فتاویٰ علمیہ

المعروف

توضیح الاحکام

تالیف

حافظ زبیر علی زئی

مکتبہ اسلامیہ

فتاویٰ علمیّہ
المعروف
توضیح الاحکام

فتاویٰ علمیہ

المعروف

توضیح الاحکام

تالیف

حافظ زبیر علی زئی

مکتبہ اسلامیہ

ناشر .... محمد سرور عاصم

کمپوزنگ .... مکتبۃ الحدیث

اشاعت .... اکتوبر 2009ء

قیمت ....

بالمقابل رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ، لاہور - پاکستان فون:042-37244973

بیسمنٹ اٹلس بینک بالمقابل شیل پٹرول پمپ کوتوالی روڈ، فیصل آباد-پاکستان فون:041-2631204, 2034256

مکتبۃ الحدیث حضرو اٹک فون : 057-2310571

E-mail:maktabaislamiapk@gmail.com

فہرست

کتاب العقائد (توحید وسنت کے مسائل)

طہارت کے مسائل

مساجد کا بیان

اذان کے مسائل

نماز کے مسائل

باجماعت نماز کا بیان

اوقاتِ نماز

سترے کا بیان

امامت واقتداء کا بیان

صف بندی کا بیان

طریقۂ نماز کا بیان

نماز سے متعلق دیگر مسائل

نوافل، وتر اور قنوت کا بیان

قصر نماز کا بیان

جمعہ کا بیان

عیدین کا بیان

دعا واذکار اور فضائل کا بیان

کتاب الجنائز

اصول، تخریج اور تحقیقِ روایات

متفرق

حرفِ اول

الحمد لله رب العٰلمين والصلوٰة والسّلام علٰى رسوله الأمين ، أما بعد:

احکامِ شرعیہ وعلومِ اسلامیہ کی تدریس میں استفتاء اور افتاء بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ استفتاء سے مطلوبہ مسائل کی گتھی سلجھتی ہے تو افتاء کے ذریعے سے مفتیانِ عظام کے علمی خزائن سے ایسے جواہرِ عالیہ ونفیسہ کا ظہور ہوتا ہے جو متلاشیانِ علم کے لئے کلید کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اسلام جہالت کے ظلمت کدوں میں مینارۂ نور ہے، یہی وجہ ہے کہ اس میں تفہیمِ دین اور حصولِ علم کی خوب ترغیب، تحریص اور تلقین فرمائی گئی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ پس اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ علم سے دریافت کرلو۔ (النحل:۴۳، الانبیاء:۷)

سوالاً ، جواباً بہترین طرزِ تعلیم ہے جو کتاب وسنت سے ماخوذ ہے۔ قرآن اور حدیث میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں: ﴿ وَ يَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ﴾ وہ آپ سے عورتوں کے بارے میں فتویٰ طلب کرتے ہیں، آپ (ﷺ) کہہ دیجئے! اللہ تمھیں ان کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے۔ (النسآء:۱۲۷)

﴿ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ﴾ لوگ آپ (ﷺ) سے چاند کے بارے میں فتویٰ طلب کرتے ہیں، کہہ دیجئے! یہ لوگوں (کی عبادت) کے اوقات اور حج کے (موسم کی تعیین کے) لئے ہے۔ (البقرۃ:۱۸۹)

﴿ يَسْتَفْتُوْنَكَ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ﴾ لوگ آپ (ﷺ) سے فتویٰ پوچھتے ہیں، کہہ دیجئے! اللہ تمھیں کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے۔ (النسآء:۱۷۶)

اسی طرح صحیح بخاری (۵۰) کی وہ حدیث جو حدیثِ جبریل کے نام سے مشہور ہے،

اس میں بھی لوگوں کو دین سکھلانے کے لئے سوال جواب کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔
مذکورہ بالا تصریح سے ''فتاویٰ'' کی اہمیت و نافعیت اظہر من الشمس ہے لیکن فتویٰ کس سے پوچھا جائے؟ اس سلسلے میں ایک حدیث درج کی جاتی ہے جو ہمیشہ ملحوظ رہنی چاہیے۔

سیدنا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ فرما رہے تھے کہ اللہ علم اس طرح نہیں اٹھائے گا کہ اسے بندوں سے چھین لے بلکہ وہ (راسخ العلم) علماء کو موت دے کر علم اٹھالے گا، حتیٰ کہ جب کوئی عالم باقی نہیں رہے گا تو لوگ جاہلوں کو سردار بنالیں گے، ان سے سوالات پوچھے جائیں گے اور وہ بغیر علم کے فتویٰ دیں گے، پس وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے۔ (صحیح بخاری:۱۰۰)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہمیشہ راسخ العلم و محقق علماء سے ہی مسئلہ پوچھنا چاہیے ورنہ گمراہی کے راستے کو اختیار کرنا پڑے گا۔ (العیاذ باللہ)

دینِ اسلام میں جہاں سوال پوچھنے کی ترغیب اور راسخ العلم علماء کا انتخاب کرنے کی تاکید ہے وہاں اہلِ علم و مفتیانِ دین کے لئے بھی تنبیہات ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ﴾ اور جس کا تجھے علم نہیں، اس کے پیچھے مت پڑ۔ (بنی اسرائیل:۳۶)

نیز فرمایا: ﴿ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴾ کسی چیز کو اپنی زبان سے جھوٹ (موٹ) نہ کہہ دیا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے تاکہ اللہ پر جھوٹ بہتان باندھنے لگو، یقیناً اللہ تعالیٰ پر بہتان بازی کرنے والے کامیابی سے محروم ہی رہتے ہیں۔ (النحل:۱۱۶)

مفتی کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر بات چھان بین کے بعد ہی بیان کرے بالخصوص احادیث کے سلسلے میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
((من يقل علي مالم أقل فليتبوأ مقعده من النار)) جو شخص میری طرف وہ بات

منسوب کرے جو میں نے نہیں کہی تو اس کا ٹھکانا (جہنم کی) آگ میں ہے۔ (صحیح بخاری: ۱۰۹)

لیکن مشاہدے میں آیا ہے کہ بعض مفتیوں کے فتوے کی بنیاد ہی ضعیف روایات و آثار پر ہوتی ہے جو کہ مذموم عمل ہے۔

زیرِ نظر کتاب ''توضیح الاحکام'' ان سوال و جواب کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً فضیلۃ الشیخ حافظ زبیر علی زئی حفظہ اللہ سے پوچھے گئے اور وہ مختلف رسائل و جرائد میں چھپتے رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے استاذ محترم کو علم و فضل کے ساتھ فکر و نظر کی اصابت، استنباطِ مسائل کی قوت اور ملکۂ اجتہاد میں سے وافر حصہ عطا کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ دور دراز کے علاقوں سے سائل کھنچے چلے آتے ہیں اور اطمینانِ قلب کے بعد واپس جاتے ہیں۔ والحمد للہ

توضیح الاحکام کی جلد اول آپ کے ہاتھوں میں ہے جو کتاب العقائد، طہارت، نماز، دعا اور جنازے کے مسائل پر پوچھے گئے سوالات پر مشتمل ہے، چونکہ استاذ محترم کا ایک خاص میدان اصول و تحقیق بھی ہے، اس سلسلے میں بھی بہت سے سوالات ہیں لہٰذا انھیں اہم فائدہ جانتے ہوئے ''اصول، تخریج و تحقیق الروایات اور متفرق'' کے نام سے شاملِ کتاب کر دیا گیا ہے۔

واضح رہے کہ ترتیب و تبویب کے دوران میں بعض مقامات پر ترمیم و اضافہ بھی کیا ہے لہٰذا امیدِ واثق ہے کہ یہ کتاب اسم با مسمیٰ ثابت ہوگی۔ ان شاء اللہ

آخر میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ فضیلۃ الشیخ حافظ زبیر علی زئی حفظہ اللہ کو ہر قسم کے آلام و مصائب سے محفوظ رکھے اور اس کتاب کو ان کے لئے ذریعۂ نجات بنائے۔ (آمین)

حافظ ندیم ظہیر

(۲۷/ جون ۲۰۰۹ء)

مقدمہ توضیح الاحکام

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الأمین ، أما بعد:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَ اَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ﴾ اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اس سے منہ نہ پھیرو، اس حال میں کہ تم سن رہے ہو۔ (الانفال:۲۰)

نیز ارشاد فرمایا: ﴿ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ﴾ پھر اگر تمھارے درمیان کسی چیز کے بارے میں اختلاف ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو۔ (النساء:۵۹)

اس آیتِ کریمہ سے ثابت ہوا کہ قرآن اور حدیث یکساں حجت ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لا یجمع اللّٰہ أمتي علٰی ضلالۃ أبدًا ...)) اللہ میری اُمت کو گمراہی پر کبھی جمع نہیں کرے گا۔ الخ (المستدرک للحاکم ۱/۱۱۶ ح ۳۹۹ وسندہ صحیح)

نیز آپ ﷺ نے فرمایا: ((لن تجتمع أمتي علی الضلالۃ أبدًا فعلیکم بالجماعۃ فإن ید اللّٰہ علی الجماعۃ .)) میری اُمت گمراہی پر کبھی جمع نہیں ہوگی لہٰذا تم جماعت (اجماع) کو لازم پکڑو کیونکہ اللہ کا ہاتھ جماعت (اجماع) پر ہے۔

(المعجم الکبیر للطبرانی ۱۲/۴۴۷ ح ۱۳۶۲۳، وسندہ حسن)

ان احادیث اور دیگر دلائل سے معلوم ہوا کہ اجماعِ امت بھی حجت ہے۔

یاد رہے کہ کتاب وسنت کا وہی مفہوم معتبر ہے جو سلف صالحین کے اتفاق سے ثابت ہے۔

جن مسائل کا صریح یا غیر صریح جواب قرآن، حدیث اور اجماع میں نہ ملے تو پھر اجتہاد کرنا جائز ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے قاضی شریح بن الحارث رحمہ اللہ کی طرف لکھ کر بھیجا:

.... یا تو اپنی رائے کے ساتھ اجتہاد کرو اور فیصلہ کر دو یا فیصلے میں تاخیر کرو اور میرا خیال ہے کہ

تمھارے لئے تاخیر ہی بہتر ہے۔ (سنن الدارمی: ۱۶۹، وسندہ حسن)

علماء کے لئے ضروری ہے کہ ہر سوال کا جواب تحقیق کر کے دلائل کے ساتھ دیں اور ادلۂ شرعیہ کو ہمیشہ مدِ نظر رکھیں۔ سلف صالحین کے متفقہ فہم اور آثار کے مخالف راستہ کبھی اختیار نہ کریں اور عوام کا یہ کام ہے کہ صحیح العقیدہ علماء سے مسائل پوچھ کر اُن پر عمل کریں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ فَسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾

اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ ذکر سے پوچھ لو۔ (النحل: ۴۳)

عوام کا علماء سے مسائل پوچھنا تقلید نہیں ہے۔ دیکھئے مسلم الثبوت (ص ۲۸۹) اور راقم الحروف کی کتاب: دین میں تقلید کا مسئلہ (ص ۹)

حدیث کے طالبِ علم کی حیثیت سے بطورِ تشکر عرض ہے کہ ماہنامہ شہادت اسلام آباد میں سوال و جواب اور تخریج الاحادیث کے نام سے ایک سلسلہ شروع ہوا، جس میں تقریباً پانچ سال تک عوام کے سوالات کے جوابات دیئے گئے۔ بعد میں اللہ کے فضل و کرم سے ماہنامہ الحدیث حضرو کے تحقیقی مجلّے کا اجراء ہوا تو اسی سلسلے کو توضیح الاحکام کے نام سے جاری رکھا گیا لیکن ماہنامہ شہادت میں یہ سلسلہ میری مصروفیات کی وجہ سے بند ہو گیا ہے جبکہ الحدیث حضرو میں توضیح الاحکام کا تحقیقی سلسلہ جاری ہے۔ والحمدللہ

کئی دوستوں کے مطالبے اور اصرار کی وجہ سے اب ماہنامہ شہادت اور ماہنامہ الحدیث حضرو وغیرہما میں شائع شدہ فتاویٰ کو دوبارہ کمپوزنگ اور مراجعت کروا کر انھیں کتاب (توضیح الاحکام جلد اول) کی صورت میں ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے۔ تحقیقی میدان اور مطالعۂ کتب میں کئی نئے حوالے ملتے رہتے ہیں اور یہ کسی طالبِ علم سے مخفی نہیں ہے۔ جدید معلومات اور بہتر سے بہترین بنانے کے لئے کئی سوالات و جوابات میں مناسب مقامات پر اصلاح بھی کر دی ہے لہٰذا اس اصلاح کے بعد سوال و جواب اور توضیح الاحکام کا یہی مطبوعہ ایڈیشن معتبر اور راجح ہے۔

اس عظیم کام میں بہت سے بھائیوں اور دوستوں نے راقم الحروف کے ساتھ علمی و

اخلاقی تعاون کیا ہے، خاص طور پر تلمیذِ محترم حافظ ندیم ظہیر حفظہ اللہ نے انتھک محنت کے ساتھ بہترین ترتیب اور مفید حک و اضافے کے ساتھ اس کتاب کو طباعت کے انجام تک پہنچایا ہے۔

برادر محترم ابو خالد عبدالمجید شاکر حفظہ اللہ نے بڑی محنت اور خلوص سے مراجعت فرمائی ہے اور مجھے پوری اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں اس کی جزائے خیر عطا فرمائے گا۔
إن شاء اللّٰه

محمد قاسم برہ زئی نے کمپوزنگ اور سیٹنگ میں بہت زیادہ محنت کر کے کتاب کو نکھار دیا۔

مولانا سرور عاصم حفظہ اللہ نے بھی اس سلسلے میں اپنی نظرِ شفقت ومحبت کو قائم رکھا تا کہ جلد از جلد یہ کتاب چھپ جائے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ میرے استاذ محترم حافظ عبدالحمید ازہر حفظہ اللہ، تلمیذ محترم حافظ ندیم ظہیر حفظہ اللہ، برادر محترم ابو خالد عبدالمجید حفظہ اللہ، جناب محمد قاسم برہ زئی اور تمام معاونین کو جزائے خیر عطا فرمائے، کتاب وسنت پر ہمیں ہمیشہ گامزن رکھے اور قبر وحشر میں کامیابی وکامرانی عطا فرمائے۔ دنیا وآخرت میں سرخرو رکھے۔ آمین

مصنف، کمپوزر اور مراجعت کرنے والے جتنی بھی محنت کریں، کوئی نہ کوئی خطا اور لغزش رہ ہی جاتی ہے لہٰذا اگر کسی شخص نے اس کتاب میں کسی غلطی کی نشاندہی کی اور اپنے موقف کو دلیل کے ساتھ ثابت کر دیا تو میرا اعلان ہے کہ علانیہ اپنی غلطی سے رجوع کروں گا، کیونکہ باطل میں ضد اور جھگڑے سے حق کی طرف رجوع کرنے میں ہی خیر ہے۔

مزید دیکھئے ماہنامہ الحدیث حضرو: ۵۴ (اندرونی پہلا ٹائٹل)

وما علينا إلا البلاغ

حافظ زبیر علی زئی

(۲۳/ جون ۲۰۰۹ء)

کتاب العقائد
(توحید وسنت کے مسائل)

کیا اللہ تعالیٰ ہر جگہ بذاتہ موجود ہے؟

سوال سورۃ الحدید کی چوتھی آیت کی روشنی میں یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے، کیا یہ صحیح ہے؟ اگر صحیح نہیں تو اس کی کیا دلیل ہے۔؟ (عبدالمتین، ماڈل ٹاؤن، لاہور)

الجواب ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ؕ یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَ مَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا ؕ وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ﴾ وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر عرش (بریں) پر متمکن ہو گیا۔ وہ اسے بھی جانتا ہے جو کچھ زمین میں داخل ہوتا ہے اور (اسے بھی جانتا ہے) جو کچھ اس میں سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے، اور وہ تمھارے ساتھ ہے خواہ تم کہیں بھی ہو، اور جو کچھ بھی تم کیا کرتے ہو اسے وہ دیکھتا ہوتا ہے۔ (سورۃ الحدید:۴، الکتاب/ڈاکٹر محمد عثمان ص ۳۲۴)

اس آیت کریمہ میں ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ﴾ کی تشریح میں قدیم مفسرِ قرآن، امام محمد بن جریر بن یزید الطبری رحمہ اللہ (متوفی ۳۱۰ھ) فرماتے ہیں:

''وهو شاهد عليكم أيها الناس أينما كنتم يعلمكم ويعلم أعمالكم ومتقلبكم ومثواكم وهو على عرشه فوق سمٰواته السبع'' اور اے لوگو! وہ (اللہ) تم پر گواہ ہے، تم جہاں بھی ہو وہ تمھیں جانتا ہے، وہ تمھارے اعمال، پھرنا اور ٹھکانا جانتا ہے اور وہ اپنے سات آسمانوں سے اوپر اپنے عرش پر ہے۔ (تفسیر طبری ج ۲۷ ص ۱۲۵)

اسی مفہوم کی ایک آیت کریمہ کے بارے میں مفسر ضحاک بن مزاحم الہلالی الخراسانی رحمہ اللہ (متوفی ۱۰۶ھ) فرماتے ہیں: ''هو فوق العرش وعلمه معهم أينما كانوا'' وہ عرش پر ہے اور اس کا علم ان (لوگوں) کے ساتھ ہے چاہے وہ جہاں کہیں بھی ہوں۔

(تفسیر طبری ج ۲۸ ص ۱۰ و سندہ حسن)

امام مقرئ محقق محدث اثری ابوعمر احمد بن محمد بن عبداللہ الطلمنکی الاندلسی رحمہ اللہ (متوفی ۴۲۹ھ) فرماتے ہیں:

''اہل سنت مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ ۚ﴾ (الحدید:۴) وغیرہ آیات کا مطلب یہ ہے کہ'' أن ذلك علمه وأن الله فوق السمٰوات بذاته ، مستوٍ علی عرشه كيف شاء '' بے شک اس سے اللہ کا علم مراد ہے، اللہ اپنی ذات کے لحاظ سے آسمانوں پر، عرش پر مستوی ہے جس طرح اس کی شان کے لائق ہے۔

(شرح حدیث النزول لابن تیمیہ ص ۱۴۴، ۱۴۵)

اس اجماع سے معلوم ہوا کہ بعض الناس کا اس آیت کریمہ سے یہ مسئلہ تراشنا کہ ''اللہ اپنی ذات کے ساتھ ہر جگہ موجود ہے۔'' غلط اور باطل ہے لہٰذا کتاب وسنت اور اجماع کے مخالف ہونے کی وجہ سے مردود ہے۔

مسئولہ آیتِ کریمہ میں ''یَعْلَمُ'' کا لفظ بھی بالکل واضح اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہاں معیت سے علم وقدرت مراد ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے ہمارے استاذ محترم شیخ بدیع الدین الراشدی رحمہ اللہ کی کتاب ''توحید خالص'' (ص ۲۷۷) حارث بن اسد المحاسبی رحمہ اللہ (متوفی ۲۴۳ھ) فرماتے ہیں: ''وكذلك لا يجوز .... '' إلخ اور اسی طرح یہ کہنا جائز نہیں ہے کہ.... اللہ زمین پر ہے۔ (فہم القرآن ومعانیہ، القسم الرابع، باب مالا یجوز فیہ النسخ)

حافظ ابن الجوزی فرماتے ہیں: ''(جہمیہ کے فرقے) ملتزمہ نے باری تعالیٰ کو ہر جگہ (موجود) قرار دیا ہے۔'' (تلبیس ابلیس ص ۳۰، راقم الحروف کی کتاب: بدعتی کے پیچھے نماز کا حکم ص ۱۹)

شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اور یوں کہنا جائز نہیں کہ وہ (اللہ) ہر مکان میں ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ وہ آسمان میں عرش پر ہے۔'' (غنیۃ الطالبین ج ۱ ص ۱۰۰)

نیز دیکھئے الحدیث: ۱۰ ص ۴۳۔۴۶ [الحدیث: ۲۴]

اللہ کی معیت وقربت سے کیا مراد ہے؟

سوال اہلِ حدیث اللہ کو عرش پر مانتے ہیں اور ''معکم'' اور ''اِنی قریب'' سے متعلق کہتے ہیں کہ ''معیت وقربت'' سے مراد اللہ کا علم ،قدرت ،سماعت وبصارت ہے کیا یہ تاویل نہیں ہے؟ بعض سعودی علماء مثلاً شیخ (محمد بن) صالح العثیمین رحمہ اللہ وغیرہ اور بعض پاکستانی سلفی علماء کہتے ہیں کہ ہم ''استویٰ'' کو بلا کیف مانتے ہیں اسی طرح ''معیت وقربت'' کو بھی بلا کیف مانتے ہیں جس طرح اللہ کی شان کے لائق ہے وہ مستوی ہے اور جس طرح اس کی شان کے لائق ہے وہ ساتھ بھی ہے قریب بھی ہے ۔ہم کوئی تاویل نہیں کرتے ۔اللہ کی صفات والی آیات متشابہہ ہیں ہم ان میں سے کوئی غور وفکر وتاویل نہیں کرتے جس طرح اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہے ویسے ہی اس کی صفات ہیں ۔

محترم! دلائل کے ساتھ وضاحت فرمائیں ۔ (سلیم اختر، کراچی)

الجواب مقاتل بن حیان (النبطی المفسر) نے **وھو معھم** کی تشریح میں فرمایا:

''**علمه**'' اس کا علم ہے ۔ (الاسماء والصفات للبیہقی ص ۴۳۱ وفی نسخۃ ص ۵۴۲ وسندہ حسن)

ضحاک بن مزاحم المفسر نے فرمایا: ''**وعلمه معهم**'' اور اس کا علم ان کے ساتھ ہے ۔

(السنۃ لعبداللہ بن احمد: ۵۹۲ وسندہ حسن واخطأ القحطانی فقال: فی اسنادہ لین!)

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما (مفسر قرآن) سے مروی ہے:

''**هو على العرش وعلمه معهم**'' وہ عرش پر ہے اور اس کا علم ان کے ساتھ ہے ۔

(تفسیر ابن ابی حاتم بحوالہ شرح حدیث النزول لابن تیمیہ ص ۱۲۶)

ان روایات کے راوی بکیر بن معروف (مفسر) حسن الحدیث تھے ۔امام نسائی اور جمہور محدثین نے ان کی توثیق کی ہے، ان پر احمد بن حنبل کی طرف منسوب جرح تہذیب الکمال للمزی میں بے سند ہونے کی وجہ سے ثابت نہیں ہے، جبکہ خود امام احمد سے ان کی توثیق ثابت ہے ۔ (دیکھئے معرفۃ العلل والرجال: ۲۵۰۳)

ابن المبارک کی طرف منسوب جرح عبداللہ بن محمد بن سعدویہ اور احمد بن عبداللہ بن بشیر المروزی کی وجہ سے ثابت نہیں ہے۔ دیکھئے کتاب الضعفاء للعقیلی (ج۱ ص۱۵۲، ۱۵۳)

امام اہلِ سنت احمد بن حنبل نے ﴿هو معهم أينما كانوا﴾ کی تشریح میں فرمایا:

''علمه'' یعنی اس کا علم ہے۔ (شرح حدیث النزول ص۱۲۷، نقلہ عن کتاب السنۃ لحنبل بن اسحاق)

سلف صالحین میں سے ان کا کوئی مخالف نہیں ہے، حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے لکھا:

''وقد ثبت عن السلف أنهم قالوا: هو معهم بعلمه وقد ذكر ابن عبد البر وغيره: أن هذا اجماع من الصحابة والتابعين لهم بإحسان ولم يخالفهم فيه أحد يعتد بقوله'' اور سلف سے ثابت ہے کہ انھوں نے فرمایا: وہ (اللہ) بلحاظِ علم ان کے ساتھ ہے اور ابن عبدالبر وغیرہ نے اس پر صحابہ وتابعین کا اجماع نقل کیا ہے، اور اس سلسلے میں کسی قابل اعتماد شخص نے ان کی مخالفت نہیں کی۔ (شرح حدیث النزول ص۱۲۶)

یہ ظاہر ہے کہ اجماع شرعی حجت ہے۔ تفصیل کے لئے امام شافعی کی کتاب الرسالۃ اور حافظ ابن حزم کی الاحکام دیکھیں۔

حافظ عبداللہ محدث غازی پوری (۱۲۶۰ھ۔ ۱۳۳۷ھ) نے فرمایا: ''واضح رہے کہ ہمارے مذہب کا اصل الاصول صرف اتباع کتاب وسنت ہے'' (ابراء اہلِ حدیث والقرآن ص۳۲)

اس پر حافظ صاحب نے خود ہی بطور حاشیہ لکھا ہے کہ ''اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ اہلِ حدیث کو اجماع وقیاس شرعی سے انکار ہے کیونکہ جب یہ دونوں کتاب وسنت سے ثابت ہیں تو کتاب وسنت کے ماننے میں ان کا ماننا آ گیا.... الخ'' (ایضاً ص۳۲)

[نیز دیکھئے ماہنامہ الحدیث حضرو: ۱ ص۴]

یاد رہے کہ ''معکم'' کا معنی ''علمه وقدرته'' کرنا تاویل نہیں بلکہ اس کے لغوی معنوں میں سے ایک ہے جیسے کہا جاتا ہے: ''اِذهب أنا معك'' جاؤ میں تمھارے ساتھ ہوں۔

جو لوگ ''معکم'' کو علم وقدرت کے علاوہ کوئی علیحدہ صفت سمجھ بیٹھے ہیں ان کا قول اجماعِ صحابہ وتابعین ومن بعدھم کے خلاف ہونے کی وجہ سے مردود ہے۔ [شہادت، فروری ۲۰۰۳ء]

قرآن مخلوق نہیں بلکہ اللہ کا کلام ہے اور رحمٰن کا عرش پر مستوی ہونا برحق ہے

سوال: (۱) انور شاہ کشمیری دیوبندی کے ملفوظات میں لکھا ہوا ہے کہ

''واضح ہو کہ حافظ ابن تیمیہ بھی قیامِ حوادث حرف وصوت وغیرہ ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ مانتے ہیں.... حافظ ابنِ قیم نے بھی اپنے عقیدۂ نونیہ میں کلامِ باری کو حرف وصوت سے مرکب کہا جس کا رد علامہ کوثری نے ''تعلیقات السیف الصقیل ''میں کیا ہے اور وہاں شیخ عزالدین و دیگر اکابرِ امت کے فتاویٰ نقل کر دیئے ہیں.... ان فتاویٰ سے ثابت ہوا کہ جس نے خدا کو متکلم بالصوت والحروف کہا اُس نے خدا کے لئے جسمیت ثابت کی جو کفر ہے۔''

(ملفوظات علامہ سید انور شاہ کشمیری ص ۲۰۰)

① کیا واقعی اللہ کے کلام کو حرف وصوت سے مرکب ماننا جسمیت ثابت کرنا ہے؟

② اللہ کی صفتِ کلام کے بارے میں کتاب وسنت کی روشنی میں سلف صالحین کا عقیدہ و منہج کیا رہا ہے؟

(۲) انھیں ملفوظات میں ایک اور جگہ لکھا ہے: ''حافظ ابن تیمیہ نے کہا کہ عرش قدیم ہے، کیونکہ استواء (بمعنے جلوس واستقرار) ہے اس پر خدا کا، حالاں کہ حدیثِ ترمذی میں خلقِ عرش مذکور ہے.... اور درسِ حدیث دیوبند کے زمانہ میں حضرتؒ نے علامہ ابن تیمیہ کے استواء بمعنی واستقرار وجلوس مراد لینے پر سخت نقد کیا تھا۔'' (ملفوظات.... ص ۲۰۳)

① کیا انور شاہ کشمیری دیوبندی کی درج بالا مسائلِ عقائد کے ضمن میں شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ پر جرح وتنقید درست ہے؟ حتیٰ کہ انور شاہ کشمیری صاحب کا کہنا ہے کہ ''علامہ ابن تیمیہؒ بہت بڑے عالم و متبحر ہیں مگر وہ استقرار وجلوسِ خداوندی کا عقیدہ لے کر آئیں گے تو ان کو یہاں دار الحدیث میں داخل نہ ہونے دوں گا۔'' (ملفوظات.... ص ۲۲۰)

[شعیب محمد، سیالکوٹ]

الجواب: الحمد لله رب العالمين والصّلوٰة والسّلام علٰى رسوله الأمين ، أما بعد:

یہ عقیدہ بالکل صحیح اور برحق ہے کہ قرآنِ مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور مخلوق نہیں ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ﴾ اور اگر مشرکین میں سے کوئی ایک تجھ سے پناہ مانگے تو اُسے پناہ دے دو، حتیٰ کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔ (سورۃ التوبہ:٦)

اس آیتِ کریمہ سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین لوگوں کے سامنے جو قرآن پڑھتے تھے، وہ اللہ کا کلام ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے بارے میں فرمایا: ﴿ وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ اور بے شک یہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے۔ (الشعراء:١٩٢)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ((ألا رجل يحملني إلٰى قومه فإن قريشًا قد منعوني أن أبلّغ كلام ربّي .)) کیا کوئی آدمی مجھے اپنی قوم کے پاس نہیں لے جاتا؟ کیونکہ قریش نے مجھے اپنے رب کا کلام (لوگوں تک) پہنچانے سے روک دیا ہے۔

(سنن ابی داود:٤٧٣٤ وسندہ صحیح، الترمذی:٢٩٢٥ وقال: ''حسن صحیح غریب'' قلت : سالم بن أبي الجعد مذكور في المدلسين ولا يثبت هذا عنه ، انظر الفتح المبين في تحقيق طبقات المدلسين ص٣٩)

☆ سیدنا ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کو اللہ کا کلام کہا۔ (دیکھئے کتاب الاسماء والصفات للبیہقی ص ٢٣٩، ٢٤٠ وسندہ حسن، وقال البیہقی: ''وهذا إسناد صحيح''، دوسرا نسخہ ص ٣٠٩)

جب سورۃ الروم کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں تو مشرکینِ مکہ نے سیدنا ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ سے کہا: یہ تیرا کلام ہے یا تیرے ساتھی کا کلام ہے؟ تو انھوں نے فرمایا: نہ یہ میرا کلام ہے اور نہ میرے ساتھی کا کلام بلکہ یہ تو اللہ عزوجل کا کلام ہے۔

(کتاب الاعتقاد للبیہقی تحقیق احمد بن ابراہیم ص ١٠٨، وسندہ حسن، عبدالرحمٰن بن ابی الزناد حسن الحدیث وثقہ الجمہور، الاسماء والصفات للبیہقی ص ٢٣٩، ٢٤٠، دوسرا نسخہ ص ٣٠٩، تیسرا نسخہ ص ١٧٩، ١٨٠، وقال البیہقی: ''وھذا اسناد صحیح'')

☆ امام سفیان بن عیینہ المکی رحمہ اللہ (متوفی ١٩٨ھ) نے فرمایا: میں نے ستر (٧٠)

سال سے اپنے استاذوں کو جن میں عمرو بن دینار (ثقہ تابعی رحمہ اللہ متوفی ۱۲۶ھ) بھی تھے، یہی کہتے ہوئے سنا ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور مخلوق نہیں ہے۔

(خلق افعال العباد للامام البخاری ص ۷ فقرہ:۱، وسندہ صحیح)

☆ مشہور امام جعفر صادق رحمہ اللہ (متوفی ۱۴۸ھ) نے قرآن کے مخلوق ہونے کی نفی کی اور فرمایا: لیکن وہ اللہ کا کلام ہے۔ (مسائل ابی داود ص ۲۶۵ وسندہ حسن، الشریعۃ للآجری ص ۷۷ ح ۱۵۹، الاعتقاد للبیہقی ص ۱۰۷، وقال: ''فهو عن جعفر صحيح مشهور'')

☆ امام مالک بن انس المدنی رحمہ اللہ قرآن کو اللہ کا کلام کہتے اور اُس شخص کا شدید رد کرتے جو قرآن کو مخلوق کہتا تھا، امام مالک فرماتے کہ اُسے مار مار کر سزا دی جائے اور قید میں رکھا جائے یہاں تک کہ وہ مر جائے۔ (الشریعہ ص ۷۹ ح ۱۶۶، وسندہ حسن)

☆ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا: جو شخص قرآن کو مخلوق کہے تو وہ کافر ہے۔

(حلیۃ الاولیاء ۹/۱۱۳، وسندہ حسن)

☆ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اُس شخص کو کافر کہا ہے جس نے قرآن کو مخلوق کہا۔

(دیکھئے مسائل ابی داود ص ۲۶۲ وھو صحیح ثابت)

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے فرمایا: '' القرآن من علم الله و علم الله ليس بمخلوق والقرآن كلام الله ليس بمخلوق '' قرآن اللہ کے علم سے ہے اور اللہ کا علم مخلوق نہیں اور قرآن اللہ کا کلام ہے، مخلوق نہیں۔

(المحنۃ روایۃ صالح بن احمد بن حنبل ص ۶۹ بحوالہ العقیدۃ السلفیۃ ص ۱۰۶)

امام احمد نے مزید فرمایا: جو شخص لفظي بالقرآن مخلوق (قرآن کے ساتھ میرا لفظ مخلوق ہے) کا دعویٰ کرے تو وہ جہمی ہے۔ (مسائل ابن ہانی ج ۲ ص ۱۵۲، فقرہ:۱۸۵۳)

امام احمد نے لفظي بالقرآن مخلوق کہنے والے کے بارے میں فرمایا:

اس کے پیچھے نماز نہیں پڑھنی چاہیے اور اس کے پاس نہیں بیٹھنا چاہیے، اس سے کلام نہیں کرنا چاہیے اور اسے سلام نہیں کرنا چاہیے۔ (مسائل ابن ہانی ج ۲ ص ۱۵۲، فقرہ:۱۸۵۱)

نیز امام احمد نے فرمایا: ''القرآن علم من علم اللّٰه فمن زعم أن علم اللّٰه مخلوق فهو كافر '' قرآن اللہ کے علم میں سے علم ہے لہٰذا جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ قرآن مخلوق ہے تو وہ کافر ہے۔ (مسائل ابن ہانی ج ۲ ص ۱۵۴، فقرہ: ۱۸۶۳)

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے فرمایا: جہمیہ کے تین فرقے ہیں: (۱) ایک فرقہ قرآن کو مخلوق کہتا ہے۔ (۲) دوسرا فرقہ کلام اللہ کہہ کر سکوت کرتا ہے۔ (۳) تیسرا فرقہ کہتا ہے کہ قرآن کے ساتھ ہمارے الفاظ مخلوق ہیں۔ الخ

(المحنۃ روایۃ صالح بن احمد بن حنبل ص ۶۷، بحوالہ العقیدۃ السلفیہ فی کلام رب البریہ ص ۲۰۴)

☆ امام عبداللہ بن ادریس بن یزید الکوفی رحمہ اللہ (متوفی ۱۹۲ھ) نے اُن لوگوں کو زنادقہ (بے دین، ملحدین، بے ایمان اور کفار) قرار دیا جو قرآن کو مخلوق کہتے تھے۔
دیکھئے خلق افعال العباد للبخاری (ص ۸ فقرہ: ۵ وسندہ صحیح)

☆ امام وہب بن جریر بن حازم رحمہ اللہ (متوفی ۲۰۶ھ) نے فرمایا:
قرآن مخلوق نہیں ہے۔ (مسائل ابی داود ص ۲۶۶ وسندہ صحیح)

☆ امام ابوالنضر ہاشم بن القاسم رحمہ اللہ (متوفی ۲۰۷ھ) نے فرمایا:
قرآن اللہ کا کلام ہے، مخلوق نہیں ہے۔ (مسائل ابی داود ص ۲۶۶ وسندہ صحیح)

☆ امام ابوالولید الطیالسی رحمہ اللہ (متوفی ۲۲۷ھ) نے فرمایا:
قرآن اللہ کا کلام ہے اور اللہ کا کلام مخلوق نہیں ہے۔ (مسائل ابی داود ص ۲۶۶ وسندہ صحیح)

بلکہ امام ابوالولید نے مزید فرمایا: جو شخص دل سے یہ عقیدہ نہ رکھے کہ قرآن مخلوق نہیں ہے تو وہ اسلام سے خارج (یعنی کافر) ہے۔ (مسائل ابی داود ص ۲۶۶ وسندہ صحیح)

☆ مشہور قاری اور موثق عندالجمہور امام ابوبکر بن عیاش الکوفی رحمہ اللہ (متوفی ۱۹۴ھ) نے فرمایا: جو شخص تمھارے سامنے قرآن کو مخلوق کہے تو وہ ہمارے نزدیک کافر، زندیق (اور) اللہ کا دشمن ہے، اس کے پاس نہ بیٹھو اور اس سے کلام نہ کرو۔

(مسائل ابی داود ص ۲۶۷ وسندہ صحیح)

☆ ثقہ اور متقن قاضی معاذ بن معاذ رحمہ اللہ (متوفی ۱۹۶ھ) نے فرمایا:
جو شخص قرآن کو مخلوق کہے تو وہ اللہ عظیم کا کافر ہے۔ (مسائل ابی داود ص ۲۶۷، ۲۶۸ وسندہ صحیح)
☆ امام شافعی کے مشہور شاگرد امام ابو یعقوب یوسف بن یحییٰ البویطی رحمہ اللہ (متوفی ۲۳۱ھ) نے فرمایا: جو شخص قرآن کو مخلوق کہے تو وہ کافر ہے۔ (مسائل ابی داود ص ۲۶۸ وسندہ صحیح)
☆ امام احمد بن عبداللہ بن یونس رحمہ اللہ (متوفی ۲۲۷ھ) نے فرمایا: جو شخص قرآن کو مخلوق کہے تو اس کے پیچھے نماز نہیں پڑھنی چاہئے، یہ کفار ہیں۔ (مسائل ابی داود ص ۲۶۸ وسندہ صحیح)

اس قسم کے حوالے بے حد وشمار ہیں جن سے ثابت ہوا کہ اہلِ سنت کے اجماع اور اتفاق سے یہ عقیدہ ثابت ہے کہ مسلمانوں کے پاس موجود: قرآن مجید اللہ کا کلام ہے، مخلوق نہیں ہے اور اسے مخلوق کہنے والا کافر ہے۔ یہ وہی قرآن مجید ہے جو اللہ تعالیٰ نے جبریل امین علیہ السلام کے ذریعے سے خاتم النبیین اور رحمۃ للعالمین محمد ﷺ پر نازل فرمایا اور آپ نے صحابۂ کرام تک پہنچا دیا، صحابہ نے تابعین تک اور تابعین نے تبع تابعین تک پہنچا دیا۔ یہ وہی قرآن ہے جسے حفاظِ کرام نے یاد کر رکھا ہے، مصاحف میں لکھا ہوا ہے اور امتِ مسلمہ جس کی تلاوت کرتی ہے۔

اس عقیدے پر مفصل تحقیق کے لئے اہلِ سنت کی کتب العقائد مثلاً خلق افعال العباد، الشریعہ للآجری اور الاعتقاد للبیہقی وغیرہ کی طرف رجوع فرمائیں۔
نیز دیکھئے السنن الکبریٰ للبیہقی (۲۰۶/۱۰، ۲۰۷)
حافظ ابن عبدالبر نے اس مسئلے پر اہلِ سنت کا اجماع نقل کیا ہے۔ دیکھئے التمہید (۲۴۱/۲۱)
امام الحرمین کے والد ابو محمد عبداللہ بن یوسف الجوینی الشافعی الفقیہ رحمہ اللہ (متوفی ۴۳۸ھ) نے اس مسئلے پر ایک رسالہ لکھا ہے: ''رسالة في اثبات الاستواء والفوقية و مسئلة الحرف والصوت فی القرآن المجید''
دیکھئے مجموعۃ الرسائل المنیریہ (۱۷۴/۱۔۱۸۷)
شیخ ابو محمد الجوینی الفقیہ نے فرمایا: '' والتحقيق هو أن الله تعالىٰ تكلم بالحروف

كما يليق بجلاله و عظمته فإنه قادر و القادر لا يحتاج إلى جوارح ولا إلى لهوات و كذالك له صوت كما يليق به يسمع ولا يفتقر ذلك الصوت المقدس إلى الحلق والحنجرة كلام الله تعالى كما يليق به وصوته كما يليق به ولا ننفي الحرف والصوت عن كلامه سبحانه لافتقارهما منا إلى الجوارح واللهوات فإنهما من جناب الحق تعالى لا يفتقران إلى ذلك و هذا ينشرح الصدر له و يستريح الإنسان به من التعسف والتكلف ... "

اور تحقیق یہ ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے حروف کے ساتھ کلام فرمایا جیسا کہ اس کے جلال اور عظمت کے لائق ہے، کیونکہ وہ قادر ہے اور قادر مطلق کو اعضاء اور حلق کے کوّے کی حاجت نہیں ہوتی اور اسی طرح اُس (کے کلام) کی سُنی جانے والی آواز ہے جیسا کہ اُس کے لائق ہے اور یہ مقدس آواز حلق اور نرخرے کی محتاج نہیں، اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جیسا کہ اُس کے لائق ہے اور اس (کلام) کی آواز ہے جیسا کہ اُس کے لائق ہے۔ ہم اللہ سبحانہ کے کلام سے حرف وصوت کی نفی (انکار) اس وجہ سے نہیں کرتے کہ ہم اعضاء اور حلق کے کوّوں کے محتاج ہیں (بلکہ ان صفات کا اقرار کرتے ہیں) کیونکہ حق تعالیٰ کی جناب (ذات) ان چیزوں کی محتاج نہیں ہے اور یہ وہ بات ہے جس پر شرح صدر ہوتا ہے اور تعسف وتکلف سے (دور رہ کر) انسان کو آرام پہنچتا ہے.... (مسالۃ الحروف والصوت ص ۱۱، الرسائل المنیریہ ۱/۱۸۴)

ابراہیم نخعی نے ابو العالیہ الریاحی کی تعلیم القرآن میں احتیاط کے بارے میں فرمایا:

" أظن صاحبكم قد سمع أنه من كفر بحرف منه فقد كفر به كله "

میں سمجھتا ہوں کہ تمھارے ساتھی نے یہ سنا ہے کہ جس نے قرآن کے ایک حرف کا انکار کیا تو اس نے سارے قرآن کا انکار کیا۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۰ ص ۵۱۳ ح ۳۰۱۰۰ وسندہ صحیح)

علمائے اہلِ سنت کی ان واضح تصریحات کے مقابلے میں زاہد بن حسن بن علی [رضا] بن خضوع بن ہائی بن قانبت بن قنصو الجرکسی الکوثری نے بغیر کسی شرم وحیا کے لکھا:

" والواقع أن القرآن في اللوح و في لسان جبريل عليه السلام و في لسان النبي

ﷺ و ألسنة سائر التالين و قلوبهم و ألواحهم مخلوق حادث محدث ضرورة و من ينكر ذلك يكون مسفسطًا ساقطًا من مرتبة الخطاب و إنما القديم هو المعنى القائم بالله سبحانه يعني الكلام النفسي في علم الله جل شأنه في نظر أحمد بن حنبل و ابن حزم و قد صح عن أحمد قوله في المناظرة: القرآن من علم الله و علم الله غير مخلوق ''اور واقعی یہ ہے کہ لوحِ محفوظ، زبانِ جبریل علیہ السلام، زبانِ نبی ﷺ اور تمام تلاوتِ قرآن کرنے والوں کی زبانوں، دلوں اور تختیوں پر قرآن مخلوق حادث ہے جو کہ ضروریات (بدیہی حقیقتوں) کا مسئلہ ہے۔ جو شخص اس کا انکار کرتا ہے تو وہ بدیہات کا منکر اور وہمیات کا قائل ہے، وہ اُس مرتبے سے ساقط ہے کہ اُس سے گفتگو کی جائے۔ قدیم تو وہ معنی ہے جو اللہ سبحانہ کے ساتھ قائم ہے، احمد بن حنبل اور ابن حزم کی نظر میں وہ اللہ جل شانہ کے علم میں کلامِ نفسی کے معنی میں ہے۔ احمد سے صحیح ثابت ہے کہ انھوں نے مناظرے میں کہا: قرآن اللہ کے علم میں سے ہے اور اللہ کا علم مخلوق نہیں ہے۔

(مقالات الکوثری: بدعۃ الصوتیہ حول القرآن ص ۲۷)

کوثری کے اس تلبیسانہ کلام سے معلوم ہوا کہ کوثری جرکسی کے نزدیک وہ قرآن مخلوق ہے جسے نبی کریم ﷺ اپنے صحابہ کے سامنے تلاوت کرتے تھے، جبریلِ امین جو قرآن نبی کریم ﷺ کو سناتے تھے وہ کوثری کے نزدیک مخلوق ہے بلکہ لوحِ محفوظ میں جو قرآن لکھا ہوا ہے وہ بھی کوثری کے نزدیک مخلوق ہے۔!

علمائے اہلِ سنت کے اجماعی اور متفقہ فتاویٰ میں سے بعض کے حوالے آپ کے سامنے پیش کر دیئے گئے ہیں کہ قرآن کو مخلوق کہنے والا کافر ہے۔

حنفیوں کی کتاب شرح عقیدہ طحاویہ میں لکھا ہوا ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے، جسے اُس نے اپنے رسول پر بطورِ وحی نازل فرمایا، یہ حقیقت میں اللہ کا کلام ہے مخلوق نہیں ہے، جو شخص اسے سُن کر سمجھے کہ یہ انسان کا کلام ہے تو اُس نے کفر کیا، اللہ نے ایسے شخص کے ساتھ جہنم کے عذاب کا وعدہ کر رکھا ہے۔

دیکھئے شرح عقیدہ طحاویہ مع شرح ابن ابی العز الحنفی (ص ۱۷۹، مختصراً)

معلوم ہوا کہ جس قرآن کو جبریل امین علیہ السلام لے کر آئے اور نبی کریم ﷺ نے لوگوں کے سامنے اُس کی تلاوت کی، جو لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے اور جسے تلاوت کرنے والے تلاوت کرتے ہیں، اللہ کا کلام ہے مخلوق نہیں ہے۔

بعض لوگوں نے کلام نفسی اور کلام لفظی کی بدعت نکالی اور لفظی بالقرآن مخلوق کا نعرہ لگایا تو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے ایسے لوگوں کو جہمیہ سے زیادہ شریر قرار دیا۔
دیکھئے مسائل ابی داود (ص ۲۷۱)

تنبیہ: امام بخاری رحمہ اللہ سے "لفظي بالقرآن مخلوق" کا قول باسند صحیح ثابت نہیں ہے لہٰذا بجنوری وغیرہ نے اس سلسلے میں اُن کی طرف جو کچھ منسوب کیا ہے، وہ سب جھوٹ کا پلندہ ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا: "و القرآن کلام اللّٰہ غیر مخلوق" اور قرآن اللہ کا کلام ہے، مخلوق نہیں ہے۔ (خلق افعال العباد ص ۴۳ فقرہ: ۱۱۲)

الامام الصدوق (عند الجمہور) امام نعیم بن حماد رحمہ اللہ نے فرمایا:

"لا یستعاذ بالمخلوق و لا بکلام العباد و الجن و الإنس و الملائکة"

مخلوق، بندوں کے کلام، جن، انس اور ملائکہ کے ساتھ پناہ نہیں مانگی جاتی یعنی مخلوق کے ساتھ پناہ نہیں مانگنی چاہئے۔

اس کے راوی امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا: (نعیم بن حماد کے) اس قول میں دلیل ہے کہ اللہ کا کلام مخلوق نہیں اور اس کے سوا دوسری مذکورہ چیزیں مخلوق ہیں۔

(خلق افعال العباد ص ۸۹ فقرہ: ۴۳۸)

امام ابو القاسم اسماعیل بن محمد بن الفضل التیمی الاصبہانی: قوام السنہ رحمہ اللہ (متوفی ۵۳۵ھ) نے اصحاب الحدیث اور اہل السنہ سے نقل کیا کہ اس وقت مصاحف میں لکھا ہوا قرآن، جو سینوں میں محفوظ ہے، وہی حقیقتاً اللہ کا کلام ہے جسے اُس نے بذریعہ جبریل نبی ﷺ تک

اور بذریعہ نبی ﷺ صحابہ تک پہنچا دیا۔

دیکھئے الحجہ فی بیان المحجہ وشرح عقیدہ اہل السنۃ (ج۱ص ۳۶۸)

کوثری نے ''قائم باللہ'' (یعنی الکلام النفسی) کی مبتدعانہ اصطلاح اختیار کر کے ''کلام نفسی'' کی بدعتی اصطلاح کو ہی رواج دیا اور امام احمد و ابن حزم کا ذکر صرف دھوکا دینے اور رعب جمانے کے لئے کیا ہے، کیونکہ اللہ کے علم میں سے ہونے کا مطلب صرف یہ ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور مخلوق نہیں ہے۔ امام احمد نے لفظیہ کو جہمیہ سے زیادہ شریر قرار دیا تھا جیسا کہ سابقہ صفحات میں گزر چکا ہے اور آپ اُس شخص کو کافر کہتے تھے جو قرآن کو مخلوق کہتا تھا۔ علامہ ابن حزم نے کہا: ''والقرآن کلام اللّٰہ و علمه غیر مخلوق'' اور قرآن اللہ کا کلام اور علم ہے، مخلوق نہیں ہے۔ (المحلی ج۱ص ۳۲ مسئلہ: ۵۸)

بلکہ ابن حزم نے مصاحف میں لکھے ہوئے، قاری سے سنے جانے والے، سینوں میں محفوظ اور رسول اللہ ﷺ کے دل پر جبریل کے ذریعے سے نازل کردہ قرآن کو اللہ کا کلام حقیقتاً قرار دیا اور مجاز کی نفی کی، جو شخص قرآن کو مخلوق سمجھتا ہے اُس کے بارے میں ابن حزم نے کہا: ''فقد کفر'' یقیناً اُس نے کفر کیا۔ (المحلی ۱/۳۲ مسئلہ: ۵۹)

معلوم ہوا کہ کوثری نے امام احمد اور علامہ ابن حزم دونوں پر جھوٹ بولا اور فلسفیانہ سفسطے کو عام سادہ لوح مسلمانوں میں پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے لفظیہ فرقے (جو کوثری کی طرح کلام لفظی اور کلام نفسی کی بدعات نکالتے ہیں) کے بارے میں فرمایا: یہ لوگ صرف جہم (ایک بہت بڑے گمراہ اور بے ایمان) کے کلام پر ہی گھوم رہے ہیں۔ الخ (مسائل ابی داود ص ۲۷۱، وسندہ صحیح)

اس مسئلے (قرآن کے کلام اللہ ہونے اور مخلوق نہ ہونے) پر تفصیلی تحقیق کے لئے شیخ عبداللہ بن یوسف الجدیع العراقی حفظہ اللہ کی عظیم کتاب: ''العقیدة السلفیة في كلام رب البرية و كشف أباطيل المبتدعة الردية'' (کل صفحات ۴۶۰) کا مطالعہ کریں۔

شیخ عبداللہ بن یوسف الجدیع العراقی نے فرمایا:

سلف صالحین کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ کلام صفت ہے جو اس کے ساتھ قائم ہے، جدا نہیں، اس صفت کے ساتھ اُس کے موصوف ہونے کی نہ ابتدا ہے اور نہ انتہا، وہ اپنی مشیت اور اختیار سے اس کے ساتھ کلام فرماتا ہے اور اس کا کلام سب سے بہترین کلام ہے، اس کا کلام مخلوق کے کلام سے مشابہ نہیں کیونکہ خالق کو مخلوق پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، وہ اپنی مخلوق: فرشتوں، اپنے رسولوں اور بندوں میں سے جس سے چاہتا ہے کلام فرماتا ہے، چاہے واسطے سے یا بغیر واسطے کے۔

وہ اپنے کلام کو حقیقی طور پر سُناتا ہے، اپنے فرشتوں اور رسولوں میں سے جسے چاہے اور قیامت کے دن اپنی آواز اپنے بندوں کو سُنائے گا جیسے کہ اُس نے موسیٰ (علیہ السلام) سے کلام کیا اور اپنی آواز کے ساتھ پکارا جب وہ درخت کے پاس آئے تو اس آواز کو موسیٰ (علیہ السلام) نے سُنا۔

جس طرح اللہ کا کلام مخلوق کے مشابہ نہیں ہے اُسی طرح اُس کی آواز مخلوق کے مشابہ نہیں ہے۔ اس کے کلمات کی کوئی انتہا نہیں اور اس کے کلام میں سے قرآن، تورات اور انجیل ہیں۔ قرآن اپنی سورتوں، آیتوں اور کلمات کے ساتھ اُس کا کلام ہے، اس نے حروف اور معانی کے ساتھ یہ کلام فرمایا اور (سیدنا) محمد ﷺ سے پہلے کسی پر نازل نہیں فرمایا۔ اُس نے اسے جبریل علیہ السلام کو سُنایا، جبریل نے محمد ﷺ کو سُنایا اور محمد ﷺ نے اپنی اُمت کو سُنا دیا، جبریل اور محمد ﷺ نے صرف اس کلام کی تبلیغ کر کے آگے ادا کر دیا (یعنی لوگوں تک پہنچا دینے کا واسطہ بنے [یاد رہے کہ نبی کریم ﷺ نے قرآنِ مجید کی تشریح، توضیح اور تفسیر بھی صحابہ کرام کے سامنے بیان کر دی جو احادیث کی صورت میں محفوظ ہے۔ والحمدللہ])

یہی قرآن لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے اور یہی مصاحف (لکھے ہوئے قرآنوں) میں ہے جسے تلاوت کرنے والے اپنی زبانوں سے تلاوت کرتے ہیں، قاری اپنی آوازوں سے اس کی قراءت کرتے ہیں اور سامعین اپنے کانوں سے اسے سنتے ہیں، لکھنے والے اسے لکھتے ہیں اور شائع کرنے والے اپنے آلات کے ساتھ اسے شائع کرتے ہیں، یہی قرآن حفاظِ کرام کے سینوں میں اپنے حروف اور معانی کے ساتھ محفوظ ہے، اللہ نے یہ کلام حقیقتاً فرمایا

ہے اور یہ اُس کا حقیقی کلام ہے غیر کا کلام نہیں، اُسی سے اس کی ابتدا ہوئی اور اسی کے پاس لوٹ جائے گا۔ وہ ایک نازل شدہ قرآن ہے، مخلوق نہیں ہے، جس طرح بھی اُس میں تصرف کیا جائے، قاری کی قراءت، الفاظ پڑھنے والے کے الفاظ، حافظ کا حفظ یا کاتب کا خط ہو، جہاں بھی اس کی تلاوت ہو، لکھا جائے یا پڑھا جائے۔

پھر جو شخص اس کو سننے کے بعد یہ سمجھے کہ یہ مخلوق ہے تو اس شخص نے کفر کیا (یعنی یہ شخص کافر ہے) اور اللہ نے موسیٰ (علیہ السلام) کے لئے آدم (علیہ السلام) کی پیدائش سے چالیس سال پہلے اپنے ہاتھ سے تورات لکھی جیسا کہ صحیح حدیث سے ثابت ہے۔

اللہ کے کلام کی تقسیم، حصص اور اجزاء ہو سکتے ہیں، پس قرآن اس کے کلام میں سے ہے، تورات اس کے کلام میں سے ہے اور انجیل اُس کے کلام میں سے ہے۔ قرآن تورات کے علاوہ ہے اور تورات انجیل کے علاوہ ہے۔ فاتحہ قرآن کا بعض ہے اور آیۃ الکرسی سورۃ البقرہ کا بعض ہے، سورۃ البقرہ سورۃ آل عمران کے علاوہ ہے اور اسی طرح اس کا سارا کلام ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مختلف لغات (زبانوں) میں کلام فرمایا لہٰذا تورات عبرانی زبان میں ہے، انجیل سریانی زبان میں ہے اور قرآن عربی زبان میں ہے۔ قرآن میں ایسے معانی ہیں جو تورات میں نہیں ہیں اور تورات میں ایسی باتیں ہیں جو قرآن میں نہیں ہیں اور اسی طرح اس کا سارا کلام ہے۔

اللہ تعالیٰ کے کلام میں بلحاظِ افضیلت درجے ہیں لہٰذا اُس کا بعض دوسرے بعض سے افضل ہے۔ دوسری آیات سے آیت الکرسی افضل ہے اور سورۂ فاتحہ جیسی سورت تورات اور انجیل میں نازل نہیں ہوئی اور نہ اس طرح دوسری کوئی سورت قرآن میں نازل ہوئی ہے، قل ھواللہ احد (سورۃ الاخلاص) ایک تہائی قرآن ہے۔

اللہ تعالیٰ کا کلام ایک دوسرے کے پیچھے آتا (یعنی باہم ترتیب کے ساتھ مربوط) ہے مثلاً بسم اللہ میں اللہ کا کلام بسم کے بعد ہے، سین باء کے بعد ہے اور میم سین کے بعد ہے۔ یہ سب اللہ کا کلام ہے، اپنے الفاظ اور حروف کے ساتھ مخلوق نہیں، مخلوق کے مشابہ نہیں ہے۔

(قرآن پڑھنے لکھنے کی حالت میں) بندوں کی آوازیں اور حرکات، مصحف کے ورقے، جلد اور لکھنے کی سیاہی یہ سب مخلوق ہیں اور پڑھے سنے لکھے جانے والے حروف اللہ کا کلام ہیں، اپنے حروف اور معانی کے لحاظ سے قرآن مخلوق نہیں۔

کلامُ اللہ کے بارے میں یہ سلف صالحین کا عقیدہ ہے۔

(العقیدۃ السلفیۃ فی کلام رب البریۃ وکشف اباطیل المبتدعۃ الردیۃ ص ۶۳۔۶۵ مترجماً ومفہوماً)

فرقہ اشعریہ کے امام ابوالحسن الاشعری رحمہ اللہ (متوفی ۳۲۴ھ) نے فرمایا:

''قرآن اللہ کا کلام ہے مخلوق نہیں ہے۔'' پھر انھوں نے اس پر کئی دلیلیں پیش کیں۔

دیکھئے الابانہ عن اصول الدیانہ (ص ۱۹۔۲۱)

تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں بعض مبتدعین نے حرف اور صوت کا صریح انکار کر کے نیا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ دیکھئے مجموع فتاویٰ (۵۷۹/۱۲)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جس شخص نے کتاب اللہ میں سے ایک حرف پڑھا تو اسے ایک نیکی ملے گی جو دس نیکیوں کے برابر ہوگی، میں یہ نہیں کہتا کہ الم ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ہے، لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے۔ (سنن الترمذی: ۲۹۱۰ وقال: ''ھذا حدیث حسن صحیح غریب'' وسندہ حسن)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قرآن سیکھو اور اس کی تلاوت کرو، تمھیں ہر حرف کے بدلے میں دس نیکیاں ملیں گی۔ الخ (المعجم الکبیر للطبرانی ۱۴۰/۹ ح ۸۶۴۹ وسندہ حسن)

سیدنا ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((فينادي بصوت : إن الله يأمرك ....)) پھر وہ (اللہ) صوت (آواز) سے ندا فرمائے گا: بے شک اللہ تجھے حکم دیتا ہے... (صحیح بخاری: ۷۴۸۳)

فائدہ: روایتِ مذکورہ کو اکثر راویوں نے معلوم (يُنَادِيْ) کے اعراب کے ساتھ پڑھا ہے۔ دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۲۵ ص ۱۵۴) اور فتح الباری (۴۶۰/۱۳)

یعنی جمہور راویوں کے نزدیک اس کا اعراب مجہول نہیں بلکہ معلوم (دال کی زیر) کے

ساتھ ہے۔

اس حدیث کی سند بالکل صحیح ہے، اسے امام بخاری نے اپنی مشہور کتاب ''الجامع الصحیح'' میں روایت کیا ہے جس کی صحت پر اُمت کا اتفاق ہے۔ اسی حدیث کے حوالے سے اس کے راوی امام محمد بن اسماعیل البخاری رحمہ اللہ نے فرمایا:

''وفي هذا دليل أن صوت الله لا يشبه أصوات الخلق ...''

اور اس میں دلیل ہے کہ اللہ کی آواز (صوت) مخلوق کی آوازوں سے مشابہ نہیں ہے۔

(خلق افعال العباد ص ۹۲ فقرہ: ۴۶۲)

حدیثِ مذکور کی تشریح میں مولانا محمد داود راز دہلوی رحمہ اللہ نے فرمایا:

''یہاں سے اللہ کے کلام میں آواز ثابت ہوئی اور ان نادانوں کا رد ہوا جو کہتے ہیں کہ اللہ کے کلام میں نہ آواز ہے نہ حروف ہیں۔ معاذ اللہ اللہ کے لفظوں کو کہتے ہیں: یہ اللہ کے کلام نہیں ہیں کیونکہ الفاظ اور حروف اور اصوات سب حادث ہیں۔ امام احمد نے فرمایا کہ یہ کم بخت لفظیہ جہمیہ سے بدتر ہیں۔'' (شرح صحیح بخاری ج ۸ ص ۵۹۲ مطبوعہ قدوسیہ لاہور)

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے فرمایا: جی ہاں! تیرے رب نے صوت (سُنی جانے والی آواز) کے ساتھ کلام فرمایا: الخ (کتاب السنہ ج ۱ ص ۲۸۰ رقم ۵۳۳)

مزید عرض ہے کہ امام ابوبکر المروزی رحمہ اللہ نے فرمایا:

(امام) ابو عبداللہ (احمد بن حنبل رحمہ اللہ) سے کہا گیا: عبدالوہاب (رحمہ اللہ) نے کہا: جو شخص کہتا ہے کہ اللہ نے موسیٰ (علیہ السلام) سے بغیر صوت (آواز) کے کلام کیا تو وہ جہمی ہے، اللہ اور اسلام کا دشمن ہے۔ (امام احمد) ابو عبداللہ نے مسکرا کر فرمایا: اس (عبدالوہاب) کا یہ قول کتنا بہترین ہے، اللہ اُسے عافیت میں رکھے۔

(السنہ للخلال بحوالہ درء تعارض العقل والنقل ج ۱ ص ۲۶۰ وسندہ صحیح، مطبوعہ: دار الحدیث القاہرہ/مصر)

حافظ ابو نصر عبیداللہ بن سعید بن حاتم بن احمد السجزی الوائلی رحمہ اللہ (متوفی ۴۴۴ھ) نے اپنے مشہور رسالے میں فرمایا: اس پر اتفاق ہے کہ کلام حرف اور صوت ہوتا ہے۔

(درء تعارض العقل والنقل لابن تیمیہ ۲۷۹/۱)

السجزی نے فرمایا: قرآنِ عربی حروف ہیں... اور اللہ کی صوت (آواز) میں مخلوق سے کوئی تشبیہ نہیں ہے جس طرح کہ اُس کی صفت کلام مخلوق سے مشابہ نہیں ہے۔ حافظ السجزی رحمہ اللہ نے مزید فرمایا: ''و أما نحن فنقول : كلام الله حرف و صوت بحكم النص'' اور ہم تو یہ کہتے ہیں کہ اللہ کا کلام حرف اور صوت (آواز) ہے جیسا کہ نص سے ثابت ہے۔

(الابانہ فی مسألۃ القرآن للسجزی بحوالہ درء تعارض العقل والنقل ۳۸۳/۱)

فائدہ: شیخ السنۃ ابونصر السجزی الوائلی رحمہ اللہ کو بعض حنفی علماء نے اپنے ''حنفی'' علماء میں ذکر کیا ہے۔ دیکھئے الجواہر المضیہ (۳۳۸/۱ ت ۹۲۳) اور تاج التراجم (ص ۲۰۱ ت ۱۵۶)

حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن القیم اور علمائے اہلِ سنت کا جو رد زاہد الکوثری نے ''تعلیقات السیف الصقیل'' وغیرہ میں کیا ہے وہ مردود ہے۔ کوثری بذاتِ خود جہمی (بدعتی، غیر سُنی) اور مجروح تھا جیسا کہ اس کی تصانیف اور تحریروں سے ثابت ہے۔ فی الحال دس (۱۰) دلیلیں پیشِ خدمت ہیں جن سے کوثری مذکور کا مجروح اور ساقط العدالت ہونا ثابت ہوتا ہے:

۱: امام ابوالشیخ الاصبہانی رحمہ اللہ کے بارے میں کوثری نے کہا:

''و قد ضعفه بلديه الحافظ العسال بحق'' اور یقیناً اس کے ہم وطن حافظ عسال نے اُسے ضعیف قرار دیا ہے جو کہ حق ہے۔ (تأنیب الخطیب ص ۴۹)

نیز دیکھئے تأنیب الخطیب للکوثری (ص ۱۴۱)

ابوالشیخ مذکور کی تضعیف حافظ العسال سے ثابت نہیں ہے لہٰذا کوثری نے اُن پر جھوٹ بولا ہے۔ یہ تضعیف نہ تو حافظ ابو احمد العسال کی کسی کتاب میں ہے اور نہ اسماء الرجال کی کسی کتاب میں اُسے بحوالہ عسال مذکور نقل کیا گیا ہے۔

۲: شیخ سلیمان الصنیع رکن مجلس الشوریٰ بمکہ نے کوثری کے بارے میں گواہی دی:

''والذي يظهر لي أن الرجل يرتجل الكذب و يغالط ...''

اور میرے سامنے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آدمی فی البدیہہ جھوٹ بولتا ہے اور مغالطے دیتا ہے۔

(حاشیہ طلیعہ التنکیل بمافی تأنیب الکوثری من الاباطیل ج ا ص ۳۱ وسندہ قوی)

۳: حسام الدین القدسی نے کوثری پر جرح کی اور کہا: ’’ **فیخلق لهم من المحاسن و الدفاع ...** ‘‘ پس وہ ان لوگوں کی خوبیاں اور دفاع گھڑتا ہے۔

(دیکھئے مقدمۃ الانتقاء لابن عبدالبر ص ۳)

۴: امام عبدالرحمٰن بن یحییٰ المعلمی رحمہ اللہ نے کوثری پر جرح کی اور حق کا دفاع کیا۔
دیکھئے التنکیل بمافی تأنیب الکوثری من الاباطیل للیمانی رحمہ اللہ

۵: احمد بن محمد بن الصدیق الغماری نے کوثری کے بارے میں کہا: ’’ **و أنه شیطان** ‘‘ اور بے شک وہ شیطان ہے۔ (بیان تلبیس المفتری محمد زاہد الکوثری ص ۱۲۴)

اور کہا: ’’ **هذا الدجال** ‘‘ یہ دجال (بیان تلبیس المفتری ص ۱۳۹)

۶: شیخ محمد ناصر الدین الالبانی رحمہ اللہ نے کہا: کیونکہ کوثری اپنے بہت سے حوالوں میں قابلِ اعتماد نہیں، وہ تدلیس کرتا تھا۔ (سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ ۸/۳۶۱ ح ۳۸۹۷)

علامہ البانی نے کوثری کو اہلِ سنت اور اہلِ حدیث کا شدید دشمن قرار دیا ہے۔
دیکھئے سلسلۃ الاحادیث الصحیحہ (۶/۲/۱۲۷ ح ۳۰۰۰)

اور نقلِ روایت میں غیر امین (یعنی ضعیف اور ساقط العدالت) قرار دیا۔ (الضعیفۃ ۱/۴۴ ح ۲۵)

علامہ البانی نے کہا: ’’ **فإنه علىٰ سعة اطلاعه و علمه مدلس صاحب هوى** ‘‘ بے شک وہ (کوثری) وسعتِ علم اور اطلاع کے باوجود مدلس اور بدعتی ہے۔

(الضعیفۃ ۳/۳۵۶ ح ۱۲۱۱)

۷: شیخ عبدالمحسن العباد کے صاحبزادے عبدالرزاق المدنی حفظہ اللہ نے کہا:
محمد زاہد کوثری ہمارے زمانے میں جہمیت کا قائد ہے۔

(القول السدید فی الرد علی من أنکر تقسیم التوحید، مقدمہ ص ۱۴، بحوالہ المکتبۃ الشاملۃ)

۸: محمد بہجۃ البیطار علامۃ الشام (متوفی ۱۳۹۶ھ) نے کہا:
’’ **الكوثري المحرّف لآيات الكتاب المجيد** ‘‘ قرآن کی آیات کا محرف: کوثری

(الکوثری وتعلیقاتہ ص ۸ بحوالہ الشاملہ)

اور اسے تاریخ میں جھوٹ کو مباح سمجھنے والا قرار دیا۔ (ایضاً ص ۱۳)

۹: شیخ دکتور شمس الدین الافغانی رحمہ اللہ نے فرمایا: "الکوثري أحد أئمة القبورية و رافع لواء الجهمية ... "کوثری قبر پرستوں کے اماموں میں سے ایک اور جہمیت کے جھنڈے کو اُٹھانے والا۔ (جھود علماء الحنفیہ فی ابطال عقائد القبوریہ ج ا ص ۴۶۰، ۴۶۱)

۱۰: میں نے شیخ ابو محمد بدیع الدین الراشدی السندھی رحمہ اللہ کو فرماتے ہوئے سنا: "خرافي يكذب "یعنی کوثری خرافات بیان کرنے والا، جھوٹ بولتا تھا۔

(انوار السبیل فی میزان الجرح والتعدیل ص ۷۵)

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی دلیلیں ہیں مثلاً کوثری نے صحابہ کرام اور ائمہ مسلمین کو اپنی تنقید و تنقیص کا نشانہ بنایا ہے جس کی تفصیل "التنکیل" وغیرہ کتابوں میں ہے۔ تعلیقات السیف الصقیل میں عزالدین بن عبدالسلام وغیرہ کے اقوال کئی وجہ سے مردود ہیں:

اول: کوثری بذاتِ خود غیر ثقہ اور ضعیف تھا۔

دوم: اگر یہ اقوال ثابت بھی ہوتے تو جمہور اہل سنت کے مقابلے میں باطل ہیں۔

سوم: العز بن عبدالسلام کا قول اگر ثابت ہو: قرآن نہ حروف ہیں اور نہ اصوات۔

(دیکھئے مقالات الکوثری: بدعۃ الصوتیہ حول القرآن ص ۲۹)

تو صحیح احادیث اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ وغیرہ کے اقوال کے خلاف ہونے کی وجہ سے غلط اور مردود ہے۔

فائدہ: مملوک خلفاء کے مقابلے میں عبدالعزیز بن عبدالسلام الدمشقی الشافعی المعروف العز بن عبدالسلام کا انتہائی بہترین موقف تھا، تاہم شیخ قطب الدین نے ذیل مرآۃ الزمان میں لکھا ہے: " كان رحمه الله مع شدته فيه حسن محاضرة بالنوادر و الأشعار و كان يحضر السماع و يرقص و يتواجد "آپ پر اللہ رحم کرے آپ اپنی شدت کے باوجود نادر حقایات اور اشعار پر بہترین استحضار رکھتے تھے، آپ سماع

(قوالی) کی محفلوں میں حاضر ہوتے، رقص کرتے (ناچتے) اور وجد میں آتے تھے۔

(دیکھئے تاریخ الاسلام للذہبی ج ۴۸ ص ۴۱۹ وفیات ۶۶۰ ھ)

رقص وسماع کی ممانعت پر حافظ شیخ ابومحمد محمود بن ابی القاسم بن بدران الدشتی الحنفی رحمہ اللہ (متوفی ۵۶۶ ھ) نے ایک عظیم الشان کتاب: ''النهي عن الرقص والسماع'' لکھی ہے جو ۹۱۵ صفحات میں دارالسنۃ (الریاض، سعودی عرب) سے دو جلدوں میں چھپ چکی ہے۔ اس کتاب میں شیخ ابن بدران نے فرمایا: یہ گروہ جو سمجھتا ہے کہ رقص، گانے سننا اور بانسریاں بجانا اچھا کام ہے، یہ لوگ اللہ کی لعنت کے مستحق ہیں۔ الخ

(النہی عن الرقص والسماع ج ۱ ص ۴۴۱)

تنبیہ: کوثری جس علم کلام کی باتیں کرتا تھا، ایسے کلام کے بارے میں امام ابوعبداللہ محمد بن ادریس الشافعی رحمہ اللہ نے فرمایا: '' لأن يبتلى العبد بكل مانهى اللّٰهُ عنه - سوى الشرك - خير له من الكلام ولقد اطلعت من أصحاب الكلام علىٰ شيءٍ ما ظننت أن مسلمًا يقول ذلك . '' اگر آدمی شرک کے علاوہ ہر ممنوع کام میں مبتلا ہو جائے، وہ اس کے لئے علمِ کلام سے بہتر ہے اور میں نے ان اصحابِ کلام کی ایسی چیزیں دیکھی ہیں، میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مسلمان ایسی بات کہہ سکتا ہے۔

(آداب الشافعی ومناقبہ لابن ابی حاتم ص ۱۳۷، وسندہ صحیح)

انور شاہ کشمیری دیوبندی کا کہنا کہ ''جس نے خدا کو متکلم بالصوت والحروف کہا اُس نے خدا کے لئے جسمیت ثابت کی جو کفر ہے۔'' کئی وجہ سے مردود اور باطل ہے:

اول: حروف اور صوت کا ذکر احادیثِ صحیحہ اور آثارِ صحابہ وغیرہ سے ثابت ہے۔ (کما تقدم) کیا یہ جسمیت کے قائل تھے؟!

دوم: امام احمد بن حنبل وغیرہ حروف واصوات کے قائل تھے۔ کیا یہ مجسمہ میں سے تھے؟

سوم: سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے کوہِ طور کے پاس اللہ تعالیٰ کا کلام سنا تھا یا نہیں؟ اگر سُنا تھا تو تم اپنے باطل دعویٰ اور اصول کی رُو سے جسمیت کے قائل ہو۔ اگر نہیں سُنا تھا تو قرآن کے منکر

ہو، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَ لَمَّا جَآءَ مُوۡسٰی لِمِیۡقَاتِنَا وَ کَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ﴾ اور جب پہنچا موسیٰ ہمارے وقت پر، اور کلام کیا اس سے اس کے رب نے۔

(الاعراف: ۱۴۳، ترجمہ عبدالقادر دہلوی ص ۲۰۲)

اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ اللہ کے کلام کو حرف اور صوت ماننا جسمیت ثابت کرنا نہیں ہے بلکہ اس ایمان کا اعلان اور اظہار ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ مخلوق نہیں ہے اور یہی قرآن من وعن اپنے تمام حروف کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے روح الامین سیدنا جبریل علیہ السلام کے ذریعے سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا، یہ اللہ کی صفتِ کلام اور صفتِ علم ہے اور صفات باری تعالیٰ مخلوق نہیں ہیں بلکہ صفت الرب کو مخلوق سمجھنے والا کافر ہے۔

صفتِ کلام کے بارے میں سلف صالحین کے عقیدے اور منہج کے بعض حوالے اس مضمون میں سابقہ صفحات پر گزر چکے ہیں۔

احمد رضا بجنوری دیوبندی (مجروح) نے انور شاہ کاشمیری دیوبندی سے نقل کیا:

''حافظ ابن تیمیہ نے کہا: ''عرش قدیم ہے'' (ملفوظات کشمیری ص ۲۰۳)

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی طرف منسوب یہ قول کئی وجہ سے باطل اور مردود ہے:

اول: یہ قول حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کسی کتاب میں لکھا ہوا نہیں ہے۔

دوم: شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا: ''.... أن العرش مخلوق أیضًا ''
...بے شک عرش بھی مخلوق ہے۔ (مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ ج ۱۸ ص ۲۱۴)

سوم: انور شاہ کشمیری دیوبندی نے اس کی کوئی صحیح دلیل یا حوالہ پیش نہیں کیا۔

چہارم: احمد رضا بجنوری بذاتِ خود مجروح تھا، اس کی چار دلیلیں پیشِ خدمت ہیں:

۱: بجنوری نے نقل کرتے ہوئے کہا: ''ابن تیمیہ نے ''کنزولی ھذا ''سے تشریح کر کے بدعت قائم کر دی ہے۔'' (ملفوظات ص ۲۴۳)

حالانکہ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ''کنزولی ھذا ''کے الفاظ قطعاً نہیں کہے بلکہ انھوں نے فرمایا: '' و کذلك نعلم معنی النزول ولا نعلم کیفیته ''اور اسی طرح ہم نزول

کا معنی جانتے ہیں اور اس کی کیفیت کو نہیں جانتے۔ (شرح حدیث النزول ص ۴۲)

عبارتِ مذکورہ بالا کا جس نے بھی حافظ ابن تیمیہ کی طرف انتساب کیا ہے، اُس نے جھوٹ بولا ہے۔

۲: بجنوری نے کہا: ''فتح الباری ۱۳۹/۷ میں بھی حدیثِ نزول وصلوٰۃِ بیت اللحم نسائی، بزار وطبرانی کے حوالے سے ذکر ہوئی ہے، مگر کچھ ابہام کے ساتھ، اور غالباً اسی سے علامہ ابن القیم نے غلط فائدہ اٹھایا ہے، واللہ اعلم۔'' (ملفوظات ص ۱۸۳)

عرض ہے کہ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ ۷۵۱ھ میں فوت ہوئے اور حافظ ابن حجر العسقلانی ۷۷۳ میں پیدا ہوئے تھے تو اپنی وفات کے بعد پیدا ہونے والے کی کتاب فتح الباری سے کس طرح ابن القیم نے غلط فائدہ اُٹھایا تھا؟

بجنوری نے تو جھوٹ کا ''لک'' توڑ دیا ہے۔

تنبیہ: حوالۂ مذکورہ کے سیاق وسباق سے صاف ظاہر ہے کہ اس میں حدیث سے فائدہ اُٹھانا مراد نہیں بلکہ فتح الباری سے ''غلط فائدہ'' اُٹھانا مراد ہے۔

۳: بجنوری نے امام بخاری رحمہ اللہ کے بارے میں کہا: ''زیادہ تحقیقی بات یہ ہے کہ امام بخاری کو پہلی بار بخارا سے مسئلہ حرمت رضاع بلبن شاۃ کی وجہ سے نکلنا پڑا...''

(ملفوظات کشمیری ص ۱۵۶)

بجنوری کی یہ بات بالکل جھوٹ ہے اور یہ وہ جھوٹا قصہ ہے جسے بعض بے سند حنفیوں نے گھڑ کر اپنے مقلدین میں مشہور کر دیا تھا۔ عبدالحئی لکھنوی تقلیدی نے بھی اس قصے کا بعید از صحت ہونا تسلیم کیا۔ دیکھئے الفوائد البہیہ (ص ۲۹، ترجمہ احمد بن حفص البخاری)

ہم پوچھتے ہیں کہ اس بے سند جھوٹے قصے کی ''صحیح متصل'' سند کہاں ہے؟

اس جھوٹے قصے کا خلاصہ یہ ہے کہ بجنوری وغیرہ کے نزدیک امام بخاری رحمہ اللہ اس بات کے قائل تھے کہ اگر بچہ اور بچی کسی ایک گائے کا دودھ پی لیں تو رضاعت ثابت ہو جاتی ہے۔!! حالانکہ ایسی باطل بات کا قائل کوئی صاحبِ علم نہیں، کجا یہ کہ امیر المومنین فی الحدیث

اور امام الدنیا فی فقہ الحدیث امام بخاری ایسی بات کے قائل ہوں۔!!

جو لوگ امام بخاری رحمہ اللہ پر جھوٹ بولنے سے شرم و حیا نہیں کرتے، وہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ وغیرہ پر کتنا جھوٹ بولتے ہوں گے۔؟!

۴: بجنوری نے لکھا ہے: ''تقلید شخصی ضروری ہے'' (ملفوظات ص ۲۲۳)

عرض ہے کہ کتاب اللہ، سنت اور اجماع سے تقلید شخصی کا ضروری ہونا ہرگز ثابت نہیں بلکہ سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''اگر وہ (عالم) سیدھے راستے پر بھی (جارہا) ہو تو اپنے دین میں اس کی تقلید نہ کرو'' الخ

(کتاب الزہد للامام وکیع ج ۱ ص ۲۹۹، ۳۰۰ ح ۷۱ وسندہ حسن، دین میں تقلید کا مسئلہ ص ۳۶)

اشرفعلی تھانوی دیوبندی نے کہا: ''مگر تقلید شخصی پر تو کبھی اجماع بھی نہیں ہوا...''

(تذکرۃ الرشید ج ۱ ص ۱۳۱)

محمد تقی عثمانی دیوبندی نے تقلید شخصی کے بارے میں کہا:

''یہ کوئی شرعی حکم نہیں تھا، بلکہ ایک انتظامی فتویٰ تھا'' (تقلید کی شرعی حیثیت ص ۶۵)

معلوم ہوا کہ احمد رضا بجنوری ایک مجروح شخص تھا اور بس (!) لہٰذا ایسے شخص کی نقل اور روایت مردود ہوتی ہے۔

استواء کا معنی جلوس کرنا حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے ثابت نہیں ہے۔

حافظ ابن تیمیہ کا یہ عقیدہ ہرگز نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے عرش پر بیٹھا ہوا ہے۔ آپ کی کسی کتاب میں **جلس علی العرش** یا **جلوسه علی العرش** وغیرہ قسم کی کوئی عبارت موجود نہیں ہے بلکہ آپ کا یہ عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ حقیقتاً اپنے عرش پر مستوی ہے بغیر کیفیت اور تشبیہ کے۔ دیکھئے مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ (۳/ ۲۱۷)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے الامام العارف معمر بن احمد الاصبہانی رحمہ اللہ سے نقل کیا کہ ''**و إن اللّٰه استوی علی عرشه بلا کیف و لا تشبیه و لا تأویل والاستواء معقول و الکیف فیه مجهول و أنه عزوجل [مستوٍ علی عرشه]**

بائن من خلقه و الخلق بائنون منه ، بلا حلول ... ''اور بے شک اللہ اپنے عرش پر مستوی ہوا، بغیر کیفیت ،تشبیہ اور تاویل کے، استواء معقول ہے اور کیفیت مجہول ہے اور بے شک وہ اپنے عرش پر مستوی ہے۔عزوجل، اپنی مخلوقات سے جدا ہے اور مخلوق اس سے جدا ہے، بغیر حلول کے... (الاستقامہ لابن تیمیہ ج ۱ ص ۱۶۸)

معلوم ہوا کہ جلوس کے لفظ کی نسبت حافظ ابن تیمیہ پر افتراء ہے۔ رہا مسئلہ عرش پر اللہ تعالیٰ کا مستوی ہونا تو یہ قرآن، حدیث اور اجماع سلف صالحین سے ثابت ہے۔

مشہور مفسرِ قرآن امام مجاہد (تابعی) رحمہ اللہ نے استوی کی تفسیر میں فرمایا:

'' علا علی العرش ''عرش پر بلند ہوا۔

(صحیح بخاری مع فتح الباری ۱۳/ ۴۰۳ قبل ح ۷۴۱۸، تفسیر الفریابی بحوالہ تغلیق التعلیق ۵/ ۳۴۵)

تنبیہ: روایتِ مذکورہ میں عبداللہ بن ابی نجیح مدلس تھے لیکن صحیحین میں مدلسین کی روایات سماع پر محمول ہیں لہٰذا یہاں تدلیس کا اعتراض صحیح نہیں ہے۔

نیز دیکھئے تفسیر ابن کثیر (نسخہ محققہ دار عالم الکتب ج ۶ ص ۳۱۹)

فائدہ: آج کل بہت سے دیوبندیوں نے کلبی (کذاب) کی روایت کردہ تفسیر ابن عباس کو سینے سے لگا رکھا ہے، حالانکہ اس من گھڑت تفسیر میں استوی کا مفہوم: '' استقر '' لکھا ہوا ہے۔ دیکھئے تنویر المقباس (ص ۱۰۳)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے استوی کی تشریح میں استقر اور ظہر وغیرہ اقوال ذکر کر کے فرمایا: حسن (بصری کا قول: علا، ارتفع) اور (امام) مالک (المدنی کا قول: استواء معلوم اور کیفیت مجہول) سب سے بہترین جواب ہے۔ دیکھئے مجموع فتاویٰ (ج ۵ ص ۵۱۹، ۵۲۰)

استویٰ کا معنی ومفہوم ''استولیٰ'' کسی ایک صحابی، تابعی، تبع تابعی یا مستند امام سے ثابت نہیں ہے، رہے ماتریدیہ اور کلابیہ وغیرہ تو سلف صالحین کے خلاف اُن کے افعال و اقوال کا کوئی اعتبار نہیں بلکہ سرے سے مردود ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کا عرش پر مستوی ہونا قرآن، حدیث، اجماع اور آثار سے ثابت

ہے۔اس عظیم الشان عقیدے کے تفصیلی دلائل کے لئے حافظ ذہبی کی عظیم الشان اور شہرۂ آفاق کتاب " العلو للعلي الغفار " کا مطالعہ کریں جو کہ دو بڑی جلدوں میں عبداللہ بن صالح البراک کی تحقیق کے ساتھ چھپ چکی ہے، جو ۱۶۴۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ والحمد للہ

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ قرآنِ مجید کے کلام اللہ ہونے اور اللہ تعالیٰ کے اپنے عرش پر مستوی ہونے کے صحیح عقیدوں کی وجہ سے حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ وغیرہ پر کشمیری اور بجنوری وغیرہما کا تنقید کرنا غلط اور باطل ہے۔

کشمیری کا شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کو دار التقلید (مدرسۂ دیوبند) میں داخل نہ ہونے دینا، ابن تیمیہ کے لئے نقصان کی کوئی بات نہیں ہے کیونکہ وہ تو دنیا سے تشریف لے جا چکے ہیں اور ملا علی قاری حنفی کی تصریح کے ساتھ اولیائے اُمت میں سے تھے۔

دیکھئے جمع الوسائل فی شرح الشمائل (۲۰۷/۱) اور ماہنامہ الحدیث حضرو (عدد ۵۸ ص ۱۳)

اولیاء اللہ کا موت کے بعد مقام جنت ہے، نہ کہ مدرسۂ دیوبند جو کہ بستی کی غلاظتوں کے ڈھیر اور کوڑے کرکٹ کی جگہ پر تعمیر کیا گیا۔ دیکھئے فخر العلماء (تصنیف اشتیاق اظہر ص ۶۴) مبشرات دار العلوم (ص ۲۷ تصنیف انوار الحسن ہاشمی) اور علماء ہند کا شاندار ماضی (ج ۵ ص ۶۴) اور جو بتوں کی عبادت کرنے والے ہندوؤں میں گھرا ہوا ہے۔ مدرسۂ دیوبند میں اندھی تقلید، ابن عربی اور حسین بن منصور الحلاج کے تصوف، باطل تاویلات وتحریفات اور بدعات و ضلالات کے سوا کیا ہے کہ اولیاء الرحمٰن اُس کا دورہ کریں اور تقلیدی حضرات اُن پر پابندیاں لگاتے پھریں۔ سبحان اللہ! وما علینا إلا البلاغ (۲۹/ مارچ ۲۰۰۹ء)

کیا اللہ تعالیٰ مومن کے دل میں سما سکتا ہے؟

سوال کیا کوئی ایسی حدیث ہے جس کا مفہوم یہ ہو: " اللہ تعالیٰ کسی چیز میں نہیں سما سکتا سوائے مومن کے دل کے۔" (ابو حمید الساعدی عبدالصمد الرفیقی)

الجواب تلاشِ بسیار کے باوجود مجھے یہ روایت، حدیث کی کسی کتاب میں نہیں ملی۔ اسماعیل بن محمد العجلونی الجراحی (متوفی ۱۱۶۲ھ) کی کتاب " کشف الخفاء ومزیل

الألباس عما اشتهر من الأحاديث على ألسنة النّاس "(ج ۲ ص ۱۹۵ ح ۲۲۰۶) میں اس مفہوم کی بعض مرویات کا تذکرہ موجود ہے۔ صاحبِ کتاب نے امام عراقی وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ یہ روایت بے اصل ہے۔ نیز دیکھئے "ضعیف اور موضوع روایات" ج ۱ ص ۷۷ تصنیف: مولانا محمد یحییٰ گوندلوی حفظہ اللہ (رحمہ اللہ) [الحدیث:۹]

وحدت الوجود کیا ہے؟ اور اس کا شرعی حکم

سوال میں آپ کے مؤقر اسلامی جریدے ماہنامہ "الحدیث" کا مستقل قاری ہوں۔ آپ جس محنت اور عرق ریزی سے مسائل کی تحقیق و تنقیح فرماتے ہیں، اس سے دل کو اطمینان و سرور حاصل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے زورِ قلم کو اور بھی بڑھادے۔

دو سوالات پوچھنا چاہتا ہوں، اُمید ہے کہ آپ ان کی تحقیق و تخریج اور تنقیح فرمائیں گے۔

(پہلا سوال یہ ہے کہ) فلسفۂ وحدت الوجود کیا ہے؟ اس کی مکمل تفصیل اور تنقیح فرمائیں۔

والسلام: آپ کا دینی بھائی (محمد شیر وزیر۔ پی سی ایس آئی آر لیبارٹریز، پشاور)

[تنبیہ: دوسرا سوال مع جواب آگے آرہا ہے۔ ان شاء اللہ]

الجواب اردو لغت کی ایک مشہور کتاب میں وحدت الوجود کا مطلب اِن الفاظ میں لکھا ہوا ہے:

"تمام موجودات کو اللہ تعالیٰ کا وجود خیال کرنا۔ اور وجود ماسویٰ کو محض اعتباری سمجھنا جیسے قطرہ، حباب، موج اور قعر وغیرہ سب کو پانی معلوم کرنا" (حسن اللغات فارسی اردو ص ۹۴۱)

وارث سرہندی کہتے ہیں: "صوفیوں کی اصطلاح میں تمام موجودات کو خدا تعالیٰ کا وجود ماننا اور ماسوا کے وجود کو محض اعتباری سمجھنا" (علمی اردو لغت ص ۱۵۵۱)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وأما الإتحاد المطلق الذي هو قول أهل وحدة الوجود الذين يزعمون أن وجود المخلوق هو عين وجود الخالق"

اور اتحادِ مطلق اسے کہتے ہیں جو وحدت الوجود والوں کا قول ہے: جو سمجھتے ہیں کہ مخلوق کا وجود عین خالق کا وجود ہے۔ (مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ ج ۱۰ ص ۵۹)

حافظ ابن تیمیہ دوسرے مقام پر لکھتے ہیں: ''فإن صاحب هذا الكتاب المذكور الذي هو (فصوص الحكم) و أمثاله مثل صاحبه القونوي والتلمساني وابن سبعين والششتري وابن الفارض وأتباعهم ، مذهبهم الذي هم عليه أن الوجود واحد و يسمون أهل وحدة الوجود ويدعون التحقيق والعرفان وهم يجعلون وجود الخالق عين وجود المخلوقات ''

کتاب مذکور جو فصوص الحکم ہے، کا مصنف اور اس جیسے دوسرے مثلاً قونوی، تلمسانی، ابن سبعین، ششتری، ابن فارض اور ان کے پیروکار، ان کا مذہب یہ ہے کہ وجود ایک ہے۔ انھیں وحدت الوجود والے کہا جاتا ہے اور وہ تحقیق وعرفان کا دعویٰ رکھتے ہیں اور یہ لوگ خالق کے وجود کو مخلوقات کے وجود کا عین قرار دیتے ہیں۔ (مجموع فتاویٰ ج ۲ ص ۱۲۳، ۱۲۴)

حافظ ابن حجر العسقلانی نے فرمایا: ''المراد بتوحيد الله تعالىٰ الشهادة بأنه إله واحد وهذا الذي يسميه بعض غلاة الصوفية توحيد العامة، وقد ادعى طائفتان في تفسير التوحيد أمرين اخترعوهما أحدهما: تفسير المعتزلة كما تقدم ، ثانيهما: غلاة الصوفية فإن أكابرهم لما تكلموا في مسئلة المحو و الفناء و كان مراد هم بذلك المبالغة في الرضا والتسليم وتفويض الأمر ، بالغ بعضهم حتى ضاهى المرجئة في نفي نسبة الفعل إلى العبد ، وجرّ ذلك بعضهم إلىٰ معذرة العصاة ثم غلا بعضهم فعذر الكفار ثم غلا بعضهم فزعم أن المراد بالتوحيد اعتقاد وحدة الوجود ... ''

اللہ تعالیٰ کی توحید سے مراد اس بات کی گواہی دینا ہے کہ وہی ایک الٰہ ہے اور اسے بعض غالی صوفی: عوام کی توحید کہتے ہیں۔ دو گروہوں نے توحید کی تشریح میں دو باتیں گھڑی ہیں: ایک معتزلہ کی تفسیر جیسا کہ گزر چکا ہے۔ دوسرے غالی صوفی جن کے اکابر نے جب محو وفناء کے مسئلے میں کلام کیا اور ان کی اس سے مراد تسلیم ورضا اور معاملات کو اللہ کے سپرد کرنے میں مبالغہ تھا، ان میں سے بعض نے مبالغہ کر کے بندے سے نسبتِ فعل کی نفی کر کے مرجئہ سے

برابری کی اور اس بات نے بعض کو گناہ گاروں کے معذور ہونے پر آمادہ کرلیا پھر بعض نے غلو کر کے کفار کو بھی معذور قرار دیا پھر بعض نے غلو کر کے یہ دعویٰ کیا کہ توحید سے مراد وحدت الوجود کا عقیدہ ہے..... (فتح الباری ج ۱۳ ص ۳۴۸ کتاب التوحید باب:۱)

معلوم ہوا کہ ابن حجر کے نزدیک وحدۃ الوجود کا عقیدہ رکھنے والے بے حد غالی صوفی ہیں۔

ایک پیر نے اپنے مرید سے کہا: " **اعتقد أن جميع الأشياء باعتبار باطنها متحد مع الله تعالىٰ و باعتبار ظاهرها مغاير له وسواه** "

یہ عقیدہ رکھو کہ تمام چیزیں باطنی لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ متحد ہیں اور ظاہری لحاظ سے اس کے علاوہ اور اس کا مغائر (غیر) ہیں۔

اس کے بارے میں ملا علی قاری حنفی نے کہا: " **هذا كلام ظاهر الفساد مائل إلى وحدة الوجود أو الإتحاد كما هو مذهب أهل الإلحاد** "

اس کلام کا فاسد ہونا ظاہر ہے، یہ وحدت الوجود یا اتحاد کی طرف مائل ہے جیسا کہ ملحدین کا مذہب ہے۔ (الرد علی القائلین بوحدۃ الوجود لملا علی قاری ص ۱۳، مطبوعہ دار المامون للتراث دمشق، الشام)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے وحدت الوجود کے رد پر ایک رسالہ بنام " **إبطال وحدة الوجود والرد على القائلين بها** " لکھا ہے جو تقریباً ایک سو اٹھائیس (۱۲۸) صفحات پر مشتمل ہے، جسے کویت کے ایک مکتبے نے فہرست اور تحقیق کے ساتھ شائع کیا ہے۔

ابن عربی (الحلولی) کی طرف منسوب کتاب فصوص الحکم میں لکھا ہوا ہے:

" **فأنت عبد وأنت رب لمن له فيه أنت عبد** "

[بس تو بندہ ہے اور تُو رب ہے۔ "کس کا بندہ! اس کا بندہ جس میں تو فنا ہو گیا ہے۔"]

(فصوص الحکم اردو ص ۱۵۷ فص حکمت علیہ فی کلمۃ اسماعیلیۃ، مترجم عبدالقدیر صدیقی، دوسرا نسخہ ص ۷۷ مع شرح الجامی ص ۲۰۲، تنبیہ الغبی الی تکفیر ابن عربی للامام العلامۃ المحدث برہان الدین البقاعی رحمہ اللہ ص ۱۷)

کتب لغت اور علماء کے ان چند حوالوں سے معلوم ہوا کہ ابن عربی (اور حسین بن منصور الحلاج) کے مقلدین کے عقیدے وحدت الوجود سے خالق اور مخلوق کا ایک ہونا، حلولیت

اور اتحاد ظاہر ہے یعنی ان لوگوں کے نزدیک بندہ خدا اور خدا بندہ ہے۔ اب آپ کے سامنے وحدت الوجود کا عقیدہ رکھنے والوں کی دس عبارتیں پیشِ خدمت ہیں جن سے درج بالا نتیجے کی تصدیق ہوتی ہے:

① تھانہ بھون کے حاجی امداد اللہ ولد حافظ محمد امین ولد شیخ بڈھا تھانوی عرف مہاجر مکی نے لکھا ہے: ''اور اس کے بعد اس کو ہو ہو کے ذکر میں اسقدر منہمک ہو جانا چاہئے کہ خود مذکور یعنی (اللہ) ہو جائے اور فنا در فنا کے یہی معنی ہیں اس حالت کے حاصل ہو جانے پر وہ سراپا نور ہو جائے گا۔'' (کلیاتِ امدادیہ ص ۱۸، ضیاء القلوب)

تنبیہ: بریکٹ میں اللہ کا لفظ اسی طرح کلیاتِ امدادیہ میں لکھا ہوا ہے۔!

② حاجی امداد اللہ صاحب ایک آیت: ﴿وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ﴾ (الذاریات:۲۱) کا غلط ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خدا تم میں ہے کیا تم نہیں دیکھتے ہو۔'' (کلیاتِ امدادیہ ص ۳۱، ضیاء القلوب)

تنبیہ: آیتِ مذکورہ کا ترجمہ کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ الدہلوی لکھتے ہیں:

''ودر ذاتِ شما نشانہا ست آیا نمی نگرید'' (ترجمہ شاہ ولی اللہ ص ۶۲۷)

یعنی اور تمھاری ذات میں نشانیاں ہیں کیا تم نہیں دیکھتے؟

شاہ ولی اللہ کے ترجمے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اس آیت سے پہلی آیت میں آیات یعنی نشانیوں کا لفظ آیا ہے۔

③ حاجی امداد اللہ تھانہ بھونوی صاحب مزید لکھتے ہیں:

''اس مرتبہ میں خدا کا خلیفہ ہو کر لوگوں کو اس تک پہونچاتا ہے اور ظاہر میں بندہ اور باطن میں خدا ہو جاتا ہے اس مقام کو برزخ البرازخ کہتے ہیں اور اس میں وجوب وامکان مساوی ہیں کسی کو کسی پر غلبہ نہیں'' (کلیاتِ امدادیہ ص ۳۵، ۳۶، ضیاء القلوب)

④ عاشق الٰہی میرٹھی دیوبندی لکھتے ہیں: ''ایک روز حضرت مولانا خلیل احمد صاحب زید مجدہ نے دریافت کیا کہ حضرت یہ حافظ لطافت علی عرف حافظ مینڈھو شیخ پوری کیسے شخص تھے

حضرت نے فرمایا ''پکا کافر تھا'' اور اسکے بعد مسکرا کر ارشاد فرمایا کہ ''ضامن علی جلال آبادی تو توحید ہی میں غرق تھے۔'' (تذکرۃ الرشید جلد۲ ص۲۴۲)

عبارتِ مذکورہ میں حضرت سے مراد رشید احمد گنگوہی اور خلیل احمد سے مراد بذل المجھود، براہین قاطعہ اور المہند کے مصنف خلیل احمد انبیٹھوی سہارنپوری ہیں۔

ضامن علی جلال آبادی کون تھے اور کس توحید میں غرق تھے؟ اس کے بارے میں گنگوہی ''صاحب ارشاد فرماتے'' ہیں: '' ضامن علی جلال آبادی کی سہارنپور میں بہت رنڈیاں مرید تھیں ایکبار یہ سہارنپور میں کسی رنڈی کے مکان پر ٹھیرے ہوئے تھے سب مریدنیاں اپنے میاں صاحب کی زیارت کیلئے حاضر ہوئیں مگر ایک رنڈی نہیں آئی میاں صاحب بولے کہ فلانی کیوں نہیں آئی رنڈیوں نے جواب دیا'' میاں صاحب ہم نے اُس سے بہتیرا کہا کہ چل میاں صاحب کی زیارت کو اُس نے کہا میں بہت گناہگار ہوں اور بہت روسیاہ ہوں میاں صاحب کو کیا منہ دکھاؤں میں زیارت کے قابل نہیں'' میاں صاحب نے کہا نہیں جی تم اُسے ہمارے پاس ضرور لانا چنانچہ رنڈیاں اُسے لیکر آئیں جب وہ سامنے آئی تو میاں صاحب نے پوچھا'' بی تم کیوں نہیں آئی تھیں؟'' اُس نے کہا حضرت روسیاہی کی وجہ سے زیارت کو آتی ہوئی شرماتی ہوں۔ میاں صاحب بولے'' بی تم شرماتی کیوں ہو کرنے والا کون اور کرانے والا کون وہ تو وہی ہے'' رنڈی یہ سُنکر آگ ہوگئی اور خفا ہو کر کہا لاحول ولاقوۃ اگرچہ میں روسیاہ وگنہگار ہوں مگر ایسے پیر کے مُنہ پر پیشاب بھی نہیں کرتی۔'' میاں صاحب تو شرمندہ ہو کر سرنگوں رہ گئے اور وہ اُٹھکر چلدی۔'' (تذکرۃ الرشید ج۲ ص۲۴۲)

اس طویل عبارت اور قصے سے معلوم ہوا کہ گنگوہی صاحب کے نزدیک توحید میں غرق پیر کا یہ عقیدہ تھا کہ زنا کرنے والا اور کرانے والا وہی یعنی خدا ہے۔ **معاذ اللّٰہ ثم معاذ اللّٰہ**

اللہ کی قسم! وحدت الوجود کا عقیدہ رکھنے والے وجودیوں کی ایسی عبارات نقل کرنے سے دل ڈرتا اور قلم کانپتا ہے لیکن صرف احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے پیشِ نظر یہ حوالے پیش کئے جاتے ہیں اور صرف عام مسلمانوں کو ان کا اصلی چہرہ اور باطنی عقیدہ دکھانا مقصود ہے۔

⑤ ضامن علی جلال آبادی کو توحید میں غرق سمجھنے والے رشید احمد گنگوہی نے اپنے پیر حاجی امداداللہ کو ایک خط لکھا تھا جس کے آخر میں وہ لکھتے ہیں:

''یا اللہ معاف فرمانا کہ حضرت کے اِرشاد سے تحریر ہوا ہے۔ جھوٹا ہوں، کچھ نہیں ہوں۔ تیرا ہی ظل ہے۔ تیرا ہی وجود ہے مَیں کیا ہوں، کچھ نہیں ہوں۔ اور وہ جو مَیں ہوں وہ تو ہے اور مَیں اور تُو خود شرک در شرک ہے۔ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ ...'' !

(فضائل صدقات از زکریا کاندھلوی دیو بندی حصہ دوم ص ۵۵۶ واللفظ لہ، مکاتیب رشیدیہ ص ۱۰)

مَیں (گنگوہی) اور تُو (خدا) کا ایک ہونا وہ عقیدہ ہے جو وحدت الوجود کے پیروکار اور ابنِ عربی وغیرہ کے مقلدین کئی سو سالوں سے مسلسل پیش کر رہے ہیں۔

⑥ خواجہ غلام فرید، شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا رد کرنے، عقیدۂ استویٰ علی العرش کو غلط اور عقیدۂ وحدت الوجود کو حق قرار دینے کے بعد کہتے ہیں:

''وحدت الوجود کو حق تسلیم کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب خدا کے سوا کسی اور کا کوئی وجود ہی نہیں بلکہ سب خدا کا وجود ہے تو پھر بت پرستی کیوں ممنوع ہے اس کا جواب یہ ہے۔ بت خدا نہیں بلکہ خدا سے جدا نہیں ہے مثال کے طور پر زید کا ہاتھ زید نہیں ہے لیکن زید سے جدا نہیں ہے..'' (مقابیس المجالس عرف اشارات فریدی ص ۲۱۸)

⑦ خواجہ محمد یار فریدی کہتے ہیں:

''گر محمد نے محمد کو خدا مان لیا　　　پھر تو سمجھو کہ مسلمان ہے دغا باز نہیں''

(دیوان محمدی ص ۱۵۶)

یہ وحدت الوجود ہی کا عقیدہ ہے جس کی وجہ سے محمد یار صاحب نے محمد رسول اللہ ﷺ کو خدا مان لیا ہے۔ سبحانه وتعالٰى عما يقولون علوًا كبيرًا .

⑧ محمد قاسم نانوتوی، رشید احمد گنگوہی اور اشرف علی تھانوی کے پیر حاجی امداداللہ کہتے ہیں:

''حرمین میں بعض امور عجیب و پسندیدہ ہیں (۱) وحدۃ الوجود لوگوں میں بہت مُرتکز ہے میں مدینہ میں مسجد قبا کی زیارت کو گیا ایک آدمی کو دیکھا کہ اندر مسجد کے جاروب کشی میں مشغول

ہے جب زیارت سے فارغ ہوکر میں باہر آیا اور جوتے پہننے کا قصد کیا تو سنا کہ کہتا ہے۔ یااللہ یاموجود اور دوسرا جو بیرون مسجد تھا کہتا تھا بل فی کل الوجود اس کو سن کر مجھ پر ایک حالت طاری ہوئی بعدہٗ لڑکوں کو شغدف میں دیکھا کہ کھیل رہے ہیں اور ایک لڑکا کہہ رہا ہے یَا اَللّٰہ لَیْسَ غَیْرُوكَ اس سے میں نہایت بے تاب ہوا اور کہا کہ کیوں ذبح کرتے ہو...“

(شمائم امدادیہ ص ۷۱، ۷۲، امداد المشتاق ص ۹۵ فقرہ: ۱۹۱)

ہر وجود میں اللہ کو موجود سمجھنا وحدت الوجود کا بنیادی عقیدہ ہے۔

⑨ حاجی امداد اللہ تھانہ بھونوی کہتے ہیں:

”ایک موحد سے لوگوں نے کہا کہ اگر حلوا و غلیظ ایک ہیں تو دونوں کو کھاؤ انہوں نے بشکل خنزیر ہو کر گُوہ کو کھالیا۔ پھر بصورت آدمی ہو کر حلوا کھایا اس کو حفظ مراتب کہتے ہیں جو واجب ہے“ (شمائم امدادیہ ص ۷۵، امداد المشتاق ص ۱۰۱ فقرہ: ۲۲۴، واللفظ لہ)

شمائم کے مطبوعہ نسخے میں غلیظ کے بجائے غلیط لکھا ہوا ہے جس کی اصلاح امداد المشتاق سے کر دی گئی ہے۔ گُوہ پاخانے کو کہتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ وجودیوں کے نزدیک پاک و ناپاک سب ایک ہے۔

⑩ ایک سوال کو نقل کرتے ہوئے حاجی امداد اللہ صاحب لکھتے ہیں: ”سوال دوم....اور دوسری جگہ ضیاء القلوب ہی میں ہے تاوقتیکہ ظاہر و مظہر میں فرق پیش نظر سالک ہے بُوئے شرک باقی ہے اس مضمون سے معلوم ہوا کہ عابد و معبود میں فرق کرنا شرک ہے۔

جواب دوم کوئی شک نہیں ہے کہ فقیر نے یہ سب ضیاء القلوب میں لکھا ہے اگر کہیں کہ جو کچھ کہا نہیں جاتا ہے کیوں لکھا گیا جواب یہ ہے کہ اکابر دین اپنے مکشوفات کو تمثیلات محسوسات سے تعبیر کرتے ہیں تاکہ طالب صادق کو سمجھا دیں نہ یہ کہ کَاَنَّہٗ ، ھُوَ کہہ دیتے ہیں....“

(شمائم امدادیہ ص ۳۴، ۳۵)

خلاصہ یہ کہ عابد و معبود کو ایک سمجھنا، اللہ تعالیٰ کو عرش پر مستوی نہ ماننا بلکہ اپنی ذات کے ساتھ ہر جگہ ہر وجود میں موجود ماننا اور حلولیت کا عقیدہ رکھنا مختصر الفاظ میں وحدت الوجود کہلاتا ہے۔

یہی وہ عقیدہ ہے جسے حسین بن منصور الحلاج مقتول اور ابنِ عربی صُوفی نے علانیہ پیش کیا۔
التنبیہ علی مشکلات الہدایہ کے مصنف علی بن ابی العزالحنفی (متوفی ۷۹۲ھ) لکھتے ہیں:

”وهذا القول قد أفضى بقوم إلى القول بالحلول والإتحاد وهو أقبح من كفر النصارى فإن النصارى خصوه بالمسيح وهؤلاء عموا جميع المخلوقات ومن فروع هذا التوحيد :أن فرعون و قومه كاملوا الإيمان عارفون بالله على الحقيقة ومن فروعه :أن عباد الأصنام على الحق والصواب وأنهم إنما عبدوا الله لا غيره“

اور یہ قول ایک قوم کو حلول واتحاد کی طرف لے گیا ہے اور یہ نصرانیوں (عیسائیوں) کے کفر سے زیادہ بُرا ہے کیونکہ نصرانیوں نے تو اسے مسیح کے ساتھ خاص مانا اور انھوں نے تمام مخلوقات کے بارے میں عام کر دیا۔ اس (وجودی) توحید کی فروع میں سے ہے کہ فرعون اور اس کی قوم مکمل ایمان والے تھے، حقیقت پر اللہ کو پہچاننے والے تھے۔ اس کی فروع میں سے یہ بھی ہے کہ بتوں کی عبادت کرنے والے حق پر اور صحیح ہیں، انھوں نے اللہ ہی کی عبادت کی ہے، کسی دوسرے کی نہیں۔ (شرح عقیدہ طحاویہ ص ۷۸، ۷۹)

وحدت الوجود کا رد

درج بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ وحدت الوجود کا عقیدہ سراسر گمراہی اور کفریہ عقیدہ ہے جس کا رد شیخ الاسلام ابن تیمیہ، حافظ ابن حجر العسقلانی، قاضی ابن ابی العزالحنفی اور ملا علی قاری حنفی وغیرہم نے شدومد سے کیا ہے۔ ملا علی قاری وحدت الوجود کے رد میں اپنی کتاب کے آخر میں لکھتے ہیں:

”فإن كنت مؤمنًا و مسلمًا حقًا و مسلمًا صدقًا فلا تشك في كفر جماعة ابن عربي ولا تتوقف في ضلالة هذا القوم الغوي والجمع الغبي فإن قلتَ : هل يجوز السلام عليهم ابتداء ؟ قلتُ :لا ولا رد السلام عليهم بل لايقال لهم :عليكم ، أيضًا فإنهم شر من اليهود والنصارى وإن حكمهم حكم

المرتدين... ويجب إحراق كتبهم المؤلفة و يتعين على كل أحد أن يبين فسادشقاقهم و كساد نفاقهم فإن سكوت العلماء و اختلاف (بعض) الآراء صار سبباً لهٰذا الفتنة وسائر أنواع البلاء ... ''پھر اگر تم سچے مسلمان اور پکے مومن ہو تو ابن عربی کی جماعت کے کفر میں شک نہ کرو اور اس گمراہ قوم اور بے وقوف اکٹھ کی گمراہی میں توقف نہ کرو، پھر اگر تم پوچھو: کیا انھیں سلام کہنے میں ابتدا کی جاسکتی ہے؟ میں کہتا ہوں: نہیں اور نہ ان کے سلام کا جواب دیا جائے بلکہ انھیں وعلیکم کا لفظ بھی نہیں کہنا چاہئے کیونکہ یہ یہودیوں اور نصرانیوں سے زیادہ بُرے ہیں اور ان کا حکم مرتدین کا حکم ہے... ان لوگوں کی لکھی ہوئی کتابوں کو جلانا واجب ہے اور ہر آدمی کو چاہئے کہ ان کی فرقہ پرستی اور نفاق کو لوگوں کے سامنے بیان کردے کیونکہ علماء کا سکوت اور بعض راویوں کا اختلاف اس فتنے اور تمام مصیبتوں کا سبب بنا ہے.... (الرد علی القائلین بوحدۃ الوجود ص ۱۵۵، ۱۵۶)

محدثین کرام وعلمائے عظام کے ان صریح فتووں کے ساتھ عرض ہے کہ اپنے اسلاف سے بے خبر بعض دیوبندی ''علماء'' نے بھی وحدت الوجود کا زبردست رد کیا ہے مثلاً:

① حکیم میاں عبدالقادر فاضل دیوبند لکھتے ہیں: ''وحدۃ الوجو خود کو خدائی مسند پر جلوہ افروز ہونے والوں کا باطل عقیدہ وعمل ہے'' (تنزیہ الٰہ ص ۱۸۵، مطبوعہ بیت الحکمت لوہاری منڈی لاہور، ملنے کا پتہ: کتب خانہ شان اسلام راحت مارکیٹ اردو بازار لاہور)

② خان محمد شیرانی پنجپیری دیوبندی (ژوب بلوچستان) نے وحدت الوجود کے رد میں ''کشف الجحود عن عقیدۃ وحدۃ الوجود'' نامی کتاب لکھی ہے جس کے ٹائٹل پر لکھا ہوا ہے کہ ''اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ جن لوگوں کا وحدۃ الوجود اور حلولی کا عقیدہ ہوتا ہے، وہ صحیح نہیں ہے۔''

ابن عربی صوفی کا رد

آخر میں وحدت الوجود کے بڑے داعی اور مشہور حلولی صوفی ابن عربی کا مختصر و جامع رد پیشِ خدمت ہے:

① حافظ ابن حجر عسقلانی کہتے ہیں کہ میں نے اپنے استاذ امام (شیخ الاسلام) سراج الدین

البلقيني سے ابن عربی کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے فوراً جواب دیا کہ وہ کافر ہے۔

(لسان المیزان ج ۴ ص ۳۱۹، دوسرا نسخہ ج ۵ ص ۲۱۳، تنبیہ الغبی الی تکفیر ابن عربی للمحدث البقاعی رحمہ اللہ ص ۱۵۹)

ابن عربی کے بارے میں حافظ ابن حجر کا ایک گمراہ شخص سے مباہلہ بھی ہوا تھا جس کا تذکرہ آگے آرہا ہے۔ ان شاء اللہ

② حافظ ابن دقیق العید نے ابو محمد عز الدین عبدالعزیز بن عبدالسلام السلمی الدمشقی الشافعی رحمہ اللہ (متوفی ۶۶۰ھ) سے ابن عربی کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے فرمایا:

''شيخ سوء كذاب مقبوح ، يقول بقدم العالم ولا يرى تحريم فرج'' إلخ

گندا، کذاب (اور) حق سے دُور شخص (تھا) وہ عالَم کے قدیم ہونے کا قائل تھا اور کسی شرمگاہ کو حرام نہیں سمجھتا تھا۔ الخ (الوافی بالوفیات ج ۴ ص ۱۲۵، وسندہ صحیح، تنبیہ الغبی ص ۱۳۸)

ابن عبدالسلام کا یہ قول درج ذیل کتابوں میں بھی دوسری سندوں کے ساتھ مذکور ہے:

(تنبیہ الغبی ص ۱۳۹، وسندہ حسن) مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ (ج ۲ ص ۲۴۴ وسندہ حسن)

میزان الاعتدال (۶۵۹/۳) لسان المیزان (۳۱۱/۵، ۳۱۲، دوسرا نسخہ ۳۹۸/۶)

تنبیہ: الوافی بالوفیات میں کاتب کی غلطی سے ''أبي بكر بن العربي'' چھپ گیا ہے جبکہ صحیح لفظ ابی بکر کے بغیر ''ابن عربي'' ہے۔

③ ثقہ اور جلیل القدر امام ابوحیان محمد بن یوسف الاندلسی رحمہ اللہ (متوفی ۷۴۵ھ) نے فرمایا: ''ومن ذهب من ملاحدتهم إلى القول بالإتحاد والوحدة كالحلاج والشوذي وابن أحلى وابن العربي المقيم كان بدمشق وابن الفارض وأتباع هؤلاء كابن سبعين والتستري تلميذه وابن مطرف المقيم بمرسية والصفار المقتول بغرناطة وابن اللباج وأبو الحسن المقيم كان بلورقة وممن رأيناه يُرمى بهذا المذهب الملعون العفيف التلمساني ...'' إلخ

اور ان کے ملحدین میں سے جو اتحاد اور وحدت (یعنی وحدت الوجود) کا قائل ہے جیسے (حسین بن منصور) الحلاج، شوذی، ابن اَحلی، ابن عربی جو دمشق میں مقیم تھا، ابن فارض اور

ان کے پیروکار جیسے ابن سبعین اور اس کا شاگرد تستری، مرسیہ میں رہنے والا ابن مطرف اور غرناطہ میں قتل ہونے والا الصفار، ابن اللباج اور لورقہ میں رہنے والا ابو الحسن اور ہم نے جنھیں اس ملعون مذہب کی تہمت کے ساتھ دیکھا ہے جیسے عفیف تلمسانی...الخ

(تفسیر البحر المحیط ج ۳ ص ۴۶۴، ۴۶۵، سورۃ المائدہ: ۱۷)

④ تفسیر ابن کثیر کے مصنف حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"وله كتابه المسمى بفصوص الحكم فيه أشياء كثيرة ظاهرها كفر صريح"

اور اس کی کتاب جس کا نام فصوص الحکم ہے، اس میں بہت سی چیزیں ہیں جن کا ظاہر کفرِ صریح ہے۔ (البدایہ والنہایہ ج ۱۳ ص ۱۶۷، وفیات ۶۳۸ھ)

⑤ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "ولم يمدح الحيرة أحد من أهل العلم والإيمان ولكن مدحها طائفة من الملاحدة كصاحب الفصوص ابن عربي وأمثاله من الملاحدة الذين هم حيارى... "

اہلِ علم اور اہلِ ایمان میں سے کسی نے بھی حیرت کی تعریف نہیں کی لیکن ملحدین کے ایک گروہ نے اس کی تعریف کی ہے جیسے فصوص الحکم والا ابن عربی اور اس جیسے دوسرے ملحدین جو حیران و پریشان ہیں... (فتاویٰ ابن تیمیہ ج ۱۱ ص ۳۸۵)

حافظ ابن تیمیہ اور حافظ ابن القیم دونوں کے بارے میں ملا علی قاری حنفی لکھتے ہیں:

"ومن طالع شرح منازل السائرين تبين له أنهما كانا من أكابر أهل السنة والجماعة ومن أولياء هذه الأمة " اور جس نے منازل السائرین کی شرح کا مطالعہ کیا ہے تو اس پر واضح ہوا کہ وہ (ابن تیمیہ اور ابن القیم) دونوں اہل سنت والجماعۃ کے اکابر اور اس امت کے اولیاء میں سے تھے۔ (جمع الوسائل فی شرح الشمائل ج ۱ ص ۲۰۷)

⑥ محدث بقاعی لکھتے ہیں کہ ہمارے استاذ حافظ ابن حجر العسقلانی کا ابن الامین نامی ایک شخص سے ابن عربی کے بارے میں مباہلہ ہوا۔ اس آدمی نے کہا: اے اللہ! اگر ابن عربی گمراہی پر ہے تو تُو مجھ پر لعنت فرما۔ حافظ ابن حجر نے کہا: اے اللہ! اگر ابن عربی ہدایت پر

ہے تو تُو مجھ پر لعنت فرما۔
وہ شخص اس مباہلے کے چند مہینے بعد رات کو اندھا ہو کر مر گیا۔ یہ واقعہ ۷۹۷ھ کو ذوالقعدہ میں ہوا تھا اور مباہلہ رمضان میں ہوا تھا۔ (تنبیہ الغبی ص ۱۳۶، ۱۳۷)

⑦ ملا علی قاری حنفی کا حوالہ گزر چکا ہے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ ابن عربی کی جماعت کے کفر میں شک نہ کرو۔

⑧ قاضی تقی الدین علی بن عبدالکافی السبکی الشافعی نے شرح المنہاج کے باب الوصیہ میں کہا: ''ومن كان من هؤلاء الصوفية المتأخرين كابن عربي وغيره فهم ضلال جهال خارجون عن طريقة الإسلام '' اور جو ان متاخرین صوفیہ میں سے ہے جیسے ابن عربی وغیرہ تو یہ گمراہ جاہل ہیں (جو) اسلام کے طریقے سے خارج ہیں۔ (تنبیہ الغبی ص ۱۴۳)

⑨ شمس الدین محمد العیزری الشافعی نے اپنی کتاب ''الفتاوی المنتشرة '' میں فصوص الحکم کے بارے میں کہا: ''قال العلماء : جميع مافيه كفر لأنه دائر مع عقيدة الإتحاد.... '' إلخ علماء نے کہا: اس میں سارے کا سارا کفر ہے کیونکہ یہ اتحاد کے عقیدے پر مشتمل ہے۔ الخ (تنبیہ الغبی ص ۱۵۲)

⑩ محدث برہان الدین البقاعی نے تکفیر ابن عربی پر تنبیہ الغبی کے نام سے کتاب لکھی ہے جس کے حوالے آپ کے سامنے پیش کیے گئے ہیں۔

معلوم ہوا کہ عام علماء اور جلیل القدر محدثین کرام کے نزدیک ابن عربی صوفی اور وحدت الوجود کا عقیدہ رکھنے والے لوگ گمراہ اور گمراہ کرنے والے ہیں۔ جن علماء نے ابن عربی کی تعریف کی ہے یا اسے شیخ اکبر کے خود ساختہ لقب سے یاد کیا ہے، اُن کے دو گروہ ہیں:

اول: جنھیں ابن عربی کے بارے میں علم ہی نہیں ہے۔

دوم: جنھیں ابن عربی کے بارے میں علم ہے۔ ان کے تین گروہ ہیں:

اول: جو ابن عربی کی کتابوں اور اس کی طرف منسوب کفریہ عبارات کا یہ کہہ کر انکار کر دیتے ہیں کہ یہ ابن عربی سے ثابت ہی نہیں ہیں۔

دوم: جو تاویلات کے ذریعے سے کفریہ عبارات کو مشرف بہ اسلام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

سوم: جو ان عبارات سے کلیتاً متفق ہیں۔ اس تیسرے گروہ اور ابن عربی کا ایک ہی حکم ہے اور پہلے دو گروہ اگر بذاتِ خود صحیح العقیدہ ہیں تو جہالت کی وجہ سے لاعلم ہیں۔

آخر میں عرض ہے کہ وحدت الوجود ایک غیر اسلامی عقیدہ ہے جس کی تردید قرآن مجید، احادیثِ صحیحہ، اجماع، آثارِ سلف صالحین اور عقل سے ثابت ہے۔ مثلاً ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ ءَ اَمِنۡتُمۡ مَّنۡ فِی السَّمَآءِ اَنۡ یَّخۡسِفَ بِکُمُ الۡاَرۡضَ فَاِذَا ہِیَ تَمُوۡرُ ﴾ کیا تم بے خوف ہو اُس سے جو آسمان پر ہے کہ تمھیں زمین میں دھنسا دے پھر وہ ڈولنے لگے؟ (سورۃ الملک:١٦)

رسول اللہ ﷺ نے ایک لونڈی سے پوچھا: ((أَيْنَ اللّٰهُ ؟)) اللہ تعالیٰ کہاں ہے؟ اس نے جواب دیا: ''فِي السَّمَاءِ'' آسمان پر ہے۔ آپ نے پوچھا: میں کون ہوں؟ اس نے کہا: آپ اللہ کے رسول ہیں۔ آپ ﷺ نے اُس لونڈی کے مالک سے فرمایا: ((أَعْتِقْهَا فَإِنَّهَا مُؤْمِنَةٌ.)) اسے آزاد کر دو کیونکہ یہ ایمان والی ہے۔

(صحیح مسلم: ٥٣٧، ترقیم دار السلام: ١١٩٩)

ابو عمرو الطلمنکی نے کہا: اہلِ سنت کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے ساتھ سات آسمانوں سے اوپر اپنے عرش پر مستوی ہے اور معیت سے مراد اُس کا علم (وقدرت) ہے۔

(دیکھئے شرح حدیث النزول لابن تیمیہ ص ١٤٤، ١٤٥ ملخصاً)

تنبیہ: وحدت الوجود کے قائل حسین بن منصور الحلاج الحلولی کے بارے میں تفصیلی تحقیق کے لئے دیکھئے ماہنامہ الحدیث حضرو: ٢١ ص ٨۔١١ [الحدیث: ٤٩]

وحدت الوجود اور علمائے دیوبند

سوال (دوسرا سوال یہ ہے کہ) علماءِ دیوبند میں کون کون اس فلسفہ کے قائل تھے؟

(محمد شیر وزیر۔ پی سی ایس آئی آر لیبارٹریز، پشاور)

الجواب علمائے دیوبند کے اکابر میں سے درج ذیل ''علماء'' وحدت الوجود کے قائل تھے: رشید احمد گنگوہی، محمد قاسم نانوتوی، حسین احمد مدنی ٹانڈوی، اشرفعلی تھانوی اور ان سب کے پیرومرشد حاجی امداداللہ تھانہ بھونوی.

حاجی امداداللہ لکھتے ہیں: ''نکتہ شناسا مسئلہ وحدۃ الوجود حق وصحیح ست وراین مسئلہ شکے وشبہے نیست معتقد وفقیر وہمہ مشائخ وفقیر ومعتقد کسانیکہ بافقیر بیعت کردہ وتعلق میدارند ہمیں ست مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم ومولوی رشید احمد صاحب ومولوی محمد یعقوب صاحب ومولوی احمد حسن صاحب وغیرہم ازعزیزاں فقیر اند وتعلق بافقیر میدارند ہیچگاہ خلاف اعتقادات فقیر وخلاف مشرب مشائخ طریق خود مسلکی نخواند پذیرفت...''

''نکتہ شناسا مسئلہ وحدۃ الوجود حق وصحیح ہے اس مسئلہ میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ فقیر ومشائخ فقیر اور جن لوگوں نے فقیر سے بیعت کی ہے سب کا اعتقاد یہی ہے مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم ومولوی رشید احمد صاحب ومولوی محمد یعقوب صاحب مولوی احمد حسن صاحب وغیرہم فقیر کے عزیز ہیں اور فقیر سے تعلق رکھتے ہیں کبھی خلاف اعتقادات فقیر وخلاف مشرب مشائخ طریقِ خود مسلک اختیار نہ کریں گے۔''

(کلیات امدادیہ، رسالہ دربیان وحدۃ الوجود ص ۲۱۸، ۲۱۹، شمائم امدادیہ ص ۳۲)

سرفراز خان صفدر گکھڑوی دیوبندی کے بھائی صوفی عبدالحمید خان سواتی لکھتے ہیں:

''علماء دیوبند کے اکابر مولانا محمد قاسم نانوتوی ؒ (المتوفی ۱۲۹۷ھ) اور مولانا مدنی ؒ (المتوفی ۱۳۷۷ھ) اور دیگر اکابر مسئلہ وحدۃ الوجود کے قائل تھے۔ حضرت نانوتوی ؒ کا رسالہ بھی اس مسئلہ پر موجود ہے اور متعدد مکاتیب میں بھی اس مسئلہ کا ذکر ہے اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی ؒ کے مکاتیب میں بھی اس مسئلہ کی تصویب موجود ہے۔ اور مولانا شاہ اشرف علی تھانوی ؒ (المتوفی ۱۳۶۲ھ) نے بھی اس مسئلہ پر بہت کچھ لکھا ہے اور ان سب کے پیرومرشد حضرت مولانا حاجی شاہ محمد امداداللہ مہاجر مکی ؒ (المتوفی ۱۳۱۷ھ) تو اس مسئلہ میں بہت انہماک اور تیقن رکھتے تھے۔'' (مقالاتِ سواتی حصہ اول، اکابر علمائے دیوبند اور نظریہ وحدۃ الوجود ص ۳۷۵)

عبدالحمید سواتی صاحب مزید لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ (المتوفی ۱۳۶۳ھ) نے دیوبندی جماعت کے اوصاف و خصوصیات کے سلسلہ میں لکھا ہے: ''اس جماعت کے امتیازی اوصاف میں ہم وحدۃ الوجود، فقہ حنفی کا التزام ، ترکی خلافت سے اتصال ، تین اصول متعین کر سکتے ہیں، جو اس جماعت کو امیر ولایت علیؒ کی جماعت سے جُدا کر دیتے ہیں۔'' (خطبات ومقالات ص ۲۳۷)

یہ بات کس قدر افسوس ناک ہے اور کس قدر لاعلمی کی بات ہے کہ یہ کہا جائے کہ علماء دیوبند وحدۃ الوجود کے قائل نہیں تھے۔ علماء دیوبند اور ان کے مقتداء و پیشواء حضرات بھی اس مسئلہ کے بڑی شدّ ومد سے قائل تھے۔

حکیم الامت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانویؒ نے متعدد کتابیں اس موضوع پر لکھی ہیں اور شیخ ابن عربیؒ (المتوفی ۶۳۸ھ) کا دفاع کیا ہے۔'' (مقالات سواتی حصہ اول ص ۳۷۵، ۳۷۶)

معلوم ہوا کہ اکابر علمائے دیوبند ابن عربی والے عقیدۂ وحدت الوجود کے بڑی شدّ ومد سے قائل تھے۔

احمد رضا خان بریلوی لکھتے ہیں: ''اور وحدتِ وجود حق ہے۔'' (فتاویٰ رضویہ نسخہ جدیدہ ج ۱۴ اص ۶۴۱)

دوسرے مقام پر وحدت کو حق قرار دے کر احمد رضا خان صاحب لکھتے ہیں:

''اور اتحاد باطل اور اس کا معنی الحاد'' (فتاویٰ رضویہ ج ۱۴ اص ۶۱۸)

عرض ہے کہ وحدت الوجود ہے ہی اتحاد باطل اور الحاد کا نام جیسا کہ پہلے سوال کے جواب میں متعدد حوالوں سے ثابت کر دیا گیا ہے لہٰذا وحدت الوجود کو حق قرار دے کر عجیب وغریب تاویلیں کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ (۱۶/ مارچ ۲۰۰۸ء) [الحدیث:۴۹]

حاجی امداد اللہ تھانہ بھونوی کا انوکھا نظریہ

سوال کیا یہ بات صحیح ہے کہ دیوبندیوں کے پیر حاجی امداد اللہ نے اپنی کتاب ''کلیات امدادیہ'' میں خدا بننے کا طریقہ لکھا ہے؟ (فضل اکبر کاشمیری)

الجواب جی ہاں! حاجی امداد اللہ صاحب ذاکر کے بارے میں لکھتے ہیں: ''اور اس

کے بعد اس کو ہو ہو کے ذکر میں اسقدر منہمک ہو جانا چاہئے کہ خود مذکور یعنی (اللہ) ہو جائے''

(کلیات امدادیہ، مطبوعہ دارالاشاعت کراچی، ص ۱۸)

تنبیہ: بریکٹ میں ''(اللہ)'' کا لفظ حاجی امداد اللہ نے خود لکھا ہے۔ حاجی صاحب کا یہ عقیدہ سراسر کفر و شرک ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ ﴾ اور انھوں نے اس کے لئے اس کے بندوں میں سے حصہ بنا دیا۔ بے شک ایسا انسان کھلا کافر ہے۔ (الزخرف: ۱۵)

جب اللہ کے بندوں کو اس کا جزء قرار دینا بہت بڑا کفر ہے تو یہ عقیدہ رکھنا کہ ''انسان ذکر میں منہمک ہو کر خود مذکور یعنی اللہ ہو جاتا ہے'' بہت ہی بڑا کفر ہے۔ حاجی امداد اللہ کی اس کتاب ''کلیات امدادیہ'' میں اس قسم کی بہت سی کفریہ و شرکیہ عبارات موجود ہیں۔

[الحدیث: ۱۶]

شرک کا مفہوم

سوال ان میں سے اکثر (لوگ) باوجود اللہ پر ایمان رکھنے کے بھی مشرک ہیں۔ (سورۃ یوسف آیت نمبر ۱۰۶) کیا یہ لوگ قیامت کے بعد کا سارا عرصہ دوزخ میں رہیں گے یا پھر محمد رسول اللہ ﷺ کی آخری سفارش پر ان کو جنت مل جائے گی، جواب قرآن و حدیث کے دلائل سے پوری تفصیل کے ساتھ دیں۔ (ایک سائل)

الجواب شرک کی دو قسمیں ہیں: ① شرک اصغر ② شرک اکبر

شرک اصغر: ریا کو کہتے ہیں محمود بن لبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إن أخوف ما أخاف عليكم الشرك الأصغر))

مجھے تم پر سب سے زیادہ ڈر شرک اصغر کا ہے۔ صحابہ نے پوچھا: یا رسول اللہ! شرکِ اصغر کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((الریا)) یہ ریا (دکھاوا) ہے۔

(مسند احمد ج ۵ ص ۴۲۹ ح ۲۴۰۳۶ وسندہ حسن)

شرک اکبر: اللہ کی ذات، صفاتِ خاصہ اور اسماء (ناموں) میں مخلوق کو شریک کرنا شرک کہلاتا ہے۔ غیر اہلِ حدیث محمد اعلیٰ تھانوی صاحب لکھتے ہیں: "قال العلماء: الشرك علٰى أربعة أنحاء، الشرك في الألوهية والشرك في وجوب الوجود والشرك فی التدبیر والشرك فی العبادۃ"

علماء نے کہا: شرک کی چار قسمیں ہیں: الوہیت میں شرک، واجب الوجود ہونے میں شرک، تدبیر میں شرک اور عبادت میں شرک " (کشاف اصطلاحات الفنون ج ۱ ص ۱۷۷)

ابن منظور اللغوی نے لکھا ہے: "والشرك ان یجعل للّٰہ شریکًا"

"اور شرک یہ ہے کہ اللہ کی ربوبیت میں کسی کو شریک بنا دیا جائے" (لسان العرب ج ۱۰ ص ۴۴۹)

الشیخ عبدالرحمٰن بن حسن آل الشیخ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "غیر اللہ کو تمام عبادات میں یا کسی خاص عبادت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانا شرک اکبر کہلاتا ہے"

(فتح المجید رہدایۃ المستفید ج ۱ ص ۳۰۸، ۳۰۹)

الشیخ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ نواقضِ اسلام کے بارے میں فرماتے ہیں: "ان میں سے سب سے بڑا شرک ہے مثلاً فوت شدہ بزرگوں کو پکارنا اور ان سے فریاد کرنا، بتوں، درختوں اور ستاروں وغیرہ سے حاجت روائی چاہنا" (فتاویٰ ج ۲ ص ۱۵، اردو طبع دار السلام لاہور)

الشیخ محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ دورِ بعثتِ نبوی ﷺ کے مشرکین کا شرک کیسا تھا؟ تو انھوں نے جواب دیا: " بعثتِ نبوی ﷺ کے دور کے مشرکین کا شرک ربوبیت میں نہیں تھا، کیونکہ قرآن کریم اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ صرف عبادات میں شرک کرتے تھے۔ رہی ربوبیت تو وہ ایک اللہ کو رب مانتے تھے، اسے مجبوروں کی دعائیں سننے والا اور مصیبتیں ٹالنے والا، وغیرہ تسلیم کرتے تھے، اللہ نے ان سے ربوبیت کا اقرار نقل کیا ہے لیکن وہ اللہ کی عبادت میں غیروں کو شریک کر لیتے تھے، اور یہ شرک ملت (اسلامیہ) سے باہر نکال دیتا ہے" (مجموع فتاویٰ ج ۱ ص ۲۶، العقیدۃ)

شرکِ اکبر کرنے والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے: ﴿اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ

حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ﴾ بے شک جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا تو اس پر اللہ نے جنت حرام قرار دی اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ (المآئدہ:۷۲)

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ ﴾

بے شک اللہ شرک نہیں بخشتا اور اس کے علاوہ جو وہ چاہے بخش دیتا ہے۔ (النسآء:۴۸)

اللہ تعالیٰ نے ہمیں سمجھانے کے لئے اپنے پیارے حبیب ﷺ سے فرمایا:

﴿ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾

اگر آپ شرک کرتے تو آپ کے اعمال ضائع ہو جاتے اور آپ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاتے۔ (الزمر:۶۵)

معلوم ہوا کہ شرکِ اکبر کا مرتکب ابدی جہنمی ہے اسے کسی سفارش یا شفاعت کے ذریعے سے جہنم سے نہیں نکالا جائے گا۔ شفاعت تو امت محمدیہ میں سے صرف ان لوگوں کے ساتھ خاص ہے جو دنیا میں کبیرہ گناہ کرتے تھے (مثلاً چوری، زنا، شراب نوشی وغیرہ) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((شفاعتي لأهل الكبائر من أمتي)) میری شفاعت میری امت کے، کبیرہ گناہ کرنے والوں کے لئے ہے۔ (سنن ابی داود:۴۷۳۹، صحیح)

اس حدیث کی کئی سندیں ہیں مثلاً دیکھئے سنن الترمذی (۲۴۳۵) وغیرہ، اور شفاعت والی حدیث متواتر ہے۔ دیکھئے نظم المتناثر من الحدیث المتواتر للکتانی (ص۲۴۶، ۲۴۸)

[الحدیث:۱] [شہادت، جون ۲۰۰۴ء]

ایمان میں کمی بیشی کا مسئلہ

سوال کیا ایمان کم اور زیادہ ہوتا ہے دلائل سے واضح کریں؟

(محمد خلیل چوہان، جلال بلگن، گوجرانوالہ)

الجواب اس میں کوئی شک نہیں کہ ایمان زیادہ بھی ہوتا ہے اور کم بھی ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا ﴾

بے شک جولوگ ایمان لائے ان کا ایمان زیادہ ہوتا ہے۔ (سورۃ التوبہ:۱۲۴)

اس مفہوم کی دیگر آیات کے لئے دیکھئے صحیح البخاری (کتاب الایمان، باب: اقبل ح ۸)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((الإيمان بضع وستون شعبة والحياء شعبة من الإيمان))

ایمان کے ساٹھ سے زائد درجے ہیں اور حیا ایمان کا (ایک) درجہ ہے۔

(صحیح بخاری:۹، صحیح مسلم:۳۵/۵۷، دارالسلام:۱۵۲)

سیدنا ابوامامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((من أحب لله و أبغض لله وأعطى لله ومنع لله فقد استكمل الإيمان)) جو شخص اللہ کے لئے محبت کرے اور اللہ کے لئے بغض رکھے، اللہ کے لئے (مال) دے اور اللہ کے لئے (ہی مال) روکے تو اس کا ایمان مکمل ہے۔ (ابوداود:۴۶۸۱ وسندہ حسن)

عمیر بن حبیب بن خماشہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "الإيمان يزيد و ينقص" ایمان زیادہ ہوتا ہے اور کم ہوتا ہے۔ (کتاب الایمان لابن ابی شیبہ:۱۴، وسندہ صحیح)

اس کے راوی یزید بن عمیر کو امام عبدالرحمٰن بن مہدی نے "قوم توارثوا الصدق" میں سے قرار دیا ہے۔ (مسائل محمد بن عثمان بن ابی شیبہ:۲۵ بتحقیقی، المؤتلف والمختلف للدارقطنی ۹۲۳/۲)

اہل سنت کا یہی مسلک وموقف ہے کہ ایمان زیادہ اور کم ہوتا ہے۔

دیکھئے الشریعۃ للامام محمد بن الحسین الآجری (ص ۱۱۶-۱۱۸)

وشرح اصول اعتقاد اہل السنۃ للالکائی (۸۹۰/۵-۹۶۴) وغیرہما۔

یہی عقیدہ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل وغیرہم کا ہے رحمہم اللہ اجمعین،

جبکہ دیوبندیوں و بریلویوں کی کتاب عقائد نسفیہ (ص ۹۲) میں لکھا ہوا ہے:

"والإيمان لا يزيد ولا ينقص" ایمان نہ زیادہ ہوتا ہے اور نہ کم ہوتا ہے۔

دیوبندیوں کے نزدیک ایمان فقط تصدیق قلب کا نام ہے۔

دیکھئے حقانی عقائد الاسلام (ص ۱۲۳، تصنیف عبدالحق حقانی و پسند فرمودہ: محمد قاسم نانوتوی)

امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''حدثنا الهذيل بن سليمان أبو عيسى قال: سألت الأوزاعي ، قلت: يا أبا عمرو !ما تقول في رفع الأيدي مع كل تكبيرة وهو قائم في الصلوة ؟ قال :ذلك الأمر الأول وسئل الأوزاعي وأنا أسمع عن الإيمان، فقال :الإيمان يزيد و ينقص ، فمن زعم أن الإيمان لا يزيد ولا ينقص فهو صاحب بدعة فاحذروه'' ہمیں ہذیل بن سلیمان ابوعیسیٰ نے حدیث بیان کی، کہا: میں نے اوزاعیؒ سے پوچھا، میں نے کہا: اے ابوعمرو! آپ ہر تکبیر کے ساتھ رفع یدین کے بارے میں کیا کہتے ہیں، جبکہ آدمی نماز میں کھڑا ہو؟ انھوں نے کہا: یہ پہلے والی بات ہے (یعنی اسلاف کا اسی پر عمل ہے) اور اوزاعی سے ایمان کے بارے میں پوچھا گیا اور میں سن رہا تھا تو انھوں نے فرمایا: ایمان زیادہ (بھی) ہوتا ہے اور کم (بھی) ہوتا ہے، جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ ایمان زیادہ اور کم نہیں ہوتا وہ شخص بدعتی ہے اس سے بچو۔

(جزء رفع الیدین بتحقیقی: ۱۰۸، حسن ہے، قلمی بخط یدی ص ۱۲۹)

تنبیہ: میں نے جزء رفع یدین کے ترجمہ میں ''حسن ہے'' لکھا تھا جو کہ کمپوزر کی غلطی سے ''ضعیف ہے'' چھپ گیا، اس غلطی کی اصلاح مراجعت میں بھی رہ گئی، میرا طریق کار یہ ہے کہ میں ضعیف روایت کی وجہ بیان کر دیتا ہوں جبکہ جزء رفع یدین کے مطبوعہ نسخے میں ضعیف کی کوئی وجہ مذکور نہیں ہے۔ جزء رفع یدین کے عربی نسخے والی اصل پر بھی میرے ہاتھ سے بالکل صاف ''اسنادہ حسن'' لکھا ہوا ہے (قلمی ح ۱۰۸) لہٰذا اپنے نسخوں کی اصلاح کر لیں۔

ہذیل بن سلیمان سے مراد فدیک بن سلیمان ہیں جن سے امام بخاری وغیرہ نے روایت بیان کی ہے اور امام بخاری عام طور پر اپنے نزدیک صرف ثقہ ہی سے روایت کرتے ہیں، نیز حافظ ابن حبان نے بھی ان کی توثیق کی ہے لہٰذا فدیک ''مذکور'' حسن الحدیث ہیں۔

امام اوزاعی (متوفی ۱۵۷ھ) کے اس فتویٰ سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ایمان کم اور زیادہ نہیں ہوتا وہ لوگ بدعتی ہیں۔ أعاذنا الله من شرّهم [الحدیث:۲]

کلمۂ طیبہ کا ثبوت

سوال کیا کلمۂ طیبہ "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کا ثبوت کسی صحیح حدیث میں ملتا ہے؟ تحقیق سے جواب دیں۔ جزا کم اللہ خیرًا. (حبیب محمد، بیاڑ۔ دیر)

الجواب امام ابوبکر احمد بن الحسین البیہقی رحمہ اللہ (متوفی ۴۵۸ھ) نے فرمایا:

" أخبرنا أبو عبدالله الحافظ: ثنا أبو العباس محمد بن يعقوب: ثنا محمد ابن إسحاق: ثنا يحيى بن صالح الوحاظي: ثنا إسحاق بن يحيى الكلبي: ثنا الزهري: حدثني سعيد بن المسيب أن أبا هريرة رضي الله عنه عن النبي ﷺ قال: ((أنزل الله تعالىٰ في كتابه فذكر قومًا استكبروا فقال: ﴿ اِنَّهُمْ كَانُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴾ وقال تعالىٰ: ﴿ اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا ﴾ وهي: لاإله إلا الله محمد رسول الله)) استكبر عنها المشركون يوم الحديبية يوم كاتبهم رسول الله ﷺ في قضية المدة . "

ہمیں ابوعبداللہ الحافظ (امام حاکم، صاحب المستدرک) نے خبر دی (کہا): ہمیں ابوالعباس محمد بن یعقوب (الاصم) نے حدیث بیان کی (کہا): ہمیں محمد بن اسحاق (بن جعفر، ابوبکر الصغانی) نے حدیث بیان کی (کہا): ہمیں یحییٰ بن صالح الوحاظی نے حدیث بیان کی (کہا): ہمیں اسحاق بن یحییٰ الکلبی نے حدیث بیان کی (کہا): ہمیں (ابن شہاب) الزہری نے حدیث بیان کی (کہا): مجھے سعید بن المسیب نے حدیث بیان کی، بے شک انھیں (سیدنا) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے حدیث بیان کی (آپ ﷺ نے) فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں نازل فرمایا تو تکبر کرنے والی ایک قوم کا ذکر کر کے فرمایا: یقیناً جب انھیں لا الٰہ الا اللہ کہا جاتا ہے تو تکبر کرتے ہیں۔ (الصّٰفّٰت:۳۵)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جب کفر کرنے والوں نے اپنے دلوں میں جاہلیت والی ضد رکھی تو اللہ

نے اپنا سکون واطمینان اپنے رسول اور مومنوں پر اتارا اور ان کے لئے کلمۃ التقویٰ کو لازم قرار دیا اور وہ اس کے زیادہ مستحق اور اہل تھے۔ (الفتح:۲۶)

اور وہ (کلمۃ التقویٰ) لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے۔

(صلح) حدیبیہ والے دن جب رسول اللہ ﷺ نے مدت (مقرر کرنے) والے فیصلے میں مشرکین سے معاہدہ کیا تو مشرکوں نے اس کلمے سے تکبر کیا تھا۔

(کتاب الاسماء والصفات ص ۱۰۵، ۱۰۶، دوسرا نسخہ ص ۱۳۱، تیسرا نسخہ مطبوعہ انوار محمدی الہ آباد ۱۳۱۳ھ ص ۸۱ باب ماجاء فی فضل الکلمۃ الباقیۃ فی عقب ابراہیم علیہ السلام)

اس روایت کی سند حسن لذاتہ ہے۔

حاکم، اصم، محمد بن اسحاق الصغانی، زہری اور سعید بن المسیب سب اعلیٰ درجے کے ثقہ ہیں۔

۱: یحییٰ بن صالح الوحاظی صحیح بخاری و صحیح مسلم کے راوی اور جمہور محدثین کے نزدیک ثقہ تھے۔ امام ابوحاتم الرازی نے کہا: صدوق، امام یحییٰ بن معین نے کہا: "ثقة"

(الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم ۹/۱۵۸ وسندہ صحیح)

امام بخاری نے فرمایا: **ویحي ثقة** (کتاب الضعفاء الصغیر: ۱۴۵، طبع ہندیہ)

یحییٰ بن صالح پر درج ذیل علماء کی جرح ملتی ہے:

۱: احمد بن حنبل ۲: اسحاق بن منصور ۳: عقیلی ۴: ابواحمد الحاکم

امام احمد کی جرح کی بنیاد ایک مجہول انسان ہے۔ دیکھئے الضعفاء للعقیلی (۴/۴۰۸)

یہ جرح امام احمد کی توثیق سے معارض ہے۔

ابوزرعہ الدمشقی نے کہا: "**لم يقل يعني أحمد بن حنبل في يحيى بن صالح إلا خيراً**"

احمد بن حنبل نے یحییٰ بن صالح کے بارے میں صرف خیر ہی کہا ہے۔

(تاریخ دمشق لابن عساکر ۶۸/۸۷ وسندہ صحیح)

اسحاق بن منصور کی جرح کا راوی عبداللہ بن علی ہے۔ (الضعفاء للعقیلی ۴/۴۰۹)

عبداللہ بن علی کا ثقہ و صدوق ہونا ثابت نہیں ہے لہٰذا یہ جرح ثابت ہی نہیں ہے۔

عقیلی کی جرح الضعفاء الکبیر میں نہیں ملی البتہ تاریخ دمشق (۶۸/ ۷۹) میں یہ جرح ضرور موجود ہے لیکن اس جرح کا راوی یوسف بن احمد غیر موثق (مجہول الحال) ہے لہٰذا یہ جرح بھی ثابت نہیں ہے۔

ابو احمد الحاکم (اور بشرطِ صحت احمد، اسحاق بن منصور اور عقیلی) کی جرح جمہور محدثین کی توثیق کے مقابلے میں مردود ہے۔ حافظ ذہبی نے کہا: '' **ثقة في نفسه ، تكلم فيه لرأيه** ''
وہ بذاتِ خود ثقہ تھے، ان کی رائے کی وجہ سے (ابو احمد الحاکم وغیرہ کی طرف سے) ان میں کلام کیا گیا ہے۔ (معرفۃ الرواۃ المتکلم فیھم بما لا یوجب الرد: ۳۶۷)

حافظ ابن حجر نے کہا: خالد (بن مخلد) اور یحییٰ بن صالح دونوں ثقہ ہیں۔

(فتح الباری ج ۹ ص ۵۲۴ تحت ح ۵۳۷۸ کتاب الاطعمۃ باب الاکل مما یلیہ)

اور کہا: **صدوق من أهل الرأي** (تقریب التہذیب: ۷۵۶۸)

تقریب التہذیب کے محققین نے لکھا ہے: '' **بل ثقة** '' بلکہ وہ ثقہ تھے۔ (التحریر ج ۴ ص ۸۸)

خلاصۃ التحقیق: یحییٰ بن صالح ثقہ و صحیح الحدیث ہیں۔

۲: اسحاق بن یحییٰ بن علقمہ الکلبی الحمصی العوصی صحیح بخاری کے (شواہد کے) راوی ہیں۔
دیکھئے صحیح البخاری (۶۸۲، ۱۳۵۵، ۳۲۹۹، ۳۴۴۳، ۳۹۲۷، ۶۶۴۷، ۷۰۰۰، ۷۱۷۱، ۷۳۸۲)

حافظ ابن حبان نے انھیں کتاب الثقات (ج ۶ ص ۴۹) میں ذکر کیا اور صحیح ابن حبان (الاحسان: ۶۰۷۴) میں ان سے روایت لی ہے۔

دارقطنی نے کہا: '' **أحاديثه صالحة والبخاري يستشهده ولا يعتمده في الأصول** ''
ان کی حدیثیں صالح (اچھی) ہیں، بخاری شواہد میں ان سے روایت لیتے ہیں اور اصول میں ان پر اعتماد نہیں کرتے۔ (سوالات الحاکم للدارقطنی: ۲۸۰)

تنبیہ: امام بخاری شواہد میں جس راوی سے روایت لیتے ہیں وہ ان کے نزدیک ثقہ ہوتا ہے۔ (اِلا یہ کہ کسی خاص راوی کی تخصیص ثابت ہو جائے)
دیکھئے شروط الائمۃ الستۃ لمحمد بن طاہر المقدسی (ص ۱۸ اور دوسرا نسخہ ص ۱۴)

ابوعوانہ نے صحیح ابی عوانہ (المستخرج علیٰ صحیح مسلم) میں ان سے روایت لی ہے۔ (ج۲ص۲۹۳)
حافظ ابن حجر نے کہا: " صدوق، قیل: إنه قتل أباه " سچا ہے، کہا گیا ہے کہ اس نے اپنے باپ کو قتل کیا تھا۔ (تقریب التہذیب:۳۹۱)
باپ کو قتل کرنے والا قصہ تہذیب الکمال (طبع مؤسسۃ الرسالہ ج۱ص۲۰۲) میں ادھوری (غیر مکمل) سند " ابو عوانة الأسفرائني عن أبي بكر الجذامي عن ابن عوف قال: يقال " سے مروی ہے۔ یہ قصہ کئی لحاظ سے مردود ہے:

① ابوعوانہ تک سند غائب ہے۔
② ابوبکر الجذامی نامعلوم ہے۔
③ یقال (کہا جاتا ہے) کا قائل نامعلوم ہے۔

صاحبِ تہذیب الکمال نے بغیر کسی سند کے محمد بن یحییٰ الذہلی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے اسحاق بن یحییٰ کو طبقۂ ثانیہ میں ذکر کیا اور کہا: " مجهول: لم أعلم له روايةً غير يحيى بن صالح الوحاظي فإنه أخرج إليّ له أجزاء من حديث الزهري فوجدتها مقاربة فلم أكتب منها إلا شيئاً يسيراً "
مجہول ہے، میرے علم میں یحییٰ بن صالح الوحاظی کے سوا کسی نے اس سے روایت بیان نہیں کی۔ انھوں نے میرے سامنے اس کی زہری سے حدیثوں کے اجزاء پیش کئے تو میں نے دیکھا کہ یہ روایات مقارب (صحیح ومقبول اور ثقہ راویوں کے قریب قریب) ہیں۔ میں نے ان میں سے تھوڑی روایتیں ہی لکھی ہیں۔ (ج۱ص۲۰۲)

حافظ ابوبکر محمد بن موسیٰ الحازمی (متوفی ۵۹۱ھ) نے امام زہری کے شاگردوں کے طبقۂ ثانیہ کے بارے میں کہا کہ وہ مسلم کی شرط پر ہیں۔ (شروط الائمۃ الخمسہ ص۵۷)
معلوم ہوا کہ یہ راوی امام محمد بن یحییٰ الذہلی کے نزدیک مجہول ہونے کے ساتھ ثقہ و صدوق اور مقارب الحدیث ہے(!) بصورتِ دیگر یہ جرح جمہور محدثین کے مقابلے میں مردود ہے۔

خلاصۃ التحقیق: اسحاق بن یحییٰ الکلبی حسن الحدیث ہیں۔

فائدہ: لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ والی یہی روایت شعیب بن ابی حمزہ نے ''عن الزهري عن سعيد بن المسيب عن أبي هريرة'' کی سند سے بیان کر رکھی ہے۔

(کتاب الایمان لابن مندہ ج۱ص ۳۵۹ ح۱۹۹ وسندہ صحیح إلی شعیب بن ابی حمزہ)

اس شاہد کے ساتھ اسحاق بن یحییٰ کی روایت مزید قوی ہو جاتی ہے۔ والحمدللہ

دوسری دلیل: لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔

حافظ ابن حزم لکھتے ہیں: '' فهذا إجماع صحيح كا لإجماع على قول لا إله إلا الله محمد رسول الله ''پس یہ اجماع صحیح ہے جیسا کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے کلمے پر اجماع ہے۔ (المحلی ج۱۰ص ۴۲۳، العین، مسئلہ: ۲۰۲۵)

حافظ ابن حزم مزید لکھتے ہیں: '' وكذلك ما اتفق عليه جميع أهل الإسلام بلاخلاف من أحد منهم من تلقين موتاهم: لا إله إلا الله محمد رسول الله''

اور اسی طرح تمام اہلِ اسلام بغیر کسی اختلاف کے اس پر متفق ہیں کہ مرنے والوں کو (موت کے وقت) لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ (پڑھنے) کی تلقین کرنی چاہئے۔

(الفصل فی الملل والاھواء والنحل ج۱ص ۱۶۲، الرد علی من زعم أن الانبیاء علیہم السلام لیسوا أنبیاء الیوم)

معلوم ہوا کہ کلمۂ اخلاص: کلمۂ طیبہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا صحیح حدیث اور اجماع سے ثبوت موجود ہے۔ والحمدلله وصلى الله على نبيه وسلم .

تنبیہ: ''مفتی'' محمد اسماعیل طورو دیوبندی نے ''شش کلمے'' کے تحت لکھا ہے:

'' کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

(ترجمہ) نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ کے اور حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔

(البخاری، مسلم ج۱ص ۷۳) ''

(مختصر نصاب ص ۲۴ طبع ۲۰۰۵ء دار الافتاء جامعہ اسلامیہ، صدر کامران مارکیٹ راولپنڈی)

یہ مکمل کلمہ نہ تو صحیح بخاری کی کسی حدیث میں لکھا ہوا ہے اور نہ صحیح مسلم کی کسی حدیث

میں اس طرح موجود ہے۔ مفتی بنے ہوئے علماء کو اپنی تحریروں میں احتیاط کرنی چاہیے اور غلط حوالوں سے کلی اجتناب کرنا چاہیے۔ وما علینا إلا البلاغ (۱۶/فروری ۲۰۰۷ء)

[الحدیث: ۳۵]

نور اور بشر کا مسئلہ؟

سوال کیا یہ جائز ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو صرف نور مانا جائے اور بشر نہ مانا جائے؟ دلیل سے جواب دیں۔ (حاجی نذیر خان، دامان حضرو)

الجواب اس میں کوئی شک نہیں کہ نبی اکرم ﷺ رسول اللہ ہونے کے ساتھ ساتھ انسان اور بشر تھے جیسا کہ قرآن مجید، احادیثِ متواترہ اور اجماع سے ثابت ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((إنما أنا بشر)) إلخ میں تو بشر ہوں۔ الخ

(صحیح بخاری: ۶۹۶۷، صحیح مسلم: ۱۷۱۳)

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''کان بشرًا من البشر'' آپ (ﷺ) انسانوں میں سے ایک بشر تھے۔ (الادب المفرد للبخاری: ۵۴۱ وسندہ صحیح، روایۃ البخاری عن عبداللہ بن صالح کاتب اللیث صحیحۃ وتابعہ عبداللہ بن وہب عند ابن حبان فی صحیحہ، الاحسان: ۵۶۴۶، دوسرا نسخہ: ۵۶۷۵)

تمام صحابہ و تابعین کا یہی عقیدہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ سیدنا آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے اور بشر تھے۔ کسی ایک آیت یا حدیث سے آپ کی بشریت کی نفی ثابت نہیں ہے۔

انگریزوں کے دور میں پیدا ہونے والے بریلوی فرقے کی مشہور کتاب ''بہارِ شریعت'' میں لکھا ہوا ہے کہ ''عقیدہ۔ نبی اس بشر کو کہتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے لئے وحی بھیجی ہو۔ اور رسول بشر ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ملائکہ میں بھی رسول ہیں۔ عقیدہ۔ انبیاء سب بشر تھے اور مرد، نہ کوئی جن نبی ہوا نہ عورت۔'' (حصہ اول ص ۷)

اس میں کوئی شک نہیں کہ رسول اللہ ﷺ بشر ہونے کے ساتھ رسول، نبی اور نورِ ہدایت بھی تھے لیکن یہ کہنا کہ آپ بشر نہیں بلکہ نور من نور اللہ تھے، کتاب و سنت کے خلاف اور باطل عقیدہ ہے اور یہ کہنا بھی غلط ہے کہ آپ نوری مخلوق تھے جو لباسِ بشریت میں دنیا میں

تشریف لائے تھے، کیونکہ اس عقیدے کی بھی کوئی دلیل نہیں ہے۔ وما علینا إلا البلاغ
(۲۰/ دسمبر ۲۰۰۸ء)

رسول اللہ ﷺ کا سایہ مبارک

سوال کیا کسی حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا سایہ تھا؟

(عدنان الطاف، اسلام آباد)

الجواب جی ہاں! رسول اللہ ﷺ کے سایہ کا ثبوت کئی احادیثِ صحیحہ میں ہے اور اس کے خلاف کچھ بھی ثابت نہیں ہے۔

طبقات ابن سعد (۸/ ۱۲۶، ۱۲۷، واللفظ لہ) اور مسند احمد (۶/ ۱۳۱، ۱۳۲، ۲۶۱) میں امام مسلم کی شرط پر شمیسہ رحمہا اللہ سے روایت ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: " فبینما أنا یوماً في منصف النهار ، إذا أنا بظل رسول اللہ ﷺ مقبلاً " دوپہر کا وقت تھا کہ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کا سایہ آرہا ہے۔

شمیسہ کو امام ابن معین نے ثقہ کہا ہے۔ (تاریخ عثمان بن سعید الدارمی: ۴۱۸) اور ان سے شعبہ نے بھی روایت کی ہے اور شعبہ (حتی الامکان) اپنے نزدیک عام طور پر صرف ثقہ سے روایت کرتے تھے۔

"کما ھو الأغلب" [دیکھئے: تہذیب التہذیب ۱/ ۴، ۵]

لہٰذا یہ سند صحیح ہے۔ اسی طرح کی ایک طویل روایت سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے۔ جس کا ایک حصہ کچھ یوں ہے: "فلما کان شهر ربیع الأول ، دخل علیها ، فرأت ظله .... " إلخ جب ربیع الاول کا مہینہ آیا تو آپ (ﷺ) اُن کے پاس تشریف لائے، انھوں نے آپ کا سایہ دیکھا... الخ [مسند احمد ۶/ ۳۳۸]

اس کی سند صحیح ہے اور جو اسے ضعیف کہتا ہے وہ خطا پر ہے کیونکہ شمیسہ کا ثقہ ہونا ثابت ہو چکا ہے۔

صحیح ابن خزیمہ (۲/ ۵۱ ح ۸۹۲) میں بھی صحیح سند کے ساتھ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((حتی رأیت ظلّي و ظلّکم ...... إلخ))
یہاں تک کہ میں نے اپنا اور تمھارا سایہ دیکھا...... الخ
اسے حاکم اور ذہبی دونوں نے صحیح کہا ہے۔ [المستدرک للحاکم ۴/۴۵۶]
کسی صحیح یا حسن روایت سے قطعاً یہ ثابت نہیں کہ نبی ﷺ کا سایہ نہیں تھا۔ علامہ سیوطی نے خصائص کبریٰ میں جو روایت نقل کی ہے وہ اصول حدیث کی رُو سے باطل ہے۔

(ہفت روزہ الاعتصام لاہور، ۲۷/ جون ۱۹۹۷ء)[الحدیث: ۴۰]

نبی ﷺ کی قبر کے پاس درود اور اس کا سماع؟

سوال جو درود نبی ﷺ کی قبر مبارک کے پاس پڑھا جاتا ہے۔ کیا آپ ﷺ اسے بنفسہ سماعت فرماتے ہیں؟ دلیل سے واضح کریں۔ (فرحان الٰہی، راولپنڈی)

الجواب ایک روایت میں آیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:
"من صلّی عند قبري سمعته و من صلّی عليّ نائیًا أبلغته" "جو شخص مجھ پر میری قبر کے پاس درود پڑھتا ہے تو میں اسے سنتا ہوں اور جو شخص مجھ پر دور سے درود پڑھتا ہے تو وہ مجھے پہنچایا جاتا ہے۔

(کتاب الضعفاء للعقیلی ۴/ ۱۳۶، ۱۳۷، مصنفات ابی جعفر بن البختری: ۷۳۵، شعب الایمان للبیہقی: ۱۵۸۳، کتاب الموضوعات لابن الجوزی ۱/ ۳۰۳ ح ۵۶۲، امالی ابن شمعون بلفظ آخر: ۲۵۵، تاریخ دمشق لابن عساکر ۵۹/ ۲۲۰)

عقیلی نے کہا: "لا أصل له من حدیث الأعمش" "اعمش کی حدیث سے اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ (ص ۱۳۷ ج ۴)

ابن الجوزی نے کہا: "ھٰذا حدیث لا یصح" "یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ (الموضوعات ۱/ ۳۰۳)
اس کا راوی ابو عبدالرحمٰن محمد بن مروان السدی ہے جس کے بارے میں ابن نمیر نے کہا: "کذاب" (الضعفاء للعقیلی ۱/ ۱۳۶ وسندہ حسن، الحدیث: ۲۴ ص ۵۲)

امام بخاری اور ابو حاتم رازی نے کہا: اس کی حدیث بالکل لکھی نہیں جاتی۔

(الضعفاء الصغیر: ۳۵۰، الجرح والتعدیل ۸/ ۸۶)

ابن حبان نے کہا: یہ ثقہ راویوں سے موضوع حدیثیں بیان کرتا تھا۔

(المجروحین ۲/۲۸۶، الحدیث: ۲۴ص ۵۲)

معلوم ہوا کہ یہ سند موضوع ہے۔ حافظ ابن القیم نے ابوالشیخ (الاصبہانی) کی طرف منسوب کتاب "الصلوٰۃ علی النبی ﷺ" سے اس کی دوسری سند دریافت کی ہے۔

(دیکھئے جلاء الافہام ص ۵۴)

اس سند میں عبدالرحمٰن بن احمد الاعرج مجہول الحال راوی ہے لہٰذا یہ سند ابومعاویہ الضریر تک بھی ثابت نہیں ہے۔ سلیمان بن مہران الاعمش مشہور مدلس تھے اور ان کی عن والی روایت ابوصالح سے ہو یا کسی اور سے، غیر صحیحین میں ضعیف ہی ہوتی ہے۔ دیکھئے ماہنامہ الحدیث: ۳۳ص ۳۸ تا ۴۳

حافظ ذہبی کا اعمش کی ابوصالح وغیرہ سے روایت کو محمول علی الاتصال قرار دینا غلط ہے۔

خلاصۃ التحقیق: یہ روایت دونوں سندوں کے ساتھ ضعیف یعنی مردود ہے۔ نیز دیکھئے الضعیفۃ للالبانی (۲۰۳)

ایک روایت میں آیا ہے کہ نبی ﷺ کی قبر کے پاس ایک فرشتہ مقرر ہے جو آپ کو امتیوں کے درود پہنچاتا ہے۔ (الصحیحۃ للالبانی: ۱۵۳۰ بحوالہ الدیلمی والسخاوی)

یہ روایت اپنی دونوں سندوں کے ساتھ ضعیف و مردود ہے۔ پہلی سند میں بکر بن خداش مجہول الحال اور محمد بن عبداللہ بن صالح المروزی مجہول ہے۔ دوسری سند میں نعیم بن ضمضم مجہول اور عمران بن حمیری مجہول الحال ہے لہٰذا اسے حسن قرار دینا غلط ہے۔

صحیح روایت میں آیا ہے کہ اللہ کے فرشتے زمین میں پھرتے ہیں اور نبی ﷺ کو آپ کی امت کی طرف سے سلام پہنچاتے ہیں۔ (سنن النسائی ۳/۴۳ ح ۱۲۸۳، فضل الصلوٰۃ علی النبی ﷺ لاسماعیل بن اسحاق القاضی: ۲۱ وسندہ صحیح، سفیان الثوری صرح بالسماع) [الحدیث: ۳۸]

وسیلے کی حقیقت

سوال عام طور پر بعض لوگ توسل بالموتی کا عقیدہ رکھتے ہیں، ان کے بارے

میں وضاحت کریں۔ علمائے سلف پر حنفی (!) حضرات الزام لگاتے ہیں کہ وہ توسل بالموتی کے قائل تھے، قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔ (حافظ محمد عمران، حافظ آباد)

الجواب توسل بالاموات کا مطلب یہ ہے کہ دعا میں مردہ لوگوں کا وسیلہ پیش کیا جائے، یہ توسل بدعت ہے۔ کتاب وسنت اور سلف صالحین سے توسل بالاموات ثابت نہیں ہے لہٰذا اس سے کلی اجتناب کرنا چاہئے۔

یہ ایسی بدعت جو چور دروازے کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کا ڈائریکٹ تعلق شرک سے ہے یعنی یہی توسل بسا اوقات شرک کی بھیانک شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس سلسلے میں تفصیلی معلومات کے لئے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتاب الوسیلہ اور دیگر کتب کا مطالعہ کریں۔ [شہادت، دسمبر ۲۰۰۰ء]

طاہر القادری صاحب کے ایک حوالے کی تحقیق

سوال ایک روایت میں آیا ہے کہ سیدنا آدم علیہ السلام نے نبی کریم سیدنا محمد ﷺ کے وسیلے سے دعا کی تھی۔ (المستدرک للحاکم ۶۱۵/۲ ح ۴۲۲۸ دلائل النبوۃ للبیہقی ۴۸۹/۵)

یہ روایت نقل کر کے ڈاکٹر محمد طاہر القادری (بریلوی) صاحب لکھتے ہیں:

"☆ امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح الاسناد کہا ہے۔

☆ امام بیہقی نے بھی اسے صحیح قرار دیا ہے" (الاربعین فی فضائل النبی الامین ص ۵۵ طبع چہارم ۲۰۰۲ء)

کیا واقعی امام بیہقی نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے؟ اور کیا واقعتاً یہ روایت صحیح ہے؟

(ابوثاقب محمد صفدر حضروی)

الجواب عرض ہے کہ امام بیہقی نے اس روایت کو ہرگز صحیح قرار نہیں دیا۔ بلکہ امام بیہقی رحمہ اللہ یہ روایت لکھ کر فرماتے ہیں: "تفرد به عبدالرحمٰن بن زيد بن أسلم من هذا الوجه عنه وهو ضعيف" اس سند کے ساتھ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کا تفرد ہے اور وہ ضعیف ہے۔ (دلائل النبوۃ ۴۸۹/۵)

ایسے ہی طاہر القادری صاحب اپنی دوسری کتاب میں یہی حدیث نقل کر کے امام بیہقی

وغیرہ سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے اسے ''صحیح قرار دیا ہے''
(دیکھئے عقیدۂ توحید اور حقیقتِ شرک ص ۲۶۶ طبع ہفتم جون ۲۰۰۵ء)
معلوم ہوا کہ طاہر القادری صاحب کا یہ کہنا کہ ''امام بیہقی نے بھی اسے صحیح قرار دیا ہے'' صریح جھوٹ ہے۔
تنبیہ: امام حاکم کی تردید حافظ ذہبی نے تلخیص المستدرک میں کردی ہے اور فرمایا ہے:
''بل موضوع'' بلکہ یہ روایت موضوع (من گھڑت) ہے۔
اس روایت کی سند عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم اور عبداللہ بن مسلم الفہری کی وجہ سے موضوع ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے سلسلۃ الاحادیث الضعیفہ والموضوعہ للشیخ الالبانی رحمہ اللہ
(۱/۳۸، ۴۷ ح ۲۵) وما علینا إلا البلاغ [الحدیث: ۲۲]

قطب وابدال کی شرعی حیثیت

سوال کچھ لوگ قطب اور ابدال کے وجود پر حدیث پیش کرتے ہیں۔ یہ حدیث کہاں ہے اور اس کی حیثیت کیا ہے؟ (سید عبدالناصر، ضلع مردان)

الجواب سنن ابی داود (کتاب المہدی باب ا ح ۴۲۸۶) اور مسند احمد (ج ۲ ص ۳۱۶) میں ہے کہ ''فإذا رأى الناس ذلك أتاه أبدال الشام وعصائب أهل العراق فيبايعونه إلخ'' [پھر جب لوگ یہ دیکھیں گے تو اس کے پاس شام کے ابدال اور عراق کی ٹولیاں آکر اُس کی بیعت کریں گی۔ الخ]
اس کی سند قتادہ کی تدلیس کی وجہ سے ضعیف ہے۔ ''صاحب له'' بھی مجہول ہے۔
مسند احمد (ج ۵ ص ۳۲۲) کی ایک روایت میں ہے کہ
''الأبدال في هذه الأمة ثلاثون إلخ'' [اس امت میں تیس ابدال ہیں۔ الخ]
امام احمد نے اس روایت کو ''منکر'' کہا ہے۔ اس کے راوی حسن بن ذکوان سخت مدلس تھے اور عن سے روایت کی ہے۔ عبدالواحد بن قیس ضعیف علی الراجح راوی ہے۔
نیز سیدنا عبادہ رضی اللہ عنہ سے اس کی ملاقات بھی ثابت نہیں۔ یعنی یہ سند ضعیف ہی ضعیف ہے۔

مسند احمد (ج ۱ ص ۱۱۲) میں ہے کہ "الأبدال یکونون بالشام إلخ" [ابدال شام میں ہوں گے۔ الخ]

اس کی سند انقطاع کی وجہ سے ضعیف ہے۔ شریح بن عبید کی سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ملاقات ثابت نہیں ہے۔ دیکھئے تعلیق الشیخ احمد شاکر علی المسند (ج ۲ ص ۱۷۱)

وقال ابن عساکر: "هذا منقطع" [اور ابن عساکر نے کہا: یہ منقطع ہے۔]

(الحاوی للفتاوی ۲/۲۴۲)

معلوم ہوا کہ ابدال والی تمام روایات ضعیف و مردود ہیں۔ بعض علماء کا یہ قول کہ "فلاں شخص ابدال میں سے تھا" کی کوئی شرعی دلیل نہیں ہے اور نہ اس سے صوفیوں والے ابدال مراد ہیں۔ اس لئے "نظم اللآل في الكلام على الأبدال" اور "الخبر الدال على وجود القطب والأوتاد والنجباء والأبدال" جیسی کتابیں لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

ثبت العرش ثم انقش. [پہلے تخت کو ٹھہرائیں پھر نقش نگاری کریں۔]

علامہ سیوطی نے سیف بن عمر (کذاب) وغیرہ کی روایات جمع کر کے ابدال وغیرہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ (دیکھئے الحاوی للفتاوی ج ۲ ص ۲۴۲)

قطب اقطاب والی ایک روایت بھی نہیں ملی۔

علامہ ابن القیم لکھتے ہیں: "ومن ذلك، أحاديث الأبدال والأقطاب والأغواث والنقباء والنجباء والأوتاد كلها باطلة على رسول الله ﷺ"

اور اس میں سے ابدال، اقطاب (جمع قطب)، اغواث (جمع غوث)، نقباء (جمع نقیب)، نجباء (جمع نجب) اور اوتاد (جمع وتد) کی تمام احادیث باطل ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی طرف انھیں باطل طور پر منسوب کیا گیا ہے۔ (المنار المنیف ص ۱۳۶ فقرہ: ۳۰۷)

اسے ملا علی قاری نے بھی الاسرار المرفوعۃ فی الاخبار الموضوعۃ (ص ۴۷۰) میں نقل کیا ہے۔

[شہادت، دسمبر ۲۰۰۱ء]

فائدہ: سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: فتنہ ہوگا، اس میں لوگ اس طرح تپیں گے جس طرح سونا

بھٹی میں تپتا ہے لہٰذا اہلِ شام کو بُرا نہ کہو کیونکہ اُن میں ابدال ہیں اور شامی ظالموں کو بُرا کہو... پھر لوگ قتال کریں گے اور انھیں شکست ہوگی پھر ہاشمی ظاہر ہوگا تو اللہ تعالیٰ انھیں دوبارہ باہم شیر وشکر بنا دے گا اور اپنی نعمتوں کی فراوانی فرما دے گا پھر لوگ اسی حالت پر ہوں گے کہ دجال کا خروج ہوگا۔

(المستدرک للحاکم ۵۵۳/۴ ح ۸۶۵۸ وسندہ صحیح وصححہ الحاکم ووافقہ الذہبی)

اس موقوف صحیح روایت میں ابدال کا ذکر ملتا ہے لیکن یہاں ابدال سے مراد نیک اور صحیح العقیدہ لوگ ہیں، نہ کہ دنیا کا نظام بدلنے یا چلانے والے لہٰذا اہلِ بدعت کا ابدال والی روایات سے نیک لوگوں کے بارے میں الوہیت اور ربوبیت والے عقائد گھڑنا باطل ہے۔

کشف کی حقیقت؟

سوال کشف کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ (ایک سائل)

الجواب کشف: مکاشفہ کو کہتے ہیں جس میں جنت، دوزخ، ملائکہ اور عالمِ غیر متناہی کی باتیں مکشوف ہو جاتی ہیں۔ دیکھئے کشاف اصطلاحات الفنون (ج ۲ ص ۱۲۵۴)

عرفِ عام میں کشف اور الہام ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔

صحیح بخاری (۳۴۶۹) میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

((إنه قد كان فيما مضى قبلكم من الأمم محدثون، وإنه إن كان في أمتي هذه منهم فإنه عمر بن الخطاب))

تم سے پہلی امتوں میں ایسے لوگ گزرے ہیں جنھیں کشف (والہام) ہوتا تھا اور بے شک اگر اس اُمت (مسلمہ) میں اُن میں سے کوئی ہوتا تو عمر بن خطاب ہوتے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اُمتِ مسلمہ میں کسی شخص کو بھی کشف والہام نہیں ہوتا۔

خواب میں کسی چیز کی بشارت یا کسی آدمی کا گمان وقیاس اس سے سراسر مختلف بات ہے۔

یاد رہے کہ جن روایات میں آیا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سینکڑوں میل دور سے ساریہ کو پکارا تھا: "یا ساریة الجبل" اے ساریہ، پہاڑ کے قریب جاؤ۔

یہ ساری روایات اصولِ حدیث کی رُو سے ضعیف اور مردود ہیں۔ محمد بن عجلان مدلس راوی ہیں لہٰذا اُن کی عن والی روایت کو ضعیف و مردود ہی سمجھا جائے گا۔

خلاصہ یہ کہ کشف بھی غیب دانی کا ایک نام ہے اور امتِ مسلمہ میں قیامت تک کسی کو کشف یا الہام نہیں ہوتا۔

نام نہاد بزرگوں کے جن واقعات میں کشف والہام کا تذکرہ ہے، وہ سارے واقعات بے اصل اور مردود ہیں۔ [الحدیث:۲۸]

بدعتِ لغوی اور بدعتِ شرعی میں فرق

سوال ① بریلوی مولوی اپنی مروجہ بدعات کو ثابت کرنے کے لیے درج ذیل دلائل پیش کرتے ہیں:

ا۔ حضرت عمرؓ کا تراویح کی جماعت کا حکم دینا اور فرمانا "نعمت البدعة هذه" یہ ایک اچھی بدعت ہے۔ لہٰذا اچھی بدعت جائز ہے۔

۲۔ مرقاۃ باب الاحکام میں حدیث ہے: جس کام کو مسلمان اچھا جانیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہے۔

۳۔ مشکوۃ باب العلم میں ہے: "جو کوئی اسلام میں اچھا طریقہ جاری کرے گا اس کو اس کا ثواب ملے گا اور اس کو بھی جو اس پر عمل کریں گے اور ان کے ثواب میں کچھ کمی نہ ہوگی۔ اور جو شخص اسلام میں برا طریقہ جاری کرے گا تو اس پر اس کا گناہ بھی ہے اور اس کا بھی جو اس پر عمل کریں گے اور ان کے گناہ میں کچھ کمی نہ ہوگی"

آپ ذرا ان دلائل کا پوسٹ مارٹم کردیں۔ جزاکم اللہ خیراً

② کیا "بدعت حسنہ" اور "بدعت سیئہ" کی تقسیم درست ہے؟ جبکہ حضرت عمرؓ کا عمل وقول موجود ہے یعنی تراویح کی جماعت کا حکم اور فرمایا: "نعمت البدعة هذه" یہ ایک اچھی بدعت ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "وكل بدعة ضلالة" ہر بدعت گمراہی ہے۔ (حافظ عاطف منظور، فتح ٹاؤن اوکاڑہ)

الجواب "نعمت البدعة هذه" سے مراد بدعت شرعی نہیں بلکہ بدعت لغوی ہے۔ دیکھئے منہاج السنۃ لشیخ الاسلام ابن تیمیہ ومرعاۃ المفاتیح (۴/۳۲۷ ح ۱۳۰۹) یہی تحقیق شاطبی (الاعتصام ۱/۲۵۰) اور ابن رجب (جامع العلوم والحکم: ۲۸) کی ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: " البدعة علیٰ قسمين :القسم الأول : تارة تكون بدعة شرعية كقوله ﷺ :

((فإن كل محدثة بدعة و كل بدعة ضلالة .))

القسم الثاني : و تارة تكون بدعة لغوية ، كقول أمير المؤمنين عمر بن الخطاب رضي الله عنه ـ عن جمعه إياهم علىٰ صلاة التراويح و استمرارهم : نعمت البدعة هذه "

بدعت کی دو قسمیں ہیں: (۱) بدعتِ شرعی جیسے آپ ﷺ کا فرمان ہے: (دین میں) ہر نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

(۲) اور کبھی یہ بدعت لغوی ہوتی ہے جیسے امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا قول، جو لوگوں کو نمازِ تراویح پر مستقل جمع کرنے کے بارے میں ہے: یہ اچھی بدعت ہے۔

(تفسیر ابن کثیر ۱/۳۴۸، البقرۃ: ۱۱۷)

یاد رہے کہ تراویح کی جماعت رسول اللہ ﷺ سے قولاً اور فعلاً دونوں طرح ثابت ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہر وہ بدعت گمراہی ہے جس کی شریعت میں کوئی دلیل نہیں ہے، اسے بدعتِ شرعی کہا جاتا ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے قول میں بدعت سے مراد شرعی بدعت نہیں بلکہ ایک ایسے عمل کو بدعت کہا گیا ہے جو کہ سنت سے ثابت ہے لہٰذا اسے لغوی بدعت کہا جائے گا، یہ شرعی بدعت نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((من أحدث في ديننا ما ليس منه فهو رد .))

جس نے ہمارے دین میں کوئی ایسی بات نکالی جو اس میں موجود نہیں تو وہ مردود ہے۔

(جزء من حدیث لوین: ۶۹ وسندہ صحیح، شرح السنۃ للبغوی: ۱۰۳، وسندہ حسن)

سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی قول "ما رآه المسلمون حسناً فهو عند الله حسن" میں المسلمون سے مراد تمام (صحیح العقیدہ) مسلمان ہیں لہٰذا یہ حدیث اجماع کی دلیل ہے۔

"من سن سنة حسنة" إلخ سے مراد طریقہ جاری کرنا ہے، طریقہ گھڑنا اور ایجاد کرنا نہیں ہے۔ جو طریقہ سنت سے ثابت ہے اسے جاری کرنے میں ہی ثواب ہے۔

[بدعتِ حسنہ اور سیئہ کی تقسیم قطعاً درست نہیں ہے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے قول کو اس سلسلے میں پیش کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ اس سے مراد لغوی بدعت ہے جیسا کہ اُوپر مذکور ہے۔ نیز سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان: "كل بدعة ضلالة وإن رآها الناس حسناً" ہر بدعت گمراہی ہے اگرچہ لوگ اسے (بدعتِ) حسنہ ہی قرار دیں۔ (السنہ للمروزی: ۸۱ وسندہ حسن) بھی اس تقسیم کو باطل قرار دیتا ہے۔] [الحدیث: ۱۰]

اہلِ بدعت کا ذبیحہ

سوال "اہلِ کتاب کے علاوہ مشرکین کا ذبیحہ حرام ہے؟ پاکستان کے قصابوں کے ذبیحہ کے متعلق کیا حکم ہے؟ جبکہ اکثریت قصابوں کی بے دین ہے۔

ان آثار کی سند کیسی ہے؟

۱: سعید بن منصور نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ سوائے مسلمانوں اور اہلِ کتاب کے کسی اور کا ذبیحہ مت کھاؤ۔ (کشاف القناع ۶/۲۰۵)

۲: ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سوال کیا گیا کہ اگر ایک مسلمان آدمی ذبیحہ کرتے وقت بسم اللہ بھول جائے تو؟ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ "وہ ذبیحہ کھایا جائے گا"

سوال ہوا: "اگر مجوسی بسم اللہ پڑھ کر ذبح کرے تو؟" انھوں نے فرمایا کہ "وہ ذبیحہ نہیں کھایا جائے گا" (المستدرک للحاکم ۴/۲۳۳ ح ۷۵۷۲)

۳: ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: تم ایسے علاقے میں آگئے ہو جہاں مسلمان قصاب نہیں ہیں بلکہ نبطی یا مجوسی ہیں لہٰذا جب گوشت خریدو تو معلوم کیا کرو، اگر وہ یہودی یا نصرانی کا ذبح کیا ہوا ہو تو کھاؤ، ان کا ذبیحہ اور کھانا تمھارے لئے حلال ہے۔

(مصنف عبدالرزاق ۴/۴۸۷ ح ۸۵۷۸)

کیا رسول اللہ ﷺ کے صحابہ یا تابعین میں سے کوئی مشرکین کے ذبیحے کے جواز کا بھی قائل ہے؟ براہِ مہربانی اس مسئلے کی تفصیلاً راہنمائی فرمائیں۔

اہلِ کتاب کے علاوہ مشرکین کے ذبیحے کو حرام قرار دینے والوں کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱: ذبیحہ کرنا عبادت ہے اور اللہ تعالیٰ مشرک کی عبادت قبول نہیں کرتا۔

۲: اہلِ کتاب کے علاوہ مشرکین کے ذبیحے کے حرام ہونے پر اجماع ہے۔ (یہ) امام احمد اور ابن تیمیہ نے کہا ہے۔

۳: قرآن مجید میں اہلِ کتاب کے ذبیحہ کو جائز قرار دیا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ باقیوں (دوسروں) کا حرام ہے۔ (سید عبدالسلام زیدی، عبدالحکیم ضلع خانیوال)

الجواب ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ ﴿فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ﴾ جس پر (ذبح کرتے وقت) اللہ کا نام لیا جائے تو اس میں سے کھاؤ۔ (الانعام: ۱۱۸)

اس آیتِ کریمہ اور دیگر دلائل کی رُو سے اس پر اتفاق ہے کہ صحیح العقیدہ مسلمان کا ذبح شدہ حلال جانور حلال ہے بشرطیکہ وہ ذبح کرتے وقت اس پر اللہ کا نام لے اور کوئی شرعی مانع (رکاوٹ) نہ ہو۔ دیکھئے موسوعۃ الاجماع فی الفقہ الاسلامی (۲/۴۴۸)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ لوگوں نے کہا: یا رسول اللہ! یہاں ایسے لوگ ہیں جو شرک سے نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں، وہ ہمارے پاس گوشت لے کر آتے ہیں اور یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انھوں نے ذبح کرتے وقت اس پر اللہ کا نام لیا ہے یا نہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((سمّوا اللہ علیہ و کلوا)) اس پر اللہ کا نام لے لو اور کھاؤ۔

(صحیح بخاری: ۲۰۵۷، ۷۳۹۸)

اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ اسلام کے ذبیحے کو حسنِ ظن کی بنیاد پر کھایا جائے گا اور یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی ہر قصاب سے پوچھتا پھرے کہ آپ نے اس پر اللہ کا نام لیا تھا یا نہیں؟

اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ذبح شدہ جانور پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا تو یہ ذبیحہ حرام ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ﴾
اور جس پر اللہ کا نام نہ لیا جائے اسے نہ کھاؤ اور بے شک یہ فسق ہے۔ (الانعام:۱۲۱)

اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) اگر حلال جانور پر اللہ (خدا) کا نام لے کر ذبح کریں تو یہ جانور حلال ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۠﴾
اور اہلِ کتاب کا کھانا تمھارے لئے حلال ہے۔ (المآئدۃ:۵)

اس آیت کی تشریح میں اہلِ سنت کے مشہور امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:
اور اہلِ کتاب، یہود و نصاریٰ کے ذبیحے تمھارے لئے حلال ہیں۔ (تفسیر طبری ۶/۶۴)

امام ابن شہاب الزہری نے عرب کے نصاریٰ کے بارے میں فرمایا کہ ان کے ذبیحے کھائے جاتے ہیں کیونکہ وہ اہلِ کتاب میں سے ہیں اور اللہ کا نام لیتے ہیں۔
تفسیر طبری (۶/۶۵ وسندہ صحیح) نیز دیکھئے صحیح بخاری (قبل ح ۵۵۰۸)

اس پر اجماع ہے کہ ہر یہودی اور ہر نصرانی کا ذبیحہ حلال ہے۔ (بشرطیکہ وہ اللہ کا نام لے) دیکھئے تفسیر ابن جریر طبری (۶/۶۶)

اس پر اجماع ہے کہ اہلِ اسلام، یہود اور نصاریٰ کے علاوہ تمام ادیان مثلاً ہندو، بدھ مذہب اور سکھ وغیرہ کفار و مشرکین کا ذبیحہ حرام ہے اور اس پر بھی اجماع ہے کہ مرتد اور زندیق کا ذبیحہ حرام ہے لہٰذا مرزائی، بہائی، نُصیری اور دُروز وغیرہ مرتدین کے ذبائح حرام ہیں۔

کلمہ گو اور اسلام کے دعویداروں کے دو بڑے گروہ ہیں:

اول: اہلِ سنت (صحیح العقیدہ لوگ)

دوم: اہلِ بدعت (بدعقیدہ لوگ)

عقیدے کے لحاظ سے اہلِ سنت کے دو گروہ ہیں:

① صالح اعمال والے

② فاسق و فاجر

اس سلسلے میں ایک بڑا مسئلہ ترکِ صلوٰۃ ہے۔ بعض علماء کے نزدیک تارک الصلوٰۃ

کافر ہے اور بعض اسے فاسق و فاجر کہتے ہیں۔ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے کتاب الصلوٰۃ میں فریقین کے دلائل جمع کر دیے ہیں۔ محدث البانی رحمہ اللہ اور بعض علماء کی تحقیق یہ ہے کہ تارک الصلوٰۃ کافر نہیں ہے۔ محدث عبداللہ روپڑی رحمہ اللہ سے پوچھا گیا: ''بے نماز کا ذبیحہ مسلمانوں کو کھانا جائز ہے یا نہیں؟'' تو انھوں نے جواب دیا: ''بے نماز بے شک کافر ہے خواہ ایک نماز کا تارک ہو یا سب نمازوں کا کیونکہ ((مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ)) عام ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ہر تارکِ صلوٰۃ کافر ہے رہا بے نماز کے ذبیحہ کا حکم سو وہ اہلِ کتاب کے حکم میں ہونے کی وجہ سے درست ہوسکتا ہے خواہ نیک ذبح کرنے والا پاس موجود ہو یا نہ، ہاں نیک ہر طرح سے بہتر ہے اور بے نماز جب کافر ہوا تو اس کا کھانا مثل عیسائی کے کھانے کے سمجھ لینا چاہیے۔ حتی الوسع اس سے پرہیز رکھے عند الضرورۃ کھالے''

(فتاویٰ اہلِ حدیث ج ۲ ص ۶۰۴)

ہمارے استاذ محترم حافظ عبدالمنان نور پوری حفظہ اللہ سے پوچھا گیا: ''بے نماز کے متعلق اکثر کہا جاتا ہے کہ وہ کافر ہے اگر یہ بات درست ہے تو کیا بے نماز کا ذبیحہ حلال ہے یا حرام؟'' تو انھوں نے جواب دیا: ''اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ﴾ [آج حلال ہوئی تم کو سب پاک چیزیں اور اہلِ کتاب کا کھانا تم کو حلال ہے اور تمھارا کھانا ان کو حلال ہے۔] عام مفسرین نے اس مقام پر طعام کی تفسیر ذبیحہ فرمائی ہے تو جب اہلِ کتاب کا ذبیحہ حلال ہے تو کلمہ پڑھنے والوں کا ذبیحہ بھی حلال ہے خواہ وہ نماز نہ پڑھتے ہوں کیونکہ وہ اہلِ کتاب تو ہیں ہی۔ ہاں اگر بوقت ذبح غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو تو وہ ذبیحہ حرام ہے خواہ ذبح کرنے والا پکا نمازی ہی ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ﴾ [اور اس میں سے نہ کھاؤ جس پر نام نہیں لیا گیا اللہ کا اور یہ کھانا گناہ ہے] نیز فرمایا: ﴿ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ﴾ [اور جس جانور پر نام پکارا جائے اللہ کے سوا کسی اور کا] ۱/۴/۱۴۱۸ھ'' (احکام و مسائل ج ۱ ص ۴۵۲)

حافظ عبدالمنان حفظہ اللہ سے کسی شخص نے پوچھا: ''بازاری گوشت کیسا ہے حلال یا حرام؟ جیسا کہ پاکستان کے اکثر قصاب نماز اور دین کے بارہ میں بالکل صفر ہیں اور ان کا عقیدہ تو ماشاء اللہ اور بھی نگفتہ بہ ہوتا ہے کیا ان کا ذبیح مشرک کے زمرہ میں آتا ہے؟''

حافظ صاحب نے جواب دیا: ''حلال ہے کیونکہ اہلِ کتاب کا ذبیحہ حلال ہے اور معلوم ہے کہ اہلِ کتاب کافر بھی ہیں اور مشرک بھی۔ پاکستان کے قصاب بہر حال اہلِ کتاب سے اچھے ہی ہیں پھر یہ کلمہ بھی پڑھتے ہیں مگر ایک شرط ہے کہ بوقت ذبح وہ بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ پڑھتے ہوں غیر اللہ کے نام پر ذبح نہ کرتے ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ﴾ [اور اس میں سے نہ کھاؤ جس پر نام نہیں لیا گیا اللہ کا] ۲۱/۵/۱۴۱۷ھ'' (احکام ومسائل ۱/۴۵۲)

اس مسئلے میں راجح یہی ہے کہ جو شخص مطلقاً ہمیشہ کے لئے تارک الصلوٰۃ ہے (کبھی نماز نہیں پڑھتا) تو اس کا ذبیحہ نہ کھایا جائے۔

اہلِ بدعت: بدعت کی دو بڑی قسمیں ہیں:

① بدعتِ صغریٰ (غیر مُکفِّرہ وغیر مُفسِّقہ) مثلاً سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے افضل سمجھنا۔ ② بدعتِ کبریٰ (مکفرہ ومفسقہ)

اس کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ بدعتِ مکفرہ مثلاً یہ عقیدہ رکھنا کہ قرآن مجید مخلوق ہے۔

۲۔ بدعتِ مفسقہ مثلاً صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو برا کہنا۔

بدعتِ کبریٰ کے تحت تمام خوارج، روافض، معتزلہ، جہمیہ اور منکرینِ حدیث آتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد آپ کے سوالات کے جوابات پیشِ خدمت ہیں:

۱: جو مشرکین ہندو مذہب یا بدھ مذہب وغیرہما سے تعلق رکھتے ہیں ان کا ذبیحہ حرام ہے۔

۲: پاکستان میں جو ہندو یا بدھ وغیرہما قصائی ہیں تو ان کا ذبیحہ حرام ہے۔ جو مسلمان صحیح العقیدہ قصائی ہیں ان کا ذبیحہ حلال ہے۔ جو مرتدین و کفار ہیں ان کا ذبیحہ حرام ہے اور جو مبتدعین

(اہلِ بدعت) ہیں، اگر وہ اللہ کا نام لے کر حلال جانور ذبح کریں تو یہ گوشت حلال ہے۔
اہلِ بدعت کی روایات صحیحین میں موجود ہیں مثلاً:

(۱) خالد بن مخلد: صحیحین کا راوی خالد بن مخلد ثقہ وصدوق ہے، جمہور محدثین نے اس کی توثیق کی ہے۔ ابن سعد نے کہا: "وکان منکر الحدیث، فی التشیع مفرطًا" وہ تشیع میں افراط کرنے والا، منکر حدیثیں بیان کرنے والا تھا۔ (طبقات ابن سعد ۶/۴۰۶)

جوزجانی نے کہا: "کان شتامًا معلنًا بسوء مذهبه" وہ (صحابہ کو) گالیاں دینے والا تھا، اپنے بُرے مذہب کا اعلان کرنے والا تھا۔ (احوال الرجال: ۱۰۸)

(۲) علی بن الجعد: صحیح بخاری کا راوی اور ثقہ عند الجمہور (صحیح الحدیث) تھا۔ اس نے سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہا: "أخذ من بيت المال مائة ألف درهم بغيرِ حق" اس نے بیت المال سے ایک لاکھ درہم ناحق لیے۔ اس پر یہ قسم بھی کھاتا تھا۔

(تاریخ بغداد ۱۱/۳۶۴ وسندہ حسن)

(۳) عباد بن یعقوب: صحیح البخاری کا راوی اور موثق عند الجمہور (حسن الحدیث) تھا۔

امام ابن خزیمہ نے فرمایا: "نا عباد بن یعقوب - المتهم في رأيه ، الثقة في حديثه" ہمیں عباد بن یعقوب نے حدیث سنائی، وہ اپنی رائے میں متہم تھا اور اپنی حدیث میں ثقہ تھا۔ (صحیح ابن خزیمہ: ۱۴۹۷)

یہ تشیع میں غالی تھا اور سلف (صحابہ وتابعین) کو گالیاں دیتا تھا۔

دیکھئے الکامل لابن عدی (۴/۱۶۵۳ [۵/۵۵۹])

حافظ ابن حبان نے کہا: "وکان رافضیًا داعیة إلی الرفض .." اور وہ رافضی تھا (اور) رافضیت کی طرف دعوت دیتا تھا۔ (المجروحین ۲/۱۷۲)

حافظ ابن حجر نے کہا: "صدوق رافضي" (تقریب التہذیب: ۳۱۵۳)

جب اہلِ بدعت (ثقہ وصدوق عندالجمہور) کی روایات مقبول ہیں تو ان کا ذبیحہ بھی حلال ہے۔
حافظ ذہبی رحمہ اللہ کیا خوب فرماتے ہیں: "فلنا صدقه و علیه بدعته" پس اس کی سچائی

ہمارے لئے ہے اور اس کی بدعت اسی پر (وبال) ہے۔ (میزان الاعتدال ۱/۵ ترجمۃ ابان بن تغلب)

۳۔ جس قصاب کو آپ مرتد، کافر یا مشرک سمجھتے ہیں اور اس کا آپ کے پاس واضح ثبوت بھی ہے تو اس کا ذبیحہ نہ کھائیں۔ رہے اہلِ بدعت تو دلائلِ مذکورہ کی رُو سے ان کا ذبیحہ حلال ہے۔

۴۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا اثر، سعید بن منصور سے باسند صحیح متصل نہیں ملا۔ بے سند روایتیں مردود ہوتی ہیں۔ سعید بن منصور سے لے کر ابن مسعود رضی اللہ عنہ تک سند بھی نامعلوم ہے۔ نیز دیکھئے:۶

۵۔ اس روایت کی سند ضعیف ہے۔ اسے ابن جریج نے عمرو بن دینار سے "عن" کے ساتھ روایت کیا ہے اور ابن جریج مشہور مدلس ہیں۔

۶۔ حدیثِ ابن مسعود رضی اللہ عنہ / مصنف عبدالرزاق: اس روایت کی سند میں ابو اسحاق السَّبیعی مدلس ہیں اور روایت "عن" سے ہے لہٰذا یہ سند بھی ضعیف ہے۔

۷۔ میرے علم کے مطابق صحابۂ کرام و تابعین میں سے کوئی بھی ہندو مشرکین وغیرہ کے ذبیحے کے جواز کا قائل نہیں ہے۔ رہا مسئلہ اہلِ بدعت کا تو سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ خارجیوں اور خَشَبیوں کے پیچھے نماز پڑھ لیتے تھے۔ (دیکھئے طبقات ابن سعد ۴/۱۶۹، ۱۷۰، حلیۃ الاولیاء ۱/۳۰۹ وسندہ صحیح)

آپ انھیں سلام بھی کہتے تھے۔ (السنن الکبریٰ للبیہقی ۳/۱۲۲، وسندہ صحیح)

آپ مشہور ظالم حجاج بن یوسف جیسے بدعتی کے پیچھے بھی نماز پڑھ لیتے تھے۔

(دیکھئے السنن الکبریٰ للبیہقی ۳/۱۲۱، ۱۲۲، وسندہ حسن)

حجاج بن یوسف کے بارے میں حافظ ذہبی نے کہا: "وکان ظلومًا جبارًا ناصبیًا خبیثًا..." اور وہ ظالم جبار (اور) ناصبی خبیث تھا۔ (سیر اعلام النبلاء ۴/۳۴۳)

تنبیہ: واضح رہے کہ راجح یہی ہے کہ بدعتِ کبریٰ کے مرتکب کے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔ تفصیلی تحقیق کے لئے دیکھئے راقم الحروف کی کتاب "بدعتی کے پیچھے نماز کا حکم"

[یہ بات بھی دلائل سے معلوم ہوتی ہے کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے اس عمل سے رجوع کر لیا تھا کیونکہ ایک دفعہ ایک بدعتی نے آپ کو سلام بھیجا تو آپ نے (اس کی بدعت کی وجہ

سے) سلام کا جواب نہیں دیا تھا۔ دیکھئے سنن الترمذی: ۲۱۵۲ وقال: ''ھذا حدیث حسن صحیح غریب'' وسندہ حسن]

۸۔ ذبیحہ کرنا ایک عمل ہے جس کی مشروعیت کتاب وسنت سے ثابت ہے۔ بعض الناس کا یہ کہنا کہ ''ذبیحہ کرنا عبادت ہے'' اس کی دلیل مجھے معلوم نہیں ہے۔

۹۔ اہلِ کتاب اور اہلِ سلام کے سوا تمام مشرکین ومرتدین وکفار کا ذبیحہ بلاشک وشبہ حرام ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اہلِ اسلام (کلمہ گو مدعیانِ اسلام) میں سے اہلِ بدعت کا ذبیحہ بھی حرام ہے۔

۱۰۔ یہود کے اکہتر اور نصاریٰ کے بہتر فرقے ہوئے جنھیں اہلِ کتاب سے خارج نہیں کیا گیا اور اسی طرح امتِ مسلمہ کے تہتر فرقے ہیں جن میں سے بہتر فرقوں کی تکفیر کرنا اور امتِ مسلمہ سے خارج قرار دینا غلط ہے۔ بس صرف یہ کہہ دیں کہ یہ فرقے گمراہ ہیں اور اہلِ بدعت میں سے ہیں یا ان کے عقائد کفریہ وشرکیہ ہیں۔ ان تمام فرقوں کے ہر ہر شخص کو متعین کرکے، بغیر اقامتِ حجت کے کافر، مشرک یا مرتد قرار دینا غلط ہے۔

اس ساری بحث کا خلاصہ درج ذیل ہے:

① کفار ومرتدین مثلاً ہندو، بدھ مذہب والوں، مرزائیوں اور تحریفِ قرآن کا عقیدہ رکھنے والوں کا ذبیحہ حرام ہے۔

② اہلِ بدعت کلمہ گو فرقوں کا ذبیحہ حلال ہے بشرطیکہ وہ دینِ اسلام کے کسی ایسے عقیدے یا عمل کا انکار نہ کریں جو ضروریاتِ دین میں سے ہے۔

③ جس طرح اہلِ کتاب کے اکہتر یا بہتر فرقے اہلِ کتاب کے عمومی حکم میں شامل ہیں، اسی طرح اہلِ اسلام کے تہتر فرقے (جن میں فرقۂ ناجیہ طائفۂ منصورہ بھی شامل ہے) اہلِ اسلام کے عمومی حکم میں شامل ہیں۔

④ اہلِ بدعت سے محدثین کرام کا اپنی کتبِ صحاح میں روایات لینا اس بات کی دلیل ہے کہ ان لوگوں کا ذبیحہ حلال ہے۔

⑤ بہتر یہی ہے کہ کسی صحیح العقیدہ مسلمان بھائی کا ذبیحہ کھایا جائے۔

⑥ موجودہ دور میں اہلِ سنت کی طرف منسوب دو بڑے فرقوں آلِ دیوبند اور آلِ بریلی کے عام عقائد ایک جیسے ہیں۔ ان میں سے ایک فرقے کا ذبیحہ کھانا اور دوسرے کا ذبیحہ نہ کھانا کسی واضح دلیل سے ثابت نہیں ہے۔

محمد یوسف لدھیانوی دیوبندی لکھتے ہیں: ''میرے لئے دیوبندی بریلوی اختلاف، کا لفظ ہی موجبِ حیرت ہے۔ آپ سن چکے ہیں کہ شیعہ سنی اختلاف تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو ماننے یا نہ ماننے کے مسئلہ پر پیدا ہوا، اور حنفی وہابی اختلاف ائمہ ہدیٰ کی پیروی کرنے نہ کرنے پر پیدا ہوا۔ لیکن دیوبندی بریلوی اختلاف کی کوئی بنیاد میرے علم میں نہیں ہے۔''

(اختلافِ اُمت اور صراطِ مستقیم ص ۲۵)

⑦ جس شخص کا اہلِ بدعت کے ذبیحے پر دل مطمئن نہیں ہے تو نہ کھائے مگر خوارج کی طرح تکفیری فتوے جاری کرتا نہ پھرے۔ ان اہلِ بدعت میں سے ایسے سادہ ہیرے بھی ملتے ہیں جنھیں جب کتاب وسنت کی دعوت پہنچتی ہے تو والہانہ انداز میں لبیک کہتے ہوئے دینِ اسلام کے لئے اپنی جانیں اور مال قربان کر دیتے ہیں۔

⑧ اس امت میں سب سے بُرے لوگ خوارج اہلِ تکفیر ہیں، ان سے ہر وقت اجتناب کرنا (یعنی بچنا) چاہیے، مرجئہ اور جہمیہ سے بھی دور رہیں۔

⑨ صحیح العقیدہ اہلِ حدیث (اہلِ سنت) علماء سے ہر مسئلے میں مکمل رابطہ رکھیں۔

⑩ سیدنا عیسیٰ بن مریم علیہما السلام اور عزیر کو اللہ کا بیٹا کہنے والوں کا ذبیحہ حلال ہے تو ان کلمہ گو اہلِ اسلام کا ذبیحہ کیوں حلال نہیں ہے جنھیں علمائے حق نے متفقہ طور پر کفار و مرتدین اور مشرکین کے حکم میں شامل نہیں کیا؟ وما علینا إلا البلاغ (۲۲ دسمبر ۲۰۰۶ء)

[الحدیث: ۳۳]

جنات کا وجود ایک حقیقت ہے

سوال جنات کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ آج کل عموماً کنواری اور خوب رو لڑکی پر

جن عاشق ہو جاتے ہیں اور مختلف قسم کے باباے اور پیر ٹونے ٹوٹکے کرتے ہیں، کیا اس قسم کے معاملات نبی آخر الزمان کے دور میں ہوتے تھے یا صحابہ کرام کے دورِ خلافت وحیات میں ہوتے تھے، آیا تاریخ میں کوئی صحیح واقعہ موجود ہے؟ (ایک سائل)

الجواب جنات ایک مستقل مخلوق ہے جس کا وجود انسانوں کے علاوہ ہے اور ان کی تخلیق آگ سے ہوئی ہے، جیسا کہ قرآن، حدیث اور اجماع سے ثابت ہے۔

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا:

''لم يخالف أحد من طوائف المسلمين في وجود الجن''

مسلمانوں میں سے کوئی گروہ بھی جنات کے وجود کا مخالف نہیں ہے۔

(آکام المرجان لمحمد بن عبداللہ الشبلی ص ۵)

جنات کے لڑکیوں پر عاشق ہونے کے عام قصے جھوٹ وافتراء پر مبنی ہوتے ہیں، بعض عورتوں کو ہسٹریا کی بیماری ہوتی ہے جس کے ہذیان میں وہ عجیب وغریب آوازیں اور دعاوی ظاہر کرتی ہیں، مقصد صرف معاشقہ یا اپنے مقاصد کی تکمیل ہوتی ہے۔

پیروں وغیرہ کے ٹونے ٹوٹکے بھی فراڈ اور جادو وغیرہ پر مشتمل ہوتے ہیں جن سے کلی اجتناب واجب یعنی فرض ہے۔ ایسے معاملات کا وجود نبی آخر الزمان کے عہد مبارک میں کلیتاً نہیں ملتا اور نہ صحابہ یا تابعین کے دور میں ایسا واقعہ ہوا ہے۔ بعض روایات میں جنات کا انسانی جسم میں داخل ہونے کا صراحتاً ذکر ہے لہٰذا ان کی اسنادی حیثیت پیشِ خدمت ہے:

فرقد السبخي عن سعيد بن جبير عن ابن عباس... إلخ (مسند احمد ۱/۲۳۹، ۲۵۴، ۲۶۸، الدارمی ۱/۱۱، ۱۲، ح ۱۹، الطبرانی فی الکبیر ۱۲/۵۷ ح ۱۲۴۶۰، دلائل النبوۃ للبیہقی ۶/۱۸۲)

فرقد راوی ضعیف ہے۔

دیکھئے تحفۃ الاقویاء فی تحقیق کتاب الضعفاء للبخاری (ص ۹۱ ت ۳۰۸) وعام کتب ضعفاء، ایوب السختیانی نے کہا: ''ليس بشيء'' یہ راوی کوئی چیز نہیں ہے (ایضاً)

(۲) إسماعيل بن عبد المالك عن أبي الزبير عن جابر... إلخ

(سنن الدارمی ۱/۱۰ ح ۱۷ وعبد بن حمید: ۱۰۵۱، ابن ابی شیبہ ۱۱/۴۹۰۔۴۹۲ ح ۳۱۷۴۵، دلائل النبوۃ لابی نعیم: ۲۸۱، والبیہقی فی الدلائل ۶/۱۸، ۱۹، التمہید ۱/۲۲۳، ۲۲۴)

اسماعیل بن عبدالملک جمہور محدثین کے نزدیک ضعیف راوی ہے۔ (تحفۃ الاقویاء ص ۱۳ ت ۱۸)

معمر عن عطاء بن السائب عن عبداللّٰہ بن حفص عن یعلٰی بن مرۃ الثقفي إلخ (احمد ۴/۱۷۳، شرح السنۃ ۱۳/۲۹۶ ح ۳۷۱۸) معمر نے عطاء کے اختلاط کے بعد ان سے حدیث سنی ہے اور عبداللہ بن حفص مجہول ہے۔ (دیکھئے تقریب التھذیب ص ۱۷۱)

شواہد: (ا) أحمد بن عبدالجبار: ثنا یونس بن بکیر عن الأعمش عن المنھال ابن عمرو عن یعلی بن مرۃ عن أبیه . (صححہ الحاکم ووافقہ الذہبی ۲/۶۱۷، ۶۱۸ ح ۴۲۳۲)

سلیمان الاعمش مدلس تھے اور روایت عن سے ہے۔

(ب) عثمان بن حکیم بن عباد بن حنیف الانصاری عن عبدالرحمن بن عبدالعزیز عن یعلی بن مرۃ... إلخ (احمد ۴/۱۷۰)

عبدالرحمٰن مذکور ''لیس بالمشھور'' تھا۔ (دیکھئے تعجیل المنفعۃ ص ۲۵۳)

اگر اس سے مراد عبدالرحمٰن بن عبدالعزیز بن عبداللہ بن عثمان بن حنیف الانصاری الامامی ہو تو یہ سند منقطع ہے کیونکہ وہ ۱۶۲ھ میں فوت ہوئے اور ان کی عمر ۷۰ سال سے زیادہ تھی یعنی ۹۰ھ میں پیدا ہوئے تھے، یعلی بن مرۃ رضی اللہ عنہ سے ان کی ملاقات کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

(۴) مطر بن عبدالرحمٰن عن ھند ابنۃ الوازع إلخ (احمد کما فی جامع المسانید لابن کثیر ۱۲/۲۴۶، اطراف المسند ۵/۴۴۵ ح ۷۵۱۹، مجمع الزوائد ۹/۲، اتحاف المھرۃ لابن حجر ۱۳/۶۵۶)

ہند ام ابان کی توثیق نامعلوم ہے۔

المعجم الکبیر للطبرانی (ج ۵ ص ۲۷۵ ح ۵۳۱۴ عن ابی داود: ۵۲۲۵، واصلہ عند ابی داود ۵۲۲۵ و مجمع الزوائد ۹/۲، ۳) میں ایک دوسری روایت بھی ہے جس کی راویہ ام ابان ہی ہے جو کہ مجہولۃ الحال ہے۔

(۵) عثمان بن أبی العاص إلخ (مجمع الزوائد ۹/۳ وقال: وفیه عثمان بن بسر

ولم أعرفه وبقية رجاله ثقات) یہ سند عثمان بن بسر کی جہالت کی وجہ سے ضعیف ہے۔
میرے پاس ان تمام روایات کی مفصل تحقیق کا وقت نہیں البتہ مختصراً عرض ہے کہ میرے علم کے مطابق اس سلسلے کی تمام روایات ضعیف ہیں تاہم یہ صحیح ہے کہ جب شیطان وسوسہ ڈالے تو ''اُخرج عدو اللّٰہ'' اے اللہ کے دشمن! نکل جا، کہنا صحیح ہے جیسا کہ سنن ابن ماجہ (کتاب الطب باب الفزع والأرق وما یتعوذ بہ ح ۳۵۴۸ وسندہ صحیح ولہ شاہد فی صحیح مسلم: ۲۲۰۳) سے ثابت ہے۔ [شہادت، جنوری ۲۰۰۲]

قصیدۂ بردہ کی حقیقت

سوال امام بوصیری جن کا قصیدہ بردہ شریف مشہور ہے اور عموماً ٹی وی پر بھی نشر ہوتا ہے۔ اس کی کیا حقیقت ہے؟ امام بوصیری نام کا شخص کون ہے؟ (عبدالقدوس السّلفی، اسلام آباد)

الجواب بوصیری لقب کے دو آدمی زیادہ مشہور ہیں:

① حافظ شہاب الدین ابوالعباس احمد بن ابی بکر بن اسماعیل البوصیری القاہری آپ ۷۶۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۸۴۰ھ میں اٹھتر سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ آپ حافظ بلقینی، حافظ عراقی، حافظ ہیثمی اور حافظ ابن حجر وغیرہم کے شاگرد تھے۔ آپ کی کتابوں میں زوائد سنن ابن ماجہ اور اتحاف الخیرۃ المہرۃ فی زوائد المسانید العشرۃ بہت مشہور ہیں۔ آپ کے استاد حافظ ابن حجر نے اپنی کتاب انباء الغمر (۴۳۱/۸) میں آپ کی تعریف کی ہے۔ بوصیری مذکور کے حالات درج ذیل کتابوں میں موجود ہیں:

انباء الغمر، الضوء اللامع للسخاوی (۲۵۱/۱) حسن المحاضرہ للسیوطی (۳۶۳/۱) شذرات الذہب (۲۳۳/۷) النجوم الزاہرہ (۲۰۹/۱۵) ذیل طبقات الحفاظ (۳۷۹) وغیرہ۔

وہ ''الشیخ المفید الصالح المحدث الفاضل'' تھے لیکن ان کے مزاج میں حدت تھی اور ان کے خط میں متون واسماء کی تحریفاتِ کثیرہ تھیں۔ رحمہ اللہ

② محمد بن سعید بن حماد بن حسن البوصیری الولاصی، ولادت ۶۰۸ھ اور وفات ۶۹۵ھ ہے۔ یہ شخص حافظ ابن حجر وحافظ ذہبی سے پہلے گزرا ہے لیکن میرے علم کے مطابق کسی محدث نے

اس کا ذکر نہیں کیا اور نہ اس کا ثقہ وصدوق یا موثق ہونا حدیث کے کسی قابلِ اعتماد عالم سے ثابت ہے، معلوم ہوا کہ یہ ایک مجہول الحال شاعر تھا۔

قصیدۂ بردہ میں غلو سے بھرپور اور کتاب وسنت کے خلاف اشعار موجود ہیں۔ مثلاً:

الفصل العاشر في ذكر المناجات و عرض الحاجات میں لکھا ہوا ہے:

"يا أكرم الخلق مالي من ألوذبه سواك عند حلول الحادث العمم

اے بزرگترین مخلوقات یا اے بہترین رسل بوقت نزول حادثۂ عظیم وعام کے آپ کے سوا کوئی ایسا نہیں ہے جس کی میں پناہ میں آؤں۔ صرف آپ ہی کا بھروسہ ہے۔"

(عطر الوردہ فی شرح البردہ، ترجمہ از ذوالفقار علی دیوبندی ص ۸۵)

یہ کہنا کہ عظیم حادثوں میں صرف نبی کریم ﷺ کی ہی پناہ اور بھروسا ہے، قرآن مجید اور صحیح احادیث کے خلاف ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ﴾ اور مدد نہیں مگر اللہ غالب حکمت والے کے پاس سے۔ (آل عمران: ۱۲۶، ترجمہ احمد رضا خان بریلوی ص ۱۰۶)

معلوم ہوا کہ مافوق الاسباب مدد کرنا صرف اللہ تعالیٰ ہی کی صفتِ خاصہ ہے لہٰذا اس مدد کے لئے رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرنا غلط ہے۔

سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کا ایسے آدمی کے بارے میں ارشاد مبارک ہے جو کہتا ہے یا کہے گا: "يا رسول الله! أغثني" یا رسول اللہ! میری مدد کریں۔ ((لا أملك لك شيئًا)) میں تیرے لئے کسی چیز کا مالک نہیں ہوں۔ (صحیح بخاری: ۳۰۷۳، صحیح مسلم: ۱۸۳۱)

اس صحیح حدیث کی تائید سورۃ الاعراف کی آیت نمبر ۱۸۸ سے بھی ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ صحیح حدیث بذاتِ خود حجت ہے چاہے عقائد واحکام کا مسئلہ ہو یا فضائل ومناقب کا اور چاہے اس کی تائید قرآن مجید میں واضح طور پر موجود ہو یا نہ ہو، ہر حال میں صحیح حدیث حجت ہے۔ والحمدللہ

فائدہ: قصیدۂ بردہ میں ایک شعر لکھا ہوا ہے کہ

''فمبلغ العلم فيه أنه بشر   وأنه خير خلق الله كلهم''

ہے ہمارے علم اور تحقیق کی غایت یہی   تھا وہ انسان اور انسانوں میں افضل اور تم

(قصیدۂ بردہ مع ترجمہ ملک محمد اشرف نقشبندی ص ۳۲)

ترجمے میں غالباً: ''اور اتم'' کے الفاظ ہیں۔ واللہ اعلم

اس شعر میں بوصیری صاحب نے نبی کریم اور نورِ ہدایت سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کو بشر اور خیر خلق اللہ کلھم قرار دیا ہے، جبکہ بعض لوگ بشر کے لفظ سے چڑتے ہیں۔

[الحدیث: ۳۷]

نظر کا لگ جانا برحق ہے

سوال کیا نظر برحق ہے؟ جیسا کہ ہمارے ہاں مشہور ہے کہ فلاں کو فلاں کی نظر لگ گئی، اس کی کیا حقیقت ہے؟ (عمران الٰہی، راولپنڈی)

الجواب سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((العین حق)) نظر (کا لگنا) حق ہے۔ (الصحیفۃ الصحیحہ تصنیف ہمام بن منبہ: ۱۳۱، صحیح بخاری: ۵۷۴۰ وصحیح مسلم: ۲۱۸۷ [۵۷۰۱]، مصنف عبد الرزاق ۱۱/ ۱۸ ح ۲۹۷۷۸، مسند احمد ۲/ ۳۱۹ ح ۸۲۴۵ وسندہ صحیح ولہ طریق آخر عند ابن ماجہ: ۳۵۰۷ وسندہ صحیح ورواہ احمد ۲/ ۴۸۷)

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((العین حق)) نظر (لگنا) حق ہے۔ (صحیح مسلم: ۲۱۸۸ [۵۷۰۲])

سیدنا حابس التمیمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((والعین حق)) اور نظر برحق ہے۔ (سنن الترمذی: ۲۰۶۱ وسندہ حسن، مسند احمد ۴/ ۶۷ حیۃ بن حابس صدوق وثقہ ابن حبان وابن خزیمۃ کما یظہر من اتحاف المھرۃ ۴/ ۹۷ وروی عنہ یحیٰی بن ابی کثیر وھو لا یروی إلا عن ثقۃ عندہ)

سیدہ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! بنو جعفر (طیار رضی اللہ عنہ کے بچوں) کو نظر لگ جاتی ہے تو کیا میں ان کو دم کروں؟ آپ نے فرمایا:

((نعم ولو کان شيء یسبق القدر لسبقتہ العین)) جی ہاں! اور اگر کوئی چیز تقدیر پر

سبقت لے جاتی تو وہ نظر ہوتی ۔ (السنن الکبریٰ ۹/۳۴۸ وسندہ صحیح، سنن الترمذی: ۲۰۵۹ وقال: ''حسن صحیح'' وللحدیث شاهد صحیح فی صحیح مسلم ۲۱۹۸[۵۷۲۶])

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (مجھے) حکم دیا کہ نظر کا دم کرو۔

(صحیح بخاری: ۵۷۳۸ و صحیح مسلم: ۲۱۹۵[۵۷۲۰-۵۷۲۲])

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نظر کے (علاج کے) لئے دم کی اجازت دی ہے۔ (صحیح مسلم: ۲۱۹۶[۵۷۲۴])

سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لڑکی کے بارے میں فرمایا: ((استرقوا لها فإن بها النظرة)) اسے دم کراؤ کیونکہ اسے نظر لگی ہے۔

(صحیح بخاری: ۵۷۳۹ و صحیح مسلم: ۲۱۹۷[۵۷۲۵])

سیدنا جابر بن عبداللہ الانصاری رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ ایک حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نظر لگ جانے پر دم کی اجازت دی ہے۔ (دیکھئے صحیح مسلم: ۲۱۹۸[۵۷۲۶])

سیدنا بریدہ بن الحصیب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ دم صرف نظر یا ڈسے جانے کی بنا پر ہے۔

(صحیح مسلم: ۲۲۰[۵۲۷])

سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((لا رقية إلا من عين أو حمة.)) دم صرف نظر اور ڈسے ہوئے (کے علاج) کے لئے ہے۔

(سنن ابی داود: ۳۸۸۴ وسندہ صحیح، ورواہ البخاری: ۵۷۰۵ موقوفاً وسندہ صحیح والمرفوع والموقوف صحیحان والحمد للہ)

سیدنا ابوامامہ بن سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میرے والد سہل بن حنیف (رضی اللہ عنہ) نے غسل کیا تو عامر بن ربیعہ (رضی اللہ عنہ) نے انھیں دیکھ لیا اور کہا: میں نے کسی کنواری کو بھی اتنی خوبصورت جلد والی نہیں دیکھا۔ سہل بن حنیف (رضی اللہ عنہ) شدید بیمار ہو گئے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا: تم اپنے بھائیوں کو کیوں قتل کرنا چاہتے ہو؟ تم نے برکت کی دعا کیوں نہیں کی؟ ((إن العين حق)) بے شک نظر حق ہے۔

(موطأ امام مالک ۲/۹۳۸ ح ۱۸۱۰ وسندہ صحیح وصححہ ابن حبان، الموارد: ۱۴۲۴)

ان روایات سے معلوم ہوا کہ نظر لگنے کا برحق ہونا متواتر احادیث سے ثابت ہے۔
سورۂ یوسف کی آیت نمبر (۶۷) سے بھی نظر کا برحق ہونا اشارتاً ثابت ہے۔
نظر کا ایک علاج یہ بھی ہے کہ نظر لگانے والے کے وضو (یا غسل) کے بچے ہوئے پانی سے اسے نہلایا جائے جسے نظر لگی ہے۔ دیکھئے موطأ امام مالک (۹۳۸/۲ ح ۱۸۱۰ وسندہ صحیح)

یا درج ذیل دعا پڑھیں:
((أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّآمَّةِ، مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ وَّهَامَّةٍ وَّمِنْ كُلِّ عَيْنٍ لَّامَّةٍ))
اللہ کے پورے کلمات کے ساتھ اس کی پناہ چاہتا ہوں ہر ایک شیطان اور ہر نقصان پہنچانے والی نظر بد سے۔ (صحیح بخاری: ۳۳۷۱) (۱۲/ جنوری ۲۰۰۷ء) [الحدیث: ۳۶]

سوال نظر لگنے کا مسئلہ دین کے لحاظ سے صحیح ہے یا غلط کچھ حضرات رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ یہ نظر حق ہے اور نظر کے لگنے سے انسان قبر میں پہنچ جاتا ہے۔ آپ براہ کرم قرآن وسنت کی روشنی میں جواب دیں۔ (ایک سائل)

الجواب اللہ کے حکم سے نظر لگنے کا مسئلہ صحیح وحق ہے۔
الصحیفۃ الصحیحۃ لہمام بن منبہ [متوفی ۱۳۲ھ] (ح ۱۳۰، صحیح بخاری: ۵۷۴۰ وصحیح مسلم: ۲۱۸۷) وغیرہ میں حدیث ہے کہ ((العین حق ....)) نظر کا لگنا حق ہے۔
نیز دیکھئے موطأ امام مالک (۹۳۸/۲ رقم: ۱۸۱۰، وسندہ صحیح)
نبی ﷺ نے ایک دعا سکھائی جس میں نظرِ بد سے اللہ کی پناہ مانگی گئی ہے:
((أعوذ بكلمات الله التآمّة ، من كل شيطان وّ هامة ، ومن كل عين لامة .))
[میں اللہ کے پورے کلمات کے ساتھ اس کی پناہ چاہتا ہوں، ہر شیطان اور ہر زہریلے جانور سے، اور ہر ملامت والی آنکھ سے] (صحیح بخاری: ۳۳۷۱)
جو لوگ نظر لگنے کے منکر ہیں، وہ حدیث کے منکر ہیں کیونکہ نظر کا مسئلہ صحیح احادیث سے ثابت ہے اور خیر القرون کے سنہری دور میں کسی ایک محدث یا امام سے اس کا انکار ثابت نہیں ہے۔ [شہادت، جولائی ۱۹۹۹ء]

رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھنا

سوال کیا دورِ حاضر میں رسول اللہ ﷺ کسی کے خواب میں آسکتے ہیں یعنی (کیا خواب میں آپ کی) زیارت ممکن ہے؟

① سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جس نے مجھے نیند (خواب) میں دیکھا اس نے یقیناً مجھے دیکھا کیونکہ شیطان میری شکل نہیں بنا سکتا۔

[صحیح بخاری: ۶۹۹۴، صحیح مسلم: ۲۲۶۶، دار السلام: ۵۹۱۹]

② سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا جس نے مجھے خواب میں دیکھا وہ مجھے بیداری میں دیکھے گا اور شیطان میری صورت نہیں بنا سکتا۔

[صحیح بخاری: ۶۹۹۳، صحیح مسلم: ۲۲۶۶، دار السلام: ۵۹۲۰]

مندرجہ بالا احادیث کی تشریح فرمائیے۔ (فاروق حیدر، راولپنڈی)

الجواب رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا جا سکتا ہے بشرطیکہ آپ ﷺ کو آپ ﷺ کی اپنی صورت پر دیکھا جائے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ کو خواب میں جو دیکھا تو یہ بالکل صحیح ہے وہ آپ ﷺ کی صورت مبارک پہچانتے تھے۔ ان کے بعد جو بھی دیکھنے کا دعویٰ کرے گا تو اگر اس کا عقیدہ صحیح ہے تو پھر اس کے خواب کو قرآن و حدیث و فہم سلف صالحین پر پیش کیا جائے گا، ورنہ ایسے خوابوں سے دوسرے لوگوں پر حجت قائم کرنا صحیح نہیں ہے۔

یہ بات بالکل صحیح ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی شکل مبارک میں شیطان لعین ہرگز نہیں آسکتا مگر کسی حدیث میں یہ نہیں آیا کہ شیطان جھوٹ نہیں بول سکتا اور کسی دوسری شکل میں آکر کذب بیانی سے اسے کسی مومن اور صالح شخص کی طرف منسوب نہیں کر سکتا۔

بیداری میں دیکھنے کے دو ہی مطلب ہو سکتے ہیں: ① عہد نبوی میں جس نے آپ ﷺ کو خواب میں دیکھا تو وہ پھر بیداری میں بھی ضرور دیکھے گا لہٰذا یہ حدیث صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ خاص ہے۔ ② اگر اس حدیث کو عام سمجھا جائے تو پھر دیکھنے والا قیامت کے دن آپ ﷺ کو بیداری میں دیکھے گا۔ [الحدیث: ۴۰]

معراج جسمانی تھا

سوال حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی تھیں: ''(واقعۂ معراج میں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مبارک مفقود نہیں ہوا لیکن اللہ آپ کی روح کو لے گیا۔''

(تفسیر ابن جریر طبری ۹/۱۶ بحوالہ واقعہ معراج اور اُس کے مشاہدات، حافظ صلاح الدین یوسف طبع دار السلام ص ۳۲)

پوچھنا یہ ہے کہ کیا یہ روایت صحیح ہے؟ اور اگر یہ روایت صحیح ہے تو کیا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا صرف روحانی طور پر معراج کی قائل تھیں؟ (شعیب محمد، سیالکوٹ)

الجواب روایتِ مذکورہ تفسیر ابن جریر الطبری میں درج ذیل سند و متن سے مذکور ہے: ''حدثنا ابن حمید قال: ثنا سلمة عن محمد قال: ثني بعض آل أبي بكر أن عائشة كانت تقول: مافقد جسد رسول الله ﷺ ولكن الله أسرى بروحه''

ہمیں (محمد) بن حمید (الرازی) نے حدیث بیان کی، کہا: ہمیں سلمہ (بن الفضل الابرش) نے حدیث بیان کی، وہ محمد (بن اسحاق بن یسار) سے بیان کرتے ہیں، کہا: مجھے آلِ ابی بکر میں سے بعض نے بتایا کہ (سیدہ) عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی تھیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم (مبارک) غائب نہیں ہوا (تھا) لیکن اللہ نے آپ کو روحانی معراج کرائی۔ (ج ۱۵ ص ۱۳)

تحقیق: یہ روایت اُصولِ حدیث کی رُو سے ضعیف و مردود ہے۔ اس میں بعض آل ابی بکر راوی مجہول محض ہے، اس کا کوئی اتا پتا معلوم نہیں ہے۔ ایسے مجہول العین راوی کی روایت ضعیف و مردود ہوتی ہے۔

یہ بات بہت عجیب و غریب ہے کہ منکرینِ حدیث اور مخالفینِ کتاب و سنت ہمیشہ صحیح و ثابت روایات کو رد کر دیتے ہیں اور اس طرح کی بے سر و پا مجہول و مردود قسم کی روایتوں سے استدلال کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا اصل مقصد اپنی بدعت اور گمراہی کی تائید ہوتا ہے اور بس!

عوام الناس کی خدمت میں عرض ہے کہ اگر کوئی شخص قرآنِ مجید، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے علاوہ دنیا کی کسی کتاب کا بھی حوالہ دے تو آنکھیں بند کر کے اس پر یقین نہ کریں بلکہ اصولِ حدیث کی روشنی میں سند و متن کی تحقیق کروائیں اور صحیح و ثابت ہونے کے بعد ہی اسے تسلیم کریں۔

تنبیہ بلیغ: تفسیر ابن جریر میں اسی سند کے ساتھ محمد بن اسحاق سے روایت ہے کہ

''ثني يعقوب بن عتبة بن المغيرة بن الأخنس أن معاوية بن أبي سفيان كان إذا سئل عن مسري رسول الله ﷺ قال: كانت رؤيا من الله صادقة''

مجھے یعقوب بن عتبہ بن المغیرہ بن الاخنس نے حدیث بیان کی کہ (سیدنا) معاویہ بن ابی سفیان (رضی اللہ عنہ) سے جب رسول اللہ ﷺ کی معراج کے بارے میں پوچھا جاتا تو فرماتے: اللہ کی طرف سے (یہ) سچا خواب تھا۔ (۱۵/۱۳)

یہ روایت بھی منقطع ہونے کی وجہ سے ضعیف ومردود ہے۔ یعقوب بن عتبہ طبقۂ سادسہ (تبع تابعین) میں سے تھے، انھوں نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو نہیں پایا۔

معلوم ہوا کہ یہ دونوں روایتیں سرے سے ثابت ہی نہیں ہیں۔

تنبیہ: حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ نے بذریعہ ٹیلی فون مجھے بتایا کہ انھوں نے اپنی مذکورہ کتاب میں یہ دونوں روایتیں لکھ کر ان کی تردید بھی کر رکھی ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''هي رؤيا عين، أريها رسول الله ﷺ ليلة أسري به إلى بيت المقدس'' یہ (حقیقی) آنکھ کا دیکھنا ہے جو رسول اللہ ﷺ کو بیت المقدس تک معراج والی رات دکھایا گیا۔ (صحیح بخاری: ۳۸۸۹)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ((بينا أنا عند البيت بين النائم واليقظان .)) إلخ

میں بیت اللہ کے قریب نیند اور بیداری کی درمیانی حالت میں تھا۔ الخ

(صحیح بخاری: ۳۲۰۷، صحیح مسلم: ۱۶۴/۳۱۶)

معلوم ہوا کہ معراج بیداری میں ہوئی تھی۔ [الحدیث: ۴۲]

دعوتِ حق کے لئے مناظرہ کرنا

سوال رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((أنا زعيم ببيت في ربض الجنة لمن ترك المراء وإن كان محقًا))

میں جنت کے گرد ونواح میں اس آدمی کے لیے گھر کی ضمانت دیتا ہوں جو بحث وجدال چھوڑ

دے اگر چہ وہ حق پر ہی کیوں نہ ہو۔ (سنن ابی داود، کتاب الادب، باب فی حسن خلق: ۴۸۰۰ وسندہ حسن)

جب سے یہ حدیث پڑھی ہے ذہن بہت الجھ گیا، میرے سارے کلاس فیلو حنفی ہیں ان سے بڑی گرما گرم بحثیں ہوتی ہیں اور میں ہمیشہ قرآن وحدیث کے دلائل سے ان کو لاجواب کر دیتا ہوں مگر جب سے میں نے یہ حدیث ان کو سنائی ہے وہ میرے پیچھے پڑ گئے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ حدیث تیرے جیسے بندے کے لیے کہی ہے۔ کیوں کہ تو بحثیں بہت کرتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر ایک شخص شرک و بدعت کی تبلیغ کر رہا ہے تو اس پر حق واضح کر دینا چاہئے اور ظاہری بات ہے کہ بحث تو ہوگی ایک دو باتوں سے تو وہ مطمئن نہ ہوگا۔ اور قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ﴾ اور ان سے احسن طریقے سے بحث وجدال کیجئے۔

اس لیے اگر ایک شخص قرآن وحدیث کو توڑ موڑ کر پیش کرتا ہے اور شرک و بدعت کی توثیق میں ان کی من مانی تاویلات کرتا ہے تو اس پر دلائل کے ذریعے سے بحث کر کے اتمام حجت کر دینی چاہیے۔ اور پھر علماء کا اختلافی مسائل پر بحث کرنا کس ضمن میں آتا ہے۔ بس آپ ذرا مجھے سمجھائیں۔ (حافظ عاطف منظور، فتح ٹاؤن اوکاڑہ)

الجواب لغت میں '' المراء'' کا مطلب ہے: ''جھگڑا، کٹ حجتی، بحث''

(القاموس الوحید ص ۱۵۴۶)

علامہ ابن الاثیر (متوفی ۶۰۶ھ) لکھتے ہیں: '' المراء: الجدل، والتماری والمماراة: المجادلة علی مذهب الشك والریبة''

مراء جھگڑے کو کہتے ہیں اور تماری، مماراة کا معنی یہ ہے کہ شک وشبہ کی بنیاد پر جھگڑا کیا جائے۔ (النہایۃ فی غریب الحدیث ج ۴ ص ۳۲۲)

معلوم ہوا کہ حدیثِ مذکور میں احکام واختلافی مسائل پر دعوت وتحقیق کے لیے بحث و مباحثہ مراد نہیں ہے، علامہ ابن اثیر مزید لکھتے ہیں: '' وقیل: إنما جاء هذا في الجدال والمراء في الآیات التي فیها ذکر القدر ونحوه من المعاني علی مذهب

أهل الكلام وأصحاب الأهواء والآراء ، دون ما تضمنته من الأحكام وأبواب الحلال والحرام فإن ذلك قد جرى بين الصحابة فمن بعدهم من العلماء وذلك فيما يكون الغرض منه والباعث عليه ظهور الحق يتتبع دون الغلبة والتعجيز والله أعلم" اور کہا گیا ہے کہ اس حدیث (لاتماروا في القرآن الخ) سے مراد، تقدیر وغیرہ کے مسائل میں آیات کریمہ میں، اہلِ کلام، اہل بدعت اور اہل رائے کی طرح جھگڑا کرنا ہے۔ اس سے احکام اور حلال وحرام والے مباحث مراد نہیں ہیں کیونکہ یہ بحثیں (اور مناظرے) تو صحابہ کرام اور بعد والے علماء کے درمیان ہوئے ہیں، ان کی غرض وغایت یہ تھی کہ حق واضح ہو جائے تاکہ حق کی اتباع کی جائے، ان سے مخالف پر مجرد غلبہ یا عاجز کرنا مراد نہیں تھا۔ واللہ اعلم (النہایہ ۴/۳۲۲)

﴿وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾ اور اچھے طریقے کے ساتھ ان لوگوں سے مجادلہ (بحث) کرو۔ (النحل: ۱۲۵) جائز مناظرے کے جواز کی دلیل ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ((بلّغوا عني ولو آية)) إلخ مجھ سے (دین لے کر) لوگوں تک پہنچا دو چاہے ایک آیت ہی کیوں نہ ہو۔ (صحیح البخاری: ۳۴۶۱)

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا ایک کافر سے مناظرہ قرآن مجید میں مذکور ہے۔ (سورۃ البقرۃ: ۲۵۸)

مستدرک الحاکم (۲/۵۹۳، ۵۹۴ ح ۴۱۵۷) میں نجران کے عیسائیوں کا نبی ﷺ سے بحث ومباحثہ مذکور ہے۔ وصححہ الحاکم علی شرط مسلم ووافقہ الذہبی

صحیح بخاری میں ایک فقہی مسئلے پر سیدنا عبداللہ بن مسعود اور سیدنا ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہما کا مناظرہ موجود ہے۔ (۳۴۵، ۳۴۶)

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا خوارج سے مناظرہ کرنا ثابت ہے۔

(السنن الکبریٰ للبیہقی ۸/۱۷۹ وسندہ حسن)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں: " فكل لم يناظر أهل الالحاد والبدع مناظرة تقطع دابرهم ، لم يكن أعطى الإسلام حقه ولا وفى بموجب العلم والإيمان

ولا حصل بكلامه شفاء الصدور وطمأنينة النفوس ولا أفاد كلامه العلم واليقين " پس ہر شخص جو ملحدین ومبتدعین سے (عالم ہونے کے باوجود) بنیاد کاٹ دینے والا مناظرہ نہ کرے تو اس نے اسلام کا حق ادا نہیں کیا اور نہ علم وایمان کا تقاضا پورا کیا ہے۔ اس کے کلام سے دلوں کی شفا اور اطمینان حاصل نہیں ہوتا اور نہ اس کا کلام علم ویقین کا فائدہ دیتا ہے۔ (درء تعارض العقل والنقل ج ۱ ص ۳۵۷)

معلوم ہوا کہ اہلِ باطل اور لاعلم لوگوں کو کتاب وسنت کے دلائل سنا کر حق واضح کرنا دین کی بہت بڑی خدمت ہے۔ (۶-۲-۲۰۰۵ء) [الحدیث:۱۰]

کذباتِ ثلاثہ والی حدیث کا مفہوم

سوال گذارش ہے کہ کچھ دنوں سے ہماری سکول کلاس میں (صحیح) بخاری کی حدیث کذبات ابراہیم علیہ السلام کا بہت چرچا ہو رہا ہے۔ لوگ کہتے ہیں قرآن کریم میں آپ کو "صدیقًا نبیًا" کہا گیا ہے اور حدیث میں آپ کی طرف جھوٹ منسوب ہوا ہے، اس لیے یہ اس بخاری کو نہیں مانتے اور اسی وجہ سے یہ کتاب اصح الکتب بعد کتاب اللہ کا درجہ نہیں رکھتی۔ اس کے متعلق آپ بالوضاحت مضمون لکھیں۔ آپ کی خدمت میں ایک گذارش ہے براہِ کرم اس کام کو جلد سرانجام دیں۔ اللہ آپ کے علم میں اور اضافہ فرمائے۔ (آمین)

(محمد ارسلان ستار، راولپنڈی)

الجواب کذباتِ ابراہیم علیہ السلام والی حدیث، مختلف الفاظ کے ساتھ درج ذیل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے مروی ہے:

۱: سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ

۲: سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ

۳: سیدنا ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ والی حدیث درج ذیل تابعین عظام رحمہم اللہ اجمعین سے مروی ہے:

۱: محمد بن سیرین البصری (ثقہ ثبت عابد کبیر القدر، توفی ۱۱۰ھ/تقریب التہذیب: ۵۹۴۷ ملخصا)

۲: عبدالرحمٰن بن ہرمز الاعرج (ثقہ ثبت عالم، توفی: ۱۱۷ھ/التقریب: ۴۰۳۳)

۳: ابوزرعہ بن عمرو بن جریر (ثقہ/التقریب: ۸۱۰۳)

محمد بن سیرین سے درج ذیل راویوں نے یہ حدیث بیان کی ہے:

۱: ایوب بن ابی تمیمہ السختیانی (ثقہ ثبت حجۃ، توفی ۱۳۱ھ/التقریب: ۶۰۵)

☆ صحیح بخاری کتاب احادیث الأنبیاء باب ۸ ح ۳۳۵۷ وصحیح مسلم، کتاب الفضائل باب ۴۱ ح (۶۱۴۵) ۱۵۴/۲۳۷۱

۲: ہشام بن حسان البصری

(ثقہ، الخ توفی ۱۴۷، او ۱۴۸ھ/التقریب: ۷۲۸۹ وانظر طبقات المدلسین ۳/۱۱۰)

☆ ابو داود فی سننہ (۲۲۱۲) والنسائی فی السنن الکبریٰ (۹۸/۵ ح ۸۳۷۴ والنسخۃ المحققہ ۳۹۶/۷ ح ۸۳۱۶) وابن حبان فی صحیحہ (الاحسان: ۴۹۵/۷ ح ۵۷۰۷ والنسخۃ المحققۃ ۴۵/۱۳۔۴۷ ح ۵۷۳۷) وابن جریر الطبری فی تفسیرہ (۴۵/۲۳) وأبو یعلی فی مسندہ (۶۰۳۹)

عبدالرحمٰن بن ہرمز الاعرج سے درج ذیل راوی نے یہ حدیث بیان کی ہے:

۱: ابوالزناد (عبداللہ بن ذکوان المدنی، ثقہ فقیہ: توفی ۱۳۰ھ او بعدھا/التقریب: ۳۳۰۲)

☆ احمد فی مسندہ ۴۰۳/۲ ح ۹۲۳۰ والنسخۃ المحققۃ ۱۳۱/۱۵۔۱۳۴ ح ۹۲۴۱) والترمذی (۳۱۶۶) وقال: ''حسن صحیح'' والطبری فی تفسیرہ (۴۵/۲۳ وسندہ حسن) ورواہ البخاری (۲۲۱۷) مختصراً جداً۔

ابوزرعہ بن عمرو بن جریر سے درج ذیل راوی نے یہ حدیث بیان کی ہے:

۱: ابوحیان التیمی الکوفی (ثقہ عابد، توفی ۱۴۱ھ/التقریب: ۷۵۵۵)

☆ البخاری فی صحیحہ (۳۳۶۱، ۴۷۱۲) ومسلم فی صحیحہ ([۴۸۰] ۳۲۷/۱۹۴) وعبداللہ بن المبارک المروزی فی مسندہ (۱۱۰) واحمد فی مسندہ (۴۳۵/۲، ۴۳۶ ح ۹۶۲۱ والنسخۃ المحققۃ ۳۸۴/۱۵۔۳۸۷ ح ۹۶۲۳ وسندہ صحیح) والنسائی فی الکبری (۳۷۸/۶، ۳۷۹ ح ۱۱۲۸۶

والمحققة ۱۰/۱۴۸۔۱۵۰ح ۱۱۲۲۲) وابن خزیمہ فی کتاب التوحید (ص ۲۴۲۔۲۴۴ والمحققة ۲/۵۹۲۔۵۹۶ح ۳۴۷) وابن ابی شیبۃ فی المصنف (۱۱/۴۴۴ح ۳۱۶۶۵) والترمذی (۲۴۳۴ وقال: ھذا حدیث حسن صحیح) وابوعوانہ فی صحیحہ (المستخرج علی صحیح مسلم ۱/۱۷۰۔۱۷۴)

○ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے درج ذیل راوی نے یہ حدیث بیان کی ہے:

۱: قتادہ بن دعامہ البصری (ثقہ ثبت، توفی ۱۱۱ تا ۱۱۹ھ انظر التقریب: ۵۵۱۸)

☆ النسائی فی الکبریٰ

(۶/۴۴۰، ۴۴۱ح ۱۱۴۳۳ والمحققة ۱۰/۲۳۱، ۲۳۲ح ۱۱۳۶۹، وسندہ حسن، وقتادۃ صرح بالسماع)

○ سیدنا ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ

☆ الترمذی (۳۱۴۸/۱۸ وقال: حسن) وابویعلی فی مسندہ (۲/۳۱۰ح ۱۰۴۰)

تنبیہ: یہ روایت علی بن زید بن جدعان کے ضعف (ضعیف ہونے) کی وجہ سے ضعیف ہے۔

○ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ

☆ احمد فی مسندہ (۱/۲۸۱، ۲۸۲ح ۲۵۴۶، ۱/۲۹۵، ۲۹۶ح ۲۶۹۲ والمحققة ۴/۳۳۰۔ ۳۳۲ح ۲۵۴۶، ۴/۴۲۷۔۴۲۹ح ۲۶۹۲) وابوداود الطیالسی فی مسندہ (۲۷۱۱، ومنحۃ المعبود ۲/۲۲۶، ۲۲۷ح ۲۷۹۸)

تنبیہ: اس روایت کی سند ضعیف ہے۔ اس کا ایک راوی علی بن زید بن جدعان ضعیف ہے۔ (دیکھئے تقریب التھذیب: ۴۷۳۴)

موقوف روایات:

۱: سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ

☆ صحیح البخاری (۳۳۵۸) والنسائی فی الکبریٰ (۵/۹۸، ۹۹ح ۸۳۷۵ والمحققة ۷/۳۹۷ ح ۸۳۱۷ وسندہ صحیح) والطبری فی تفسیرہ (۲۳/۴۵)

آثار التابعین:

۱: محمد بن سیرین

☆ الطبری فی تفسیرہ (۲۳/۴۵، وسندہ صحیح)

اس تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ کذباتِ ابراہیم علیہ السلام والی حدیث، رسول اللہ ﷺ سے بذریعہ دو صحابیوں سیدنا ابو ہریرہ اور سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہما ثابت ہے۔

اسے امام بخاری کے علاوہ امام مسلم، امام ترمذی، امام ابن حبان، امام ابو عوانہ وغیرہم نے بھی صحیح قرار دیا ہے۔ رحمہم اللہ اجمعین

یہ حدیث امام بخاری (پیدائش: ۱۹۴ھ وفات: ۲۵۶ھ) کی پیدائش سے پہلے امام عبداللہ بن المبارک رحمہ اللہ (وفات: ۱۸۱ھ) نے بیان کر رکھی ہے۔ ان کے علاوہ امام بخاری کے استادوں مثلاً امام احمد بن حنبل، امام ابن ابی شیبہ، معاصرین مثلاً امام ابو داود وغیرہ اور بعد والے محدثین نے بھی روایت کیا ہے۔

کسی محدث نے اس حدیث پر جرح نہیں کی اور نہ کسی سے اس کا انکار ثابت ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد، صحابہ و تابعین سے بھی یہی روایت ثابت ہے۔

اس صحیح روایت کا مفہوم صرف یہ ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے تین مقامات پر توریہ فرمایا تھا، جسے تعریض بھی کہتے ہیں۔ اور ایسا کرنا شرعاً جائز ہے۔ اس توریہ کو حدیث میں کذبات کہا گیا ہے۔ اہلِ حجاز کی لغت میں توریہ کو کذب بھی کہتے ہیں۔ دیکھئے فتح الباری (ج ۶ ص ۳۹۱ تحت ح ۳۳۵۸) وتفسیر ابن کثیر (۵/۳۴۹ سورۃ الصافات: ۸۹) وشروح احادیث وکتب لغت وغیرہ۔ (۳۰/ ذوالحجہ ۱۴۲۵ھ) [الحدیث: ۱۰]

قیامت سے پہلے امام مہدی کا ظہور

سوال امام مہدی کب آئیں گے اور ان کے اوصاف کیا ہوں گے؟ نیز اہلحدیث کا امام مہدی کے بارے میں کیا مسلک ہے؟ (عطاء اللہ مکوانی، تھرپارکر)

الجواب قربِ قیامت نزولِ عیسیٰ علیہ السلام سے کچھ پہلے امام مہدی خلیفۃ المسلمین بنیں گے۔ ان کا نام محمد اور والد کا نام عبداللہ ہوگا، وہ فاطمہ بنت محمد ﷺ کی اولاد میں سے ہوں گے۔ (دیکھئے سنن ابی داود: ۴۲۸۴، وھو حدیث صحیح)

[لیکن یہ بات واضح رہے کہ وہ کسی غار میں نہیں ہیں بلکہ پیدا ہوں گے اور پھر خلافت کی مسند پر بیٹھیں گے۔] تفصیل کے لیے حافظ ابن کثیر کی کتاب النہایہ فی الفتن والملاحم کا مطالعہ کریں۔ [شہادت، اکتوبر ۱۹۹۹ء] [الحدیث: ۹]

فائدہ: امام مہدی کے بارے میں مفصل، تحقیقی اور علمی مضمون ''ظہورِ امام مہدی: ایک ناقابلِ تردید حقیقت'' میری کتاب ''علمی مقالات'' جلد دوم میں ملاحظہ فرمائیں۔

امام احمد بن حنبل اور عقیدۂ سماعِ موتیٰ

سوال کیا امام احمد بن حنبل اور اکابرین حنابلہ سے سماع موتیٰ اور عرض اعمال کا عقیدہ ثابت ہے یا ڈاکٹر عثمانی نے مغالطہ دیا ہے؟ (ایک سائل)

الجواب ڈاکٹر مسعود احمد عثمانی ایک مشہور کذاب ودجال اور تکفیری وخارجی عقیدے کا حامل تھا۔ اس نے میرے سامنے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کو کافر کہا تھا، لہٰذا جب تک اصل کتاب نہ دیکھ لیں ڈاکٹر مسعود کی نقل وروایات کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اصل مصادر کی طرف خود رجوع کر کے تحقیق کریں یا پھر ہمیں ڈاکٹر مسعود والے حوالے لکھ بھیجیں تاکہ ان کی تحقیق کی جاسکے۔ [شہادت، فروری ۲۰۰۴ء]

تنبیہ: واضح رہے کہ یہ عثمانی گروپ کا امام احمد کے خلاف باطل پروپیگنڈا ہے جبکہ یہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا یہ عقیدہ نہیں تھا کہ مُردے ہمہ وقت قبروں میں سنتے ہیں۔

امام اہلِ سنت احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے عقائد ان کی کتابوں اور ان کے اقوال سے اظہر من الشمس ہیں۔

حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور تقلید

سوال محترم حافظ صاحب چند سوالات ہیں مہربانی فرما کر ان کے جوابات مفصل دیئے جائیں۔ جوابات دینے میں تھوڑی دیر ہو جائے تو کوئی بات نہیں لیکن جواب مفصل ہونے چاہئیں اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ (آمین)

۱۔ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کا مسلک ان کی کتابوں سے باحوالہ نقل فرمائیں کہ یہ مقلد تھے یا غیر مقلد؟

۲۔ نیز یہ بھی بتائیں کہ کیا ان کی کتابوں میں سے شرک وغیرہ ثابت کیا جا سکتا ہے۔ بریلوی (حضرات حافظ ابن القیم کی) کتاب الروح وغیرہ سے یہ عقیدہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ مُردوں کے سننے اور اُن سے مدد مانگنے کے قائل تھے۔ کیا ان کی مزید (دوسری) کتابوں میں، مردے اور غائب سے مدد مانگنا، ناجائز یا شرک لکھا ہوا موجود ہے۔ اگر ہے تو باحوالہ لکھیں۔ ایک بریلوی دوست کہتا ہے کہ ہمارا عقیدہ ابن تیمیہ اور ابن قیم سے ملتا ہے۔ کیا واقعی یہ بات درست ہے؟ اگر نہیں تو وضاحت فرمائیں۔ اگر ان میں سے کوئی سوال ''الحدیث'' کے لئے موزوں ہو تو ضرور شائع کیجئے۔ جزاکم اللہ خیراً.

۳۔ بریلوی دوست کہتا ہے کہ محمد بن عبدالوہاب سے پہلے کسی نے قبروں سے اور غائب سے مدد مانگنا شرک نہیں لکھا۔ کیا یہ بات درست ہے؟ اگر نہیں تو اللہ آپ کو بہترین جزا عطا فرمائے۔ کم از کم دس قدیم مفسرینِ قرآن وحدیث کے حوالہ جات لکھیں جنھوں نے غائب یا فوت شدہ سے مانگنا شرک لکھا ہو۔ یاد رہے کہ اہم مفسرین کے اقوال ہوں۔

۴۔ حدیث کہ جب تم کسی ویران جگہ پر ہو اور تمہاری سواری گم ہو جائے تو پکارو (اے اللہ کے بندو میری مدد کرو۔) اس کی سند اگر ضعیف ہے (تو) ثابت کریں، تمام طرق کے بارے میں بتائیں۔ جن محدثین نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ ان کے اقوال باحوالہ بتائیں نیز یہ بھی بتائیں کہ کیا کسی اہم مفسر نے (سوائے غلام رسول سعیدی بریلوی کے) شارح مسلم، کسی نے اس حدیث سے قبروں یا غائب سے مدد مانگنا ثابت کیا ہے؟

فضیلۃ الشیخ یہ سوال بہت اہم ہے مفصل جواب دیجئے گا۔ اللہ آپ کے علم وعمل میں برکت دے اور دنیا اور آخرت میں آپ کے لئے آسانیاں پیدا فرمائے۔ (ابو علی اسد ندیم)

الجواب ① حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ مشہور عالم بلکہ شیخ الاسلام تھے۔ ان کا مقلد ہونا قطعاً ثابت نہیں ہے بلکہ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

" ولقد أنكر بعض المقلدين على شيخ الإسلام في تدريسه بمدرسة ابن الحنبلي وهي وقف على الحنابلة، والمجتهد ليس منهم، فقال: إنما أتناول ماأتناوله منها على معرفتي بمذهب أحمد، لاعلى تقليدي له "

اور بعض مقلدین نے شیخ الاسلام (ابن تیمیہ) پر اعتراض کیا کہ وہ مدرسہ ابن الحنبلی میں پڑھاتے ہیں حالانکہ یہ مدرسہ حنابلہ پر وقف ہے اور مجتہد ان (حنبلیوں و مقلدین) میں نہیں ہوتا، تو انھوں نے فرمایا: میں اسے احمد (بن حنبل) کے مذہب کی معرفت پر استعمال کرتا ہوں، میں اس (احمد) کی تقلید نہیں کرتا۔

(اعلام الموقعین ۲/۲۴۱، ۲۴۲ مطبوعہ دار الجیل بیروت لبنان، الرد علی من أخلد إلی الأرض للسیوطی ص ۱۲۶)

دلیل دوم: حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے شاگرد حافظ ذہبی رحمہ اللہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں: " الشيخ الإمام العلامة الحافظ الناقد (الفقيه) المجتهد المفسر البارع شيخ الإسلام عَلم الزهاد نادرة العصر ... " (تذکرۃ الحفاظ ۴/۱۴۹۶ ت ۱۱۷۵)

معلوم ہوا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ حافظ ذہبی کے نزدیک مجتہد تھے۔ یہ بات عام لوگوں کو بھی معلوم ہے کہ مجتہد تقلید نہیں کرتا۔ طحطاوی حنفی نے " طبقة المجتهدين في الشرع كالأربعة وأمثالهم " کے بارے میں لکھا ہے کہ " وهم غير مقلدين " اور وہ غیر مقلد ہیں۔ (حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار ۱/۵۱)

ماسٹر محمد امین اوکاڑوی دیوبندی حیاتی لکھتے ہیں:

" جو شخص خود مجتہد ہوگا وہ خود قواعد شرعیہ سے مسئلہ تلاش کر کے کتاب و سنت پر عمل کرے گا "

(تحقیق مسئلہ تقلید ص ۵ مجموعہ رسائل ۱/۲۱ مطبوعہ، اکتوبر ۱۹۹۱ء گوجرانوالہ)

دلیل سوم: کچھ لوگ یہ کہتے رہتے ہیں کہ عوام پر فلاں (مثلاً امام ابوحنیفہ) یا فلاں کی تقلید واجب ہے۔ ان لوگوں کی تردید کرتے ہوئے حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

" وأما أن يقول قائل: إنّه يجب على العامة تقليد فلان أو فلان فهذا لا يقوله مسلم " اور اگر کوئی کہنے والا کہے کہ عوام پر فلاں یا فلاں کی تقلید واجب ہے، تو ایسی بات

کوئی مسلم نہیں کہتا۔ (مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ ۲۲/۲۴۹)

معلوم ہوا کہ حافظ ابن تیمیہ کے نزدیک کوئی مسلمان بھی وجوبِ تقلیدِ فلان کا قائل نہیں ہے۔

دلیل چہارم: جو شخص (تقلید کرتے ہوئے) کسی ایک امام کے لئے تعصب کرتا ہے (جیسا کہ آلِ دیوبند وغیرہ کا طریقۂ کار ہے) تو ایسے شخص کو امام ابن تیمیہ "کالرافضي .... جاهلاً ظالماً" قرار دیتے ہیں۔ دیکھئے مجموع فتاویٰ (۲۲/۲۵۲) یعنی ان کے نزدیک ایسا شخص جاہل، ظالم اور رافضیوں کی طرح ہے۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ مقلد نہیں تھے بلکہ مجتہد اور متبع کتاب وسنت تھے۔ والحمدللہ

② حافظ ابن القیم نے ایک مستقل کتاب "اعلام الموقعین" تقلید کے رد میں لکھی ہے۔ اس کتاب کا نام جلال الدین سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) "ذم التقليد" بتاتے ہیں۔

(دیکھئے الرد علی من اخلد الی الارض ص ۱۲۶)

دلیل پنجم: حافظ ابن قیم الجوزیہ تقلید کے بارے میں فرماتے ہیں: "وإنما حدثت هذه البدعة في القرن الرابع المذموم على لسان رسول الله ﷺ"

اور یہ بدعت تو چوتھی صدی (ہجری) میں پیدا ہوئی، جس کی مذمت رسول اللہ ﷺ نے اپنی (مبارک) زبان سے بیان فرمائی ہے۔ (اعلام الموقعین ۲/۲۰۸)

معلوم ہوا کہ مروجہ تقلید امام ابن القیم کے نزدیک بدعت مذمومہ ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ وہ بذاتِ خود حنبلی مقلد ہرگز نہیں تھے بلکہ مجتہد و متبع کتاب وسنت تھے۔ والحمدللہ

فائدہ: دیوبندیوں اور بریلویوں کے بزرگ ملا علی قاری حنفی (متوفی ۱۰۱۴ھ) نے لکھا ہے:

"ومن طالع شرح منازل السائرين تبين له أنهما كانا من أكابر أهل السنة والجماعة ومن أولياء هذه الأمة" اور جو شخص شرح منازل السائرین کا مطالعہ کرے تو اس کے لئے واضح ہو جائے گا کہ وہ دونوں (ابن تیمیہ اور ابن القیم) اہلِ سنت والجماعت کے اکابر اور اس امت کے اولیاء میں سے تھے۔

(جمع الوسائل فی شرح الشمائل ار۲۰۷)

③ میرے علم کے مطابق ابن تیمیہ اور ابن القیم رحمہما اللہ کی کتابوں میں شرک اکبر کا کوئی ثبوت نہیں ہے، تاہم ابن القیم کی ثابت شدہ ''کتاب الروح'' اور دیگر کتابوں میں ضعیف ومردود روایات ضرور موجود ہیں۔ یہ دونوں حضرات مردوں سے مدد مانگنے کے قائل نہیں تھے، رہا مسئلہ سماع موتیٰ کا تو یہ سلف صالحین کے درمیان مختلف فیہا مسئلہ ہے، اسے کفر و شرک سمجھنا غلط ہے۔ صحیح اور راجح یہی ہے کہ صحیح احادیث سے ثابت شدہ بعض مواقع مخصوصہ کے علاوہ مُردہ کچھ بھی نہیں سنتا۔

آپ کے بریلوی دوست کا یہ دعویٰ کہ ''ہمارا عقیدہ، ابن تیمیہ اور ابن قیم سے ملتا ہے'' محتاجِ دلیل ہے۔ اس سے کہیں کہ وہ اپنے مشہور عقائد مثلاً وجوب تقلید ابی حنیفہ، حاضر ناظر، نور من نور اللہ اور علم الغیب وغیرہ مسائل کا مدلل و باحوالہ ثبوت ابن تیمیہ و ابن القیم سے پیش کرے تاکہ مزید بحث و تحقیق جاری رکھی جاسکے۔

④ بریلوی دوست سے کہیں کہ وہ محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ سے پہلے گزرے ہوئے کسی ایک ثقہ و مستند امام سے صرف ایک حوالہ ثابت کردے کہ قبروں سے مدد مانگنا صحیح ہے یا شرک نہیں ہے۔ شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ کی پیدائش سے صدیوں پہلے شیخ الاسلام ابن تیمیہ (متوفی ۷۲۸ھ) نے ایک کتاب ''الجواب الباھر فی زوار المقابر'' لکھی ہے جس میں قبر پرستوں کا زبردست رد کیا ہے۔

جو لوگ آپ ﷺ کی قبر کی طرف رخ کرکے سلام (السلام علیک) کی اونچی آوازیں بلند کرتے ہیں ان کے بارے میں ابن تیمیہ نے لکھا ہے: ''**بل هذه بدعة لم يستحبها أحد من العلماء**'' بلکہ یہ بدعت ہے، علماء میں سے کسی ایک نے بھی اسے مستحب قرار نہیں دیا۔ (الجواب الباھر ص۹ مطبوعہ: الریاض، جزیرۃ العرب/ السعودیہ)

جو لوگ قبروں پر جاکر انھیں پکارتے ہیں (**ويدعونه ويحبونه مثل ما يحبون الخالق**) انھیں ابن تیمیہ نے ''**أهل الشرك**'' قرار دیا ہے۔ (الجواب الباھر ص۲۱)

یہ ساری کتاب پڑھنے کے لائق ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے قبر پرستی کو شرک کا پہلا سبب (هو أول أسباب الشرك في قوم نوح) قرار دیا ہے۔ (الجواب الباہر ص ۱۲)

شیخ الاسلام سے صدیوں پہلے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کو چھونا مکروہ سمجھتے تھے۔ روایت میں آیا ہے: " أن ابن عمر كان يكره مسّ قبر النبي عليه السلام "

بے شک ابن عمر (رضی اللہ عنہ) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کو چھونا مکروہ سمجھتے تھے۔

(جزء محمد بن عاصم الثقفی الاصبہانی: ۲۷ وسندہ صحیح، أبو أسامة بري من التدليس)

فائدہ: ابن قدامہ الحنبلی (متوفی ۶۲۰ھ) نے قبروں پر چراغ جلانے سے منع کرتے ہوئے لکھا ہے: " وإفراطًا في تعظيم القبور أشبه تعظيم الأصنام.. " اور قبروں کی تعظیم میں یہ افراط ہے، یہ بتوں کی تعظیم سے مشابہ ہے۔ (المغنی ۲/۱۹۳ مسئلہ: ۱۵۹۴)

سورۂ یونس کی آیت (۱۰۱) کی تشریح میں مفسر ابن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ) فرماتے ہیں: " يقول تعالىٰ ذكره ولا تدع يا محمد من دون معبودك وخالقك شيئاً في الدنيا ولا في الآخرة.... " إلخ

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے معبود اور خالق (اللہ) کے علاوہ دنیا و آخرت میں کسی چیز کو بھی (مافوق الاسباب) نہ پکارو.....الخ (تفسیر طبری ۱۱/۱۲۲)

قدیم مفسرین میں سے صرف اسی ایک ثقہ مفسر کا حوالہ کافی ہے۔ جو لوگ قبر پرستی کو جائز سمجھتے ہیں ان سے مطالبہ کریں کہ صرف ایک قدیم ثقہ مفسر سے قبر پرستی کا جواز ثابت کریں۔

ابن تیمیہ نے ان لوگوں کو مشرک قرار دیا ہے جو قبر والوں کو (مدد کے لئے) پکارتے ہیں۔ دیکھئے کتاب الرد علی الاخنائی (ص ۵۲) اور مجموع فتاویٰ (۲۷/۲۵۶)

⑤ یہ روایت اپنی مختلف سندوں کے ساتھ مسند ابی یعلیٰ، المعجم الکبیر للطبرانی اور مسند البزار وغیرہ میں موجود ہے۔ اس کی تمام سندیں ضعیف ہیں۔

دیکھئے السلسلة الضعيفة للالبانی (۲/۱۰۸۔۱۱۲ ح ۶۵۵، ۶۵۶)

مسند بزار والی سند شیخ البانی کے نزدیک شاذ ہونے کی وجہ سے مردود ہے۔ حافظ بزار

بذاتِ خود متکلم فیہ ہیں۔حافظ دارقطنی نے ان کے بارے میں فرمایا:" ثقة يخطئ كثيراً ويتكل على حفظه "(سوالات حمزۃ بن یوسف السہمی للدارقطنی:۱۱۶)

اور فرمایا:" يخطئ في الاسناد والمتن ، حدث بالمسند بمصر حفظًا، ينظر في كتب الناس ويحدث من حفظه، ولم تكن معه كتب فأخطأ في أحاديث كثيرة، يتكلمون فيه، جرحه أبو عبد الرحمن النسائي "(سوالات الحاکم للدارقطنی:۲۳)

ابواحمد الحاکم سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا:" يخطئ في الإسناد والمتن "

(دیکھئے لسان المیزان ۱/۲۳۷)

بزار کو خطیب بغدادی، ابوعوانہ صاحب المسند ،وغیرہما نے ثقہ وصدوق قرار دیا ہے۔

بزار کی معلول روایت کے مقابلے میں بیہقی نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا:" إنّ لله عزوجل ملائكة في الأرض سوى الحفظة يكتبو ن ما يسقط من ورق الشجر فإذا أصاب أحد كم عرجة في الأرض لا يقدر فيها على الأعوان فليصح فليقل:عبادالله أغيثونا أوأعينونا رحمكم الله، فإنه سيعان " (شعب الایمان ۶/۱۲۸ ح ۷۶۹۷ وسندہ حسن موقوف، ۱/۱۸۳ ح ۱۶۷)

صحابی کے اس قول میں زندہ فرشتوں کو پکارنے کا جواز ہے لہٰذا یہ پکارنا ماتحت الاسباب ہوا۔اس قول میں مردہ روحوں کو پکارنے کا کوئی ثبوت نہیں ہے لہٰذا اسے مافوق الاسباب پکارنے کی دلیل بنالینا غلط ہے۔

لطیفہ: مسند البزار اور بیہقی والی روایت کا ایک راوی اسامہ بن زید اللیثی ہیں جو قولِ راجح میں حسن الحدیث ہیں۔یہ راوی اگر حنفیوں کے مخالف کسی حدیث میں آجائے تو یہ لوگ فوراً اس پر جرح کردیتے ہیں، مثلاً دیکھئے آثار السنن للنیموی (باب ماجاء فی التغلیس ح ۲۱۳ عن ابی مسعود الانصاری رضی اللہ عنہ ، حاشیہ)

کیا انصاف اسی کا نام ہے؟ (۲۵ ذوالقعدہ ۱۴۲۶ھ) [الحدیث:۲۳]

زمین اور آسمان کے درمیان مسافت

سوال عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم بطحاء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھے تھے، ایک بادل گزرا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: تم جانتے ہو یہ کیا ہے؟ ہم نے کہا: بادل، فرمایا: یہ مزن ہے، ہم نے کہا: ہاں مزن ہے، فرمایا: اور عنان، ہم خاموش ہو گئے۔ آپ نے پوچھا: تمھیں معلوم ہے زمین و آسمان کے درمیان کتنی مسافت ہے؟ ہم نے کہا: اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔ فرمایا: ان کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ ہر آسمان کی موٹائی پانچ سو سال ہے۔ پھر ایک سمندر ہے اس کی مسافت زمین و آسمان کی مسافت کے برابر ہے اور اللہ اس کے اوپر ہے۔ بنو آدم کے اعمال میں سے کوئی بھی عمل اس سے مخفی نہیں۔ (ابوداود: ۴۷۲۳، ابن ماجہ: ۱۹۳، مسند احمد ج ۱ ص ۲۰۶، وحسنہ الترمذی: ۳۳۲۰، کتاب التوحید للامام ابن خزیمہ ۱۰۱، ۱۰۲، من طرق آخر، کتاب العلو للذھبی ص ۱۰۸، ۱۰۹۔ وقال: تفرد بہ سماک عن عبداللہ بن عباس وغیرہ وفیہ جھالۃ.....الخ، ونقلہ الالبانی فی ضعیف سنن ابی داود)

لیکن علامہ ذہبی نے اس کے ایک طریق (سند) ابراہیم بن طہمان عن سماک کو شاید صحیح کہا ہے، دیکھیں ص ۱۰۹ طبع الھند۔ آپ کیا فرماتے ہیں؟ (ایک سائل)

الجواب اسے امام ترمذی (۳۳۲۰) نے حسن قرار دیا ہے لیکن اس کی سند ضعیف ہے۔ سماک بن حرب اختلاط کا شکار ہو گئے تھے اور ان کا یہ روایت قبل از اختلاط بیان کرنا معلوم نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ عبداللہ بن عمیرہ کا احنف بن قیس سے سماع معروف نہیں ہے۔ (دیکھئے التاریخ الکبیر للبخاری ۵/۱۵۹) [شہادت، مارچ ۲۰۰۳ء]

ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام؟

سوال آزر، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا چچا تھا یا والد؟ کیونکہ ''اَبٌ'' کا لفظ والد کے ساتھ ساتھ چچا کیلئے بھی بولا جاتا ہے اور قرآن میں استعمال ہوا ہے۔

(طارق، دومیل، مظفر آباد)

الجواب آزر کے بارے میں دو مذہب مشہور ہیں:

① ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام آزر ہے۔

② آزر، ابراہیم علیہ السلام کا والد نہیں ہے۔

میری تحقیق میں پہلا مذہب ہی صحیح اور حق ہے۔

ا۔ مذہب اول کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱: قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ﴾ (سورۃ الانعام:۷۴)

و یاد کن چون گفت ابراہیم پدر خواہ آزر را خدا میگیری بتان را۔

(فارسی ترجمہ از شاہ ولی اللہ الدھلوی ص۱۶۶)

اور جب کہا ابراہیم نے اپنے باپ آزر کو، تو کیا پکڑتا ہے مورتوں کو خدا؟

(اردو ترجمہ از شاہ عبدالقادر دہلوی ص۱۶۶)

۲: سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((يلقى إبراهيم أباه آزر يوم القيامة وعلى وجه آزر قترة وغبرة)) إلخ

ابراہیم علیہ السلام قیامت کے دن اپنے باپ آزر سے ملاقات کریں گے۔ (صحیح بخاری:۳۳۵۰)

۳تا۹: قرآن مجید میں درج ذیل آیاتِ مبارکہ میں ﴿ لِاَبِيْهِ ﴾ کہہ کر ابراہیم علیہ السلام کے بت پرست والد کا ذکر کیا گیا ہے۔ (۳) سورۃ التوبہ، آیت:۱۱۴

(۴) سورۃ الممتحنہ:۴ (۵) مریم:۴۲ (۶) الانبیاء:۵۲ (۷) الشعراء:۷۰

(۸) الصافات:۸۵ (۹) الزخرف:۲۶۔

۱۰: اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کا قول نقل کیا: ﴿ وَاغْفِرْ لِاَبِيْۤ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴾

اور میرے باپ کی مغفرت کر، بے شک وہ گمراہوں میں سے تھا۔ (سورۃ الشعراء:۸۶)

ابراہیم علیہ السلام نے بار بار ﴿ يَا اَبَتِ ﴾ کہہ کر اپنے والد کو مخاطب کیا۔

(۱۱) سورۂ مریم:۴۲ (۱۲) مریم:۴۳ (۱۳) مریم:۴۴ (۱۴) مریم:۴۵

۱۵: سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إن إبراهيم رأى أباه يوم القيامة ، عليه الغبرة والقترة)) بے شک ابراہیم (علیہ السلام) اپنے باپ کو قیامت کے دن دیکھیں گے، اس پر گرد اور کالک چھائی ہوگی۔

(السنن الکبری للنسائی: ح ۱۱۳۷۵، والتفسیر للنسائی: ح ۳۹۵ وسندہ صحیح، ولہ طریق آخر عند البخاری فی صحیحہ: ۴۷۶۸)

۱۶: اسماعیل بن عبدالرحمٰن السدی (تابعی) نے کہا: " اسم أبيه آزر ".

ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام آزر ہے۔ (تفسیر طبری: ج ۷ ص ۱۵۸، وسندہ حسن لذاتہ)

تنبیہ: ایک دوسری روایت میں سدی مذکور نے صیغہ تمریض استعمال کرتے ہوئے کہا:

" ويقال : لا بل اسمه تارح واسم الصنم آزر " (تفسیر طبری: ۷/۱۵۸، ۱۵۹، وسندہ حسن)

" ویقال " میں اشارہ ہے کہ یہ دوسرا قول مردود ہے، مجہول قائل کا یہ مردود قول تفسیر ابن ابی حاتم (۴/۱۳۲۵) اور در منثور (۳/۲۳) میں الفاظ کے تغیر کے ساتھ مذکور ہے۔

۲۔ مذہب دوم کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱: مجاہد تابعی سے مروی ہے کہ " آزر لم يكن بأبيه ولكنه اسم صنم "

(تفسیر ابن ابی حاتم ۴/۱۳۲۵، وتفسیر طبری ۷/۱۵۸)

اس قول کی سند کا ایک راوی لیث بن ابی سلیم ہے، اسے جمہور محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔

دیکھئے تہذیب التہذیب (ج ۸ ص ۴۱۷ تا ۴۱۹)

حافظ ابن حجر نے فرمایا: " وليث ضعيف " اور لیث (بن ابی سلیم) ضعیف ہے۔

(فتح الباری ج ۲ ص ۲۱۴ ح ۷۲۹)

ضعف کی وجہ اس کا آخری عمر میں اختلاط ہے۔ دیکھئے تقریب التہذیب (۵۶۸۵)

لیث مذکور مدلس بھی ہے۔

دیکھئے کتاب " مشاهير علماء الأمصار " لابن حبان (ص ۱۴۶ رقم: ۱۱۵۳)

لہٰذا یہ روایت دو وجہ سے ضعیف و مردود ہے۔ ایک دوسری سند میں ابن ابی نجیح مدلس راوی ہیں لہٰذا وہ سند بھی ضعیف ہے۔

۲: ابن جریج سے مروی ہے کہ "لیس آزر بأبیه" إلخ (درمنثور ج ۳ ص ۲۳ بحوالہ ابن المنذر)
اس روایت کی کوئی سند معلوم نہیں ہے، لہٰذا یہ روایت مردود ہے۔
۳: عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ "إن أبا إبراهيم لم يكن اسمه آزر ، إنما كان اسمه تارح " (تفسیر ابن ابی حاتم: ۴/۱۳۲۵ ح ۷۴۹۱)

یہ روایت ضعیف و مردود ہے۔
بشر بن عمارہ الخثعمی المکتب الکوفی: ضعیف ہے۔ (التقریب: ۶۹۷)
ضحاک بن مزاحم نے ابن عباس (رضی اللہ عنہما) سے (کچھ بھی) نہیں سنا۔
دیکھئے کتاب الجرح والتعدیل (ج ۴ ص ۴۵۹ عن ابی زرعہ رحمہ اللہ)
مضبوط سند کے ساتھ مروی ہے کہ عبدالملک بن میسرہ نے ضحاک بن مزاحم سے پوچھا:
کیا آپ نے ابن عباس سے (کچھ) سنا ہے؟ کہا: نہیں۔ کہا: یہ (تفسیر) جو آپ بیان کرتے ہیں، یہ کس سے لی ہے؟ کہا: تجھ سے اور اِس سے اور اُس سے۔

(کتاب الجرح والتعدیل ج ۴ ص ۴۵۸، ج ۸ ص ۳۳۳، کتاب المراسیل لابن ابی حاتم ص ۹۵)

اس روایت کے راوی معلیٰ بن خالد الرازی ثقہ ہیں اور ابو اسامہ تدلیس معروف کے الزام سے بری تھے۔ دیکھئے میری کتاب "الفتح المبین فی تحقیق طبقات المدلسین" (۲/۴۴)
تنبیہ (۱): ابن ابی حاتم نے حسن سند کے ساتھ ابن عباس (رضی اللہ عنہما) سے نقل کیا ہے کہ "يعني بآزر الصنم وأبو إبراهيم ، اسمه :يازر وأمه اسمها مثانى " إلخ

(تفسیر ابن ابی حاتم ۴/۱۳۲۴)

یہ روایت اسرائیلیات سے ماخوذ ہے، یازر اور آزر ایک ہی شخصیت کا نام ہے۔ صرف لہجے میں فرق ہے جیسے ابراہیم اور ابراہام ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔ بت کا نام آزر ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ بت پرست کا نام آزر نہیں ہو سکتا رام نامی ہندو، رام بت کی عبادت کرتا ہے حالانکہ عبادت صرف ایک اللہ ہی کی کرنی چاہیے۔
تنبیہ (۲): کسی ایک صحابی یا تابعی سے باسند صحیح قطعاً یہ ثابت نہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کے

والد کا نام آزر نہیں ہے۔

تنبیہ (۳): سلیمان التیمی سے مجہول سند کے ساتھ مروی ہے کہ "بلغني أنها أعوج وأنها أشد كلمة قالها إبراهيم علیہ السلام لأبيه" (تفسیر ابن ابی حاتم ۴/۱۳۲۵)

یہ قول مذہب اول کے مخالف نہیں ہے کیونکہ ہٹ دھرم ضدی اور کافر باپ سے جو توحید کا انکار کرتے ہوئے اپنے بیٹے کو گھر سے نکال دے، عندالضرورت سخت الفاظ کہے جا سکتے ہیں۔

تنبیہ (۴): بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارح اور لقب آزر ہے، یہ قول مذہب اول کے مطابق ہے، مخالف بالکل نہیں ہے۔

تنبیہ (۵): کسی ایک روایت سے قطعاً یہ ثابت نہیں کہ قرآن میں "آزر" کا لفظ چچا "عم" کے بارے میں ہے جس شخص کا یہ دعویٰ ہے کہ قرآن میں بہت سی آیات میں "لِاَبِيْهِ" یا "يَا اَبَتِ" کے لفظ کا مطلب "لِعَمِّهِ" یا "يَا عَمّ" ہے۔ اس سے ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ایک دلیلِ قوی پیش کرے جو اس کے دعویٰ پر صریح ہو۔

خلاصۃ التحقیق: ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام آزر ہے، چچا کا نام آزر ثابت نہیں ہے۔

روح المعانی میں آلوسی نے ایک روایت لکھی ہے:

"لم أزل أنقل من أصلاب الطاهرين إلى أرحام الطاهرات"

(روح المعانی: ج ۴ ص ۱۹۵)

یہ روایت بے اصل ہے۔ اس مفہوم کی ایک باطل و مردود روایت ابونعیم اصبہانی کی دلائل النبوۃ میں بھی ہے۔ (ج ۱ ص ۵۷ ح ۱۵)

اس روایت کے درج ذیل راویوں کے حالات معلوم نہیں ہیں:

یزید بن ابی حکیم!، موسیٰ بن عیسیٰ، انس بن محمد، محمد بن عبداللہ، احمد بن محمد بن سعید المروزی، محمد بن سلیمان الہاشمی۔

اس باطل روایت کے بارے میں حافظ سیوطی نے لکھا ہے کہ "أخرجه أبو نعيم من

طرق عن ابن عباس " (الخصائص الکبریٰ:۱؍۳۷)

حالانکہ ابونعیم نے اسے ایک ہی سند سے روایت کیا ہے۔

تفسیر ابن ابی حاتم (ج۹ص ۲۸۲۸ح ۱۶۰۲۸) وغیرہ میں حسن سند سے مروی ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ﴾ کی تفسیر میں فرمایا:

"من نبي إلى نبي حتى أخرجك نبيًّا"

یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے اسماعیل نبی علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔

اس موقوف قول کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے والد عبداللہ، دادا عبدالمطلب، پردادا ہاشم: یہ سب نبی تھے اور نہ یہ کسی کا عقیدہ ہے، صحیح بخاری کی صحیح حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آباء واجداد میں سے اسماعیل علیہ السلام کے علاوہ کوئی بھی نبی نہیں تھا۔

دیکھئے کتاب بدء الوحی (باب:۱ح ۷)

آلوسی نے لکھا ہے کہ " أخرجه ابن المنذر في تفسيره بسند صحيح عن سليمان بن صرد قال ...... فقال عمه :من أجلي دفع عنه ...... "

(روح المعانی ج ۴ص ۱۹۵)

اس قول کی کوئی سند معلوم نہیں ہے، پتا نہیں کہ آلوسی نے کہاں سے یہ دعویٰ کر رکھا ہے کہ "بسند صحيح" !، بے اصل و بے سند روایات کو " بسند صحيح " کہہ کر تسلیم کروانا بہت ہی عجیب کام ہے۔ اگر یہ قول باسند صحیح ثابت ہو بھی جاتا تو اس کا مطلب صرف یہ ہوتا کہ ابراہیم علیہ السلام کا والد آزر اور چچا (نام غیر معلوم) دونوں آپ علیہ السلام کے سخت مخالف تھے، اور ایسا ہونا کوئی بعید نہیں ہے، یاد رہے کہ اس بے سند روایت میں ولدیتِ آزر کی نفی موجود نہیں ہے۔

محدث کبیر ابوالاشبال احمد محمد شاکر المصری رحمہ اللہ نے صاف صاف لکھا ہے کہ " أما أن اسم والد إبراهيم " آزر " فإنه عندنا أمر قطعي الثبوت ، بصريح القرآن في هذه الآية، بدلالة الألفاظ على المعاني ، وأما التأويل والتلاعب بالألفاظ ،

فما هو إلا إنكار مقنع لمضمون الكلام ومعناه ، وسواء أكان اسمه في قول أهل النسب نقلاً عن الكتب السابقة – " تارح " أولم يكن ، فلا أثرله في وجوب الإيمان بصدق ما نص عليه القرآن وبدلالة لفظ " لأبيه " على معناه الوضعي في اللغة، والقرآن هو المهيمن على ما قبله من كتب الأديان السابقة ، ثم يقطع كل شك ويذهب بكل تأويل – الحديث الصحيح الذي رواه البخاري: (۱۳۹/۴، من الطبعة السلطانیہ/۶/ ۲۷ من فتح الباری)

" عن أبي هريرة عن النبي ﷺ قال :((يلقى إبراهيم أباه آزر يوم القيامة ، وعلى وجه آزر قترة و غبرة ، فيقول له إبراهيم :ألم أقل لك :لا تعصني ؟)) إلى آخر الحديث وليس بعد هذا النص مجال للتلاعب "

یعنی: ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام آزر ہونا ہمارے نزدیک، اس آیت کریمہ میں قرآن کی صراحت کے ساتھ قطعی الثبوت ہے، الفاظ بھی اسی معنی پر دلالت کرتے ہیں، رہا تاویلیں کرنا اور الفاظ کے ساتھ کھیلنا تو یہ قرآن کے مضمون کا انکار ہی ہے، اہل نسب نے پہلی (محرف شدہ) کتابوں سے تارح نقل کیا ہے، اس کا قرآن کے مقابلے میں کوئی اثر (واعتبار) نہیں ہے، لغت میں ﴿لابیہ﴾ کا لفظ اصل میں باپ پر دلالت کرتا ہے، اور قرآن مجید پہلی تمام کتابوں پر فیصلہ کن حاکم اور نگران ہے، پھر اس صحیح حدیث سے بھی ہر قسم کا شک اور تاویل باطل ہو جاتی ہے جسے بخاری نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی سند سے نبی ﷺ سے نقل کیا ہے کہ ابراہیم (علیہ السلام) قیامت کے دن اپنے باپ آزر سے ملاقات کریں گے اور آزر کے چہرے پر کالک اور گرد و غبار چھایا ہوگا تو اسے ابراہیم (علیہ السلام) کہیں گے: کیا میں نے تجھے یہ نہیں کہا تھا: میری نافرمانی نہ کر؟ (صحیح بخاری: ۳۳۵۰) اس حدیث کے بعد کسی تلاعب (الفاظ کے ساتھ کھیلنے) کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔" (عمدۃ التفسیر ج ۵ ص ۵۳)

[الحدیث:۳]

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا اللہ تعالیٰ سے مصافحہ کرنا؟

سوال امام جلال الدین سیوطی کی کتاب تاریخ الخلفاء میں ایک روایت از بزار منقول ہے کہ حضرت عمرؓ قیامت کے دن اللہ سے مصافحہ کریں گے اور اپنا سلام پیش کریں گے اور اللہ عزوجل حضرت عمرؓ کو ہاتھ سے پکڑ کر جنت میں داخل کریں گے۔

(عابد حسین شاہ ولد ظہور شاہ)

الجواب آپ کی مذکورہ روایت کی تحقیق درج ذیل ہے:

تاریخ الخلفاء للسیوطی میں لکھا ہوا ہے کہ "وأخرج ابن ماجه والحاكم عن أبي بن كعب قال: قال النبي عليه الصلوة والسلام: أول من يصافحه الحق عمر وأول من يسلم عليه وأول من ياخذ بيده فيدخل الجنة" (ص۱۱۷)

ابن ماجہ (۱۰۴) اور حاکم (۳/۸۴ ح ۴۴۸۹ نحو المعنیٰ) نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الحق (یعنی اللہ) سب سے پہلے (قیامت کے دن) عمر سے مصافحہ کرے گا اور سب سے پہلے عمر پر سلام کرے گا اور سب سے پہلے عمر (رضی اللہ عنہ) کا ہاتھ پکڑ کر انھیں جنت میں داخل کرے گا۔

تحقیق: یہ روایت (سخت) ضعیف ہے۔ (انوار الصحیفۃ ص ۲۶۵)

ابن ماجہ والی سند کا ایک راوی داود بن عطاء ہے، جس کے بارے میں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

"ضعيف" (تقریب التہذیب: ۱۸۰۱)

امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "منكر الحديث" (کتاب الضعفاء: ۱۱۰ و تحفۃ الاقویاء ص ۳۹)

احمد بن ابی بکر البوصیری (متوفی: ۸۴۰ھ) فرماتے ہیں: "قد اتفقوا على ضعفه"

یعنی اس کے ضعیف ہونے پر اتفاق (یعنی اجماع) ہے۔

اس روایت کے بارے میں حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

"هذا الحديث منكر جدًا وما أبعد من أن يكون موضوعًا ... إلخ"

یہ حدیث سخت منکر ہے بلکہ میرے نزدیک اس کا موضوع ہونا بعید از امکان نہیں ہے۔

(جامع المسانید ۱/۲۷ ح ۱۴۰ وشرح سنن ابن ماجہ للسندھی ۱/۵۲)

مستدرک الحاکم والی سند ضعیف ہے۔اس کے راوی فضل بن جبیر الوراق کی توثیق نامعلوم ہے۔حافظ العقیلی نے اسے کتاب الضعفاء میں ذکر کیا ہے۔ (۳/۴۴۴ ت ۱۴۹۲)

مستدرک والی روایت پر حافظ ذہبی نے شدید جرح کی ہے۔

الکامل لابن عدی (۷/۲۵۲۸) وتاریخ دمشق لابن عساکر (۴۷/۱۴۰) اور العلل المتناہیۃ لابن الجوزی (۱/۱۹۲ ح ۳۰۹) میں اس کا ایک موضوع (من گھڑت) شاہد (تائید کرنے والی روایت) بھی ہے،اس روایت میں قاضی وہب بن وہب ابوالبختری کذاب ہے اور محمد بن ابی حمید الانصاری ضعیف ہے۔

شیخ الالبانی رحمہ اللہ نے اس روایت کو "منکر جدًا" قرار دیا ہے۔

(السلسلۃ الضعیفۃ ۵/۵۰۶ ح ۲۴۸۵)

خلاصہ یہ ہے کہ یہ روایت "أول من یصافحه الحق" إلخ اپنی تمام سندوں کے ساتھ ضعیف ومردود ہے۔

تنبیہ: بزاروالا حوالہ مجھے نہیں ملا۔ واللہ اعلم [الحدیث:۱۰]

مصنف عبدالرزاق کا مفقود نسخہ اور حدیثِ نور

سوال محترم الشیخ! مصنف عبدالرزاق کے حوالے سے ایک روایت جو حنفی (اور) بریلوی حضرات پیش کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

"اے جابر اللہ نے سب سے پہلے تیرے نبی کا نور پیدا کیا......"

اس روایت کے بارے میں علمائے اہلِ حدیث کا کہنا ہے کہ یہ روایت نہ مصنف عبدالرزاق میں ہے اور نہ تفسیر عبدالرزاق میں ہے۔

ہمارے ضلع گجرات سے ایک رسالہ "اہلسنت" بریلویوں کا شائع ہوتا ہے اس رسالے میں انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ حدیث جابر ہمیں مل گئی ہے اور لکھا ہے کہ یہ نسخہ جس میں یہ روایت موجود ہے افغانستان سے دستیاب ہوا ہے کیا افغانستان والا نسخہ اصل نسخہ ہے یا یہ

حنفیوں کے ہاتھ کا کمال (اور ہاتھ کی صفائی) ہے کیونکہ حنفیوں نے اپنے مقاصد کے لئے قرآن وحدیث میں تحریف کر رکھی ہے اور اس رسالے کے سرورق پر لکھا ہوا ہے کہ

["حدیث نور" کا مخطوطہ دریافت کرلیا گیا]

ان الفاظ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس سے پہلے یہ دریافت نہیں ہوا تھا بلکہ یہ تازہ تازہ مارکیٹ میں آیا ہے۔الشیخ! آپ براہِ مہربانی اس کی تحقیق کریں اور اصل حقائق سے لوگوں کو روشناس کریں۔ (جزاکم اللہ خیراً)

میں آپ کو "اہلسنت" رسالہ بھیج رہا ہوں اس کے صفحہ ۳ پر یہ مضمون موجود ہے۔

(خرم ارشاد محمدی، دولت نگر، گجرات)

الجواب اس کا جواب ایک تحقیقی مقالے کی صورت میں پیشِ خدمت ہے:

قلمی اور مطبوعہ کتابوں سے استدلال کی شرائط

الحمدللہ رب العالمین ، والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الأمین ، أما بعد :

قرآن مجید، اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے جو اس نے اپنے بندے اور رسول: محمد ﷺ پر نازل فرمائی اور مسلمانوں کے ہاتھوں اور سینوں میں بعینہ،مِن وعَن محفوظ ہے۔

صحیح بخاری وصحیح مسلم میں رسول اللہ ﷺ کی احادیث مبارکہ من وعَن اور بعینہ محفوظ ہیں۔

ان دونوں کتابوں کی صحت پر امت مسلمہ کا اجماع ہے۔

دیکھئے علوم الحدیث لابن الصلاح (ص ۴۱، ۴۲) واختصار علوم الحدیث (ص ۱۲۴، ۱۲۸)

شاہ ولی اللہ الدہلوی الحنفی فرماتے ہیں: "صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے بارے میں تمام محدثین متفق ہیں کہ ان میں تمام کی تمام متصل اور مرفوع احادیث یقیناً صحیح ہیں۔ یہ دونوں کتابیں اپنے مصنفین تک بالتواتر پہنچی ہیں، جو ان کی عظمت نہ کرے وہ بدعتی ہے جو مسلمانوں کی راہ کے خلاف چلتا ہے" (حجۃ اللہ البالغہ، اردو: ۱/۲۴۲ مترجم: عبدالحق حقانی)

ان تینوں کتابوں کے علاوہ دنیا کی کسی کتاب سے بھی استدلال کرنے کے لئے درج ذیل شرائط کا ہونا ضروری ہے:

۱: صاحبِ کتاب ثقہ وصدوق ہو، مثلاً امام ابوداود (صاحب السنن) امام ترمذی (صاحب الجامع) امام نسائی (صاحب المجتبیٰ والکبریٰ) امام ابن ماجہ (صاحب السنن) امام مالک (صاحب المؤطا) وغیرہم ثقہ بلکہ فوق الثقہ تھے۔

اگر صاحبِ کتاب ثقہ وصدوق نہ ہو بلکہ مجروح ومجہول اور ساقط العدالت ہو تو اس کی کتاب سے استدلال باطل ہو جاتا ہے، مثلاً احمد بن مروان بن محمد الدینوری صاحب المجالسۃ و جواھر العلم (یضع الحدیث: لسان المیزان ۱/۳۰۹ وثقہ مسلمۃ ومسلمۃ مجروح) الدولابی صاحب الکنی (ضعیف) محمد بن الحسن الشیبانی صاحب المؤطا (کذاب بقول ابن معین) ابوجعفر الکلینی صاحب الکافی (رافضی غیر موثق) یہ سب ساقط العدالت تھے لہٰذا ان کی کتابوں سے استدلال مردود ہے۔

۲: کتاب کے مخطوطے کا ناسخ وکاتب: ثقہ وصدوق ہو۔

حافظ ابن الصلاح الشہرزوری فرماتے ہیں: '' وھو أن یکون ناقل النسخۃ من الأصل غیر سقیم النقل ، بل صحیح النقل ، قلیل السقط '' اور (تیسری) شرط یہ ہے کہ اصل کتاب سے نسخے کا ناقل (کاتب وناسخ) غلط نقل کرنے والا نہ ہو، بلکہ صحیح نقل کرنے اور کم غلطیاں کرنے والا ہو۔ (علم الحدیث لابن الصلاح ص ۳۰۳، نوع: ۲۵)

اس شرط سے معلوم ہوا کہ اگر کتاب کا کاتب غیر ثقہ یا مجہول ہو تو اس کتاب سے استدلال جائز نہیں ہے۔

حبیب الرحمٰن اعظمی دیوبندی کی تحقیق سے چھپی ہوئی مسند الحمیدی کے مخطوطے (مخطوطۂ دیوبندیہ، نوشتہ ۱۳۲۴ھ) اور نسخۂ سعیدیہ (نوشتہ ۱۳۱۱ھ) کے کاتبین کا ثقہ وصدوق ہونا نامعلوم ہے، ان کے نسخوں کے مطالعے سے صاف واضح ہوتا ہے کہ یہ دونوں حضرات کثیر الغلط ہیں۔ مسند حمیدی للاعظمی کے نسخے کا کوئی سا بھی صفحہ نکالیں، غلطیوں اور تصاحیف سے بھرا ہوا ہے، مثلاً: ص ۱ پر لکھا ہوا ہے کہ '' فی الأصل :یزید ، والصواب زید '' یعنی اس نسخے کی ابتدا ہی غلط ہے۔

ایک جگہ اعظمی صاحب خود لکھتے ہیں: '' في الأصل :تقوت ،وهي محرفة ''

(مسند الحمیدی ۱/۱۵ تحت ح ۲۴)

یعنی اصل میں ''تقوت'' کا لفظ محرف ہے، تحریف ہوگئی ہے۔

عرض ہے کہ ایسی محرف کتابوں سے وہی لوگ استدلال کرتے ہیں جو تحریفات و اکاذیب سے محبت رکھتے ہیں۔

۳: ناسخ مخطوطہ سے صاحب کتاب تک سند صحیح ہو، مثلاً:

ابن ابی حاتم الرازی کی کتاب ''اصول الدین'' کی سند، صاحب مخطوطہ سے لے کر ابن ابی حاتم تک صحیح ہے۔ (دیکھئے الحدیث حضرو، ج اشارہ:۲ ص ۴۱)

جبکہ شرح السنہ للبربہاری کی سند میں دو راوی مجروح ہیں:

اول: غلام خلیل کذاب ہے۔ (ماہنامہ الحدیث شمارہ:۲ ص ۲۵)

دوم: قاضی احمد بن کامل متساہل (ضعیف) ہے۔ (ایضاً ص ۲۵)

لہٰذا اس کتاب (شرح السنہ للبربہاری: مطبوع و مخطوط) سے استدلال صحیح نہیں ہے۔

۴: مخطوطہ (کتاب کے قلمی نسخے) کا محل وقوع، خط، تاریخ نسخ پہچاننا اور قدامت کی تحقیق ضروری ہے، جو نسخہ پرانا اور قلیل الغلط ہو، اسے بعد والے تمام نسخوں پر فوقیت حاصل ہے۔

۵: نسخہ پر علمائے کرام اور ائمہ دین کے سماعات ہوں، مثلاً مسند حمیدی کا مخطوطہ ظاہر یہ، نسخۂ دیوبندیہ و نسخۂ سعیدیہ سے قدیم ترین (نوشتہ ۶۸۹ھ) ہے اور اس پر جلیل القدر علماء کے سماعات بھی ہیں، اور قلیل الغلط بھی ہے لہٰذا اسے ان دونوں (دیوبندیہ و سعیدیہ) پر فوقیت حاصل ہے۔

(سماع کی جمع سماعات ہے۔ جب ایک قلمی نسخہ علماء کرام خود پڑھتے یا انھیں سنایا جاتا تو وہ اس پر لکھ دیتے تھے کہ یہ فلاں فلاں نے پڑھا یا سنا ہے، اسے سماعات کہتے ہیں۔)

۶: نسخہ علماء کے درمیان مشہور ہو۔

آج اگر کوئی شخص افغانستان، قزاقستان، گرجستان وغیرہ کے کسی کونے کھدرے سے

خودساختہ نسخہ پیش کر کے شور مچانا شروع کر دے کہ مخطوطہ مل گیا ہے تو علمی میدان میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

۷: اس کتاب کے دیگر نسخوں کو مدنظر رکھا جائے، مثلاً قاسم بن قطلوبغا (کذاب) نے مصنف ابن ابی شیبہ کے ایک (نامعلوم) نسخہ سے "تحت السرة" کے اضافے والی حدیث نقل کی ہے جبکہ مصنف ابن ابی شیبہ کے دیگر نسخوں میں یہ اضافہ قطعاً موجود نہیں ہے۔

خلیل احمد سہارنپوری دیوبندی صاحب ایک اصول سمجھاتے ہیں:

اگر ایک عبارت بعض نسخوں میں ہو اور بعض میں نہ ہو تو: "**فعلی هذا هذه العبارة مشكوك فيها**" اس طرح سے یہ عبارت مشکوک ہو جاتی ہے۔ (بذل المجہود ۴/۱۷ تحت ح:۷۴۸)

۸: اس کتاب کی عبارات وروایات کا ان کتابوں سے مقارنہ کیا جائے جن میں اس کتاب سے روایت یا نقل موجود ہے، مثلاً سنن ابی داود کی احادیث کا السنن الکبری للبیہقی میں احادیث ابی داود سے مقارنہ ومقابلہ کیا جائے۔ امام بیہقی اپنی سند کے ساتھ امام ابوداود سے روایتیں نقل کرتے ہیں۔

۹: یہ بھی شرط ہے کہ علمائے کرام اور محدثین عظام نے نسخۂ مذکورہ پر طعن وجرح نہ کی ہو۔

۱۰: صاحبِ کتاب سے اگر کتاب صحیح وثابت ہو تو پھر بھی یہ شرط ضروری ہے:

صاحبِ کتاب سے لے کر صاحبِ قول یا صاحبِ روایت تک سند صحیح یا حسن لذاتہ ہو۔

اگر ان شرائط میں سے ایک شرط بھی مفقود ہو تو اس کتاب کی روایت سے استدلال کرنا باطل ومردود ہو جاتا ہے۔

تنبیہ: محمد محب اللہ نوری بریلوی نے دعویٰ کیا ہے:

"حال ہی میں فضیلۃ الشیخ عیسیٰ مانع (سابق منسٹر اوقاف دبئ) اور اہلسنت کے نامور عالم دین اور محقق حضرت علامہ محمد عباس رضوی کی جستجو سے "مصنف عبدالرزاق" کا مخطوطہ افغانستان سے دستیاب ہوا ہے، جس میں "تخلیق نور محمدی" پر مستقل باب موجود ہے اور اس میں "حدیث جابر" کم وبیش پانچ سندوں کے ساتھ درج ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ کوئی اشاعتی

ادارہ اس مخطوطہ کی شایانِ شان اشاعت کا اہتمام کردے"

(ماہنامہ اہلسنت گجرات، اگست ۲۰۰۳ء ص ۴)

عرض ہے کہ بریلوی و دیوبندی دونوں گروہ، اہل سنت نہیں ہیں، ان کے اصول و عقائد اہل سنت سے مختلف ہیں۔

تنبیہ: بریلوی و دیوبندی حضرات حنفی بھی نہیں ہیں۔

مصنف عبد الرزاق کے اس نو دریافت شدہ مخطوطے سے استدلال اسی وقت کیا جاسکتا ہے جب اس میں درج ذیل شرائط موجود ہوں:

۱: ناسخ مخطوطہ ثقہ وصدوق ہو۔

۲: اس بات کا ثبوت ہو کہ یہ مخطوطہ واقعی اسی ناسخ نے لکھا ہے۔

۳: صاحبِ ناسخ مخطوطہ سے لے کر امام عبد الرزاق تک سند صحیح و حسن ہو۔

۴: امام عبد الرزاق سے لے کر رسول اللہ ﷺ یا صاحب قول تک سند صحیح و حسن ہو۔

۵: اس مخطوطے میں وہ تمام شرائط موجود ہوں جن کا تذکرہ، اس مضمون میں کیا گیا ہے۔

چار (۴) من گھڑت کتابیں

آخر میں دو من گھڑت، موضوع اور باطل کتابوں کا ذکر پیش خدمت ہے جو دو مشہور اماموں کی طرف منسوب کر دی گئی ہیں، حالانکہ یہ دونوں امام ان دو کتابوں سے بری ہیں۔

① الفقہ الاکبر، المنسوب الی الامام الشافعی رحمہ اللہ

امام شافعی رحمہ اللہ کی طرف "الفقہ الاکبر" کے نام سے ایک کتاب منسوب کی گئی ہے جسے "الکوکب الازھر شرح الفقہ الاکبر" کے نام سے مصطفیٰ احمد الباز نے "المکتبہ التجاریہ، مکہ مکرمہ" سعودی عرب سے شائع کیا ہے۔

اس کتاب کے موضوع و من گھڑت ہونے کے چند دلائل درج ذیل ہیں:

۱: اس کا ناسخ (کاتب) نامعلوم ہے۔

۲: ناسخ سے لے کر امام شافعی تک سند نامعلوم ہے۔

۳: مصطفیٰ الباز والے نسخے میں اس کتاب کے نسخوں کا تعارف مختصراً درج ذیل ہے:

ا۔ مطبوعہ ۱۹۰۰ء

ب۔ نسخہ محمد بن عبداللہ بن احمد الراوی (مجہول) جدید دور کا لکھا ہوا؟

ج۔ شہاب الدین بن احمد بن مصلح البصری، متوفی ۹۸۶ھ (؟) کا لکھا ہوا نسخہ؟

د۔ احمد بن الشیخ درویش الخطیب کا لکھا ہوا (جدید) نسخہ؟

ھ۔ غیر مسلم: کارل بروکلی نے اس کتاب کو امام شافعی کی طرف منسوب کیا ہے۔

معلوم ہوا کہ یہ سب نسخے بے اصل اور مردود ہیں۔

حاجی خلیفہ صاحب لکھتے ہیں: ''لكن فيه شك والظن الغالب أنه من تأليف بعض أكابر العلماء'' لیکن (امام شافعی کی طرف) اس (کی نسبت) میں شک ہے اور ظنِ غالب یہی ہے کہ یہ بعض اکابر علماء کی تصنیف ہے۔ (کشف الظنون ۲/۱۲۸۸)

یہ اکابر علماء کا بعض: مجہول ہے۔

مشہور عربی محقق ابو عبیدہ مشہور بن حسن آل سلمان لکھتے ہیں:

''الفقه الأكبر: المكذوب على الإمام محمد بن إدريس الشافعي''

الفقہ الاکبر، امام شافعی پر مکذوب (جھوٹ) ہے۔ (کتب حذر منھا العلماء ۲/۲۹۳)

شیخ صالح المقبلی نے بھی اس کتاب کے تصنیف الشافعی ہونے کا انکار کیا ہے۔

دیکھئے ''العلم الشامخ فی ایثار الحق علی الآباء والمشائخ'' (ص ۱۸۰)

۴: امام شافعی رحمہ اللہ کے شاگردوں اور متقدمین مثلاً امام بیہقی وغیرہ، نے اس کتاب کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

لطیفہ: الکوکب الازہر شرح الفقہ الاکبر، المکذوب علی الشافعی رحمہ اللہ، میں لکھا ہوا ہے کہ

''ولا يكفي إيمان المقلد''

اور (عقائد واصولِ دین میں) مقلد کا ایمان کافی نہیں ہے۔ (ص ۴۲)

(۲) الفقہ الاکبر المنسوب الی الامام ابی حنیفہ رحمہ اللہ

ملا علی قاری کی شرح کے ساتھ الفقہ الاکبر کا جو نسخہ مطبوعہ ہے اس کے شروع میں نسخے کے راوی، ناسخ اور ناسخ سے امام ابوحنیفہ تک کوئی سند موجود نہیں ہے۔ حاجی خلیفہ نے لکھا ہے کہ "روى عنه أبو مطيع البلخي" اسے (امام ابوحنیفہ سے) ابو مطیع البلخی نے روایت کیا ہے۔ (کشف الظنون ۲/۱۲۸۷)

ابو مطیع الحکم بن عبداللہ البلخی جمہور محدثین کے نزدیک مجروح ہے۔ اسے ابن معین، بخاری اور نسائی (کتاب الضعفاء والمتروکین: ۶۵۴) وغیرہم نے ضعیف قرار دیا ہے۔

ایک حدیث کے بارے میں حافظ ذہبی نے فرمایا: "فهذا وضعه أبو مطيع على حماد" اسے ابو مطیع نے حماد (بن سلمہ) پر گھڑا ہے۔ (میزان الاعتدال ۳/۴۲ ت ۵۵۲۳)

یعنی ابو مطیع وضاع (حدیثیں گھڑنے والا تھا) ابو مطیع سے نیچے، اس نسخے کی سند نامعلوم ہے۔

ایک ملا صاحب نے اس کتاب کی ایک دوسری سند فٹ کر رکھی ہے۔

(دیکھئے مجموعۃ الرسائل العشرۃ ص ۱۷)

اس سند میں بہت سے راوی مجہول، غیر معروف اور نامعلوم التوثیق ہیں، مثلاً:

نصر بن یحییٰ البلخی، علی بن احمد الفارسی، علی بن الحسین الغزالی، نصران بن نصر الختلی اور حسین بن الحسین الکاشغری وغیرہم۔

اس سند کا بنیادی راوی: ملا صاحب بذاتِ خود مجہول ہے۔

خلاصہ یہ کہ یہ سند بھی موضوع و باطل ہے۔

تنبیہ: اس موضوع رسالے "الفقہ الاکبر" میں لکھا ہوا ہے:

"فما ذكر الله تعالىٰ في القرآن من ذكر الوجه واليد والنفس فهو صفات بلا كيف ولا يقال: أن يده قدرته ونعمته لأ فيه ابطال الصفة و هو قول اهل القدر والإعتزال ولكن يده صفته بلا كيف"

پس اللہ تعالیٰ نے قرآن میں وجہ (چہرہ) ید (ہاتھ) اور نفس (جان) کا جو ذکر کیا ہے وہ اس

کی بلا کیف صفتیں ہیں اور یہ نہیں کہنا چاہئے کہ اس کا ہاتھ اس کی قدرت اور نعمت ہے کیونکہ اس (طرح کہنے) میں صفت کا ابطال ہے اور یہ قول قدریوں اور معتزلہ کا ہے، لیکن (کہنا یہ چاہئے کہ) اس (اللہ) کا ہاتھ اس کی صفت ہے بلا کیف (ص ۱۹ و مع شرح القاری ص ۳۶، ۳۷)

اس کے برخلاف خلیل احمد سہارنپوری دیوبندی نے لکھا ہے:

"مثلاً یہ کہ ممکن ہے استواء سے مراد غلبہ ہو اور ہاتھ سے مراد (قدرت) تو یہ بھی ہمارے نزدیک حق ہے" (المہند ص ۴۲ جواب سوال: ۱۳، ۱۴، بدعتی کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم ص ۱۸)

معلوم ہوا کہ اس کتاب (الفقہ الاکبر) کے مطابق دیوبندی حضرات معتزلہ کے مذہب پر ہیں۔

۳: امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی طرف منسوب کتاب "الصلوٰۃ" ان سے ثابت نہیں ہے۔

حافظ ذہبی فرماتے ہیں: "و کتاب :الرسالة في الصّلوة ، قلت :هو موضوع علي الإمـام" یعنی یہ کتاب موضوع (اور من گھڑت) طور پر امام (احمد) کی طرف منسوب کر دی گئی ہے۔ (سیر اعلام النبلاء ۱۱/ ۳۳۰)

تنبیہ: نماز نبوی کے مقدمۃ التحقیق (ص ۱۸) میں "اور امام احمد بن محمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۲۴۱) کی کتاب الصلوٰۃ وغیرہ" کے الفاظ مکتبہ دارالسلام والوں کی غلطی کی وجہ سے چھپ گئے ہیں۔ میں اس عبارت سے بری ہوں، مدیر مکتبہ دارالسلام نے اس عبارت مذکورہ کے بارے میں اپنے پیڈ پر لکھ کر دیا کہ

"تسامح کی وجہ سے چھپ گئی ہے۔ جس پر ادارہ مقدمۃ التحقیق کے مؤلف سے معذرت خواہ ہے، عبدالعظیم اسد، دارالسلام لاہور ۱۸/۸/۲۰۰۰"

اس معذرت نامہ کی اصل میرے پاس محفوظ ہے۔

[تنبیہ: جدید ایڈیشن میں "ادارہ دارالسلام" نے اس تسامح کی تصحیح کر دی ہے یعنی اس عبارت کو حذف کر دیا گیا ہے۔]

۴: امام مالک (کے مذہب) کی طرف منسوب "المدونۃ الکبریٰ" غیر مستند کتاب ہے۔

دیکھئے میری کتاب "القول المتین فی الجہر بالتأمین" (ص۷۳) وسیر اعلام النبلاء (۲۰۶/۱۴) والعبر فی خبر من غبر (۱۲۲/۲) [الحدیث:۵]

رافضیت سے متعلق چند روایات کی تحقیق

سوال مختلف علماء سے درج ذیل احادیث سنی ہیں، لیکن علماء نے ان کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ اور یہ علماء اب فوت ہو چکے ہیں۔ مہربانی فرما کر ان احادیث کی تخریج سے آگاہ کریں اور یہ بھی واضح کریں کہ یہ احادیث صحیح ہیں یا نہیں؟ احادیث درج ذیل ہیں: (مفہوم)

۱: "آخر زمانہ میں ایک قوم آئے گی جس کا نام رافضی ہوگا، میرے صحابہؓ پر وہ تبرا کریں گے، ان میں سے کوئی بیمار ہو جائے تو پوچھئے مت، مر جائے جنازہ مت پڑھئے، تمھارا مر جائے اپنے جنازے میں انھیں شریک نہ کیجئے"

۲: جب فتنے اور بدعات عام ہو جائیں اور صحابہؓ پر تبرا کیا جائے تو عالم کو چاہئے کہ اپنے علم کو ظاہر کرے"

۳: رسول پاکؐ نے حضرت عمر کو کہا: اے عمر حق بات کہہ خواہ لوگوں کے دل پر وہ بری گزرے"

۴: جس قوم میں ابوبکر صدیقؓ موجود ہوں کسی اور کیلئے جائز نہیں کہ وہ امامت کرائے۔

(عبداللہ طاہر، اسلام آباد)

الجواب رافضی اس شخص کو کہتے ہیں جو "صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مذمت اور کردار کشی کو جائز سمجھتا ہے" (القاموس الوحید ص ۶۴۸)

حافظ ذہبی (متوفی ۷۴۸ھ) فرماتے ہیں:

" ومن أبغض الشيخين واعتقد صحة إما متهما فهو رافضي مقيت ومن سبهما و اعتقد أنهما ليسا بإمامي هدى فهو من غلاة الرافضة " جو شخص شیخین (ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما) سے بغض رکھے اور انھیں خلیفۂ برحق بھی سمجھے تو یہ شخص رافضی، قابلِ نفرت ہے اور جو شخص انھیں (ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو) خلیفۂ برحق بھی نہ سمجھے اور بُرا کہے تو یہ شخص غالی

رافضیوں میں سے ہے۔ (سیر اعلام النبلاء: ۱۶/ ۴۵۸ ترجمۃ الدارقطنی رحمہ اللہ)

حافظ ابن حجر العسقلانی (متوفی ۸۵۲ھ) رحمہ اللہ فرماتے ہیں: " فمن قدمه على أبي بكر و عمر فهو غالٍ في تشيعه ويطلق عليه رافضي " جو شخص (سیدنا) علی کو (سیدنا) ابوبکر و (سیدنا) عمر پر (افضلیت میں) مقدم کر دے تو وہ شخص غالی شیعہ ہے اور اس پر رافضی کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ (ہدی الساری مقدمہ فتح الباری ص ۴۵۹)

اثنا عشری جعفری فرقہ، رافضی فرقہ ہے۔

دلیل نمبر ا: غلام حسین نجفی رافضی نے اپنی کتاب " جاگیر فدک " میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھا ہے کہ " جناب ابوبکر اور مرزا صاحب میں کوئی فرق نہیں " (ص ۵۰۹)

اس نجفی بیان میں صدیق اکبر کو مرزا غلام احمد قادیانی کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ (العیاذ باللہ)

دلیل نمبر ۲: محمد الرضی الرضوی الرافضی کہتا ہے:

" أما برائتنا من الشيخين فذاك من ضرورة ديننا ...... " إلخ

اور شیخین (ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما ناقل) سے برأت (تبرا) کرنا ہمارے دین کی ضرورت میں سے ہے۔ (کذبوا علی الشیعہ: ص ۴۹)

روافض کے بارے میں مروی شدہ مرفوع احادیث کی تحقیق درج ذیل ہے۔

ا: بشر بن عبدالله عن أنس بن مالك عن النبي ﷺ قال: وأنه سيكون في آخر الزمان قوم يبغضونهم فلا تواكلوهم ولا تشاركوهم ولا تصلوا عليهم و لا تصلوا معهم ...... وهذا خبر باطل لا أصل له "

آخری زمانے میں ایسے لوگ ہوں گے جو ان (ابوبکر و عمر و عثمان و علی رضی اللہ عنہم) سے بغض رکھیں گے، تم ان کے ساتھ نہ کھانا کھاؤ، نہ شریک کرو، نہ ان کا جنازہ پڑھو اور نہ ان کے ساتھ (مل کر) نماز پڑھو...... یہ روایت باطل ہے، اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

(کتاب المجروحین لابن حبان: ۱/ ۱۸۷)

حافظ ذہبی نے اس روایت کو سخت منکر قرار دیا۔ (میزان الاعتدال ۱/ ۳۲۱)

بشر القصیر کے بارے میں امام ابن حبان نے کہا:" منكر الحديث جدًا " یہ سخت منکر حدیثیں بیان کرنے والا ہے۔ (المجروحین:ص ۱۸۷)

۲: " أبو عقيل يحي بن المتوكل عن كثير النواء عن إبراهيم بن حسن بن حسن بن علي بن أبي طالب عن أبيه عن جده قال قال علي بن أبي طالب: قال رسول الله ﷺ : يظهر في آخر الزمان قوم يسمون الرافضة ، يرفضون الإسلام " آخری زمانے میں ایک قوم ظاہر ہوگی جس کا نام رافضی ہوگا، یہ لوگ اسلام کو چھوڑ دیں گے۔ (مسند احمد ۱/۱۰۳ ح ۸۰۸، روایۃ عبداللہ بن احمد عن غیر ابیہ)

یہ روایت بلحاظِ سند ضعیف ہے۔

ابو عقیل یحییٰ بن المتوکل ضعیف ہے۔ (تقریب التہذیب:۷۶۳۳)

کثیر بن اسماعیل النواء ضعیف ہے۔ (التقریب:۵۶۰۵)

حافظ ابن الجوزی نے فرمایا:" هذا حديث لا يصح عن رسول الله ﷺ "

یہ حدیث رسول اللہ ﷺ سے صحیح (ثابت) نہیں ہے۔ (العلل المتناہیہ ۱/۱۵۷ ح ۲۵۲)

۳: " عمران بن زيد :ثنا الحجاج بن تميم عن ميمون بن مهران عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ : يكون في آخر الزمان قوم ينبزون الرافضة ، يرفضون الإسلام ويلفظونه اقتلوهم فإنهم مشركون "

آخری زمانے میں ایک قوم ہوگی جسے رافضی کہا جائے گا یہ اسلام کو اتار پھینکیں گے، انھیں قتل کرو کیوں کہ یہ مشرک ہیں۔

(مسند عبد بن حمید: ۶۹۸، دوسرا نسخہ: ۶۹۷، والمسند الجامع ۹/۵۹۶ ح ۷۰۸۲ واللفظ لہ)

یہ روایت ضعیف ہے، عمران بن زید: لین (یعنی ضعیف) ہے۔ (التقریب:۵۱۵۶)

حجاج بن تمیم: ضعیف ہے۔ (التقریب:۱۱۲۰)

تنبیہ: ان راویوں پر محدثین کرام کی جرح تفصیلاً تہذیب الکمال، تہذیب التہذیب اور میزان الاعتدال وغیرہ میں موجود ہے۔ تقریب کا حوالہ بطورِ اختصار اور بطورِ خلاصہ واعدل

الاقوال دیا جاتا ہے۔ والحمدللہ

۴: ''عصام بن الحكم العكبرى :نا جميع بن عمير البصري: ثنا سوار الهمداني عن محمد بن جحادة عن الشعبي عن علي قال قال: رسول الله ﷺ : إنك وشيعتك فى الجنة وسيأتي قوم (لهم نبز) يقال لهم الرافضة ، فإذا لقيمتوهم فاقتلوهم فإنهم مشركون '' (اے علی!) تم اور تمھارے شیعہ، جنت میں جائیں گے اور ایک قوم آئے گی جن کا لقب رافضی ہوگا، جب تم انھیں ملو تو انھیں قتل کرو، کیونکہ یہ مشرک ہیں۔ (حلیۃ الاولیاء ۳۲۹/۴ وتاریخ بغداد مختصراً ۲۸۹/۱۲ ت ۶۷۳۱، والعلل المتناھیۃ ۱۵۸/۱، ۱۵۹ ح ۲۵۴ واللفظ لہ)

یہ روایت باطل ومردود ہے، سوار بن مصعب الہمدانی: منکر الحدیث (منکر حدیثیں بیان کرنے والا) ہے۔ (کتاب الضعفاء للامام البخاری بتحقیقی: ۱۵۸)

امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ نے فرمایا: '' وقد رأيته وليس بشئ ، كان يجيئنا إلى منزلنا '' میں نے اسے دیکھا ہے، یہ کچھ چیز نہیں ہے، یہ ہمارے ڈیرے پر آتا تھا۔

(تاریخ ابن معین، روایۃ الدوری: ۲۰۶۸)

اس پر شدید جروح کے لئے دیکھئے لسان المیزان (۱۲۸/۳، ۱۲۹ ت ۴۰۵۸)

جمیع بن عمیر البصری: ضعیف ہے۔ (التقریب: ۹۶۷)

عصام بن الحکم کی توثیق نامعلوم ہے۔

تنبیہ: جمیع بن عمیر کو جمیع بن عمر بھی کہا جاتا ہے۔

۵: ''تليد بن سليمان أبو إدريس المحاربي عن أبي الحجاف داود بن أبي عوف عن محمد بن عمرو الهاشمي عن زينب بنت علي عن فاطمة بنت رسول الله ﷺ قالت :نظر النبي ﷺ إلى علي فقال :هذا فى الجنة وإن من شيعته قوم يعطون الإسلام فليفظونه ، لهم نبز يسمون الرافضة فمن لقيهم فليقتلهم فإنهم مشركون ''

نبی ﷺ نے علی (رضی اللہ عنہ) کی طرف دیکھ کر فرمایا: یہ جنتی ہے اور اس کے شیعہ میں سے ایک قوم (ایسی) ہوگی جنھیں اسلام دیا جائے گا تو وہ اسلام کو پھینک دیں گے، ان کا (صفاتی) نام رافضی ہوگا، جو شخص انھیں پائے تو قتل کر دے کیونکہ یہ مشرک ہیں۔

(کتاب المجروحین لابن حبان: ۱/۲۰۵ واللفظ لہ، العلل المتناہیۃ: ۱/۱۵۹ ح: ۲۵۵ ومسند ابی یعلیٰ بتحقیق الشیخ الاثری ۶/۱۶۵ ح ۶۷۱۶ وتحقیق حسین سلیم اسد ۱۲/۱۱۶، ۱۱۷ ح ۶۷۴۹، ونسخہ مخطوطہ ص ۱۳۵، تاریخ دمشق لابن عساکر ۴۳/۱۳۰، موضح أوھام الجمع والتفریق للخطیب ۱/۴۳)

یہ روایت سخت ضعیف اور باطل ہے۔ تلید بن سلیمان پر جمہور محدثین نے شدید جرح کی ہے لہٰذا بعض محدثین کی توثیق مردود ہے۔

امام یحییٰ بن معین (متوفی ۲۳۳ھ) رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''تلید کذاب ، کان یشتم عثمان ، و کل من یشتم عثمان أو طلحة أو أحدًا من أصحاب النبي ﷺ ، دجال لا یکتب عنه و علیه لعنة الله و الملائکة و الناس أجمعین''

تلید کذاب ہے، عثمان (رضی اللہ عنہ) کو گالیاں دیتا تھا۔ اور ہر وہ شخص جو عثمان یا طلحہ یا نبی ﷺ کے کسی ایک صحابی (رضی اللہ عنہم اجمعین) کو گالی دے تو وہ شخص دجال ہے، اس سے (کچھ بھی) نہ لکھا جائے اور ایسے شخص پر اللہ، فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہو۔

(تاریخ ابن معین: روایۃ الدوری: ۲۶۷۰)

تنبیہ (۱): مسند ابی یعلیٰ میں قدیم زمانے سے یہ غلطی چلی آرہی ہے کہ ابو ادریس (تلید بن سلیمان) کے بجائے ابن ادریس لکھا ہوا ہے جو کہ یقیناً غلط ہے۔

حافظ الشام ابن عساکر، مسند ابی یعلیٰ کے نسخے کی غلطی پر تنبیہ فرماتے ہیں:

''کذا قال وإنما هو أبو إدریس وهو تلید بن سلیمان''

راوی نے اسی طرح کہا ہے (!) حالانکہ یہ راوی (صرف اور صرف) ابو ادریس تلید بن سلیمان ہے۔ (تاریخ دمشق ۴۳/۱۳۱)

محقق جلیل القدر مولانا ارشاد الحق اثری نے بھی اس قدیم غلطی کی نشاندہی کر کے لکھ دیا ہے

کہ ابن ادریس مصحف (تصحیف شدہ) ہے۔ (مسند ابی یعلی ۱۶۵/۶ ح ۶۷۱۶ حاشیہ)
حسین سلیم اسد نے لکھا ہے:
''إسناده صحيح إن كانت زينب سمعت من أمها وإلا فهو منقطع''
یعنی اس کی سند صحیح ہے، اگر زینب نے اپنی ماں (فاطمہ رضی اللہ عنہا) سے سنا ہے ورنہ منقطع ہے۔

(مسند ابی یعلی ۱۱۷/۱۲ ح ۶۷۵۰ حاشیہ:۴)

ابوادریس (تلید) کی سند کو ابن ادریس (عبداللہ بن ادریس رحمہ اللہ) سمجھ کر اس روایت کو صحیح قرار دینا حسین الدارانی جیسے لوگوں کا ہی کام ہے۔
تنبیہ (۲): ابوالجحاف داود بن ابی عوف کا ذکر تلید ابوادریس کے استادوں میں تو موجود ہے۔ (دیکھئے تہذیب الکمال وغیرہ)
لیکن عبداللہ بن ادریس کے استادوں میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ خلاصہ یہ کہ تلید ابوادریس کی بیان کردہ یہ روایت باطل ہے، اس کے بارے میں امام ابن الجوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''هذا لا يصح عن رسول الله ﷺ''
یہ رسول اللہ ﷺ سے صحیح (ثابت) نہیں ہے۔ (العلل المتناہیہ ۱۵۹/۱ ح ۲۵۵)
۶: ''حجاج بن تميم عن ميمون بن مهران عن ابن عباس عن النبي ﷺ قال: يا علي سيكون في أمتي قوم ينتحلون حبنا أهل البيت لهم نبز يسمون الرافضة فاقتلوهم فانهم مشركون'' اے علی (بن ابی طالب، رضی اللہ عنہ) عنقریب میری امت میں سے ایک قوم ہوگی جو ہمارے اہلِ بیت کی محبت کا دعویٰ کرے گی، ان لوگوں کا لقب رافضی ہوگا، پس انھیں قتل کرو یہ مشرک ہیں۔ (المعجم الکبیر للطبرانی ۲۴۲/۱۲ ح ۱۲۹۹۸ وحلیۃ الاولیاء ۹۵/۴، مسند ابی یعلی ۴۵۹/۴ ح ۲۵۸۶ والسنۃ لابن ابی عاصم ح ۹۸۱)
یہ روایت ضعیف ہے، حجاج بن تمیم: ضعیف ہے جیسا کہ روایت: ۳ کی تحقیق میں گزر چکا ہے۔ اس ضعیف راوی کے باوجود علامہ ہیثمی لکھتے ہیں:
''وإسناده حسن'' اور اس کی سند حسن ہے۔ (مجمع الزوائد ۲۲/۱۰)

ہیثمی کا یہ قول جمہور محدثین کے خلاف ہونے کی وجہ سے مردود ہے۔

۷: '' الفضل بن غانم :حدثنا سوار بن مصعب عن عطية العوفي عن أبي سعيد الخدري عن أم سلمة عن النبي ﷺ قال :أنت وأصحابك في الجنة ، أنت وشيعتك في الجنّة ، إلا أن ممن يحبك قومًا يضفرون الإسلام بألسنتهم ، يقرؤن القرآن لا يجاوز تراقيهم ، لهم نبز يسمون الرافضة ، فإذا لقيتهم فجاهدهم فإنهم مشركون ، قال :قلت : يا رسول الله ﷺ ما علامة ذلك فيهم ؟ قال :يتركون الجمعة والجماعة ، ويطعنون في السلف الأول ''

(اے علی) تم اور تمھارے ساتھی جنتی ہیں، تم اور تمھارے شیعہ جنتی ہیں، سوائے اس کے کہ ایک قوم تجھ سے محبت (کا دعویٰ) کرے گی، یہ اسلام کا زبانی دعویٰ کریں گے، قرآن پڑھیں گے جو ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا، ان کا لقب رافضی ہوگا، جب تم انھیں پاؤ تو ان سے جہاد کرو کیونکہ یہ مشرک ہیں۔ (سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا) میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ان کی علامت کیا ہوگی؟ آپ نے فرمایا: جمعہ اور جماعت ترک کر دیں گے اور سلف اول (یعنی صحابہ) پر طعن کریں گے۔

(تاریخ بغداد للخطیب: ۳۵۸/۱۲ ت ۶۷۹۰ الاوسط للطبرانی: ۳۱۵/۷، ۳۱۶ ح ۶۶۰۱)

یہ روایت سخت ضعیف، باطل اور مردود ہے۔

فضل بن غانم کے بارے میں امام ابن معین نے فرمایا: '' ضعيف ليس بشئ ''
یہ ضعیف ہے، کچھ چیز نہیں ہے۔ (سوالات ابن الجنید: ۱۱)

سوار بن مصعب: منکر الحدیث ہے جیسا کہ روایت: ۴ کے تحت گزر چکا ہے۔

عطیہ العوفی کو جمہور محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔

حافظ ابن حجر نے کہا: '' ضعيف الحفظ ، مشهور بالتدليس القبيح '' حافظے کی وجہ سے ضعیف ہے اور گندی تدلیس کرنے کے ساتھ مشہور ہے۔ (طبقات المدلسین بتحقیقی ۱۲۲/۴)

۸: '' أبو سعيد محمد بن أسعد التغلبي :حدثنا عبثر بن القاسم أبو زبيد

(عن حصين بن عبدالرحمٰن عن أبي عبدالرحمٰن السلمي عن علي) قال قال: رسول اللّٰه ﷺ :سيأتي بعدى قوم لهم نبز ، يقال لهم الرافضة ، فإذا لقيمتوهم فاقتلوهم فإنهم مشركون ، قلت :يارسول اللّٰه!ما العلامة فيهم ؟ قال: يقرضونك بما ليس فيك ويطعنون على أصحابي ويشتمونهم"

میرے بعد ایک قوم آئے گی جس کا لقب رافضی (رافضہ) ہوگا، جب تم انھیں پاؤ تو انھیں قتل کرو، بے شک وہ مشرک ہیں، میں (علی رضی اللہ عنہ) نے پوچھا: یا رسول اللہ ﷺ ان کی (نشانی) کیا ہے؟ فرمایا: تیرے بارے میں ایسی باتیں کہیں گے جو تجھ میں نہیں ہیں اور میرے صحابہ پر طعن و تشنیع کریں گے۔ (کتاب السنہ لابن ابی عاصم:۲/۴۷۶ ح ۹۷۹)

یہ روایت ضعیف ہے، محمد بن اسعد التغلبی: لین (یعنی ضعیف) ہے۔ (التقریب:۵۷۲۶)

۹: "بكر بن خنيس :حدثنا سوار بن مصعب عن داود بن أبي عوف عن فاطمة بنت علي عن فاطمة الكبرى عن أسماء بنت عميس عن أم سلمة عن رسول اللّٰه ﷺ قال :أبشر يا علي !أنت و أصحابك فى الجنة ، إلا إن ممن يزعم أنه يحبك قوم يرفضون الإسلام ، يلفظونه يقال لهم الرافضة (فإذا أدركتهم فجاهدهم) فإنهم مشركون ، قلت :يا رسول اللّٰه !ما العلامة فيهم ؟ قال :لا يشهدون جمعة ولا جماعة ويطعون على السف"

اے علی! تجھے خوشخبری ہو، تو اور تیرے ساتھی جنتی ہیں سوائے ان کے جو تیری محبت کے دعویدار ہیں مگر اسلام کو دور پھینکنے والے ہیں، انھیں رافضی کہا جائے گا۔ جب تو انھیں پائے تو ان سے جہاد کرنا کیونکہ وہ مشرک ہیں، میں نے کہا: یارسول اللہ! ان کی نشانی کیا ہے؟ فرمایا: وہ جمعہ کے تارک اور جماعت کے ساتھ نماز نہیں پڑھیں گے اور سلف (صالحین، صحابہ) پر طعن کریں گے۔ (کتاب السنہ:۹۸۰)

یہ سند سخت ضعیف اور مردود ہے۔ بکر بن خنیس جمہور محدثین کے نزدیک ضعیف ہے۔

(دیکھئے تسہیل الحاجۃ فی تحقیق سنن ابن ماجہ:۲۲۹، تحریر تقریب التہذیب:۷۳۹)

سوار منکر الحدیث (یعنی سخت ضعیف) ہے۔ جیسا کہ روایت: ۴ کے تحت گزر چکا ہے۔

خلاصۃ التحقیق: رافضیوں کا نام لے کر، مذمت والی کوئی روایت بھی صحیح وثابت نہیں ہے، اس مفہوم کی دیگر بے اصل، موضوع اور مردود روایات درج ذیل کتابوں میں بھی موجود ہیں۔ شرح اصول اعتقاد اہل السنہ للالکائی (۱۴۵۳/۸-۱۴۵۵) معالم التنزیل للبغوی (۲۰۸/۴ آخر سورۃ الفتح) کنز العمال (۳۲۴/۱۱ ح ۳۱۶۳۵، ۳۱۶۳۶)

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "ثنا وکیع عن شعبة عن أبي التیاح عن أبي السوار قال قال علي: لیحبني قوم حتی یدخلوا النّار في حبي ولیبغضني قوم حتی یدخلوا النّار في بغضي" علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ایک قوم (لوگوں کی جماعت) میرے ساتھ (اندھا دھند) محبت کرے گی حتی کہ وہ میری (افراط والی) محبت کی وجہ سے (جہنم کی) آگ میں داخل ہوگی اور ایک قوم میرے ساتھ بغض کرے گی حتی کہ وہ میرے بغض کی وجہ سے (جہنم کی) آگ میں داخل ہوگی۔

(کتاب فضائل الصحابہ ۵۶۵/۲ ح ۹۵۲ واسنادہ صحیح، کتاب السنہ لابن ابی عاصم ح ۹۸۳ وسندہ صحیح)

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں:

"نا وکیع عن نعیم بن حکیم عن أبي مریم قال: سمعت علیاً یقول: یهلك في رجلان، مفرط غال و مبغض قال" (سیدنا) علی (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: میرے بارے میں دو (قسم کے) آدمی ہلاک ہو جائیں گے (۱) غالی (اور محبت میں ناجائز) افراط کرنے والا، اور (۲) بغض کرنے والا حجت باز۔ (فضائل الصحابہ ۵۷۱/۲ ح ۹۶۴ واسنادہ حسن)

چونکہ ان دونوں اقوال کا تعلق غیب سے ہے لہٰذا یہ دونوں مرفوع حکماً ہیں یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی رضی اللہ عنہ کو یہ باتیں بتائی ہوں گی، لہٰذا رافضی اور غلو کرنے والے شیعہ حضرات دنیا وآخرت دونوں میں رسوا اور ہلاک ہو جائیں گے۔ واللہ من ورائهم محیط

تلخیص الجواب: سوال میں بیان کردہ روایت بے اصل اور باطل ہے۔

[۲] مسند الفردوس للدیلمی میں لکھا ہوا ہے:

"إذا ظهر البدع في أمتي (و شتم أصحابي) فليظهر العالم علمه فإن لم يفعل فعليه لعنة الله" سیدنا ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے مرفوعاً مروی ہے کہ: جب میری امت میں بدعتیں ظاہر ہو جائیں اور میرے صحابہ کو گالیاں دی جائیں تو عالم کو اپنا علم ظاہر کرنا چاہئے، اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس پر اللہ کی لعنت ہے۔ (۱/۳۹۰ ح ۱۲۷۵)

یہ روایت بے سند و بے اصل ہے لہٰذا مردود و باطل ہے، اس مفہوم کی تائید کرنے والی ایک ضعیف و مردود روایت تاریخ دمشق لابن عساکر (۶۲/۵۷) میں ہے۔ اس روایت میں محمد بن عبدالرحمٰن بن رمل الدمشقی مجہول الحال ہے، شیخ الالبانی رحمہ اللہ نے اس روایت کو منکر قرار دیا ہے۔ (السلسلۃ الضعیفۃ ۴/۱۴ ح ۱۵۰۶)

دیلمی نے اس کی ایک موضوع (من گھڑت) سند بھی بیان کر رکھی ہے۔ (ایضاً ص ۱۵)

خلاصہ: یہ روایت بے اصل و مردود ہے۔

[۳] یہ روایت بے اصل ہے، اس کی کوئی سند مجھے نہیں ملی۔

[۴] سنن ترمذی کی ایک روایت (ح ۳۶۷۳) میں آیا ہے: "لا ينبغي فيهم أبو بكر أن يؤمهم غيره" لوگوں کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ اگر ان میں ابوبکر (رضی اللہ عنہ) موجود ہوں تو کوئی دوسرا شخص ان کی امامت کرائے۔

یہ روایت ضعیف ہے، عیسیٰ بن میمون الانصاری: ضعیف ہے۔ (التقریب: ۵۳۳۵)

محدث البانی رحمہ اللہ اس روایت کے بارے میں فرماتے ہیں "ضعیف جدًا" یعنی سخت ضعیف ہے۔ (سنن الترمذی ص ۸۳۴، السلسلۃ الضعیفہ ۱۰/۳۶۵)

اس کی تائید میں دو مردود اور باطل روایتیں السلسلہ الصحیحہ (۱۰/۳۶۶ ح ۸۲۰) میں بطور رد مذکور ہیں۔ محدث ارشاد الحق اثری نے سیوطی (اللآلی ۱/۲۹۶) وغیرہ میں کہا ہے کہ یہ روایت شواہد کے لحاظ سے حسن یعنی حسن لغیرہ ہے حالانکہ یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے، اس روایت کے شواہد مردود و باطل ہیں لہٰذا یہ حسن لغیرہ کے درجے تک قطعاً نہیں پہنچتی۔

[نیز ایسی حسن لغیرہ یعنی ضعیف + ضعیف = ضعیف ہی رہتی ہے، یہ قابلِ حجت اور دلیل نہیں

بن سکتی۔] وما علینا إلا البلاغ (٦ جولائی ٢٠٠٤ء) [الحدیث:٤]

امام حسن بن علی البربہاری کی کتاب: شرح السنۃ؟

سوال کیا امام الحسن بن علی البربہاری کی "شرح السنۃ" نامی کوئی کتاب ہے؟

(محمد خلیل چوہان، جلال بلگن، گوجرانوالہ)

الجواب اس میں کوئی شک نہیں کہ امام ابو محمد الحسن بن علی بن خلف البربہاری (متوفی ٣٢٩ھ) حنابلہ کے بڑے اماموں میں سے تھے، حافظ ذہبی فرماتے ہیں:

"شيخ الحنابلة القدوة الإمام ...... الفقيه كان قوالاً بالحق داعيًا إلى الأثر ، لا يخاف في الله لومة لائم" (سیر اعلام النبلاء: ١٥/٩٠)

لیکن "شرح السنہ" کے نام سے جو کتاب مطبوع ہے وہ امام بربہاری سے ثابت نہیں ہے، یہ کتاب جس قلمی نسخے سے شائع کی گئی ہے اس کے ٹائٹل پر لکھا ہوا ہے:

"كتاب شرح السنة عن أبي عبدالله أحمد بن محمد بن غالب الباهلي غلام خليل رحمه الله ، رواية أبي بكر أحمد بن كامل بن خلف بن شجرة القاضي"

مخطوطے کے صفحۂ اُولیٰ پر اس کتاب کی سند درج ذیل ہے:

"أخبرنا الشيخ الإمام الثقة أبو الحسن عبدالحق بن عبدالخالق، قيل له: أخبركم أبو طالب عبدالقادر بن محمد بن عبدالقادر بن محمد بن يوسف بالمسجد الجامع وهو يسمع ، قيل له: أخبركم الشيخ أبو إسحاق إبراهيم ابن عمر بن أحمد البرمكي فيما أذن لكم في روايته عنه وأجازه لكم ، فاعرف بذلك وقال: نعم ، قال :أنبأ أبو الحسن محمد بن العباس بن أحمد ابن الفرات رحمه الله في كتابه ومن كتابه قريء ، قال :أخبرنا أبو بكر أحمد ابن كامل بن خلف بن شجرة القاضي قرأة عليه قال :دفع إلي أبو عبدالله أحمد ابن محمد بن غالب الباهلي هذا الكتاب وقال لي :اروعني هذا الكتاب من أوله إلى آخره، قال أبو عبدالله أحمد بن محمد بن غالب الباهلي ......"

کتاب کے آخری صفحے پر لکھا ہوا ہے: " قال أبو عبدالله غلام خليل " إلخ
معلوم ہوا کہ یہ کتاب غلام خلیل کی ہے جسے قاضی احمد بن کامل نے اس سے روایت کیا ہے۔
اب اس کتاب کے بنیادی راویوں کا تعارف درج کیا جاتا ہے تا کہ حقیقتِ حال واضح اور شبہات کا ازالہ ہو سکے:

غلام خلیل کا تعارف: امام دارقطنی نے کہا: "متروك"

(کتاب الضعفاء والمتروکین للدارقطنی:۵۸)

ابن عدی نے کہا: " أحاديثه مناكير، لا تحصى كثرة وهو بين الأمر بالضعف "

(الکامل ۱/۱۹۹)

اسماعیل بن اسحاق القاضی نے غلام خلیل کو کہا: " قليلاً قليلاً ، تكذب "

(المجروحین لابن حبان ۱/۱۵۱ وسندہ حسن)

حافظ ذہبی نے کہا: "معروف بالوضع" یعنی یہ شخص وضع حدیث کے ساتھ معروف ہے۔

(دیوان الضعفاء:۹۲)

شیخ خالد بن قاسم الردادی حنبلی سلفیوں میں بہترین اخلاق کے حامل عالم ہیں، سلفی شیوخ ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں، ان سے میری ملاقات مدینہ طیبہ میں اُن کے گھر میں ہوئی تھی۔ شیخ خالد حفظہ اللہ غلام خلیل کے بارے میں لکھتے ہیں: " إنّ غلام خليل هذا : كذاب وضاع " بے شک یہ غلام خلیل کذاب وضاع ہے۔

(مقدمہ شرح السنہ ص ۴۲)

(شیخ خالد کے شبہات کا جواب آگے آرہا ہے۔ ان شاء اللہ)

قاضی احمد بن کامل کا تعارف: قاضی صاحب کی واضح توثیق کسی محدث سے ثابت نہیں ہے جبکہ امام دارقطنی فرماتے ہیں: " كان متساهلاً ، ربما حدث من حفظه ما ليس عنده في كتابه وأهلكه العجب " وہ متساہل تھا بعض اوقات اپنے حافظے سے ایسی حدیث بیان کر دیتا جو کہ اس کی کتاب میں نہیں ہوتی تھی، اسے تکبر نے ہلاک کر دیا۔

(سوالات السہمی: ۱۷۶)

تنبیہ: بعد میں قاضی احمد بن کامل کی توثیق مل گئی لہٰذا قولِ راجح میں وہ جمہور کے نزدیک موثق ہونے کی وجہ سے صدوق حسن الحدیث راوی ہیں۔ دیکھئے ماہنامہ الحدیث حضرو: ۵۵ ص ۳۰

قاضی احمد کی توثیق ثابت ہونے کے باوجود ''شرح السنۃ للبربہاری'' غیر ثابت ہی ہے کیونکہ غلام خلیل بذاتِ خود کذاب ہے لہٰذا امام بربہاری اس کتاب سے بری ہیں۔

شیخ خالد ردادی کے شبہات کا ازالہ: شیخ خالد ردادی مدنی نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ''شرح السنہ للبربہاری'' کے مخطوطے میں تحریف وتبدیلی ہوگئی ہے۔

۱: مخطوطے میں '' عن القرن الثالث إلى القرن الرابع '' (۱۱۲) ہے جس سے ردادی صاحب تاریخی قرن (صدی) یعنی ۳۰۱ھ سے ۳۹۹ھ مراد لے رہے ہیں حالانکہ اس سے وہ قرن مراد ہے جن کا ذکر حدیث '' خير الناس قرني '' الخ میں آیا ہے۔ علامہ نووی نے فرمایا: '' والصحيح أن قرنه صلى الله عليه وسلم: الصحابة والثاني التابعون والثالث تابعوهم '' اور صحیح یہ ہے کہ آپ ﷺ کا قرن صحابہ ہے پھر تابعین ہے اور پھر تبع تابعین۔ (شرح النووی لصحیح مسلم: ۱۶/۸۵ ح ۲۵۳۳)

آخری صحابی ابوالطفیل رضی اللہ عنہ -۱۱۰ھ- میں فوت ہوئے۔ (التقریب: ۳۱۱۱)

آخری تابعی -۱۷۰ھ- میں فوت ہوئے اور آخری تبع تابعی ۲۲۰ھ میں فوت ہوئے۔

(فتح الباری ۷/۶ ح ۳۶۵۰)

اس حساب سے چوتھا قرن ۲۲۰ھ سے لے کر ۲۷۰ھ یا ۲۸۰ھ تک ہے، غلام خلیل ۲۷۵ھ میں مرا تھا لہٰذا بشرطِ صحت اس کا یہ کہنا کہ '' إلى القرن الرابع '' بالکل صحیح ہے کیونکہ قرن رابع اس نے پوری طرح پایا ہے! اور اس سے ۳۰۱ھ سے ۳۹۹ھ تک مراد لینا غلط ہے۔

۲: احمد بن کامل القاضی، غلام خلیل کے مشہور شاگردوں میں سے ہے، خطیب بغدادی لکھتے ہیں: '' روى عنه ...... وأحمد بن كامل القاضي '' یعنی غلام خلیل سے احمد بن کامل القاضی نے روایت بیان کی ہے۔ (تاریخ بغداد ۵/۷۸)

احمد بن کامل ہی نے بتایا ہے کہ غلام خلیل -۲۷۵ھ- میں فوت ہوا تھا، (تاریخ بغداد ۸۰/۵)

حافظ الذہبی نے کہا: ''غلام خلیل ...... وعنه ابن كامل'' (میزان الاعتدال ۱۴۱/۱)

امام حاکم النیسابوری نے غلام خلیل کے ذکر میں کہا ہے: ''روى عن جماعة من الثقات أحاديث موضوعة على ما ذكره لنا القاضي أبوبكر أحمد بن كامل بن خلف من زهده وورعه ونعوذ بالله من زهد يقيم صاحبه ذلك المقام''

(المدخل: ص ۱۲۱ ت ۱۸)

بربہاری کے شاگردوں میں احمد بن کامل اور احمد بن کامل کے شاگردوں میں بربہاری کا نام مجھے نہیں ملا۔

۳: بربہاری کی طرف منسوب یہ کتاب صرف غلام خلیل اور قاضی احمد بن کامل کی سند سے ہی معلوم ومعروف ہے، لہٰذا یہ ساری کتاب مشکوک ہے۔

۴: جن لوگوں نے بربہاری کے حالات لکھے ہیں اور کتاب ''شرح السنہ'' ان کی طرف منسوب کی ہے ان میں سے کسی نے بھی بربہاری کو نہیں دیکھا، بے سند اقوال کی علمی میدان میں کوئی حجت نہیں ہوتی، مثلاً قاضی ابوالحسین محمد بن ابی یعلیٰ (پیدائش ۴۵۱ھ وفات ۵۲۶ھ) نے بغیر کسی سند کے حسن بن علی بن خلف البربہاری (متوفی ۳۲۹ھ) سے نقل کیا کہ انھوں نے شرح السنہ میں یہ لکھا ہے اور یہ لکھا ہے۔ الخ (طبقات الحنابلہ ۱۸/۲-۴۶)

۵: اگر بطورِ تنزل یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ کتاب غلام خلیل کی نہیں بلکہ بربہاری کی ہی ہے، حالانکہ یہ محال اور باطل ہے تو بھی غلام خلیل کے کذاب اور وضاع ہونے کی وجہ سے شرح السنہ کا یہ نسخہ مردود اور غیر ثابت ہی ہے۔

۶: امام ابن تیمیہ، امام ذہبی، ابن عبدالهادی، ابن مفلح الحنبلی اور متاخرین نے بغیر کسی صحیح سند سے بربہاری کے جو اقوال نقل کئے ہیں ممکن ہے ان سب کا ماخذ ابن ابی یعلیٰ کی طبقات الحنابلہ ہو، اور اگر نہ بھی ہو تو ان کا ماخذ نامعلوم ہے لہٰذا ان نقول سے یہ بالکل ثابت نہیں ہوتا کہ شرح السنہ کا (غلام خلیل والا) نسخہ بربہاری کا ہی لکھا ہوا ہے۔

خلاصہ یہ کہ مطبوعہ شدہ اور طبقات الحنابلہ والی: شرح السنہ ایک مشکوک کتاب ہے جسے امام بربہاری کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے، حالانکہ امام بربہاری سے یہ کتاب ثابت نہیں ہے، جس شخص کو میری اس تحقیق سے اختلاف ہے اس پر لازم ہے کہ وہ شرح السنہ کا اصلی نسخہ پیش کر کے اس کی سند کا صحیح ہونا ثابت کرے، إذليس فليس، وما علينا إلا البلاغ

[الحدیث:۲]

عبداللہ بن سبا کون تھا؟

سوال بعض لوگ عبداللہ بن سبا یہودی کے وجود کا انکار کرتے ہیں۔ آپ سے گذارش ہے کہ اس سوال کا مفصل جواب بیان فرمائیں تا کہ اصل حقیقت واضح ہو جائے۔

(خالد بن علی گوہر دایو، ملخصاً)

الجواب عبداللہ بن سبا یہودی کا وجود ایک حقیقت ہے جس کا ثبوت صحیح بلکہ متواتر روایات سے ثابت ہے مثلاً:

① امام احمد بن زہیر بن حرب عرف ابن ابی خیثمہ فرماتے ہیں: ''حدثنا عمرو بن مرزوق قال: نا شعبة عن سلمة بن كهيل عن زيد بن وهب قال قال علي: مالي ولهذا الخبيث الأسود ۔ يعني عبدالله بن سبأ۔ وكان يقع في أبي بكر وعمر. ''سیدنا علی (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: اس کالے خبیث یعنی عبداللہ بن سبا کا میرے ساتھ کیا تعلق ہے؟ اور وہ (ابن سبا) ابوبکر اور عمر (رضی اللہ عنہما) کو برا کہتا تھا۔

(التاریخ الکبیر لابن ابی خیثمہ ص ۵۸۰ ح ۱۳۹۸، وسندہ صحیح)

② حجیہ الکندی سے روایت ہے کہ (سیدنا) علی علیہ السلام نے منبر پر فرمایا: یہ کالا ابن السوداء اللہ اور رسول پر جھوٹ بولتا ہے۔ الخ (الجزء الثالث والعشرون من حدیث ابی الطاہر محمد بن احمد بن عبداللہ بن نصر الذہلی: ۱۵۷، وسندہ حسن، تاریخ ابن ابی خیثمہ: ۱۳۹۸، تاریخ دمشق ۳۱/۶)

ابن سوداء سے مراد ابن سبا ہے۔

③ عبیداللہ بن عتبہ (بن مسعود) رحمہ اللہ نے فرمایا: ''إني لست بسبائي ولا حروري''

میں نہ تو سبائی (عبداللہ بن سبا والا یعنی شیعہ) ہوں اور نہ حروری (خارجی) ہوں۔

(مصنف ابن ابی شیبہ ج۱۱ص۲۹۹، ۳۰۰ ح ۳۱۲۲۷، دوسرا نسخہ ح ۳۱۷۶۱ وسندہ صحیح)

④ امام یزید بن زریع رحمہ اللہ (متوفی ۱۹۲ھ) نے فرمایا: "ثنا الكلبي و كان سبائيًا" ہمیں (محمد بن السائب) الکلبی نے حدیث بیان کی اور وہ سبائی (یعنی عبداللہ بن سبا کی پارٹی میں سے) تھا۔ (الکامل لابن عدی ج۶ص ۲۱۲۸ وسندہ صحیح، دوسرا نسخہ ج۷ص ۲۷۵)

⑤ محمد بن السائب الکلبی نے کہا: "أنا سبائي" میں سبائی ہوں۔

(الضعفاء للعقیلی ۴/۷۷ وسندہ صحیح، المجروحین لابن حبان ۲/۲۵۳ وسندہ صحیح)

لفظ سبائی کی تشریح میں امام ابو جعفر العقیلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"هم صنف من الرافضة أصحاب عبدالله بن سبأ"

یہ رافضیوں کی ایک قسم ہے، یہ عبداللہ بن سبا کے پیروکار ہیں۔ (الضعفاء الکبیر ۴/۷۷)

⑥ امام عامر بن شراحیل الشعبی رحمہ اللہ (متوفی ۱۰۴ھ) نے فرمایا:

"فلم أر قومًا أحمق من هذه السبئية" میں نے ان سبائیوں سے زیادہ احمق کوئی قوم نہیں دیکھی۔ (الکامل لابن عدی ۶/۲۱۲۸ وسندہ صحیح، دوسرا نسخہ ج۷ص ۲۷۵)

⑦ امام ابن شہاب الزہری رحمہ اللہ نے ایک ثقہ راوی عبداللہ بن محمد بن علی بن ابی طالب کے بارے میں فرمایا: "و كان عبدالله يتبع السبائية" اور عبداللہ سبائیوں کے پیچھے چلتے تھے۔ (التاریخ الکبیر للبخاری ۵/۱۸۷، وسندہ صحیح)

سبائیوں سے مراد رافضیوں (شیعوں) کی ایک قسم ہے۔ (تہذیب الکمال ج۱۰ص ۵۱۳)

⑧ حافظ ابن حبان رحمہ اللہ نے فرمایا:

"و كان الكلبي سبئيًا من أصحاب عبدالله بن سبا ...."

اور کلبی سبائی تھا، وہ عبداللہ بن سبا کے پیروکاروں میں سے تھا... (المجروحین ۲/۲۵۳)

⑨ ابراہیم بن یعقوب الجوزجانی نے کہا:

"ثم السبئية إذ غلت فى الكفر فزعمت أن عليًا إلٰهُهَا حتّى حرّقهم

بالنار... "پھر سبائی ہیں، جب انھوں نے کفر میں غلو کیا تو یہ دعویٰ کیا کہ علی اُن کے الٰہ (معبود) ہیں حتیٰ کہ انھوں (علی رضی اللہ عنہ) نے ان لوگوں کو جلا دیا۔ (احوال الرجال ص ۳۷)

⑩ امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ نے اعمش کے شاگرد ابو سلمان یزید نامی راوی کے بارے میں فرمایا: "وهو سبائي" اور وہ سبائی ہے۔ (تاریخ ابن معین، روایۃ الدوری: ۲۸۷۰)

ان کے علاوہ اور بھی کئی حوالے ہیں جن سے عبداللہ بن سبا یہودی کے وجود کا ثبوت ملتا ہے۔ اہلِ سنت کی اسماء الرجال کی کتابوں میں بھی ابن سبا کا تذکرہ موجود ہے۔

مثلاً دیکھئے تاریخ دمشق لابن عساکر (۳/۳۱) میزان الاعتدال (۲/۴۲۶) لسان المیزان (۳/۲۸۹، دوسرا نسخہ ۴/۲۲) وغیرہ۔

فرقوں پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں بھی عبداللہ بن سبا اور سبائیوں کا ذکر موجود ہے۔

مثلاً دیکھئے ابو الحسن الاشعری کی کتاب "مقالات الاسلامیین" (ص ۸۶)

الملل والنحل للشہرستانی (ج ۲ ص ۱۱) اور الفصل فی الملل والاھواء والنحل (۴/۱۸۰) وغیرہ.

حافظ ابن حزم اندلسی لکھتے ہیں: "وقالت السبائية أصحاب عبدالله بن سبا الحميرى اليهودى مثل ذلك في علي بن أبي طالب رضي الله عنه"

اور سبائیوں: عبداللہ بن سبا حمیری یہودی کے پیروکاروں نے علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں اسی طرح کی باتیں کہی ہیں۔ (الفصل فی الملل ۴/۱۸۰)

ابو الحسن الاشعری فرماتے ہیں: "والصنف الرابع عشر من أصناف الغالية وهم السبئية أصحاب عبدالله بن سبا يزعمون أن عليًا لم يمت وأنه يرجع إلى الدنيا قبل يوم القيامة ..." غالیوں میں سے چودھویں قسم سبائیوں کی ہے جو عبداللہ بن سبا کے پیروکار ہیں، وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ علی (رضی اللہ عنہ) فوت نہیں ہوئے اور بے شک وہ قیامت سے پہلے دنیا میں واپس آئیں گے.... (مقالات الاسلامیین ص ۸۶)

حافظ ذہبی نے عبداللہ بن سبا کے بارے میں لکھا ہے کہ "من غلاة الزنادقة ضال مضل" وہ غالی زندیقوں میں سے (اور) ضال مضل تھا۔ (میزان الاعتدال ۲/۴۲۶)

اہلِ سنت کا عبداللہ بن سبا کے وجود پر اجماع ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

شیعہ فرقے کے نزدیک بھی عبداللہ بن سبا کا وجود ثابت ہے جس کی دس (۱۰) دلیلیں پیشِ خدمت ہیں:

۱: امام ابوعبداللہ (جعفر بن محمد بن علی الصادق) رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا: ''لعن اللّٰه عبداللّٰه بن سبا انه ادعی الربوبية فی أمير المؤمنين (ع) وكان واللّٰه أمير المؤمنين (ع) عبدًا للّٰه طائعًا، الويل لمن كذب علينا، و إن قومًا يقولون فينا مالا نقوله في أنفسنا ، نبرأ إلى اللّٰه منهم ، نبرأ إلى اللّٰه منهم''

عبداللہ بن سبا پر اللہ لعنت کرے اُس نے امیر المومنین (علی علیہ السلام) کے بارے میں ربوبیت (رب ہونے) کا دعویٰ کیا، اللہ کی قسم! امیر المومنین (علیہ السلام) تو اللہ کے طاعت شعار بندے تھے، تباہی ہے اس کے لئے جو ہم پر جھوٹ بولتا ہے، بے شک ایک قوم ہمارے بارے میں ایسی باتیں کرے گی جو ہم اپنے بارے میں نہیں کرتے، ہم ان سے بری ہیں ہم ان سے بری ہیں۔ (رجال کشی ص ۱۰۷، روایت نمبر ۱۷۲)

اس روایت کی سند شیعہ اسماء الرجال کی رُو سے صحیح ہے۔ محمد بن قولویہ القمی، سعد بن عبداللہ بن ابی خلف القمی، یعقوب بن یزید، محمد بن عیسیٰ بن عبید، علی بن مہز یار، فضالہ بن ایوب الازدی اور ابان بن عثمان یہ سب راوی شیعوں کے نزدیک ثقہ ہیں۔

دیکھئے مامقانی کی تنقیح المقال (جلد اول)

۲: ہشام بن سالم سے روایت ہے کہ میں نے ابوعبداللہ (علیہ السلام) کو اپنے شاگردوں کے سامنے عبداللہ بن سبا اور امیر المومنین علی بن ابی طالب کے بارے میں اس کے دعویٰ ربوبیت کے بارے میں فرماتے ہوئے سنا: اس نے جب یہ دعویٰ کیا تو امیر المومنین (علیہ السلام) نے اس سے توبہ کرنے کا مطالبہ کیا، اس نے انکار کر دیا تو انھوں نے اُسے آگ میں جلا دیا۔ (رجال کشی ص ۱۰۷، روایت: ۱۷۱، وسندہ صحیح عند الشیعہ)

اس روایت کی سند بھی شیعہ اصول کی رو سے صحیح ہے۔

۳: اسماء الرجال میں شیعوں کے امام کشی نے لکھا ہے:

"ذكر بعض أهل العلم أن عبداللّٰه بن سبا كان يهوديًا فأسلم ووالى عليًا (ع) وكان يقول وهو على يهوديته في يوشع بن نون وصيّ موسى بالغلو، فقال في اسلامه بعد وفات رسول اللّٰه (ص) في علي (ع) مثل ذلك، وكان أول من شهر بالقول بفرض امامة عليّ وأظهر البراء ة من أعدائه وكاشف مخالفيه وأكفرهم فمن ههنا قال من خالف الشيعة: أصل التشيع والرفض مأخوذ من اليهودية"

بعض اہلِ علم نے ذکر کیا ہے کہ عبداللہ بن سبا یہودی تھا پھر اسلام لے آیا اور علی (علیہ السلام) سے والہانہ محبت کی، وہ یہودیت میں غلو کرتے ہوئے یوشع بن نون کے بارے میں کہتا تھا: وہ موسیٰ (علیہ السلام) کے وصی تھے، پھر مسلمان ہونے کے بعد وہ علی (علیہ السلام) کے بارے میں اس طرح کہنے لگا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات کے بعد آپ وصی ہیں۔

سب سے پہلے علی کی امامت کی فرضیت والا قول اُسی نے مشہور کیا اور آپ کے دشمنوں سے براءت کا اظہار کیا، آپ کے مخالفین سے کھلم کھلا دشمنی کی اور انھیں کافر کہا، اس وجہ سے جو لوگ شیعوں کے مخالف ہیں وہ کہتے ہیں: شیعوں اور رافضیوں کی اصل یہودیت میں سے ہے۔ (رجال کشی ص ۱۰۸، ۱۰۹)

۴: شیعوں کے ایک مشہور امام ابو محمد حسن بن موسیٰ النوبختی نے لکھا ہے:

"وحكى جماعة من أهل العلم من أصحاب علي عليه السلام: أن عبداللّٰه ابن سبأ كان يهوديًا فأسلم ووالى عليًا عليه السلام وكان يقول وهو على يهوديته في يوشع بن نون بعد موسى عليه السلام بهذه المقالة فقال في اسلامه بعد وفاة النبي صلى اللّٰه عليه وآله وسلم في علي عليه السلام بمثل ذلك وهو أول من شهر القول بفرض امامة علي عليه السلام وأظهر البراء ة من أعدائه وكاشف مخالفيه فمن هناك قال من خالف الشيعة: أن الرفض

ما خوذ من اليهودية "

علی علیہ السلام کے شاگردوں (اور تبعین) میں سے علماء کی ایک جماعت نے ذکر کیا ہے کہ عبداللہ بن سبا یہودی تھا پھر اسلام لے آیا اور علی علیہ السلام سے والہانہ محبت کی، وہ اپنی یہودیت میں موسیٰ علیہ السلام کے بعد یوشع بن نون کے بارے میں ایسا کلام کرتا تھا پھر اس نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد علی علیہ السلام کے بارے میں ایسی بات کہی، سب سے پہلے علی علیہ السلام کی امامت کی فرضیت کا قول اس نے مشہور کیا، اس نے آپ کے دشمنوں سے براءت کا اظہار کیا اور آپ کے مخالفین سے کھلم کھلا دشمنی کی، اس وجہ سے جو شیعہ کا مخالف ہے وہ کہتا ہے: رافضیوں کی اصل یہودیت سے نکالی گئی ہے۔ (فرق الشیعہ للنوبختی ص ۲۲)

تنبیہ: یہ نسخہ سید محمد صادق آل بحر العلوم کی تصحیح و تعلیق کے ساتھ مکتبہ مرتضویہ اور مطبعہ حیدریہ نجف (العراق) سے چھپا ہے۔

۵: شیعوں کے ایک مشہور امام مامقانی نے اسماء الرجال کی کتاب میں لکھا ہے:

"عبداللّٰه بن سبا ملعون حرقه عليٌّ" "عبداللہ بن سبا ملعون ہے، اسے علی علیہ السلام نے جلا دیا تھا۔ (تنقیح المقال ج ا ص ۱۸۹ راوی نمبر ۲۸۷)

۶: ابو جعفر محمد بن الحسن الطوسی (متوفی ۴۶۰ھ) نے لکھا ہے:

"عبداللّٰه بن سبا الذي رجع إلى الكفر وأظهر الغلو "

عبداللہ بن سبا جو کفر کی طرف لوٹ گیا اور غلو کا اظہار کیا۔ (رجال الطوسی ص ۵۱)

۷: حسن بن علی بن داود الحلی نے کہا:" عبداللّٰه بن سبا ى [جخ] رجع إلى الكفر وأظهر الغلو [كش] كان يدعي النبوة و أن عليًا عليه السلام هو اللّٰه ... "

عبداللہ بن سبا کفر کی طرف لوٹ گیا اور غلو کا اظہار کیا، وہ نبوت کا دعویٰ کرتا تھا اور یہ کہتا تھا کہ علی علیہ السلام اللہ ہیں۔ (کتاب الرجال ص ۲۵۴، الجزء الثانی)

۸ تا ۱۰: دیکھئے المقالات والفرق لسعد بن عبداللہ الاشعری القمی (ص ۲۱ بحوالہ الشیعہ والتشیع للأستاذ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ ص ۵۹)

قاموس الرجال للتستری (ج ۵ ص ۴۶۳ بحوالہ الشیعہ والتشیع)

معجم رجال الحدیث للخوئی (ج ۱۰ ص ۲۰۰ بحوالہ شیعیت تصنیف ڈاکٹر محمد البنداری، مترجم اردو ص ۵۶)

خلاصۃ التحقیق: معلوم ہوا کہ اہلِ سنت کی مستند کتابوں اور شیعہ اسماء الرجال کی رُو سے بھی عبداللہ بن سبا یہودی کا وجود حقیقت ہے جس میں کوئی شک نہیں لہٰذا بعض گمراہوں اور کذابین کا چودھویں پندرھویں صدی ہجری میں ابن سبا کے وجود کا انکار کر دینا بے دلیل اور جھوٹ ہونے کی وجہ سے مردود ہے۔ وما علینا إلا البلاغ (۱۱ جون ۲۰۰۸ء)

حسین بن منصور الحلاج

سوال میں اس خط کے ذریعے سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ یہ منصور حلاج کون تھا۔ کس صدی میں گزرا ہے، اور کس جرم کی پاداش میں اسے قتل کیا گیا تھا۔ محدثین اور علماءِ محققین منصور حلاج کے بارے میں کیا فرماتے ہیں۔ دلائل سے ثابت کریں۔

(انعام الرحمٰن، تحصیل و ضلع صوابی)

الجواب حسین بن منصور الحلاج ، جسے جاہل لوگ منصور الحلاج کے نام سے یاد کرتے ہیں، کا مختصر و جامع تعارف درج ذیل ہے:

① حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''المقتول علی الزندقة، ماروی ولله الحمد شیئاً من العلم، وكانت له بداية جيّدة وتألّه وتصوّف، ثم انسلخ من الدين ، وتعلم السحر وأراهم المخاريق، أباح العلماء دمه فقتل سنة احدى عشرة و ثلا ثمائة '' اسے زندیق ہونے کی وجہ سے قتل کیا گیا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے علم کی کوئی چیز روایت نہیں کی۔ اُس کی ابتدائی حالت (بظاہر) اچھی تھی، عبادت گزاری اور تصوف (کا اظہار کرتا تھا) پھر وہ دین (اسلام) سے نکل گیا، جادو سیکھا اور (استدراج کرتے ہوئے) خرقِ عادت چیزیں لوگوں کو دکھائیں، علماء کرام نے فتویٰ دیا کہ اس کا خون (بہانا) جائز ہے لہٰذا اُسے ۳۱۱ھ میں قتل کیا گیا۔ (میزان الاعتدال ج ۱ ص ۵۴۸)

② حافظ ابن حجر العسقلانی فرماتے ہیں:

"والناس مختلفون فيه ، وأكثرهم على أنه زنديق ضال"

لوگوں کا اس (حسین بن منصور الحلاج) کے بارے میں اختلاف ہے، اکثریت کے نزدیک وہ زندیق گمراہ (تھا) ہے۔ (لسان المیزان ج ۲ ص ۳۱۴ والتنبیہ المحققہ ۵۸۲/۲)

دورِ متاخرین میں اسماء الرجال کے ان دو جلیل القدر اماموں اور اسماء الرجال کی دو مشہور ترین کتابوں سے جمہور علماء کے نزدیک حلاج مذکور کا زندیق و گمراہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔

③ جلیل القدر امام ابو عمر محمد بن العباس بن محمد بن زکریا بن یحییٰ البغدادی (ابن حیویہ) رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "لما أخرج حسين الحلاج ليقتل مضيت في جملة النّاس، ولم أزل أزاحم حتى رأيته، فقال لأصحابه: لا يهولنم هذا، فإني عائد إليكم بعد ثلاثين يومًا، ثم قتل" جب حسین (بن منصور) حلاج کو قتل کے لئے (جیل سے) نکالا گیا تو میں بھی لوگوں کے ساتھ (اُسے دیکھنے کے لئے) گیا، میں نے لوگوں کے رش کے باوجود اُسے دیکھ لیا، وہ اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا: "تم اس سے نہ ڈرنا، میں تیس (۳۰) دنوں کے بعد تمھارے پاس دوبارہ (زندہ ہوکر) آجاؤں گا" پھر وہ قتل کر دیا گیا۔

(تاریخ بغداد ج ۸ ص ۱۳۱ ت ۴۴۳۲ وسندہ صحیح، المنتظم لابن الجوزی ۲۰۶/۱۳ وقال: "وهذا الإسناد صحيح لاشك فيه" لسان المیزان ۳۱۵/۲ وقال: "وإسناد ها صحيح")

اس صحیح سند سے معلوم ہوا کہ حسین بن منصور حلاج جھوٹا شخص تھا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وعند جماهير المشائخ الصوفية وأهل العلم أن الحلاج لم يكن من المشائخ الصالحين ، بل كان زنديقًا"

جمہور مشائخِ تصوف اور اہلِ علم (علمائے حق) کے نزدیک حلاج نیک لوگوں میں سے نہیں تھا بلکہ زندیق (بہت بڑا ملحد و گمراہ) تھا۔ (مجموع فتاویٰ ج ۸ ص ۳۱۸)

شیخ الاسلام نے فرمایا: "الحمد لله رب العالمين، الحلاج قتل على الزندقة" اللہ رب العالمین کا شکر ہے، حلاج کو زندیق ہونے کی وجہ سے قتل کیا گیا تھا۔

(مجموع فتاویٰ ۱۰۸/۳۵)

شیخ الاسلام نے مزید فرمایا: ''وكذلك من لم يجوز قتل مثله فهو مارق من دين الإسلام'' اور اسی طرح جو شخص حلاج کے قتل کو جائز نہیں سمجھتا تو وہ (شخص) دین اسلام سے خارج ہے۔ (مجموع فتاویٰ ج ۲ ص ۴۸۶)

۴ حافظ ابن الجوزی نے اس (حسین بن منصور) کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے ''القاطع المحال اللجاج القاطع بمحال الحلاج'' (المنتظم ۱۳/۲۰۴)

ابن جوزی فرماتے ہیں: ''أنه كان مُمَخْرِقًا'' بے شک وہ جھوٹا باطل پرست تھا۔

(ایضاً ۱۳/۲۰۶)

ان شدید جرحوں کے مقابلے میں حلاج مذکور کی تعریف وتوثیق ثابت نہیں ہے۔

ظفر احمد عثمانی تھانوی دیوبندی صاحب نے اشرف علی تھانوی دیوبندی صاحب کی زیرِ نگرانی ایک کتاب لکھی ہے ''القول المنصور فی ابن منصور، سیرت منصور حلاج'' یہ کتاب مکتبہ دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴ سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں تھانوی صاحب نے موضوع، بے اصل اور مردود روایات جمع کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ (دیوبندیوں کے نزدیک) حسین بن منصور حلاج اچھا آدمی تھا۔ (!)

مثال نمبر ۱: تھانوی صاحب نے لکھا ہے: ''لوگوں کے اسرار بیان کر دیتے، ان کے دلوں کی باتیں بتلا دیتے (یعنی کشف ضمائر بھی حاصل تھا) اسی وجہ سے ان کو حلاج الاسرار کہنے لگے، پھر حلاج لقب پڑ گیا'' (سیرت منصور حلاج ص ۳۱)

تبصرہ: اس قول کی بنیاد تاریخ بغداد کی ایک روایت ہے جسے احمد بن الحسین بن منصور نے تستر میں بیان کیا تھا (ج ۸ ص ۱۱۳) احمد بن الحسین بن منصور کے حالات معلوم نہیں ہیں لہٰذا یہ شخص مجہول ہے۔

مثال نمبر ۲: تھانوی صاحب نے لکھا ہے: ''حسین بن منصور نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے لئے حدوث کو لازم کر دیا ہے....'' (سیرت منصور حلاج ص ۴۷ بحوالہ رسالہ قشیریہ)

عبدالکریم بن ہوازن القشیری کے الرسالۃ القشیریۃ میں یہ عبارت بحوالہ ابوعبدالرحمٰن

(محمد بن الحسین) السلمی النیسابوری لکھی ہوئی ہے۔ (ص ۱۴۳ مطبوعہ دار الکتب العلمیۃ بیروت لبنان)

ابوعبدالرحمٰن السلمی اگرچہ اپنے عام شہر والوں اور اپنے مریدوں کے نزدیک جلیل القدر تھا مگر اسی شہر کے محدث محمد بن یوسف القطان النیسابوری (وكان صدوقاً، له معرفة بالحديث وقد درس شيئاً من فقه الشافعي، وله مذهب مستقيم وطريقة جميلة / تاریخ بغداد ۳/ ۴۱۱) فرماتے ہیں: ''كان أبو عبدالرحمٰن السلمي غير ثقة...... وكان يضع للصوفية الأحاديث'' ابوعبدالرحمٰن السلمی غیر ثقہ تھا......اور وہ صوفیوں کے لئے احادیث گھڑتا تھا۔ (تاریخ بغداد ج ۲ ص ۲۴۸ وسندہ صحیح)

اس شدید جرح کے مقابلے میں سلمی مذکور کی تعدیل بطریقۂ محدثین ثابت نہیں ہے۔

سلمی کے استاد محمد بن محمد بن غالب اور اس کے استاد ابونصر احمد بن سعید الاسفنجانی کی توثیق بھی مطلوب ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس موضوع سند کو تھانوی صاحب نے فخریہ پیش کیا ہے۔

تنبیہ بلیغ: عبدالکریم بن ہوازن نے رسالہ قشیریہ میں حسین الحلاج کو بطورِ ولی ذکر نہیں کیا۔ رسالہ قشیریہ اس کے ترجمہ سے خالی ہے۔ کسی دوسرے شخص کے حالات میں ذیلی طور پر اگر ایک موضوع روایت میں اُس کا نام آگیا ہے تو اس پر خوشی نہیں منانی چاہئے۔

خلاصۃ التحقیق: حسین بن منصور الحلاج اولیاء اللہ میں سے نہیں تھا بلکہ وہ ایک گمراہ و زندیق صوفی تھا جسے جلیل القدر فقہاء اسلام کے متفقہ فتوے کی بنیاد پر چوتھی صدی ہجری کے شروع میں قتل کر دیا گیا تھا۔ اس کی کرامتوں کے بارے میں سارے قصے موضوع و بے اصل ہیں۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ولا أرى يتعصب للحلاج إلا من قال بقوله الّذي ذكر أنه عين الجمع فهذا هو قول أهل الوحدة المطلقة ولهذا ترى ابن عربي صاحب الفصوص يعظمه ويقع في الجنيد والله الموفق''

میری رائے میں حلاج کی حمایت ان لوگوں کے سوا کوئی نہیں کرتا جو اس کی اس بات کے قائل ہیں جس کو وہ عین جمع کہتے ہیں اور یہی اہل وحدت مطلقہ کا قول ہے اس لئے تم ابن

عربی صاحب فصوص کو دیکھو گے کہ وہ حلاج کی تو تعظیم کرتے ہیں اور جنید کی تحقیر کرتے ہیں۔

(لسان المیزان ج ۲ ص ۳۱۵، وسیرت منصور حلاج ص ۴۵ حاشیہ)

اہلِ وحدت مطلقہ سے مراد وہ صوفی حضرات ہیں جو وحدت الوجود اور حلولیت کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ تعالی اللّٰہ عمّا یقولون علوًّا کبیرًا

اس قول کا رد ظفر احمد تھانوی صاحب نے رسالہ قشیریہ کی موضوع روایت سے کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ رد تحقیقی میدان میں بذاتِ خود مردود ہے۔ تھانوی صاحب نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ ''ابن منصور اور جنید کا عقیدہ توحید ایک ہی تھا'' [ص ۴۶] مگر انھوں نے اس دعویٰ پر کوئی صحیح دلیل پیش نہیں کی۔ علمی میدان میں عبدالوہاب الشعرانی، خرافی صوفی بدعتی کے بے سند حوالوں سے کام نہیں چلتا بلکہ صحیح و ثابت سندوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

''الحدیث'' حضرو کا یہ امتیاز ہے کہ ''الحدیث'' میں صرف صحیح و ثابت حوالہ ہی بطورِ استدلال لکھا جاتا ہے۔ اسماء الرجال کے حوالے بھی اصل کتابوں سے صحیح و ثابت سندوں کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں۔ ضعیف روایات اور ضعیف حوالوں کی ہمیں ضرورت ہی نہیں ہے۔ والحمد للّٰہ علٰی ذلك .

رسول اللہ ﷺ کی احادیث ہوں یا سلف صالحین کے آثار و اسماء الرجال کے حوالے، سب کے لئے صحیح و حسن لذاتہ اسانید کی ضرورت ہے۔

شیخ الاسلام عبداللہ بن المبارک المروزی رحمہ اللہ (متوفی ۱۸۱ھ) فرماتے ہیں:

'' الإسناد من الدّین ، ولو لا الإسناد لقال من شاء ما شاء ''سند دین میں سے ہے، اگر سند نہ ہوتی تو جو شخص جو چاہتا کہہ دیتا۔ (مقدمہ صحیح مسلم ترقیم دارالسلام: ۳۲ وسندہ صحیح)

وما علینا إلا البلاغ (۱۴/ شوال ۱۴۲۶ھ) [الحدیث: ۲۱]

نبی ﷺ کا جسم اطہر اور قبر

سوال کیا نبی ﷺ کا جسم مبارک قبر میں اور روح جنت میں اوپر مقام الوسیلہ میں ہے؟ (صحیح بخاری جلد اول ص ۱۸۵، مطبوعہ دہلی) (ایک سائل)

الجواب یہ بات صحیح ہے کہ رسول اللہ ﷺ فداہ ابی وامی وروحی کا جسم اطہر مبارک مدینے والی قبر میں اور روح مبارک جنت میں ہے جیسا کہ آپ کی ذکر کردہ حدیث، حدیث بخاری سے واضح ہے۔ [شہادت، فروری ۲۰۰۴ء]

قبر میں نبی ﷺ کی حیات کا مسئلہ

سوال اس میں کوئی شک نہیں کہ نبی کریم ﷺ اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آپ ﷺ کی یہ زندگی اُخروی و برزخی زندگی ہے یا دنیاوی زندگی ہے؟ ادلۂ اربعہ سے جواب دیں، جزاکم اللہ خیراً (ایک سائل)

الجواب ۱: اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ نبی کریم ﷺ دنیا کی زندگی گزار کر فوت ہو گئے ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ﴾

بے شک تم وفات پانے والے ہو اور یہ لوگ بھی مرنے والے ہیں۔ (الزمر: ۳۰)

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"أَلَا مَنْ كَانَ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَإِنَّ مُحَمَّدًا ﷺ قَدْ مَاتَ" إلخ

سن لو! جو شخص محمد (ﷺ) کی عبادت کرتا تھا تو بے شک محمد ﷺ فوت ہو گئے ہیں۔

(صحیح البخاری: ۳۶۶۸)

اس موقع پر سیدنا ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ نے ﴿ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ﴾ إلخ [آل عمران: ۱۴۴] والی آیت تلاوت فرمائی تھی۔ ان سے یہ آیت سن کر (تمام) صحابہ کرام نے یہ آیت پڑھنی شروع کر دی۔ (البخاری: ۱۲۴۱، ۱۲۴۲)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اسے تسلیم کر لیا۔ دیکھئے صحیح البخاری (۴۴۵۴)

معلوم ہوا کہ اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا اجماع ہے کہ نبی ﷺ فوت ہو گئے ہیں۔

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

"مَاتَ النَّبِيُّ ﷺ" إلخ نبی ﷺ فوت ہو گئے ہیں۔ (صحیح البخاری: ۴۴۴۶)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَا مِنْ نَبِيٍّ يَمْرَضُ إِلَّا خُيِّرَ بَيْنَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ))

جو نبی بھی بیمار ہوتا ہے تو اسے دنیا اور آخرت کے درمیان اختیار دیا جاتا ہے۔

(صحیح البخاری ۴۵۸٦، صحیح مسلم: ۲۴۴۴)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے بدلے میں آخرت کو اختیار کر لیا یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کی زندگی اُخروی زندگی ہے جسے بعض علماء برزخی زندگی بھی کہتے ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

"كُنْتُ أَسْمَعُ أَنَّهُ لَا يَمُوْتُ نَبِيٌّ حَتَّى يُخَيَّرَ بَيْنَ الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ"

میں (آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے) سنتی تھی کہ کوئی نبی وفات نہیں پاتا یہاں تک کہ اسے دنیا اور آخرت کے درمیان اختیار دے دیا جاتا ہے۔ (البخاری: ۴۴۳۵ و مسلم: ۲۴۴۴)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ہی فرماتی ہیں:

" فَجَمَعَ اللّٰهُ بَيْنَ رِيْقِيْ وَرِيْقِهِ فِيْ آخِرِ يَوْمٍ مِنَ الدُّنْيَا وَأَوَّلِ يَوْمٍ مِنَ الآخِرَةِ " پس اللہ تعالیٰ نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دنیا کے آخری دن اور آخرت کے پہلے دن میرے اور آپ کے لعابِ دہن کو (مسواک کے ذریعے سے) اکٹھا کر دیا۔

(صحیح البخاری: ۴۴۵۱)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک دوسری روایت میں ہے:

" لَقَدْ مَاتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم " إلخ یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے ہیں۔

(صحیح مسلم: ۲۹۷۴/۲۹ و ترقیم دار السلام: ۷۴۵۳)

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے دلائل ہیں۔ ان صحیح و متواتر دلائل سے معلوم ہوا کہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فداہ ابی وامی وروحی، فوت ہو گئے ہیں۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اپنی نماز کے بارے میں فرماتے تھے:

"إِنْ كَانَتْ هٰذِهِ لَصَلَاتُهُ حَتَّى فَارَقَ الدُّنْيَا" آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی یہی نماز تھی

حتیٰ کہ آپ (ﷺ) دنیا سے چلے گئے۔ (صحیح البخاری:۸۰۳)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کے بارے میں فرمایا:
''حَتّٰى فَارَقَ الدُّنْيَا'' حتی کہ آپ (ﷺ) دنیا سے چلے گئے۔

(صحیح مسلم:۲۹۷۶/۳۳ ودار السلام:۷۴۵۸)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی فرماتے ہیں:

'' خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مِنَ الدُّنْيَا '' إلخ

رسول اللہ ﷺ دنیا سے چلے گئے۔ (صحیح البخاری:۵۴۱۴)

ان ادلۂ قطعیہ کے مقابلے میں فرقۂ دیوبندیہ کے بانی محمد قاسم نانوتوی (متوفی ۱۲۹۷ھ) لکھتے ہیں:

''ارواح انبیاء کرام علیہم السلام کا اخراج نہیں ہوتا فقط مثلِ نور چراغ اطراف و جوانب سے قبض کر لیتے ہیں یعنی سمیٹ لیتے ہیں اور سوا اُن کے اوروں کی ارواح کو خارج کر دیتے ہیں......'' (جمال قاسمی ص۱۵)

تنبیہ: میر محمد کتب خانہ باغ کراچی کے مطبوعہ رسالے ''جمال قاسمی'' میں غلطی سے ''ارواح'' کے بجائے ''ازواج'' چھپ گیا ہے۔ اس غلطی کی اصلاح کے لئے دیکھئے سرفراز خان صفدر دیوبندی کی کتاب ''تسکین الصدور'' (ص ۲۱۶) محمد حسین نیلوی مماتی دیوبندی کی کتاب ''ندائے حق'' (ج اص ۵۷۲ وص ۶۳۵)

نانوتوی صاحب مزید لکھتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات دنیوی علی الاتصال ابتک برابر مستمر ہے اسمیں انقطاع یا تبدل وتغیر جیسے حیات دنیوی کا حیات برزخی ہو جانا واقع نہیں ہوا''

(آبِ حیات ص ۲۷)

''انبیاء بدستور زندہ ہیں'' (آبِ حیات ص ۳۶)

نانوتوی صاحب کے اس خود ساختہ نظریے کے بارے میں نیلوی دیوبندی صاحب لکھتے

ہیں:

”لیکن حضرت نانوتوی کا یہ نظریہ صریح خلاف ہے اس حدیث کے جو امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں نقل فرمایا ہے.....“ (ندائے حق جلد اول ص ۶۳۶)

نیلوی صاحب مزید لکھتے ہیں:

”مگر انبیاء کرام علیہم السلام کے حق میں مولانا نانوتوی قرآن وحدیث کی نصوص و اشارات کے خلاف جمال قاسمی ص ۱۵ میں فرماتے ہیں:

ارواح انبیاء کرام علیہم السلام کا اخراج نہیں ہوتا“ (ندائے حق جلد اول ص ۷۲۱)

لطیفہ: نانوتوی صاحب کی عباراتِ مذکورہ پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد عباس رضوی بریلوی لکھتا ہے:

”اور اس کے برعکس امام اہلِ سنت مجدد دین وملت مولانا الشاہ احمد رضا خان صاحب وفات (آنی) ماننے کے باوجود قابلِ گردن زنی ہیں“

(واللہ آپ زندہ ہیں ص ۱۲۴)

یعنی بقولِ رضوی بریلوی، احمد رضا خان بریلوی کا وفات النبی ﷺ کے بارے میں وہ عقیدہ نہیں جو محمد قاسم نانوتوی کا ہے۔!

۲: اس میں کوئی شک نہیں کہ وفات کے بعد، نبی کریم ﷺ جنت میں زندہ ہیں۔ سیدنا سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ حدیث میں آیا ہے کہ فرشتوں (جبریل و میکائیل علیہما السلام) نے نبی کریم ﷺ سے فرمایا:

((إِنَّهُ بَقِيَ لَكَ عُمُرٌ لَمْ تَسْتَكْمِلْهُ ، فَلَوِ اسْتَكْمَلْتَ أَتَيْتَ مَنْزِلَكَ))

بے شک آپ کی عمر باقی ہے جسے آپ نے (ابھی تک) پورا نہیں کیا۔ جب آپ یہ عمر پوری کرلیں گے تو اپنے (جنتی) محل میں آ جائیں گے۔ (صحیح البخاری ۱/۱۸۵ ح ۱۳۸۶)

معلوم ہوا کہ آپ ﷺ دنیا کی عمر گزار کر جنت میں اپنے محل میں پہنچ گئے ہیں۔

شہداء کرام کے بارے میں پیارے رسول ﷺ فرماتے ہیں:

((أَرْوَاحُهُمْ فِيْ جَوْفِ طَيْرٍ خُضْرٍ، لَهَا قَنَادِيلُ مُعَلَّقَةٌ بِالْعَرْشِ، تَسْرَحُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ شَاءَتْ، ثُمَّ تَأْوِيْ إِلٰى تِلْكَ الْقَنَادِيلِ))

ان کی روحیں سبز پرندوں کے پیٹ میں ہوتی ہیں، ان کے لئے عرش کے نیچے قندیلیں لٹکی ہوئی ہیں۔ وہ (روحیں) جنت میں جہاں چاہتی ہیں سیر کرتی ہیں پھر واپس ان قندیلوں میں پہنچ جاتی ہیں۔ (صحیح مسلم:۱۲۱/۱۸۸۷ او دارالسلام:۴۸۸۵)

جب شہداء کرام کی روحیں جنت میں ہیں تو انبیاء کرام اُن سے بدرجہا اعلیٰ جنت کے اعلیٰ و افضل ترین مقامات و محلات میں ہیں۔ شہداء کی یہ حیات جنتی، اُخروی و برزخی ہے، اسی طرح انبیاء کرام کی یہ حیات جنتی، اُخروی و برزخی ہے۔

حافظ ذہبی (متوفی ۷۴۸ھ) لکھتے ہیں:

" وَهُوَ حَيٌّ فِيْ لَحْدِهِ حَيَاةٌ مِثْلُهُ فِي الْبَرْزَخِ "

اور آپ (ﷺ) اپنی قبر میں برزخی طور پر زندہ ہیں۔ (سیر اعلام النبلاء ۱۶۱/۹)

پھر وہ یہ فلسفہ لکھتے ہیں کہ یہ زندگی نہ تو ہر لحاظ سے دنیاوی ہے اور نہ ہر لحاظ سے جنتی ہے بلکہ اصحابِ کہف کی زندگی سے مشابہ ہے۔ (ایضاً ص ۱۶۱)

حالانکہ اصحابِ کہف دنیاوی زندہ تھے جبکہ نبی کریم ﷺ پر بہ اعتراف حافظ ذہبی وفات آچکی ہے لہٰذا صحیح یہی ہے کہ آپ ﷺ کی زندگی ہر لحاظ سے جنتی زندگی ہے۔ یاد رہے کہ حافظ ذہبی بصراحتِ خود آپ ﷺ کے لئے دنیاوی زندگی کے عقیدے کے مخالف ہیں۔

حافظ ابن حجر العسقلانی لکھتے ہیں: " لِأَنَّهُ بَعْدَ مَوْتِهِ وَإِنْ كَانَ حَيًّا فَهِيَ حَيَاةٌ أُخْرَوِيَّةٌ لَا تُشْبِهُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا، وَاللّٰهُ أَعْلَمُ " بے شک آپ (ﷺ) اپنی وفات کے بعد اگرچہ زندہ ہیں لیکن یہ اخروی زندگی ہے جو دنیاوی زندگی کے مشابہ نہیں ہے۔ واللہ اعلم

(فتح الباری ج ۷ ص ۳۴۹ تحت ح ۴۰۴۲)

معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ زندہ ہیں لیکن آپ کی زندگی اُخروی و برزخی ہے، دنیاوی نہیں ہے۔

اس کے برعکس علمائے دیوبند کا یہ عقیدہ ہے:

"وحیوته ﷺ دنیویة من غیر تکلیف وهی مختصة به ﷺ وبجمیع الأنبیاء صلوات اللہ علیهم والشهداء –لابرزخیة......"

"ہمارے نزدیک اور ہمارے مشائخ کے نزدیک حضرت ﷺ اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں اور آپ کی حیات دنیا کی سی ہے بلا مکلف ہونے کے اور یہ حیات مخصوص ہے آنحضرت اور تمام انبیاء علیہم السلام اور شہداء کے ساتھ برزخی نہیں ہے جو تمام مسلمانوں بلکہ سب آدمیوں کو......" (المہند علی المفند فی عقائد دیوبند ص ۲۲۱ پانچواں سوال: جواب)

محمد قاسم نانوتوی صاحب لکھتے ہیں: "رسول اللہ ﷺ کی حیات دنیوی علی الاتصال ابتک برابر مستمر ہے اسمیں انقطاع یا تبدل وتغیر جیسے حیات دنیوی کا حیات برزخی ہوجانا واقع نہیں ہوا" (آب حیات ص ۲۷)

دیوبندیوں کا یہ عقیدہ سابقہ نصوص کے مخالف ہونے کی وجہ سے مردود ہے۔

سعودی عرب کے جلیل القدر شیخ صالح الفوزان لکھتے ہیں:

" اَلَّذِيْ یَقُوْلُ: اِنَّ حَیَاتَهُ فِی الْبَرْزَخِ مِثْلُ حَیَاتِهِ فِی الدُّنْیَا کَاذِبٌ وَهٰذِهِ مَقَالَةُ الْخَرَافِیِّیْنَ" جو شخص یہ کہتا ہے کہ آپ (ﷺ) کی برزخی زندگی دنیا کی طرح ہے وہ شخص جھوٹا ہے۔ یہ من گھڑت باتیں کرنے والوں کا کلام ہے۔ (التعلیق المختصر علی القصیدۃ النونیہ، ج ۲ ص ۶۸۴)

حافظ ابن قیم نے بھی ایسے لوگوں کی تردید کی ہے جو برزخی حیات کے بجائے دنیاوی حیات کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ (النونیہ فصل فی الکلام فی حیاۃ الانبیاء فی قبورھم ۲/۱۵۴، ۱۵۵)

امام بیہقی رحمہ اللہ (برزخی) ردِارواح کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں:

" فَهُمْ أَحْیَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ کَالشُّهَدَاءِ " پس وہ (انبیاء علیہم السلام) اپنے رب کے پاس، شہداء کی طرح زندہ ہیں۔ (رسالہ: حیات الانبیاء للبیہقی ص ۲۰)

یہ عام صحیح العقیدہ آدمی کو بھی معلوم ہے کہ شہداء کی زندگی اُخروی و برزخی ہے، دنیاوی نہیں ہے۔ عقیدہ حیات النبی ﷺ پر حیاتی ومماتی دیوبندیوں کی طرف سے بہت سی

کتابیں لکھی گئی ہیں مثلاً مقامِ حیات، آبِ حیات، حیاتِ انبیاء کرام، ندائے حق اور اقامۃ البرھان علی ابطال وساوس ھدایۃ الحیران وغیرہ

اس سلسلے میں بہترین کتاب مشہور اہلِ حدیث عالم مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ کی ''مسئلہ حیاۃ النبی ﷺ'' ہے۔

۴: بعض لوگ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ، اپنی قبر مبارک پر لوگوں کا پڑھا ہوا درود بنفسِ نفیس سنتے ہیں اور بطورِ دلیل ''مَنْ صَلَّى عَلَيَّ عِنْدَ قَبْرِيْ سَمِعْتُهُ'' والی روایت پیش کرتے ہیں۔ عرض ہے کہ یہ روایت ضعیف ومردود ہے۔ اس کی دو سندیں بیان کی جاتی ہیں:

اول: محمد بن مروان السدي عن الأعمش عن أبي صالح عن أبي هريرة ......إلخ (الضعفاء للعقیلی ۴/۱۳۶، ۱۳۷ وقال: لا اصل لہ من حدیث اعمش ولیس بمحفوظ الخ وتاریخ بغداد ۳/۲۹۲ ت ۱۳۷۷ وکتاب الموضوعات لابن الجوزی ۱/۳۰۳ وقال: ھذا حدیث لا یصح الخ)

اس کا راوی محمد بن مروان السدی: متروک الحدیث (یعنی سخت مجروح) ہے۔

(کتاب الضعفاء للنسائی: ۵۳۸)

اس پر شدید جروح کے لئے دیکھئے امام بخاری کی کتاب الضعفاء (۳۵۰، مع تحقیقی: تحفۃ الاقویاء ص ۱۰۲) ودیگر کتب اسماء الرجال

حافظ ابن القیم نے اس روایت کی ایک اور سند بھی دریافت کر لی ہے۔

''عبدالرحمن بن أحمد الأعرج: حدثنا الحسن بن الصباح: حدثنا أبو معاوية: حدثنا الأعمش عن أبي صالح عن أبي هريرة'' إلخ

(جلاء الافہام ص ۵۴ بحوالہ کتاب الصلوۃ علی النبی ﷺ لابی الشیخ الاصبہانی)

اس کا راوی عبدالرحمٰن بن احمد الاعرج غیر موثق (یعنی مجہول الحال) ہے۔ سلیمان بن مہران الاعمش مدلس ہیں۔ (طبقات المدلسین: ۲/۵۵ والتلخیص الحبیر ۳/۴۸ ح ۱۱۸۱ وصحیح ابن حبان، الاحسان طبعہ جدیدہ ۱/۱۶۱ وعام کتب اسماء الرجال)

اگر کوئی کہے کہ حافظ ذہبی نے یہ لکھا ہے کہ اعمش کی ابو صالح سے معنعن روایت سماع

پر محمول ہے۔ (دیکھئے میزان الاعتدال ۲/۲۲۴)

تو عرض ہے کہ یہ قول صحیح نہیں ہے۔ امام احمد نے اعمش کی ابو صالح سے (معنعن) روایت پر جرح کی ہے۔ دیکھئے سنن الترمذی (۲۰۷ بتحقیقی)

اس مسئلے میں ہمارے شیخ ابو القاسم محب اللہ شاہ الراشدی رحمہ اللہ کو بھی وہم ہوا تھا۔ صحیح یہی ہے کہ اعمش طبقۂ ثالثہ کے مدلس ہیں اور غیر صحیحین میں اُن کی معنعن روایات، عدمِ تصریح وعدمِ متابعت کی صورت میں ضعیف ہیں لہٰذا ابو الشیخ والی یہ سند بھی ضعیف و مردود ہے۔

یہ روایت " مَنْ صَلّٰی عَلَيَّ عِنْدَ قَبْرِيْ سَمِعْتُهُ " اس صحیح حدیث کے بھی خلاف ہے جس میں آیا ہے: ((إِنَّ لِلّٰهِ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةً سَيَّاحِيْنَ يُبَلِّغُوْنِيْ مِنْ أُمَّتِي السَّلَامُ)) بے شک زمین میں اللہ کے فرشتے سیر کرتے رہتے ہیں، وہ مجھے میری اُمت کی طرف سے سلام پہنچاتے ہیں۔ (کتاب فضل الصلوۃ علی النبی ﷺ للامام اسماعیل بن اسحاق القاضی: ۲۱ وسندہ صحیح، والنسائی ۳/۴۳ ح ۱۲۸۳، الثوری صرح بالسماع)

اس حدیث کو ابن حبان (موارد: ۲۳۹۲) وابن القیم (جلاء الافہام ص ۶۰) وغیرہما نے صحیح قرار دیا ہے۔

خلاصۃ التحقیق: اس ساری تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ فوت ہو گئے ہیں، وفات کے بعد آپ جنت میں زندہ ہیں۔ آپ کی یہ زندگی اُخروی ہے جسے برزخی زندگی بھی کہا جاتا ہے۔ یہ زندگی دنیاوی زندگی نہیں ہے۔ (۲۱/ ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ)

[الحدیث: ۱۵]

قبر میں نماز اور ثابت البنانی رحمۃ اللہ علیہ

سوال ایک روایت میں آیا ہے کہ ثابت البنانی رحمہ اللہ اپنی قبر میں نماز پڑھتے تھے۔ اس روایت کی حقیقت کیا ہے؟ (ماسٹر انور سلفی، حاصل پور ضلع بہاولپور)

الجواب حماد بن سلمہ سے روایت ہے کہ ثابت (بن اسلم البنانی رحمہ اللہ) نے کہا:

"إن كنت أعطيت أحدًا الصلاة في قبره فأعطني الصلاة في قبري"

(اے اللہ) اگر تو نے کسی کو اس کی قبر میں نماز پڑھنے کی اجازت دی ہے تو مجھے (بھی) میری قبر میں نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرما۔ (طبقات ابن سعد ۲۳۲/۷ وسندہ صحیح)

عبداللہ بن شوذب سے روایت ہے: ''میں نے ثابت البنانی کو کہتے ہوئے سنا:

''اللّٰهم إن كنت أعطيتَ أحدًا من خلقك يصلي لك في قبره فأعطنيه''

اے میرے اللہ! اگر تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو قبر میں نماز پڑھنے کی اجازت دی ہے تو مجھے (بھی) یہ اجازت دینا۔

(المعرفۃ والتاریخ لیعقوب بن سفیان الفارسی ۹۹/۲ وسندہ حسن، حلیۃ الاولیاء ۳۱۹/۲)

یہ ایک دعا ہے جو ثابت البنانی رحمہ اللہ نے مانگی ہے۔

یوسف بن عطیہ (متروک) نے کہا: ''فأذن لثابت أن يصلي في قبره''

پس ثابت کو ان کی قبر میں نماز پڑھنے کی اجازت مل گئی۔ (حلیۃ الاولیاء ۳۱۹/۲)

یہ روایت یوسف بن عطیہ کی وجہ سے موضوع ہے۔ یوسف بن عطیہ کے بارے میں امام بخاری نے کہا: ''منكر الحديث'' (کتاب الضعفاء بتحقیقی: ۴۲۲)

نسائی نے کہا: ''متروك الحديث'' (کتاب الضعفاء: ۶۱۷)

جسر (بن فرقد) سے روایت ہے کہ اس نے ثابت البنانی کو قبر میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔

(حلیۃ الاولیاء ۳۱۹/۲)

اس کی سند درج ذیل ہے: ''حدثنا عثمان بن محمد العثماني قال: ثنا إسماعيل بن الكرابيسي قال: حدثني محمد بن سنان القزاز قال: ثنا شيبان بن جسر عن أبيه'' (حلیۃ الاولیاء ۳۱۹/۲)

یہ سند موضوع ہے۔ جسر کے بارے میں امام دارقطنی نے کہا: ''متروك''

(سوالات البرقانی: ۷۰) وہ ضعیف متروک ہے۔ (تحفۃ الاقویاء فی تحقیق کتاب الضعفاء: ۵۴)

جسر کا شاگرد شیبان نامعلوم ہے۔ شیبان کا شاگرد محمد بن سنان (بن یزید) ضعیف ہے۔

(تقریب التہذیب: ۵۹۳۶)

محمد بن سنان کا شاگرد اسماعیل بن الکرابیسی مجہول الحال ہے۔اس کے شاگرد ابو عمرو عثمان بن محمد بن عثمان بن محمد بن عبدالملک کی توثیق نامعلوم ہے یعنی یہ سند ظلمات ہے۔

تنبیہ: اس مردود روایت کو عبدالحیٔ لکھنوی صاحب نے بحوالہ حلیۃ الاولیاء ''حدثنا عثمان ابن محمد العثماني :حدثنا إسماعيل بن علي الكرابيسي: حدثني محمد ابن سنان :حدثنا سنان عن أبيه'' کی سند سے نقل کیا ہے۔

(دیکھئے إقامۃ الحجۃ علیٰ ان الاِ کثار فی التعبد لیس ببدعۃ ص ۲۴، مجموعہ رسائل لکھنوی ج ۲ ص ۱۷۴)

لکھنوی صاحب سے اسے زکریا دیوبندی صاحب نے اپنی کتاب ''فضائلِ نماز'' (ص ۶۹، ۷۰ رتیسرا باب: خشوع وخضوع کے بیان میں) میں نقل کر کے عوام الناس کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ (نیز دیکھئے فضائلِ اعمال ص ۳۶۱)

زکریا صاحب سے اسے کسی نور محمد قادری (دیوبندی) نامی شخص نے بطورِ استدلال وحجت نقل کر کے ''قبر میں نماز'' اور ''عقیدہ حیاتِ قبر'' کا ثبوت فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔

دیکھئے دیوبندیوں کا ماہنامہ ''الخیر'' ملتان (جلد ۲۴ شمارہ: ۵، جون ۲۰۰۶ء ص ۲۵/۲۴۹)

عرض ہے کہ محمد بن سنان القزاز کے شدید ضعف اور الکرابیسی والعثمانی کی جہالت کے ساتھ ساتھ سنان اور اس کے باپ (ابوسنان) کا کوئی اتا پتا معلوم نہیں ہے۔

عین ممکن ہے کہ عبدالحیٔ صاحب والے نسخے میں ''شيبان بن جسر عن أبيه'' کو ''سنان عن أبيه'' لکھ دیا گیا ہو۔

اس مردود روایت کو عبدالحیٔ لکھنوی صاحب کا بغیر تحقیق وجرح کے نقل کرنا اور پھر ان کی کورانہ تقلید میں زکریا صاحب، نور محمد قادری دیوبندی اور مسئولین ماہنامہ ''الخیر'' ملتان کا عام لوگوں کے سامنے بطورِ حجت واستدلال پیش کرنا غلط حرکت ہے۔علماء کو چاہئے کہ عوام کے سامنے صرف وہی روایات پیش کریں جو کہ صحیح وثابت ہوں۔اس سلسلے میں علماء کو چاہئے کہ پوری تحقیق کریں ورنہ پھر خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ((مَنْ صَمَتَ نَجَا)) جو خاموش رہا اس نے نجات پائی۔

(کتاب الزہد لابن المبارک: ۳۸۵ وسندہ حسن، سنن الترمذی: ۲۵۰۱)

خلاصۃ التحقیق: یہ بات تو ثابت ہے کہ مشہور تابعی ثابت بن اسلم البنانی رحمہ اللہ قبر میں نماز پڑھنے کی دعا کرتے تھے مگر یہ بات ثابت نہیں ہے کہ انھوں نے قبر میں نماز پڑھی ہے۔

ضعیف و متروک راویوں کی روایات کی بنیاد پر اس قسم کے دعوے کرنا کہ ثابت رحمہ اللہ قبر میں نماز پڑھتے تھے، غلط اور مردود ہے۔ (۵/ جمادی الاولی ۱۴۲۷ھ) [الحدیث: ۲۸]

اہلِ بیت میں ازواجِ مطہرات شامل ہیں

سوال قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ سے فرمایا ہے کہ ہم نے آپ کے اہلِ بیت کو پاک کر دیا ہے۔ سورۃ الاحزاب (آیت: ۳۳) اس پاک کرنے کا کیا مطلب ہے کیوں کہ اس آیت کو بنیاد بنا کر ائمہ معصومین کا عقیدہ گھڑا گیا ہے۔ (ایک سائل)

الجواب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"نزلت في نساء النبي ﷺ" یہ آیت خاص طور پر نبی کریم ﷺ کی ازواجِ مطہرات کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ (تفسیر ابن ابی حاتم وتفسیر ابن کثیر ۳/ ۴۹۱، دوسرا نسخہ ۵/ ۱۶۹)

اس کی سند "حسن" ہے، اس کے راوی امام عکرمہ اس بات پر مباہلہ کرنے کو تیار تھے کہ اس آیت سے مراد ازواجِ نبی ﷺ ہیں۔

قرآن کریم سے ثابت ہے کہ بیویاں اہلِ بیت میں شامل ہوتی ہیں۔ (دیکھیں سورۂ ہود: ۷۱۔۷۳)

آیت مذکورہ میں طہارۃ سے معصومین مراد لینا نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے نہ تابعین اور نہ ائمہ اہلِ سنت سے ثابت ہے بلکہ تطہیر سے گناہ، شرک، شیطان، افعالِ خبیثہ اور اخلاقِ ذمیمہ سے طہارت مراد ہے۔ دیکھئے احکام القرآن للقاضی ابی بکر بن العربی ص ۴۲۹

عقیدہ ائمہ معصومین صرف روافض کا من گھڑت عقیدہ ہے۔ [الحدیث: ۵۱]

مروجہ جماعتوں اور بیعت کی حیثیت

سوال اگر اسلامی مملکت کے قیام کے لئے کوئی جماعت بنتی ہے اور اس کے امیر کے ہاتھ پر تمام ممبرانِ جماعت بیعت (بیعتِ ارشاد) کرتے ہیں تو اس کی کیا شرعی حیثیت ہوگی؟ (جائز، غلط، بدعت وغیرہ)؟ (عبدالمتین، ماڈل ٹاؤن لاہور)

الجواب اسلامی مملکت کے قیام کے لئے ذاتی، انفرادی اور جماعت سازی کے بغیر اجتماعی کوشش جاری رکھنی چاہئے اور سب سے پہلے اپنی اور اپنے متعلقین کی کتاب وسنت کے مطابق اصلاح کرنی چاہئے۔ موجودہ تمام جماعتیں باطل ہیں اور ''وَلَا تَفَرَّقُوْا'' اور فرقے فرقے نہ بنو۔ (آل عمران:۱۰۳) کے قرآنی حکم کے سراسر خلاف ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ سے معلوم ہوتا ہے کہ پارٹیاں پارٹیاں، فرقے فرقے اور گروہ گروہ نہ بنو۔ جب کہ جماعت پرست لوگ عملاً یہ کہتے ہیں کہ پارٹیاں بناؤ اور گروہ در گروہ میں بٹ جاؤ۔

جب تک روئے زمین کے تمام صحیح العقیدہ لوگ مل کر ایک ہی جماعت اور ایک ہی خلیفہ کے تحت نہ ہو جائیں ان تمام پارٹیوں میں شمولیت جائز نہیں ہے۔ ان کی رکنیت، چندہ مہم اور حزبیت سے دُور دُور رہ کر ان سے معروف (نیکی) میں تعاون کیا جا سکتا ہے، اسلام میں صرف دو ہی بیعتیں ہیں: ① نبی کی بیعت ② خلیفہ کی بیعت

ان کے علاوہ تیسری کسی بیعت کا دینِ اسلام میں کوئی نام ونشان نہیں ہے تفصیل کے لئے شیخ البانی رحمہ اللہ کے مشہور شاگرد شیخ علی حسن الحلبی کی کتاب ''البيعة بين السنة والبدعة عند الجماعات الإسلامية'' کا مطالعہ انتہائی مفید ہے۔

تنبیہ: بیعت بھی صرف اسی خلیفہ کی کرنی چاہئے جس پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہو۔ جیسا کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے ثابت ہے۔ دیکھئے المسند من مسائل الامام رحمہ اللہ (قلمی ۱، بحوالہ الامامۃ العظمیٰ عند اہل السنۃ والجماعۃ ص ۲۱۷) ومسائل الامام احمد لابن ہانیٔ (۲/۱۸۵ رقم:۲۰۱۱) والسنہ للخلال (ص ۸۰، ۸۱ رقم: ۱۰ وھو صحیح عن احمد رحمہ اللہ)

شیخ علی حسن الحلبی نے فرمایا: ''لا تكون البيعة إلا لأمير المؤمنين فقط''

امیر المومنین کے علاوہ کسی دوسرے کی بیعت جائز نہیں ہے۔ (البیعہ ص ۲۳)

علی حسن الحلبی صاحب نے مزید لکھا ہے: " لا تعطى البيعة على أنواعها إلا لخليفة المسلمين المنفذ للأحكام ، المطبق للحدود " بیعت اپنی تمام اقسام کے ساتھ صرف اسی کی کرنی چاہیئے جو مسلمانوں کا خلیفہ ہو، جس نے احکام کو نافذ اور (اسلامی) حدود کو روبعمل (لاگو) کر رکھا ہو۔ (البیعہ ص ۲۸)

وما علينا إلا البلاغ (۲۰/صفر ۱۴۲۷ھ) [الحدیث: ۲۵]

تخلیقِ آدم اور احادیث کا مفہوم

سوال صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی مندرجہ ذیل حدیث کا صحیح مفہوم کیا ہے؟

① خلق الله آدم على صورته .... إلخ (بخاری کتاب الاستیذان باب ۱)

② خلق الله عزوجل آدم على صورته .... إلخ

(مسلم کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمھا واہلہا طبع قدیمی کتب خانہ ج ۲ ص ۳۸۰) (ناصر رشید، راولپنڈی)

الجواب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((إذا قاتل أحدكم أخاه فليجتنب الوجه فإن الله خلق آدم على صورته)) اگر تم میں کوئی اپنے بھائی سے لڑے تو (اس کے) چہرے پر نہ مارے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم (علیہ السلام) کو اس (شخص) کی صورت پر پیدا کیا ہے۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۲۷ ح ۲۶۱۲)

امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے اس حدیث و دیگر احادیث سے یہ ثابت کیا ہے کہ على صورته سے مراد مضروب ہے، یعنی وہ شخص جسے مارا پیٹا گیا ہے۔ (دیکھئے کتاب التوحید ص ۳۷)

اگر کوئی کہے کہ ایک روایت میں آیا ہے کہ " أن الله خلق آدم على صورة الرحمٰن " اللہ تعالیٰ نے بے شک آدم کو الرحمٰن کی صورت پر پیدا کیا۔

(کتاب التوحید لابن خزیمہ ص ۳۸، المعجم الکبیر للطبرانی ج ۱۲ ص ۴۳۰ ح ۱۳۵۸۰، وغیرہما)

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ روایت اصولِ حدیث کی رو سے ضعیف ہے۔ اس کے دو راوی: الاعمش اور حبیب بن ابی ثابت مدلس تھے اور انھوں نے عن سے روایت کی ہے۔

صول حدیث میں یہ مقرر ہے کہ مدلس کی عن والی روایت ضعیف ہوتی ہے۔ بعض حنابلہ نے س حدیث کی تصحیح پر ایک بڑی کتاب بھی لکھی ہے مگر نہ تو وہ راویوں کی تصریحِ سماع ثابت کر سکے ہیں اور نہ کوئی معتبر متابعت، لہٰذا بڑی کتاب لکھنے کا آخر کیا فائدہ ہے؟

[شہادت، مئی ۲۰۰۰ء]

امام ابن خزیمہ اور اللہ تعالیٰ کی صفت: آنکھیں

سوال امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے کتاب التوحید (ص ۴۲، ۴۳ طبع بیروت) میں للہ تعالیٰ کی آنکھیں ثابت کرنے کے لئے ایک روایت نقل کی ہے، وہ یہ ہے کہ

"عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: رأيت رسول الله ﷺ يضع إبهامه على ذنه وأصبعه التي تليها على عينه" [سیدنا ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا، آپ اپنا انگوٹھا اپنے کان پر رکھتے اور شہادت کی انگلی کو اپنی آنکھ پر رکھتے۔]

یہ روایت آیت "كان الله سميعًا بصيرًا" کی تفسیر میں نقل کی ہے۔ اگر امام صاحب کے استدلال کو مدنظر رکھتے ہوئے اس سے اللہ تعالیٰ کی آنکھیں ثابت کی جائیں تو پھر اس سے تو کان بھی ثابت ہوتے ہیں، کیونکہ نبی ﷺ نے آنکھوں کے ساتھ کانوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا سمیع سے کان ثابت ہوتے ہیں یا نہیں؟ نیز امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ کے استدلال کی بھی وضاحت فرمائیں۔ (ایک سائل)

الجواب حدیثِ مذکور کو امام ابوداود (۴۷۲۸) نے بھی روایت کیا ہے، اسے ابن حبان (الموارد: ۱۷۳۲) حاکم (۲۴/۱) اور ذہبی نے صحیح کہا ہے۔ اس حدیث سے اللہ کا سمیع و بصیر ہونا ثابت ہے، اس سے اللہ کا کان اور آنکھ ثابت کرنا صحیح نہیں، اللہ کی آنکھوں کا ثبوت قرآن ودیگر احادیث صحیحہ میں ہے، امام ابن خزیمہ نے اس حدیث کے ذریعے سے جہمیہ کا رد کیا ہے جو کہ اللہ کو سمیع و بصیر نہیں مانتے۔ [شہادت، مارچ ۲۰۰۳ء]

نبی ﷺ کی نبوت اور آدم علیہ السلام

سوال ''میں اس وقت بھی نبی تھا جس وقت آدم کا خمیر بنایا گیا''
اس ضمن میں کسی کتاب میں صحیح سند سے کوئی روایت ہے؟ (طاہر ندیم، لاہور)

الجواب سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:
" قالوا: یا رسول اللہ ! متی وجبت لك النبوة؟ "
لوگوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ کے لئے نبوت کب واجب ہوئی تھی؟
آپ ﷺ نے فرمایا: ((و آدم بین الروح والجسد))
اور نبوت اس وقت واجب ہوئی جب آدم (علیہ السلام) روح اور جسد کے درمیان تھے۔

(جامع ترمذی، کتاب المناقب، باب ماجاء فی فضل النبی ﷺ ح ۳۶۰۹، دلائل النبوہ للبیہقی ۲/۱۳۰ وابو نعیم فی الدلائل ص ۸ ح ۸، المستدرک للحاکم ۲/۶۰۹، اخبار اصبہان لابی نعیم ۲/۲۲۶، کتاب القدر للفریابی ح ۱۴، تاریخ بغداد للخطیب ۳/۱۴۶، امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا: ھذا حدیث حسن صحیح غریب من حدیث ابی ہریرۃ لانعرفہ الا من ھذا الوجہ)

یہ روایت صحیح ہے۔ ولید بن مسلم نے دلائل النبوۃ میں سماع کی تصریح کر دی ہے اور اس روایت کے کئی شواہد ہیں۔

۲۔ سیدنا میسرۃ الفجر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے کہا:
" یا رسول اللہ ! متی کتبت نبیاً ؟ " اے اللہ کے رسول! آپ کب نبی لکھے گئے؟
تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((و آدم بین الروح والجسد))
اور آدم (علیہ السلام) روح اور جسد کے درمیان تھے۔ (مسند احمد ۵/۵۹ ح ۲۰۸۷۲، کتاب السنۃ لعبداللہ بن احمد ۲/۳۹۸ ح ۸۶۴ واللفظ لہ، التاریخ الکبیر للبخاری ۷/۳۷۴، کتاب السنۃ لابن ابی عاصم ح ۴۱۰، کتاب القدر لجعفر بن محمد الفریابی ص ۲۹ ح ۱۷، طبقات ابن سعد ۷/۶۰، المعجم الکبیر للطبرانی ۲۰/۳۵۳ ح ۸۳۳، ۸۲۲، ابو یعلی الموصلی، اتحاف الخیرۃ المہرۃ للبوصیری ۹/۸ ح ۸۸۴ حلیۃ الاولیاء لابی نعیم الاصبہانی ۹/۵۳، الحاکم فی المستدرک ۲/۶۰۸، ۶۰۹ وصححہ ووافقہ الذہبی، معجم الصحابۃ لعبدالباقی بن قانع ج ۱۴ ص ۵۰۴۳ ح ۱۹۹۲، ۱۹۹۳)

اس روایت کی سند صحیح ہے۔ بعض روایتوں میں ((متی کنت نبیاً؟)) آپ کب (سے)

نبی تھے؟ کے الفاظ آئے ہیں۔

۳۔ میسرۃ الفجر رضی اللہ عنہ جیسی روایت عبداللہ بن ابی الجدعاء العبدی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔

(طبقات ابن سعد ۷/۵۹ معجم الصحابۃ لعبد اللہ بن محمد بن عبد العزیز البغوی ۴/۱۳۴ ح ۱۶۵۲ معرفۃ الصحابۃ لابی نعیم الاصبہانی ۳/۱۶۱۴ ح ۴۰۶۴ معجم الصحابۃ لعبد الباقی بن قانع البغدادی ۹/۳۳۲۸ ح ۱۰۳۹، الاحادیث المختارۃ للضیاء المقدسی ۹/۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۴)

اس حدیث کی سند صحیح ہے۔

۴۔ عن رجل رضی اللہ عنہ نحو روایۃ میسرۃ الفجر رضی اللہ عنہ (کتاب السنۃ لابن ابی عاصم ح ۴۱۱)

۵۔ عن عبداللہ بن شقیق التابعی مرسلاً نحو روایۃ میسرۃ الفجر رضی اللہ عنہ

(مصنف ابن ابی شیبہ ۱۴/۲۹۲ ح ۳۶۵۴۴ کتاب القدر للفریابی ح ۱۵، ۱۶ طبقات ابن سعد ۱/۱۴۸)

۶۔ مطرف بن عبداللہ بن الشخیر التابعی۔ مرسل، بلفظ: ''متى كنت نبيًا ؟ قال : ((بين الروح والطين من آدم)) (طبقات ابن سعد ۱/۱۴۸، وسندہ ضعیف لارسالہ)

۷۔ عامر الشعبی التابعی۔ مرسل بلفظ ''متى استنبئت ؟ فقال:

((و آدم بين الروح والجسد حين أخذ مني الميثاق))

(طبقات ابن سعد ۱/۱۴۸، وسندہ ضعیف جداً مع ارسالہ، فیہ جابر بن یزید الجعفی ضعیف جداً رافضی ومتہم)

۸۔ نصر بن مزاحم [ضعيف]: ثنا قيس (ابن الربيع) [ضعيف] عن جابر الجعفي [ضعيف رافضي متهم] عن الشعبي عن ابن عباس قال:

قيل يا رسول الله ! متى كتبت نبيًا ؟ قال : ((وآدم بين الروح والجسد))

(البزار: کشف الاستار ۳/۱۱۲ ح ۲۳۶۴، وسندہ ضعیف جداً منکر)

۹۔ عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إني عند الله مكتوب خاتم النبيين)) میں یقیناً اللہ کے ہاں خاتم النبیین لکھا ہوا تھا اور ((وإن آدم لمنجدل في طينته)) بے شک آدم اپنی گوندھی ہوئی مٹی میں تھے۔

(شرح السنہ للبغوی ج ۱۳ص ۲۰۷ ح ۳۶۲۶ واللفظ لہ وتفسیر البغوی، المشکوٰۃ بتحقیقی ح ۵۷۵۹، واحمد ۴/ ۱۲۷، ۱۲۸، البیہقی فی دلائل النبوۃ ۲/ ۱۳۰، ابن عساکر فی تاریخ دمشق ۳۵/ ۳۰۷، وصحیح ابن حبان الموارد: ۲۰۹۳، وصححہ الحاکم ۲/ ۶۰۰ وتعقبہ الذہبی بقول: ابوبکر (بن ابی مریم) ضعیف'' قلت: ولم ینفرد بہ، تابعہ الثقۃ معاویۃ بن صالح عن سعید بن سوید عن ابن ھلال السلمی عن عرباض بن ساریۃ، و ابونعیم فی دلائل النبوۃ ح ۹، و فی حلیۃ الاولیاء ۶/ ۸۹، ۹۰، طبقات ابن سعد ۱/ ۱۴۹، المعجم الکبیر للطبرانی ۱۸/ ۲۵۲، ۲۵۳، ح ۶۲۹، ۶۳۱، کتاب المعرفۃ والتاریخ لیعقوب بن سفیان الفارسی ۲/ ۳۴۵، التاریخ الکبیر للبخاری ۶/ ۶۸ ت ۱۷۳۶ تفسیر ابن ابی حاتم ۱/ ۲۳۶ ح ۱۲۵۴ تفسیر ابن جریر الطبری ج ۱ص ۴۳۵ [سورۃ البقرۃ: ۱۲۹] البزار، کشف الاستار ۳/ ۱۱۳ ح ۲۳۶۵ وعندہ بعض الالفاظ منکرۃ وسندہ ضعیف من اجل ابی بکر بن ابی مریم وغیرہ)

ابوبکر بن ابی مریم (الغسانی) والی روایت ضعیف ہے لیکن معاویہ بن صالح والی روایت حسن ہے اور میں نے معاویہ بن صالح (ثقہ) کی روایت کو ہی اوپر متن میں لکھا ہے۔ اس روایت کے راویوں کا مختصر تعارف درج ذیل ہے:

۱۔ عرباض بن ساریہ: صحابی رضی اللہ عنہ

۲۔ عبد الأعلی بن ھلال ویقال عبد اللہ: تابعی، لم أجدہ فی تعجیل المنفعۃ، روی عنہ سعید بن سوید ویزید بن أیھم ومحمد بن مسلم الزھری[وغیرھم] ترجمتہ فی تاریخ دمشق [۳۰۷/۳۵] وغیرہ ۔ وذکرہ ابن حبان فی الثقات [۱۲۸/۵] وصحح لہ الحاکم [۶۰۰/۲]

فھو حسن الحدیث علی الأقل وأسقطہ بعض الرواۃ من السند وھذا لا یضر وھو من المزید فی متصل الأسانید .

۳۔ سعید بن سوید: قال البخاری: ''لم یصح حدیثہ'' وصحح حدیثہ ابن حبان والحاکم کما تقدم وانظر تعجیل المنفعۃ (ص ۱۵۲ ت ۳۷۱) فحدیثہ لا ینزل عن درجۃ الحسن وذکرہ ابن حبان فی الثقات (۳۶۱/۶)

۴۔ معاویہ بن صالح الحمصی الحضرمی، روی لہ مسلم فی صحیحہ، وغیرہ ووثقہ أحمد والجمھور وقال

صاحبا "تحریر تقریب التہذیب": "بل ثقة" (۳/۳۹۴ ت ۶۷۶۲)

اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ معاویہ بن صالح والی روایت بلحاظ سند حسن ہے۔ بعض روایتوں میں "إني عبد اللّٰه" آیا ہے۔ دونوں الفاظ صحیح ہیں۔ جس طرح کہ "کتبت" اور "کنت" دونوں الفاظ صحیح ہیں۔

معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کا عبداللہ اور خاتم النبیین ہونا تقدیر میں تخلیق آدم سے پہلے ہی لکھ دیا گیا تھا لہٰذا اس حدیث کا تعلق مسئلہ تقدیر سے ہے، مسئلہ تخلیقِ سیدنا محمد ﷺ، فداہ ابی وامی سے نہیں۔ امام فریابی کا اس حدیث (حدیث ابی ہریرہ وحدیث میسرۃ الفجر) کو کتاب القدر میں ذکر کرنا اس استدلال کی زبردست دلیل ہے۔

تنبیہ: محدث عبدالرحمٰن مبارک پوری رحمہ اللہ نے بحوالہ ابن ربیع عن ابی نعیم فی الدلائل وغیرہ کی ایک روایت نقل کی ہے۔ "کنت أول النبین فی الخلق و آخر هم فی البعث" یعنی میں انبیاء میں سے سب پہلے تخلیق کیا گیا ہوں اور سب سے آخر میں زندہ ہو کر اُٹھوں گا۔ (تحفۃ الاحوذی ج ۴ ص ۲۹۳ نسخہ ہندیہ)

یہ روایت دلائل النبوۃ لابی نعیم (۶/۱ ح ۳) الفوائد لتمام الرازی (۱۵/۲ ح ۱۰۰۳) الکشف والبیان للثعلبی (۱۰۸، الاحزاب: ۸) تفسیر ابن ابی حاتم کمافی تفسیر ابن کثیر (۳/۴۷۸ وفی نسخہ ۶/۳۸۳) ابوبکر بن لال کمافی ہامش فردوس الاخبار للدیلمی (۳/۳۳۱ ح ۴۸۸۳) اور الکامل لابن عدی (۳/۱۲۰۹) میں "سعید بن بشیر: ثنا قتادة عن الحسن عن أبي هريرة قال قال رسول اللّٰه ﷺ" کی سند سے مروی ہے۔

سعید بن بشیر ازدی ضعیف (راوی) تھا۔ (دیکھئے تقریب التہذیب ص ۱۲۰)

اسے ابن معین اور جمہور محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ محمد بن عبداللہ بن نمیر نے کہا:

"سعيد بن بشير: منكر الحديث، ليس بشئ ليس بقوي الحديث، يروي عن قتادة المنكرات" سعید بن بشیر منکر حدیثیں بیان کرنے والا، کچھ چیز نہیں، حدیث میں قوی نہیں تھا، وہ قتادہ سے منکر روایتیں بیان کرتا تھا۔ (الجرح والتعدیل ۴/۷ وسندہ صحیح)

الساجی نے کہا: ''حدث عن قتادة بمنا کیر''
اس نے قتادہ سے منکر روایتیں بیان کی ہیں۔ (تہذیب التہذیب ۴/۱۰)
یعنی سعید بن بشیر جب قتادہ سے روایت کرے تو وہ روایت منکر ہوتی ہے۔ کسی معتدل محدث نے اس کی قتادہ سے روایت کو صحیح یا حسن قرار نہیں دیا۔ بقول ابن عدی خلید بن دعلج (ضعیف) نے سعید بن بشیر کی متابعت کر رکھی ہے۔ مجھے یہ روایت نہیں ملی۔
قتادہ اور حسن بصری: دونوں مشہور مدلس راوی تھے لہٰذا اگر ان تک سند صحیح ہوتی تو بھی یہ ضعیف تھی کیونکہ بشرط صحت وہ عن سے روایت کر رہے ہیں۔
خلاصہ یہ کہ یہ سند ضعیف و منکر ہے۔ عصرِ حاضر کے مشہور محقق شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے بھی اس روایت کو ''ضعیف'' قرار دیا ہے۔ دیکھئے السلسلة الضعیفة (۲/۱۱۵ح ۶۶۱)
طبقات ابن سعد میں ہے: ''عن قتادة قال قال رسول اللہ ﷺ: کنت أول الناس فی الخلق و آخرھم فی البعث'' (۱/۱۴۹)
اسی کی دو سندیں ہیں:
۱۔ عبدالوہاب بن عطاء (مدلس) عن سعید بن ابی عروبۃ (مدلس) عن قتادۃ....الخ
یہ سند تدلیس کی وجہ سے ضعیف ہے۔
۲۔ عمرو بن عاصم الکلابی: اخبرنا ابو ہلال (محمد بن سلیم الراسبی: ضعیف ضعفہ الجمہور) الخ
یہ سند بھی ضعیف ہے۔
یہ دونوں سندیں اگر صحیح بھی ہوتیں تو یہ روایت قتادہ تابعی کے ارسال کی وجہ سے ضعیف ہے۔

[شہادت، اگست، ستمبر ۲۰۰۳ء]

رسول اللہ ﷺ پر درود اور فرشتوں کا اسے پہنچانا

سوال ایک روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھ پر کثرت سے درود بھیجو کیونکہ بے شک اللہ نے میری قبر پر ایک فرشتہ مقرر کیا ہے، جب میری اُمت میں سے کوئی شخص مجھ پر درود پڑھے گا تو یہ فرشتہ مجھے کہے گا: اے محمد! فلاں شخص کے فلاں

بیٹے نے اس وقت آپ پر درود بھیجا ہے۔
اس روایت کو شیخ البانی نے اپنی مشہور کتاب السلسلۃ الصحیحۃ میں ذکر کیا ہے۔
(ج ۴ ص ۴۳ ح ۱۵۳۰)

کیا یہ روایت صحیح ہے؟ (راحیل شاہ، برطانیہ)

الجواب شیخ محمد ناصر الدین الالبانی نے اس روایت کی دو سندیں پیش کی ہیں:

① ''عن محمد بن عبدالله بن صالح المروزي: حدثنا بكر بن خداش عن فطر بن خليفة عن أبى الطفيل عن أبى بكر الصديق رضي الله عنه مرفوعًا أي عن رسول الله ﷺ'' (بحوالہ الدیلمی ۱/۱/۳۱، الصحیحہ ۴/۴۴)

اس سند میں محمد بن عبداللہ بن صالح مجہول ہے، جس کے بارے میں البانی صاحب نے خود لکھا: ''لم أعرفه'' میں نے اسے نہیں پہچانا۔ (الصحیحہ ص ۴۴)

دوسرے یہ کہ محمد بن عبداللہ تک محدث دیلمی کی سند نامعلوم ہے۔

خلاصہ یہ کہ یہ سند ثابت نہیں ہے۔

② نعيم بن ضمضم عن عمران بن الحميري عن عماربن ياسر رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ: ((إن لله ملكاً أعطاه أسماع الخلائق فهو قائم على قبري إذا مت، فليس أحد يصلي علي صلوة إلا قال: يا محمد! صلّى عليك فلان بن فلان .... إلخ

اللہ نے ایک فرشتے کو مخلوقات کی سماعتیں عطا فرمائی ہیں جو میری وفات کے بعد میری قبر پر کھڑا ہوگا پھر جو کوئی مجھ پر ایک درود پڑھے گا تو وہ کہے گا: اے محمد! فلاں کے فلاں بیٹے نے آپ پر درود پڑھا ہے۔ الخ

(بحوالہ ابوالشیخ بن حیان والطبرانی وغیرہما عن القول البدیع للسخاوی ص ۱۱۲، الصحیحہ ۴/۴۴)

اس سند کا راوی نعیم بن ضمضم مجہول ہے، جسے ہمارے علم کے مطابق کسی نے بھی ثقہ نہیں کہا۔
دیکھئے لسان المیزان (۶/۱۶۹، طبعہ جدیدہ ۷/۲۱۳)

اس سند کا دوسرا راوی عمران بن الحمیری مجہول الحال ہے جسے سوائے ابن حبان کے کسی نے بھی ثقہ نہیں قرار دیا۔ دیکھئے لسان المیزان (۴/۳۴۵، دوسرا نسخہ ۵/۲۶۴)

امام بخاری نے التاریخ الکبیر (۶/۴۱۶) میں یہ روایت ذکر کر کے ''لا يتابع عليه'' کہہ کر اس کے ضعف کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔

مجہول راویوں کی ان دو سندوں کے بارے میں البانی صاحب نے لکھا:

''فالحديث بهذا الشاهد وغيره مما في معناه حسن إن شاء الله تعالىٰ''

پس اس شاہد وغیرہ سے یہ حدیث ان شاء اللہ تعالیٰ حسن ہے۔ (الصحیحہ ۴/۴۵) !

عرض ہے کہ یہ روایت ان دونوں سندوں کے ساتھ ضعیف و مردود ہی ہے اور مجہول راویوں کی روایتیں مردود ہوتی ہیں نہ کہ ضعیف + ضعیف کے خودساختہ کلیے کے ذریعے سے انھیں حسن قرار دیا جائے۔!

دوسرے یہ کہ یہ ضعیف روایت اُس صحیح حدیث کے خلاف ہے جس میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((إن لله ملائكة سيّاحين في الأرض يبلّغوني من أمّتي السلام)) بے شک اللہ کے فرشتے زمین میں پھرتے رہتے ہیں، وہ مجھے اپنی اُمت کی طرف سے سلام پہنچاتے ہیں۔

(سنن النسائی ۳/۴۳ ح ۱۲۸۳، وھو حدیث صحیح، مسند احمد ۱/۳۸۷، ۴۵۲، فضل الصلوۃ علی النبی ﷺ للامام إسماعیل القاضی: ۲۱ وسندہ صحیح، وصححہ ابن حبان، الاحسان: ۹۱۰، دوسرا نسخہ: ۹۱۴، والحاکم ۲/۴۲۱ ح ۳۵۷۶ ووافقہ الذہبی)

ایک اعتراض: اس کی سند میں سفیان ثوری مدلس ہیں۔

جواب: امام اسماعیل بن اسحاق القاضی نے فرمایا:

''حدثنا مسدد قال: ثنا يحي عن سفيان: حدثني عبدالله بن السائب عن زاذان عن عبدالله - هو ابن مسعود عن النبي ﷺ قال: ((إن لله ملائكة سيّاحين يبلّغوني من أمتي السلام.))'' (فضل الصلوۃ علی النبی ﷺ ص ۱۱ ح ۲۱ وسندہ صحیح)

معلوم ہوا کہ امام سفیان ثوری نے سماع کی تصریح کر دی ہے اور دوسرے یہ کہ سلیمان بن

مہران الاعمش (ثقہ مدلس) نے اُن کی متابعت کر رکھی ہے۔

دوسرا اعتراض: اس کی سند میں زاذان راوی شیعہ ہے۔

جواب: زاذان ابو عمر کا شیعہ ہونا ثابت نہیں ہے بلکہ حافظ ابو نعیم الاصبہانی نے زاذان کو اہلِ سنت کے اولیاء میں شمار کیا ہے۔

دیکھئے حلیۃ الاولیاء (۴/۱۹۹۔۲۰۴) اور ماہنامہ الحدیث حضرو: ۱۴ ص ۲۵

جمہور محدثین نے انھیں ثقہ وصدوق قرار دیا ہے لہٰذا زاذان مذکور پر ہر قسم کی جرح مردود ہے، تفصیل کے لئے دیکھئے میرا مضمون "الیاقوت والمرجان فی توثیق أبی عمر زاذن" والحمدللہ

(۳/نومبر ۲۰۰۸ء)

نذر اور تقدیر

سوال حدیث میں ہے کہ "نذر سے تقدیر نہیں بدلتی لیکن بخیل کا مال نکل جاتا ہے" اس کا کیا مطلب ہے۔ نذر و نیاز اللہ کے نام پر جائز ہے یا سنت ہے کہ نہیں؟

(عبدالعزیز بن) عبداللہ بن باز کے فتاویٰ میں انھوں نے یہ فرمایا ہے کہ اگر کسی نے نذر مانی ہے تو پوری کرے مگر آئندہ ایسا نہ کرے اور پھر مندرجہ بالا حدیث بیان کی۔

(محمد عادل شاہ، برطانیہ)

الجواب سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((لا يأتي ابنَ آدم النذرُ بشيٍ لم يكن قُدِّر له ولكن يلقيه النذر إلى القدر قد قُدِّر له فيستخرج الله به من البخيل فيؤتي عليه ما لم يكن يؤتي عليه من قبل .))

ابن آدم (انسان) کو نذر کوئی چیز نہیں دیتی جو اُس کی تقدیر میں نہ ہو لیکن نذر اُسے اُس تقدیر کی طرف لے جاتی ہے جو اُس کے مقدر میں تھی، البتہ اللہ اس نذر کے ذریعے سے بخیل سے اس کا مال نکلواتا ہے لہٰذا وہ شخص وہ (مال وغیرہ صدقے میں) دیتا ہے جو وہ اس سے پہلے نہیں دیتا تھا۔ (صحیح بخاری: ۶۶۹۴، صحیح مسلم: ۱۶۴۰)

اس حدیث سے ثابت شدہ مسئلے کی تشریح میں مولانا محمد داود راز رحمہ اللہ نے فرمایا:

”اکثر لوگوں کا قاعدہ ہے کہ یوں تو اللہ کی راہ میں اپنا پیسہ خرچ نہیں کرتے جو کوئی مصیبت آن پڑے اس وقت طرح طرح کی منتیں اور نذریں مانتے ہیں۔ باب کی حدیث میں... صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نذر اور منت ماننے سے تقدیر نہیں پلٹ سکتی ہوتا وہی ہے جو تقدیر میں ہے۔ مسلم کی حدیث میں صاف یوں ہے کہ نذر نہ مانا کرو اس لئے کہ نذر سے تقدیر نہیں پلٹ سکتی۔ حالانکہ نذر کا پورا کرنا واجب ہے۔ مگر آپ نے جو نذر سے منع فرمایا وہ اس نذر سے جس میں یہ اعتقاد ہو کہ نذر ماننے سے بلاٹل جائے گی جیسے اکثر جاہلوں کا عقیدہ ہوتا ہے لیکن اگر یہ جان کر نذر کرے کہ نافع اور ضار اللہ ہی ہے اور جو اس نے قسمت میں لکھا ہے وہی ہوگا تو ایسی نذر منع نہیں بلکہ اس کا پورا کرنا ایک عبادت اور واجب ہے۔ اب ان لوگوں کے حال پر بہت ہی افسوس ہے جو خدا کو چھوڑ کر دوسرے بزرگوں یا درویشوں کی نذر مانیں وہ علاوہ گنہگار ہونے کے اپنا ایمان بھی کھوتے ہیں کیونکہ نذر ایک مالی عبادت ہے اس لئے غیر اللہ کی نذر ماننے والا مشرک ہو جاتا ہے۔“

(صحیح بخاری، مطبوعہ مکتبہ قدوسیہ لاہور ج ۸ ص ۶۴، ۶۵ قبل ح ۶۶۰۸)

مثلاً ایک آدمی کی اولاد نہیں ہے، اسے چاہئے کہ صدقات وغیرہ اور نیک اعمال میں مصروف رہ کر مسلسل دعائیں کرتا رہے لیکن اگر وہ ایسا کرنے کے بجائے یہ نذر مانتا ہے کہ اے اللہ! اگر تُو نے مجھے بیٹا دے دیا تو میں مسجد، مدرسہ یا ہسپتال وغیرہ تعمیر کروں گا۔ ایسی نذر ماننا ممنوع ہے اور اگر مان لے تو اسے پورا کرنا واجب ہے۔

دوسری طرف ایک شخص ہے، اسے اللہ نے بیٹا دے دیا یا کوئی نعمت عطا فرمائی تو خوش ہو کر اس نے نذر مان لی: ”اے اللہ تیرا شکر ہے، میں تیرے دین کے لئے فلاں کام کروں گا۔“

یہ نذر بالکل صحیح اور پسندیدہ ہے۔

اللہ کے نام پر نذر و نیاز جائز اور صحیح ہے بلکہ نذر و نیاز ہوتی ہی صرف ایک اللہ کے لئے ہے۔

غیر اللہ کے نام پر نذر و نیاز حرام ہے۔ اُمید ہے کہ آپ یہ مسئلہ سمجھ چکے ہوں گے۔ واللہ اعلم

اہلِ حدیث کی قدامت اور آلِ دیوبند

سوال میرے بعض دیوبندی دوست کہا کرتے ہیں کہ ''غیر مقلدین'' (یعنی اہلحدیث) بالکل نیا فرقہ ہے۔ انگریزوں کے دور سے پہلے اس کا کوئی وجود نہیں۔ کیا آپ کسی مستند دیوبندی عالم سے اہلحدیث کی قدامت ثابت کر سکتے ہیں؟ (ایک سائل)

الجواب ''مفتی'' رشید احمد لدھیانوی دیوبندی نے لکھا ہے:

''تقریباً دوسری تیسری صدی ہجری میں اہلِ حق میں فروعی اور جزئی مسائل کے حل کرنے میں اختلافِ انظار کے پیشِ نظر پانچ مکاتبِ فکر قائم ہوگئے۔ یعنی مذاہب اربعہ اور اہل حدیث۔ اس زمانے سے لے کر آج تک انہی پانچ طریقوں میں حق کو منحصر سمجھا جاتا رہا۔''

(احسن الفتاویٰ ج۱ص ۳۱۶، مودودی صاحب اور تخریب اسلام ص ۲۰)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ دیوبندی اکابر بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اہل الحدیث کا وجود مبارک دوسری صدی ہجری سے ہے۔ جب کہ حق و انصاف یہ ہے کہ اہل الحدیث کا وجود سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کے مقدس دور سے ہے۔ **والفضل ماشهدت به الأعداء**

(ہفت روزہ الاعتصام لاہور، ۲۷/ جون ۱۹۹۷ء)

کیا چاروں امام برحق ہیں؟

سوال بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ چار امام برحق ہیں مگر تقلید صرف ایک کی کرتے ہیں۔ قرآن و حدیث سے جواب دیں کہ امام کس طرح برحق ہیں اور اُن کو ماننا کس حد تک جائز ہے؟ (حاجی نذیر خان، دامان حضرو)

الجواب اہلِ اسلام میں ہزاروں لاکھوں امام گزرے ہیں مثلاً تمام صحابۂ کرام، تمام صحیح العقیدہ ثقہ تابعین و تبع تابعین اور دیگر ائمہ عظام رحمہم اللہ اجمعین۔

اس وقت دنیا میں آلِ تقلید کے کئی گروہوں میں سے دو بڑے گروہ ہیں:

اول: مذاہب اربعہ میں سے صرف ایک مذہب کی تقلید کرنے والے: یہ لوگ امام مالک،

ابوحنیفہ، شافعی اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ کو چار امام کہتے ہیں۔

دوم: شیعہ یعنی روافض: یہ اہلِ بیت کے بارہ اماموں کو امام برحق اور معصوم مانتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ اہلِ سنت کی طرف منسوب تقلیدی مذاہب والے لوگوں کے نزدیک چار اماموں سے مراد مالک بن انس المدنی، ابوحنیفہ نعمان بن ثابت الکوفی الکابلی، محمد بن ادریس الشافعی الہاشمی اور احمد بن حنبل الشیبانی البغدادی رحمہم اللہ ہیں۔

مذکورہ چار اماموں کو برحق ماننے کے دو معنی ہو سکتے ہیں:

۱: یہ چاروں حدیث اور فقہ کے بڑے امام تھے۔

عرض ہے کہ امام ابوحنیفہ کے بارے میں جمہور سلف صالحین کا اختلاف ہے، جس کی تفصیل التاریخ الکبیر للبخاری، الکنیٰ للامام مسلم، الضعفاء للنسائی، الکامل لابن عدی، الضعفاء للعقیلی، المجروحین لابن حبان اور میری کتاب "الاسانید الصحیحہ فی اخبار الامام ابی حنیفہ" میں ہے۔

پانچویں صدی ہجری سے لے کر بعد والے زمانوں میں عام اہلِ حدیث علماء (محدثین) کے نزدیک امام ابوحنیفہ فقہ کے ایک مشہور امام تھے اور یہی راجح ہے۔

حافظ ابن حجر العسقلانی نے فرمایا: "فقیه مشهور" یعنی امام ابوحنیفہ مشہور فقیہ تھے۔

(دیکھئے تقریب التہذیب: ۷۱۵۳)

امام یزید بن ہارون الواسطی (متوفی ۲۰۶ھ) رحمہ اللہ نے فرمایا: "أدركت الناس فما رأيت أحدًا أعقل ولا أفضل ولاأورع من أبي حنيفة" میں نے (بہت سے) لوگوں کو دیکھا ہے لیکن ابوحنیفہ سے زیادہ عقل والا، افضل اور نیک کوئی بھی نہیں دیکھا۔ (تاریخ بغداد ج ۱۳ص ۳۶۴ وسندہ صحیح)

سنن ابی داود کے مصنف امام ابوداود سجستانی رحمہ اللہ نے فرمایا: "رحم الله مالكًا كان إمامًا، رحم الله الشافعي كان إمامًا، رحم الله أبا حنيفة كان إمامًا" مالک (بن انس) پر اللہ رحم کرے وہ امام تھے، شافعی پر اللہ رحم کرے وہ امام تھے، ابوحنیفہ پر اللہ رحم کرے وہ امام تھے۔ (الانتقاء لابن عبدالبر ص ۳۲ وسندہ صحیح، الاسانید الصحیحہ ص ۸۲)

ان کے علاوہ حکم بن ہشام الثقفی، قاضی عبداللہ بن شبرمہ، شقیق البلخی، عبدالرزاق بن ہمام صاحب المصنف، حافظ ابن عبدالبر اور حافظ ذہبی وغیرہم سے امام ابوحنیفہ کی تعریف و ثناء ثابت ہے۔

تنبیہ: حدیث میں ثقہ ہونا یا نہ ہونا، حافظے کا قوی ہونا یا نہ ہونا یہ علیحدہ مسئلہ ہے جس کی مفصل تحقیق ''الاسانید الصحیحہ'' میں مرقوم ہے۔ بطورِ خلاصہ عرض ہے کہ جمہور محدثین نے (جن کی تعداد ایک سو سے زیادہ ہے) امام صاحب پر حافظے وغیرہ کی وجہ سے جرح کی ہے۔

ماہنامہ الحدیث حضرو، وغیرہ میں ہم نے اپنا منہج بار بار واضح کر دیا ہے کہ اگر محدثین کرام کے درمیان کسی راوی کے بارے میں جرح وتعدیل کا اختلاف ہو تو ہمارے نزدیک، تطبیق نہ ہونے کی صورت میں ہمیشہ جمہور محدثین کو ترجیح حاصل ہوتی ہے۔

باقی تینوں امام حدیث میں ثقہ اور فقہ میں امام تھے۔ رحمہم اللہ اجمعین

۲: اگر چار امام برحق ہونے کا یہ مطلب ہے کہ لوگوں پر ان چاروں میں سے صرف ایک امام کی تقلید واجب یا جائز ہے، تو یہ مطلب کئی وجہ سے باطل ہے:

① عربی لغت میں ''بے سوچے سمجھے یا بے دلیل پیروی'' کو تقلید کہتے ہیں۔ دیکھئے القاموس الوحید (ص ۱۳۴۶) اور میری کتاب: ''دین میں تقلید کا مسئلہ'' ص ۷

بے دلیل پیروی قرآن مجید کی رُو سے ممنوع ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ﴾ اور جس کا تجھے علم نہ ہو، اُس کی پیروی نہ کر۔

(سورۃ بنی اسرائیل: ۳۶)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ تقلید نہیں کرنی چاہئے۔

نیز دیکھئے المستصفی من علم الاصول للغزالی (۳۸۹/۲) اعلام الموقعین لابن القیم (۱۸۸/۲) اور الرد علی من اخلد الی الارض للسیوطی (ص ۱۲۵، ۱۳۰)

② رسول اللہ ﷺ کی کسی حدیث میں ائمۂ اربعہ میں سے صرف ایک امام کی تقلید کا کوئی

ثبوت موجود نہیں ہے لہٰذا مروّجہ تقلید بدعت ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ (صحیح مسلم: ۸۶۸، دارالسلام: ۲۰۰۵)

③ صحابۂ کرام سے مروّجہ تقلید ثابت نہیں بلکہ بعض صحابہ سے صراحتاً تقلید کی ممانعت ثابت ہے۔ مثلاً سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: دین میں لوگوں کی تقلید نہ کرو.... الخ

(السنن الکبریٰ للبیہقی ۲/۱۰، وسندہ صحیح، دین میں تقلید کا مسئلہ ص ۳۵)

سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے فرمایا: رہا عالم کی غلطی کا مسئلہ تو اگر وہ سیدھے راستے پر بھی ہو تو اپنے دین میں اُس کی تقلید نہ کرو۔ الخ

(کتاب الزہد للامام وکیع بن الجراح ج ۱ ص ۲۹۹، ۳۰۰ ح ۷۱ وسندہ حسن، دین میں تقلید کا مسئلہ ص ۳۶)

④ اس پر اجماع ہے کہ مروّجہ تقلید ناجائز ہے۔

دیکھئے النبذۃ الکافیۃ فی احکام اصول الدین لابن حزم (ص ۷۱) الرد علیٰ من اخلد الی الارض للسیوطی (ص ۱۳۱، ۱۳۲) اور دین میں تقلید کا مسئلہ (ص ۳۴، ۳۵)

⑤ تابعین کرام میں سے کسی سے بھی مروّجہ تقلید ثابت نہیں بلکہ ممانعت ثابت ہے۔ مثلاً امام شعبی نے فرمایا: یہ لوگ تجھے رسول اللہ ﷺ کی جو حدیث بتائیں تو اسے پکڑ لو اور جو بات وہ اپنی رائے سے کہیں، اُسے کوڑے کرکٹ پر پھینک دو۔

(مسند الدارمی ۱/۶۷ ح ۲۰۶ وسندہ صحیح)

حکم بن عتیبہ رحمہ اللہ نے فرمایا: لوگوں میں سے ہر آدمی کی بات آپ لے بھی سکتے ہیں اور رد بھی کر سکتے ہیں سوائے نبی ﷺ کے [یعنی آپ کی ہر بات لینا فرض ہے۔]

(الاحکام لابن حزم ۶/۲۹۳ وسندہ صحیح)

ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کے سامنے کسی نے سعید بن جبیر رحمہ اللہ کا قول پیش کیا تو انھوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ کی حدیث کے مقابلے میں تم سعید بن جبیر کے قول کو کیا کرو گے؟

(الاحکام لابن حزم ۶/۲۹۳ وسندہ صحیح)

⑥ لوگوں کے مقرر کردہ ان چاروں اماموں سے بھی مروّجہ تقلید کا جواز یا وجوب ثابت نہیں

بلکہ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا: ''ولا تقلدوني'' اور تم میری تقلید نہ کرو۔

(آداب الشافعی ومناقبہ لابن ابی حاتم ص ۵۱ وسندہ حسن، دین میں تقلید کا مسئلہ ص ۳۸)

مزید عرض ہے کہ امام شافعی نے اپنی اور دوسروں کی تقلید سے منع فرمایا تھا۔
دیکھئے مختصر المزنی (ص ۱)

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے فرمایا: اپنے دین میں تُو اِن میں سے کسی ایک کی بھی تقلید نہ کر۔ (مسائل ابی داود ص ۲۷۷)

بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ ''یہ ممانعت صرف مجتہدین کے لئے ہے'' بے دلیل ہونے کی وجہ سے باطل اور مردود ہے۔

⑦ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا: اے یعقوب (ابو یوسف)! تیری خرابی ہو، میری ہر بات نہ لکھا کر، میری آج ایک رائے ہوتی ہے اور کل بدل جاتی ہے۔ کل دوسری رائے ہوتی ہے تو پھر پرسوں وہ بھی بدل جاتی ہے۔

(تاریخ یحییٰ بن معین، روایۃ الدوری ۲/۶۰۷ ت ۲۴۶۱ وسندہ صحیح، دین میں تقلید کا مسئلہ ص ۳۹)

مشہور ثقہ راوی قاضی حفص بن غیاث النخعی الکوفی (متوفی ۱۹۴ھ) نے فرمایا:

''كنت أجلس إلى أبي حنيفة يفتي في المسئلة الواحدة بخمسة أقاويل في اليوم الواحد، فلما رأيت ذلك تركته و أقبلت على الحديث'' .

میں ابوحنیفہ کے پاس بیٹھتا تو ایک دن میں ہی انھیں ایک مسئلے کے بارے میں پانچ اقوال کہتے ہوئے سنتا، جب میں نے یہ دیکھا تو انھیں ترک کر دیا (یعنی چھوڑ دیا) اور حدیث (پڑھنے) کی طرف متوجہ ہو گیا۔ (کتاب السنۃ لعبداللہ بن احمد بن حنبل: ۳۱۶ وسندہ صحیح)

حفص بن غیاث سے اس روایت کے راوی عمر بن حفص بن غیاث ثقہ تھے۔ دیکھئے کتاب الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم (۶/۱۰۳ ت ۵۴۴ نقلہ عن ابیہ ابی حاتم الرازی قال: کوفي ثقة) اُن پر جرح مردود ہے۔

عمر بن حفص کے شاگرد ابراہیم بن سعید الجوہری ابو اسحاق ثقہ ثبت تھے۔ دیکھئے تاریخ

بغداد (۶/۹۳ ت ۳۱۲۷) اور الاسانید الصحیحہ (ص ۱۴) اُن پر ابن خراش رافضی کی جرح مردود ہے۔

ابراہیم الجوہری رحمہ اللہ اس روایت میں منفرد نہیں بلکہ احمد بن یحییٰ بن عثمان نے اُن کی متابعتِ تامہ کر رکھی ہے۔

دیکھئے کتاب المعرفۃ والتاریخ للامام یعقوب بن سفیان الفارسی (ج ۲ ص ۷۸۹)

اگر احمد بن یحییٰ بن عثمان کا ذکر کاتب کی غلطی نہیں تو عرض ہے کہ یعقوب بن سفیان سے مروی ہے کہ میں نے ہزار اور زیادہ اساتذہ سے حدیث لکھی ہے اور سارے ثقہ تھے۔ الخ

(تہذیب الکمال ج ۱ ص ۴۶، مختصر تاریخ دمشق لابن عساکر، اختصار ابن منظور ۳/۱۰۶، ترجمہ احمد بن صالح المصری)

تاریخ دمشق کا مذکورہ ترجمہ نسخۂ مطبوعہ میں موجود نہ ہونے کی وجہ سے اس قول کی سند نہیں مل سکی اور یہ قول اختصار کے ساتھ تاریخ بغداد (۴/۱۹۹، ۲۰۰ وسندہ صحیح) وغیرہ میں موجود ہے۔ واللہ اعلم نیز دیکھئے التنکیل لما فی تانیب الکوثری من الأباطیل (۱/۲۴)

⑧ بعد کے علماء نے بھی مروّجہ تقلید سے منع فرمایا ہے مثلاً امام ابومحمد القاسم بن محمد بن القاسم القرطبی رحمہ اللہ (متوفی ۲۷۶ھ) نے مقلدین کے رد میں ایک کتاب لکھی ہے۔

دیکھئے سیر اعلام النبلاء (۱۳/۳۲۹ ت ۱۵۰) اور دین میں تقلید کا مسئلہ (ص ۳۹)

حافظ ابن حزم نے کہا: اور تقلید حرام ہے۔ (النبذۃ الکافیہ فی احکام اصول الدین ص ۷۰)

عینی حنفی (!) نے کہا: پس مقلد غلطی کرتا ہے اور مقلد جہالت کا ارتکاب کرتا ہے اور ہر چیز کی مصیبت تقلید کی وجہ سے ہے۔ (البنایہ شرح الہدایہ ج ۱ ص ۳۱۷)

⑨ دینِ اسلام میں ایسی کوئی دلیل نہیں ہے کہ امام ابوحنیفہ کی تقلید کرنے والے پر امام شافعی وغیرہ کی تقلید حرام ہے۔

⑩ مروّجہ تقلید کی وجہ سے اُمت میں بڑا انتشار اور اختلاف ہوا ہے۔

مثلاً دیکھئے الفوائد البہیہ (ص ۱۵۲، ۱۵۳) میزان الاعتدال (۴/۵۲) فتاویٰ البزازیہ (۴/۱۱۲) اور دین میں تقلید کا مسئلہ (۸۹، ۹۰)

مزید تفصیل کے لئے اعلام الموقعین وغیرہ بہترین کتابوں کا مطالعہ کرنا مفید ہے۔

درج بالا جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ فقیہ ہونے کے لحاظ سے چاروں امام اور دوسرے ہزاروں لاکھوں ثقہ صحیح العقیدہ امام برحق تھے مگر دین میں مروّجہ تقلید کسی ایک کی بھی جائز نہیں اور لوگوں پر یہ فرض ہے کہ سلف صالحین کے فہم کی روشنی میں قرآن وحدیث اور اجماع پر عمل کریں اور مروّجہ تقلیدی مذاہب سے اپنے آپ کو دُور رکھیں کیونکہ ان تقلیدی مذاہب کے اماموں کی پیدائش سے پہلے اہلِ سنت کا مذہب دنیا میں موجود تھا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا: ابوحنیفہ، مالک، شافعی اور احمد بن حنبل کے پیدا ہونے سے پہلے اہلِ سنت وجماعت کا مذہب قدیم ومشہور ہے کیونکہ یہ صحابہ کا مذہب ہے۔

(منہاج السنۃ ج ۱ ص ۲۵٦، دین میں تقلید کا مسئلہ ص ٦۳)

طہارت کے مسائل

پانی کی نجاست کا مسئلہ

سوال فقہ حنفی میں پانی کی نجاست کو دُور کرنے کے لئے ہدایات ہیں۔ قرآن وحدیث سے یہ مسئلہ حل کریں کہ فلاں چیز (چوہا وغیرہ) گرنے سے کنویں سے اتنے ڈول نکالنے چاہئیں۔ (سید عبدالناصر، ضلع مردان)

الجواب اس بات پر اجماع ہے کہ اگر نجاست پڑنے سے پانی کا رنگ، ذائقہ اور بو بدل جائے تو پانی ناپاک ہو جاتا ہے۔ دیکھئے الاجماع لابن المنذر (ص ۳۳، نص ۱۱، ۱۲)

لہٰذا ایسی صورت میں اتنا پانی نکالا جائے کہ رنگ، ذائقہ اور بُو صحیح ہو جائے۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جس کنویں میں چوہا گر کر مر جائے تو اس کنویں کا پانی نکالا جائے گا۔ (شرح معانی الآثار للطحاوی ج ۱ ص ۷ اوسندہ حسن، وآثار السنن ح ۱۱، وقال: "إسنادہ حسن")

چوہے کو نکالنے کے بعد، اب اتنا پانی نکالا جائے کہ اوصافِ ثلاثہ صحیح ہو جائیں اور اگر اوصافِ ثلاثہ پہلے سے صحیح ہوں تو کنویں والوں کو اختیار ہے کہ اپنے اجتہاد سے جتنے ڈول نکالنا چاہیں نکال لیں۔ یاد رہے کہ صاحب ہدایہ مُلا مرغینانی کی یہ بات سخت مضحکہ خیز اور بلا دلیل ہے کہ اگر کنویں میں چوہا گر کر مر جائے تو بیس ڈول نکالے جائیں گے اور اگر کبوتر گر کر مر جائے تو چالیس ڈول نکالے جائیں گے۔

دیکھئے الہدایہ (ج ۱ ص ۴۲، ۴۳ باب الماء الذی یجوز بہ الوضوء ومالا یجوز بہ)

معلوم ہوا کہ حنفیہ کے نزدیک چوہے کی بہ نسبت کبوتر زیادہ نجس ہے۔ واللہ اعلم

[شہادت، دسمبر ۲۰۰۱ء]

جیب میں اذکار کی کتاب اور طہارت

سوال اگر کسی کی جیب میں اللہ کا نام، قرآن کی کوئی سورت یا دعاؤں کی کتاب ہو تو وہ پیشاب، پاخانے کے لئے جا سکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ اس قسم کی روایات (کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم) انگوٹھی اتارتے تھے سب کی سب ضعیف ہیں۔ (حبیب اللہ، پشاور)

الجواب: انگوٹھی اتارنے والی روایت ضعیف ومنکر ہے دیکھئے سنن ابی داود (ح ۱۹ نیل المقصود) وغیرہ، باقی امور کے بارے میں خود اجتہاد کرلیں۔ بہتر یہی ہے کہ سورتوں وغیرہ کو کسی محفوظ جگہ رکھ کر ہی بیت الخلاء میں داخل ہوں۔ واللہ اعلم [شہادت جنوری ۲۰۰۲ء]

بیت الخلاء اور انگوٹھی اُتارنا

سوال: ایک روایت میں آیا ہے کہ نبی ﷺ جب بیت الخلاء میں داخل ہوتے تو اپنی انگوٹھی (جس پر محمد رسول اللہ لکھا ہوا تھا۔ ﷺ) اُتار دیتے تھے۔
کیا یہ روایت صحیح ہے؟ (طارق مجاہد یزمانی)

الجواب: بیت الخلاء جانے سے پہلے انگوٹھی اُتارنے والی روایت درج ذیل سند سے مروی ہے: ''همام عن ابن جريج عن الزهري عن أنس'' رضي الله عنه

(سنن ابی داود: ۱۹، وقال: ''هذا حديث منكر'' سنن الترمذی: ۱۷۴۶، وقال: ''هذا حديث حسن صحيح غريب'' الشمائل للترمذی: ۹۳ سنن النسائی ۱۷۸/۸ ح ۵۲۱۶ سنن ابن ماجہ: ۳۰۳، السنن الکبریٰ للبیہقی ۹۵/۱ وقال: ''وهذا شاهد ضعيف والله أعلم'' أي حديث همام، اخبار اصبہان ۱۱۱/۲)

ابن جریج مشہور مدلس تھے۔ دیکھئے طبقات المدلسین (۸۳/۳) تقریب التہذیب (۴۱۹۳) جامع التحصیل (ص ۱۰۸) کتاب المدلسین لابی زرعۃ ابن العراقی (۴۰) المدلسین للسیوطی (۳۶) سوالات الحاکم النیسابوری للدارقطنی (۲۶۵) علل الحدیث لابن ابی حاتم (۲۰۷۸) اور سوالات البرذعی (ص ۴۴۳ قول ابی مسعود احمد بن الفرات)

ابن جریج مدلس کی یہ روایت عــــن سے ہے اور عام طالب علموں کو بھی معلوم ہے کہ (غیر صحیحین میں) مدلس کی عن والی روایت ضعیف ہوتی ہے لہٰذا یہ روایت ضعیف ہے۔
ابن جریج کی تدلیس کے باوجود امام ترمذی کا اسے ''حسن صحیح غریب'' کہنا عجیب وغریب ہے۔ حافظ منذری کا ''رواتـــه ثقـات أثبـات'' کی وجہ سے اسے صحیح کہنا بھی نا قابلِ فہم ہے۔ مدلس کے عن اور عدمِ تصریحِ سماع کے باوجود اس کی ''تصحیح'' کیونکر صحیح ہوسکتی ہے؟
اگر کسی شخص کو اس روایت میں ابن جریج کے سماع کی تصریح مل گئی ہے تو باحوالہ پیش

کرے بصورتِ دیگر اس روایت سے استدلال کرنا مردود ہے۔ (۱۴۲۷/۱۱/۴ھ)

[الحدیث:۳۲]

قبلہ رُخ ہو کر پیشاب کرنا منع ہے

سوال قبلہ کی طرف منہ یا پیٹھ کر کے پیشاب کرنے سے نبی ﷺ نے منع فرمایا ہے، کیا یہ حدیث صحیح ہے؟ نیز اگر رکاوٹ یعنی دیوار ہو یا درخت یا جھاڑی سامنے ہو تو پھر کیا حکم ہے؟ وضاحت فرمائیں۔ جزاک اللہ خیراً (قاری سعید الحسن، اسلام گڑھ)

الجواب جی ہاں یہ حدیث بالکل صحیح ہے اور صحیحین (بخاری:۳۹۴ ومسلم:۲۶۴) میں موجود ہے، اگر رکاوٹ (اوٹ) ہو یا درخت وغیرہ تب بھی قبلہ کی طرف منہ نہ کریں۔ رہا پیٹھ کرنا تو یہ مجبوری میں جائز ہے اور افضل یہی ہے کہ پیٹھ بھی نہ کریں۔

[شہادت، نومبر ۲۰۰۰ء]

حالتِ جنابت اور قرآن کی قراءت

سوال درج ذیل حدیث کی تحقیق کیا ہے:

سیدنا علی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب تک غسل کی حاجت والے نہ ہوتے ہمیں قرآن پڑھاتے تھے۔

(صلوٰۃ الرسول مع القول المقبول ص ۱۲۷ حدیث:۵۸ بحوالہ سنن ترمذی حدیث:۱۴۶ سنن ابی داود حدیث:۲۲۹)

شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف کہا ہے۔ حافظ عبدالرؤف حفظہ اللہ نے بھی تفصیلی بحث کے ساتھ اس حدیث پر ضعیف کا حکم لگایا ہے۔ جبکہ آپ نے تسہیل الوصول الیٰ تخریج صلوۃ الرسول میں اسے حسن قرار دیا۔ تفصیل سے وضاحت کریں، صحیح موقف کیا ہے؟

(محمد محسن سلفی، کراچی)

الجواب روایت مذکورہ کو ابوداود (۲۲۹) نسائی (۲۶۷) اور ابن ماجہ (۵۹۴) نے شعبہ سے اور ترمذی (۱۴۶) نے اعمش اور (محمد بن عبدالرحمٰن) بن ابی لیلیٰ سے، ان تینوں

نے عمرو بن مرہ عن عبداللہ بن سلمہ عن علی رضی اللہ عنہ کی سند سے بیان کرتے ہیں۔

اس روایت کو ترمذی نے ''حسن صحیح'' اور ابن خزیمہ (۲۰۸) ابن حبان (الموارد: ۱۹۲، ۱۹۳) ابن الجارود (۹۴) حاکم (۱۰۷/۴) اور ذہبی وغیرہم نے صحیح کہا ہے۔

حافظ ابن حجر العسقلانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

''والحق أنه من قبل الحسن يصلح بالحجة''

اور حق یہ ہے کہ یہ روایت حسن کی قسم سے ہے (اور) استدلال کے لئے مناسب ہے۔

(فتح الباری ج ۱ ص ۴۰۸ ح ۳۰۵)

بعض لوگوں نے اس حدیث پر دو طرح سے جرح کی ہے:

۱۔ عبداللہ بن سلمہ کا تفرد

اس کا جواب یہ ہے کہ عبداللہ بن سلمہ کو یعقوب بن شیبہ، العجلی المعتدل، ابن عدی اور جمہور محدثین نے موثق (ثقہ، صدوق وغیرہ) قرار دیا ہے لہٰذا ابو حاتم اور ابو احمد الحاکم الکبیر کی جرح مردود ہے۔

۲۔ عبداللہ بن سلمہ کا اختلاط

اس کا جواب یہ ہے کہ اس اختلاط کا علم عبداللہ مذکور کے شاگرد عمرو بن مرہ سے ہوا ہے اور اس حدیث کے راوی بھی عمرو بن مرہ ہی تھے لہٰذا یہ دلیل ہے کہ عمرو بن مرہ (ثقہ امام) نے عبداللہ بن سلمہ مذکور سے یہ روایت قبل از اختلاط ہی سنی ہے۔ محدثین کرام کا اسے صحیح وحسن قرار دینا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے نزدیک یہ روایت عبداللہ بن سلمہ نے اختلاط سے پہلے بیان کی ہے۔

الکامل لابن عدی میں ہے: ''وقال شعبة روى هذا الحديث عبد الله بن سلمة بعد ما كبر'' اور شعبہ نے کہا: عبداللہ بن سلمہ نے یہ حدیث بوڑھا ہونے کے بعد بیان کی ہے۔ (۱۴۸۷/۴)

یہ قول دو وجہ سے مردود ہے:

اول: بے سند ہے۔

دوم: اگر اسے احمد بن حنبل عن سفیان بن عیینہ کی سند سے منسوب کیا جائے تو ابن ابی عصمہ کی توثیق اور ابن عیینہ کی تصریح سماع مطلوب ہے، امام شعبہ سے اس قول کے برعکس بھی مروی ہے۔ابن خزیمہ (ج ا ص ۱۰۴) نے صحیح سند سے نقل کیا کہ شعبہ نے کہا: ''هذا ثلث رأس مالي'' یہ (حدیث) میرے سرمائے کا ایک تہائی ہے۔

دارقطنی (ج ا ص ۱۱۹ ح ۴۲۳) نے حسن سند کے ساتھ شعبہ سے نقل کیا: ''ما أحدث بحديث أحسن منه'' میں اس حدیث سے بہتر کوئی حدیث بیان نہیں کرتا۔

سنن الدارقطنی (۱/۱۱۸ ح ۴۱۹) اور السنن الکبری للبیہقی (۱/۸۹) میں ابوالغریف عن علی کی سند سے موقوفاً مروی ہے کہ جنبی شخص قرآن سے ایک حرف بھی نہ پڑھے۔(ملخصاً)

دارقطنی نے کہا: ''هو صحيح عن علي''

ابوالغریف عبیداللہ بن خلیفہ الہمدانی کو ابن حبان اور دارقطنی وغیرہما نے موثق قرار دیا ہے۔

اس پر صرف ابوحاتم الرازی نے جرح کی ہے جو کہ جمہور کی توثیق کے مقابلے میں مردود ہے۔امام دارقطنی کے قول ''هو صحيح عن علي'' کے باوجود ابواسحاق الحوینی المصری صاحب یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ ''لم یوثقه سوا ابن حبان'' اسے ابن حبان کے سوا کسی نے ثقہ قرار نہیں دیا۔ (دیکھئے غوث المکدود تخریج منتقی ابن الجارود ج ا ص ۹۷)

ابوالغریف مذکور کے بارے میں حافظ ابن حجر نے لکھا ہے: ''صدوق رمي بالتشيع''

(تقریب التہذیب ص ۲۲۴)

یہ روایت مسند احمد (۱/۱۱۰ ح ۸۷۲) اور مسند ابی یعلیٰ (۱/۳۰۰ ح ۳۶۵) میں بھی بقول راجح: موقوفاً ہی مروی ہے۔ والحمد للہ

خلاصہ: عبداللہ بن سلمہ کی روایت حسن لذاتہ ہے اور ابوالغریف وغیرہ کے شواہد کی رو سے صحیح لغیرہ ہے۔

تنبیہ: راقم الحدیث کی صرف وہی کتاب معتبر ہے جس کے آخر میں میرے دستخط ہیں یا

اُسے مکتبۃ الحدیث حضرو/ مکتبہ اسلامیہ لاہور، فیصل آباد سے شائع کیا گیا ہے۔

[شہادت، مئی ۲۰۰۳ء]

جنابت اور حیض کی حالت میں قرآن کی تلاوت اور مسجد میں داخلہ

سوال براہِ مہربانی ایک سوال کا جواب (ماہنامہ) الحدیث میں شائع فرمادیں۔ کیا جنابت اور حیض کی حالت میں قرآن پڑھنا اور مسجد میں داخل ہونا حرام ہے؟

(عابدہ پروین، لاہور)

الجواب یہ سوال درج ذیل صورتوں پر مشتمل ہے:

۱: حالتِ جنابت میں قرآنِ مجید پڑھنا ۲: حالتِ حیض میں قرآن مجید پڑھنا

۳: جنبی کا مسجد میں داخل ہونا ۴: حائضہ کا مسجد میں داخل ہونا

مندرجہ بالا صورتوں کے جوابات بالترتیب درج ذیل ہیں:

① حالتِ جنابت میں قرآنِ مجید پڑھنا جائز نہیں ہے۔ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن پڑھنے سے، جنابت کے علاوہ کوئی چیز نہیں روکتی تھی۔ (سنن ابی داود: ۲۲۹، وسندہ حسن لذاتہ، وصححہ الترمذی: ۱۴۶، وابن خزیمہ: ۲۰۸، وابن حبان، الاحسان: ۹۹/۷۹۶، الموارد: ۱۹۲، ۱۹۳، وابن الجارود: ۹۴، والحاکم ۴/۱۰۷ ح ۷۰۸۳ والذہبی والبغوی فی شرح السنۃ ۲/۴۲ ح ۲۷۳ وابن السکن وعبدالحق الاشبیلی کما فی التلخیص الحبیر ۱/۱۳۹ ح ۱۸۹)

اس حدیث کے راوی امام شعبہ نے فرمایا: ''هذا ثلث رأس مالي'' یہ (حدیث) میرے سرمائے کا ایک تہائی ہے۔ (صحیح ابن خزیمہ ۱/۱۰۴ ح ۲۰۸ وسندہ صحیح)

امام شعبہ سے اس کے خلاف کچھ بھی ثابت نہیں ہے۔

حافظ ابن حجر العسقلانی نے فرمایا: ''والحق أنه من قبيل الحسن يصلح للحجة'' اور حق یہ ہے کہ یہ (حدیث) حسن کی قسم سے ہے، حجت ہونے کے لائق ہے۔

(فتح الباری ۱/۴۰۸ ح ۳۰۵)

اس حدیث کے راوی عبداللہ بن سلمہ کی توثیق جمہور محدثین سے ثابت ہے اور

ائمہ کرام کی اس تصحیح سے واضح ہوا کہ انھوں نے یہ حدیث اختلاط سے پہلے بیان کی ہے۔

ایک دوسری سند کے ساتھ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے موقوفاً ثابت ہے کہ قرآن مجید اس وقت تک پڑھو جب تک جنبی نہ ہو جاؤ اور اگر جنابت لاحق ہو جائے تو پھر ایک حرف (بھی) نہ پڑھو۔

(سنن الدارقطنی ۱/۱۱۸ ح ۴۱۹ وقال: ''صحیح عن علی'' وسندہ حسن)

یعنی تمھیں قرآنِ مجید پڑھنے سے جنابت کے علاوہ کوئی چیز نہ روکے، تو معلوم ہوا کہ جنابت کی صورت میں قرآنِ مجید پڑھنا نہیں چاہئے۔

مشہور تابعی ابووائل شقیق بن سلمہ نے فرمایا: جنبی اور حائضہ (دونوں) قرآن نہ پڑھیں۔

(مصنف ابن ابی شیبہ ۱/۱۰۲ ح ۱۰۸۵، وسندہ صحیح)

ان کے مقابلے میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کے نزدیک جنبی کے لئے ایک دو آیتیں پڑھنا جائز ہے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ بحوالہ تغلیق التعلیق ۲/۱۷۲، وسندہ صحیح، عمدۃ القاری ۳/۲۷۴، نیز دیکھئے مصنف ابن ابی شیبہ مطبوع ۱/۱۰۲ ح ۱۰۸۹، اور صحیح بخاری قبل ح ۳۰۵)

امام محمد بن علی الباقر کے نزدیک بھی جنبی کا ایک دو آیتیں پڑھنا جائز ہے۔ دیکھئے مصنف ابن ابی شیبہ (۱/۱۰۲ ح ۱۰۸۸، وسندہ صحیح)

خلاصۃ التحقیق: راجح یہی ہے کہ جنبی کے لئے قرآنِ مجید کی تلاوت جائز نہیں ہے تاہم وہ مسنون اذکار مثلاً وضو سے پہلے ''بسم اللّٰہ'' پڑھ سکتا ہے جیسا کہ دوسرے دلائل سے ثابت ہے۔ آپ ﷺ ہر وقت اللہ کا ذکر فرماتے تھے۔ دیکھئے صحیح مسلم (۳۷۳)

④ حالتِ حیض میں قرآنِ مجید پڑھنا جائز نہیں ہے۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جنبی اور حائضہ (عورت) قرآن میں سے کچھ بھی نہ پڑھیں۔ (سنن الترمذی: ۱۳۱، وسنن ابن ماجہ: ۵۹۵، وسندہ ضعیف)

لیکن یہ روایت اسماعیل بن عیاش کی غیر شامیوں سے روایت کی وجہ سے ضعیف ہے۔ دیکھئے سنن الترمذی (۱۳۱ بتحقیقی)

بعض علماء کے نزدیک حائضہ کا قرآن مجید پڑھنا (مشروط) جائز ہے اور بعض علماء اسے

ناجائز سمجھتے ہیں جن میں سے ابو وائل رحمہ اللہ کا قول گزر چکا ہے۔ بعض علماء کے نزدیک حائضہ (اگر حافظہ ہے تو اس) کے لئے قراءتِ قرآن جائز ہے ورنہ وہ قرآن بھول سکتی ہے۔ دیکھئے خواجہ محمد قاسم رحمہ اللہ کی کتاب "قد قامت الصلوۃ" (ص ۹۶)

خلاصۃ التحقیق: حائضہ کے لئے تلاوتِ قرآن جائز نہیں ہے لیکن اگر وہ حافظہ یا معلّمہ ہو تو حالتِ اضطرار کی وجہ سے اس کے لئے یہ عمل جائز ہے۔ واللہ اعلم

③ جنبی کا مسجد میں داخل ہونا (بغیر شرعی عذر کے) جائز نہیں ہے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((فإني لا أحل المسجد لحائض و لا جنب.)) پس بے شک میں مسجد کو حائضہ اور جنبی کے لئے حلال قرار نہیں دیتا۔ (سنن ابی داود: ۲۳۲ وسندہ حسن، صحیح ابن خزیمہ: ۱۳۲۷)

اس حدیث کی راویہ جسرہ بنت دجاجہ کی حدیث قولِ راجح میں حسن کے درجے سے نہیں گرتی اور افلت بن خلیفہ العامری صدوق ہیں، ان پر جرح مردود ہے۔

ایک مشہور حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب اعتکاف کی حالت میں مسجد میں ہوتے تو اپنا سر مبارک باہر نکالتے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے حجرے سے ہی آپ کے سر مبارک کی کنگھی کرتی تھیں اور وہ حالتِ حیض میں ہوتی تھیں۔ (دیکھئے صحیح البخاری: ۲۹۶)

اس سے بھی جسرہ بنت دجاجہ کی حدیث کے بعض مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ بعض علماء نے سورۃ النساء کی آیت: ۴۳ ﴿ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ﴾ سے استدلال کیا ہے کہ اگر جنبی کا راستہ ہی مسجد میں سے ہے تو وہ (غسل وغیرہ کے لئے) گزر سکتا ہے۔

④ حائضہ کا بھی مسجد میں داخل ہونا جائز نہیں ہے۔ اس کی دلیل شق نمبر ۳ کے تحت گزر چکی ہے۔ والحمد للہ (۲۸/مئی ۲۰۰۷ء)

[الحدیث: ۳۹]

حائضہ اور جنبی کا مسجد میں داخلہ؟

سوال میں حائضہ عورت اور جنبی کا مسجد میں آنا حلال نہیں کرتا (عن عائشہ رضی اللہ عنہا / سنن ابی داود: ۲۳۲) آپ نے اسے حسن کہا ہے۔ جبکہ شیخ البانی رحمہ اللہ اور حافظ عبدالرؤف نے ضعیف کہا ہے۔ مفصل دلائل سے آپ اپنا ''حسن'' کا حکم ثابت کریں؟

(محسن سلفی، کراچی)

الجواب روایت مذکورہ کو امام بیہقی نے السنن الکبری (۴۴۲/۲، ۴۴۳) میں ابوداود کی سند سے روایت کیا ہے اور اسے ابن خزیمہ (۱۳۲۷) اور ابن سید الناس نے صحیح قرار دیا ہے۔ ابن القطان الفاسی اسے حسن قرار دیتے تھے جبکہ ابن حزم اور عبدالحق الاشبیلی اسے ضعیف سمجھتے تھے۔

یہ روایت افلت بن خلیفہ نے جسرہ بنت دجاجہ: سمعت عائشہ رضی اللہ عنہا کی سند سے بیان کی ہے۔ راقم الحروف کے نزدیک یہ سند حسن ہے۔

افلت بن خلیفہ کے بارے میں احمد بن حنبل نے ''ما أری به بأسًا'' اور دارقطنی نے صالح کہا۔ ابن حبان نے الثقات میں ذکر کیا۔ ابن خزیمہ نے ان کی حدیث کو صحیح قرار دیا۔

ابوحاتم الرازی نے کہا ''شیخ''

حافظ ذہبی بتاتے ہیں کہ ''شیخ'' کا لفظ نہ جرح ہے اور نہ توثیق اور استقراء سے آپ پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہ (ابوحاتم کے نزدیک) حجت نہیں ہے۔

(میزان الاعتدال ج ۲ ص ۳۸۵ ترجمۃ العباس بن الفضل العدنی)

کسی راوی کا (امام مالک اور شعبہ وغیرہما کی طرح روایت میں) حجت نہ ہونا، مجروح ہونے کی دلیل نہیں ہے بشرطیکہ اس کی توثیق بھی موجود ہو۔ لہذا افلت مذکور کم از کم حسن الحدیث راوی تھے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا: ''صدوق'' (تقریب التہذیب: ۵۴۶)

حافظ ذہبی نے بھی انھیں ''صدوق'' ہی لکھا ہے۔ (الکاشف ۸۵/۱)

ان پر ابن حزم، بغوی اور خطابی کی جرح مردود ہے۔ احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے جرح باسند صحیح ثابت نہیں۔

جسرہ بنت دجاجہ کو امام معتدل العجلی، ابن خزیمہ اور ابن حبان نے ثقہ قرار دیا ہے جبکہ امام بخاری نے فرمایا "عند جسرة عجائب" جسرہ کے پاس عجیب روایتیں ہیں۔

ابن القطان الفاسی کے نزدیک یہ جرح اس روایت کے ساقط ہونے کے لئے کافی نہیں ہے۔

جسرہ پر ابن حزم کی جرح بھی باطل ہے لہذا راجح یہی ہے کہ جسرہ مذکورہ کی روایت حسن ہوتی ہے۔ اس روایت کے بہت سے شواہد بھی ہیں لہذا یہ ان کے ساتھ صحیح لغیرہ ہے۔ والحمد للہ

[شہادت، مئی ۲۰۰۳ء]

غسلِ جنابت میں سر پر پانی ڈالنا

سوال صحیح بخاری کی ایک حدیث میں آتا ہے کہ ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے دو مردوں کے سامنے غسل کیا تھا۔ شیعہ اور منکرین حدیث یہ حدیث بیان کر کے صحیح بخاری پر اعتراض کرتے ہیں، آپ سے درخواست ہے کہ ہمیں اس حدیث کا مفہوم سمجھائیں۔ جزاکم اللہ خیراً (حافظ اسد علی، خیر باڑہ، غازی ضلع ہری پور)

الجواب امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ " حدثنا عبداللہ بن محمد قال: حدثني شعبة قال: حدثني أبوبكر بن حفص قال: سمعت أبا سلمة يقول: دخلت أنا وأخو عائشة على عائشة فسألها أخوها عن غسل النبي ﷺ؟ فدعت بإناء نحو من صاع فاغتسلت وأفاضت على رأسها وبيننا وبينها حجاب "

ابوسلمہ (بن عبدالرحمٰن) فرماتے ہیں کہ: میں اور عائشہ (رضی اللہ عنہا) کا (رضاعی) بھائی (ہم دونوں) عائشہ (رضی اللہ عنہا) کے پاس گئے، آپ کے (رضاعی) بھائی نے نبی ﷺ کے (سر کے) غسل کے بارے میں پوچھا (کہ یہ کیسا تھا؟) تو انھوں (عائشہ رضی اللہ عنہا) نے صاع (ڈھائی کلو) کے برابر (پانی کا) ایک برتن منگوایا پھر انھوں نے غسل کیا اور اپنے سر پر پانی بہایا،

ہمارے اوران کے درمیان پردہ تھا۔ (صحیح بخاری: کتاب الغسل باب الغسل بالصاع ونحوہ، ح ۲۵۱)

اس حدیث کو امام مسلم (۴۲/۳۲۰، دارالسلام: ۷۲۸) نسائی (الصغری ۱/۱۲۷ ح ۲۲۸ والکبری ۱/۱۱۶ ح ۲۳۲) احمد بن حنبل (المسند ۶/۷۱، ۷۲ ح ۲۴۹۳۴، ۶/۱۴۳ ح ۲۵۶۲۰) ابونعیم الاصبہانی (المستخرج علی صحیح مسلم ۱/۳۷۰ ح ۷۲۰) ابوعوانہ (المسند المستخرج ۱/۲۹۵، ۲۹۶) اور بیہقی (السنن الکبری: ۱/۱۹۵) نے شعبہ (بن الحجاج) کی سند سے مختصراً ومطولاً نحو المعنی بیان کیا ہے۔ اس روایت کے مفہوم میں درج ذیل باتیں اہم ہیں:

۱: صحابہ کرام کے دور میں اس بات پر شدید اختلاف ہوگیا تھا کہ غسل جنابت کرتے وقت عورت اپنے سر کے بال کھولے گی یا نہیں، اور یہ کہ غسل کے لئے کتنا پانی کافی ہے، عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ عورتوں کو حکم دیتے تھے کہ غسل کرتے وقت اپنے سر کے بال کھول کر غسل کریں۔ اس پر تعجب کرتے ہوئے امی عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

" یا عجبًا لابن عمرو هذا يأمر النساء إذا اغتسلن أن ينقضن رؤوسهن ، أفلا يأمرهن أن يحلقن رؤوسهن " !؟ ابن عمرو پر تعجب ہے کہ وہ عورتوں کو حکم دیتے ہیں کہ غسل کرتے وقت اپنے سر کے بال کھول دیں کیا وہ انھیں یہ حکم نہیں دے دیتے کہ وہ اپنے سر کے بال منڈوا ہی دیں ؟ (صحیح مسلم: ۳۳۱/۵۹، دارالسلام: ۷۴۷)

۲: سیدنا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کے رد کے لئے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عملاً سر پر پانی ڈال کر سمجھایا کہ بال کھولنا ضروری نہیں ہے۔

۳: محدث ابوعوانہ الاسفرائنی (متوفی ۳۱۶ھ) نے اس حدیث پر درج ذیل باب باندھا ہے: " باب صفة الأواني التي كان يغتسل منها رسول الله ﷺ ، وصفة غسل رأسه من الجنابة ، دون سائر جسده "

رسول اللہ ﷺ کے غسل والے برتنوں کا بیان، اور غسل جنابت میں، باقی سارے جسم کو چھوڑ کر (صرف) سر دھونے کی صفت کا بیان۔ (صحیح ابی عوانہ ۱/۲۹۴)

محدث کبیر کی اس تبویب سے معلوم ہوا کہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے صرف سر دھو کر

دکھایا تھا، باقی جسم دھو کر نہیں دکھایا تھا۔

۴: صحیح مسلم والی روایت میں آیا ہے: " **فأفرغت علٰی رأسها ثلاثًا** "

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے سر پر تین دفعہ (بال کھولے بغیر ہی) پانی بہایا تھا۔ (۳۲۰/۴۲)

باقی جسم کے غسل کا کوئی ذکر اس روایت میں نہیں ہے۔

۵: صحیح بخاری (۲۵۱) اور صحیح مسلم (۳۲۰) میں آیا ہے کہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور شاگردوں کے درمیان (موٹا) پردہ (حجاب، ستر) تھا۔ ایک صحیح حدیث میں آیا ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غسل کر رہے تھے ، **فاطمة ابنته تستره بثوب** ، اور آپ کی بیٹی فاطمہ نے ایک کپڑے کے ذریعے سے آپ کے لئے پردہ کر رکھا تھا۔

(موطا امام مالک ۱/۱۵۲ ح ۳۵۶ تحقیقی ، وصحیح البخاری: ۳۵۷ وصحیح مسلم: ۸۲/۳۳۶ بعد ح ۷۱۹)

یہ ظاہر ہے کہ پردے کے پیچھے نظر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ورنہ پھر پردے کا کیا مقصد ہے؟

۶: سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے رضاعی بھائی عبداللہ بن یزید البصری تھے۔

(ارشاد الساری للقسطلانی ج ۱ ص ۳۱۷)

یا کثیر بن عبید الکوفی تھے۔ (فتح الباری ۱/۳۶۵)

ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوف، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے رضاعی بھانجے تھے۔

(فتح الباری ۱/۳۶۵)

معلوم ہوا کہ یہ دونوں شاگرد، غیر مرد نہیں بلکہ محرم تھے، اسلام میں محرم سے سر، چہرے اور ہاتھوں کا کوئی پردہ نہیں ہے۔

۷: عبدالرحمٰن دیوبندی لکھتے ہیں: "حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہونے والے یہ دونوں محرم تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کے سامنے پردہ ڈال کر غسل کیا اور دونوں نے حضرت عائشہؓ کا سر اور اوپر کا بدن دیکھا جو محرم کو دیکھنا درست ہے لیکن جسم کے باقی اعضاء جن کا مستور رکھنا محرم سے بھی ضروری ہے وہ پردہ میں تھے"

(فضل الباری ج ۲ ص ۴۲۸، از افادات شبیر احمد عثمانی دیوبندی)

۸: غلام رسول سعیدی بریلوی لکھتے ہیں: ''اس حدیث پر منکرین حدیث اعتراض کرتے ہیں کہ ان احادیث کو ماننے سے لازم آتا ہے کہ اجنبی مرد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کرتے تھے اور وہ ان کو غسل کر کے دکھا دیتی تھیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ مرد اجنبی نہ تھے۔ ان میں سے ابو سلمہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے رضاعی بھتیجے تھے اور دوسرے عبداللہ بن یزید آپ کے رضاعی بھائی تھے۔ غرض دونوں محرم تھے، آپ نے حجاب کی اوٹ میں غسل کیا اور ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ازواج مطہرات کپڑوں کے ساتھ غسل کرتی تھیں اور اس سے آپ کا مقصد یہ تھا کہ ان کو شرح صدر ہو جائے کہ اتنی مقدار پانی غسل کے لئے کافی ہوتا ہے۔ علامہ بدرالدین عینی لکھتے ہیں: قاضی عیاض نے کہا: اس حدیث کا ظاہر یہ ہے کہ ان دونوں نے سر اور جسم کے اس بالائی حصہ میں غسل کا عمل دیکھا جس کو دیکھنا محرم کے لئے جائز ہے اور اگر انھوں نے اس عمل کا مشاہدہ نہ کیا ہوتا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پانی منگانے اور ان کی موجودگی میں غسل کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ستر کا انتظام، سر اور چہرے کے نچلے حصے کے لئے کیا تھا جس کو دیکھنا محرم کے لئے جائز نہیں ہے'' (شرح صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۰۱۹، ۱۰۲۹)

خلاصہ یہ کہ اس حدیث میں صرف یہ مسئلہ بیان ہوا ہے کہ غسل میں، سر کے بال کھولے بغیر ہی سر پر تین دفعہ پانی ڈالنا چاہئے، اس حدیث کا باقی جسم کے غسل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وما علینا إلا البلاغ [الحدیث:۲]

غسل جنابت میں سر کا مسح

سوال غسل کے وضو میں سر کے مسح کا کیا حکم ہے؟ (حکیم ابو عامر ایم۔ اے، لاہور)

الجواب بہتر یہی ہے کہ غسل سے پہلے وضو میں سر کا مسح نہ کیا جائے۔

سنن النسائی میں ایک روایت ہے کہ ''حتٰی إذا بلغ رأسه لم یمسح'' حتیٰ کہ جب آپ سر تک پہنچے تو سر کا مسح نہ کیا۔

(باب ترک مسح الرأس فی الوضوء من الجنابۃ ج ۱ ص ۲۰۵، ۲۰۶ ح ۴۲۲ وھو صحیح غریب)

غسل سے فارغ ہونے کے بعد پاؤں دھونے چاہئیں جیسا کہ دوسری احادیث سے ثابت ہے۔ غسل جنابت والی کسی روایت میں سر کے مسح کا ذکر نہیں آیا۔

(دیکھئے فتح الباری ۱/۳۶۳ تحت ح:۲۵۹)

امام احمد بن حنبل بھی غسل جنابت میں سر کے مسح کے قائل نہیں تھے۔ دیکھئے مسائل ابی داود (ص ۱۹ باب الجنب والحائض) اور مالکیہ کا بھی یہی مسلک ہے۔

(۲۳ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ) [الحدیث:۲۷]

کیا منی پاک ہے؟

سوال کیا منی پاک ہے؟ بعض لوگ اہل حدیث کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ وہ منی کو صاف (پاک) قرار دیتے ہیں۔ (محمد جلال محمدی بن عبدالحنان، شرینگل ضلع دیر)

الجواب منی کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔

[ہمارے نزدیک راجح یہ ہے کہ منی ناپاک، پلید اور نجس ہے۔]

حنفیوں کے چچازاد بھائی شوافع اسے پاک سمجھتے ہیں جیسا کہ محمد تقی عثمانی دیوبندی نے کہا:

''منی کی نجاست وطہارت کے بارے میں اختلاف ہے، اس میں حضرات صحابہ کے دَور سے اختلاف چلا آرہا ہے، صحابۂ کرام میں سے حضرت ابن عمرؓ اور ابن عباسؓ اور ائمہ میں سے امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک منی طاہر ہے...'' (درسِ ترمذی ج ۱ ص ۳۴۶)

طاہر پاک کو کہتے ہیں۔ یاد رہے کہ ہمارے نزدیک منی ناپاک ہے جیسا کہ میں نے کئی سال پہلے ایک سوال کے جواب میں لکھا تھا، یہ سوال وجواب درج ذیل ہیں:

سوال ایک مسئلہ جو بریلوی و دیوبندی حضرات بڑا اچھالتے ہیں کہ ''اہلحدیث کے نزدیک منی پاک ہے۔'' منی کے بارے میں مسلکِ اہلِ حدیث واضح فرمائیں اور دلائل بھی ذکر کریں؟ (ایک سائل)

الجواب منی کے بارے میں... محمد رئیس ندوی لکھتے ہیں:

''ہم کہتے ہیں کہ فرقہ بریلویہ اور فرقہ دیوبندیہ کے پیران پیر شیخ عبدالقادرؒ جیلانی نے کہا:

"وهو (أي المني) طاهر في أشهر الروايتين" یعنی ہمارے مذہب میں مشہور ترین روایت کے مطابق منی پاک ہے۔ (غنیۃ الطالبین مترجم ص ۷۰)

اور حنبلی مذہب کی کتاب الانصاف فی معرفۃ الراجح من الخلاف میں صراحت ہے کہ

"ومني الآدمي طاهر هذا المذهب مطلقًا و عليه جماهير الأصحاب إلخ"

یعنی حنبلی مذہب میں مطلقاً آدمی کی منی طاہر ہے اور جمہور اصحاب کا یہی مذہب ہے

(الانصاف فی معرفۃ الراجح من الخلاف ۱/۳۴۰۔۳۴۱)

امام نووی نے کہا: "وذهب كثير إلى أن المني طاهر روي ذلك عن علي بن أبي طالب وسعد بن أبي وقاص وابن عمر وعائشة وداود وأحمد في أصح الروايتين وهو مذهب الشافعي و أصحاب الحديث ..."

یعنی بہت سارے اہل علم منی کو طاہر کہتے ہیں حضرت علی مرتضیٰ وسعد بن ابی وقاص وابن عمر وعائشہ جیسے صحابہ سے یہی مروی ہے اور امام داود ظاہری کا یہی مسلک ہے امام احمد کی صحیح ترین روایت یہی ہے کہ منی پاک ہے امام شافعی واہل حدیث کا یہی مذہب ہے کہ منی پاک ہے (شرح مسلم للنووی باب حکم المنی ج ۱ ص ۱۴۰ والمجموع للنووی ابواب الطہارۃ)

بعض علمائے اہل حدیث طہارت منی کے قائل ہیں اور ان کے اختیار کردہ موقف کی موافقت خلیفہ راشد علی مرتضیٰ اور متعدد صحابہ وتابعین وائمہ دین کئے ہوئے ہیں انھوں نے اپنی ذاتی تحقیق سے اسی موقف کو صحیح سمجھا ہے لیکن امام شوکانی ونواب صدیق اور متعدد محقق سلفی علماء نجاست منی ہی کے قائل ہیں

(نیل الاوطار ج ۱ ص ۶۷، وتحفۃ الاحوذی شرح ترمذی ج ۱ ص ۱۱۴۔۱۱۵ ومرعاۃ شرح مشکوۃ کتاب الطہارۃ ج ۲ ص ۱۹۶ وغایۃ المقصود ج ۱)

دریں صورت فرقہ بریلویہ ودیوبندیہ کا علی الاطلاق اسے غیر مقلدوں کا مذہب قرار دینا محض تقلید پرستی والی تلبیس کاری وکذب بیانی ہے پھر جو مسئلہ صحابہ سے لے کر فرقہ دیوبندیہ وبریلویہ کی ولادت سے پہلے اہل علم کے یہاں مختلف فیہ رہا، اس میں اپنی تحقیق کے

مطابق اسلاف کے کسی بھی موقف کو اختیار کرنے والوں کو نئے مذہب کی طرف دعوت دینے والا قرار دینا جبکہ اسے مذہب کی دعوت قرار دینے والے بذات خود چودھویں صدی میں پیدا ہوئے کون سا طریقہ ہے؟

ہم بھی اس مسئلہ میں امام شوکانی وعام محقق سلفی علماء سے متفق ہیں کہ منی ناپاک ونجس ہے۔'' (ضمیر کا بحران ص ۳۰۹، ۳۱۰)

میں بھی یہی کہتا ہوں کہ منی ناپاک اور نجس ہے۔ اسے پاک کہنا غلط ہے یاد رہے کہ جماہیر الاصحاب سے امام احمد کے شاگرد اور حنابلہ مراد ہیں۔ اور ندوی صاحب کی نقل کردہ عبارات میں مذکور صحابہ کرام میں سے کسی صحابی سے بھی طہارت منی کا قول ثابت نہیں ہے۔

یہ سوال و جواب آپ لوگوں کی خدمت میں دوبارہ پیش کر دیا گیا ہے لہٰذا جھوٹے پروپیگنڈے کرکے اہلِ حدیث کو بدنام کرنے کی کوشش نہ کریں۔ وما علینا إلا البلاغ

(۲۹/ ذوالقعدہ ۱۴۲۹ھ بمطابق ۲۸/نومبر ۲۰۰۸ء)

[الحدیث: ۵۸]

وضو کی فضیلت اور برکات

سوال رسول اللہ ﷺ نے وضو کی فضیلت و برکات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ’’میں قیامت کے روز اپنی امت کے لوگوں کو پہچان لوں گا۔‘‘ کسی نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ یہ کیسے؟ وہاں تو ساری دنیا کے انسان جمع ہوں گے؟ فرمایا: ’’ایک پہچان یہ ہوگی کہ وضو کی وجہ سے میری امت کے چہرے اور ہاتھ جگمگا رہے ہوں گے۔‘‘ (فتح الربانی ۲/۳۵)

یہ روایت کیسی ہے؟ (محمد محسن سلفی، کراچی)

الجواب روایتِ مذکورہ کے مفہوم کی دو روایتیں الفتح الربانی (۲/۳۰) میں موجود ہیں: ① ’’عن نعیم المجمر عن أبي هريرة رضي الله عنه إلخ‘‘

یہ روایت بالکل صحیح ہے اور صحیح بخاری (۱۳۶) وصحیح مسلم (۲۴۶/۳۵،۳۴) میں موجود ہے۔

② عن زر بن حبيش عن عبدالله بن مسعود رضي الله عنه إلخ ‘‘

یہ روایت سنن ابن ماجہ (۲۸۴) میں موجود ہے اور حسن لذاتہ ہے۔

[شہادت، اگست ۲۰۰۴ء]

ایک ہی چلو سے کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا

سوال وضو کے اندر تین مرتبہ کلی کرنا، تین مرتبہ ناک میں پانی ڈالنا، الگ الگ کرنا ہے یا ایک ہی مرتبہ چلو پانی لیا جس سے کلی بھی کی اور ناک میں بھی پانی ڈالا۔ ان دونوں صورتوں میں سے کون سی درست ہے؟ (محمد ابراہیم، ٹنڈو آدم)

الجواب صحیح احادیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک چلو لے کر آدھے سے کلی کرتے اور آدھا ناک میں ڈالتے تھے۔ دیکھئے صحیح البخاری (۱۹۱، ۱۹۹) صحیح مسلم (۲۳۵)

لہٰذا ایک ہی چلو سے کلی اور ناک میں پانی ڈالنا چاہیے۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ آپ ﷺ علیحدہ پانی سے کلی کرتے تھے اور ناک میں علیحدہ پانی ڈالتے تھے۔ (سنن ابی داود: ۱۳۹، وسندہ ضعیف)

اس روایت کی سند لیث بن ابی سلیم کی وجہ سے ضعیف ہے اور اس میں دوسری علت بھی ہے۔ دیکھئے التلخیص الحبیر (ج ۱ ص ۷۸، ۷۹ ح ۷۹)

بلکہ علامہ نووی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث بالاتفاق ضعیف ہے۔ (المجموع شرح المہذب ج ۱ ص ۳۶۴)

ایک دوسری روایت میں بھی کلی اور ناک میں پانی ڈالنے کے درمیان فصل کا ذکر آیا ہے جو سیدنا عثمان اور سیدنا علی رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ جسے ابو علی بن السکن نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔ (التلخیص ص ۷۹)

مجھے تلاش بسیار کے باوجود اس کی سند نہیں ملی۔

بعد میں اس کی سند مل گئی ہے جو کہ مع متن وحوالہ درج ذیل ہے:

امام ابن ابی خیثمہ (متوفی ۲۷۹ھ) نے فرمایا: "حدثنا علي بن الجعد قال: أنا عبدالرحمن بن ثابت بن ثوبان عن عبدة بن أبي لبابة قال: سمعت شقيق بن سلمة قال: رأيت علياً وعثمان توضآ ثلاثاً ثلاثاً ثم قالا: هكذا توضأ النبي ﷺ وذكر أنهما أفردا المضمضة والاستنشاق" شقیق بن سلمہ نے کہا کہ میں نے علی اور عثمان (رضی اللہ عنہما) کو دیکھا، انھوں نے اعضائے وضو کو تین تین دفعہ دھویا پھر فرمایا کہ نبی ﷺ نے اسی طرح وضو کیا تھا۔ اور (شقیق نے) بیان کیا کہ ان دونوں نے کلی علیحدہ کی تھی اور ناک میں علیحدہ پانی ڈالا تھا۔ (التاریخ الکبیر لابن ابی خیثمہ ص ۵۸۸ ح ۱۴۱۰ وسندہ حسن لذاتہ)

معلوم ہوا کہ کلی کرتے وقت منہ میں علیحدہ پانی ڈالنا اور (بعد میں) ناک میں علیحدہ پانی ڈالنا بھی جائز ہے۔ [شہادت، مئی ۱۹۹۹ء]

وضو کے دوران میں جائز کلام

سوال وضو یا کھانے کے دوران باتیں کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ (ایک سائل)

الجواب وضو یا کھانے کے دوران میں جائز باتیں کرنے کی ممانعت کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے وضو کیا جب آپ پاؤں دھونے کے قریب پہنچے تو میں نے اپنے ہاتھ بڑھائے تاکہ آپ کے موزے اتار دوں

تو آپ ﷺ نے فرمایا: چھوڑ دو، میں نے انھیں پاک (یعنی وضو کی) حالت میں پہنا ہے پھر آپ نے موزوں پر مسح کیا۔ (صحیح بخاری:۲۰۶ وصحیح مسلم:۷۹/۲۷۴، واللفظ لہ)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ وضو کے دوران میں جائز باتیں کرنا درست ہے البتہ لایعنی اور فضول گفتگو کسی وقت بھی جائز نہیں ہے۔

عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ سے روایت کہ میں نے ایک دن رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کھانا کھایا تو میں پلیٹ کے کناروں سے کھانے لگا، پھر رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا: ((کل مما یلیك)) جو تمھارے قریب ہے اس میں سے کھاؤ۔ (صحیح بخاری:۵۳۷۷، صحیح مسلم:۲۰۲۲)

معلوم ہوا کہ کھانے پینے کے دوران میں بھی باتیں کرنا جائز ہے۔ [شہادت، جولائی ۱۹۹۹ء]

وضو کے بعد دعا

سوال وضو کے بعد یہ دعا پڑھی جاتی ہے " اللّٰھم اجعلني من التوابین واجعلني من المتطھرین " امام ترمذی رحمہ اللہ نے اسے مضطرب فرمایا ہے لیکن بعض علماء کے بقول یہ روایت اپنے متابعات (یا شواہد) کی بنا پر مقبول ہے۔ اس پر کچھ روشنی ڈالیں۔

(ابوحمید الساعدی الرفیقی۔ لاہور)

الجواب دعاء الوضوء کے مذکورہ بالا الفاظ سنن ترمذی (حدیث ۵۵) میں ہیں۔ یہ روایت انقطاع وغیرہ کی وجہ سے ضعیف ہے۔ المعجم الاوسط للطبرانی اور المعجم الکبیر میں اس کا ایک ضعیف شاہد بھی ہے۔ دیکھئے مجمع الزوائد (ج ا ص ۲۳۹) اس روایت پر تفصیلی تحقیق کے لئے دیکھئے سنن ترمذی ج ۹۷ تا ۸۳ تحقیق الاستاد احمد محمد شاکر رحمہ اللہ

[الحدیث:۹] [شہادت، اکتوبر ۱۹۹۹ء]

وضو کے بعد شرم گاہ پر پانی چھڑکنا

سوال وضو کرنے کے بعد شرم گاہ کی طرف پانی کے چھینٹے ڈالے جاتے ہیں۔ اس عمل کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ مسعود احمد بی۔ ایس۔ سی یہ روایت اپنی کتب میں لائے ہیں۔

(ظفر عالم، لاہور)

الجواب مسعود احمد بی ایس سی صاحب نے، وضو کے بعد شرمگاہ پر پانی چھڑکنے والی روایت بلوغ الامانی ج ۲ ص ۵۳ سے نقل کی ہے۔ یہ روایت مسند احمد (ج ۴ ص ۱۶۱) مسند عبد بن حمید (ح ۲۸۳) اور سنن ابن ماجہ (ح ۴۶۲) میں بھی اسی سند سے موجود ہے۔

یہ سند کئی وجہ سے ضعیف ہے:

① ابن لہیعہ اختلاط کی وجہ سے ضعیف تھے اور اس روایت کا قبل از اختلاط ہونا معلوم نہیں۔

② ابن لہیعہ مدلس تھے۔ وہ ضعیف راویوں سے تدلیس کرتے تھے۔ (طبقات المدلسین لابن حجر) اور عن سے روایت کر رہے ہیں۔ ایسے راوی کی "عن" والی روایت قطعاً مردود ہوتی ہے۔

حافظ بوصیری نے لکھا ہے کہ "**هذا إسناد ضعيف لضعف ابن لهيعة**"، یہ سند ابن لہیعہ کی وجہ سے ضعیف ہے۔ (زوائد ابن ماجہ ص ۹۷ ح ۱۶۵، دوسرا نسخہ ح ۴۶۲)

③ امام زہری ثقہ مدلس تھے (بشرطِ صحت) اور عن سے روایت کر رہے ہیں۔

تاہم سنن ابی داود کتاب الطهارة باب فی الانتضاح (ص ۱۶۶۔۱۶۸) وغیرہ میں حسن سند سے ثابت ہے کہ نبی ﷺ نے وضو کیا اور شرمگاہ پر پانی چھڑکا۔ اسے حاکم اور ذہبی نے بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے۔ (المستدرک ج ۱ ص ۱۷۱)

اس روایت کی وجہ سے پہلی روایت بھی حسن ہوگئی ہے۔ والحمد للہ

ایک آدمی نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے شکایت کی کہ جب میں نماز میں ہوتا ہوں تو مجھے یہ خیال آتا ہے کہ میرے ذکر پر پیشاب کی تری ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ غارت کرے شیطان کو، شیطان نماز میں آکر انسان کے ذکر کو اس لئے چھوتا ہے تاکہ وہ خیال کرنے لگے کہ اس کا وضو ٹوٹ چکا ہے۔ پس اگر تو وضو کرے تو اپنی شرمگاہ پر پانی چھڑک لیا کر۔ اگر تجھے اپنی تری کا خیال آئے گا تو یہ سمجھ لے کہ یہ چھڑکا ہوا پانی ہے۔ (مصنف عبدالرزاق ج ۱ ص ۱۵۱ ح ۵۸۳)

نافع مولیٰ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ جب وضو کرتے تو

اپنی شرمگاہ پر پانی چھڑکتے تھے۔ (ابن ابی شیبہ ج اص ۱۶۷ ح ۱۷۷۵، اس کی سند صحیح ہے)

اس قسم کے دوسرے آثار شیخ عمرو بن عبدالمنعم بن سلیم کی کتاب ''السنن والمبتدعات فی العبادات'' (ص ۱۵ تا ۱۷) میں موجود ہیں۔ یہ کتاب میرے ترجمے کے ساتھ ''عبادات میں بدعات'' کے نام سے اردو میں مطبوع ہے لیکن چونکہ میری مراجعت اور دستخطوں کے بغیر چھپی ہے لہٰذا اس کتاب کی کسی غلطی کا میں ذمہ دار نہیں ہوں۔ [شہادت، اگست ۲۰۰۱ء]

وضو کے بعد اعضائے وضو پونچھنا

سوال کیا وضو اور غسل کے بعد کپڑے (تولیے وغیرہ) کا استعمال جائز ہے؟

(ابوقتادہ، بستی بلوچاں فروکہ ضلع سرگودھا)

الجواب محفوظ بن علقمہ سے روایت ہے کہ سلمان فارسی (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا:

بے شک رسول اللہ ﷺ نے وضو کیا تو آپ نے اپنا اُونی جُبہ پلٹ کر اُس سے اپنا چہرہ پونچھ لیا۔ (سنن ابن ماجہ: ۴۶۸، ۳۵۶۴)

محفوظ بن علقمہ کا سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے لہٰذا یہ روایت ضعیف ہے۔ اس کے باوجود بوصیری نے اس روایت کو صحیح اور شیخ البانی نے ''حسن'' قرار دیا ہے۔!

عبیداللہ بن ابی بکر (تابعی) سے روایت ہے کہ انھوں نے (سیدنا) انس بن مالک (رضی اللہ عنہ) کو دیکھا، آپ وضو کے بعد رومال سے اپنا چہرہ پونچھ کر صاف کرتے تھے۔

(الاوسط لابن المنذر ۱/ ۴۱۵ وسندہ حسن)

بشیر بن ابی مسعود رضی اللہ عنہ (وضو کے بعد) رومال کے ساتھ پونچھتے تھے۔ (الاوسط ۱/ ۴۱۶ وسندہ صحیح)

حسن بصری اور محمد بن سیرین دونوں وضو کے بعد رومال سے منہ پونچھنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔ (ابن ابی شیبہ ۱/ ۱۴۸، ۱۴۹ ح ۱۵۷۹، وسندہ صحیح)

الربیع بن عمیلہ اور ابوالاحوص دونوں وضو کے بعد پونچھتے تھے۔

(ابن ابی شیبہ ۱/ ۱۴۹ ح ۱۵۸۱ وسندہ حسن)

حسن بصری سے پوچھا گیا کہ کیا وضو کے بعد کپڑے سے منہ پونچھنا جائز ہے؟ تو انھوں نے فرمایا: جی ہاں، بشرطیکہ کپڑا پاک صاف ہو۔ (ابن ابی شیبہ ۱/۱۴۹ ح ۱۵۸۴ وسندہ صحیح)

اسود (تابعی مشہور) رومال سے پونچھتے تھے۔ (ابن ابی شیبہ ۱/۱۴۹ ح ۱۵۸۸ وسندہ صحیح)

امام زہری (تابعی) بھی اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔ (ابن ابی شیبہ ۱/۱۴۹ ح ۱۵۹۰ وسندہ صحیح)

بکر بن عبداللہ المزنی فرماتے تھے کہ سردیوں میں (وضو کے اعضاء) پونچھنے میں فائدہ ہوتا ہے۔ (ابن ابی شیبہ ۱/۱۴۹ ح ۱۵۹۱ وسندہ صحیح)

امام احمد وضو کے بعد رومال کے استعمال کو جائز سمجھتے تھے۔ (مسائل ابی داود ص ۱۲)

دوسری طرف عطاء بن ابی رباح (تابعی) ان رومالوں کو بدعت سمجھتے تھے۔

(ابن ابی شیبہ ۱/۱۵۰ ح ۱۵۹۶ وسندہ صحیح)

ابراہیم نخعی اور سعید بن جبیر دونوں وضو کے بعد رومال کا استعمال مکروہ سمجھتے تھے۔

(ابن ابی شیبہ ۱/۱۵۰ ح ۱۵۹۵ وسندہ صحیح)

سعید بن المسیب (تابعی) اسے مکروہ سمجھتے تھے اور فرماتے تھے کہ (وضو کے قطروں کا) وزن ہوتا ہے۔ (ابن ابی شیبہ ۱/۱۵۰ ح ۱۵۹۹ وسندہ حسن)

ان تمام آثارِ صحیحہ کو مدِنظر رکھتے ہوئے عرض ہے کہ وضو کے بعد اعضائے وضو پونچھنا جائز اور مباح ہے، اس میں کوئی گناہ نہیں ہے تاہم بہتر یہی ہے کہ نہ پونچھا جائے۔ واللہ اعلم

غسل کے بعد جسم پونچھنا

سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس غسل کے بعد رومال لایا گیا مگر آپ نے اسے نہیں لیا اور اس کے ساتھ جسم نہیں پونچھا۔

(صحیح البخاری: ۲۵۹، ۲۷۶ و صحیح مسلم: ۳۱۷ بالفاظ مختلفۃ نحو المعنیٰ)

بعض لوگ اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ غسل کے بعد جسم نہیں پونچھنا چاہئے۔ لیکن امام ابن المنذر النیسابوری رحمہ اللہ (متوفی ۳۱۸ھ) فرماتے ہیں: "وهذا الخبر لايوجب الحظر ذلك ولا المنع منه لأن النبي عليه السلام لم ينه عنه، مع أن

النبي ﷺ قد كان يدع الشئ المباح لئلا يشق على أمته، من ذلك قوله لبني عبدالمطلب: لولا أن تغلبوا على سقايتكم لنزعت معكم" اس حدیث سے (غسل کے بعد جسم خشک کرنے کی) ممانعت ثابت نہیں ہوتی اور نہ اس کا وجوب ثابت ہوتا ہے کیونکہ نبی ﷺ نے اس سے منع نہیں کیا۔ نبی ﷺ بعض اوقات ایک مباح چیز اس لئے چھوڑ دیتے تھے، تاکہ اُمت پر تنگی نہ ہو۔ اسی میں سے آپ کا وہ ارشاد بھی ہے جو آپ نے بنوعبدالمطلب سے فرمایا تھا: اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ لوگ (میری وجہ سے) بھیڑ کر کے تمھیں پانی نکالنے سے روک دیں گے تو میں بھی تمھارے ساتھ مل کر پانی نکالتا۔ (الاوسط ۱/۴۱۹)

امام احمد بن حنبل غسل کے بعد جسم پونچھنے کو جائز سمجھتے تھے۔ (مسائل ابی داود ص ۱۲)

آثارِ صحابہ اور فہم سلف کو مدِ نظر رکھتے ہوئے عرض ہے کہ غسل کے بعد جسم نہ پونچھنا افضل ہے اور اگر پونچھ لیا جائے تو جائز ہے۔ سردیوں میں جب بیماری کا خطرہ ہو تو پھر جسم پونچھنا بہتر ہے۔ واللہ أعلم [الحدیث: ۲۰]

مقتدی کا وضو کے بغیر نماز پڑھنے سے امام کو اشتباہ

سوال ابو روح الکلاعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھاتے وقت سورۂ روم پڑھی، آپ ﷺ کو اس میں اشتباہ ہوگیا، جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا شیطان نے ہماری قراءت میں شبہ ڈال دیا اور اس کا سبب وہ لوگ ہیں جو وضو کئے بغیر نماز کو آجاتے ہیں لہٰذا جب تم نماز کو آؤ تو اچھی طرح وضو کر کے آیا کرو۔

(الفتح الربانی ۲/۴۶) (محمد محسن سلفی، کراچی)

الجواب یہ روایت مسند احمد (۳/۴۷۱، ۴۷۲ ح ۱۵۹۶۹) میں موجود ہے۔ سنن النسائی (۲/۱۵۶ ح ۹۴۸) وغیرہ میں اس کی دوسری سند بھی ہے جس کے ساتھ یہ روایت صحیح ہے۔ دیکھئے میری کتاب "عمدۃ المساعی فی تخریج سنن النسائی (ق ۱/۹۴)

لہٰذا ہر نمازی کو چاہئے کہ وہ پوری احتیاط سے مکمل وضو کرے، پھر نماز پڑھے۔

[شہادت، اگست ۲۰۰۴ء]

جرابوں پر مسح جائز ہے

سوال کیا جرابوں پر مسح جائز ہے؟ (ایک سائل)

الجواب جی ہاں! حدیث میں آیا ہے کہ " **عن ثوبان قال: بعث رسول اللّٰه ﷺ سرية ...... أمرهم أن يمسحوا على العصائب والتساخين** "

ثوبان (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجاہدین کی ایک جماعت بھیجی..... انھیں حکم دیا کہ پگڑیوں اور پاؤں کو گرم کرنے والی اشیاء (جرابوں اور موزوں) پر مسح کریں۔

(سنن ابی داود ج ۱ ص ۲۱ ح ۱۴۶)

اس روایت کی سند صحیح ہے، اسے حاکم نیشاپوری رحمہ اللہ اور حافظ ذہبی رحمہ اللہ دونوں نے صحیح کہا ہے۔ (المستدرک والتلخیص ج ۱ ص ۱۶۹ ح ۶۰۲)

اس حدیث پر امام احمد رحمہ اللہ کی جرح کے جواب کے لئے نصب الرایہ (ج ۱ ص ۱۶۵) وغیرہ دیکھیں۔

امام ابوداود السجستانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" **ومسح على الجوربين علي بن أبي طالب و أبو مسعود و البراء بن عازب و أنس بن مالك وأبو أمامة و سهل بن سعد وعمرو بن حريث، وروى ذلك عن عمر بن الخطاب و ابن عباس** "

اور علی بن ابی طالب، ابومسعود (ابن مسعود) اور براء بن عازب، انس بن مالک، ابوامامہ، سہل بن سعد اور عمرو بن حریث نے جرابوں پر مسح کیا اور عمر بن خطاب اور ابن عباس سے بھی جرابوں پر مسح مروی ہے (رضی اللہ عنہم اجمعین) (سنن ابی داود ۱/۲۴ ح ۱۵۹)

صحابہ کرام کے یہ آثار مصنف ابن ابی شیبہ (۱/۱۸۸، ۱۸۹) مصنف عبدالرزاق (۱/۱۹۹، ۲۰۰) محلی ابن حزم (۲/۸۴) الکنیٰ للدولابی (۱/۱۸۱) وغیرہ میں باسند موجود ہیں۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا اثر الاوسط لابن المنذر (ج ۱ ص ۴۶۲) میں صحیح سند کے ساتھ موجود ہے، جیسا کہ آگے آرہا ہے۔ علامہ ابن قدامہ فرماتے ہیں:

"ولأن الصحابة رضي الله عنهم مسحوا على الجوارب ولم يظهر لهم مخالف في عصرهم فكان اجماعًا" اور چونکہ صحابہ نے جرابوں پر مسح کیا ہے اور ان کے زمانے میں ان کا کوئی مخالف ظاہر نہیں ہوا لہٰذا اس پر اجماع ہے کہ جرابوں پر مسح کرنا صحیح ہے۔ (المغنی ۱/۱۸۱ مسئلہ ۴۲۶)

خفین پر مسح متواتر احادیث سے ثابت ہے۔ جرابیں بھی خفین کی ایک قسم ہیں جیسا کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ، ابراہیم نخعی اور نافع وغیرہم سے مروی ہے۔ جو لوگ جرابوں پر مسح کے منکر ہیں، ان کے پاس قرآن، حدیث اور اجماع سے ایک بھی صریح دلیل نہیں ہے۔

① امام ابن المنذر النیسابوری رحمہ اللہ نے فرمایا: "حدثنا محمد بن عبدالوهاب: ثنا جعفر بن عون: ثنا يزيد بن مردانبة: ثنا الوليد بن سريع عن عمرو بن حريث قال: رأيت عليًا بال ثم توضأ ومسح على الجوربين"
عمرو بن حریث (رضی اللہ عنہ) نے کہا: میں نے دیکھا (سیدنا) علی رضی اللہ عنہ نے پیشاب کیا، پھر وضو کیا اور جرابوں پر مسح کیا۔ (الاوسط ج ۱ ص ۴۶۲، وفی الاصل: مردانبة وھو خطأ مطبعی)
اس کی سند صحیح ہے۔

② سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے جرابوں پر مسح کیا۔
دیکھئے مصنف ابن ابی شیبہ (۱/۱۸۸ ح ۱۹۷۹) وسندہ حسن

③ سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے جرابوں پر مسح کیا۔
دیکھئے مصنف ابن ابی شیبہ (۱/۱۸۹ ح ۱۹۸۴) وسندہ صحیح

④ سیدنا عقبہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے جرابوں پر مسح کیا۔
دیکھئے مصنف ابن ابی شیبہ (۱/۱۸۹ ح ۱۹۸۷) اور اس کی سند صحیح ہے۔

⑤ سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہ نے جرابوں پر مسح کیا۔
دیکھئے مصنف ابن ابی شیبہ (۱/۱۸۹ ح ۱۹۹۰) وسندہ حسن

ابن منذر نے کہا: (امام) اسحاق بن راہویہ نے فرمایا: "صحابہ کا اس مسئلے پر کوئی اختلاف

نہیں ہے۔" (الاوسط لابن المنذر ار۴۶۴، ۴۶۵)

تقریباً یہی بات ابن حزم نے کہی ہے۔ (المحلی ۲/ ۸۶، مسئلہ نمبر ۲۱۲)

ابن قدامہ کا قول سابقہ صفحے پر گزر چکا ہے۔

معلوم ہوا کہ جرابوں پر مسح کے جائز ہونے کے بارے میں صحابہ کا اجماع ہے رضی اللہ عنہم،

اور اجماع (بذاتِ خود مستقل) شرعی حجت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ میری امت کو گمراہی پر کبھی جمع نہیں کرے گا"

(المستدرک للحاکم ار۱۱۶ ح ۳۹۷، ۳۹۸)

نیز دیکھئے" ابراء اهل الحدیث والقرآن مما فی الشواهد من التهمة والبهتان "

ص ۳۲، تصنیف حافظ عبداللہ محدث غازی پوری رحمہ اللہ (متوفی ۱۳۳۷ھ)

مزید معلومات:

① ابراہیم النخعی رحمہ اللہ جرابوں پر مسح کرتے تھے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ار۱۸۸ ح ۱۹۷۷)

اس کی سند صحیح ہے۔

② سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے جرابوں پر مسح کیا۔ (ایضاً ار۱۸۹ ح ۱۹۸۹)

اس کی سند صحیح ہے۔

③ عطاء بن ابی رباح جرابوں پر مسح کے قائل تھے۔ (المحلی ۲/ ۸۶)

معلوم ہوا کہ تابعین کا بھی جرابوں پر مسح کے جواز پر اجماع ہے۔ والحمد للہ

۱: بقولِ حنفیہ قاضی ابو یوسف جرابوں پر مسح کے قائل تھے۔ (الهدایہ ج اص ۶۱)

۲: بقولِ حنفیہ محمد بن الحسن الشیبانی بھی جرابوں پر مسح کا قائل تھا۔ (ایضاً ار۶۱ باب المسح علی الخفین)

۳: آگے لکھا ہے کہ (بقولِ حنفیہ) امام ابو حنیفہ پہلے جرابوں پر مسح کے قائل نہیں تھے لیکن بعد میں انھوں نے رجوع کر لیا تھا۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سفیان الثوری، ابن المبارک، شافعی، احمد اور اسحاق (بن راہویہ) جرابوں پر مسح کے قائل تھے (بشرطیکہ وہ موٹی ہوں۔) دیکھئے سنن الترمذی (ح ۹۹)

سید نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "باقی رہا صحابہ کا عمل، تو ان سے مسح جراب ثابت ہے، اور تیرہ صحابہ کرام کے نام صراحتہ سے معلوم ہیں، کہ وہ جراب پر مسح کیا کرتے تھے..." (فتاوی نذیریہ ج ۱ ص ۳۳۲)

لہٰذا سید نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ کا جرابوں پر مسح کے خلاف فتویٰ اجماعِ صحابہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے مردود ہے۔

جورب: سوت یا اون کے موزوں کو کہتے ہیں۔

(درس ترمذی ج ۱ ص ۳۳۴ تصنیف محمد تقی عثمانی دیوبندی)

نیز دیکھئے البنایہ فی شرح الہدایہ للعینی (ج ۱ ص ۵۹۷)

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ خفین (موزوں) جوربین مجلدین اور جوربین منعلین پر مسح کے قائل تھے مگر جوربین (جرابوں) پر مسح کے قائل نہیں تھے۔

ملا مرغینانی لکھتے ہیں: "وعنه أنه رجع إلى قولهما وعليه الفتوى"

اور امام صاحب سے مروی ہے کہ انھوں نے صاحبین کے قول پر رجوع کر لیا تھا اور اسی پر فتویٰ ہے۔ (الہدایہ ۱/۶۱)

صحیح احادیث، اجماعِ صحابہ، قولِ ابی حنیفہ اور مفتی بہ قول کے مقابلہ میں دیوبندی اور بریلوی حضرات کا یہ دعویٰ ہے کہ جرابوں پر مسح جائز نہیں ہے، اس دعویٰ پر ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ [شہادت، جنوری ۲۰۰۱ء]

سوال جرابوں پر مسح کرنے والی روایت میں سفیان ثوری رحمہ اللہ عن سے روایت کرتے ہیں اور آپ سفیان ثوری کی عن والی روایت کو نہیں مانتے (دیکھئے نور العینین، ترمذی کی روایت) تو کیا جرابوں پر مسح جائز ہے؟ کیا آپ کے پاس تحدیث یا ثقہ متابعت ہے؟ اگر ہے تو ضرور چاہیے۔ علامہ مبارک پوری نے تحفۃ الاحوذی میں جراب پر مسح کی روایت کو ضعیف کہا ہے۔ (حبیب اللہ۔ پشاور)

الجواب سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے باسند صحیح جرابوں پر مسح کرنا ثابت ہے۔

(الاوسط لابن منذر ج ۱ ص ۴۶۲ ت ۴۷۹)

اس روایت کی سند میں نہ تو سفیان ثوری ہیں اور نہ کوئی دوسرا مدلس راوی بلکہ یہ سند بالکل صحیح ہے۔

یہ روایت مصنف ابن ابی شیبہ (ج ۱ص ۱۸۹ح ۱۹۸۶) میں بھی موجود ہے مگر غلطی سے عمرو بن حریث کے بجائے عمرو بن کریب چھپ گیا ہے۔

ان کے علاوہ دیگر کئی صحابہ سے المسح علی الجوربین ثابت ہے جن کا کوئی مخالف معلوم نہیں لہٰذا جرابوں پر مسح کے جواز پر صحابہ کا اجماع ہے۔ دیکھئے المغنی ابن قدامۃ (ج ۱ص ۱۸۱ مسئلہ ۴۲۶) والاوسط لابن منذر (۱/۴۶۴، ۴۶۵) والمحلی (ج ۲ص ۸۷) اور ہدیۃ المسلمین (ص ۱۷، ۲۰ح ۴) اجماع صحابہ بذات خود بہت بڑی دلیل ہے لہٰذا سفیان ثوری کی معنعن روایت پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے اسے صرف اس اجماع کی تائید میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ [شہادت جنوری ۲۰۰۳ء]

سخت سردی میں تیمّم

سوال بہت ہی بوڑھے شخص کو سردی کے موسم میں پانی کی موجودگی میں تیمّم کی اجازت ہے یا نہیں؟ بشرطیکہ اس کو گرم پانی کر کے دینے والا موجود ہو، اگر نہ ہو تو کیا حکم ہے؟

☆ بوڑھا آدمی جس کو چلنے پھرنے سے تکلیف ہوتی ہے اور نظر کمزور ہے، رات کے وقت عشاء کی نماز گھر میں ادا کر سکتا ہے یا نہیں، جبکہ اس کو لے جانے اور واپس لانے والے بھی موجود ہوں اور لے جانے والے اور واپس لانے والے نہ ہوں تو کیا حکم ہے؟ (ایک سائل)

الجواب اگر بہت ہی بوڑھا شخص، صحت مند ہے تو وہ وضو کرے گا، وضو کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ اگر وہ شخص یا کوئی دوسرا شخص بیمار ہے، بیماری میں وضو کرنے سے اسے تکلیف ہوتی ہے اور بیماری کے بڑھنے کا خطرہ ہے تو مریض کے لئے یہ گنجائش ہے کہ وہ تیمّم کر لے۔

☆ بہتر تو یہی ہے کہ یہ شخص مسجد میں نماز پڑھے، اگر اسے کوئی شرعی عذر ہے مثلاً مرض وغیرہ یا لے جانے والے اور لانے والے کا موجود نہ ہونا وغیرہ تو گھر میں نماز پڑھ سکتا ہے۔

بعض معذورین کا گھروں میں، عذر کی بنا پر نماز پڑھنا ثابت ہے۔
دیکھئے السنن الکبریٰ للبیہقی (ج ۳ ص ۶۶، ۶۷) وصحیح مسلم (۶۵۹، دارالسلام: ۱۵۰۰)

[شہادت، جولائی ۲۰۰۰ء]

تیمّم کے لئے مٹی کا ڈھیلا

سوال تیمّم کرنے کے لئے مٹی کا ڈھیلا مسجد کے اندر رکھ کر اس سے تیمّم کرنے میں کوئی مضائقہ تو نہیں یا کہ مٹی کا ڈھیلا مسجد سے باہر رکھنا ضروری ہے؟ حدیث سے جواب دیں۔ (اشفاق احمد)

الجواب پاک مٹی کا ڈھیلا، اگر کسی مسجد کے اندر رکھا گیا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اس کی ممانعت پر کوئی دلیل میرے علم میں نہیں ہے۔ واللہ اعلم، تاہم یہ بہتر ہے کہ تیمّم کی مٹی کو بھی مسجد سے باہر رکھا جائے۔ [شہادت، جون ۲۰۰۱ء]

سوال مٹی کا ڈھیلا مسجد میں رکھ کر اس سے تیمّم درست ہے یا مسجد سے باہر رکھنا ضروری ہے؟ (ڈاکٹر نسیم اختر، اسلام آباد)

الجواب مٹی کا پاک ڈھیلا چاہے مسجد میں ہو یا مسجد کے باہر، دونوں جگہ رکھ کر اس سے تیمّم کرنا جائز ہے۔ [شہادت، ستمبر ۲۰۰۱ء]

ہوا نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے

سوال کیا ہوا نکلنے سے وضوء ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟ (حافظ حبیب محمد، بیاڑ۔ دیر)

الجواب جی ہاں، آدمی کی ہوا نکلنے سے، یقیناً وضو ٹوٹ جاتا ہے، چاہے ہوا تھوڑی نکلے یا زیادہ، چاہے آواز سے نکلے یا بے آواز، چاہے بدبو آئے یا نہ آئے، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہوا نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

امام ابوداود (متوفی ۲۷۵ھ) فرماتے ہیں:

"حدثنا عثمان بن أبي شيبة :حدثنا جرير بن عبدالحميد عن عاصم الأحول

عن عيسى بن حطان عن مسلم بن سلام عن علي بن طلق قال قال رسول الله ﷺ: ((إذا فسا أحدكم في الصلوة فلينصرف فليتوضأ وليعد الصلوة))"

(سنن ابی داود: کتاب الطہارۃ، باب فیمن یحدث فی الصلوٰۃ، ح:۲۰۵)

اس حدیث کی سند حسن (لذاتہ) ہے، اسے ترمذی (۱۱۶۴) نسائی (السنن الکبریٰ: ۳۲۵/۵ ح ۹۰۲۵، ۹۰۲۶) دارمی (السنن: ۲۶۰/۱ ح ۱۱۴۶) وغیرہم نے عاصم الاحول کی سند سے مختصراً ومطولاً، الفاظ کے معمولی اختلاف کے ساتھ بیان کیا ہے، امام ترمذی نے کہا: "حدیث حسن" یعنی یہ حدیث حسن ہے۔ حافظ ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا۔

(الاحسان: ۲۰۱/۶، ح ۴۱۸۹، دوسرا نسخہ: ۸/۶ ح ۲۲۳۷، ۵۱۴/۹، ۵۱۵ ح ۴۱۹۹، ۴۲۰۱، موارد الظمآن: ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴)

راویوں کا تعارف: اس حدیث کے راویوں کا مختصر اور جامع تعارف درج ذیل ہے:

۱۔ عثمان بن ابی شیبہ: "ثقة حافظ شهير وله أوهام، وقيل: كان لا يحفظ القرآن"

(التقریب: ۴۵۱۳)

"كان لا يحفظ القرآن" والا دعویٰ باطل، اور "وله أوهام" والی جرح مردود ہے۔ یہ راوی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داود، سنن النسائی اور سنن ابن ماجہ کے راوی ہیں۔

۲۔ جریر بن عبدالحمید: "ثقة صحيح الكتاب، قيل: كان في آخر عمره يهم من حفظه" (التقریب: ۹۱۶)

اس راوی پر "يهم من حفظه" والی جرح مردود ہے، یہ کتب ستہ کے مرکزی راوی ہیں، یہ روایت جریر کے علاوہ دوسرے راویوں نے بھی بیان کر رکھی ہے۔

۳۔ عاصم الاحول: "ثقة من الرابعة، لم يتكلم فيه إلا القطان، فكأنه بسبب دخوله في الولاية" (التقریب: ۳۰۶۰)

یحیٰی القطان کی جرح مردود ہے، عاصم مذکور کتب ستہ کے مرکزی راوی ہیں۔

۴۔ عیسیٰ بن حطان: انھیں درج ذیل محدثین نے ثقہ قرار دیا ہے:

① العجلی المعتدل (تاریخ الثقات: ۱۳۳۰، قال: ثقہ)

② ابن حبان (ذکرہ فی کتاب الثقات ۵/۲۱۵ وصحح حدیثہ)

③ الترمذی (امام ترمذی نے ان کی بیان کردہ حدیث کو "حسن" کہہ کر عیسیٰ مذکور کی توثیق کردی ہے۔)

خلاصہ یہ ہے کہ عیسیٰ بن حطان جمہور محدثین کے نزدیک ثقہ ہیں۔

۵۔ مسلم بن سلام الحنفی: انھیں درج ذیل محدثین نے ثقہ قرار دیا ہے:

① ابن حبان (ذکرہ فی کتاب الثقات ۵/۳۹۵)

② ابن شاہین (ثقات ابن شاہین: ۱۳۹۱)

③ ابونعیم (ابونعیم الفضل بن دکین الکوفی نے کہا: "کان مسلم أحد الثقات المأمونین" (مسائل محمد بن عثمان بن ابی شیبہ: ۷ بتحقیقی)

④ الترمذی (امام ترمذی نے مسلم الحنفی کی حدیث کو "حسن" کہہ کر ان کی توثیق کر دی ہے۔)

خلاصہ یہ ہے کہ مسلم بن سلام الحنفی ثقہ ہیں۔

تنبیہ: شعیب ارناؤوط نے یہ دعویٰ کر رکھا ہے کہ "ولم یوثقه غیر المؤلف" یعنی اس راوی کو ابن حبان کے سوا، کسی دوسرے نے ثقہ نہیں کہا۔ یہ دعویٰ اصلاً باطل ہے، کیونکہ مسلم مذکور کو ابن حبان کے علاوہ، ترمذی، ابن شاہین اور ابونعیم نے بھی ثقہ قرار دیا ہے، اسی طرح ابن القطان الفاسی کا مسلم مذکور کو "مجہول الحال" کہہ کر "هذا حدیث لا یصح" کہنا بھی مردود ہے۔ والحمدللہ

۶۔ علی بن طلق، صحابی ہیں رضی اللہ عنہ، امام دارمی نے فرمایا کہ علی بن طلق صحابی ہیں۔

(دیکھئے سنن الدارمی: ص ۲۰۸، ح ۱۱۴۶)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ شعیب ارناووط وغیرہ کا اس حدیث کو ضعیف کہنا غلط ہے۔

حق یہی ہے کہ یہ حدیث بلحاظِ سند حسن لذاتہ ہے اور بلحاظِ شواہد صحیح ہے۔

شواہد کا ذکر: ① ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إذا وجد أحدكم في بطنه شيئًا فأشكل عليه، أخرج منه شيء أم لا؟ فلا يخرجن من المسجد حتى يسمع صوتًا أو يجد ريحًا))
اگر تم میں سے (مرض وہم والا) کوئی شخص اپنے پیٹ میں کوئی گڑبڑ محسوس کرے اور اسے شک ہو کہ ہوا نکلی ہے یا نہیں نکلی؟ تو اس وقت تک مسجد سے نہ نکلے جب تک (ہوا نکلنے کی) آواز سنے یا بدبو سونگھ لے۔ (صحیح مسلم:۹۹/۳۶۲، دارالسلام:۸۰۵)

یہ روایت اس شکی وہمی مریض کے بارے میں ہے جسے وہم رہتا ہے کہ اس کی ہوا خارج ہوئی ہے یا نہیں، ظاہر ہے کہ شک کی بنیاد پر نماز توڑ دینا صحیح نہیں ہے، رہا وہ شخص جسے یقین ہو جائے کہ اس کی ہوا نکلی ہے تو اس کا وضو ٹوٹ جاتا ہے چاہے وہ آواز سنے یا نہ سنے، چاہے وہ بدبو محسوس کرے یا نہ کرے۔

۲ عباد بن تمیم کے چچا (عبداللہ زید المازنی رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ((لا ينصرف حتى يسمع صوتًا أو يجد ريحًا)) یعنی (وہم اور شک کا مریض شخص) اس وقت تک نماز سے نہ نکلے جب تک وہ آواز سن لے یا بدبو محسوس کر لے۔

(صحیح البخاری:۱۷۷، وصحیح مسلم:۹۸/۳۶۱ دارالسلام:۸۰۴)

۳: ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لا تقبل صلوة من أحدث حتى يتوضأ)) جس کو حدث ہو جائے (یعنی وضو ٹوٹ جائے تو) اس کی نماز اس وقت تک قبول نہیں ہوتی جب تک وہ (دوبارہ) وضو نہ کر لے (یعنی دوبارہ وضو کے بعد ہی نماز قبول ہوگی)۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ حدث سے کیا مراد ہے؟ تو انھوں نے فرمایا: فساء (پھسکی) یا آواز کے ساتھ ہوا کا نکلنا۔ (صحیح البخاری:۱۳۵)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ انسان کی ہوا نکلنے سے اس کا وضو فوراً ٹوٹ جاتا ہے چاہے یہ ہوا آواز سے نکلے یا بے آواز نکلے۔ چاہے بدبو آئے یا نہ آئے، چاہے معمولی پھسکی ہو یا بڑا پاد، چاہے دبر سے نکلے یا قبل سے، ان سب حالتوں میں یقیناً وضو ٹوٹ جاتا ہے اور یہی اہلِ حدیث کا مسلک ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "والوضوء مما خرج ولیس مما دخل" جو چیز (منہ سے مثلاً قے، الٹی یا دبر و قبل سے مثلاً پھسکی، پاد وغیرہ) نکلے تو اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ اور جو چیز (منہ سے) داخل ہو اس سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

(الاوسط لابن المنذر ج ۱ ص ۱۸۵ ث ۸۱، وسندہ صحیح) [الحدیث:۲]

پیشاب کے قطروں کی بیماری اور وضو

سوال مجھے پیشاب کے قطروں کا نقص ہے (یعنی مجھے مسلسل پیشاب کے قطرے آتے رہتے ہیں) نماز میں میرے لئے کیا حکم ہے؟ کیا مجھے بار بار وضو کرنا پڑے گا یا صرف ایک ہی وضو سے نمازیں پڑھتا رہوں اور پھر کپڑے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ ممکن ہے بعض اوقات قطرہ کپڑے (شلوار یا ازار) کو بھی لگ جاتا ہو۔ نماز کے علاوہ بھی قطرے آتے رہتے ہیں لہٰذا ان کپڑوں کا کیا حکم ہے؟ وضاحت سے لکھیں۔ (ظفر اقبال، شکر گڑھ)

الجواب اگر پیشاب کے قطرے مسلسل آنے کی بیماری ہے تو مستحاضہ والی حدیث کی رو سے اسے ہر نماز کے لیے نیا وضو کرنا پڑے گا۔ بطورِ احتیاط اسے کپڑے کا وہ حصہ بھی دھونا چاہئے جہاں قطرہ گرنے کا احتمال ہو۔ اگر کبھی کبھار قطرہ آتا ہو تو اسے اس قطرہ کے بعد دوبارہ وضو کر کے نماز پڑھنی چاہیے۔ [شہادت، اگست ۲۰۰۰ء، طبع جدید ۱۱/ فروری ۲۰۰۸ء][الحدیث:۴۷]

ٹخنوں سے نیچے ازار اور وضو

سوال کیا شلوار (چادر وغیرہ) ٹخنوں سے نیچے لٹکانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

(ایک سائل)

الجواب وضو ٹوٹ جاتا ہے؟ اس کی تو مجھے دلیل معلوم نہیں، لیکن میری تحقیق میں وہ حدیث بلحاظ سند حسن ہے جس میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے اُس شخص کو (دوبارہ) وضو کرنے کا حکم دیا جس کا اِزار ٹخنوں سے نیچے لٹکا ہوا تھا۔ دیکھئے سنن ابی داود کتاب الصلوٰۃ، باب الاسبال فی الصلوۃ ح ۶۳۸ (وغیرہ)

اس روایت کے ایک راوی ابوجعفر المؤذن ہیں، جنھیں بعض محدثین مجہول یعنی مجہول الحال قرار دیتے ہیں جبکہ درج ذیل محدثین نے انھیں ثقہ، صحیح الحدیث یا حسن الحدیث قرار دیا ہے:

① ابن حبان، دیکھئے موارد الظمآن: ۲۴۰۶

② الترمذی: حسن لہ: ۳۴۴۸

③ النووی، صحح لہ فی ریاض الصالحین

④ ابن حجر قواہ فی تخریج الاذکار

⑤ **روی عنہ یحیی بن أبي کثیر وھو لا یحدث إلا عن ثقة عند أبي حاتم الرازي**، اتنی توثیق کے بعد اس راوی کو مجہول کہنا غلط ہے لہٰذا یہ روایت حسن ہے۔

[شہادت، اپریل ۲۰۰۴ء][الحدیث: ۹]

نماز میں ہنسنے سے وضو کا ٹوٹنا؟

سوال کیا نماز میں ہنسنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

(ابوقتادہ، بستی بلوچاں فروکہ ضلع سرگودھا)

الجواب اس پر اجماع ہے کہ نماز میں با آواز بلند ہنسنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ دیکھئے الاوسط لابن المنذر (۴۹)

اور اس میں اختلاف ہے کہ نماز میں با آواز بلند ہنسنے سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں؟

اہل الرائے کا مسلک یہ ہے کہ وضو بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ اس بارے میں وہ ضعیف و موضوع روایات پیش کرتے ہیں۔ عبدالحئی لکھنوی نے ایک رسالہ لکھا ہے: ''**الھسھسة بنقض الوضوء بالقھقھة**'' یہ ایسا رسالہ ہے جس پر بے اختیار ہنسنے کو جی چاہتا ہے کیونکہ مولف مذکور اپنے دعویٰ پر ایک بھی صحیح یا حسن روایت پیش نہیں کر سکے۔ پھر بڑے سائز کے اکیس (۲۱) صفحات سیاہ کرنے کا کیا فائدہ؟

اس رسالے میں لکھنوی صاحب تمہید و اقوال کے بعد جو پہلی روایت لائے ہیں اُس

میں ہشام بن حسان مدلس ہیں۔ امام ابن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''وحديث الضحك في الصلوٰة ومرسل الزهري ليس بشيءٍ'' نماز میں ہنسنے (سے وضو ٹوٹنے) والی حدیث اور زہری کی مرسل روایت (دونوں) کچھ چیز نہیں ہے۔ (السنن الکبریٰ للبیہقی ۱/۱۴۸، وسندہ صحیح)

اس ضعیف روایت کے مقابلے میں سیدنا جابر بن عبداللہ الانصاری رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ وہ نماز میں ہنسنے سے وضو کے قائل نہیں تھے۔ (السنن للدارقطنی ۱/۱۷۲ ح ۶۵۰ وسندہ صحیح)

عطاء بن ابی رباح فرماتے تھے: ''وليس عليه وضوء'' اور اس پر (دوبارہ) وضو نہیں ہے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ۱/۳۸۷ ح ۳۹۱۳ وسندہ صحیح)

عروہ بن الزبیر بھی ہنسنے کی وجہ سے دوبارہ وضو کے قائل نہیں تھے۔

(ابن ابی شیبہ ۱/۳۸۷ ح ۳۹۱۹ وسندہ صحیح)

امام احمد آواز کے ساتھ ہنسنے سے دوبارہ وضو کے قائل نہیں تھے۔

(مسائل ابی داود ص ۱۳، ومسائل ابن ہانی ۱/۷)

امام شافعی بھی اس کے قائل تھے کہ ہنسنے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ (کتاب الام ۱/۲۱)

خلاصہ یہ کہ نماز میں آواز کے ساتھ ہنسنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے لیکن وضو نہیں ٹوٹتا۔

[الحدیث: ۲۰]

مساجد کا بیان

تحیۃ المسجد کا حکم

سوال مسجد میں داخل ہونے کے بعد بیٹھنے سے پہلے دو رکعت پڑھنی فرض ہیں یا مستحب اور اگر پڑھے بغیر بیٹھیں تو گناہ تو نہیں ہے؟ (ظفر اقبال، شکرگڑھ)

الجواب یہ دو رکعتیں فرض نہیں ہیں لیکن بہتر اور افضل یہی ہے کہ بیٹھنے سے پہلے دو رکعتیں ضرور پڑھے۔ دلیل کے لئے دیکھئے سنن ابی داود (ح ۴۶۷، ۴۶۸) والسنن الکبریٰ للبیہقی (۲/۲۰ وسندہ حسن) [شہادت، اگست ۲۰۰۰ء]

سوال کیا تحیۃ المسجد لازم ہے یا کہ تاکیداً اُس کا حکم آیا ہے؟ (ایک سائل)

الجواب تحیۃ المسجد فرض یا واجب نہیں ہے جیسا کہ ((إلا أن تتطوع)) والی حدیث سے ثابت ہوتا ہے۔
تفصیل کے لئے دیکھئے المحلی (ج ۲ ص ۲۲۶ تا ص ۲۳۲ مسئلہ نمبر ۲۷۰)

لہٰذا جن احادیث میں حکم آیا ہے، ان سے مراد تاکید و ترغیب ہے۔ واللہ اعلم

حدیثِ امر پر علامہ نووی نے ''استحباب تحية المسجد بركعتين إلخ'' کا باب باندھا ہے۔ جمہور علماء اس حدیث میں حکم کو استحباب پر محمول کرتے ہیں۔

حافظ ابن حجر العسقلانی نے کہا: '' و اتفق أئمة الفتوى على أن الأمر في ذلك للندب '' إلخ اس پر ائمۂ فتویٰ کا اتفاق ہے کہ اس (حدیث) میں امر استحباب کے لئے ہے۔ (فتح الباری ج ۱ ص ۵۳۷ تحت ح ۴۴۴) [شہادت، جنوری ۲۰۰۰ء]

فائدہ: امام نسائی نے ایک صحیح حدیث سے یہ استنباط کیا ہے کہ مسجد میں دو رکعتیں پڑھے بغیر بیٹھنا بھی جائز ہے۔ دیکھئے سنن النسائی (۲/۵۳، ۵۴ ح ۷۳۲ [باب] الرخصة فی الجلوس فيه والخروج منه بغير صلاة)

مساجد اور صحیح سمتِ قبلہ

سوال سائل کا تعلق ڈیرہ غازی خان شہر سے ہے۔ ہمارے شہر میں قبلے کا رخ مغرب میں تھوڑا ترچھا ہے اور شہر کے تمام مسالک: دیوبندی، بریلوی، اہلِ حدیث (اور) شیعہ حضرات کی مسجدیں اسی رخ میں بنی ہوئی ہیں اور بغیر کسی اختلاف کے لوگ اسی رخ میں مساجد بنا رہے ہیں۔ لیکن ہمارے شہر میں ایک مسجد والوں نے مسجد کا رخ مغرب میں سیدھا کر دیا ہے اور متولی مسجد کا کہنا ہے کہ اس طرح رخ کرنے سے قبلہ رخ میں کوئی فرق نہیں پڑتا اور آپ کی نمازوں کا میں ذمہ دار ہوں جب کہ متولی صاحب نہ تو عالم ہیں، نہ مفتی ہیں نہ قاری ہیں۔ جب کہ قبلہ نما میٹر سے قبلہ کا رخ مغرب میں ترچھا ہی آتا ہے۔ آپ سے التماس ہے کہ آپ ہمیں قرآن وسنت کی روشنی میں بتائیں کہ کیا اُن کی یہ بات ٹھیک ہے؟ اور یہ کہ بقیہ اہلِ شہر جو مساجد کا رخ مغرب میں ترچھا کر کے بنا رہے ہیں جو کہ قبلہ نما میٹر کے عین مطابق ہے وہ سب غلط ہے؟ یا یہ لوگ کسی نئے فتنہ کا آغاز کر رہے ہیں؟

جب کہ مسافر ہونے کی صورت میں قبلہ کی صحیح سمت کا علم نہ ہونے کی وجہ سے جس طرف منہ کرے گا نماز ہو جائے گی۔ لیکن اگر علم ہو جائے کہ قبلہ کا رخ صحیح سمت میں نہیں بلکہ سیدھا ہے تو اس صورت میں بھی نماز ہو جائے گی؟

اس سوال کے جواب کے سلسلے میں براہِ مہربانی فتویٰ ارسال فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔ فتویٰ قرآن وحدیث کی روشنی میں ہو۔ ضروری ہے کہ فتویٰ ہمیں ارسال کریں کیونکہ ہمیں کسی بھی ساتھی کو سمجھانا ہو یا دکھانا ہو تو علمائے کرام کا فتویٰ دکھایا جا سکے اور اصلاح ہو سکے۔

(عبدالوہاب، ڈیرہ غازی خان)

الجواب ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ﴾ پس آپ (نماز میں) اپنا چہرہ مسجدِ حرام (بیت اللہ) کی طرف پھیر دیں اور تم جہاں کہیں بھی ہو (نماز میں) اپنے چہرے اسی طرف

پھیرو۔ (سورۃ البقرہ:۱۴۴)

نبی کریم ﷺ نے مسیٔ الصلوٰۃ کو حکم دیا: ((إذا قمت إلی الصلوٰۃ فأسبغ الوضوء ثم استقبل القبلة فكبر .)) جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو پورا وضو کرو پھر قبلہ رُخ ہو کر تکبیر (اللہ اکبر) کہو۔ (صحیح بخاری، کتاب الاستئذان باب من رد فقال: علیک السلام ح ۶۲۵۱، صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ باب وجوب قراءۃ الفاتحہ فی کل رکعۃ ح ۴۶/ ۳۹۷ وترقیم دارالسلام: ۸۸۶)

ان دلائل اور دیگر دلائل سے ثابت ہے کہ نمازی کو حالتِ نماز میں بیت اللہ کی طرف رُخ کرنا چاہئے اور اسی پر اُمت کا اجماع ہے۔

جب مسلمانوں کو نماز میں قبلہ رُخ کرنے کا حکم دیا گیا تو سب کعبہ کی طرف پھر گئے۔
دیکھئے صحیح بخاری (ح ۴۰۳) وصحیح مسلم (ح ۵۲۶ وترقیم دارالسلام: 1178)

رسول اللہ ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے مکے کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھی۔ (دیکھئے صحیح بخاری: ۴۰)
معلوم ہوا کہ مکہ سے باہر اور دُور والوں کے لئے یہ حکم ہے کہ مکہ کی طرف رُخ کر کے فرض نمازیں پڑھیں۔ نوافل کیلئے سواری کی حالت میں دوسرا حکم ہے جس کا ہمارے موضوع سے فی الحال کوئی تعلق نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر۱: بیت اللہ کے پاس بیت اللہ کی طرف رُخ کر کے اور مکہ سے باہر مکہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنا فرض ہے۔

مسئلہ نمبر۲: جان بوجھ کر، علم ہو جانے کے باوجود بیت اللہ سے ہٹ کر کسی دوسری طرف رُخ کر کے نماز پڑھنا جائز نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر۳: اپنی پوری کوشش کے باوجود اگر سمتِ قبلہ میں کوئی غلطی ہو جائے تو معاف ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ((مابین المشرق والمغرب قبلة .))
مشرق اور مغرب کے درمیان جو ہے وہ (مدینہ والوں کے لئے) قبلہ ہے۔

(سنن الترمذی: ۳۴۴ وقال: ''ھذا حدیث حسن صحیح'' وسندہ حسن)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: '' ما بین المشرق والمغرب قبلة . '' مشرق اور مغرب کے

درمیان (مدینے والوں کا) قبلہ ہے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ۲/۳۶۲ ح ۷۴۳۰ وسندہ صحیح)

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "ما بین المشرق و المغرب قبلة"

(ابن ابی شیبہ ۲/۳۶۲ ح ۷۴۳۲ وسندہ صحیح)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "ما بین المشرق و المغرب قبلة إذا توجهت قبل البیت." جب تم بیت اللہ کی طرف رُخ کرلو تو مشرق اور مغرب کے درمیان قبلہ ہے۔

(السنن الکبریٰ للبیہقی ۲/۹ وسندہ حسن، نافع بن ابی نعیم حسن الحدیث وثقہ الجمہور وأخطأ ابن الترکمانی فتکلم فیہ بجروح مرجوحۃ)

خلاصۃ التحقیق: نمازوں میں حتی الوسع کعبہ (بیت اللہ) مکہ کی طرف ہی رُخ کرنا چاہئے۔ جان بوجھ کر مکہ (بیت اللہ) کے علاوہ کسی دوسری طرف رُخ کر کے فرض نماز پڑھنا جائز نہیں ہے۔ اگر سمتِ قبلہ میں اجتہادی غلطی ہو جائے تو معاف ہے۔

سائل کے سوال کا مختصر جواب: بشرطِ صحتِ سوال عرض ہے کہ جن لوگوں نے بغیر کسی واضح دلیل کے مسجد کا رخ قبلے کی طرف سے ہٹا کر مغرب کی طرف سیدھا کر دیا ہے، اُن کا یہ عمل غلط ہے اور اس سے بڑا فرق پڑتا ہے کیونکہ عین ممکن ہے کہ اس طرح کی حرکت سے لوگ بجائے مکہ کے قبلۂ اول کی طرف نماز پڑھ رہے ہوں۔ کوئی شخص کسی کی نمازوں کا کبھی ذمہ دار نہیں ہوتا لہٰذا متولی کا قول باطل ہے۔ وما علینا إلا البلاغ (۳/اگست ۲۰۰۷ء)

[الحدیث: ۴۱]

مسجد کو کسی دوسری ہیئت (حالت) میں بدلنا؟

سوال ہمارے گاؤں کے ساتھ ایک اور گاؤں ہے۔ اس گاؤں کے باہر ایک مسجد تھی لیکن اب گاؤں والوں نے گاؤں کے اندر ہی نئی مسجد بنالی ہے۔ پوچھنا یہ ہے کہ کیا اب ہم اس پہلی مسجد کو جو بالکل بند پڑی ہے اسے سکول بنا سکتے ہیں یا مسجد کی عمارت شہید کر کے اسے عید گاہ بنا سکتے ہیں؟ کیونکہ مسجد بالکل بند ہے۔ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب دیں۔

(ایک سائل)

الجواب بہتر یہ ہے کہ مسجد کو تبدیل نہ کیا جائے بلکہ اسے آباد کیا جائے۔ اگر اس

گاؤں کے صحیح العقیدہ لوگ بالاتفاق اسے عیدگاہ میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں تو حافظ عبداللہ روپڑی رحمہ اللہ کی تحقیق میں ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے راستہ تنگ ہونے کی وجہ سے مسجد کا کچھ حصہ راستہ میں ملا کر اس کو فراخ کر دیا۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ ابن تیمیہ'' (فتاویٰ اہل حدیث ج۱ص ۳۴۹)

اس سلسلے میں انھوں نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے عمل سے بھی استدلال کیا ہے کہ انھوں نے جامع مسجد، کھجوروں کے تاجروں سے بدل کر دوسری جگہ لے گئے اور وہاں بازار بن گیا۔ (ایضاً)

اس کے برعکس بعض علماء کی تحقیق یہ ہے کہ جہاں مسجد بن جائے اسے قیامت تک تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ واللہ اعلم [شہادت، جولائی ۱۹۹۹ء]

مسجد کے فنڈ کو ذاتی استعمال میں لانا کیسا ہے؟

سوال زید مسجد کا خزانچی ہے، وہ مسجد کے فنڈ کو ذاتی استعمال میں لاتا ہے جب مسجد کو ضرورت پڑتی ہے تو وہ فنڈ دے دیتا ہے کیا ایسا کرنا قرآن وسنت کی رو سے جائز ہے؟

(حبیب اللہ، سیالکوٹ)

الجواب آپ کے سوال کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص مثلاً زید مسجد کا خزانچی ہے۔ اس کے پاس فنڈ میں سو سو کے دس نوٹ یعنی ایک ہزار روپیہ امانت موجود ہے۔ وہ ان جمع شدہ نوٹوں کو اپنے کاروبار میں خرچ کر دیتا ہے۔ جب مسجد کے لئے ضرورت پڑتی ہے تو وہ اسی طرح کے دوسرے دس نوٹ یا پانچ سو کے دو نوٹ وغیرہ دے کر ایک ہزار روپیہ پورا کر دیتا ہے۔ میرے خیال میں اگر مسجد کمیٹی اور چندہ دہندگان کو کوئی اعتراض نہیں تو ایسا کرنا جائز ہے۔ اس لئے کہ نوٹ بدلنے سے مالیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ واللہ اعلم [شہادت، جولائی ۱۹۹۹ء]

اذان کے مسائل

قبلہ رخ ہوکراذان کہنا

سوال کیا اذان کہتے وقت قبلہ رُخ ہونے کے بارے میں کوئی صحیح یا ضعیف روایت موجود ہے؟ (ایک سائل)

الجواب معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ میں نے نینداور بیداری کی درمیانی حالت میں دیکھا: ایک آدمی کھڑا تھا، جس نے دوسبز کپڑے پہن رکھے تھے، اس نے قبلہ رخ ہوکر اذان کہی۔

(السنن الکبریٰ للبیہقی ۳۹۱/۱ وقال: مرسل)

یہ سند ضعیف ہے، عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کی معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے ملاقات نہیں ہوئی۔
یہ روایت دوسری سند کے ساتھ سنن ابی داود (ح ۵۰۶) میں ہے۔ اس میں " أصحابنا " مجہول ہیں۔ یہ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ عن معاذ کی سند سے بھی مختصراً موجود ہے، سنن ابی داود میں قبلہ رخ ہونے کا کوئی ذکر نہیں ہے، سنن ابی داود والی سند بھی ضعیف ہے۔
اس سلسلے میں ایک دوسری روایت کی طرف امام ابن المنذر رنے اشارہ کیا ہے۔
یہ روایت سعد القرظ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ " وإن بلالاً كان إذا كبر بالأذان استقبل القبلة " بے شک بلال (رضی اللہ عنہ) اذان کی تکبیر کہتے وقت قبلے کی طرف رخ کرتے تھے۔ (المعجم الکبیر للطبرانی ۳۹/۶ ح ۵۴۴۸)

اس روایت کی سند ضعیف ہے اس میں عبدالرحمٰن بن عمار بن سعد المؤذن: ضعیف ہے اور عمار بن سعد مجہول الحال ہے۔ ان دونوں روایتوں کے ضعیف ہونے کی طرف ابن المنذر رنے اشارہ کردیا ہے۔

امام ابن المنذر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ " أجمع أهل العلم على أن من السنة أن تستقبل القبلة بالأذان " اس پر علماء کا اجماع ہے کہ اذان کہتے وقت قبلہ رخ ہونا سنت ہے۔ (الاوسط ۲۸/۳)

نیز فرماتے ہیں: " وأجمعوا على أن من السنة أن تستقبل القبلة بالأذان "

اور اس پر اجماع ہے کہ اذان کہتے وقت قبلہ رخ ہونا چاہیے۔ (الاجماع: ص ۷، فقرہ: ۳۹)
نیز دیکھئے موسوعۃ الاجماع فی الفقہ الاسلامی (۹۳/۱)

عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ کیا قبلہ رخ ہو کر اذان کہنی چاہیے؟ تو انھوں نے فرمایا: جی ہاں (مصنف عبدالرزاق ۴۶۵/۱ ح ۱۸۰۲ وسندہ صحیح)

محمد بن سیرین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "إذا أذن المؤذن استقبل القبلة"
جب مؤذن اذان کہے تو اسے قبلہ رخ ہونا چاہیے۔ (مصنف عبدالرزاق: ۴۶۶/۱ ح ۱۸۰۴ وسندہ صحیح)

سیدنا ابوامامہ بن سہل رضی اللہ عنہ کے سامنے مؤذن نے قبلہ رخ ہو کر اذان دی۔

(مسند السراج: ۷۱ وسندہ حسن، وقال الشیخ ارشاد الحق الاثری: "إسنادہ صحیح")

خلاصہ: اذان میں قبلہ کی طرف رخ کرنا اجماع سے ثابت ہے، والحمدللہ [الحدیث: ۴]

نومولود کے کان میں اذان کہنا

سوال کیا بچے کی پیدائش پر دائیں کان میں اذان اور اذان میں الصلوٰۃ خیر من النوم پڑھنا اور بائیں کان میں اقامت پڑھنا ثابت ہے؟ مسنون طریقہ کیا ہے؟

(محمد صدیق سلفی، ایبٹ آباد)

الجواب الصلوٰۃ خیر من النوم کا ثبوت میرے علم میں نہیں ہے، رہا اذان اور اقامت کا کہنا تو اس کی بنیاد چند ضعیف روایات پر قائم ہے:

(الف) سنن ابی داود (کتاب الادب باب فی المولود فیؤذن فی اذنہ ح ۵۱۰۵) سنن الترمذی (کتاب الاضاحی باب الاذان فی اذن المولود ح ۱۵۱۴) مسند احمد (ج ۶ ص ۳۹۱) السنن الکبریٰ للبیہقی (ج ۹ ص ۳۰۵) مصنف عبدالرزاق (ج ۴ ص ۳۳۶ وغیرہ) میں عاصم بن عبیداللہ عن عبیداللہ بن ابی رافع عن ابی رافع کی سند سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسن بن علی بن ابی طالب کے کان میں اذانِ نماز دی تھی، جب وہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ اسے امام ترمذی نے حسن صحیح کہا لیکن اس کی سند ضعیف ہے۔ اس کا راوی عاصم بن عبیداللہ جمہور محدثین کے نزدیک حافظے کی خرابی کی وجہ سے ضعیف ہے۔

حافظ ابن حجر نے تقریب التہذیب (۳۰٦۵) میں اسے "ضعیف" ہی لکھا ہے۔

(ب) مسند ابی یعلیٰ (ج ۱۲ص ۱۵۰ح ٦۷۸۰) عمل الیوم واللیلۃ لابن السنی (٦۲۳) شعب الایمان للبیہقی (ج ٦ص ۳۹۰ ح ۸٦۱۹) تاریخ ابن عساکر والامالی لابن بشران (بحوالہ السلسلۃ الضعیفۃ للالبانی ج ۱ص ۳۲۹، ۳۲۱) وغیرہ کتابوں میں یحییٰ بن العلاء الرازی عن مروان بن سالم عن طلحہ بن عبیداللہ العقیلی عن الحسین (یا الحسن) بن علی کی سند سے مروی ہے کہ جس شخص کا بیٹا (یا بیٹی) پیدا ہو، وہ اس کے دائیں کان میں اذان اور بائیں میں اقامت کہے تو اسے بچوں کی بیماری نہیں لگے گی۔

یہ سند موضوع ہے۔ یحییٰ بن العلاء کذاب ہے، مروان بن سالم متروک متہم ہے اور طلحہ بن عبیداللہ العقیلی مجہول ہے لہٰذا یہ روایت مردود ہے۔ اسے پہلی روایت کا شاہد بنانا غلط ہے۔

(ج) امام بیہقی نے شعب الایمان (ج ٦ص ۳۹۰، ۸٦۲۰) میں محمد بن یونس (الکدیمی) عن الحسن بن عمرو بن سیف عن القاسم بن مطیب عن منصور بن صفیہ عن ابی معبد عن ابن عباس کی سند سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے حسن بن علی کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہی تھی۔

اس کی سند موضوع ہے۔ محمد بن یونس الکدیمی مشہور کذاب ہے۔

دیکھئے میزان الاعتدال وغیرہ نیز الحسن بن عمرو بن سیف بھی کذاب ومتروک ہے۔

دوہری اذان کا مسئلہ

سوال اذان کہنے کے بارے میں وضاحت فرمائیں کہ کون سی اذان دوہری اور کون سی اکہری ہو یا کہ تمام اذانیں دوہری دینی چاہئیں؟

(ب) دوہری اذان کے بارے میں کتبِ ستہ میں جو مختلف احادیث وارد ہیں، ان میں تضاد ہے، ان کی وضاحت فرمائیں، ہمارے یہاں اس مسئلہ میں کافی اختلاف ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ دوہری اذان جائز نہیں ہے اور وہ مسجد میں دوہری اذان کہنے نہیں دیتے

بلکہ دوہری اذان کہنے والے کے ساتھ جھگڑا کرتے ہیں جبکہ دوسرا فریق کہتا ہے کہ اکہری اذان بھی جائز ہے اور دوہری بھی جائز ہے، دونوں کہی جاسکتی ہیں۔ دونوں گروپ اپنے اپنے موقف میں شدت اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کسی وقت کوئی حادثہ رونما ہوجائے لہٰذا براہِ مہربانی تفصیل سے اس بارے میں جواب دیں۔

(د) ابومحذورہ رضی اللہ عنہ صحابی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ کا مؤذن مقرر کیا تھا جو کہ مسلم شریف کی حدیث میں موجود ہے، کیا یہ تمام اذانیں دوہری کہتے تھے یا کبھی دوہری اور کبھی اکہری، اور انھیں کب مؤذن مقرر کیا گیا اور کب تک یہ بیت اللہ کے مؤذن رہے، جب تک یہ مؤذن رہے، دوہری اذانیں دیتے رہے یا اکہری یا دونوں طرح؟

براہ مہربانی تفصیل سے اور جلد جواب دیں۔ (ایک سائل)

الجواب دوہری اذان، جس میں ''أشهد أن لا إله إلا الله اور أشهد أن محمد رسول الله'' چار دفعہ ہوتا ہے جبکہ اکہری اذان میں دو مرتبہ دونوں طرح جائز ہے۔ یہ عمل تمام اذانوں میں بھی جائز ہے تاہم یاد رہے کہ جب دوہری اذان ہوگی تو اقامت بھی دوہری ہوگی اور اگر اکہری اذان ہوگی تو اقامت بھی اکہری ہوگی۔ دوہری اذان اکہری اقامت اور اکہری اذان دوہری اقامت کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے۔

(دیکھئے ہدیۃ المسلمین ص ۲۰، ۲۱، دوسرا نسخہ ۲۹، ۳۰)

راقم الحروف کا اس سلسلے میں ایک تحقیقی مضمون ''الاعتصام لاہور'' میں کافی عرصہ پہلے چھپ چکا ہے۔ والحمدللہ

اس سلسلے کی احادیث میں کوئی تضاد نہیں ہے، دوہری اذان والی روایت صحیح مسلم (۳۷۹) وسنن ابی داود (۵۰۲) وغیرہما میں موجود ہے۔

تنبیہ: صحیح مسلم کے بعض نسخوں میں کاتب کی غلطی سے دوسری مرتبہ والا ''اللہ اکبر اللہ اکبر'' رہ گیا ہے۔

(دیکھئے درسی نسخہ، حاشیہ ج ۱ ص ۱۶۵، والسنن الکبریٰ للبیہقی ج ۱ ص ۳۹۲، ۳۹۳)

سیدنا ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کو غزوۂ حنین کے بعد اذان سکھائی گئی تھی۔ اس کے بعد آپ ۵۹ھ تک مؤذن رہے۔ (دیکھئے سیر اعلام النبلاء ج ۳ ص ۱۱۷، ۱۱۸، وغیرہ)

لیکن اس بارے میں کوئی صراحت نہیں ہیکہ ان کی تمام اذانیں دوہری ہوتی تھیں یا اکہری! دونوں طرح اذان کا ثبوت کتبِ حدیث میں موجود ہے لہٰذا اس میں شدت اختیار نہیں کرنی چاہئے۔ [شہادت، جولائی ۲۰۰۰ء]

فجر کی دو اذانیں اور مسئلۂ تثویب

سوال (الف) بعض علماء کے نزدیک فجر کی دو اذانیں ہیں، ایک صبح صادق سے کچھ دیر قبل اور دوسری طلوع صبح صادق پر۔

(ب) پہلی اذان میں تثویب (الصلوٰۃ من النوم) کہا جائے۔

(ج) دونوں کے درمیان وقفہ تھوڑا (تقریباً دس منٹ) ہو۔

کیا یہ باتیں مسنون و جائز ہیں؟ حقیقی مسلک سے آگاہ فرمائیں۔

اس مسلک کے علماء میں:

(۱) البانی بحوالہ تمام المنہ تخریج و تعلیق فقہ السنہ اور الارواء (صحیح ابی داود ۲/۱۵۴ ح ۵۱۶)

(۲) شیخ الحدیث حافظ ثناء اللہ مدنی بحوالہ ہفت روزہ الاعتصام لاہور (مجریہ ۹۸-۸-۱۴)

(۳) مولانا محمد منیر قمر سیالکوٹی بحوالہ فقہ الصلوٰۃ (جلد دوم صفحہ نمبر ۱۵۲ تا ۱۵۶)

(۴) حافظ عبدالرؤف سندھو بحوالہ القول المقبول فی تخریج و تعلیق صلوٰۃ الرسول (طبع ۱۹۹۷ء) شامل ہیں۔ (محمد صدیق سلفی، ایبٹ آباد)

الجواب فجر کی دو اذانیں ہیں:

ایک طلوع فجر کے بعد اور دوسری اقامتِ صلوٰۃ کے وقت جسے اقامت بھی کہتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((بین کل أذانین صلوٰۃ))

ہر دو اذانوں کے درمیان نماز ہے۔ (صحیح بخاری: ۶۲۴، صحیح مسلم: ۸۳۸)

ایک تیسری اذان ہے جو طلوع فجر سے پہلے دی جاتی ہے، اسے رات کی اذان کہتے ہیں،

جیسا کہ فرمانِ رسول ﷺ ہے: ((إن بلالاً یؤذن بلیل .))

بے شک رات کی اذان بلال دیتے ہیں۔ (صحیح بخاری: ۶۲۲، صحیح مسلم: ۱۰۹۲)

جن احادیث میں آیا ہے کہ "الصلوٰة خیر من النوم" کے الفاظ صبح کی پہلی اذان میں ہیں، ان کا مطلب یہ ہے کہ طلوعِ فجر کے بعد صبح کی دو اذانوں (اذان و اقامت) میں سے پہلی اذان (یعنی اذانِ عرفی) میں یہ الفاظ کہے جائیں گے نہ کہ اقامت میں۔

رہی رات کی اذان جو صبح سے پہلے دی جاتی ہے تو اس میں "الصلوٰة خیر من النوم" کے الفاظ ثابت نہیں ہیں۔ صحیح ابن خزیمہ (ج۱ص۲۰۲) سنن الدارقطنی (ج۱ص۲۴۳) اور السنن الکبریٰ للبیہقی (ج۱ص۴۲۳) میں صحیح سند کے ساتھ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "من السنة إذا قال المؤذن في أذان الفجر حي علی الصلوٰة قال: الصلوٰة خیر من النوم ." سنت میں سے یہ ہے کہ جب مؤذن صبح کی اذان میں حي علی الصلوٰة کہے تو الصلوٰة خیر من النوم کہے۔

صحابی کا من السنة کہنا، مرفوع حدیث کہلاتا ہے جیسا کہ اصولِ حدیث میں مقرر ہے۔

سیدنا ابو محذورہ رضی اللہ عنہ فجر کی اذان میں الصلوٰة خیر من النوم کہتے تھے۔

دیکھئے سنن ابی داود (۵۰۴ و سندہ صحیح)

خلاصہ یہ کہ طلوعِ فجر کے بعد صبح کی اذان اول میں "الصلوٰة خیر من النوم" کے الفاظ کہنے چاہئیں۔ طلوعِ فجر سے پہلے، تہجد والی اذان میں یہ الفاظ قطعاً ثابت نہیں ہیں۔

اس سلسلے میں شیخ امین اللہ البشاوری حفظہ اللہ نے لکھا ہے:

" وإن قول الشیخ الألباني حفظه الله ضعیف في هذه . "اور بے شک اس مسئلے میں شیخ البانی حفظہ اللہ (رحمہ اللہ) کا قول ضعیف ہے۔ (فتاویٰ الدین الخالص ج۳ص۲۲۵)

شیخ ثناء اللہ مدنی، شیخ محمد منیر قمر سیالکوٹی اور حافظ عبدالرؤف سندھو حفظہم اللہ نے اس مسئلے میں (شاید) بغیر تحقیق کے شیخ البانی حفظہ اللہ (رحمہ اللہ) کی پیروی کی ہے۔ واللہ اعلم

وسبحان من لا یسھو

[شہادت، اکتوبر ۲۰۰۰ء]

اذانِ جمعہ کا مقام

سوال جمعہ کے دن خطبہ سے پہلے اذان کہاں دینی چاہیے؟

(حافظ شفیق باغ، آزاد کشمیر)

الجواب صحیح بخاری (ج۱ص۱۲۴ح ۹۱۲) میں ابن ابی ذئب عن الزہری عن السائب بن یزید رضی اللہ عنہ کی سند سے روایت ہے کہ ''کان النداء یوم الجمعة أوله إذا جلس الإمام علی المنبر علی عهد النبي ﷺ ... '' إلخ جمعہ کے دن پہلی (یعنی خطبہ والی) اذان نبی ﷺ کے دور میں اس وقت دی جاتی تھی جب امام منبر پر بیٹھ جاتا تھا.....الخ

یہی روایت امام طبرانی نے سلیمان التیمی عن الزہری عن السائب کی سند سے روایت کی ہے:
'' کان النداء علی عهد رسول الله ﷺ و أبي بکر و عمر رضي الله عنهما عند المنبر .... '' إلخ رسول اللہ ﷺ، ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں (جمعہ کی) اذان منبر کے قریب ہوتی تھی۔ (ج۷ص۱۴۶، ۱۴۷ح ۶۶۴۶)

سلیمان التیمی ''ثقہ عابد'' تھے۔ (تقریب التہذیب: ۲۵۷۵)

آپ کی روایات کتبِ ستہ میں موجود ہیں۔

(حافظ ابن حجر کے نزدیک) آپ پر تدلیس کا الزام غلط ہے۔

دیکھئے النکت علی ابن الصلاح (ج۲ص۶۳۷۔۶۳۸)

لیکن صحیح یہ ہے کہ آپ مدلس تھے۔ دیکھئے تاریخ ابن معین (روایۃ الدوری: ۳۶۰۰)
نیز میری کتاب الفتح المبین فی تحقیق طبقات المدلسین (ص۴۲) اور یہ روایت آپ کی تدلیس کی وجہ سے ضعیف ہے۔

سنن ابی داود (۱۰۸۸) میں ایک روایت محمد بن اسحاق عن الزہری عن السائب کی سند سے ہے کہ '' کان یؤذن بین یدي رسول الله ﷺ إذا جلس علی المنبر یوم الجمعة علی باب المسجد ... '' إلخ رسول اللہ ﷺ جب جمعہ کے دن منبر پر

بیٹھتے تو مسجد کے دروازے پر اذان دی جاتی تھی۔

یہ روایت ضعیف اور منکر ہے۔ محمد بن اسحاق اگر چہ صدوق حسن الحدیث راوی ہیں لیکن مشہور مدلس ہیں اور یہ روایت عن سے ہے لہٰذا یہ سند ضعیف ہے اور صحیح بخاری والی حدیث کے مفہوم سے بھی بعید تر معلوم ہوتی ہے، راجح یہی ہے کہ اذان ممبر کے قریب کہنی چاہئے۔ واللہ اعلم [شہادت، دسمبر ۲۰۰۰ء]

اذان کے بعد درود پڑھنا

سوال اذان کے الفاظ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ سن کر نبی کریم ﷺ پر درود بھیجنا چاہئے یا نہیں؟ کیا اذان کے بعد بھیجا جانے والا درود ان الفاظ کو سننے پر کفایت کرے گا یا نہیں؟ اخوکم فی الدین۔ (ابوقتادہ بستی بلوچاں فروکہ ضلع سرگودھا)

الجواب صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ اذان کے بعد درود پڑھنا چاہئے۔ اذان کے دوران میں درود پڑھنا میرے علم کے مطابق ثابت نہیں ہے بلکہ صحیح مسلم (۳۸۵) کی مرفوع حدیث اور صحیح بخاری (۶۱۲) میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے عمل سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ "اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" کے جواب میں یہی کلمات دوہرائے جائیں اور بعد میں درود پڑھا جائے لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اذان ختم ہوتے ہی درود پڑھیں۔

واللّٰہ أعلم (۱۶/ رمضان ۱۴۲۶ھ) [الحدیث: ۲۰]

اقامت مؤذن کا حق ہے

سوال ہم نے سنا ہے کہ حدیث میں ہے کہ جو اذان دے وہی تکبیر بھی کہے، کیا یہ درست ہے؟ (نیک محمد کھوسا، مانجھی پورہ)

الجواب جو شخص اذان دے وہی اقامت کہے۔ یہ روایت ابو داود (۵۱۴) اور ترمذی (ح ۱۹۹) نے بیان کی ہے۔ اس کی سند عبدالرحمٰن الافریقی کی وجہ سے ضعیف ہے۔ (نیل المقصود فی التعلیق علی سنن ابی داود ص ۱۸۳)

اس کے تمام شواہد ضعیف ہیں۔ سنن ابی داود (۵۱۲، ۵۱۳) اور السنن الکبریٰ للبیہقی (۱/۳۹۹) کی ایک ضعیف روایت سے واضح ہوتا ہے کہ مؤذن کے علاوہ دوسرا شخص بھی اقامت کہہ سکتا ہے۔ امام بیہقی نے ابومحذورہ سے صحیح سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ انھوں نے اذان کہی اور خود اقامت بھی کہی۔ (ایضاً وقال: ''وھذا اسنادہ صحیح شاھد لما تقدم'')

امام بیہقی نے اس اثر کو، مذکورہ روایت (سنن ابی داود: ۵۱۴) کا شاہد قرار دیا ہے۔

اس اثر کی رُو سے راجح یہی ہے کہ موذن ہی اقامت کہے اور اگر کسی وجہ سے کوئی دوسرا اقامت کہہ دے تو بھی جائز ہے۔ واللہ اعلم [شہادت، مئی ۱۹۹۹ء، اگست ۲۰۰۱ء]

اقامت کہنے والا کہاں کھڑا ہو؟

سوال جماعت کھڑی ہونے پر دائیں طرف سے اقامت کہنا ضروری ہے یا مستحب؟ صف میں بائیں طرف کھڑا شخص اقامت کہے تو لوگ اعتراض کرتے ہیں۔

(محمد صدیق سلفی، ایبٹ آباد)

الجواب کسی حدیث میں یہ تعین نہیں ہے کہ اقامت بائیں طرف سے نہ کہی جائے لہٰذا دائیں طرف ہو یا بائیں طرف یا امام کے بالکل پیچھے، ان سب حالتوں میں اقامت کہنا جائز ہے۔ ان میں سے کسی ایک حالت پر لوگوں کا اعتراض صحیح نہیں ہے۔ بائیں طرف (اقامت) کو مکروہ کہنا بلا دلیل ہے۔ [شہادت، اکتوبر ۲۰۰۰ء]

بغیر اقامت کے نمازِ کس حکم میں ہے؟

سوال جمعہ کی نماز بغیر اقامت کے ہو جاتی ہے یا نہیں؟ اگر ایسی جماعت ہو چکی ہو تو کیا لوٹانا ضروری ہے؟ (ظفر اقبال، کامرہ)

الجواب اگرچہ گاؤں، شہر یا جنگل وغیرہ میں نماز باجماعت کے لئے اذان واقامت لازمی ہیں جیسا کہ مشہور احادیث سے ثابت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((فلیؤذن لکم أحدکم ، ولیؤمکم أکبر کم)) تم میں سے ایک اذان کہے اور

سب سے بڑا امامت کرائے۔ (صحیح البخاری: ۶۲۸ وصحیح مسلم: ۶۷۴)

اذان واقامت شعائر اسلام میں سے ہیں۔ تاہم میرے علم میں ایسی کوئی حدیث نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ اگر سہواً یا تعمداً اذان یا اقامت رہ جائے تو نماز نہیں ہوتی۔

بالتعمد اذان واقامت نہ دینا احادیث صحیحہ اور شعائر اسلام کی مخالفت کی وجہ سے انتہائی مذموم عمل ہے تاہم سہو پر اعادہ صلوٰۃ لازم نہیں ہے۔

مشہور تابعی عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ اس بات کے قائل تھے کہ اگر کوئی شخص اقامت بھول جائے تو دوبارہ نماز پڑھنی چاہیے۔

(مصنف عبدالرزاق ۱/ ۵۱۱ ح ۱۹۵۸، مصنف ابن ابی شیبہ ۱/ ۲۱۸ ح ۲۲۷۲، وسندہ صحیح ح ۲۲۷۴، ۲۲۷۵)

مجاہد تابعی رحمہ اللہ کا بھی یہی خیال تھا۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ۱/ ۲۱۸ ح ۲۲۷۳ وسندہ صحیح)

ابراہیم نخعی رحمہ اللہ اس بات کے قائل تھے کہ اقامت بھول جانے کی صورت میں نماز دوبارہ نہیں پڑھی جائے گی۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ۱/ ۲۱۸ ح ۲۲۷۱ وسندہ صحیح)

ان متناقض اقوال میں راجح یہی ہے کہ نماز صحیح ہے اور اس کا اعادہ ضروری نہیں ہے۔

واللہ اعلم

[شہادت، دسمبر ۲۰۰۳ء]

دوسری جماعت کے لئے اقامت کا مسئلہ

سوال ایک ہی نماز کی دوسری جماعت کروانے کے لئے دوبارہ تکبیر کہنی چاہیے یا پہلی تکبیر کافی ہے؟ کہتے ہیں کہ دوبارہ اگر اذان کہی جائے تو پھر دوبارہ تکبیر نہیں کہنی چاہیے۔ کیا یہ صحیح ہے؟ صحیح صورت حال سے آگاہ فرمائیں۔ (ظفر اقبال)

الجواب اس مسئلے کی کوئی مرفوع صریح حدیث میرے میں علم نہیں ہے البتہ علماء کرام کے آثار ضرور موجود ہیں۔

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے ایک مسجد میں آ کر جہاں لوگ نماز (باجماعت) پڑھ چکے تھے، دوبارہ اذان واقامت کہلوائی اور نماز پڑھی۔

(مصنف ابن ابی شیبہ ۱/ ۲۲۱ ح ۲۲۹۸ و السنن الکبریٰ للبیہقی ۱/ ۴۰۷، ۳/ ۷۰، تغلیق التعلیق ۲/ ۲۷۶، ۲۷۷ وقال:

''هذا اسناد صحيح موقوف'' اور صحیح بخاری کتاب الاذان باب فضل صلوۃ الجماعۃ قبل ح ۶۴۵ تعلیقاً)

اس روایت کی سند صحیح ہے اور اس سے دوبارہ اذان واقامت کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر میں اسود اور علقمہ (تابعین) کو نماز پڑھائی تو انھیں اذان یا اقامت کا حکم نہیں دیا۔

(صحیح مسلم کتاب المساجد باب الندب الی وضع الایدی علی الرکب فی الرکوع ح ۵۳۴)

یعنی یہ باجماعت نماز بغیر اذان واقامت کے پڑھی گئی تھی۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

''إذا كنت في قرية يؤذن فيهم ويقام أجزاك ذاك''

اگر تم کسی گاؤں میں ہو جس میں اذان واقامت ہوتی ہو تو تمھارے لئے وہی کافی ہے۔

(کتاب المعرفۃ والتاریخ لیعقوب بن سفیان الفارسی ۲۰۹/۲ وسندہ صحیح، السنن الکبریٰ للبیہقی ۴۰۶/۱)

جہاں اقامت ہو جاتی وہاں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما دوسری اقامت نہیں کہتے تھے۔

(کتاب المعرفۃ والتاریخ ۲۰۹/۲ وسندہ حسن، عبداللہ بن واقد بن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بن الخطاب وثقہ مسلم وابن حبان والحاکم ۲۷۸/۲، ۲۴۸ وذہبی والبیہقی ۴۰۶/۱ فحدیثہ لا ینزل عن درجۃ الحسن)

لہٰذا معلوم ہوا کہ دونوں طرح جائز ہے۔ اگر فتنے وفساد کا اندیشہ نہ ہو تو دوسری مرتبہ بھی (بغیر لاؤڈ سپیکر کے) اذان واقامت کہنا بہتر ہے۔ واللہ اعلم

[شہادت، جولائی ۲۰۰۳ء، اکتوبر ۲۰۰۰ء]

انفرادی نماز اور اقامت

سوال اگر کوئی شخص فرض نماز انفرادی طور پر ادا کرتا ہے۔ گھر میں کسی اور جگہ یا مسجد میں تو اس کے لئے اقامت کہنا لازمی ہے یا نہیں؟ اگرچہ نیت جماعت کی نہ ہو۔ کیونکہ یہاں پر ایک عرب عالم کا کہنا ہے کہ اقامت ضروری ہے اور کچھ تو اذان دینے کے حق میں بھی ہیں اگرچہ (نماز) انفرادی ہی کیوں نہ ہو۔ (محمد عادل شاہ، برطانیہ)

الجواب انفرادی طور پر فرض نماز پڑھنے والے کے لئے اقامت کہنا ضروری نہیں

ہے۔اس بات کے چند دلائل درج ذیل ہیں:

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسود بن یزید اور علقمہ بن قیس کو اپنے گھر میں نماز پڑھائی لیکن انھیں اذان اور اقامت کہنے کا حکم نہیں دیا۔ دیکھئے صحیح مسلم (کتاب المساجد باب الندب الی وضع الایدی علی الرکب فی الرکوع ونسخ التطبیق ح ۵۳۴، ترقیم دارالسلام: ۱۱۹۱)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسجد میں اذان واقامت ہونے کے بعد گھر یا مسجد میں دوسری جماعت کے لئے اذان واقامت ضروری نہیں ہے۔

ایک آدمی مسجد میں آیا اور نماز ہو چکی تھی تو وہ اقامت کہنے لگا۔اسے عروہ بن الزبیر رحمہ اللہ نے کہا: اقامت نہ کہو کیونکہ ہم نے اقامت کہہ دی ہے۔

(مصنف ابن ابی شیبہ ۲۲۱/۱ ح ۲۳۰۵ وسندہ صحیح)

مشہور تابعی اور مفسرِ قرآن امام مجاہد نے فرمایا: اگر تم اپنے گھر میں اقامت سن لو اور چاہو تو تمھارے لئے یہ کافی ہے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ۲۲۰/۱ ح ۲۲۹۶ وسندہ حسن)

عروہ بن الزبیر رحمہ اللہ نے فرمایا: اگر تم سفر میں ہو تو تمھاری مرضی ہے کہ اذان اور اقامت کہو یا صرف اقامت کہہ دو اور اذان نہ کہو۔ (موطأ امام مالک ۷۳/۱ ح ۱۵۶، وسندہ صحیح)

مزید تفصیل کے لئے دیکھئے موطأ امام مالک (روایۃ ابن القاسم، اختصار القابسی بتحقیقی: ۱۹۸)

معلوم ہوا کہ دوسری جماعت کے لئے دوبارہ اذان ضروری نہیں ہے اور انفرادی نماز کے لئے اذان یا اقامت بالکل ضروری نہیں ہے لہٰذا آپ کے علاقے کے عرب عالم کا کہنا صحیح نہیں ہے۔

جن روایات میں ایسی حالت میں اذان کا ذکر آیا ہے وہ استحباب اور جواز پر محمول ہیں۔

نماز کے مسائل

باجماعت نماز کا بیان

اذان سننے کے باوجود مقامی جگہ پر نماز پڑھنا

سوال ہمارے کچھ جماعتی بھائیوں نے مسجد کے قریب دفتر قائم کیا ہے جہاں اذان کی آواز صاف پہنچتی ہے۔ یہ دوست فرض نماز وہیں ادا کرتے ہیں جبکہ مسجد بھی نزدیک ہے اور اذان بھی ان تک پہنچتی ہے تو کیا یہ نماز ہو جاتی ہے؟ (محمد ابراہیم، ٹنڈو آدم)

الجواب صحیح احادیث میں نماز باجماعت سے متعدد فضائل مذکور ہیں مثلاً:
جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے والے کی نماز اکیلے شخص کی نماز سے ستائیس گنا زیادہ درجہ رکھتی ہے۔ (موطأ امام مالک ج ا ص ۱۲۹، صحیح البخاری ج ا ص ۸۹ ح ۶۴۵، صحیح مسلم: ۶۵۰)

بعض ایسی صحیح روایات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا واجب ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: ((من سمع النداء فلم يأته فلا صلاة له إلا من عذر)) جو شخص اذان کی آواز سننے کے باوجود (نماز کے لئے) نہ آئے تو اس کی نماز نہیں ہوتی سوائے یہ کہ اس کے پاس کوئی (شرعی) عذر ہو۔ (سنن ابن ماجہ: ۷۹۳ وھو حدیث صحیح)

اسے ابن حبان (الموارد: ۴۲۶) حاکم (۲۴۵/۱) اور ذہبی نے بخاری ومسلم کی شرط پر صحیح قرار دیا ہے۔ ہشیم نے تاریخ واسط (ص ۲۰۲) میں سماع کی تصریح کر دی ہے نیز قراد ابونوح عبدالرحمٰن بن غزوان (السنن الکبریٰ للبیہقی ۵۷/۳) اور سعید بن عامر نے ان کی متابعت کر رکھی ہے۔

تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب "نیل المقصود فی التعلیق علی سنن ابی داود (ص ۱۹۵ ح ۵۵۱)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بغیر شرعی عذر کے فرض نماز گھر میں یا مقامی جگہ پڑھنا ممنوع ہے۔

ایک صحیح روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک نابینا (سیدنا ابن ام

مکتوم رضی اللہ عنہ) آئے اور گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت مانگی تو آپ نے پوچھا: کیا تم اذان کی آواز سنتے ہو؟ انھوں نے کہا: جی ہاں! پھر آپ نے فرمایا: تو مسجد میں آؤ۔ (صحیح مسلم: ٦٥٣)

مشہور جلیل القدر صحابی سیدنا عبداللہ بن مسعود البدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ہدایت کے طریقے سکھائے۔ ان ہدایت کے طریقوں میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اس مسجد میں نماز ادا کی جائے جس میں اذان دی جاتی ہے (اور ایک روایت میں ہے کہ انھوں نے فرمایا:) اگر تم نماز اپنے اپنے گھروں میں پڑھو گے، جیسے (جماعت سے) پیچھے رہنے والا یہ شخص اپنے گھر میں پڑھ لیتا ہے تو تم اپنے نبی کی سنت کو چھوڑ دو گے اور اگر نبی کی سنت کو چھوڑ دو گے تو گمراہ ہو جاؤ گے۔ الخ (صحیح مسلم: ٦٥٤)

لہٰذا ان جماعتی بھائیوں کو چاہیے کہ فرض نماز ملحقہ مسجد میں ادا کریں۔ [شہادت، مئی ١٩٩٩ء]

نماز باجماعت کے بعد دوسری جماعت

سوال ایک روایت میں آیا ہے کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے اطراف سے آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز ادا کرنا چاہتے تھے۔ آپ نے دیکھا کہ لوگوں نے نماز پڑھ لی ہے تو آپ اپنے گھر کی طرف چلے گئے۔ آپ نے گھر والوں کو جمع کیا۔ پھر ان کے ساتھ نماز پڑھی۔“ کیا یہ روایت صحیح ہے؟ (ایک سائل)

الجواب یہ روایت نہ صحیح ہے نہ حسن۔

اسے حافظ ابن عدی نے الکامل (ج ٦ ص ٢٣٩٨) اور امام طبرانی نے الاوسط (ج ٥ ص ٣٠٤ ح ٤٥٩٨) میں: ”الوليد بن مسلم قال: أخبرني أبو مطيع معاوية بن يحي عن خالد الحذاء عن عبدالرحمن بن أبي بكرة عن أبيه“ کی سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ شیخ ناصر الدین البانی نے حافظ ہیثمی سے ”و رجاله ثقات“ اور اس کے راوی ثقہ ہیں (مجمع الزوائد ج ٢ ص ٤٥) نقل کر کے اسے ”حسن“ قرار دیا ہے۔

(دیکھئے تمام المنہ ج ١ ص ١٥٥، مجلۃ الدعوۃ لاہور، محرم ١٤١٨ھ مئی ١٩٩٧ء ص ٤٤)

حالانکہ اصول میں یہ مقرر و متعین ہے کہ کسی سند کے راویوں کا ثقہ ہونا اُس وقت تک اُس

روایت کے صحیح ہونے کی دلیل نہیں جب تک سند کا متصل، غیر شاذ اور غیر معلول ہونا ثابت نہ ہو جائے۔ اُوپر بیان کردہ روایت کا متصل ہونا مشکوک ہے۔ اس کے بنیادی راوی ولید بن مسلم ثقہ ہونے کے ساتھ مدلس بھی تھے۔ خود شیخ البانی نے لکھا ہے:

"ثم إن الوليد بن مسلم و إن كان ثقة فقد كان يدلس تدليس التسوية"

پھر (یہ کہ) بے شک ولید بن مسلم اگرچہ ثقہ تھے مگر تدلیس تسویہ کرتے تھے۔

(السلسلۃ الضعیفۃ ج ۲ ص ۸۱ ح ۶۱۳)

بلکہ انھوں نے مزید لکھا ہے: "فالمحققون لا يحتجون بما رواه الوليد إلا إذا كان مسلسلاً بالتحديث أو السماع"

پس محققین (حضرات) ولید کی روایت سے حجت نہیں پکڑتے سوائے اس کے کہ وہ مسلسل تحدیث (حدثنا، حدثنی وغیرہ) یا سماع کی تصریح کریں۔ (الضعیفۃ ج ۳ ص ۴۰۹، ۴۱۰ ح ۱۲۵۳)

چونکہ اس سند میں سماع مسلسل (آخر تک ہر راوی کے سماع کی تصریح) نہیں ہے لہٰذا یہ روایت قابلِ حجت نہیں ہے۔ اسے حسن قرار دینا محققین کی تحقیق کے خلاف ہے۔

(ہفت روزہ الاعتصام لاہور، ۲۷/ جون ۱۹۹۷ء، ج ۴۹ شمارہ ۲۴)

قصداً دوسری جماعت کرانے کا حکم؟

سوال ہمارے مولوی صاحب کہتے ہیں: جو آدمی پانچوں نمازیں جماعت سے پڑھے، وہ کبھی کسی مجبوری کی وجہ سے جماعت سے رہ جائے تو وہ آدمی دوسری جماعت کروا سکتا ہے ورنہ دوسری جماعت ہر لیٹ آنے والا نہیں کروا سکتا، کیا یہ درست ہے؟ حوالہ مانگیں تو کہتے ہیں کہ کسی عالم سے پوچھو، اس کی وضاحت فرما دیں کہ دوسری جماعت کے لئے کیا حکم ہے؟ (ظفر اقبال، شکرگڑھ)

الجواب اگر کسی شرعی عذر کی بنا پر جماعت سے رہ جائے تو دوسری جماعت کرانا جائز ہے لیکن خواہ مخواہ شر وفساد اور فتنے کے لئے ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔

اگر صحیح العقیدہ امام اور انتظامیہ کے ساتھ دشمنی ہے تو ان لوگوں کا مسجدوں میں دوسری

جماعت کرانا صحیح نہیں ہے بلکہ ان پر لازم ہے کہ فوراً صلح وصفائی کریں۔

[شہادت، اگست ۲۰۰۰ء]

مسجد میں دوسری جماعت کرانے کا حکم

سوال السلام علیکم، آپ کی خدمت میں روزنامہ ایکسپریس مورخہ ۲۳ فروری ۲۰۰۷ء کا تراشہ بھیج رہا ہوں۔ اس میں مفتی منیب الرحمٰن نے ''مسجد میں جماعت ثانی کا حکم'' کے عنوان سے ایک سوال کا تفصیلاً جواب دیا ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ صحیح احادیث کی روشنی میں، جماعت ثانی کے متعلق دیئے گئے جواب پر تفصیلی روشنی ڈالئے تاکہ نماز جیسے اہم رکن کے متعلق Confusion (پریشانی) دور ہو سکے۔ (اشفاق احمد ملک، راولپنڈی)

منیب الرحمٰن صاحب کا مضمون مع سوال وجواب درج ذیل ہے:

'' مسجد میں جماعت ثانی کا حکم

مفتی منیب الرحمٰن

سوال: ہم یہ دیکھتے چلے آئے ہیں کہ مسجد میں ایک جماعت کے بعد دوسری جماعت بھی کی جاتی ہے، لیکن میں نے مسجد بلال ماڑی پور میں لکھا ہوا دیکھا ہے کہ مسجد میں دوسری جماعت کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ وضاحت فرما دیجیے۔ (سید صفی اللہ شاہ، گڑھی نواب، بلگرام)

جواب: نبی کریم ﷺ نے نماز با جماعت کے بے شمار فضائل بیان فرمائے ہیں اور ترک جماعت پر وعید بھی فرمائی ہے۔ آپ ؐ نے ارشاد فرمایا، ''منافقین پر سب سے زیادہ دشوار، عشاء اور فجر کی نماز ہے۔ اگر ان لوگوں کو ان نمازوں کا ثواب معلوم ہو جائے تو انھیں پڑھنے ضرور آئیں گے، خواہ انھیں گھٹنوں کے بل چل کر آنا پڑے۔ میں نے ارادہ کیا تھا کہ ایک شخص کو نماز پڑھانے کا حکم دوں، پھر چند لوگوں کے ساتھ لکڑیوں کا گٹھر لے کر ان لوگوں کے پاس جاؤں جو جماعت میں نہیں آتے اور ان کے گھروں کو آگ لگا دوں۔'' (صحیح مسلم)

بشری تقاضے کے تحت اگر کسی شرعی عذر کی بناء پر جماعت چھوٹ جائے تو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کے لئے جماعت کے اجر کا اہتمام فرمایا اور ترغیب دی۔

حضرت ابو سعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص (مسجد نبوی میں) آیا، رسول کریم نماز پڑھ چکے تھے (یعنی جماعت ہو چکی تھی) تو (رسولؐ نے) فرمایا، ''کون ہے جو اس کے ساتھ (جماعت کے ثواب کی) تجارت کرے؟'' تو ایک شخص کھڑا ہوا اور اس نے اس شخص کے ساتھ (نفل کی نیت کر کے با جماعت) نماز پڑھی۔ (سنن ترمذی)

اسی طرح رسول پاکؐ نے ایک شخص کو دیکھا کہ تنہا نماز پڑھ رہا ہے۔ آپؐ نے فرمایا "کوئی شخص ہے جو اس پر (جماعت کے ثواب کا) صدقہ کرے اور اس کے ساتھ (نفل کی نیت کر کے باجماعت) نماز پڑھے؟ (سنن ابی داؤد)

مسجد میں جماعت ثانی کے متعلق علامہ نظام الدین لکھتے ہیں، "مسجد میں جب امام مقرر ہو اور پابندی سے جماعت ہوتی ہو اور وہاں کے رہنے والے باجماعت نماز پڑھتے ہوں تو ایسی مسجد میں اذانِ ثانی کے ساتھ جماعت ثانیہ جائز نہیں ہے البتہ جب وہ بغیر اذان کے جماعت کے ساتھ نماز ادا کریں تو بالاتفاق دوسری جماعت جائز ہے، جیسے شارع عام کی مسجد میں جائز ہے۔" (فتاویٰ عالمگیری)

علامہ علاءالدین حصکفی لکھتے ہیں: "مسجد محلہ میں اذان واقامت کے ساتھ دوسری جماعت مکروہ ہے، مگر جو مسجد شارع عام پر ہو یا جس مسجد میں امام ومؤذن مقرر نہ ہوں (اس میں جماعتِ ثانی مکروہ) نہیں ہے۔"

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: "مسجد محلہ میں اذان واقامت کے ساتھ جماعت کی تکرار مکروہ ہے، مگر اس صورت میں کہ پہلے غیر محلہ والوں نے وہاں اذان واقامت کے ساتھ جماعت کرائی ہو یا اہل محلہ نے آہستہ اذان دے کر جماعت کروائی ہو (مکروہ نہیں ہے) اور اگر اہل محلہ نے اذان واقامت کے بغیر جماعت کی تکرار کی تو یہ بالاتفاق جائز ہے یا اگر مسجد شارع عام پر ہے تو (جماعتِ ثانی) بالاتفاق تکرار جماعت جائز ہے، جیسا کہ اس مسجد کا حکم ہے، جس کے لئے امام ومؤذن مقرر نہ ہو اور لوگ اس میں گروہ در گروہ نماز ادا کرتے ہوں، وہاں افضل یہ ہے کہ ہر فریق اپنی اپنی اذان واقامت کے ساتھ الگ الگ نماز پڑھے۔" فقہائے احناف کا معتمد مذہب یہ ہے کہ دوسری جماعت اذان کے اعادے کے ساتھ مکروہ ہے اور بلا اعادۂ اذان دوبارہ جماعت کرانے میں کوئی حرج نہیں، جب کہ وہ جماعتِ ثانی جماعت اولیٰ کی ہیئت پر نہ ہو۔

علامہ ابنِ عابدین شامی لکھتے ہیں۔ امام ابو یوسف سے روایت ہے کہ جب جماعت پہلی ہیئت پر نہ ہو تو مکروہ نہیں ورنہ مکروہ ہے، یہی صحیح ہے اور محراب سے ہٹ کر ادا کرنے سے ہیئت بدل جاتی ہے۔

امام احمد رضا قادری نے ایک ہی مسجد میں جماعتِ ثانیہ قائم کرنے کے مسئلے پر ایک مستقل رسالہ تصنیف فرمایا ہے جس میں آپ نے تقریباً 12 ممکنہ صورتیں اور ان کے احکام بیان فرمائے ہیں۔ ان میں آج کل کے حالات کی مناسبت سے چند اہم صورتیں یہ ہیں:

(1) جو مسجد شارع عام، بس اسٹینڈ، ریلوے اسٹیشن، ایئرپورٹ یا سرائے وغیرہ کی ہے، جہاں لوگوں کے قافلے آتے جاتے رہتے ہیں، وہاں نئی اذان واقامت کے ساتھ کسی کراہت کے بغیر تکرار جماعت جائز ہے۔

(2) ایک مسجد کسی محلے یا بستی کے لئے ہے، وہاں کچھ اجنبی لوگ یا مسافر اذان واقامت کے ساتھ

جماعت کر کے چلے گئے تو اہل محلہ کے لیے دوبارہ اذان واقامت کے ساتھ جماعت کرانا جائز ہے، کیوں کہ اس مسجد میں اقامت جماعت انہی لوگوں کا حق ہے۔ جیسے اصولاً تو نماز جنازہ کی تکرار جائز نہیں ہے، لیکن اگر ولی کی اجازت کے بغیر دوسرے لوگوں نے نماز جنازہ پڑھ لی تو ولی کو اعادے کا حق ہے۔

(3) محلے یا بستی کی جماعت میں بعض اہل محلہ نے اذان کے بغیر جماعت کر لی تو بھی وہاں اذان واقامت کے ساتھ تکرار جماعت جائز ہے۔

(4) محلے یا بستی کی مسجد میں کچھ لوگوں نے آہستہ اذان دے کر جماعت کرا لی تو اہل محلہ کا دوبارہ اذان واقامت کے ساتھ جماعت کرانا جائز ہے، کیونکہ اذان کا اصل مقصد اعلانِ عام ہے جو آہستہ اذانِ اول سے حاصل نہیں ہوا۔

(5) امام کسی دوسرے مسلک کا ہو، مثلاً شافعی اور اس کے بارے میں ظنِ غالب یا یقین ہو کہ وہ بعض فقہی مسائل میں ایسا طریقہ اختیار کرتا ہے کہ مسلک حنفی کے مطابق وضو نہیں ہوتا، مثلاً (الف) وہ پچھنا لگوانے کے بعد نماز کے لیے دوبارہ وضو نہیں کرتا (ب) جسم کی کسی عضو یا مقام سے خون نکل کر بہہ جانے سے دوبارہ وضو نہیں کرتا (ج) نماز کے اندر قہقہہ لگا کر ہنسنے سے نماز تو بالاتفاق فاسد ہو جاتی ہے، مگر شوافع کے نزدیک وضو نہیں ٹوٹتا، اور اب شافعی امام ایسی صورت میں احتیاط پر عمل کرتے ہوئے نماز کے لیے وضو کا اعادہ نہیں کرتا (د) امام شافعی المسلک ہے اور وہ وضو کرتے وقت احتیاط پر عمل کرتے ہوئے چوتھائی سر یا اس سے زیادہ کا مسح نہیں کرتا، بلکہ چند بالوں کے مسح پر اکتفا کرتا ہے۔ ان تمام صورتوں میں چوں کہ احناف کے نزدیک وضو یا ہوتا ہی نہیں ہے یا فاسد ہو جاتا ہے تو اس سے نماز ادا نہیں کی جاسکتی، اب اگر کہیں صورت حال ایسی ہے کہ امام شافعی المسلک ہے اور یہ جاننے کے باوجود کہ اس کے مقتدی سب کے سب یا اکثر حنفی ہیں اور وہ مندرجہ بالا مسائل میں احتیاط پر عمل نہیں کرتا تو حنفی اپنی نماز کی حفاظت کے لیے جماعت ثانی کر سکتے ہیں۔

(6) پہلی جماعت میں امام ایسی قرأت کرتا ہے جو موجب فسادِ نماز ہے۔

(7) ظن غالب یا یقین کی حد تک معلوم ہے کہ پہلی جماعت کا امام توہین الوہیت ورسالت کا مرتکب ہے۔

آخر میں لکھتے ہیں کہ اب محل نظر صرف ایک صورت رہی کہ مسجد محلہ میں اہل محلہ نے بہ اذان واقامت بروجہ سنت امام موافق المذہب سالم العقیدہ، متقی مسائل داں، صحیح خواں کے ساتھ جماعت اولیٰ خالی عن الکراہت ادا کر لی، پھر باقی ماندہ لوگ آئے، انھیں دوبارہ اس مسجد میں جماعت قائم کرنے کی اجازت ہے یا نہیں؟ اور ہے تو بہ کراہت یا بے کراہت، اس بارے میں عین تحقیق وحق وثیق وحاصل انیق

ونظرِ دقیق واثر توفیق یہ ہے کہ اس صورت میں تکرارِ جماعت بہ اعادہ اذان ہمارے نزدیک ممنوع وبدعت ہے۔ یہی ہمارے امام کا مذہب مہذب وظاہر الروایہ ہے۔

متن متین مجمع البحرین، وبحر الرائق علامہ زین میں ہے کہ مسجد محلّہ میں دوسری اذان کے ساتھ تکرار جماعت جائز نہیں۔ (البحر الرائق)

فقہائے کرام نے ایک ہی مسجد میں ''جماعت ثانیہ'' پر اس لیے تفصیل کے ساتھ گفتگو فرمائی کہ لوگ بلا ضرورت وبلا جوازِ شرعی اسے انتشار کا ذریعہ نہ بنائیں اور دانستہ فتنہ وتفریق بین المسلمین کا سبب نہ بنیں۔''

جواب الجواب: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ، اما بعد:

آپ کا خط ملا جس میں مفتی منیب الرحمٰن نے ایک سوال کا جواب بعنوان: ''مسجد میں جماعتِ ثانی کا حکم'' لکھا ہے جو روزنامہ ایکسپریس ۲۳ فروری ۲۰۰۷ء بروز جمعہ شائع ہوا ہے۔ راقم الحروف نے اس جواب کا مطالعہ کیا۔ جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

① نماز باجماعت کے بے شمار فضائل ہیں جیسا کہ صحیح مسلم (وغیرہ) سے ثابت ہیں۔

② اگر کسی شرعی عذر سے جماعت رہ جائے تو دوسری جماعت کا اجر ہے جیسا کہ سنن ترمذی وسنن ابی داود کی احادیث سے ثابت ہے۔

③ حصکفی حنفی، ابن عابدین شامی حنفی اور احمد رضا بریلوی نے یہ کہا ہے اور فتاویٰ عالمگیری اور البحر الرائق وغیرہ حنفی کتابوں میں یہ لکھا ہوا ہے۔!

④ حنفی (وتقلیدی لوگ) اپنی نماز کی حفاظت کے لئے جماعت ثانی کر سکتے ہیں بحوالہ احمد رضا خان بریلوی۔

⑤ مسجدِ محلّہ میں دوسری اذان کے ساتھ تکرار جماعت جائز نہیں بحوالہ البحر الرائق۔

عرض ہے کہ اول الذکر: نماز باجماعت کے فضائل پر سب کا اتفاق ہے۔ سوم، چہارم اور پنجم کا تعلق قرآن وحدیث کے دلائل سے نہیں بلکہ فقہ حنفی وفقہ بریلوی وغیرہما سے ہے جس کا جواب دینے کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ان اقوال وفتاویٰ کا شرعی حجت ہونا ہی ثابت نہیں ہے۔ دوم کے سلسلے میں عرض ہے کہ سنن ترمذی (۲۲۰) وسنن ابی داود (۵۵۴) کی حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک آدمی کو جماعت ہو جانے کے بعد اکیلے نماز پڑھتے ہوئے

دیکھا گیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((ألا رجل يتصدق على هٰذا فيصلي معه؟)) کیا کوئی ایسا آدمی نہیں ہے جو (ثواب کی تجارت کرتے ہوئے) اس آدمی پر صدقہ کرے اور اس کے ساتھ مل کر نماز (باجماعت) پڑھے؟ (واللفظ لابی داود:۵۷۴)

سنن ترمذی میں اس حدیث کے آخر میں یہ اضافہ ہے کہ ایک آدمی نے کھڑے ہو کر اس جماعت سے رہنے والے آدمی کے ساتھ مل کر نماز باجماعت پڑھی۔ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ اسے امام ترمذی نے "حسن" ابن خزیمہ (۱۶۳۲) ابن حبان (موارد الظمآن: ۴۳۶۔۴۳۸) حاکم (۲۰۹/۱) ذہبی اور حافظ ابن حجر (فتح الباری ۱۴۲/۲ تحت ح ۶۵۸) نے صحیح قرار دیا ہے۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ (مسجد کے امام یا انتظامیہ کی اجازت سے) دوسری جماعت بغیر کسی کراہت کے جائز ہے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہی قول کئی صحابہ اور تابعین کا ہے کہ جس مسجد میں جماعت ہو چکی ہو تو دوسری جماعت جائز ہے اور یہی قول (امام) احمد اور (امام) اسحاق (بن راہویہ) کا ہے۔ (سنن الترمذی ص ۶۴ باب ماجاء فی الجماعة فی المسجد قد صلّی فیہ مرة) سنن دارقطنی (۲۷۶/۱ ح ۱۰۶۸) میں اس حدیث کا ایک حسن شاہد (تائید کرنے والی روایت) بھی ہے جس کے بارے میں زیلعی حنفی نے کہا: "وسنده جيد" اور اس کی سند اچھی ہے۔ (نصب الرایۃ ۵۸/۱)

سیدنا انس رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک جگہ تشریف لے گئے، وہاں فجر کی نماز باجماعت ہو چکی تھی تو انھوں نے ایک آدمی کو اذان دینے کا حکم دیا پھر انھوں نے نماز فجر سے پہلی دو رکعتیں پڑھیں پھر انھوں نے اقامت کا حکم دیا اور آگے ہو کر اپنے ساتھیوں کو نماز پڑھائی۔ (دیکھئے مصنف ابن ابی شیبہ ج ۲ ص ۳۲۱ ح ۷۰۹۳ وسندہ صحیح، وقال الحافظ ابن حجر فی تغلیق التعلیق [۲۷۷/۲]: "هٰذا الإسناد صحیح موقوف" وصحیح البخاری قبل ح:۶۴۶)

محدث محمد بن ابراہیم بن المنذر النیسابوری رحمہ اللہ (متوفی ۳۱۸ھ) فرماتے ہیں جو آدمی اس (جماعتِ ثانیہ) سے منع کرتا ہے یا مکروہ سمجھتا ہے، ہمارے علم کے مطابق اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ (الاوسط فی السنن والاجماع والاختلاف ج ۴ ص ۲۱۸)

ایک صحیح حدیث میں آیا ہے کہ ((ولا تؤمنّ الرجل في أهله ولا في سلطانه ولا تجلس علی تکرمته في بیته إلا أن یأذن لك أو یا ذنه .)) تم کسی آدمی کے گھر میں یا اس کی سلطنت (زیرِ اختیار جگہ) میں اُس کی امامت نہ کرو اور نہ اس کے گھر میں اس کی مسند تکریم پر بیٹھو اِلا یہ کہ وہ تمھیں اجازت دے یا اس کی (عام) اجازت ہو۔ (صحیح مسلم:۶۷۳[۱۵۳۵])

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی مسجد میں اس کے امام یا انتظامیہ کی مرضی اور اجازت کے بغیر دوسری جماعت نہیں کرنی چاہئے۔ راستوں پر جو مسجدیں بغیر مستقل امام کے ہیں، ان میں عرفاً ہر ایک کے لئے جماعت ثانیہ یا ثالثہ وغیرہ کی اجازت ہوتی ہے۔

تنبیہ (۱): منیب الرحمٰن صاحب کے مردود علیہ جواب میں اور بھی کئی باتیں قابلِ رد ہیں مثلاً نبی کریم ﷺ پر پورا درود نہ لکھنا اور صرف "ص" لکھنا وغیرہ۔

تنبیہ (۲): راقم الحروف نے اپنی کتاب "بدعتی کے پیچھے نماز کا حکم" میں یہ ثابت کیا ہے کہ اہلِ حق کو اہلِ بدعت کے پیچھے نماز نہیں پڑھنی چاہئے۔ وما علینا إلا البلاغ

(۴/ مارچ ۲۰۰۷ء) [الحدیث:۳۷]

گھر میں نماز باجماعت ادا کرنے کی کیفیت

سوال اگر میاں بیوی اور بچے اہلِ حدیث ہوں تو میاں گھر میں جماعت کروائے تو کیا مرد آگے ہوگا اور عورت اور بچے پیچھے ہوں گے یا بچہ نابالغ پیچھے ہوگا، ترتیب کیا ہوگی؟

(ظفر اقبال، کامرہ)

الجواب امام کے پیچھے اس کے بچے اور ان کے پیچھے علیحدہ صف میں عورتیں اور بچیاں ہونی چاہئیں۔ دیکھئے وہ حدیث جس میں ہے کہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"فقام رسول اللّٰه ﷺ وصففت أنا والیتیم وراءه والعجوز من ورائنا" پس رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے اور میں نے اور یتیم نے آپ ﷺ کے پیچھے صف باندھی اور ہمارے پیچھے ایک بڑھیا تھی۔ (صحیح البخاری:۳۸۰ و مسلم:۶۵۸)

[شہادت، دسمبر ۲۰۰۳ء]

عورتوں کی جماعت میں خیر؟

سوال اس روایت کی تخریج درکار ہے:

"لا خير في جماعة النساء إلا في المسجد"

[عورتوں کی جماعت میں کوئی خیر نہیں ہے سوائے مسجد کے۔]

(مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، کتاب الصلاۃ ۲/۱۱۸ حدیث ۲۱۰۴، المعجم الاوسط للطبرانی حدیث ۹۳۵۹ طبع جدید)

(محمد محسن سلفی، کراچی)

الجواب مسند احمد (۶/۶۶ ح ۲۴۸۸۰) میں ہے:

حدثنا حسن :حدثنا ابن لهيعة: حدثنا الوليد بن أبي الوليد قال: سمعت القاسم بن محمد يخبر عن عائشة أن رسول الله ﷺ قال: ((لا خير في جماعة النساء إلا في مسجد ، أوفي جنازة قتيل))

کوئی خیر نہیں ہے عورتوں کی جماعت (یعنی اکٹھا ہونے) میں سوائے مسجد میں یا کسی مقتول کے جنازے میں۔

حدثنا: حجاج: حدثنا ابن لهيعة عن الوليد أبي الوليد قال: سمعت القاسم يخبر عن عائشة عن النبي ﷺ قال:((لا خير في جماعة النساء إلا في مسجد أو في جنازة قتيل)) (ج ۶ ص ۱۵۴ ح ۲۵۷۲۸)

اسے امام طبرانی نے درج ذیل سند و متن سے روایت کیا ہے:

حدثنا هارون بن كامل قال: حدثنا أبو صالح الحراني قال: حدثنا ابن لهيعة عن الوليد بن أبي الوليد قال: عن القاسم بن محمد عن عائشة أن رسول الله ﷺ قال:((لاخير في جماعة النساء في مسجد جماعة أو جنازة قتيل))

(المعجم الاوسط ج ۱۰ ص ۱۶۶ ح ۹۳۵۵)

عبداللہ بن لہیعہ المصری مختلف فیہ راوی تھے۔ ان کے بارے میں اعدل الاقوال یہ ہے کہ وہ اختلاط کی وجہ سے ضعیف تھے اور ان کی روایت دو شرطوں کے ساتھ حسن ہوتی ہے:

① وہ سماع کی تصریح کریں کیونکہ وہ مدلس تھے۔ (قال ابن حبان: یدلس عن اقوام ضعفاء)

② ان کی روایت اختلاط سے پہلے کی ہو۔

درج ذیل راویوں نے ان سے اختلاط سے پہلے احادیث سنی تھیں:

عبد اللہ بن المبارک، عبد اللہ بن وہب، عبد اللہ بن یزید المقرئ (تہذیب التہذیب ۳۳۰/۵)، یحیٰی بن اسحاق السیلحینی (تہذیب التہذیب ۳۶۱/۲ ترجمہ حفص بن ہاشم بن عقبۃ الزہری) عبداللہ بن مسلمہ القعنبی (میزان الاعتدال ۴۸۲/۲) الولید بن مزید (المعجم الصغیر ۲۳۱/۱) عبد الرحمٰن بن مہدی (مقدمہ لسان المیزان ۱۰/۱، ۱۱) اسحاق بن عیسیٰ (میزان الاعتدال ۴۷۷/۲) لیث بن سعد (فتح الباری ۳۴۵/۴ تحت ح ۲۱۲۷) بشر بن بکر (الضعفاء للعقیلی ۲۹۴/۲) سفیان ثوری، شعبہ، اوزاعی، عمرو بن الحارث المصری (ذیل الکواکب النیرات ص ۴۸)

اوپر ذکر کردہ روایت میں ابن لہیعہ کے تین شاگرد ہیں:

۱۔ حجاج (لعلہ ابن محمد الاعور او ابن سلیمان الرعینی)

۲۔ حسن بن موسیٰ الاشیب۔

۳۔ ابو صالح الحرانی (عبدالغفار بن داود)

ان تینوں کا سماع قبل از اختلاط ثابت نہیں ہے لہٰذا یہ سند ضعیف ہے۔ یاد رہے کہ ولید بن ابی الولید پر جرح مردود ہے۔

المعجم الاوسط للطبرانی (ج ۸ ص ۶۴ ح ۷۱۲۶) میں ایک روایت ہے کہ

"لاخير في جماعة النساء إلا عند ميت فإنهن إذا اجتمعن قلن وقلن"

اس کا راوی الوازع بن نافع متروک ہے۔ دیکھئے المیزان (ج ۶ ص ۲۵۹، ۲۶۰) وغیرہ متروک کی روایت شواہد و متابعت میں بھی پیش نہیں کی جا سکتی۔

دیکھئے اختصار علوم الحدیث لابن کثیر (ص ۳۸، النوع الثانی تعریفات اخری للحسن)

المعجم الکبیر للطبرانی (ج ۱۲ ص ۳۱۷ ح ۱۲۲۸) میں ہے کہ "لا خير في جماعة النساء

إلا عند ميت فإنهن إذا اجتمعن قلن وقلن ''اس کا راوی بھی الوازع بن نافع ہے، وازع کا شاگرد مغیرہ بن سقلاب ضعیف علی الراجح اور موسیٰ بن ایوب صاحب خبر منکر ہے۔ یہ سند بھی مردود ہے۔ اس کے مقابلے میں سنن ابی داود (کتاب الصلوٰۃ، باب امامۃ النساء ح ۵۹۲ ومن طریقہ البیہقی فی الخلافیات، مخطوط مصور ۴ب) میں ہے کہ ((وأمرها أن تؤم أهل دارها)) اور رسول اللہ ﷺ نے ام ورقہ رضی اللہ عنہا کو حکم دیا کہ وہ اپنے گھر والوں کی امامت کریں۔ اس روایت کو ابن خزیمہ (۱۶۷۶) اور ابن جارود (۳۳۳) نے صحیح قرار دیا ہے۔

شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے اسے حسن قرار دیا ہے اور محمد بن علی النیموی (تقلیدی) نے بھی اسے اسنادہ حسن لکھا ہے (آثار سنن ح ۵۱۳) اس حدیث کے راویوں کا مختصر تذکرہ پڑھ لیں:

(۱) عبدالرحمٰن بن خلاد الانصاری: انھیں ابن حبان نے کتاب الثقات میں ذکر کیا اور ابن القطان الفاسی المغربی نے کہا: ''حاله مجهول'' ابن خزیمہ اور ابن الجارود نے تصحیح کے ذریعے سے انھیں ثقہ وصدوق قرار دیا، یعنی وہ ابن حبان، ابن خزیمہ اور ابن الجارود کے نزدیک ثقہ تھے لہٰذا ابن القطان وغیرہ کی تجہیل (مجہول قرار دینے) کا یہاں کوئی اعتبار نہیں ہے۔ لیلیٰ بنت مالک نے ان کی متابعت کر رکھی ہے۔

(۲) ولید بن عبداللہ بن جمیع صحیح مسلم وغیرہ کے راوی تھے۔ امام یحییٰ بن معین اور جمہور محدثین نے انھیں ثقة ولا بأس به قرار دیا ہے۔ ان پر ابن حبان، عقیلی اور حاکم کی جرح مردود ہے لہٰذا ان کی روایت صحیح یا حسن ہوتی ہے۔

(۳) محمد بن فضیل بن غزوان: کتب ستہ کے راوی اور موثق عند الجمہور تھے۔ ان پر تشیع کا الزام چنداں مضر نہیں ہے۔ ان کی روایت صحیح ہوتی ہے۔ والحمدللہ

(۴) الحسن بن حماد المصری صدوق تھے۔ (دیکھئے تقریب التہذیب ص ۶۹ وغیرہ)

خلاصہ یہ ہے کہ یہ سند حسن ہے اسے عبدالرحمٰن بن خلاد کی وجہ سے ضعیف کہنا صحیح نہیں ہے۔

مصنف عبدالرزاق (۵۰۸۶) اور السنن الکبریٰ للبیہقی (۱۳۱/۳) میں ایک روایت ہے کہ

عائشہ رضی اللہ عنہا نے گھر والیوں کے درمیان کھڑے ہو کر فرض نماز کی امامت کی تھی۔

(آثار السنن: ۵۱۴ وقال: اسنادہ صحیح وصححہ النووی، اعلاء السنن ۴/۲۴۳)

اس کی سند حسن ہے، سفیان ثوری نے سماع کی تصریح کر دی ہے۔

السنن الکبریٰ (۳/۱۳۱)، مصنف ابن ابی شیبہ (۲/۸۹ ح ۴۹۵۴) اور سنن دار قطنی (۱/۴۰۴ ح ۱۴۲۲) میں اس کے متعدد شواہد بھی ہیں۔ (انوار السنن ص ۱۰۳)

ریطہ کو امام عجلی نے ثقہ قرار دیا ہے۔ (الثقات: ۲۰۹۴)

مصنف عبدالرزاق (۵۰۸۲) میں ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انھوں نے (عورتوں کے) درمیان کھڑے ہو کر عصر کی نماز پڑھائی تھی۔

(آثار السنن: ۵۱۵ وقال: اسنادہ صحیح وصححہ النووی کما فی اعلاء السنن ۴/۲۴۴ ح ۱۲۲۲)

سفیان ثوری نے سماع کی تصریح کر دی ہے۔ (الاوسط لابن المنذر ج ۴ ص ۲۲۷ ح ۲۰۷۵)

سفیان بن عیینہ نے ان کی متابعت کر رکھی ہے۔ (ابن ابی شیبہ ۲/۸۸ ح ۴۹۵۲ السنن الکبریٰ للبیہقی ۳/۱۳۱)

حجیرۃ بنت حصین کی توثیق نہیں ملی لیکن یہ روایت دوسرے شواہد کی رُو سے حسن ہے اور مرفوع حدیث بھی اس کی مؤید ہے۔ والحمد للہ

ان کے مقابلے میں باسند صحیح، امامتِ نساء کی ممانعت ثابت نہیں ہے۔

ظفر احمد تھانوی دیوبندی نے سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ "لا تؤم المرأۃ" عورت امامت نہ کرائے۔ (اعلاء السنن ج ۴ ص ۲۴۳ ح ۱۲۲۰ بحوالہ المدونہ ج ۱ ص ۸۶)

اس روایت سے استدلال کئی وجہ سے مردود ہے:

① مدونہ کتاب کی سحنون تک صحیح و متصل سند مفقود ہے۔

② مدونہ کتاب بذاتِ خود غیر معتبر ہے۔

③ مولیٰ بنی ہاشم نامعلوم ہے۔ مطلقاً ابن ابی ذئب کے شیوخ کو ثقات کہہ کر اسے ثقہ قرار دینا غلط ہے۔

④ مولیٰ بنی ہاشم کی سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ملاقات ثابت نہیں ہے لہٰذا ظفر صاحب کا

اسے "فالسند صحیح" کہنا غلط ہے۔

⑤ اگر یہ روایت صحیح ہوتی تو اس کا مطلب صرف یہ ہوتا کہ عورت (مردوں کی) امامت نہ کرائے اور اس طرح تمام روایات میں تطبیق وتوفیق ہو جاتی ہے۔ [شہادت، فروری ۲۰۰۳ء]

اوقاتِ نماز

نمازِ ظہر کو ٹھنڈا کر کے پڑھنے کا مفہوم

سوال ہمارے سکول میں دو بجے چھٹی ہوتی ہے۔ جبکہ ظہر کی نماز دو بجے چھٹی کے بعد پڑھنی پڑتی ہے۔ ہمارے ہاں زوال کا وقت ۱۲ بج کر دو منٹ پر ختم ہو جاتا ہے کیا اس کے بعد ہم ظہر پڑھ سکتے ہیں کیونکہ اس وقت وقفہ ہوتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ گرمیوں میں ظہر کی نماز ٹھنڈی کر کے پڑھنی چاہیے، کیا یہ حدیث سفر کے لئے خاص ہے یا عام ہے۔ (ظفر اقبال)

الجواب جب زوال ہونے کا یقین ہو جائے تو اس سے تھوڑی دیر بعد یا زوال کے فوراً بعد ہی ظہر کی نماز پڑھ لیں جیسا کہ عام احادیث سے ثابت ہے۔ گرمیوں میں ظہر کی نماز ٹھنڈی یعنی دیر سے پڑھنے کا تعلق سفر کے ساتھ ہے۔ صحیح حدیث میں آیا ہے:

"كنا مع النبي ﷺ في سفر.... فقال النبي ﷺ: ((إن شدة الحرّ من فيح جهنم فإذا اشتد الحر فأبردوا بالصّلاة))" ہم نبی ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے... تو نبی ﷺ نے فرمایا: بے شک گرمی کی شدت جہنم کی بھاپ سے ہے لہٰذا جب گرمی تیز ہو تو نماز ٹھنڈی کر کے پڑھو۔ (صحیح بخاری کتاب مواقیت الصلاۃ، باب الابراد بالظہر فی السفر ح ۵۳۹)

معلوم ہوا کہ ابردوا بالصلوۃ والی احادیث کا تعلق سفر کے ساتھ ہے لہٰذا مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے گا۔ مدینہ میں آپ ﷺ زوال کے ساتھ ہی ظہر پڑھ لیتے تھے۔ جیسا کہ حدیث انس رضی اللہ عنہ "فقام على المنبر" إلخ سے ثابت ہے۔

(دیکھئے صحیح بخاری کتاب مواقیت الصلوۃ باب وقت الظہر عند الزوال ح ۵۴۰)

[شہادت، جولائی ۲۰۰۳ء]

نمازِ عصر کا وقت

سوال قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں کہ (نماز) عصر کا وقت کب شروع ہوتا ہے؟ (چراغ حسین شاہ، کامرہ کلاں ضلع اٹک)

الجواب سنن ابی داود (ج ۱ص ۶۲) سنن ترمذی (ج ۱ص ۳۸) اور صحیح ابن خزیمہ (ج ۱ص ۱۶۸) میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((أمّني جبرئيل عند البيت مرتين فصلى الظهر في الأول منهما حين كان الفيْ مثل الشراك ثمّ صلى العصر حين كان كل شيْ مثل ظله .....
وصلّى المرة الثانية الظهر حين كان ظلّ كل شيْ مثله لوقت العصر بالأمس ثمّ صلّى العصر حين كان ظل كلّ شيْ مثليه ... ثمّ التفت إلي جبرئيل فقال: يا محمد! هذا وقت الأنبياء من قبلك والوقت فيما بين هذين الوقتين .))

مجھے جبریل علیہ السلام نے بیت اللہ کے قریب دو دفعہ امامت کرائی۔ پس اس نے پہلے دن ظہر کی نماز اس وقت پڑھی جب سایہ تسمے کے برابر تھا۔ پھر اس نے عصر کی نماز اس وقت پڑھی جب ہر چیز کا سایہ اس کے برابر ہو گیا...

اور دوسری دفعہ ظہر اُس وقت پڑھی جب ہر چیز کا سایہ اس کے برابر ہو گیا، جس وقت کل (پہلے دن) کی عصر پڑھی تھی۔ پھر اس نے عصر اس وقت پڑھی جب ہر چیز کا سایہ اس کے دو مثل ہو گیا... پھر جبریل علیہ السلام نے میری طرف رُخ کر کے فرمایا: اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! یہ آپ سے پہلے انبیاء کا وقت ہے اور نماز کا وقت ان دونوں وقتوں کے درمیان ہے۔

اس حدیث کے بارے میں امام ترمذی نے فرمایا: ”حديث ابن عباس حديث حسن“ ابن عباس کی حدیث حسن ہے/ نیز اسے ابن حبان وغیرہ نے بھی صحیح کہا ہے۔

(دیکھئے نصب الرایہ للزیلعی ج ۱ص ۲۲۱، وراجع التلخیص الحبیر ج ۱ص ۱۷۳)

محمد بن علی النیموی نے لکھا: ”و إسناده حسن“ اور اس کی سند حسن ہے۔ (آثار السنن ص ۵۱)

یہ صحیح روایت اپنے مدلول پر واضح اور صریح ہے۔ اس کے متعدد شواہد بھی ہیں: مثلاً

① عن أبي هريرة رضي الله عنه/ أخرجه النسائي (ج۱ص۸۷)وغيره عن محمّد بن عمرو عن أبي سلمة عنه به و فيه :ثم صلّى العصر حين رأى الظل مثله ... إلخ

وأخرجه الحاكم (ج۱ص۱۹۴)مختصرًا و صححه علىٰ شرط مسلم ووافقه الذهبي وصححه ابن السكن و حسنه الترمذي في العلل ، وقال الحافظ في التلخيص الحبير (ج۱ص۱۷۳):" بإسناد حسن "

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ حدیث: جسے امام نسائی وغیرہ نے آپ سے روایت کیا ہے اوراس میں ہے: پھر آپ نے اس وقت عصر پڑھی جب سائے کو چیز کے مثل (برابر) دیکھ لیا۔ اسے حاکم نے بھی مختصراً روایت کیا ہےاور حاکم وذہبی دونوں نے صحیح علیٰ شرط مسلم(!)اور ابن السکن نے صحیح کہا ہے۔امام ترمذی اورابن حجر عسقلانی نے حسن کہا۔

② عن أبي مسعود رضي الله عنه/ أخرجه أبو داود (ج۱ص۶۲۔۶۳)وغيره مختصرًا و فيه :" و يصلّي العصر والشمس مرتفعة بيضاء قبل أن تدخلها الصفرة فينصرف الرجل من الصلوٰة فيأتي ذا الحليفة قبل غروب الشمس ."

وصححه الحاكم (ج۱ص۱۹۲۔۱۹۳) وغيره .

سیدنا ابومسعود رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ حدیث: جسے ابوداود وغیرہ نے مختصراً روایت کیا ہےاوراس میں ہے: اورآپ اس وقت عصر پڑھتے جب کہ سورج بلند اور سفید ہوتا اس سے پہلے کہ اس میں زردی آجائے۔ پس نمازی نماز سے فارغ ہوکر غروب آفتاب سے پہلے ذوالحلیفہ تک پہنچ سکتا تھا۔ اسے حاکم وغیرہ نے صحیح کہا ہے۔

③ عن جابر رضي الله عنه / أخرجه النسائي (ج۱ص۸۸) وغيره عنه قال: سأل رجل رسول الله ﷺ عن مواقيت الصلاة ؟ فقال: ((صلّ معي.))فصلّى الظهر حين زاغت الشمس والعصر حين كان فيْ كل شيْ مثله ... إلخ . وللحديث طرق أخرىٰ عند الترمذي (ج۱ص۳۸)وغيره

وصححه الحاكم (۱/۱۹۶) ووافقه الذهبي .

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ حدیث: جسے امام نسائی وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کے اوقات کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا: میرے ساتھ نماز پڑھ! پس آپ نے ظہر اس وقت پڑھی جب سورج ڈھل گیا اور عصر اس وقت پڑھی جب ہر چیز کا سایہ اس کے برابر ہو گیا... الخ

اس حدیث کی امام ترمذی وغیرہ کے پاس اور بھی سندیں ہیں اور اسے حاکم وذہبی دونوں نے صحیح کہا ہے۔ مزید تحقیق کے لئے التلخیص الحبیر (ج ۱ ص ۱۷۳۔۱۷۴) وغیرہ کا مطالعہ کریں۔

ان احادیثِ صحیحہ صریحہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عصر کا وقت ایک مثل پر شروع ہو جاتا ہے۔

نیموی صاحب نے اعتراف کرتے ہوئے کہا:

" و إني ولم أجد حديثًا صريحًا صحيحًا أو ضعيفًا يدل على أن وقت الظهر إلى أن يصير الظل مثليه " اور بے شک مجھے ایسی کوئی صریح، صحیح یا ضعیف حدیث نہیں ملی جو اس پر دلالت کرتی ہو کہ ظہر کا وقت دو مثل تک باقی رہتا ہے۔ (آثار السنن ص ۵۴)

وما علينا إلا البلاغ

(ہفت روزہ الاعتصام لاہور، ۱۲/صفر ۱۴۱۷ھ جلد ۴۸ شمارہ ۲۴)

ممنوع اوقات میں نوافل کی ادائیگی

سوال عصر کی نماز کے بعد سنتیں یا نفل پڑھے جا سکتے ہیں یا نہیں؟ (ایک سائل)

الجواب نماز عصر اور نماز صبح کے بعد نفل وغیرہ نہیں پڑھنے چاہئیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((**لا صلوٰة بعد الصبح حتّٰى ترتفع الشمس ولا صلوٰة بعد العصر حتّٰى تغيب الشمس**))

صبح کی (فرض) نماز کے بعد کوئی نماز نہیں حتیٰ کہ سورج بلند ہو جائے اور عصر (کی نماز) کے بعد کوئی نماز نہیں حتیٰ کہ سورج غروب ہو جائے۔ (صحیح بخاری: ۵۸۶ و صحیح مسلم ۱/۲۷۵ ح ۸۲۸)

اس مفہوم کی بہت سی روایات ہیں۔ دیکھئے سنن نسائی (ج ۱ ص ۲۷۸)

دوسرے دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ عندالطلوع اور عندالغروب کے علاوہ یہ ممانعت تنزیہی ہے تحریمی نہیں ہے مثلاً:

سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کے بعد نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے سوائے اس کے کہ سورج سفید، صاف اور بلند ہو (تو پڑھ سکتے ہیں۔)

دیکھئے سنن نسائی (۵۷۴) وسنن ابی داود (۱۲۷۴) وسندہ صحیح

اس ممانعت عامہ سے بعض نمازیں مخصوص ہیں مثلاً:

① جس کا فرض رہ گیا ہو اور اسے یاد آ جائے یا وہ نیند سے بیدار ہوا ہو۔

② نماز جنازہ ③ نماز استسقاء ④ نماز کسوف ⑤ تحیۃ المسجد

⑥ بیت اللہ میں نماز ⑦ سنن راتبہ اگر رہ جائیں۔

یہ نمازیں صبح وعصر کے فرائض کے بعد پڑھنا ممنوع نہیں ہیں۔

ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ظہر کی دو رکعتیں رہ گئیں تو آپ نے یہ رکعتیں عصر کے بعد پڑھی تھیں۔ صحیح بخاری وصحیح مسلم وسنن نسائی (ج۱ ص۲۸۱، ۲۸۲)

سیدنا قیس بن قہد رضی اللہ عنہ کی صبح کی دو سنتیں رہ گئیں تو انھوں نے فرضوں کے بعد اسی وقت پڑھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معلوم ہو جانے کے بعد کچھ کہنے کے بجائے سکوت فرمایا۔

دیکھئے صحیح ابن خزیمہ (ج۲ ص۱۶۴ ح۱۱۱۶) اور صحیح ابن حبان (ج۴ ص۸۲ ح۲۴۶۲)

اسے حاکم اور ذہبی دونوں نے صحیح کہا ہے۔ (المستدرک والتلخیص ج۱ ص۲۷۴، ۲۷۵)

اس کی سند صحیح اور متصل ہے۔ نیز دیکھئے میری کتاب ہدیۃ المسلمین فی جمع الاربعین من صلوٰۃ خاتم النبیین (حدیث: ۲۴)

[شہادت، جولائی ۱۹۹۹ء]

سترے کا بیان

سترے کا حکم

سوال کیا نماز میں سترہ قائم کرنا واجب یا مستحب ہے؟

(حافظ شفیق باغ، آزاد کشمیر)

الجواب نماز میں سترہ کا اہتمام کرنا مستحب ہے۔ وہ احادیث جن میں سترہ کی تائید وحکم یا سترہ کے بغیر نماز پڑھنے کی ممانعت ہے، استحباب پر محمول ہیں۔

ان احادیث کے امر کو وجوب سے استحباب پر پھیرنے والی وہ دلیل ہے جسے امام ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں (ج ۲ ص ۲۵ ح ۸۳۸۔ ۸۳۹) سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے: " فمررنا بين يدي رسول الله ﷺ بعرفة وهو يصلي المكتوبة ليس شئ يستره يحول بيننا و بينه " پس ہم رسول اللہ ﷺ کے سامنے سے گزرے آپ عرفات میں فرض نماز پڑھ رہے تھے۔ آپ کے اور ہمارے درمیان کوئی چیز بھی بطورِ سترہ موجود نہیں تھی۔

صحیح ابن خزیمہ کے محقق نے بھی اسے "اسنادہ صحیح" کہا ہے۔ اس کی تائید امام بزار رحمہ اللہ کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جسے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۷۱) میں ذکر کیا ہے۔ نیز دیکھئے شرح صحیح بخاری لابن بطال (۲/ ۱۷۵) البحر الزخار (۱۱/ ۲۰۱ ح ۴۹۵۱) اور نصب الرایہ (۲/ ۸۲)

"الفقہ الاسلامی وادلتہ" (۱/ ۷۵۲) نامی کتاب میں ہے:

" وليست واجبة بإتفاق الفقهاء لأن الأمر بإتخاذها للندب "

اس پر فقہاء (اربعہ) کا اتفاق ہے کہ سترہ واجب نہیں ہے، لہٰذا ان کے نزدیک سترہ کا حکم استحباب پر محمول ہے۔

[شہادت، دسمبر ۲۰۰۰ء، ہفت روزہ الاعتصام لاہور، ۲۷/ جون ۱۹۹۷ء]

امامت واقتداء کا بیان

مقیم امام کی اقتداء میں مسافر کی نماز

سوال ایک آدمی مسافر ہے اور وہ کسی مسجد میں مقیم امام کے پیچھے نماز پڑھتا ہے، کیا وہ امام کے پیچھے قصر پڑھے گا یا مکمل نماز پڑھے گا؟

یعنی دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض لوگ دو رکعت امام کے ساتھ پڑھ کر بیٹھ جاتے ہیں یا پہلے ہی سلام پھیر لیتے ہیں یا پھر وہ بیٹھے رہتے ہیں اور امام کے ساتھ سلام پھیرتے ہیں۔

بینوا و توجروا (حافظ شفیق، باغ آزاد کشمیر)

الجواب مسافر کو مقامی امام کے پیچھے پوری نماز پڑھنی چاہئے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے پیچھے حالت سفر میں پوری نماز پڑھی ہے۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ج ۴ص ۲۰۷ وسنن ابی داود: ۱۹۶۰، واَصلہ فی صحیح البخاری: ۱۰۸۴، وصحیح مسلم: ۶۹۵ بغیر ھذا اللفظ)

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما امام کے پیچھے حالتِ سفر میں پوری نماز پڑھتے تھے۔

(موطا امام مالک ۱/۱۴۹، وسندہ صحیح، السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۳ص ۱۵۷، وصحیح مسلم: ۶۹۴/ ۱۷)

کسی صحیح یا حسن حدیث میں نبی ﷺ یا کسی صحابی سے یہ ثابت نہیں کہ مسافر مقامی امام کے پیچھے بھی قصر کرے گا لہٰذا جو مسافر مقامی امام کے پیچھے دو رکعت پڑھ کر بیٹھ جائے یا صرف دو رکعت ہی اس کے پیچھے پڑھے گا تو وہ خطا کار ہے۔

یاد رہے کہ سفر میں بغیر کسی عذر کے جان بوجھ کر پوری نماز پڑھنا بھی صحیح ہے جیسا کہ سنن النسائی (۳/ ۱۲۲ ح ۱۴۵۷، وسندہ صحیح وحسنہ الدارقطنی ۲/ ۱۸۸ ح ۲۲۷۱) وسنن دارقطنی (۲/ ۱۸۹ ح ۲۲۷۵ وقال: "وھذا اسناد صحیح") وغیرہما کی صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ ان احادیث کو امام ابن تیمیہ کا بغیر کسی دلیل کے باطل کہنا صحیح نہیں ہے۔

[شہادت، دسمبر ۲۰۰۰ء]

مقتدی کے لئے سمع اللہ لمن حمدہ کہنا

سوال مقتدی امام کے پیچھے سمع اللہ لمن حمدہ کہے یا نہیں؟ اگر مقتدی صرف ربنا لک الحمد ہی پڑھتا ہے تو نماز میں کوئی فرق پڑتا ہے؟ (ظفر اقبال، کامرہ)

الجواب مقتدی کے بارے میں راجح یہی ہے کہ وہ بھی امام کے پیچھے سمع اللہ لمن حمدہ کہے، کسی حدیث میں یہ نہیں آیا کہ صرف امام سمع اللہ لمن حمدہ کہے اور مقتدی سمع اللہ لمن حمدہ نہ کہے۔ بلکہ عام احادیث میں امام مقتدی اور منفرد سب شامل ہیں۔

اور سنن دارقطنی (۱/۳۳۸، ۳۳۹ ح ۱۲۷۰) کی صحیح حدیث (حسن لذاتہ) سے ثابت ہے کہ مقتدی بھی سمع اللہ لمن حمدہ کہے گا۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ سمع اللہ لمن حمدہ کہنے میں امام اور مقتدی برابر ہیں، جو اس کا انکار کرتے ہیں ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ [شہادت، دسمبر ۲۰۰۳ء]

جماعت میں شامل ہونے کا طریقہ

سوال باجماعت نماز میں بعد از تکبیر تحریمہ تا قبل از سلام شامل ہونے والا مقتدی کس کیفیت سے شامل جماعت ہوگا؟ تکبیر کہہ کر رفع الیدین کر کے، ہاتھ باندھ کر، قیام کی سی صورت اختیار کرتے ہوئے امام کی پیروی کرے گا۔ مثلاً اس وقت امام:

① بحالتِ قیام ہو۔

② بحالت غیر قیام (رکوع یا سجدہ یا تشہد میں) ہو۔ یا پھر ڈائریکٹ طریقے سے امام کی حالت کی پیروی کرے گا؟ (محمد صدیق، ایبٹ آباد)

الجواب مسبوق درج ذیل کام کرے گا:

① تکبیر تحریمہ کہے۔

② اگر حالتِ قیام قبل از رکوع ہو تو سینے پر ہاتھ باندھ کر سورۂ فاتحہ سراً یعنی خفیہ آواز سے دل میں پڑھے۔

④ اگر امام رکوع یا سجدے وغیرہ میں ہے تو تکبیر کہتے ہوئے اسی حالت میں شامل ہونا چاہئے، ہاتھ باندھ کر قیام کرنے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ "الإمام ضامن فما صنع فاصنعوا" "امام ضامن ہے جیسے وہ کرے، اسی طرح کرو۔"

(سنن الدارقطنی ج۱ ص۳۲۲ ح۱۲۱۴)

اس کے راوی محمد بن کلیب بن جابر کے بارے میں ابوزرعہ الرازی نے کہا: ثقة

(الجرح والتعدیل ۸/۶۸)

حافظ ابن حبان نے انھیں کتاب الثقات (ج۵ ص۳۶۲) میں ذکر کیا دوسرا راوی موسیٰ بن شیبہ بن عمرو بن عبداللہ ہے جس کے بارے میں امام احمد نے کہا: "أحادیثه منا کیر"

ابوحاتم الرازی نے کہا: "صالح الحدیث" (الجرح والتعدیل ۸/۱۴۷)

ابن حبان نے کتاب الثقات (۹/۱۵۸) میں ذکر کیا ہے۔

معلوم ہوا کہ یہ راوی حسن الحدیث ہیں انھیں لین الحدیث کہنا صحیح نہیں ہے۔ باقی سند کے سارے راوی ثقہ ہیں لہٰذا یہ سند حسن ہے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ والی روایات بھی اس کی مؤید ہیں۔

فائدہ نمبر۱: ابوحاتم الرازی نے یہ حدیث بیان کر کے فرمایا:

"هذا تصحیح لمن قال بالقراءة خلف الإمام" "جو شخص قراءت خلف الامام کا قائل ہے یہ حدیث اسے صحیح قرار دیتی ہے۔" (الدارقطنی حوالہ مذکور)

معلوم ہوا کہ ابوحاتم الرازی اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں اس لئے اس سے "تصحیح" والا استدلال کر رہے ہیں۔

فائدہ نمبر۲: اگر امام کتاب و سنت کے خلاف کوئی کام کرے مثلاً ترک رفع یدین، وارسال الیدین قبل الرکوع وغیرہ تو اس کی اس میں پیروی قطعاً نہیں کرنی چاہئے جیسا کہ ((لا طاعة لمخلوق في معصیة اللّٰه)) جیسے عام دلائل سے ثابت ہے۔

[شہادت، اپریل ۲۰۰۴ء]

دومنزلہ مسجد میں امام کے کھڑے ہونے کا مقام

سوال دومنزلہ مسجد میں باجماعت نماز میں امام (نچلی) پہلی منزل میں امامت کروائے یا اوپر (دوسری) منزل میں۔ جبکہ مقتدی دونوں منزلوں میں ہوں؟

(محمد صدیق، ایبٹ آباد)

الجواب اس پر مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ اگر امام نچلی منزل میں امامت کرائے تو مقتدی اوپر والی منزلوں پر نماز پڑھ سکتے ہیں۔ بیت اللہ میں ایامِ حج وغیرہ میں اسی طرح نمازیں پڑھتے ہیں۔

صالح مولی التوأمہ کہتے ہیں: ''**صلیت مع أبي هريرة فوق المسجد بصلوة الإمام وهو أسفل** ''میں نے ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ مسجد کے اوپر نماز پڑھی جبکہ امام نیچے تھا۔

(مصنف ابن ابی شیبہ ۲/۲۲۳ ح ۶۱۵۸ وسندہ حسن، والبیہقی ۳/۱۱۱، وعبدالرزاق فی المصنف ۳/۸۳ ح ۴۸۸۸)

صالح نے یہ روایت اختلاط سے پہلے بیان کی ہے لہٰذا بلحاظ سند یہ روایت حسن ہے۔

عورتوں کا بھی معاملہ ایسے ہی ہے، اوپر پڑھیں یا نیچے بشرطیکہ مردوں سے اختلاط نہ ہو۔

[شہادت، مئی ۲۰۰۴ء]

عورتیں امام کے پیچھے ہی کھڑی ہوں

سوال عیدگاہ مسجد کے قریب ہی بطرف مشرق ہو، مرد نماز عید، عیدگاہ میں ادا کریں جبکہ مستورات مسجد میں (جو کہ عیدگاہ سے آگے قریب ہی قبلہ کی سمت میں واقع ہے) نماز عید کی اقتداء کریں تو ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ امام (عورتوں اور مردوں کی) درمیانی پوزیشن میں امامت کروا رہا ہے۔ نماز عید ادا کرنے کی ایسی صورت وکیفیت از روئے شریعت درست ہے یا نہیں؟ (محمد صدیق، ایبٹ آباد)

الجواب ایسی صورت میں عورتوں کی نماز صحیح نہیں۔ عورتوں کا امام سے پیچھے ہونا متواتر دلائل سے ثابت ہے۔ [شہادت، مئی ۲۰۰۴ء]

امام کا اونچی آواز سے تکبیریں کہنا

سوال ایک تبلیغی دیوبندی (علی آفاق) نے مجھے لکھ کر دیا ہے:

''اگر جناب عمران صاحب نماز شروع کرنے کی تکبیر یعنی تکبیر تحریمہ ادا کرنے کا طریقہ حدیث سے بیان کر دیں کہ امام صاحب کس طرح ادا کریں، اونچی یا آہستہ اور مقتدی کس طرح ادا کرے اونچی یا آہستہ، بہر صورت حدیث بیان کریں، میں اُسی وقت بھائی کا مسلکِ قرآن وحدیث اختیار کر لوں گا اور اگر ایسا نہ ہوسکا تو بھائی عمران صاحب حنفیت اختیار کریں گے، دستخط علی آفاق (مولانا) ۲۰۰۴۔۸۔۱۶'' انتهى كلامه

کیا اس بات کا ثبوت ہے کہ امام نماز میں اونچی تکبیریں کہے اور مقتدی دل میں یعنی سراً تکبیریں کہیں، دلیل سے جواب دیں۔ جزاکم اللہ خیراً (عمران بن تسلیم خان حضرو ضلع اٹک)

الجواب امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''أخبرنا أبو القاسم طلحة بن علي ابن الصقر وأبو عبد الله محمد بن أحمد بن أبي طاهر الدقاق ببغداد قالا: أنبأ أحمد بن عثمان بن يحي الأدمي: ثنا عباس بن محمد بن حاتم الدوري: ثنا يونس بن محمد: ثنا فليح عن سعيد بن الحارث قال: اشتكى أبو هريرة أوغاب، فصلى أبو سعيد الخدري فجهر با لتكبير حين افتتح وحين ركع وبعد إن قال: سمع الله لمن حمده وحين رفع رأسه من السجود وحين سجد وحين رفع وحين قام من الركعتين حتى قضى صلوته على ذلك، فلما انصرف قيل له: قد اختلف الناس علٰى صلوتك، فخرج حتى قام عند المنبر فقال: أيها الناس! إني والله إما أبالي اختلفت صلوتكم أولم تختلف، إني رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم هكذا يصلي، رواه البخاري في الصحيح عن يحي بن صالح عن فليح بن سليمان''

(ترجمہ:) سعید بن الحارث (تابعی) بیان کرتے ہیں: ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) جو کہ امام تھے، ایک (دفعہ) بیمار ہوئے یا (کسی وجہ سے مسجد سے) غائب تھے تو ابو سعید الخدری (رضی اللہ عنہ)

نے (ہمیں) نماز پڑھائی، پس انھوں نے تکبیر افتتاح، رکوع والی تکبیر، سمع اللہ لمن حمدہ کے بعد (سجدے کے لئے جانے) والی تکبیر، سجدے سے اُٹھنے والی تکبیر، (دوبارہ) سجدہ کرنے والی تکبیر، (سجدے سے) اُٹھنے والی تکبیر اور دو رکعتیں پڑھ کر اٹھنے والی تکبیر (یہ سب تکبیریں) جہراً (اونچی آواز سے) کہیں، حتی کہ انھوں نے اسی (طریقے) پر نماز پوری کی۔ پھر جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو کہا گیا: لوگوں کا آپ کی نماز پر اختلاف ہو گیا ہے۔ تو آپ (وہاں سے) نکل کر منبر پر کھڑے ہو گئے، پھر فرمایا: اے لوگو! اللہ کی قسم مجھے اس کی کوئی پروا نہیں کہ تمھاری نمازوں میں اختلاف ہوا ہے یا نہیں، بیشک میں نے رسول اللہ ﷺ کو اسی طرح نماز پڑھتے (پڑھاتے) دیکھا ہے۔

اسے (امام) بخاری نے صحیح (بخاری) میں یحییٰ بن صالح عن فلیح بن سلیمان کی سند سے روایت کیا ہے۔ (السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۲ ص ۱۸ باب جہر الامام بالتکبیر)

سند کی تحقیق: اس حدیث کی سند کے راویوں کا مختصر تعارف درج ذیل ہے:

(۱) أبو القاسم طلحة بن علي بن الصقر : كان ثقة . (تاریخ بغداد ۹ ص ۳۵۲)

(۲) أبو عبد الله محمد بن أحمد بن أبي طاهر الدقاق : كا ن ثقة .

(تاریخ بغداد ۱/ ۳۵۳، ۳۵۴ ت ۲۸۱)

(۳) أحمد بن عثمان بن يحي الأدمي: و كان ثقة حسن الحديث .

(تاریخ بغداد ۴/ ۲۹۹)

(۴) عباس بن محمد بن حاتم الدوري :ثقة حافظ . (تقریب التہذیب: ۳۱۸۹)

(۵) يونس بن محمد (المؤدب) :ثقة ثبت. (تقریب التہذیب: ۷۹۱۴)

(۶) فليح بن سليمان : صحیح بخاری وصحیح مسلم کے راوی ہیں، جمہور نے اُن کی توثیق کی ہے۔ جس کی جمہور محدثین توثیق کریں وہ راوی (کم از کم) حسن الحدیث ہوتا ہے۔ حافظ ذہبی اس کی بیان کردہ حدیثوں کو صحیح کہتے ہیں، مثلاً دیکھئے المستدرک للحاکم (۴/ ۲۰۷ ح ۸۲۴۴) امام بخاری ومسلم کے علاوہ، درج ذیل محدثین نے بھی اُن کی حدیثوں کو صحیح قرار دیا ہے:

(۱) ترمذی : ۲۶۰ (۲) حاکم (۳) ابن خزیمہ: ۵۸۹ (۴) ابن حبان/ الاحسان ۲۹/۴ ح ۲۳۰۲، دوسرا نسخہ ۶/۷۹، ۸۰ ح ۲۳۰۵

خلاصہ یہ کہ فلیح بن سلیمان حسن الحدیث راوی ہیں۔ والحمدللہ

حافظ ذہبی فرماتے ہیں: "وحديثه في رتبة الحسن" اوران کی حدیث حسن درجے کی ہوتی ہے۔ (تذکرۃ الحفاظ ۲۲۴/۱ ت ۲۰۹)

محمد بن علی النیموی نے فلیح مذکور کی حدیث کو "اسنادہ حسن" قرار دے کر حافظ ذہبی کا قول نقل کیا ہے۔ (آثار السنن ح: ۴۰۴ مع التعلیق)

(۷) سعید بن الحارث: ثقہ ہیں۔ (التقریب: ۲۲۸۰)

خلاصہ: یہ سند حسن لذاتہ ہے۔

تنبیہ: یہی روایت حافظ ہیثمی نے بحوالہ مسند احمد نقل کی ہے۔ (مجمع الزوائد ۱۰۳/۲، ۱۰۴)

اور حافظ ہیثمی سے ظفر احمد تھانوی دیوبندی نے نقل کر کے اس سے استدلال کیا ہے۔

(اعلاء السنن ۱۸۵/۲ ح ۶۶۲ واحیاء السنن ۳۷۲/۱)

فائدہ: بیہقی والی یہ حدیث، صحیح بخاری (ح ۸۲۵) میں مختصراً موجود ہے۔

اس حدیث سے صاف معلوم ہوا کہ جماعت میں امام کو، بلند آواز سے تکبیریں کہنی چاہئیں۔

مقتدیوں کا دل میں (خُفیہ) تکبیریں کہنا

مقتدیوں کا دل میں، آہستہ آواز سے، خُفیہ تکبیریں کہنا کئی دلائل سے ثابت ہے۔

۱: اس پر اجماع ہے کہ مکبر کے علاوہ تمام مقتدیوں کو، امام کے پیچھے دل میں، سراً، آہستہ آواز سے اور خفیہ تکبیریں کہنی چاہئیں۔ اس اجماع کا نظارہ، دنیا کی کسی بھی مسجد میں جا کر کیا جاسکتا ہے۔ والحمدللہ

مولانا نذیر احمد رحمانی رحمہ اللہ (متوفی ۱۹۶۵ء) فرماتے ہیں:

"اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے کہ تکبیرات انتقال امام زور سے کہتا ہے تو مقتدی بھی اس کی اتباع میں زور سے کہیں"

(نوافل کی جماعت کے ساتھ فرض نماز کا حکم ص ۸۴ مطبوعہ: ادارۃ العلوم الاثریہ فیصل آباد)

ماہنامہ الحدیث حضرو میں بار بار یہ ثابت کر دیا گیا ہے کہ اجماع شرعی حجت ہے، مثلاً دیکھئے الحدیث: ۱ ص ۴، والحمدللہ

۲: زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ''كنا نتكلم فى الصلوة ، يكلم أحدنا أخاه في حاجته حتى نزلت هذه الآية: ﴿ حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ق وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴾ فامرنا با لسكوت ''

ہم نماز میں باتیں کرتے تھے۔ ہر آدمی اپنے (ساتھ والے) بھائی سے ضروری بات کر لیتا تھا۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی: نمازوں کی حفاظت کرو اور درمیانی نماز (عصر) کی حفاظت کرو، اور اللہ کے سامنے عاجزی سے کھڑے ہو جاؤ [البقرة :۲۳۸] پھر ہمیں سکوت (خاموشی) کا حکم دے دیا گیا۔ (صحیح بخاری: ۴۵۳۴ و صحیح مسلم: ۵۳۹)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مقتدی خاموشی سے نماز پڑھے گا۔ اس حکم سے تین حالتیں مستثنیٰ ہیں:

اول: مقتدی اگر مکبر ہو تو دوسرے مقتدیوں کو سنانے کے لئے بلند آواز سے تکبیریں کہے گا۔ اس کی دلیل آگے آرہی ہے۔

دوم: امام اگر بھول جائے تو مقتدی مرد سبحان اللہ کہے گا۔
دلیل کے لئے دیکھئے صحیح بخاری (۱۲۳۴) و صحیح مسلم (۴۲۱)

سوم: اگر امام قراءت میں بھول جائے تو مقتدی اسے بلند آواز میں لقمہ دے سکتا ہے۔
دیکھئے سنن ابی داود (۹۰۷) و جزء القراءۃ للبخاری بتحقیقی (۱۹۴) وسندہ حسن۔

۳: سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

''وقعد النبي صلى الله عليه وسلم إلى جنبه وأبو بكر يسمع الناس التكبير''

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان (ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ) کے پاس بیٹھ گئے (آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو نماز پڑھانے لگے) اور ابوبکر (صدیق رضی اللہ عنہ) لوگوں کو تکبیر سناتے تھے۔

(صحیح البخاری: ۷۱۲ و صحیح مسلم: ۹۶/ ۴۱۸)

اس حدیث سے دو مسئلے معلوم ہوئے:

اول: حالتِ ضرورت اور اضطرار میں مکبر بننا اور بنانا جائز ہے۔

دوم: سارے مقتدی بغیر جہر کے، خفیہ آواز سے، دل میں تکبیریں کہیں گے، ورنہ پھر مکبر بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟

۴: عکرمہ سے روایت ہے: "میں نے مکہ میں ایک شیخ کے پیچھے نماز پڑھی۔ انھوں نے بائیس (۲۲) تکبیریں کہیں، میں نے ابن عباس (رضی اللہ عنہما) سے ذکر کیا تو انھوں نے فرمایا: "سنة أبی القاسم صلی اللہ علیہ وسلم" یہ ابوالقاسم (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی سنت ہے۔ (صحیح البخاری: ۷۸۸)

چار رکعتوں میں تکبیر تحریمہ، رکوع اور سجدوں والی تکبیریں اور دو رکعتیں پڑھ کر اٹھنے والی تکبیر، یہ کل تکبیریں بائیس (۲۲) ہوتی ہیں۔

اس حدیث سے امام کا جہراً تکبیریں کہنا، بطورِ نص (دلیل) اور مقتدیوں کا دل میں تکبیریں کہنا بطورِ اشارہ ثابت ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ احادیث صحیحہ اور اجماع سے ثابت ہے کہ مقتدی حضرات دل میں سراً تکبیریں کہیں گے۔ [الحدیث: ٦]

نبی کا امتی کی اقتدا میں نماز پڑھنا

سوال دوسری روایت بھی سیوطی صاحب کی کتاب سے منقول ہے کہ ہر نبی نے اپنے امتی کے پیچھے نماز پڑھی اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت آدمؑ نے کس کے پیچھے نماز پڑھی۔ (عابد حسین شاہ ولد ظہور شاہ)

الجواب حافظ سیوطی لکھتے ہیں: " (الحادی عشر) حدیث: ماقبض نبی قط حتی یؤمہ رجل من أمتہ، البزار " مفہوم: حدیث میں آیا ہے کہ: ایسا کوئی نبی بھی فوت نہیں ہوا جس نے اپنی وفات سے پہلے اپنے کسی امتی کے پیچھے نماز نہیں پڑھی۔

(تاریخ الخلفاء ص ۸۸)

یہ روایت بزار (البحر الزخار ۱/۵۵ ح ۳، کشف الاستار ۳/۲۱۱ ح ۲۵۹۱) اور احمد بن حنبل

(المسند ۱/۱۳ ح ۷۸) نے "عاصم بن كليب قال: حدثني شيخ من قريش من بني تميم عن عبدالله بن الزبير عن عمر بن الخطاب عن أبي بكر الصديق رضي الله عنهم" إلخ کی سند سے بیان کی ہے۔

یہ سند ضعیف ہے۔ (تحقیق احمد شاکر ۱/۱۷۹ نیز دیکھئے الموسوعۃ الحدیثیۃ/تحقیق مسند الامام احمد ۱/۲۴۰)

اس کا راوی شیخ مجہول ہے۔ مجہول راوی کی بیان کردہ حدیث ضعیف ہوتی ہے الا یہ کہ اس کی تائید ومتابعت کسی دوسری صحیح یا حسن روایت سے ہو جائے۔

دوسری سند: ابونعیم الاصبہانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"حدثنا أبو محمد بن حيان: ثنا أبو صالح عبدالرحمن بن أحمد الزهرى الأعرج: ثنا إبراهيم بن أحمد النابتي: ثنا علي بن الحسن بن شفيق: ثنا أبو حمزة السكرى عن عاصم بن كليب عن عبدالله بن الزبير: ثنا عمر بن الخطاب عن أبى بكر الصديق رضي الله عنهم قال: سمعت النبي ﷺ يقول: مابعث الله نبياً إلا وقد أمه بعض أمته" (اخبار اصبہان ۲/۱۱۴)

یہ روایت تین وجہ سے ضعیف ہے:

اول: عاصم بن کلیب اور عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ کے درمیان مجہول شیخ کا واسطہ گر گیا ہے۔

مجہول شیخ کے واسطے والی روایت "المزيد فى متصل الأسانيد" کے باب سے ہے۔

دوم: عبدالرحمٰن بن احمد الاعرج مجہول الحال ہے۔

سوم: ابراہیم بن احمد النابتی کی توثیق نامعلوم ہے۔

دیکھئے الضعیفہ للشیخ الالبانی رحمہ اللہ (۵۳۳/۱۳ ح ۶۲۴۶)

خلاصہ یہ ہے کہ یہ روایت اپنی دونوں سندوں کے ساتھ ضعیف ہے لہٰذا یہ سوال کہ "آدم علیہ السلام نے کس کے پیچھے (نماز) پڑھی؟" کسی جواب کا محتاج نہیں ہے۔

تنبیہ: نبی کریم ﷺ کے بارے میں یہ ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن (کسی شرعی عذر کی وجہ سے) نماز پڑھنے والی جگہ دیر سے آئے تو عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ

نماز پڑھا رہے تھے، آپ ﷺ نے عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی اور اپنی فوت شدہ رکعت کو بعد میں دہرا لیا۔

دیکھئے صحیح مسلم (کتاب الطہارہ، باب المسح علی الناصیہ والعمامہ ۸۱/۲۷۴) اور سنن ابن ماجہ (کتاب اقامۃ الصلوٰۃ باب ماجاء فی صلوۃ رسول اللہ ﷺ خلف رجل من امتہ ح ۱۲۳۶)

یاد رہے کہ نبی ﷺ کی موجودگی میں دوسرا شخص امام نہیں ہوسکتا، جو شخص آپ کی غیر حاضری میں نماز پڑھا رہا تھا وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہے۔ [الحدیث:۱۰]

نماز میں عورت کی امامت

سوال ایک سوال درپیش ہے کہ کیا عورت عورتوں کی امامت یا عورتوں مردوں کی اکٹھی امامت کرا سکتی ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

جزاکم اللہ خیراً" (چوہدری محمد اکرم گجر، جلال بلگن ضلع گوجرانوالہ)

الجواب اس مسئلے میں علماءِ کرام کا اختلاف ہے کہ کیا عورت نماز میں عورتوں کی امام بن سکتی ہے یا نہیں؟ ایک گروہ اس کے جواز کا قائل ہے۔

ایک روایت میں آیا ہے: " وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَزُوْرُهَا فِيْ بَيْتِهَا وَجَعَلَ لَهَا مُؤَذِّنًا يُؤَذِّنُ لَهَا وَأَمَرَهَا أَنْ تَؤُمَّ أَهْلَ دَارِهَا "

رسول اللہ ﷺ اُن (ام ورقہ رضی اللہ عنہا) کی ملاقات کے لیے اُن کے گھر جاتے، آپ نے ان کے لئے اذان دینے کے لئے ایک مؤذن مقرر کیا تھا اور آپ نے انہیں (ام ورقہ رضی اللہ عنہا کو) حکم دیا تھا کہ انہیں (اپنے قبیلے یا محلے والیوں کو) نماز پڑھائیں۔

(سنن ابی داود، کتاب الصلوۃ، باب امامۃ النساء ح ۵۹۲ وعنہ البیہقی فی الخلافیات قلمی ص ۴ب)

یہ سند حسن ہے، اسے ابن خزیمہ (۱۶۷۶) اور ابن الجارود (المنتقی: ۳۳۳) نے صحیح قرار دیا ہے۔

اس حدیث کے بنیادی راوی ولید بن عبداللہ بن جمیع: صدوق، حسن الحدیث تھے۔

(دیکھئے تحریر تقریب التہذیب: ۷۴۳۲)

یہ صحیح مسلم وغیرہ کے راوی اور جمہور محدثین کے نزدیک ثقہ وصدوق تھے لہٰذا اُس پر جرح مردود ہے۔

ولید کے استاد عبدالرحمٰن بن خلاد: ابن حبان، ابن خزیمہ اور ابن الجارود کے نزدیک ثقہ وصحیح الحدیث تھے لہٰذا اُن پر "حاله مجهول" والی جرح مردود ہے۔

لیلیٰ بنت مالک (ولید بن جمیع کی والدہ) کی توثیق ابن خزیمہ اور ابن الجارود نے اس کی حدیث کی تصحیح کر کے، کر دی ہے لہٰذا ان کی حدیث بھی حسن کے درجہ سے نہیں گرتی۔

اس حدیث کا مفہوم کیا ہے؟ اس کے لئے دو اہم باتیں مدنظر رکھیں:

اول: حدیث حدیث کی شرح وتفسیر بیان کرتی ہے، اس کے لئے حدیث کی تمام سندوں اور متون کو جمع کر کے مفہوم سمجھا جاتا ہے۔

دوم: سلف صالحین (محدثین کرام، راویانِ حدیث) نے حدیث کی جو تفسیر اور مفہوم بیان کیا ہوتا ہے اُسے ہمیشہ مدنظر رکھا جاتا ہے، بشرطیکہ سلف کے مابین اس مفہوم پر اختلاف نہ ہو۔

اُم ورقہ رضی اللہ عنہا والی حدیث پر امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ (متوفی ۳۱۱ھ) نے درج ذیل باب باندھا ہے:

"باب إمامة المرأةِ النساءَ في الفريضة"

فرض نماز میں عورت کا عورتوں کی امامت کرنے کا باب (صحیح ابن خزیمہ ۸۹/۳ ح ۱۶۷۶)

امام ابو بکر بن المنذر النیسابوری رحمہ اللہ (متوفی ۳۱۸ھ) فرماتے ہیں:

"ذكر إمامة المرأة النساء في الصلوات المكتوبة"

فرض نمازوں میں عورت کا عورتوں کی امامت کرنے کا ذکر۔

(الاوسط فی السنن والاجماع والاختلاف ج ۴ ص ۲۲۶)

ان دونوں محدثین کرام کی تبویب سے معلوم ہوا کہ اس حدیث میں "أَهْلَ دَارِهَا" سے مراد عورتیں ہیں مرد نہیں ہیں، محدثین کرام میں اس تبویب پر کوئی اختلاف نہیں ہے۔

امام ابوالحسن الدارقطنی رحمہ اللہ (متوفی ۳۸۵ھ) فرماتے ہیں:

"حدثنا أحمد بن العباس البغوي :ثنا عمر بن شبه: (ثنا) أبو أحمد الزبيري: نا الوليد بن جميع عن أمه عن أم ورقة أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ أَذِنَ لَهَا أَنْ يُؤَذَّنَ لَهَا وَيُقَامَ وَتَؤُمَّ نِسَاءَ هَا" بے شک رسول اللہ ﷺ نے ام ورقہ (رضی اللہ عنہا) کو اس کی اجازت دی تھی کی اُن کے لئے اذان اور اقامت کہی جائے اور وہ اپنی (گھر، محلے کی) عورتوں کی (نماز میں) امامت کریں۔ (سنن دارقطنی ج ۱ ص ۲۷۹ ح ۱۰۷۱ وسندہ حسن، وعنہ ابن الجوزی فی التحقیق مع التنقیح ۱/۲۵۳ ح ۴۲۴ وضعفہ، دوسرا نسخہ ۱/۳۱۳ ح ۳۸۷، اتحاف المھرہ لابن حجر ۱۸/۳۲۲)

اس روایت کی سند حسن ہے اور اس پر علامہ ابن الجوزی کی جرح غلط ہے۔

ابو احمد محمد بن عبداللہ بن الزبیر الزبیری کتبِ ستہ کے راوی اور جمہور کے نزدیک ثقہ تھے لہٰذا وہ صحیح الحدیث ہیں۔

امام یحییٰ بن معین نے کہا: ثقہ، ابو زرعہ نے کہا: صدوق، ابو حاتم رازی نے کہا:

" حَافِظٌ لِلْحَدِيْثِ عَابِدٌ مُجْتَهِدٌ لَهُ أَوْهَامٌ "

حدیث کے حافظ، محنتی عبادت گزار، آپ کو اوہام ہوئے۔ (الجرح والتعدیل ۷/۲۹۷)

عمر بن شبہ: صدوق لہ تصانیف (تقریب التہذیب: ۴۹۱۸) بلکہ ثقہ ہیں۔ (تحریر تقریب التہذیب ۳/۷۵) حافظ ذہبی نے کہا: ثقة (الکاشف ۲/۲۷۲)

احمد بن العباس البغوی: ثقہ تھے۔ (تاریخ بغداد ۴/۳۲۹ ت ۲۱۴۴)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہ سند حسن لذاتہ ہے۔ اس صحیح روایت نے اس بات کا قطعی فیصلہ کر دیا کہ "أَهْلَ دَارِهَا" سے مراد اُم ورقہ رضی اللہ عنہا کے گھر، محلے اور قبیلے کی عورتیں ہیں، مرد مراد نہیں ہیں۔

[تنبیہ: اس سے معلوم ہوا کہ ام ورقہ رضی اللہ عنہا کے پیچھے ان کا مؤذن نماز نہیں پڑھتا تھا۔]

یہاں یہ بات حیرت انگیز ہے کہ کوئی پروفیسر خورشید عالم نامی (؟) لکھتے ہیں:

"یہ دارقطنی کے اپنے الفاظ ہیں حدیث کے الفاظ نہیں، یہ ان کی اپنی رائے ہے۔ سنن دارقطنی کے علاوہ حدیث کی کسی کتاب میں یہ اضافہ نہیں، اس لئے اس اضافے کو بطورِ

دلیل پیش نہیں کیا جا سکتا'' (اشراق ۱۷/۵ مئی ۲۰۰۵ء ص ۳۸، ۳۹)

حالانکہ آپ نے ابھی پڑھ لیا ہے کہ یہ حدیث کے الفاظ ہیں، دار قطنی کے اپنے الفاظ نہیں ہیں بلکہ راویوں کی بیان کردہ روایت کے الفاظ ہیں۔ انھیں امام دار قطنی رحمہ اللہ کی ''اپنی رائے'' کہنا غلط ہے۔ جن لوگوں کو روایت اور رائے میں فرق معلوم نہیں ہے وہ کیوں مضامین لکھ کر اُمتِ مسلمہ میں اختلاف وانتشار پھیلانا چاہتے ہیں؟

رہا یہ مسئلہ کہ یہ الفاظ سنن دار قطنی کے علاوہ حدیث کی کسی کتاب میں نہیں ہیں تو عرض ہے کہ امام دار قطنی ثقہ وقابلِ اعتماد امام تھے۔

شیخ الاسلام ابو الطیب طاہر بن عبداللہ الطبری (متوفی ۴۵۰ھ) نے کہا:

"كان الدارقطني أمير المؤمنين في الحديث ...."

حدیث میں دار قطنی اہلِ ایمان کے امیر تھے۔ (تاریخ بغداد ۱۲/ ۳۶ ت ۶۴۰۴)

خطیب بغدادی رحمہ اللہ (متوفی ۴۶۳ھ) نے کہا:

" وكان فريد عصره وقريع دهره ونسيج وحده وإمام وقته ، انتهى إليه علم الأثر والمعرفة بعلل الحديث و أسماء الرجال وأحوال الرواة مع الصدق والأمانة والفقه والعدالة (وفي تاريخ دمشق عن الخطيب قال: والثقة والعدالة، ۴۷/۴۶) وقبول الشهادة وصحة الإعتقاد وسلامة المذهب......"

وہ یکتائے روزگار، اپنے زمانے کے سردار، علم وہنر میں یگانہ اور اپنے زمانے کے امام تھے۔ علم حدیث، عِلل کی معرفت، اسماء رجال اور راویوں کے حالات معلوم کرنا اُن پر ختم تھا، وہ سچائی، امانت، فقہ، عدالت (اور ثقاہت)، قبول شہادت، صحتِ اعتقاد اور سلامتِ مذہب کے ساتھ موصوف تھے۔ (تاریخ بغداد ۱۲/ ۳۴ ت ۶۴۰۴)

حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے فرمایا: " الإمام الحافظ المجود شيخ الإسلام علم الجهابذه " (سیر اعلام النبلاء ۱۶/ ۴۴۹)

اس جلیل القدر امام پر متاخر حنفی فقیہ محمود بن احمد العینی (متوفی ۸۵۵ھ) کی جرح مردود

ہے۔عبدالحیٰ لکھنوی نے اس عینی کے بارے میں لکھا:" ولو لم يكن فيه رائحة التعصب المذهبي لكان أجود دو أجود " اگر اس (عینی) میں مذہبی (یعنی حنفی) تعصب کی بدبو نہ ہوتی تو بہت ہی اچھا ہوتا۔ (الفوائد البہیہ ص ۲۰۸)

تنبیہ: امام دارقطنی رحمہ اللہ تدلیس کے الزام سے بری ہیں۔

دیکھئے میری کتاب الفتح المبین فی تحقیق طبقات المدلسین (۱/۱۹)

جب حدیث نے بذاتِ خود حدیث کا مفہوم متعین کر دیا ہے اور محدثین کرام بھی اس حدیث سے عورت کا عورتوں کی امامت کرانا ہی سمجھ رہے ہیں تو پھر لغت کی مدد اور الفاظ کے ہیر پھیر سے عورتوں کو مردوں کا امام بنا دینا کس عدالت کا انصاف ہے؟

ابن قدامہ لکھتے ہیں: " وهذه زيادة يجب قبولها "

اور اس زیادت (نساءھا) کا قبول کرنا واجب ہے۔ (المغنی ۲/ ۱۶ م ۱۱۴۰)

یہاں یہ بھی یاد رہے کہ آثار سلف صالحین سے صرف عورت کا عورتوں کی امامت کرانا ہی ثابت ہوتا ہے۔عورت کا مردوں کی امامت کرانا کسی اَثر سے ثابت نہیں ہے۔

ریطہ الحنفیہ (قال العجلی: کوفیۃ تابعیۃ ثقۃ) سے روایت ہے:

" أمتنا عائشة فقامت بينهن في الصلوة المكتوبة "

ہمیں عائشہ (رضی اللہ عنہا) نے فرض نماز پڑھائی تو آپ عورتوں کے درمیان کھڑی ہوئی تھیں۔

(سنن دارقطنی ۱/ ۴۰۴ ح ۱۴۲۹، وسندہ حسن، وقال النیموی فی آثار السنن: ۵۱۴" وإسنادہ صحیح" وانظر کتابی انوار السنن فی تحقیق آثار السنن ق ۱۰۳)

امام شعبی رحمہ اللہ (مشہور تابعی) نے فرمایا: " تؤم المرأة النساء في صلوة رمضان تقوم معهن في صفهن " عورت عورتوں کو رمضان کی نماز پڑھائے (تو) وہ ان کے ساتھ صف میں کھڑی ہو جائے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ۲/ ۸۹ ح ۴۹۵۵ وسندہ صحیح، عنعنۃ ہشیم عن حصین محمولۃ علی السماع، انظر شرح علل الترمذی لابن رجب ۲/ ۵۶۲ والفتح المبین فی تحقیق طبقات المدلسین لراقم الحروف ۱۱۱/۳)

ابن جریج نے کہا:" تؤم المرأة النساء من غير أن تخرج أمامهن ولكن تحاذي

بهن فی المکتوبة والتطوع "عورت جب عورتوں کی امامت کرائے گی تو وہ آگے کھڑی نہیں ہوگی بلکہ اُن کے برابر (صف میں ہی) کھڑی ہو کر فرض و نفل پڑھائے گی۔

(مصنف عبدالرزاق ۳/۱۴۰ ح ۵۰۸۰، اس روایت کی سند عبدالرزاق کی تدلیس [عن] کی وجہ سے ضعیف ہے۔)

معمر بن راشد نے کہا: " تؤم المرأة النساء في رمضان وتقوم معهن فی الصف" عورت عورتوں کو رمضان میں نماز پڑھائے اور وہ اُن کے ساتھ صف میں کھڑی ہو۔

(مصنف عبدالرزاق ۳/۱۴۰ ح ۵۰۸۵، اس روایت کی سند عبدالرزاق کی تدلیس [عن] کی وجہ سے ضعیف ہے۔)

اس پر سلف صالحین کا اجماع ہے کہ عورت جب عورتوں کو نماز پڑھائے گی تو صف سے آگے نہیں بلکہ صف میں ہی اُن کے ساتھ برابر کھڑی ہو کر نماز پڑھائے گی۔

مجھے ایسا ایک حوالہ بھی باسند نہیں ملا جس سے یہ ثابت ہو کہ سلف صالحین کے سنہری دور میں کسی عورت نے مردوں کو نماز پڑھائی ہو یا کوئی مستند عالم اس کے جواز کا قائل ہو۔

[اسی طرح کسی روایت میں ام ورقہ رضی اللہ عنہا کے مؤذن کا اُن کے پیچھے نماز پڑھنا بھی قطعاً ثابت نہیں۔]

ابن رشد (متوفی ۵۱۵ھ) وغیرہ بعض متاخرین نے بغیر کسی سند و ثبوت کے یہ لکھا ہے کہ ابو ثور (ابراہیم بن خالد، متوفی ۲۴۰ھ) اور (محمد بن جریر) الطبری (متوفی ۳۱۰ھ) اس بات کے قائل ہیں کہ عورت مردوں کو نماز پڑھا سکتی ہے۔

(دیکھئے بدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۱۴۵، المغنی فی فقہ الامام احمد ۲/۱۵ مسئلہ: ۱۱۴۰)

چونکہ یہ حوالے بے سند ہیں لہٰذا مردود ہیں۔

خلاصۃ التحقیق: عورت کا نماز میں عورتوں کی امامت کرانا جائز ہے مگر وہ مردوں کی امام نہیں بن سکتی۔ وما علینا إلا البلاغ (۳ ربیع الاول ۱۴۲۶ھ) [الحدیث: ۱۵]

باقی ماندہ رکعات کی ادائیگی کیسے؟

سوال مختلف حالات میں داخل ہونے والا نمازی (جماعت میں) بقایا نماز کس طرح ادا کرے گا؟ (سید عبدالناصر، ضلع مردان)

الجواب حدیث میں ہے: ((ما أدركتم فصلوا وما فاتكم فأتموا))

جتنی نماز امام کے ساتھ پاؤ، پڑھو اور جتنی فوت ہو جائے، پوری کرو۔

(دیکھئے صحیح بخاری: ۶۳۵، صحیح مسلم: ۶۰۳)

مولانا عبداللہ محدث روپڑی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس سے معلوم ہوا کہ مسبوق امام کے فارغ ہونے کے بعد جتنی نماز پڑھتا ہے وہ اس کی پچھلی نماز ہے اور جو امام کے ساتھ پڑھی ہے وہ اس کی پہلی ہے۔ کیونکہ حدیث میں فوت شدہ کی بابت اتمام کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی اخیر سے پورا کرنے کے ہیں۔ اور اخیر سے پورا کرنا اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ جو امام کی فراغت کے بعد پڑھے وہ اس کی اخیر ہو گی۔ اور بعض روایتوں میں اتمام کی جگہ قضاء کا لفظ آیا ہے تو وہ بھی اس کے خلاف نہیں ہے۔ کیونکہ قضاء کے معنی پورا کرنے کے بھی آتے ہیں۔ جیسے قرآن مجید میں ہے: ﴿ فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ ﴾ یعنی جب نماز پوری ہو جائے تو پھر روزی کی تلاش کے لئے زمین میں پھیل جاؤ۔ (الجمعہ: ۱۰)

پس جب اخیری نماز ہوئی تو اس میں ثناء نہیں پڑھنی چاہئے۔ اگر غلطی سے پڑھ لی جائے تو معاف ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے قرآن مجید میں متشابہ لگ جاتا ہے۔ دیدہ دانستہ پڑھنی ٹھیک نہیں خواہ مغرب کی نماز ہو یا کوئی اور چار رکعت والی نماز ہو یا دو رکعت والی نماز ہو۔ کسی میں ثناء نہیں اور التحیات بھی اسی حساب سے بیٹھے یعنی امام کے ساتھ ایک رکعت پائی ہے تو ایک اور پڑھ کر بیٹھے۔ اگر رکوع میں امام کے ساتھ ملا ہے تو اسے رکعت شمار نہ کرے۔''

(فتاویٰ اہلِ حدیث ج ۱ ص ۵۷۰، ۵۷۱۔ از عبداللہ روپڑی رحمہ اللہ)

محدث روپڑی رحمہ اللہ کی تحقیق سے معلوم ہوا کہ مسبوق، امام کے ساتھ جو رکعت پائے گا وہ اس مسبوق کی پہلی رکعت ہے۔ وہ بعد میں باقی نماز پوری کرے گا۔ سلف صالحین

میں سے یہی موقف امام سعید بن المسیب رحمہ اللہ وغیرہ کا ہے۔
دیکھئے السنن الکبریٰ للبیہقی (ج ۲ ص ۲۹۹)

ابن ابی شیبہ نے صحیح سند کے ساتھ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ وہ امام کے ساتھ پائی جانے والی نماز کو اس کی آخری نماز قرار دیتے تھے "أنه كان يجعل ما أدرك مع الإمام آخر صلاته" (ج ۲ ص ۳۲۴ ح ۷۱۲۱) جب امام کی نماز، اس (امام) کی آخری نماز ہے تو معلوم ہوا کہ وہ اپنی نماز کو اپنی پہلی نماز ہی سمجھتے تھے۔ [شہادت، دسمبر ۲۰۰۱ء]

مغرب کی نماز پڑھنے والے کے پیچھے عصر کی نماز؟

سوال اگر کوئی شخص کسی مجبوری سے عصر نہ پڑھ سکا وہ جب مسجد پہنچا تو مغرب کی جماعت کھڑی ہونے والی تھی کیا وہ اپنی عصر پہلے ادا کرے گا اور پھر جماعت میں داخل ہوگا یا پہلے مغرب پڑھ کر عصر ادا کرے گا۔ نماز میں ترتیب ضروری ہے کہ نہیں؟

(محمد عادل شاہ، برطانیہ)

الجواب حدیث میں آیا ہے کہ ((فما أدركتم فصلّوا وما فاتكم فأتموا.))
پس تم جو پالو تو نماز پڑھ لو اور جو فوت ہو جائے تو پوری کرلو۔ (صحیح بخاری: ۶۳۵، صحیح مسلم: ۶۰۳)

اس حدیث کی رُو سے مغرب پڑھنے والے کے پیچھے مغرب کی نماز پڑھیں اور بعد میں عصر کی نماز پڑھ لیں۔ نماز میں ترتیب کا خیال ضروری ہے لیکن اضطراری حالت کے احکام بعض اوقات بدل جاتے ہیں۔

مغرب والے کے پیچھے عصر کی نماز پڑھنا میرے علم کے مطابق کسی حدیث یا اثر سے ثابت نہیں ہے۔ واللہ اعلم

سوال ایک شخص سنتیں پڑھ رہا ہو تو کیا دوسرا آنے والا اس کے ساتھ بطورِ جماعت شامل ہو کر اپنے فرض پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ (محمد شاہد میمن)

الجواب اس کا صریح ثبوت مجھے معلوم نہیں ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تہجد والی حدیث پر قیاس کر کے بعض لوگ جواز کے قائل ہیں۔ تاہم دلیل صریح نہ ہونے کی وجہ سے

ایسے عمل سے اجتناب بہتر ہے البتہ یہ مسئلہ مسلم اور ثابت ہے کہ امام کی نیت نفل نماز کی ہو اور مقتدیوں کی فرض، تو دونوں کی نماز درست ہے۔ [شہادت، جولائی ۲۰۰۱ء]

سوال ایک شخص کی مغرب کی نماز فوت ہوگئی، جب وہ مسجد میں آیا تو عشاء کی جماعت تیار تھی، آیا وہ شخص مغرب کی نیت کرے اور تین رکعت پڑھ کر سلام پھیر دے اور پھر جماعت میں شامل ہو جائے؟ یا عشاء کی نماز پڑھے اور بعد میں مغرب ادا کرے؟

(محمد شاہد میمن)

الجواب عشاء کی چونکہ چار ہی رکعتیں ہیں لہٰذا عشاء کی نیت کر کے نماز پڑھ لے بعد میں مغرب کی نماز پڑھ لے۔ [شہادت، جولائی ۲۰۰۱ء]

صف بندی کا بیان

صف بندی کا حکم اور فقہ حنفی

سوال کیا فقہ حنفی میں نماز کی صف بندی میں خلا رکھنے کا حکم ہے یا نہیں؟ مہربانی کر کے واضح کر دیں۔ (ایک سائل)

الجواب مجھے ایسا کوئی حوالہ نہیں ملا جس میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے مقتدیوں کو یہ حکم دیا ہو کہ آپ ضرور بالضرور، صف میں دوسرے شخص سے چار پانچ یا زیادہ فاصلہ کر کے ہی کھڑے ہوں اور اگر کوئی شخص آپ کے قدم سے قدم ملانے کی جرأت کرے تو سختی سے اس کا پاؤں کچل دیں یا خفگی کا اظہار کریں اور نہ ایسا کسی حنفی ''فقیہ'' نے کہا ہے:

اس کے برعکس درمختار (فقہ حنفی کی ایک معتبر کتاب) میں لکھا ہوا ہے:

''(ويصف) أي يصفهم الإمام بأن يامرهم بذلك قال الشمني: وينبغي أن يامرهم بأن يتراصوا ويسدوا الخلل و يسووا مناكبهم'' (درمختار ج ا ص ۴۲۰)

''اور صف باندھیں یعنی مقتدیوں کی صف کرادے امام اس طرح کہ ان کو حکم کرے صف باندھنے کا شمنی نے کہا کہ امام کو چاہئے کہ مقتدیوں کو امر (حکم) کرے کہ ایک دوسرے سے ملے رہیں اور دو شخصوں کے بیچ میں کی جگہ کو بند کریں اور اپنے شانوں کو برابر رکھیں۔''

(غایۃ الاوطار ترجمہ درمختار ج ا ص ۲۹۶)

اس حنفی قول کی رو سے حنفیوں کو چاہئے کہ صف میں ایک دوسرے سے مل کر کھڑے ہوں۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف منسوب مسند ابی حنیفہ میں ایک روایت لکھی ہوئی ہے کہ

''قال رسول الله ﷺ: إن الله وملائكته يصلون على الذين يَصِلُوْنَ الصوف'' (مسند امام اعظم ص ۸۰)

استاد دارالعلوم دیوبند خورشید عالم صاحب نے اس حدیث کی تشریح میں لکھا ہے کہ

''صف کو ملانا یہ ہے کہ بیچ میں ایک دوسرے کے درمیان فاصلے اور دوری نہ ہو۔ کاندھے سے کاندھا اور شانے سے شانہ ملالیا جائے۔ خلفائے راشدین اپنی اپنی خلافتوں میں اس کی اہمیت پر بہت زور دیتے، حضرت علی وعثمان اس کی بہت دیکھ بھال رکھتے۔ حضرت علی مقتدیوں کو ہدایت کرتے کہ ایک سیدھ میں مل کر کھڑے ہوں، آگے پیچھے نہ رہیں''

(مسند امام اعظم ص ۱۷۱، ۱۷۲)

یادر ہے کہ صحیح احادیث وآثارِ صحابہ سے یہ ثابت ہے کہ مقتدیوں کو ایک دوسرے سے مل کر امام کی اقتداء کرنی چاہئے لہٰذا اس مسئلے میں احناف اور محدثین کرام کا کوئی اختلاف نہیں ہے البتہ موجودہ دور کے دیوبندیوں اور بریلویوں کا احناف ومحدثین سے ضرور اختلاف ہے۔ یہ لوگ صف ملانے سے بہت چڑتے ہیں۔ اللھم اھدھم

[شہادت، مارچ ۲۰۰۲ء]

سوال جماعت تیار ہے۔ اگلی صف میں ایک شخص کی گنجائش موجود ہے جب کہ دو شخص باقی ہیں۔ آیا اگلی صف مکمل کر کے ایک شخص پیچھے کھڑا ہو یا اگلی صف کو مکمل کیے بغیر یہ دونوں شخص دوسری صف بندی کریں؟ (محمد شاہد میمن)

الجواب دونوں طرح جائز ہے، مسئلہ اجتہادی ہے۔ [شہادت، جولائی ۲۰۰۱ء]

صف میں اکیلے آدمی کی نماز

سوال اگلی صف میں جگہ نہ ہونے کے باعث صف کے پیچھے اکیلا نمازی اگر

① آخر تک اکیلا ہی رہے تو اس کی نماز درست ہے؟

② اگر درست نہیں تو نماز لوٹانے کی صورت کیا ہوگی؟

③ نماز مکمل کر کے سلام پھیرنے کے بعد از سرِ نو نماز لوٹائے گا؟ (محمد صدیق، ایبٹ آباد)

الجواب صحیح احادیث مثلاً: ((لا صلوٰة لفرد خلف الصف وحده))

صف کے پیچھے اکیلے آدمی کی نماز نہیں ہوتی۔ (ابن حبان الموارد: ۴۰۱ وابن ماجہ: ۱۰۰۳) سے ثابت ہے کہ صف کے پیچھے اکیلے آدمی کی نماز نہیں ہوتی لہٰذا وہ سلام کے بعد اپنی نماز کا

اعادہ کرلے یعنی دوبارہ لوٹائے۔ [شہادت، مئی ۲۰۰۴ء]

سوال نماز باجماعت میں اگر کوئی نمازی بعد میں آئے اور پہلی صف مکمل ہو تو وہ اکیلا دوسری صف میں کھڑا ہوسکتا ہے یا نہیں؟ کیا کسی حدیث میں آیا ہے کہ صف کے پیچھے اکیلے آدمی کی نماز نہیں ہوتی؟ اگر ہے تو اس حدیث کے بارے میں تفصیل سے وضاحت فرمائیں؟ (ابوطاہر محمدی، خانیوال)

الجواب یہ آدمی دوسری صف میں اکیلا کھڑا ہوسکتا ہے لیکن یاد رہے کہ اگر وہ آخر تک اسی طرح اکیلا رہے گا تو اسے یہ نماز دوبارہ پڑھنی پڑے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((فلا صلوة لفرد خلف الصف))

اس شخص کی نماز نہیں ہوتی، جو صف کے پیچھے اکیلا نماز پڑھے۔

(سنن ابن ماجہ: ۱۰۰۳، وصححہ البوصیری وابن خزیمۃ: ۱۵۶۹، وابن حبان: ۴۰۱، ۴۰۲، موارد، ہدیۃ المسلمین ص ۸۸)

اگر کوئی شخص ایک امام وایک مقتدی والے مسئلے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اگلی صف سے کسی آدمی کو کھینچ لیتا ہے تو یہ بھی جائز ہے۔ [شہادت، جون ۲۰۰۰ء]

سوال ماہنامہ شہادت میں ایک سوال کے جواب میں آپ نے لکھا کہ صف میں پیچھے رہ جانے والے اکیلے آدمی کی نماز نہیں ہوتی لہٰذا اسے دوبارہ نماز پڑھ لینی چاہئے جبکہ اسی سوال کا جواب دیتے ہوئے مبشر احمد ربانی صاحب نے لکھا ہے کہ یہ اضطراری کیفیت ہے اس صورت میں اکیلے آدمی کی نماز ہو جائے گی اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ اگلی صف سے آدمی کو بھی نہ کھینچا جائے کیونکہ حدیث میں آتا ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جو صف کو ملاتا ہے اللہ اسے ملاتا ہے اور جو صف کو توڑتا ہے اللہ اسے توڑتا ہے۔“ اس حدیث کی وجہ سے صف سے آدمی کو نہ کھینچا جائے اکیلے نماز پڑھ لی جائے تو نماز ہو جائے گی، کیونکہ یہ اضطراری کیفیت ہے۔ آپ آگاہ فرمائیں کہ کیا کیا جائے؟ علماء کی دو قسم کی آراء ہیں طلباء اور عوام کس رائے پر عمل کریں۔ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب ارشاد فرمائیں۔

(خرم ارشاد محمدی، دولت نگر)

الجواب ① سیدنا وابصہ بن معبد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "أن رسول اللہ ﷺ رأی رجلاً یصلي خلف الصف وحده فأمره أن یعید" "بے شک رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو دیکھا (جو) صف کے پیچھے اکیلا نماز پڑھ رہا تھا تو آپ ﷺ نے اسے (نماز) لوٹانے کا حکم دیا۔ (سنن ابی داود: ٦٨٢، الترمذی: ٢٣٠ وقال: "حسن"، ابن ماجہ: ١٠٠٤، وصححہ ابن حبان الموارد: ٤٠٣ وللحدیث طرق عند ابن خزیمہ: ١٥٦٩، وابن حبان: ٤٠١)

اس روایت کی سند صحیح ہے۔ (نیل المقصود قلمی ج ١ ص ٢٣٤) شیخ البانی رحمہ اللہ نے بھی فرمایا: "صحیح" (سنن ابی داود بتحقیق الشیخ الالبانی ص ١١٠)

② علی بن شیبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((فإنه لا صلوٰة لرجل فرد خلف الصف)) بے شک صف کے پیچھے اکیلے آدمی کی نماز نہیں ہوتی۔ (مسند احمد ٤/٢٣ ح ١٦٤٠٦، ابن ماجہ: ١٠٠٣، وصححہ ابن خزیمہ: ١٥٦٩، وابن حبان: ٤٠١)

اس روایت کی سند صحیح ہے۔ (تسہیل الحاجہ ص ٦٨)

بوصیری نے کہا: "و إسناد حدیث علي بن شیبان صحیح، رجاله ثقات"

(زوائد ابن ماجہ ص ١٥٩)

③ حدیث وابصہ بن معبد رضی اللہ عنہ کے مطابق امام احمد اور امام اسحاق (بن راہویہ) فرماتے ہیں کہ صف کے پیچھے اکیلا آدمی (نماز پڑھنے والا) اپنی نماز دوبارہ پڑھے گا اور یہی قول حماد بن ابی سلیمان، (محمد) بن ابی لیلیٰ (الفقیہ) اور وکیع کا ہے۔ (سنن الترمذی: ٢٣٠)

④ امام ابن ابی شیبہ نے حفص (بن غیاث) سے عن عمرو بن مروان (ثقہ) عن ابراہیم (النخعی) کی سند سے نقل کیا ہے کہ "یعید" یعنی نماز دہرائے گا۔

(مصنف ابن ابی شیبہ ٢/١٩٣ ح ٥٨٨٨)

حفص بن غیاث مدلس ہیں لہٰذا یہ سند ضعیف ہے، مصنف ابن ابی شیبہ میں اس کے برعکس روایات بھی ہیں جو بلحاظ تدلیس وغیرہ ضعیف ہیں۔

⑤ ابن حزم کے نزدیک صف کے پیچھے اکیلے مقتدی کی نماز باطل ہے۔

(المحلی ٤/٥٢ مسئلہ ٥١٤)

⑥ وابصہ رضی اللہ عنہ والی حدیث کے بعد امام عبداللہ بن احمد بن حنبل فرماتے ہیں: "وكان أبي يقول بهذا الحديث" اور میرے ابا اس حدیث کے مطابق فتویٰ دیتے تھے۔

(مسند احمد ۴/ ۲۲۸ ح ۱۸۱۷۰)

⑦ ابراہیم النخعی کا قول یہ ہے کہ صف کے پیچھے اکیلا آدمی رکوع نہ کرے۔

(مصنف ابن ابی شیبہ ۱/ ۲۵۷ ح ۲۶۳۵ وسندہ صحیح)

یہی تحقیق ابن ابی شیبہ کی ہے۔ (ایضاً: ۲۶۳۶)

بلکہ امام ابوبکر بن ابی شیبہ نے اس مسئلے میں امام ابوحنیفہ کا رد لکھا ہے۔

(دیکھئے مصنف ابن ابی شیبہ ۱۴/ ۱۵۶ ح ۳۶۰۶۹، ۳۶۰۷۰)

ابوبکر محمد بن ابراہیم بن المنذر النیسابوری (متوفی ۳۱۸ھ) فرماتے ہیں:

"صلوٰة الفرد خلف الصف باطل لثبوت خبر وابصة" الخ

یعنی صف کے پیچھے اکیلے کی نماز، وابصہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کی رُو سے باطل ہے۔

(الاوسط فی السنن والاجماع والاختلاف ۴/ ۱۸۴ ت ۱۹۹۴)

⑧ مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اگر کوئی شخص مصلی بعد اتمام صف صلوٰۃ مسجد میں آیا اور صف میں اس نے کوئی جگہ نہیں پائی تو وہ اکیلا صف کے پیچھے نماز نہ پڑھے بلکہ کسی شخص کو اطراف صف سے کھینچ کر اپنے ساتھ ملالے۔" الخ

(فتاویٰ علمائے حدیث ج ۳ ص ۷۷)

اطراف صف کا مطلب یہ ہے کہ "صف کے کنارہ سے کسی کو کھینچ کر اپنے ساتھ شامل کرے۔" (فتاویٰ علمائے حدیث ۳/ ۷۸)

⑨ جمہور علماء کا خیال ہے کہ صف کے پیچھے اکیلے کی نماز، عذر کی صورت میں ہو جاتی ہے۔ (صلوٰۃ الجماعۃ، تالیف: صالح بن غانم السدلان ص ۱۱۲)

امام عطاء بن ابی رباح فرماتے ہیں کہ "لا يعيد" وہ اعادہ نہیں کرے گا۔

(مصنف عبدالرزاق ۲/ ۵۹ ح ۲۴۸۶)

تنبیہ: اس روایت کی سند عبدالرزاق (مدلس) کی تدلیس کی وجہ سے ضعیف ہے۔

اسماء الرجال اور حدیث کی تصحیح وتضعیف میں ہمیشہ جمہور محدثین کو ترجیح ہوتی ہے اِلا یہ کہ جرح مفسر ہو، جبکہ فقہی مسائل وغیرہا میں دلیلِ صریح کے مقابلے میں جمہور کا قول مرجوح ہوتا ہے۔ والحق أحق أن یتبع

صف کے پیچھے اکیلے نمازی کی نماز نہ ہونے والا قول راجح ہے اگرچہ اس کے قائلین جمہور کے مقابلے میں کم ہیں۔

⑩ صف سے پیچھے آدمی کھینچنے کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں آیا ہے کہ نبی ﷺ نماز پڑھ رہے تھے، جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ آئے اور آپ ﷺ کے بائیں طرف کھڑے ہو گئے۔ آپ ﷺ نے انھیں پکڑ کر دائیں طرف کھڑا کر دیا۔ پھر جبار بن صخر رضی اللہ عنہ آئے تو نبی ﷺ کے دائیں طرف کھڑے ہو گئے، آپ ﷺ نے جابر بن عبداللہ اور جبار بن صخر رضی اللہ عنہما دونوں کو دھکیل کر پیچھے کھڑا کر دیا۔

دیکھئے صحیح مسلم (۳۰۱۰، ترقیم دارالسلام: ۷۵۱۶، باب حدیث جابر الطّویل وقصۃ ابی الیسر)

اب چند اہم تنبیہات پیشِ خدمت ہیں:

۱۔ عورت اگر اکیلی بھی ہو تو اس کی نماز ہو جاتی ہے وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہے۔

۲۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ "وسطوا الإمام" امام کو درمیان رکھو۔

(سنن ابی داود: ۶۸۱)

یہ روایت بلحاظ سند ضعیف ہے، اس میں امۃ الواحد: مجہولہ ہے۔ (تقریب التہذیب: ۸۵۳۴)

یحییٰ بن بشیر بن خلاد: مستور ہے۔ (التقریب: ۷۵۱۵)

نیز دیکھئے انوار الصحیفۃ فی الاحادیث الضعیفۃ ص ۲۰ (ابوداود: ۶۸۱)

۳۔ صف کے پیچھے اکیلے نمازی کے بارے میں علماء کے تین اقوال ہیں:

۱: نماز نہیں ہوتی۔ ۲: نماز ہو جاتی ہے۔ ۳: عذر ہو مثلاً (اگلی صف بھری ہوئی ہو) تو نماز ہو جاتی ہے۔ ان اقوال میں پہلا قول ہی راجح ہے، جبکہ محترم مبشر احمد ربانی

صاحب کی تحقیق واجتہاد میں ثالث الذکر قول راجح ہے۔

۴۔ علماء کے درمیان اگر اجتہادی امور میں اختلاف ہو تو راجح لے کر مرجوح چھوڑ دیں اور علماء کا مکمل احترام کریں۔ [شہادت، ستمبر ۲۰۰۴]

صف میں اکیلے نماز پڑھنے کا حکم

سوال پہلی صف مکمل ہو تو آنے والا مقتدی دوسری صف میں اکیلا کھڑا ہو جائے یا پہلی صف میں سے آدمی کھینچ لے؟ (محمد شاہد میمن)

الجواب اکیلا کھڑا ہو جائے یا آدمی کھینچ لے، دونوں طرح جائز ہے۔ اکیلا کھڑا ہونے کی صورت میں نماز کو دوبارہ پڑھنا پڑھے گا۔! [شہادت، جولائی ۲۰۰۱ء]

طریقۂ نماز کا بیان

نمازِ حنفی ! یا رسول اللہ ﷺ والی محمدی نماز؟

سوال اگر لوگوں سے پوچھیں کہ آپ نے نماز کس طرح پڑھی ہے؟ تو یہ جواب دیتے ہیں: ہم نے حنفی طریقے سے نماز پڑھی ہے۔ کیا حنفی طریقے سے نماز پڑھنا جائز ہے؟ اگر حج کے بارے میں پوچھیں تو کہتے ہیں: ہم نے حنفی طریقے سے حج کیا ہے۔

کیا اسلام حنفی طریقے سے نازل ہوا ہے۔ (حاجی نذیر خان، دامان حضرو)

الجواب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِي أُصَلِّيْ))

نماز اُس طرح پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ (صحیح بخاری: ٦٣١)

معلوم ہوا کہ نماز اُس طریقے سے پڑھنی چاہئے جس طریقہ پر محمد رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھی تھی۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((يا أيها الناس! خذوا مناسككم.)) اے لوگو! حج کے طریقے (مجھ سے) لے لو۔ (سنن النسائی ٥/ ٢٧٠ ح ٣٠٦٤ وسندہ صحیح، واللفظ لہ، صحیح مسلم: ١٢٩٧)

معلوم ہوا کہ نماز بھی محمدی طریقے پر پڑھنی چاہئے اور حج بھی محمدی طریقے پر کرنا چاہئے۔ اسلام حنفی طریقے پر نازل نہیں ہوا بلکہ قرآن وحدیث کی صورت میں ہوا ہے۔ جب امام ابوحنیفہ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے تو اس وقت بھی دینِ اسلام مکمل حالت میں موجود تھا۔

[الحدیث: ٦١]

نماز کی نیت زبان سے؟

سوال ہمارے علاقے میں عام لوگ جب نماز کیلئے کھڑے ہوتے ہیں تو تکبیر سے پہلے، زبان سے نماز کی نیت کرتے ہیں۔ کیا یہ جائز ہے؟ (حاجی نذیر خان، دامان حضرو)

الجواب زبان کے ساتھ نماز کی نیت کرنا قرآن مجید، احادیثِ صحیحہ، اجماع، آثارِ

صحابہ اور آثارِ تابعین سے قطعاً ثابت نہیں ہے لہٰذا یہ عمل غلط ہے اور اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ دیکھئے میری کتاب ''ہدیۃ المسلمین'' حدیث نمبر ا

نماز کی ہر رکعت کے شروع میں تعوذ

سوال ہر رکعت میں تعوذ پڑھنا مسنون ہے یا صرف پہلی رکعت میں ہی اور باقی میں صرف بسم اللہ ہے اور اگر کوئی نہ پڑھے تو گناہ تو نہیں؟ نیز ہر تشہد میں درود اور دعائیں پڑھنا مسنون ہے یا صرف آخری تشہد میں ہی؟ وضاحت سے تحریر فرمائیں۔

(ظفر اقبال، شکر گڑھ)

الجواب آیت: ﴿ فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ﴾ [النحل: ۹۸] کی رو سے ہر رکعت کے شروع میں تعوذ یعنی اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ پڑھنا بہتر ہے۔ درود پہلے تشہد اور دوسرے دونوں میں پڑھا جاتا ہے۔

(دیکھئے سنن النسائی: ۱۱۷۱، صحیح مسلم: ۴۰۶/۶۶، دار السلام: ۱۲۳۹)

البتہ دعائیں دیگر دلائل کی بنا پر آخری تشہد میں پڑھنا ہی راجح ہیں۔ واللہ اعلم

نماز میں تعوذ کے الفاظ

سوال قراءت سے قبل (نماز میں یا غیر نماز میں) مسنون تعوذ کے الفاظ کون سے ہیں؟ کیا صرف ''أعوذ باللّٰه من الشيطان الرجيم'' اس موقع پر کافی و مسنون ہے؟

(ایک سائل)

الجواب قراءت سے قبل ایک مسنون تعوذ درج ذیل ہے: ''أعوذ باللّٰه السميع العليم من الشيطان الرجيم من همزه و نفخه و نفثه'' (سنن ابی داود: ۷۷۵ وسندہ صحیح)

درج ذیل تعوذ پڑھنا بھی صحیح ہے: ''أعوذ باللّٰه من الشيطان الرجيم''

دیکھئے صحیح بخاری (۶۱۱۵) صحیح مسلم (۲۶۱۰، ترقیم دار السلام: ۶۶۴۶) کتاب الام للامام الشافعی (۱/۱۰۷) اور مختصر صحیح نماز نبوی (ص ۱۱ فقرہ نمبر ۶ کا حاشیہ) [شہادت، اپریل ۲۰۰۴ء]

سکتات کا بیان

سوال کیا نماز میں سکتات کا ثبوت ہے؟ واضح فرمائیں۔

(عبداللہ الطاف، اسلام آباد)

الجواب سنت صحیحہ سے امام کے سکتات ثابت ہیں مثلاً:

الف: امام کا ایک ایک آیت پر وقف کرنا۔

(سنن ترمذی، ابواب القراءات باب فی فاتحہ الکتاب ح ۲۹۲۷ والحدیث صحیح)

ب: نماز میں قراءت کے بعد وقفہ کرنا۔

(سنن ترمذی، الصلوٰۃ باب ماجاء فی السکتتین فی الصلوٰۃ ح ۲۵۱، والحدیث صحیح)

لہٰذا امام کو چاہئے کہ وہ ان سکتات کا اہتمام کرے اگر کوئی شخص نا سمجھی یا اجتہادی خطا سے یہ سکتات نہیں کرتا تو پھر بھی مقتدی سورۂ فاتحہ ضرور پڑھے کیونکہ اس کے بغیر نماز ہی نہیں ہوتی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لا یقرأنّ أحدمنکم إذا جهرت بالقراءة إلا بأم القرآن)) جب میں قراءت بالجہر کروں تو تم میں سے کوئی بھی کچھ نہ پڑھے سوائے سورۂ فاتحہ کے۔ (سنن النسائی الافتتاح باب قراءۃ ام القرآن خلف الامام فیما جہر بہ الامام ۲/۱۴۱ ح ۹۲۱)

اس کی سند صحیح ہے۔

نافع بن محمود کی توثیق کے لئے دیکھئے میری کتاب ''الکواکب الدریہ'' (ص ۵۲۔۵۵)

سوال سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا یہ قول کس کتاب میں ہے کہ ''امام دو دفعہ سکتہ کرتا ہے، اس میں سورہ فاتحہ پڑھنے کو غنیمت جانو'' اور یہ صحیح ہے یا ضعیف؟

(وقار علی، ہبین الیکٹرونکس امین پارک لاہور)

الجواب یہ قول امام بخاری کی کتاب جزء القراءۃ میں موجود ہے۔ (مترجم مع عربی ص ۱۳۳ ح ۲۶۹ ب) اسکی سند حسن لذاتہ ہے یعنی یہ صحیح وقابل حجت ہے۔

نیز دیکھئے ماہنامہ شہادت اسلام آباد، مارچ ۲۰۰۰ء ج ۷ شمارہ: ۳ ص ۳۲۔۳۷

[الحدیث: ۱۴]

سوال کن صحابہ سے ثابت ہے کہ وہ قراءت کے بعد، رکوع کرنے سے پہلے، مقتدی کو فاتحہ پڑھنے کی مہلت دینے کیلئے سکتہ کرنے کے قائل وفاعل تھے؟

(وقار علی، مبین الیکٹرونکس امین پارک لاہور)

الجواب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ سکتے کرنا کتاب القراءت للبیہقی (ص ۱۰۳) میں باسند حسن لذاتہ ثابت ہے۔ حسن لذاتہ روایت حجت ہوتی ہے۔

تنبیہ: راقم الحروف نے راویوں پر جرح وتعدیل کے جو اقوال پیش کئے ہیں ان کا اصل مقصد یہ ہے کہ جمہور محدثین کا موقف بیان کر کے اسے ترجیح دی جائے۔ میرے نزدیک جرح وتعدیل میں تعارض کی صورت میں اگر تطبیق وتوثیق ممکن نہ ہو تو ہمیشہ جمہور محدثین کو ترجیح حاصل ہوتی ہے اور اسی پر میرا عمل ہے۔

دیکھئے میری کتاب نور العینین فی مسئلہ رفع الیدین (ص ۵۹/۶۰ وطبع قدیم ص ۴۱، ۴۲)

تاج الدین عبدالوھاب بن علی السبکی (متوفی ۷۷۱ھ) کہتے ہیں:

" والجرح مقدم إن كان عدد الجارح أكثر من المعدل إجماعًا، وكذا إن تساويا أو كان الجارح أقل ، وقال ابن شعبان :يطلب الترجيح "

اگر معدلین (توثیق کرنے والوں) کے مقابلے میں جارحین کی تعداد زیادہ ہو تو بالاجماع جرح مقدم ہو جاتی ہے، اور اگر برابر ہوں تو بھی جرح مقدم ہو جاتی ہے، یا اگر جارح کم ہوں تو (سبکی کے نزدیک جرح مقدم ہے) اور ابن شعبان نے کہا: ترجیح دیکھی جائے گی یعنی دوسرے دلائل سے ترجیح دیں گے۔ (قاعدہ فی الجرح والتعدیل ص ۵۰، ۵۱ واللفظ لہ، جمع الجوامع ۲/ ۱۷۲)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ اس پر اجماع ہے کہ جارحین (یعنی ماہر اہلِ فن ثقہ محدثین) کی اکثریت کی حالت میں جرح مقدم ہوتی ہے۔ رہا مسئلہ جرح میں برابری یا جارحین کی قلت کا تو اس صورت میں راقم الحروف کے نزدیک تحقیق درج ذیل ہے:

① جارحین ومعدلین دونوں برابر برابر ہوں، ایسی کوئی مثال میرے علم میں نہیں ہے۔

② جارحین کی قلت کی صورت میں معدلین کی تعدیل مقدم ہوگی۔

محمد ادریس کاندھلوی دیوبندی لکھتے ہیں: ''جب کسی راوی میں توثیق اور تضعیف جمع ہو جائیں تو محدثین کے نزدیک اکثر کے قول کا اعتبار ہے اور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ جب کسی راوی میں جرح وتعدیل جمع ہو جائیں تو جرح مبہم کے مقابلہ میں تعدیل کو ترجیح ہوگی اگرچہ جارحین کا عدد معدلین کے عدد سے زیادہ ہو اور احتیاط بھی قبول ہی کرنے میں ہے...''

(سیرت المصطفیٰ ج۱ص۷۹)

اس میں (دیوبندی) فقہاء کے مقابلے میں محدثین کا قول ہی راجح ہے۔

سرفراز خان صفدر دیوبندی لکھتے ہیں: ''بایں ہمہ ہم نے توثیق وتضعیف میں جمہور ائمہ جرح وتعدیل اور اکثر ائمہ حدیث کا ساتھ اور دامن نہیں چھوڑا'' (احسن الکلام ج۱ص۴۰)

تنبیہ: محدث اگر کسی روایت کی تصحیح یا تحسین کرے (یعنی صحیح یا حسن کہے) تو یہ اس محدث کے نزدیک اس روایت کے راویوں کی توثیق ہوتی ہے۔

حافظ ذہبی فرماتے ہیں: ''وصحح حديثه ابن المنذر وابن حزم وغيرهما فذلك توثيق له والله أعلم'' اس کی حدیث کو ابن المنذر اور ابن حزم نے صحیح کہا اور یہ اس (راوی) کی توثیق ہے۔ واللہ اعلم (میزان الاعتدال ۴/ ۵۵۸ ت ۱۰۴۷۸)

ابن القطان الفاسی نے کہا: ''وفي تصحيح الترمذي إياه توثيق لزينب وسعد بن إسحاق'' اور ترمذی کے اس حدیث کو صحیح کہنے میں زینب اور سعد بن اسحاق کی توثیق ہے۔

(بیان الوہم والایہام الواقعین فی کتاب الاحکام ۵/ ۳۹۵ ح ۲۵۶۲، نصب الرایہ ۳/ ۲۶۴)

یہی موقف صاحب الامام (نصب الرایہ ۱/ ۱۴۹) اور شیخ ناصر الدین الالبانی رحمہ اللہ کا ہے۔ (السلسلۃ الصحیحہ ۶/ ۶۶۰ ح ۲۷۸۳، ۷/ ۱۶، ح ۳۰۰۷) نیز دیکھئے الاقتراح لابن دقیق العید (ص ۳۲۵۔ ۳۲۸) اور توجیہ القاری للشیخ ثناء اللہ الزاہدی (ص ۶۳)

تنبیہ: ان جوابات میں بعض مقامات پر ضروری اصلاح اور اضافہ بھی کیا گیا ہے تاکہ قارئین کی خدمت میں زیادہ سے زیادہ معلومات پیش کر دی جائیں۔ والحمد للہ [الحدیث: ۱۴]

سوال سیدنا سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو

سکتے کرتے تھے۔ایک اس وقت جب نماز شروع کرتے اور ایک اس وقت جب آپ پوری قراءت سے فارغ ہوتے۔کیا یہ روایت صحیح ہے؟ (عبدالستار سومرو، کراچی)

الجواب یہ حدیث صحیح ہے۔(دیکھئے سنن ابی داود ج ۱ ص ۱۲۰ ح ۷۷۷ وھو حدیث صحیح، وحسنہ الترمذی: ۵۱ وقال النیموی التقلیدی فی آثار السنن: ۳۸۳ "واسنادہ صحیح" وعنعنۃ الحسن البصری عن سمرۃ لیست بعلۃ قادحۃ کما حققتہ فی نیل المقصود فی التعلیق علیٰ سنن ابی داود ج ۱ ص ۱۳۱ ح ۳۵۴، یسر اللہ لنا طبعہ)

راقم الحروف نے نیل المقصود میں یہ ثابت کیا ہے کہ سیدنا سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے حسن بصری رحمہ اللہ کی معنعن روایت بھی صحیح ہوتی ہے، اس لئے کہ یہ روایت کتاب سے ہے جو کہ بطور مناولہ ہے یا اجازہ یا بطورِ وجادہ۔

اصولِ حدیث میں، ان تینوں صورتوں میں روایت واستدلال صحیح ہے علی الراجح، بشرطیکہ اس کتاب کی نسبت مصنف تک باسند صحیح ثابت ہو اور نسخہ بھی صحیح وموثوق ہو۔

دیکھئے مقدمہ ابن الصلاح (ص ۲۰۰ تا ص ۲۰۲ مع شرح العراقی)

☆ حسن بصری رحمہ اللہ کے پاس سمرہ رضی اللہ عنہ کی کتاب کا موجود ہونا دلائلِ صحیحہ سے ثابت ہے۔

☆ (اس کتاب میں سے) حسن بصری رحمہ اللہ نے ایک حدیث (حدیث العقیقہ) سیدنا سمرہ رضی اللہ عنہ سے سنی تھی۔ [شہادت، مارچ ۲۰۰۰ء]

سورۂ فاتحہ امام کے سکتات میں پڑھنا

سوال رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: جو شخص امام کے ساتھ نماز پڑھ رہا ہو، اسے چاہئے کہ جب امام سکتہ کرے تو امام سے پہلے ہی سورۃ فاتحہ پڑھ لے۔کیا یہ روایت صحیح ہے؟ (عبدالستار سومرو، کراچی)

الجواب یہ روایت امام بیہقی نے اپنی کتاب القراءت (ص ۶۴، ۶۵) میں بیان کی ہے لیکن اس کی سند دو وجہ سے ضعیف ہے:

① محمد بن عبداللہ بن عبید بن عمیر اللیثی سخت ضعیف ہے۔

② ابن لہیعہ اختلاط کا شکار ہو گئے تھے، اس کی دوسری سندیں بھی ضعیف ہیں لہٰذا یہ روایت اپنے تمام شواہد کے ساتھ ضعیف ہی ہے۔ [شہادت، مارچ ۲۰۰۰ء]

سوال رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب امام پڑھے تو خاموش رہو۔

(صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۷۴ ح ۴۰۴/۶۳) (عبدالستار سومرو، کراچی)

الجواب اس حدیث کے راویوں میں سے ایک راوی شیخ الاسلام، محبوب المومنین، المحدث الفقیہ المجاہد، صحابیٔ رسول سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔

(صحیح مسلم: ۴۰۴ و سنن ابی داود: ۶۰۴ و سنن ابن ماجہ: ۸۴۶ و سنن نسائی: ۹۲۲، ۹۲۳ بتحقیقی وھو حدیث صحیح)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے عبدالرحمٰن بن یعقوب رحمہ اللہ نے پوچھا: میں امام کی قراءت سن رہا ہوں تو انھوں نے فرمایا: اسے (سورۂ فاتحہ کو) اپنے دل میں (یعنی سراً) پڑھ۔

دیکھئے مسند الحمیدی (بتحقیقی: ۹۸۰، ونسخۂ دیوبندیہ: ۹۷۴، ونسخۂ بتحقیق حسین سلیم اسد ج ۲ ص ۱۹۸ ح ۱۰۰۴) اور مسند ابی عوانہ (ج ۲ ص ۱۲۸، وسندہ صحیح نسخۂ جدیدہ ۱/۳۵۷ ح ۱۳۲۸)

معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سری اور جہری نمازوں میں فاتحہ خلف الامام کے قائل تھے۔ لہٰذا اُن کی بیان کردہ حدیث کے دو ہی مفہوم ہو سکتے ہیں:

① یہ ماعدا الفاتحہ پر محمول ہے، یعنی (جہری نماز میں) قراءت امام کی صورت میں فاتحہ پڑھی جائے گی اور اس کے علاوہ باقی قرآن نہیں پڑھا جائے گا۔ یہی تحقیق امیر المومنین فی الحدیث امام بخاری رحمہ اللہ کی ہے۔ دیکھئے جزء القراءت (ص ۶۳ ح ۲۶۴)

② یہ حدیث منسوخ ہے۔

آلِ تقلید کا یہ اصول بہت مشہور ہے کہ اگر راوی اپنی روایت کے خلاف عمل کرے یا فتویٰ دے تو اس کی روایت منسوخ ہوگی۔

مثلاً دیکھئے محمد منصور علی تقلیدی کی کتاب فتح المبین (ص ۶۳، ۶۴)

اصول محدثین کی رو سے شق اول راجح ہے جبکہ اہل الرائے کے اصول سے شق ثانی،

مختصر یہ کہ اصول محدثین و اصول اہل الرائے دونوں کی رو سے اس حدیث سے فاتحہ خلف الامام کے خلاف استدلال مردود ہے۔ [شہادت، فروری ۲۰۰۰ء]

سوال عبداللہ بن عثمان بن خثیم (رحمہ اللہ) نے سعید بن جبیر رحمہ اللہ تابعی سے پوچھا: کیا میں امام کے پیچھے قراءت کروں؟ سعید رحمہ اللہ نے فرمایا: ہاں اگرچہ تم اس کی قراءت سنو۔ بیشک ان لوگوں نے بدعت نکال لی ہے (کہ سکتہ نہیں کرتے) سلف یہ کام نہیں کرتے تھے۔ بیشک سلف (یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) میں سے جب کوئی لوگوں کی امامت کرتا تھا تو اللہ اکبر کہہ کر خاموش ہو جاتا۔ یہاں تک کہ جب اسے یقین ہو جاتا کہ اب ہر مقتدی نے سورۂ فاتحہ پڑھ لی ہوگی تو پھر وہ قراءت شروع کرتا تھا۔ پھر مقتدی خاموش ہو جایا کرتے تھے۔

(عبدالستار سومرو، کراچی)

الجواب اس کی سند حسن ہے۔ دیکھئے جزء القراءت للبخاری مع نصر الباری (۸۴،۸۳) اور مصنف عبدالرزاق (۱۳۴/۲) [شہادت، مارچ ۲۰۰۰ء]

سوال حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب امام خاموش ہو تو تم پڑھا کرو اور جب وہ پڑھے تو تم خاموش ہو جایا کرو۔ (عبدالستار سومرو، کراچی)

الجواب اس کی سند سخت ضعیف بلکہ موضوع ہے۔ دیکھئے کتاب القراءت للبیہقی (۷۹، ۸۰) اس کی سند میں اسحاق بن عبداللہ بن ابی فروہ کذاب و متروک ہے لہٰذا ایسی موضوع و من گھڑت روایتیں بیان کرنا جائز نہیں ہے۔ [شہادت، مارچ ۲۰۰۰ء]

سوال حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: امام کے دو سکتے ہوتے ہیں۔ ان دونوں میں سورۂ فاتحہ کی قراءت لوٹ لو۔ اس کی سند کیسی ہے؟ (عبدالستار سومرو، کراچی)

الجواب اس کی سند حسن ہے۔ جیسا کہ میں نے جزء القراءت للبخاری (۲۷۴) کی تحقیق میں واضح کر دیا ہے۔ والحمد للہ [شہادت، مارچ ۲۰۰۰ء]

سوال امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ہم کہتے ہیں کہ (مقتدی) امام کے سکتوں میں پڑھے۔ (جزء القراءۃ: ۳۲)

امام کو چاہئے کہ دو سکتے کرے: ایک تکبیر تحریمہ کے بعد اور دوسرا قراءت ختم ہونے کے بعد۔

بہت ہی کم لوگ ان احادیث پر عمل پیرا نظر آتے ہیں، پہلے مقتدی ہر حالت میں سورۂ فاتحہ پڑھے لیکن جس رکعت میں امام بلند آواز سے قراءت کرے، اس میں مقتدی سورۂ فاتحہ امام کے سکتات میں پڑھے۔ ایسی حالت میں مقتدی کوئی دوسری سورت بالکل نہ پڑھے۔ البتہ جس رکعت میں امام بلند آواز سے قراءت نہ کرے اس میں مقتدی سورۂ فاتحہ کے علاوہ اگر کوئی دوسری سورت پڑھنا چاہے تو پڑھ سکتا ہے۔ (عبدالستار سومرو، کراچی)

الجواب یہ ضروری ہے کہ جس امام یا کتاب کا حوالہ دیں تو اُن کا قول علیحدہ باحوالہ لکھیں اور اپنی بات علیحدہ لکھیں، سب کچھ گڈمڈ کر دینا غلط ہے۔ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے چاہے وہ سکتے کرے یا نہ، اگر سکتے کرے تو ان میں پڑھیں اور اگر نہ کرے تو بھی پڑھنا ضروری ہے۔ [شہادت، مارچ ۲۰۰۰ء]

سوال کیا درج ذیل باتیں ثابت ہیں کہ

(۱) رسول اللہ ﷺ دو سکتے کیا کرتے تھے۔ (۲) رسول اللہ ﷺ سکتہ میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کا حکم دیا کرتے تھے۔ (۳) صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سکتوں میں سورۂ فاتحہ پڑھا کرتے تھے۔ (۴) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب امامت کرتے تو قراءت شروع کرنے سے پہلے مقتدیوں کو سورۂ فاتحہ پڑھنے کے لئے کافی وقت دیا کرتے تھے۔ (عبدالستار سومرو، کراچی)

الجواب ان دو سکتات کے علاوہ، ہر آیت کریمہ پر ٹھہرنا بھی ثابت ہے۔ ایک حسن روایت میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ سورۂ فاتحہ کی ہر آیت پر ٹھہرتے تھے۔

"كان رسول الله ﷺ يقطع قرأته يقرأ ﴿ الحمد لله رب العالمين ﴾ ثم يقف ﴿ الرحمٰن الرحيم ﴾ ثم يقف" إلخ (سنن ترمذی: ۲۹۲۷ وقال: "غریب" وصححہ ابن خزیمہ والحاکم علیٰ شرط الشیخین ۲/ ۲۳۲، ووافقہ الذہبی!)

مسند احمد (۶/ ۲۸۸ ح ۲۶۴۷۰) میں اس روایت کا ایک شاہد ہے جس کی سند صحیح ہے۔

نماز میں فاتحہ خلف الامام کے چار طریقے ہیں:

① امام سے پہلے یعنی سکتہ اولیٰ میں پڑھ لے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''إذا قرأ الإمام بأم القرآن فاقرأبها واسبقه''
جب امام سورۂ فاتحہ پڑھے تو تم بھی پڑھو اور اس سے آگے نکل جاؤ۔ (جزء القراءت للبخاری
ص ۲۳ ح ۲۷۳ وسندہ حسن، نصر الباری: ۲۵۹، آثار السنن للنیموی ص ۲۲۳ ح ۳۵۸ وقال: اسنادہ حسن)
اسے نیموی تقلیدی نے بھی حسن کہا ہے۔

② سکتہ ثانیہ (بعد از قراءت علی الراجح، یا بعد از فاتحہ پڑھے۔)

③ سکتاتِ قراءت میں پڑھے۔

④ امام اگر سکتہ یا سکتات نہ کرے تو اس کے ساتھ ہی پڑھ لیں۔ دیکھئے میری کتاب
''الکواکب الدریہ فی وجوب الفاتحہ خلف الامام فی الصلوٰۃ الجہریہ''

یہ چاروں طریقے صحیح ہیں مگر ثانی الذکر اور ثالث الذکر (۲، ۳) سب سے راجح ہیں۔
رشید احمد گنگوہی دیوبندی صاحب فرماتے ہیں:
''اگر سکتات میں پڑھا جاوے تو مضائقہ نہیں'' (سبیل الرشاد و تالیفات رشیدیہ ص ۵۱۱)
نیز فرماتے ہیں: ''پس جب اس کو اس قدر خصوصیت بالصلوٰۃ ہے تو اگر سکتات میں اس کو پڑھ لو تو رخصت ہے اور یہ قدر قلیل آیات محل ثنا میں ختم بھی ہو سکتی ہیں اور خلط قرآن امام کی نوبت نہیں آتی۔'' (ایضاً)

[شہادت، مارچ ۲۰۰۰ء]

سوال مسعود احمد صاحب لکھتے ہیں: ''اس کے برعکس تقریباً تمام مساجد میں سکتات برائے نام ہی ہوتے ہیں الا ماشاء اللہ'' اس کی کیا حقیقت ہے؟

(عبدالستار سومرو، کراچی)

الجواب ہم ثابت شدہ سکتات کے قائل و فاعل ہیں اور مساجد میں ان کے اہتمام کے لئے حتی الوسع کوشاں بھی ہیں۔ واضح رہے کہ اس کتاب کا مصنف مسعود احمد بی ایس سی خارجی تکفیری تھا۔ راقم الحروف کا اسلام آباد میں اس کے بیٹے کے گھر میں ایک مذاکرہ بھی ہوا تھا۔ جس میں بحمد اللہ مسعود صاحب لاجواب ہوئے اور بات کرنے سے انکار کر دیا، جس

کے نتیجے میں حضرو میں ان کا سیل (Cell) مکمل طور پر ٹوٹ گیا۔ مسعود احمد صاحب کے مبایعین نے بیعت توڑ دی اور جماعت اہلِ حدیث میں شامل ہو گئے۔ والحمد للہ

مسعود صاحب کے رد میں میرے دینی بھائی محترم ڈاکٹر ابو جابر عبداللہ دامانوی کی کتاب ''الفرقۃ الجدیدۃ'' اور وقار علی شاہ کی ''جماعت التکفیر'' (دونوں حصے) مطالعہ کریں۔ [شہادت، مارچ ۲۰۰۰ء]

سوال اگر ان سکتات پر عمل نہ کیا جائے تو کیا نماز ہو جائے گی؟

(عبدالستار سومرو، کراچی)

الجواب نماز تو ہو جائے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ، لیکن بہتر یہی ہے کہ یہ سکتات کئے جائیں۔ [شہادت، مارچ ۲۰۰۰ء]

نماز میں ہاتھ کہاں باندھے جائیں؟

سوال درج ذیل احادیث کے بارے میں تفصیل سے بتائیں کہ ان کی اسنادی حیثیت کیا ہے؟

① عن وائل بن حجر قال: رأيت النبي ﷺ يضع يمينه على شماله تحت السرة . (مصنف ابن ابی شیبہ ۱/۳۹۰)

② عن علي قال: سنة الصلاة وضع الأيدي تحت السرة.

(ابن ابی شیبہ ۱/۳۹۱، مسند احمد ۱/۱۱۰ ح ۸۷۵)

③ عن أنس قال: ثلاث من أخلاق النبوة تعجيل الافطار وتاخير السحور ووضع اليد اليمنى على اليسرى فى الصلاة تحت السرة

(الجوہر النقی ۲/۳۲ بحوالہ ابن حزم [المحلی ۴/۱۱۳])

④ عن أبي هريرة قال: وضع الكف على الكف في الصلاة تحت السرة .

(الجوہر النقی ۲/۳۲ بحوالہ ابن حزم)

⑤ عن إبراهيم النخعي قال: يضع يمينه على شماله في الصلاة تحت السرة .

(ابن ابی شیبہ ۱/۳۹۰)

⑥ عن أبي مجلز: يضع باطن كف يمينه على ظاهر كف شماله و يجعلهما أسفل من السرة . (ابن ابی شیبہ ۱/ ۳۹۱)

⑦ ابن حزم نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے تعلیقاً اور مسند الامام زید میں سند کے ساتھ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تین چیزیں انبیاء کے اخلاق میں سے ہیں: ایک نماز میں دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر ناف کے نیچے رکھنا۔

محترم! ان روایات کا حوالہ، تخریج اور فصل لربك وانحر کی تفسیر اور سینے پر ہاتھ باندھنے کی احادیث کن کن کتبِ حدیث میں وارد ہیں اور ان کی اسانید کس طرح ہیں؟

(عبدالقادر)

الجواب آپ کی مطلوبہ روایاتِ مذکورہ کی تخریج و تحقیق درج ذیل ہے:

① وائل بن حجر والی روایت مصنف ابن ابی شیبہ (ج ۱ ص ۳۹۰ طبع العزیزیہ حیدر آباد، الہند، ۱۳۸۶ھ بمطابق ۱۹۶۶ء) میں ''تحت السرة'' کے اضافے کے بغیر موجود ہے۔

اسی طرح میرے استاد محترم الشیخ ابوالقاسم محب اللہ شاہ الراشدی السندھی رحمہ اللہ کے کتب خانے میں مصنف ابن ابی شیبہ کا جو قلمی نسخہ موجود ہے اس میں بھی ''تحت السرة'' کے الفاظ نہیں ہیں۔

انور شاہ کاشمیری دیوبندی نے کہا کہ میں نے مصنف (ابن ابی شیبہ) کے تین نسخے دیکھے ہیں، ان میں سے کسی ایک میں بھی ''تحت السرة'' کے الفاظ نہیں ہیں۔

(فیض الباری ج ۲ ص ۲۶۷)

مصنف ابن ابی شیبہ کا جو نسخہ بیروت سے چھپا ہے۔

اس میں بھی ''تحت السرة'' کے الفاظ نہیں ہیں۔ (ج ۱ ص ۳۴۲ حدیث: ۳۹۳۸)

مصنف ابن ابی شیبہ والی روایت امام وکیع سے ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے یہی روایت امام وکیع سے ''تحت السرة'' کے بغیر نقل کی ہے۔

(مسند احمد ج ۴ ص ۳۱۶ حدیث: ۱۹۰۵۱)

کراچی سے ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کے دیوبندی ناشرین نے حال ہی میں ابن ابی شیبہ کا نسخہ شائع کیا ہے اس میں بغیر کسی حوالے کے ''تحت السرۃ'' کے الفاظ کا اضافہ کر دیا ہے۔سوال یہ ہے کہ دیوبندیوں کو رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ بولنے کی جرأت کیوں ہوئی؟ تو اس کے دو سبب ہیں:

(۱) دیوبندیوں سے پہلے ایک حنفی مولوی قاسم بن قطلوبغا (پیدائش ۸۰۲ وفات ۸۷۹ھ) نے یہ روایت مصنف ابن ابی شیبہ سے ''تحت السرۃ'' کے اضافے کے ساتھ نقل کی ہے اور اس کے بارے میں برہان الدین ابوالحسن ابراہیم بن عمر البقاعی (متوفی ۸۸۵ھ) مصنف ''نظم الدرر فی تناسب الآیات والسور'' جو آٹھ جلدوں میں چھپی ہے، نے فرمایا: ''قاسم بن قطلوبغا...... کان کذابًا'' قاسم بن قطلوبغا... کذاب (یعنی جھوٹا) تھا۔

(الضوء اللامع للسخاوی ج۶ص۱۸۶)

(۲) دیوبندی حضرات کو جھوٹ بولنے کی عادت ہے!

دیوبندی مکتبِ فکر کے بانی محمد قاسم نانوتوی (متوفی ۱۲۹۷ھ) نے کہا:

''میں سخت نادم ہوا اور مجھ سے بجز اس کے کچھ بن نہ پڑا کہ میں جھوٹ بولوں لہٰذا میں نے جھوٹ بولا (اور صریح جھوٹ میں نے اسی روز بولا تھا)......'' الخ

(ارواح ثلاثہ ص ۳۹۰ حکایت نمبر ۳۹۱ و معارف الاکابر ص ۲۶۰)

دیوبندی مکتب فکر کے دوسرے بانی اور رکن رشید احمد گنگوہی (متوفی ۱۳۲۳ھ) نے کہا کہ ''جھوٹا ہوں....'' الخ (مکاتیب رشیدیہ ص ۱۰ و فضائل صدقات ص ۵۵۸ مطبوعہ کتب خانہ فیضی لاہور)

④ عن علي.... (مسند احمد ج۱ ص۱۱۰، ابوداود: ۷۵۶ و ابن ابی شیبہ ج۱ ص۳۹۱)

اس روایت کی سند ضعیف ہے، اس کا راوی عبدالرحمٰن بن اسحاق الکوفی الواسطی جمہور محدثین کے نزدیک ضعیف ہے، بلکہ انور شاہ کاشمیری نے کہا:

''ان الواسطي ضعيف متفق علٰى ضعفه'' بے شک واسطی ضعیف ہے، اس کے ضعیف ہونے پر اتفاق ہے۔ (العرف الشذی ج۱ ص۶۷ سطر نمبر ۲۸)

③ یہ روایت المحلی میں بلاسند ہے لیکن الخلافیات للبیہقی (قلمی ص ۳۷) میں یہ روایت "أخبرنا أبو الحسين بن الفضل ببغداد: أنبأ أبو عمرو بن السماك: ثنا محمد ابن عبيدالله بن المنادي: ثنا أبو حذيفة: ثنا سعيد بن زربي عن ثابت عن أنس قال: من أخلاق النبوة تعجيل الإفطار وتأخير السحور ووضع يمينك على شمالك في الصلاة تحت السرة" کی سند و متن سے موجود ہے۔ بیہقی نے سعید بن زربی کو اس مقام پر "وليس بالقوي" کہا ہے جب کہ تقریب التہذیب میں "منکر الحدیث" لکھا ہوا ہے لہٰذا یہ روایت ضعیف ہے۔

④ یہ روایت سنداً صحیح ہے لیکن ابومجلز تابعی کا قول ہے۔ ظاہر ہے کہ تابعی کا قول سنت صحیحہ کے مقابلے میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ عین ممکن ہے کہ ابومجلز تک اس مسئلے میں سنتِ صحیحہ نہ پہنچی ہو اور انھوں نے یہ فتویٰ اپنے اجتہاد سے دیا ہو۔

⑤ مسند زید بن علی کا بنیادی راوی ابو خالد (عمرو بن خالد) الواسطی ہے۔ (مسند زید ص ۵۰، ۵۱) یہ مشہور کذاب راوی تھا۔ دیکھئے میزان الاعتدال (۳/ ۲۵۷) وغیرہ

کتاب مذکور (مسند زید) میں آپ کا حوالہ ص ۲۰۴ پر ہے۔ یہ ساری کتاب ہی موضوع ہے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت محلّٰی (ج ۴ ص ۱۱۳ مسئلہ ۴۴۸) میں "تحت السرة" کے الفاظ کے بغیر اور بلاسند مذکور ہے لہٰذا یہ استدلال بھی باطل ہے۔

فصل لربك وانحر کی تشریح میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "وضع يده اليمنى على وسط ساعده على صدره" یعنی انھوں نے اپنا دایاں ہاتھ، اپنی کلائی کے درمیان، اپنے سینے پر رکھا۔ (التاریخ الکبیر للبخاری ج ۶ ص ۴۳۷ والسنن الکبریٰ للبیہقی ج ۲ ص ۳۰)

اس کے راوی (عاصم الجحدری) کے والد العجاج کے حالات نہیں ملے لہٰذا یہ سند ضعیف ہے۔ بعض راویوں نے العجاج کو سند سے گرا دیا ہے۔ ایک شخص عبداللہ بن رذبۃ العجاج ہے، جسے ابن حبان نے کتاب الثقات (ج ۵ ص ۲۸۷) میں ذکر کیا ہے۔

اس کے حالات تاریخِ دمشق میں بھی ہیں۔ تاہم اس کے استادوں میں عقبہ بن ظبیان

اور شاگردوں میں عاصم الجحدری کا نام نہیں ملا۔ واللہ اعلم غالباً یہ دوسرا شخص ہے۔

بہر حال یہ سند ضعیف ہے۔ التمہید لابن عبدالبر (ج ۲۰ ص ۷۸) میں اس روایت میں بحوالہ الاثرم، آخر میں "علی صدرہ" کے بجائے "تحت السرة" کا اضافہ ہے اور سند سے عاصم الجحدری کے بعد "عن أبيه" کا واسطہ گر گیا ہے۔ التمہید (ج ۹ ص ۲۱۷) سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ ابن عبدالبر، الاثرم سے الخضر بن داود کی سند سے روایتیں بیان کرتے ہیں۔ الخضر بن داود کے حالات نامعلوم ہیں اور باقی سند میں بھی نظر ہے لہذا یہ سند بھی ضعیف ہے۔

یہ مختصر تحقیق جلدی میں لکھ دی ہے۔ اس مسئلے میں مفصل تحقیق لکھنے کا میرے پاس فی الحال وقت نہیں ہے۔ مسند احمد (ج ۵ ص ۲۲۶ ح ۲۲۳۱۳) میں قبیصہ بن ہلب والی قوی روایت سینے پر ہاتھ باندھنے کی زبردست دلیل ہے۔

صحیح بخاری (ح ۷۴۰) کی ذراع والی حدیث کا عموم بھی اس کا مؤید ہے۔

علی ظهر كفه اليسرى والرسغ والی حدیث بھی اس کی دلیل ہے۔

(دیکھئے ابوداود: ۷۲۷ وسندہ صحیح)

نیز اس موضوع پر میری کتاب "نماز میں ہاتھ باندھنے کا حکم اور مقام" کا مطالعہ بھی مفید ہوگا۔ (ان شاء اللہ) [شہادت، جولائی ۲۰۰۲]

بسم اللہ بالجہر کا مسئلہ

سوال نماز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بالجہر پڑھنے کی کیا دلیل ہے؟ (ایک سائل)

الجواب سری نمازوں میں تو بسم اللہ آہستہ پڑھنے پر اتفاق ہے، جبکہ جہری نماز میں سراً (آہستہ) بھی صحیح اور جائز ہے جیسا کہ صحیح مسلم (ح ۳۹۹) وغیرہ سے ثابت ہے اور جہراً بھی جائز ہے لیکن سراً پڑھنا افضل ہے۔ عبدالرحمٰن بن ابزی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"صليت خلف عمر فجهر بسم الله الرحمٰن الرحيم."

میں نے عمر (رضی اللہ عنہ) کے پیچھے نماز پڑھی، آپ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جہراً (اونچی آواز سے) پڑھی۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱ ص ۴۱۲، شرح معانی الآثار ج ۱ ص ۱۳۷، دوسرا نسخہ ج ۱ ص ۲۰۰، السنن

الکبریٰ للبیہقی ج ۲ص ۴۸)

اس کی سند بالکل صحیح ہے۔ دیکھئے راقم الحروف کی کتاب ہدیۃ المسلمین (حدیث:۱۳)

امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں جہر کے ساتھ بسم اللہ پڑھی۔ کسی صحابی سے ان کے عمل کا رد منقول نہیں ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ بسم اللہ بالجہر کے جواز پر صحابہ کرام کا عہدِ فاروقی میں اجماع ہے۔ احادیثِ صحیحہ اور عمومِ قرآن سے ثابت ہے کہ اجماع شرعی حجت ہے اور امت مسلمہ گمراہی پر اکٹھی نہیں ہوسکتی۔ دیکھئے امام شافعی رحمہ اللہ کی کتاب "الرسالہ" اور دیگر کتبِ محدثین۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھائی تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر، پھر سورۂ فاتحہ پڑھی، پھر آمین کہی اور آخر میں فرمایا: " **والذي نفسي بيده ! إني لأ شبهكم صلاة برسول الله** ﷺ ." اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ میری نماز تم سب سے زیادہ نبی ﷺ کی نماز سے مشابہ ہے۔ (سنن النسائی: ۹۰۶، صحیح ابن خزیمہ ج ۱ص ۲۵۱ ح ۴۹۹، و ابن حبان، الاحسان ج ۳ص ۱۴۳ ح ۱۷۹۴ و الحاکم ۱؍۲۳۲ و الذہبی)

اس کی سند بالکل صحیح ہے۔ خالد کا سعید بن ابی ہلال سے سماع قبل از اختلاط ہے کیونکہ صحیح بخاری و صحیح مسلم میں خالد عن ابن ابی ہلال والی روایات موجود ہیں۔

دیکھئے راقم الحروف کا رسالہ 'القول المتین فی الجہر بالتأمین' (ص ۲۵)

زیلعی حنفی کا اپنے مسلک کی حمایت میں اسے شاذ کہنا صحیح نہیں ہے۔

اس صحیح اور مرفوع حدیث سے بسم اللہ بالجہر کا جواز ثابت ہوتا ہے جیسا کہ امام ابن خزیمہ اور امام ابن حبان وغیرہما محدثین نے استدلال کیا ہے۔

بقولِ امام ترمذی: اس حدیث کے راوی سیدنا ابو ہریرہ اور سیدنا ابن عمر، سیدنا ابن عباس، سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہم، تابعین کرام رحمہم اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ (ان احادیث و دیگر دلائل کی وجہ سے) بسم اللہ بالجہر کے قائل تھے۔

(دیکھئے سنن ترمذی الصلوٰۃ، باب من رأی الجہر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ح ۲۴۵)

جو شخص بسم اللہ بالجہر پر اعتراض کرے گا اس کا اعتراض بلا واسطہ امام شافعی رحمہ اللہ پر وارد ہوگا۔ عقائد، اعمال وغیرہ کے بارے میں اہلِ حدیث پر جو بھی اعتراض کیا جاتا ہے اس کا ہدف احادیث صحیحہ، آثارِ صحابہ، آثارِ تابعین اور ائمۂ اسلام ضرور بنتے ہیں۔

یہاں بطور فائدہ عرض ہے کہ متعدد علماء حق نے بسم اللہ بالجہر پر کتابیں اور رسالے لکھے ہیں، مثلاً شیخ الاسلام امام علی بن عمر الدارقطنی رحمہ اللہ وغیرہ۔

تنبیہ: زیلعی نے شیخ الاسلام امام دارقطنی رحمہ اللہ سے نقل کیا کہ بعض مالکیوں کے قسم دینے پر انھوں نے کہا کہ بسم اللہ بالجہر کے بارے میں کوئی مرفوع حدیث صحیح نہیں ہے۔

(نصب الرایہ ج ۱ ص ۳۵۸، ۳۵۹، التحقیق مع التنقیح ج ۱ ص ۳۱۲)

لیکن یہ قصہ مردود ہے۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ سے ثابت ہی نہیں ہے کیونکہ اسے روایت کرنے والے مجہول ہیں۔ ''وقد حكى لنا مشائخنا '' (اور ہمیں ہمارے مشائخ نے بتایا ہے) اور نہ ان مجہول مشائخ کی امام دارقطنی سے ملاقات ثابت ہے۔ اس قسم کی ضعیف و مردود حکایات کے ''زور'' پر زیلعی صاحب بسم اللہ بالجہر کی مخالفت فرما رہے ہیں۔

إنا لله و إنا إليه راجعون .

محمد تقی عثمانی دیوبندی فرماتے ہیں: ''حنفیہ میں سے اس موضوع پر سب سے مفصل کلام حافظ جمال الدین زیلعیؒ نے کیا ہے، انہوں نے ''نصب الرایہ'' میں اس مسئلہ پر تقریباً ساٹھ صفحات لکھے ہیں اور اپنی عام عادت کے خلاف بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس تمام تر نزاع کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ تسمیہ کے جہر و اخفاء کے مسئلہ میں اختلاف جواز اور عدم جواز کا نہیں ہے، بلکہ محض افضل و مفضول کا اختلاف ہے'' (درس ترمذی ج ۱ ص ۴۹۹)

مذکورہ بالا ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ بسم اللہ جہراً و سراً دونوں طرح پڑھنا صحیح اور جائز ہے۔ [شہادت، ستمبر ۲۰۰۰ء]

مسئلہ سورۂ فاتحہ خلف الامام

سوال رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق سورۂ فاتحہ کے بغیر کوئی نماز نہیں ہوتی۔ کیا امام کی اقتداء میں سورۂ فاتحہ ہر رکعت میں پڑھنی چاہیے یا تیسری اور چوتھی رکعت میں پڑھنی چاہیے، جبکہ امام صاحب سورۂ فاتحہ خاموشی سے پڑھتے ہیں۔ قرآن و سنت کی روشنی میں ذرا تفصیل کے ساتھ جواب دیں تاکہ کوئی ابہام باقی نہ رہے۔

(ایک سائل)

الجواب سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی چاہے امام ہو یا منفرد و مقتدی۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لا صلوٰة لمن لم یقرأ بفاتحة الكتاب))
اس شخص کی نماز نہیں ہوتی جو سورۂ فاتحہ نہ پڑھے۔ (صحیح بخاری:۷۵۶، وصحیح مسلم:۳۹۴)

اس حدیث کے راوی عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فاتحہ خلف الامام کے قائل و فاعل تھے۔
دیکھئے کتاب القراءت للبیہقی (ص۵۹ ح۱۳۳، واسنادہ صحیح)

شارحینِ حدیث نے بھی اس حدیث سے وجوب (یعنی فرضیت) فاتحہ خلف الامام پر استدلال کیا ہے مثلاً اعلام الحدیث فی شرح صحیح بخاری للخطابی (۵۰۰/۱)
علامہ محمود العینی الحنفی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

"استدل بهذا الحديث عبدالله بن المبارك و الأوزاعي و مالك، الشافعي و أحمد و إسحاق و أبو ثور و داود على وجوب قراءة الفاتحة خلف الإمام في جميع الصلوات "عبداللہ بن مبارک، اوزاعی، مالک (ایک قول میں) شافعی واحمد، اسحاق، ابوثور اور داود (ظاہری) نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ تمام نمازوں میں فاتحہ خلف الامام واجب (فرض) ہے۔ (عمدۃ القاری ج۶ ص۱۰)

اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کے لئے امام عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ کی کتاب تحقیق الکلام کا مطالعہ کریں۔ نیز راقم الحروف کی مختصر کتاب "الکواکب الدریہ فی وجوب الفاتحہ خلف الامام فی الجہریہ" بھی اس مسئلے پر چھپ چکی ہے۔

سوال کی مناسبت سے فاتحہ خلف الامام کے چند خاص اور مختصر دلائل پیشِ خدمت ہیں

① حدیث انس رضی اللہ عنہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مقتدیوں کو فرمایا:

اور تم میں سے ہر شخص سورۂ فاتحہ اپنے دل میں پڑھے۔ (جزء القراءت للبخاری: ۲۵۵ وسندہ صحیح)

② حدیث رجل من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم (اس کا مفہوم بھی وہی ہے جو حدیث سابق کا ہے۔) جزء القراءۃ للبخاری (ح ۶۱) ومسند احمد (۲۳۶/۴، ۶۰/۵، ۸۱، ۴۱۰)

اسے بیہقی وغیرہ نے صحیح کہا ہے۔ (معرفۃ السنن والآثار ۵۴/۲ ح ۹۲۱، والکواکب الدریہ ص ۴۸)

③ حدیث نافع بن محمود عن عبادہ

اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہری نماز میں قراءت کرنے والے مقتدیوں کو فرمایا:

جب میں جہر کے ساتھ قراءت کر رہا ہوں تو تم میں سے کوئی شخص بھی سورۂ فاتحہ کے علاوہ اور کچھ نہ پڑھے۔ (سنن نسائی ج ۲ ص ۱۴۱ ح ۹۲۱)

بیہقی کی روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں کہ جو شخص سورۂ فاتحہ نہیں پڑھتا اس کی نماز نہیں ہوتی۔

(کتاب القراءت للبیہقی ص ۶۴، وقال: ھذا اسناد صحیح ورواتہ ثقات)

اسے دار قطنی نے حسن اور الضیاء المقدسی (۳۴۶/۸، ۳۴۷ ح ۴۲۱) نے صحیح قرار دیا ہے۔

اس کے راوی نافع بن محمود جمہور محدثین کے نزدیک ثقہ ہیں۔

دیکھئے الکواکب (ص ۵۳، ۵۴) انھیں خواہ مخواہ مجہول کہہ کر اس صحیح حدیث کو رد کرنا، بعد از اتمام حجت، انتہائی ناپسندیدہ حرکت ہے۔

④ حدیث عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ

(جزء القراءت للبخاری ص ۱۷، ۱۸، رقم: ۶۳ ونصر الباری ص ۱۱۲)

ان کی سند جمہور علماء کے نزدیک حجت ہے۔

(مجموع الفتاویٰ ابن تیمیہ ج ۱۸ ص ۸، الترغیب والترہیب ج ۴ ص ۵۷۶)

⑤ حدیث مکحول عن محمود بن الربیع عن عبادہ کتاب القراءت للبیہقی (ص ۴۸، وفی نسخۃ ۶۴)

⑥ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ جہری و سری نماز میں فاتحہ خلف الامام کا حکم دیتے تھے۔

(المستدرک للحاکم ج ۱ ص ۲۳۹ وصححہ الذہبی، السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۲ ص ۱۶۷)

اسے دارقطنی نے (۱/۳۱۷ ح ۱۱۹۷، ۱۱۹۸) بھی صحیح کہا ہے۔

⑦ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جہری (وسری) نماز میں فاتحہ خلف الامام کا حکم دیتے تھے۔

(مسند الحمیدی: ۹۸۰، وصحیح ابی عوانہ ج ۲ ص ۳۸، دوسرا نسخہ ج ۱ ص ۳۵۷، واصلہ فی صحیح مسلم)

⑧ سیدنا ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ فاتحہ خلف الامام کا حکم دیتے تھے۔

(جزء القراءۃ للبخاری ص ۳۰، ۳۱، ح ۵۷، نصر الباری ص ۱۶۲، ۱۶۳، ح 105)

اس کی سند حسن ہے۔ (آثار السنن ص ۱۷۲، تحت حدیث: ۳۵۸، للنیموی التقلیدی)

⑨ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فاتحہ خلف الامام کا حکم دیتے تھے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ۱/۳۷۴)

امام بیہقی نے کہا: هذا إسناد صحيح ،لاغبار عليه (کتاب القراءت ص ۱۹۸)

⑩ عبادہ رضی اللہ عنہ کا ذکر سابقہ صفحات میں گزر چکا ہے۔

بعض لوگ فاتحہ خلف الامام کے خلاف بعض ایسے دلائل پیش کرتے ہیں جن میں فاتحہ کا ذکر نہیں اور نہ وہ اس مسئلے میں نص صریح ہیں بلکہ خود ان کا بھی ان دلائل پر عمل نہیں ہے۔

مثلاً اشرفعلی تھانوی دیوبندی صاحب سے پوچھا گیا کہ

''بسا اوقات اسی جگہ جمعہ پڑھنے کا اتفاق ہوتا (ہے از ناقل) جہاں جمعہ کی اکثر شرائط (جو حنفیہ کے ہاں ضروری ہیں) مفقود ہوتیں'' تو انھوں نے جواب دیا:

''ایسے موقعہ پر فاتحہ خلف الامام پڑھ لینا چاہئے تاکہ امام شافعیؒ کے مذہب کی بناء پر نماز ہو جائے'' (تجلیات رحمانی ۲۳۳، از قاری سعید الرحمٰن دیوبندی)

یہاں پر انھوں نے حنفی مذہب چھوڑ کر تلفیق بین المذاہب کا ارتکاب کیا اور پھر: ﴿وإذا قرئ القرآن﴾ إلخ ((و إذا قرأ فانصتوا)) کو بھول کر جہری نماز میں فاتحہ کے قائل ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

حالانکہ حق یہی ہے کہ اس آیت کریمہ وحدیث پاک ودیگر دلائل کا تعلق فاتحہ خلف الامام سے نہیں ہے بلکہ ممانعت کلام یا ماعدا الفاتحہ وغیرہما پر محمول ہے۔ [شہادت، جولائی ۱۹۹۹ء]

سوال فاتحہ خلف الامام کی سب سے قوی دلیل کون سی ہے؟

(ناصر رشید، راولپنڈی)

الجواب دلائل دو قسم کے ہوتے ہیں: عام اور خاص۔ عام دلائل کے لحاظ سے فاتحہ خلف الامام کی سب سے قوی دلیل وہ حدیث ہے جسے امام بخاری (ح ۷۵۶) وغیرہ نے سیدنا عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لا صلوٰة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب))

اس شخص کی نماز نہیں ہوتی جو سورۂ فاتحہ نہ پڑھے۔ (صحیح بخاری: ۷۵۶)

اس حدیث کے حکم میں، امام، مقتدی اور منفرد تینوں شامل ہیں جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ وغیرہ کی تحقیق ہے۔ اس حدیث کے راوی سیدنا عبادہ رضی اللہ عنہ بھی فاتحہ خلف الامام کے قائل وفاعل تھے۔ (دیکھئے کتاب القراءت للبیہقی ص ۶۹ ح ۱۳۳)

سرفراز خان صفدر دیوبندی صاحب لکھتے ہیں: ''یہ بالکل صحیح بات ہے کہ حضرت عبادہؓ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کے قائل تھے اور ان کی یہی تحقیق اور یہی مسلک و مذہب تھا''

(احسن الکلام ج ۲ ص ۱۴۲، طبع دوم)

یاد رہے کہ سیدنا عبادہ رضی اللہ عنہ کی یہ تحقیق و عمل نہ تو قرآن کریم کے مخالف ہے اور نہ صحیح احادیث کے مخالف ہے بلکہ جمہور صحابہ کرام بھی ان کے موافق و موید تھے۔

(دیکھئے میری کتاب الکواکب الدریہ فی وجوب الفاتحہ خلف الامام فی الجہریہ)

خاص دلائل کے لحاظ سے بہت سی احادیث صحیح و حسن ہیں۔ ان میں سے جزء القراءت للبخاری (ص ۶۱ ح ۲۵۵) وصحیح ابن حبان وغیرہ کی عبیداللہ بن عمرو الرقی عن ایوب السختیانی عن ابی قلابہ التابعی عن انس رضی اللہ عنہ والی روایت ازحد قوی ہے بلکہ بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔

اس حدیث کے بارے میں امام بیہقی فرماتے ہیں: ''احتج به البخاري'' اس حدیث کے ساتھ (امام) بخاری رحمہ اللہ نے حجت پکڑی ہے۔ (کتاب القراءت للبیہقی ص ۷۲)

نیز دیکھئے الکواکب الدریہ (ص ۱۹ تا ۲۵، دوسرا نسخہ ص ۴۰، ۴۷) [شہادت، مئی ۲۰۰۰ء]

سوال آپ نے ''شہادت'' نومبر ۱۹۹۹ء کے شمارہ میں ''سورۃ الفاتحہ خلف الامام'' کے بارے میں بہت سی احادیث تحریر فرما کر یہ ثابت کیا کہ مقتدی کو باجماعت نماز میں امام کے پیچھے بھی سورۂ فاتحہ پڑھنی چاہیے۔ لیکن کیا یہ تمام احادیث قرآن کی آیت سے تو نہیں ٹکرا رہی ہیں؟ کہ ''اور جب قرآن پڑھا جائے تو توجہ سے اور خاموشی سے سنو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔'' مسئلہ یہ دریافت کرنا ہے کہ ادھر قرآن پاک میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں: قرآن سنو اور ادھر آپ احادیث سے یہ ثابت کر رہے ہیں کہ قرآن کو خود بھی پڑھو۔ براہِ مہربانی ذرا واضح طور پر جواب تحریر فرمائیں کہ آیا مقتدی کو امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنی چاہیے؟ کیا یہ احادیث سے ثابت ہے اور حدیث قرآن کی اس آیت کا مقابلہ تو نہیں کر سکتی کیونکہ حدیث تو ظن ہے جبکہ قرآن من جانب اللہ ہے۔ (طارق محمود، آصف شاہ اور طاہر، کراچی)

الجواب احادیثِ صحیحہ کو ظنی کہنا غلط ہے بلکہ صحیح حدیث بھی قطعی الثبوت اور حتمی ہوتی ہے۔ جیسا کہ محدثین کرام کی تحقیق ہے۔ دیکھئے اختصار علوم الحدیث لابن کثیر (ص ۳۴)

صحیح حدیث قرآن کی طرح حجت ہے۔ جب دونوں شرعی دلیلیں ہیں اور حجت ہیں تو دلیل کے ساتھ دلیل کی تشریح و تخصیص کرنا جائز ہے۔ حدیث حدیث کی، قرآن قرآن کی اور قرآن و حدیث ایک دوسرے کی تشریح و تخصیص کرتے ہیں۔ ائمۂ اربعہ کے نزدیک حدیث کے ساتھ قرآن کی تخصیص کرنا جائز ہے۔ دیکھئے الاحکام للآمدی (ج ۲ ص ۳۴۷)

قرآن پاک کی آیت کریمہ: ﴿ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا ﴾ میں فاتحہ کی ممانعت کی صراحت نہیں ہے جبکہ فاتحہ خلف الامام والی احادیث میں فاتحہ کی صراحت ہے لہٰذا دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ حدیث قرآن کی تخصیص کر رہی ہے۔ دوسرے یہ کہ ﴿ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ﴾ سے بعض علماء نے یہ مسئلہ استنباط کیا ہے کہ مقتدی پر قراءت فرض ہے۔

دیکھئے نور الانوار (ص ۱۹۳) اور خلاصۃ الافکار شرح مختصر المنار (ص ۱۹۷)

بلکہ حنفیہ کا ایک نرالا اصول ہے کہ یہ دونوں آیتیں (وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ اور فَاقْرَءُوْا)

آپس میں ٹکرا کر ساقط ہوگئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اصول ہر لحاظ سے باطل ہے۔

فاقرءُوا سے قراءت خلف الامام کے استدلال پر اس حدیث سے بھی تائید ہوتی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اقرءُوا ..)) تم پڑھو۔

(موطأ امام مالک ج ۱ ص ۸۵ کتاب الصلوٰۃ، القراءۃ خلف الامام فیما لا یجہر بالقراءۃ)

یاد رہے کہ یہ فَاقْرَءُوْا والا حکم جہری وسری دونوں نمازوں کو شامل ہے۔ کیونکہ اس حدیث کے راوی سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جہری نمازوں میں بھی فاتحہ خلف الامام کا فتویٰ دیتے تھے۔ دیکھئے مسند ابی عوانہ (ج ۲ ص ۳۸) مسند حمیدی بتحقیقی (۹۸۰) جزء القراءت للبخاری (۵۶، ۱۳۵) آثار السنن (ص ۱۰۶، دوسرا نسخہ ص ۶۹)

یہاں پر چند باتیں مدنظر رکھیں:

① وإذا قرئ القرآن والی آیت بالاتفاق مکی ہے جبکہ فاتحہ خلف الامام والی روایات مدنی ہیں۔

② و إذا قرئ القرآن اصل میں مشرکین کے رد میں نازل ہوئی ہے۔
دیکھئے تفسیر قرطبی (ج ۱ ص ۱۲۱)

③ غیر اہلِ حدیث حضرات امام کے پیچھے تکبیر تحریمہ اللّٰہ اکبر، سبحانك اللّٰهم پڑھتے ہیں۔ صبح کی دو سنتیں، عین جماعت کے وقت پڑھ رہے ہوتے ہیں، اس وقت اس آیت کا حکم کہاں چلا جاتا ہے؟

④ رسول اللہ ﷺ پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی اور آپ فاتحہ خلف الامام کا حکم دیتے تھے، کیا اس آیت کا مفہوم آپ ﷺ کو معلوم نہیں تھا؟

⑤ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابہ فاتحہ خلف الامام کا حکم دیتے تھے کیا وہ اس آیت کے مفہوم سے واقف نہ تھے۔ مزید تفصیل کے لئے مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری کی کتاب ''تحقیق الکلام'' اور راقم الحروف کی کتاب ''الکواکب الدریہ فی وجوب الفاتحہ خلف الامام فی الجہریہ'' کا مطالعہ کریں۔

[شہادت، نومبر ۲۰۰۰ء]

حدیث: ((من كان له إمام فقرأة الإمام له قرأة)) کی تحقیق

سوال درج ذیل روایت کے بارے میں مفصل و مدلل جامع اور زوردار اور جاندار تحقیق کے لیے آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔ میرے بے شمار عزیز دوست اور بزرگ اپنے مخصوص نظریہ اور طرز عمل کی وجہ سے میرے ساتھ الجھتے، لڑتے بھڑتے، تندوتیز اور معاندانہ رویہ اور سلوک روا رکھتے ہیں [مَنْ كَانَ لَهُ إِمَام فَقِرَاْةُ الْإِمَامِ لَهُ قِرَاْة]

امام محمد کی روایت پیش کرتے ہیں: أخبرنا أبو حنيفة قال: حدثنا أبو الحسن موسى ابن أبي عائشة عن عبدالله بن شداد بن الهاد عن جابر بن عبدالله عن النبي ﷺ قال: من صلى خلف الإمام.... حديث من كان له إمَامٌ.... (موطا امام محمد)

براہ کرم اس روایت کے بارے میں مکمل تحقیق سے بہرہ ور فرمائیں بہت ہی شکر گزار ہوں گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو! آمین

براہِ کرم اس کا جواب رسالہ ''الحدیث'' میں شائع کر کے شکریہ کا موقع دیں۔

(عبداللطیف کھوکھر، راولپنڈی کینٹ)

الجواب حدیث: من كان له إمام فقرأة الإمام له قرأة ، کے مفہوم والفاظ کے ساتھ مختلف سندوں سے مروی ہے۔ یہ سندیں دو طرح کی ہیں:

اول: وہ اسانید جن میں کذاب، متروک، سخت مجروح اور مجہول راوی ہیں۔ مثلاً:

① حديث جابر الجعفي عن أبي الزبير عن جابر بن عبدالله رضي الله عنه .....إلخ (سنن ابن ماجہ: ۸۵۰)

جابر الجعفی: متروک ہے، دیکھئے کتاب الکنیٰ والاسماء للامام مسلم (ق ۹۶ کنیتہ: ابومحمد) و کتاب الضعفاء والمتروکین للامام النسائی (۹۸) وقال الزيلعي: " وكذبه أيضا أيوب و زائدة " اور اسے ایوب (السختیانی) اور زائدہ نے کذاب کہا ہے۔ (نصب الرایہ ۳۴۵/۱)

② حديث أبي هارون العبدي عن أبي سعيد الخدري رضي الله عنه

إلخ.... رواه ابن عدي في الكامل (۱/۵۲۴ ترجمۃ اسماعیل بن عمرو بن نجیح)

ابوہارون متروک ہے۔ دیکھئے کتاب الضعفاء والمتروکین للنسائی (۷۴۶)

ابوہارون کے بارے میں زیلعی حنفی نے حماد بن زید کا قول نقل کیا ہے کہ "كان كذابًا" یعنی وہ کذاب (بڑا جھوٹا) تھا۔ دیکھئے نصب الرایہ (ج ۴ ص ۲۰۱)

③ حديث سهل بن عباس الترمذي بسنده إلخ رواه الدارقطني (۱/۴۰۲ ح ۱۴۸۶) وقال: "هذا حديث منكر، وسهل بن العباس: متروك"

اصول حدیث میں یہ مقرر ہے کہ متروک وغیرہ سخت مجروح راویوں کی روایت مردود ہوتی ہے۔ مثلاً حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں: "لأن الضعف يتفاوت فمنه مالا يزول بالمتابعات يعني لا يؤثر كونه تابعًا أو متبوعًا كرواية الكذابين والمتروكين

کیونکہ ضعف کی قسمیں ہوتی ہیں، بعض ضعف متابعات سے بھی زائل نہیں ہوتے جیسے کذابین ومتروکین کی روایت، یہ نہ مؤید ہوسکتی ہے اور نہ تائید میں فائدہ دیتی ہے۔"

(اختصار علوم الحدیث ص ۳۸ تعریفات اخری للحسن، النوع: ۲)

اس تمہید کے بعد اس روایت (من كان له إمام ألخ) کی ان سندوں پر جامع بحث پیشِ خدمت ہے جن پر مخالفین قراءتِ فاتحہ خلف الامام کو ناز ہے۔ والله هو الموفق

۱: محمد بن الحسن الشيباني: أخبرنا أبو حنيفة قال: حدثنا أبو الحسن موسى ابن أبي عائشة عن عبدالله بن شداد بن الهاد عن جابر بن عبدالله " إلخ

(مؤطا الشیبانی ص ۹۸ ح ۱۱۷)

اس روایت میں عبداللہ بن شداد اور جابر رضی اللہ عنہ کے درمیان "ابوالولید" کا واسطہ ہے۔ دیکھئے کتاب الآثار المنسوب إلی قاضی أبي یوسف (۱۱۳) وسنن الدارقطنی (۱/۳۲۵ ح ۱۲۲۳، وقال: ابوالولید ھذا مجھول) وکتاب القراءۃ للبیہقی (ص ۱۲۵ ح ۳۱۴، وص ۱۲۶، ۱۲۷ دوسرا نسخہ ح ۳۳۹، ۳۴۱)

معلوم ہوا کہ یہ روایت ابوالولید (مجہول) کی وجہ سے سخت ضعیف ہے۔ اس مجہول

راوی کو بعض راویوں نے سند میں ذکر نہیں کیا تاہم یہ معلوم ہے کہ جس نے ذکر کیا، اس کی بات ذکر نہ کرنے والے کی روایت پر مقدم ہوتی ہے۔

اس روایت میں دوسری علت یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ بذاتِ خود اپنی اس بیان کردہ روایت کو باطل سمجھتے تھے۔ ابوعبدالرحمٰن المقرئ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" كان أبو حنيفة يحدثنا ، فإذا فرغ من الحديث قال: هذا الذي سمعتم كله ريح و باطل "ابوحنیفہ ہمیں حدیثیں سناتے تھے۔ جب حدیث (کی روایت) سے فارغ ہوتے تو فرماتے: یہ سب کچھ، جو تم نے سنا ہے ہوا اور باطل ہے۔

(کتاب الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم ج ۸ ص ۴۵۰ وسندہ صحیح)

ایک دوسری روایت میں امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں: ((عامة ما أحدثكم خطأ))

"میں تمھیں جو عام حدیثیں بیان کرتا ہوں، وہ غلط ہوتی ہیں"

(العلل الکبیر للترمذی ج ۲ ص ۹۶۶ وسندہ صحیح، والکامل لابن عدی ۲۴۷۳/۷ وتاریخ بغداد ۴۲۵/۱۳)

ایک دوسری روایت میں امام ابوحنیفہ نے اپنی کتابوں کے بارے میں فرمایا:

" والله ما أدري لعله الباطل الذي لا شك فيه "

اللہ کی قسم! مجھے (ان کے حق ہونے کا) پتا نہیں، ہوسکتا ہے کہ یہ ایسی باطل ہوں جن کے (باطل ہونے میں) کوئی شک نہیں ہے۔"

(کتاب المعرفۃ والتاریخ للامام یعقوب بن سفیان الفارسی ج ۲ ص ۷۸۲ وسندہ حسن)

اور یہ بات عام لوگ بھی بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ اپنی بیان کردہ حدیثوں اور کتابوں کے بارے میں بعد والوں کی بہ نسبت زیادہ جانتے تھے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ابوالولید (مجہول) کی وجہ سے امام صاحب نے اپنی روایت کو باطل قرار دیا ہو۔

والله أعلم وعلمه أتم

۲: أحمد بن حنبل: " حدثنا أسود بن عامر : أخبرنا حسن بن صالح عن أبي الزبير عن جابر " إلخ (مسند احمد، الموسوعۃ الحدیثیہ ۲۳/۱۲ ح ۱۴۶۴۳)

یہ روایت دو وجہ سے ضعیف ہے:

اول: ابوالزبیر المکی مدلس ہیں بلکہ ''مشہور بالتدلیس'' ہیں۔ (طبقات المدلسین، المرتبۃ الثالثۃ ۳/ ۱۰۱)
یہ روایت عن سے ہے۔ اصول حدیث میں یہ مقرر ہے کہ مدلس کی (غیر صحیحین میں) عن والی روایت ضعیف ہوتی ہے۔ (دیکھئے مقدمۃ ابن الصلاح مع التقیید والایضاح ص ۹۹ والنسخۃ المحققۃ ص ۱۶۱)

دوم: حسن بن صالح اور ابوالزبیر کے درمیان جابر الجعفی (متروک) کا واسطہ ہے۔
دیکھئے مسند احمد (ج ۳ ص ۳۳۹ ح ۱۴۶۹۸) والتحقیق فی اختلاف الحدیث لابن الجوزی (۱/ ۳۲۰ ح ۵۲۷)

تنبیہ: یہ بات انتہائی حیران کن ہے کہ ابن الترکمانی حنفی نے ابوالزبیر کی تدلیس کو بالائے طاق رکھتے ہوئے، اس ضعیف ومردود روایت کو " وهذا سند صحيح "لکھ دیا ہے۔
دیکھئے الجوہر النقی (۲/ ۱۵۹) بحوالہ ابن ابی شیبہ (۱/ ۳۷۷ ح ۳۸۰۲)
شیخ ناصر الدین الالبانی رحمہ اللہ نے دلائل کے ساتھ ابن الترکمانی کا زبردست رد کیا ہے۔
دیکھئے ارواء الغلیل (ج ۲ ص ۲۷۰ ح ۵۰۰)

۳: أحمد بن منيع:" ثنا إسحاق الأزرق :ثنا سفيان و شريك عن موسى ابن أبي عائشة عن عبدالله بن شداد عن جابر رضي الله عنه " إلخ
(اتحاف الخیرۃ المہرۃ للبوصیری ۲/ ۲۲۵ ح ۱۵۶۷)

یہ روایت دو وجہ سے ضعیف ہے:

اول: سفیان ثوری مدلس ہیں (عمدۃ القاری للعینی ۳/ ۱۱۲ باب الوضوء من غیر حدث، والجوہر النقی ۸/ ۲۶۲) نیز دیکھئے الحدیث: ا ص ۲۸، ۲۹، اور یہ روایت عن سے ہے۔ شریک القاضی بھی مدلس ہیں (طبقات المدلسین ۲/ ۵۶، وجامع التحصیل للعلائی ص ۱۰۷ والمدلسین لابی زرعۃ بن العراقی: ۲۸ والمدلسین للسیوطی: ۲۴ والمدلسین للحلبی ص ۳۳) اور یہ روایت عن سے ہے۔

دوم: سابقہ صفحے پر یہ گزر چکا ہے کہ عبداللہ بن شداد اور جابر رضی اللہ عنہ کے درمیان ابوالولید

(مجہول) کا واسطہ ہے۔

نتیجۃ البحث: یہ روایت اپنی تمام سندوں کے ساتھ ضعیف ہے لہٰذا شیخ البانی رحمہ اللہ کا اسے "حسن" [ارواء الغلیل ۲/۲۶۸] اور الموسوعۃ الحدیثیہ کے محشی کا "حسن بطرقه و شواهده" کہنا صحیح نہیں ہے۔ اس حدیث کو حافظ ابن حجر نے معلول (التلخیص الحبیر ۲/۲۳۲ ح ۳۴۵) اور قرطبی نے ضعیف قرار دیا ہے۔

(تفسیر قرطبی ۱/۱۲۲، الباب الثانی فی نزولها واحکامها، ای سورۃ الفاتحۃ)

فائدہ: ہمارے شیخ، امام ابو محمد بدیع الدین الراشدی رحمہ اللہ نے اس حدیث کی تضعیف پر " اظهار البرأة عن حديث : من كان له إمام فقراءة الإمام له قراءة " مستقل کتاب لکھی ہے۔ والحمد للہ (۶/محرم ۱۴۲۶ھ) [الحدیث: ۱۱]

﴿ وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا ﴾ کا مفہوم

سوال اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو غور سے سنو اور خاموش رہو۔ (الاعراف: ۲۰۴) اس سے کیا مراد ہے؟ (عبدالستار سومرو، کراچی)

الجواب جب قرآن مجید پڑھا جاتا تھا تو کفار شور مچاتے تھے اور کہتے تھے:

﴿لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ﴾

(۱) یہ قرآن نہ سنو (۲) اور شور مچاؤ (۳) تاکہ تم غالب آجاؤ۔ (حم السجدہ: ۲۶)

یہ آیت کریمہ بالاتفاق مکی ہے اور ان کافروں اور مشرکوں کے جواب میں نازل ہوئی ہے جو تلاوت و تبلیغِ قرآن کے وقت شور مچاتے تھے۔

دیکھئے تفسیر قرطبی (ج ۱ ص ۱۲۱) البحر المحیط لابی حیان الاندلسی (ج ۴ ص ۴۴۸) التفسیر الکبیر للرازی (ج ۱۵ ص ۱۰۴) فوائد القرآن لعبد الجبار بن احمد بحوالہ قرطبی (ج ۷ ص ۳۵۴) عبدالماجد دریا آبادی دیوبندی کی تفسیر ماجدی (ج ۲ ص ۲۶۳)

اشرفعلی تھانوی دیوبندی نے کہا: "میرے نزدیک: اِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا جب قرآن مجید پڑھا جائے تو کان لگا کر سنو تبلیغ پر محمول ہے اس جگہ قراءت فی الصلوٰۃ مراد نہیں۔

سیاق سے یہی معلوم ہوتا ہے تو اب ایک مجمع میں بہت آدمی مل کر قرآن پڑھیں تو کوئی حرج نہیں۔" (الکلام الحسن جلد دوم ص۲۱۲ مطبوعہ المکتبۃ الاشرفیہ، جامعہ اشرفیہ لاہور)

بعض لوگ اس آیت کریمہ کے عموم سے استدلال کرتے ہوئے فاتحہ خلف الامام سے منع کرتے ہیں حالانکہ اصول میں یہ مسئلہ مقرر ہے کہ خاص دلیل کے مقابلے میں عام دلیل پیش نہیں کی جاسکتی۔ مزید تفصیل کے لئے (امام بخاری کی کتاب جزء القراءۃ مع تحقیق: نصر الباری اور) جماعتِ اہلِ حدیث کے نامور عالم اور محقق مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ کی معرکتہ الآراء کتاب "تحقیق الکلام فی وجوب قراءۃ الفاتحہ خلف الامام" نیز میری کتاب "الکواکب الدریہ فی وجوب الفاتحہ خلف الامام فی الجہریہ" کا مطالعہ کریں۔

[شہادت، فروری ۲۰۰۰ء]

نماز میں آمین بالجہر

سوال نماز میں آمین بالجہر کی دلیل پیش کریں؟ (ایک سائل)

الجواب اس پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے کہ سری نمازوں میں آمین آہستہ (سراً) کہنی چاہیے۔ جہری نمازوں کی جہری رکعتوں میں تمام صحابہ کرام اور جمہور تابعین عظام کا مسلک یہ ہے کہ آمین بالجہر کہی جائے۔ یہی تحقیق امام شافعی رحمہ اللہ، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور امام اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ کی ہے کہ جہری نمازوں میں آمین بالجہر کہنی چاہیے۔ دیکھئے سنن ترمذی (الصلوٰۃ، باب ما جاء فی التأمین ح۲۴۸)

صحیح مسلم کے مؤلف، امام مسلم رحمہ اللہ نے اعلان فرمایا:

"قد تواترت الروايات كلها أن النبي ﷺ جهر بآمين"

اور تمام روایات کے تواتر سے ثابت ہے کہ نبی ﷺ نے آمین بالجہر کہی ہے۔

(الاول من کتاب التمییز للامام ابی الحسین مسلم بن الحجاج القشیری ص۴۰ ح۳۸)

ان متواتر روایات میں سے چند درج ذیل ہیں:

① سیدنا وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ " أنه صلّى خلف رسول الله ﷺ

فجھر بآمین "انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی، پس آپ ﷺ نے آمین بالجہر کہی۔ (سنن ابی داود الصلوٰۃ باب التأمین وراء الامام ح ۹۳۳ صحیح)

اسے سفیان ثوری رحمہ اللہ نے سلمہ بن کہیل سے "ورفع بھا صوتہ" کے الفاظ سے روایت کیا ہے، اس کی سند حسن ہے اور متعدد شواہد کی وجہ سے صحیح ہے۔ اس کے مقابلے میں شعبہ والی روایت میں سخت اضطراب ہے، اس لئے امام بخاری رحمہ اللہ، امام ابوزرعہ رحمہ اللہ اور جمہور محدثین نے اسے خطاء اور ضعیف قرار دیا ہے۔

خود امام شعبہ سے آمین بالجہر بھی مروی ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب "مسئلہ آمین بالجہر (ص ۲۳ تا ۳۱، دوسرا نسخہ ص ۳۵، ۳۶)

② سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "کان رسول اللہ ﷺ إذا فرغ من قراءۃ أم القرآن، رفع صوتہ و قال: آمین" رسول اللہ ﷺ جب سورۂ فاتحہ کی قراءت سے فارغ ہوتے تو بلند آواز سے آمین کہتے۔ (صحیح ابن خزیمہ ج ۱ ص ۲۸۷ ح ۵۷۱، صحیح ابن حبان، الاحسان ج ۳ ص ۱۴۸ ح ۱۸۰۶، المستدرک للحاکم ج ۱ ص ۲۲۳ وصححہ ووافقہ الذہبی، الدارقطنی ۱/۳۳۰ وقال: ھذا اسناد حسن، البیہقی وقال: حسن صحیح بحوالہ التلخیص الحبیر ۲۳۶، اعلام الموقعین لابن القیم ۲/۳۹۷ وصححہ)

اس کی سند امام زہری تک حسن لذاتہ ہے لیکن یہ سند امام زہری کے عن سے روایت کرنے کی وجہ سے ضعیف ہے کیونکہ زہری مدلس تھے۔

③ سیدنا عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ اور ان کے مقتدی آمین بالجہر کہتے تھے۔ دیکھئے صحیح بخاری مع فتح الباری (ج ۲ ص ۲۰۸ قبل حدیث: ۷۸۰) اور مصنف عبدالرزاق (۲۶۴۰)

④ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جب امام کے پیچھے ہوتے تو سورۂ فاتحہ پڑھتے اور لوگوں کی آمین کے ساتھ (مل کر) آمین کہتے اور اسے سنت سمجھتے تھے۔

(صحیح ابن خزیمہ ج ۱ ص ۲۸۷ ح ۵۷۲)

اس کی سند حسن لذاتہ ہے۔

⑤ عکرمہ تابعی رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ ہماری مسجدوں میں لوگ آمین کہتے تھے حتیٰ کہ

لوگوں کے آمین کہنے سے مسجدیں گونج اٹھتی تھیں۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۲ ص ۴۲۵)
اس کی سند صحیح ہے۔

⑥ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ یہودی لوگ، امام کے پیچھے آمین کہنے پر (مسلمانوں سے شدید) حسد کرتے تھے۔
مسند احمد (ج ۶ ص ۱۳۴) واصلہ عند ابن ماجہ (ج ۱ ص ۲۷۸ ح ۸۵۶ وسندہ صحیح)
یہ روایت اپنے شواہد کے ساتھ صحیح ہے۔

⑦ سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہودی حضرات، مسلمانوں سے جن کاموں پر حسد کرتے ہیں، ان میں سے قابلِ ذکر تین ہیں: سلام کا جواب دینا، صفوں کا قائم کرنا اور فرض نمازوں میں امام کے پیچھے آمین کہنا۔ (الاوسط للطبرانی ج ۵ ص ۳۶۴، ۳۶۵ ح ۴۹۰۸)

⑧ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے بھی حدیث سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا جیسی حدیث مروی ہے۔
دیکھئے تاریخ بغداد (۱۱/۴۳) اور المختارہ للضیاء المقدسی (۱/۴۵)

⑨ حدیث سیدنا علی رضی اللہ عنہ (ابن ماجہ ج ۱ ص ۲۷۸ ح ۸۵۴/ الخلافیات مخطوط صفحہ ۵۲)

⑩ امام عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۲ ص ۴۲۶)

خلاصہ یہ کہ آمین بالجہر متواتر ہے جبکہ آمین بالسر کی خبر واحد متعدد وجوہ سے ضعیف ہے:
الف: اس میں اضطراب ہے۔ بعض نے شعبہ سے آمین بالجہر نقل کیا ہے۔
ب: شعبہ کو وہم ہوا ہے۔ ج: یہ روایت ثقہ راویوں کے خلاف ہے۔
د: کسی صحابی سے جہری نمازوں میں خفیہ آمین کہنا ثابت نہیں ہے۔

[شہادت، ستمبر ۲۰۰۰ء]

جہری نمازوں میں آمین بالجہر

سوال جب ہم دیوبندی علماء سے آمین کے بارے میں سوال کرتے ہیں تو یہ جواب ملتا ہے کہ اس وقت کے لوگ بھاگ جاتے تھے، اس لئے حکم ہوا کہ آمین کہو تا کہ معلوم ہو کون کون نماز ادا کر رہا ہے۔ کیا یہ صحیح کہتے ہیں؟ (حاجی نذیر خان، دامان حضرو)

الجواب آمین کی مخالفت کرنے والے ان لوگوں کی مذکورہ بات بالکل جھوٹ ہے کیونکہ آمین بالجہر رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔

سیدنا وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی۔ ''فجهر بآمين'' الخ پس آپ نے آمین بالجہر کہی۔ (سنن ابی داود: ۹۳۳ وسندہ حسن)

سیدنا ابن الزبیر رضی اللہ عنہ اور اُن کے مقتدی اس طرح آمین کہتے تھے کہ مسجد میں آمین کی آواز بلند ہوتی تھی۔ دیکھئے صحیح بخاری (قبل ح ۷۸۰)

یاد رہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین آمین کہہ کر بھاگنے والے نہیں تھے۔

تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب ''القول المتین فی الجہر بالتأمین'' [الحدیث: ۶۱]

زاد الیقین فی تحقیق بعض روایات التأمین

سوال کیا امام اور مقتدیوں کا جہری نمازوں میں بلند آواز سے آمین کہنا ثابت ہے؟ دلیل سے جواب دیں۔ (ایک سائل)

الجواب آمین بالجہر کی چند صحیح و حسن روایات درج ذیل ہیں:

۱: قال الإمام أبو داود رحمه الله:

''حدثنا محمد بن كثير: أخبرنا سفيان عن سلمة عن حجر أبي العنبس الحضرمي عن وائل بن حجر قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا قرأ ولا الضالّين قال: آمين ورفع بها صوته''

رسول اللہ ﷺ ولا الضالین کی قراءت کے بعد آمین کہتے اور اپنی آواز اس کے ساتھ بلند فرماتے تھے۔ (سنن ابی داود ج۱ ص ۱۴۱، ۱۴۲ ح ۹۳۲ باب التامین وراء الامام)

یہ روایت مسند الدارمی (ج۱ ص ۲۸۴ ح: ۱۲۵۰) میں بھی اسی سند سے موجود ہے، وہاں ''ویرفع بها صوته'' کے الفاظ ہیں اور ترجمہ انھی الفاظ کے مطابق لکھا گیا ہے۔

سند کا تعارف

(۱) محمد بن کثیر العبدی البصری، صحیح بخاری وصحیح مسلم کے راوی ہیں۔ان کی صحیح بخاری میں ساٹھ (۶۰) سے زائد روایتیں ہیں۔ (مفتاح صحیح البخاری ص ۱۵۶)

صحیح مسلم میں ان کی حدیث (ج ۲ ص ۲۴۴ ح ۲۲۶۹ کتاب الرؤیا، باب فی تأویل الرؤیا) میں موجود ہے۔ان پر امام یحییٰ بن معین کی جرح مردود ہے۔

ابن حجر نے کہا: ''ثقة ولم يصب من ضعفه'' (تقریب التہذیب: ۶۲۵۲)

(بعض کہتے ہیں کہ) ابن معین کی جرح محمد بن کثیر المصیصی کے بارے میں ہے۔

(حاشیہ میزان الاعتدال ج ۴ ص ۱۸)

المصیصی دوسرا شخص تھا۔محمد بن کثیر العبدی کی متابعت ابوداود الحفری (السنن الکبری للبیہقی ج ۲ ص ۵۷) اور الفریابی (سنن دارقطنی ج ۱ ص ۳۳۴) نے کر دی ہے۔ والحمدللہ

(۲) سفیان بن سعید الثوری، صحیح بخاری وصحیح مسلم کے مرکزی راوی ہیں اور کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ان کی تدلیس کی بحث آگے آرہی ہے۔

(۳) سلمہ بن کہیل، صحیح بخاری وصحیح مسلم کے مرکزی راوی ہیں اور ''ثقہ'' ہیں۔

(التقریب: ۲۵۰۸)

(۴) حجر ابوالعنبس ''ثقہ'' ہیں (الکاشف للذہبی ج ۱ ص ۱۵۰)

انھیں خطیب بغدادی نے ثقہ کہا ہے۔

(۵) وائل بن حجر مشہور صحابی ہیں۔ رضی اللہ عنہ

معلوم ہوا کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ والحمدللہ

[ایک اعتراض کا جواب]

پرائمری ماسٹر: محمد امین صفدر اوکاڑوی حیاتی دیوبندی نے لکھا ہے:

''حضرت وائل بن حجرؓ کی حدیث ابوداود سے جو پیش کرتے ہیں نہ صحیح ہے، کیونکہ اس میں

سفیان مدلس، علاء بن صالح شیعہ، محمد بن کثیر ضعیف ہے۔نہ دوام میں صریح ہے"

(مجموعہ رسائل ج ۳ ص ۳۳۱ طبع اول، غیر مقلدین کی غیر مستند نماز، حوالہ نمبر ۸۷، تجلیات صفدر ج ۵ ص ۴۷۰)

جواب نمبر (۱): سفیان بن سعید الثوری کے بارے میں امام بخاری نے فرمایا:

"ولا أعرف لسفيان الثوري عن حبيب بن أبي ثابت ولا عن سلمة بن كهيل ولا عن منصور وذكر مشائخ كثيرة، لاأعرف لسفيان عن هولاء تدليسًا (ما) أقل تدليسه" (علل الترمذی الکبیر ج ۲ ص ۹۶۶)

یعنی سفیان ثوری، سلمہ بن کہیل سے تدلیس نہیں کرتے تھے۔

جواب نمبر (۲) آل تقلید کے نزدیک یہاں تدلیس مضر نہیں ہے۔ظفر احمد تھانوی دیوبندی نے کہا:"والتدليس والإرسال في القرون الثلاثة لا يضر عندنا" قرونِ ثلاثہ (صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے دور میں) ہمارے نزدیک تدلیس اور ارسال (مرسل روایت ہونا) مُضر نہیں ہے۔ (اعلاء السنن ج ۱ ص ۳۱۳)

جواب نمبر (۳) سفیان ثوری ترک رفع یدین والی حدیث المنسوب الی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، کے بنیادی راوی ہیں اور "عن" سے روایت کر رہے ہیں۔دیوبندی او ربریلوی حضرات کا سفیان کی یہاں تدلیس کے بارے میں کیا خیال ہے؟

ابو بلال محمد اسماعیل جھنگوی دیوبندی کی "تحفہ اہل حدیث" حصہ دوم (ص ۱۵۴، ۱۵۵) بھی دیکھ لیں۔

باقی جوابات کو اختصار کی وجہ سے حذف کر رہا ہوں مثلاً یحییٰ بن سعید القطان کی سفیان ثوری سے روایت وغیرہ۔العلاء بن صالح ہماری مذکورہ روایت کی سند میں ہے ہی نہیں اور محمد بن کثیر العبدی کو ضعیف کہنا مردود ہے جیسا کہ سابقہ صفحے پر گزر چکا ہے۔یاد رہے کہ راوی کے تعین کے لئے اس کے شیوخ وتلامیذ کو مدِ نظر رکھنا انتہائی ضروری ہے۔ایک روایت میں امام ابوداود نے کہا:" حدثنا محمد بن كثير نا سفيان عن منصور"

تو خلیل احمد سہارنپوری دیوبندی نے کہا:"[حدثنا محمد بن كثير] العبدي

أبوعبدالله البصري...... قال ابن معين :لم يكن بثقة وذكره ابن حبان في الثقات وقال أحمد بن حنبل : ثقة " (بذل المجہود ج۱ ص۱۳۹ ح۵۵)

ابن معین کی جرح مردود ہے جیسا کہ سابقہ صفحے پر گزر چکا ہے۔

☆ عملِ صحابہ، اور مخالفین آمین بالجہر کے پاس عدم دلیل کی بنا پر یہ صحیح حدیث دوام پر دلیل ہے۔ والحمدللہ

☆ العلاء بن صالح پر جرح بھی مردود ہے، جمہور محدثین نے انھیں ثقہ قرار دیا ہے لہٰذا ان کی حدیث حسن لذاتہ ہے۔

۲: امام ابن ماجہ القزوینی نے کہا: "حدثنا إسحاق بن منصور :أخبرنا عبد الصمد ابن عبدالوارث :ثنا حماد بن سلمة :ثنا سهيل بن أبي صالح عن أبيه عن عائشة رضي الله عنها عن النبي ﷺ قال: ماحسدتكم اليهود على شيء، ماحسدتكم على السلام والتامين " (سنن ابن ماجہ ج۱ ص۲۷۸ ح۸۵۶، وسندہ صحیح)

اسے منذری (متوفی ۶۵۶ھ) اور بوصیری دونوں نے صحیح کہا ہے۔

(الترغیب والترہیب ج۱ ص۳۲۸ وزوائد سنن ابن ماجہ للبوصیری)

سند کا تعارف

(۱) اسحاق بن منصور بن بہرام الکوسج ابویعقوب التمیمی المروزی نزیل نیسابور ۔

(تہذیب الکمال للمزی ج۲ ص۷۴، ۷۵)

صحیح بخاری وصحیح مسلم کے راوی اور " ثقة ثبت " ہیں۔ (التقریب:۳۸۴)

(۲) عبدالصمد بن عبدالوارث بن سعید العنبری، صحیح بخاری وصحیح مسلم کے راوی اور "صدوق ثبت في شعبة" تھے۔(التقریب:۴۰۸۰)

ان کے بارے میں عبدالباقی بن قانع (ضعیف) نے کہا:"ثقة يخطئ"

(تہذیب التہذیب ج۶ ص۲۹۲)

یہ جرح مردود ہے۔

(۳) حماد بن سلمہ صحیح مسلم کے راوی ہیں۔ جمہور محدثین نے انھیں ثقہ قرار دیا ہے۔ اُن پر جرح مردود ہے۔ حماد بن سلمہ سے عبدالصمد کی روایت صحیح مسلم (کتاب الجہاد باب استحباب الدعاء عند لقاء العدو ح ۱۷۴۳) میں موجود ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ عبدالصمد کا حماد سے سماع قبل از اختلاط وتغیر ہے۔ دیکھئے مقدمۃ ابن الصلاح مع شرح العراقی (ص ۳۶۶، النوع: ۶۲) لہٰذا اختلاط وتغیر کا الزام بھی مردود ہے۔ خالد بن عبداللہ الطحان نے یہی حدیث سہیل سے بیان کر رکھی ہے۔ (صحیح ابن خزیمہ ج ۱ ص ۲۸۸ ح ۵۷۴)

(۴) سہیل بن ابی صالح، صحیح مسلم کے راوی "صدوق تغير حفظه بأخره، روى له البخاري مقرونًا وتعليقًا" ہیں۔ (التقریب: ۲۶۷۵)

سہیل بن ابی صالح سے حماد بن سلمہ کی روایت صحیح مسلم (کتاب البر والصلہ، باب النہی عن قول: ہلک الناس ح ۲۶۲۳) پر موجود ہے جو اس کی دلیل ہے کہ حماد کا سہیل سے سماع قبل از اختلاط ہے۔ لہٰذا سہیل پر "تغير حفظه بأخره" والی جرح یہاں مردود ہے۔

(۵) ابوصالح ذکوان، صحیح بخاری وصحیح مسلم کے راوی اور "ثقہ ثبت" ہیں۔ (التقریب: ۱۸۴۱)

(۶) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں۔

ثابت ہوا کہ اس روایت کی سند صحیح ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہودی لوگ، مسلمانوں سے دو (اہم) باتوں پر حسد کرتے تھے: (۱) ایک دوسرے کو السلام علیکم کہنا (۲) آمین کہنا۔

یہ ظاہر ہے کہ وہ سلام اور آمین سنتے تھے لہٰذا اسی وجہ سے حسد کرتے تھے۔

۳: خطیب بغدادی نے تاریخ (۱۱/۴۳) اور ضیاء المقدسی نے المختارۃ (۵/۱۰۷ ح ۱۷۲۹، ۱۷۳۰) میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ (الفاظ خطیب کے ہیں) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((إن اليهود ليحسدونكم على السلام والتأمين))

بے شک یہود تم سے سلام اور آمین کی وجہ سے حسد کرتے ہیں۔

اس کے سارے راوی ثقہ وصدوق ہیں اور اس کی سند صحیح ہے۔

ان روایات کی تائید میں عرض ہے کہ ایک روایت میں اس حسد کی وجہ مسلمانوں کا "وقولهم

خلف إمامهم في المكتوبة : آمین "امام کے پیچھے آمین کہنا ہے۔

(الترغیب والترہیب ج ا ص ۳۲۸، ۳۲۹ وقال: "باسناد حسن" مجمع الزوائد ج ۲ ص ۱۱۳ وقال: اسنادہ حسن)

اس طرح آمین بالجہر کی اور بھی بہت ساری روایات ہیں۔ دیکھئے میری کتاب "القول المتین فی الجہر بالتامین" ان احادیث سے معلوم ہوا کہ امام مسلم رحمہ اللہ کا یہ دعویٰ بالکل صحیح ہے کہ "نبی ﷺ کا آمین بالجہر کہنا متواتر احادیث سے ثابت نہیں ہے۔" مانعین کے پیش کردہ دلائل : غیر صریح، مبہم، ضعیف اور بلا سند ہیں لہٰذا صحیح ومتواتر احادیث کے مقابلے میں مردود و باطل ہیں۔

[صحابہ کرام کا عمل]

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا اثر

امام ابن خزیمہ نے کہا:

" نا محمد بن يحيى : نا أبو سعيد الجعفي : حدثني ابن وهب : أخبرني أسامة وهو ابن زيد عن نافع عن ابن عمر : كان إذا كان مع الإمام يقرأ بأم القرآن فأمن الناس أمن ابن عمر ورأى تلك السنة ." محمد بن یحییٰ نے ہمیں حدیث بیان کی (کہا:) ہمیں ابوسعید الجعفی نے حدیث بیان کی (کہا:) مجھے ابن وہب نے حدیث بیان کی (کہا:) مجھے اسامہ بن زید نے نافع سے حدیث بیان کی کہ ابن عمر جب امام کے ساتھ نماز پڑھتے، سورۂ فاتحہ پڑھتے پھر لوگ آمین کہتے تو آپ (رضی اللہ عنہ) بھی آمین کہتے، اور اسے سنت قرار دیتے۔ (صحیح ابن خزیمہ ۱/ ۲۸۷ ح ۵۷۲)

سند کی تحقیق: نافع مولیٰ ابن عمر "ثقة ثبت فقيه مشهور" (التقریب: ۷۰۸۶)

اسامہ بن زید (اللیثی ابوزید المدنی) صحیح مسلم کے راوی اور عندالجمہور ثقہ وصدوق تھے۔

ابن وہب عن اسامہ بن زید عن نافع عن ابن عمر کی سند سے متعدد روایات صحیح مسلم میں موجود ہیں۔ (راجع تحفۃ الاشراف للمزی ۶/ ۵۴، ۵۵)

ان پر یحییٰ بن سعید، احمد بن حنبل، ابو حاتم، نسائی، البرقی اور ابو العرب نے جرح کی ہے۔ یحییٰ بن معین، ابن عدی، العجلی، مسلم، ابن حبان (وقال: یخطئ)، ابن شاہین اور یعقوب ابن سفیان وغیرہم نے ثقہ صدوق وصحیح الحدیث کہا ہے۔ الحاکم اور ابو علی الطوسی نے ان کی حدیث کو صحیح قرار دیا۔ ابن خزیمہ وغیرہ نے ان کی حدیث کی تصحیح کی ہے۔

ابن عدی کا قول ہے: ''یروي عنه ابن وهب نسخة صالحة ...... لیس بحدیثه بأس'' (ملخصاً من تہذیب الکمال مع الہامش ۳۴۷/۲۔۳۵۱ وتہذیب التہذیب ۲۰۹/۱، ۲۱۰ وغیرہما)

ذہبی نے کہا: ''الإمام العالم الصدوق'' (سیر اعلام النبلاء ۳۴۲/۶)

اور کہا: ''صدوق قوي الحدیث والظاهر أنه ثقة''

(معرفۃ الرواۃ المتکلم فیہم لا یوجب الرد للذہبی ص ۶۴ رقم ۲۶)

بوصیری نے الزوائد میں ان کی ایک حدیث کو صحیح قرار دیا۔ (سنن ابن ماجہ ۱۰۱۴/۲ ح ۳۰۵۲)

زیلعی حنفی نے اس کی ایک حدیث کو حسن کہا۔ (نصب الرایۃ ۱۶۲/۳)

علی بن المدینی نے کہا: ''کان عندنا ثقة'' (سوالات محمد بن عثمان بن ابی شیبہ رقم ۱۰۳ ص ۹۸)

محمد بن عثمان بن ابی شیبہ ثقہ ہیں اور ان پر جروح مردود ہیں۔

دیکھئے میری کتاب ''الأسانید الصحیحة في أخبار أبي حنیفة'' (ص ۸۱)

اور تحقیقی مقالات (ج ۱ ص ۴۷۵)

شمس الحق عظیم آبادی رحمہ اللہ نے ابن سید الناس سے نقل کیا کہ ''إسناده حسن'' (تعلیق المغنی ۲۵۲/۱) یعنی اس کی ایک روایت بلحاظ سند حسن ہے۔

خلاصہ یہ کہ وہ جمہور کے نزدیک ثقہ وصدوق تھے لہٰذا ان کی حدیث حسن ہے۔

حافظ ذہبی لکھتے ہیں: ''وقد یرتقي حدیثه إلٰی رتبة الحسن'' اور اُن کی حدیث حسن کے رتبے تک پہنچ جاتی ہے۔ (سیر اعلام النبلاء ۳۴۳/۶)

حافظ ابن حجر نے کہا: ''صدوق یهم'' (التقریب: ۳۱۷)

حافظ صاحب امام ابن عدی سے ایک راوی کے بارے میں نقل کرتے ہیں: ''لم أر له متناً

منكراً ربما يهم وهو حسن الحديث'' (الکامل لابن عدی ۴/۲۷۸،۱۱،لسان المیزان ۳/۶۹)
معلوم ہوا کہ یھم والی روایت کا راوی حسن الحدیث ہوتا ہے (بشرطیکہ اس کے موثقین زیادہ ہوں اور روایت مذکورہ میں اس کا وہم ہونا ثابت نہ ہو۔)

دیوبندیوں کا اصول ہے کہ مختلف فیہ راوی کی حدیث حسن ہوتی ہے۔ ظفر احمد تھانوی صاحب لکھتے ہیں: '' وكذا إذا كان الراوي مختلفاً فيه : وثقه بعضهم وضعفه بعضهم فهو حسن الحديث '' اور اس طرح اگر راوی میں اختلاف ہو، بعض نے اس کی توثیق کی ہو اور بعض نے ضعیف قرار دیا ہو تو وہ حسن الحدیث ہوتا ہے۔

(قواعد فی علوم الحدیث ص ۷۶ مع تحقیق ابی غدة الحنفی)

اور اسامہ بھی مختلف فیہ راوی ہیں۔ بعض نے جرح کی اور اکثر وجمہور علماء نے انھیں ثقہ قرار دیا لہٰذا ان کی حدیث بذات خود حسن ہے۔ واللہ اعلم

ابن وہب کتب ستہ کے راوی اور ثقہ حافظ عابد ہیں۔ (التقریب:۳۶۹۴)

ابوسعید (یحییٰ بن سلیمان) الجعفی، صحیح بخاری کے راوی ہیں، ان سے ابو زرعہ وغیرہ نے روایت کی۔ ابو زرعہ صرف ثقہ سے روایت کرتے ہیں۔ (لسان المیزان ۲/۴۱۶)

ابن حبان نے ثقہ قرار دیا۔ (کتاب الثقات ۹/۲۶۳ وقال : ربما أغرب)

دارقطنی نے کہا: ثقة

مسلمہ بن قاسم نے کہا: ''لا باس به وكان عند العقيلي ثقة وله أحاديث مناكير''
(مسلمہ بذات خود ضعیف ہے)

ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں ان سے روایت کی ہے، ابو حاتم نے کہا: ''شيخ''

ان کے مقابلے میں امام نسائی نے کہا: ''ليس بثقة''

حافظ ابن حجر نے کہا: ''صدوق يخطئ''

(ملخصاً من تہذیب التہذیب ۱۱/۲۲۷ وتقریب التہذیب:۷۵۶۴)

جمہور کے مقابلے میں یہ جرح مردود ہے، لہٰذا ابوسعید الجعفی کی حدیث حسن لذاتہ ہے۔

ان کے شاگرد محمد بن یحییٰ (الذہلی) ثقہ حافظ جلیل تھے۔ (التقریب: ۶۳۸۷)

☆ خلاصہ یہ کہ حدیث بلحاظ سند حسن ہے، لہٰذا شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ کا اسے إسناده ضعیف کہنا قرین صواب نہیں ہے۔ واللہ اعلم

امام بیہقی لکھتے ہیں: " وروينا عن ابن عمر رضي الله عنه أنه كان يرفع بها صوته إما مًا كان أو مامومًا "

ابن عمر رضی اللہ عنہ امام ہوتے یا مقتدی، (دونوں صورتوں میں) آمین بلند آواز سے کہتے تھے۔

(السنن الکبریٰ ۲/۵۹)

ان کا غالبًا اس حدیث کی طرف اشارہ ہے: " وقال نافع: كان ابن عمر رضي الله عنهما لا يدعه ويحضهم وسمعت منه في ذلك خبرًا "

نافع نے کہا: ابن عمر رضی اللہ عنہما آمین (کہنا) نہیں چھوڑتے تھے اور انھیں (اپنے شاگردوں کو) اس کی ترغیب دیتے تھے اور میں نے اس سلسلہ میں ان سے ایک خبر سنی ہے۔ (بخاری مع فتح الباری ۲/۲۰۹)

بعض روایات میں ہے کہ میں نے خیر سنی ہے۔

یہ روایت مصنف عبدالرزاق (۲۶۴۱) میں موصولاً موجود ہے۔

تنبیہ: مصنف عبدالرزاق (۲/ ۹۷) میں ابن جریج کے بعد "أخبرت نافع" چھپ گیا ہے۔ جبکہ صحیح " أخبرني نافع " ہے جیسا کہ فتح الباری (۲/ ۲۰۹) میں ہے۔

فوائد ابن معین میں صحیح سند کے ساتھ نافع سے روایت ہے:

"أن ابن عمر كان إذا ختم أم القرآن لا يدع آمين ، يؤمن إذا ختمها و يحضهم على قولها و سمعت منه في ذلك خبرًا " ابن عمر جب سورۃ فاتحہ ختم کرتے تو آمین (کہنا) نہ چھوڑتے، جب فاتحہ ختم کرتے تو آمین کہتے اور اسے کہنے کی ترغیب دیتے، میں نے ان سے اس کے متعلق ایک روایت بھی سنی ہے۔

یہ روایت ابن حجر نے تغلیق التعلیق (۲/ ۳۱۹) میں اپنی سند کے ساتھ یحییٰ بن معین سے نقل کی ہے۔

میرے اس مضمون کا صرف وہی جواب قابلِ مسموع ہوگا جس میں اس مضمون کے

مکمل متن کو درج کر کے ہر مطلوبہ بات کا جواب دیا جائے گا۔ اس شرط کی عدم موجودگی والا جواب شروع سے ہی مردود سمجھا جائے گا۔ **والمسلمون علٰی شروطھم**

یاد رہے کہ یہ شرط کتاب اللہ کے مخالف نہیں ہے بلکہ عین تحقیق مطلوب ہے تاکہ مخالف شخص اصل بحث سے ہٹ کر اِدھر اُدھر کی باتیں نہ چھیڑ دے۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب "**القول المتین فی الجھر بالتأمین**"

تنبیہ: اس مضمون "**زاد الیقین فی تحقیق بعض روایات التأمین**" کا جواب ابھی تک نہیں آیا۔ (۱۸/ستمبر۲۰۰۴ء)

لہٰذا عامۃ المسلمین کے فائدے کے لئے اسے ماہنامہ "الحدیث" میں شائع کیا جارہا ہے۔

(۱۶/شعبان۱۴۲۳ھ بمطابق ۲۳/اکتوبر۲۰۰۲ء) [الحدیث:۷]

مسبوق اور آمین

سوال مسبوق جس کی فاتحہ باقی ہو، اگر امام آمین کہہ دے تو کیا کرے گا؟ اور کیا وہ بعد میں اپنی سورۂ فاتحہ کی تکمیل کے بعد دوسری آمین کہے گا؟ (ایک سائل)

الجواب نماز جہری ہو یا سری، امام، مقتدی اور منفرد تینوں پر فاتحہ خلف الامام فرض ہے، لہٰذا جہری نماز میں بھی امام کے پیچھے مقتدی، سورۂ فاتحہ سراً پڑھے گا۔ فرض کریں کہ مقتدی نے ایک آیت پڑھی اور امام نے سورۂ فاتحہ ختم کر کے آمین کہہ دی تو ((**إذا أمن الإمام فأمنوا**)) کی رو سے یہ مقتدی بھی آمین کہے گا اور ((**وما فاتکم فاتموا**)) کے اصول کی رو سے اپنی باقی سورۂ فاتحہ پوری کرے گا۔ جب یہ اپنی سورۂ فاتحہ پوری کرے گا تو آمین نہیں کہے گا، کیونکہ حالتِ جہر میں مقتدی کو ماعدا الفاتحہ سے منع کر دیا گیا ہے، اِلا یہ کہ امام کے بھولنے پر لقمہ دے دے۔

دیکھئے میری کتاب "الکواکب الدریہ فی وجوب الفاتحہ خلف الامام فی الجہریہ"

لہٰذا میری تحقیق میں مقتدی امام کی آمین کے بعد حالتِ جہر میں اپنی سورۂ فاتحہ کی تکمیل پر آمین نہیں کہے گا کیونکہ اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ واللہ اعلم

سورۂ فاتحہ اور دوسری سورت کے درمیان بسم اللہ پڑھنا

سوال سورۂ فاتحہ اور دوسری سورت کے درمیان بسم اللہ پڑھنے کی کیا دلیل ہے؟

(ایک سائل)

الجواب سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((أنزلت علي آنفاً سورة)) میرے اوپر ابھی ایک سورت (دوبارہ) نازل ہوئی ہے، پھر آپ نے پڑھا: ((بسم اللّٰه الرحمٰن الرحيم)) ﴿ اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ○ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ○ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ﴾

(صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب حجۃ من قال البسملۃ آیۃ من اول کل سورۃ سوی براءۃ، ح ۴۰۰)

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ فاتحہ کے بعد سورت سے پہلے بھی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنا چاہئے۔ ایک دفعہ امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ نے سورۂ فاتحہ سے پہلے بسم اللہ جہراً پڑھی مگر سورت سے پہلے (جہراً) نہ پڑھی تو مہاجرین اور انصار نے اعتراض کیا، آپ نے اس کے بعد والی نماز میں سورت سے پہلے بھی بسم اللہ (جہراً) پڑھی۔

دیکھئے کتاب الام للامام شافعی (ج ۱ ص ۱۰۸)

اس کی سند حسن لذاتہ ہے۔ اسے حاکم اور ذہبی رحمہما اللہ دونوں نے مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے۔ (المستدرک ج ۱ ص ۲۳۳)

بعض لوگوں کا اپنے مسلک کی خاطر اس حدیث پر جرح کرنا صحیح نہیں ہے۔

یاد رہے کہ کسی صحیح یا حسن روایت میں اس بات کی صراحت نہیں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سورۂ فاتحہ کے بعد والی سورت کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہیں پڑھتے تھے۔

[شہادت، ستمبر ۲۰۰۰ء]

نماز میں رکوع سے پہلے اور بعد: رفع الیدین

سوال جب ہم علماء سے سوال کرتے ہیں کہ کیا نماز میں رفع یدین کرنا جائز ہے؟ تو جواب ملتا ہے کہ اُس وقت لوگ بغلوں میں بُت دے کر آتے تھے۔ کیا یہ صحیح کہتے ہیں؟ (حاجی نذیر خان دامان، حضرو)

الجواب بغلوں میں بُت دے کر آنے والی بات اور بُتوں کے ساتھ نماز پڑھنے کا قصہ بالکل جھوٹ ہے جس کا کوئی ثبوت حدیث کی کسی کتاب میں سند کے ساتھ موجود نہیں ہے۔ اس کے برعکس صحیح بخاری (۷۳۶) اور صحیح مسلم (۳۹۰) میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، آپ جب نماز میں کھڑے ہوتے تو کندھوں تک رفع یدین کرتے، رکوع کرتے وقت بھی آپ اسی طرح کرتے تھے اور جب رکوع سے سر اُٹھاتے تو اسی طرح کرتے تھے اور فرماتے: ((سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ .)) اور سجدے میں آپ ایسا نہیں کرتے تھے۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۰۲)

اس حدیث کے راوی سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بھی شروع نماز، رکوع سے پہلے، رکوع کے بعد اور دو رکعتیں پڑھ کر کھڑے ہوتے تو رفع یدین کرتے تھے اور فرماتے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایسا ہی کرتے تھے۔ (صحیح بخاری: ۷۳۹ وسندہ صحیح، شرح السنۃ للبغوی ۳/۲۱ ح ۵۶۰ وقال: ''ھذا حدیث صحیح'')

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کے راوی، اُن کے بیٹے سالم بن عبداللہ بن عمر رحمہ اللہ بھی شروع نماز، رکوع کے وقت اور رکوع سے اُٹھنے کے بعد رفع یدین کرتے تھے۔

(حدیث السراج ۲/۳۴، ۳۵ ح ۱۱۵، وسندہ صحیح)

فائدہ: سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ایک حدیث میں فرمایا: ((صلّى بنا النبي صلى الله عليه وسلم العشاء في آخر حياته فلما سلّم قام......)) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کے آخری دور میں ہمیں عشاء کی نماز پڑھائی پھر جب آپ نے سلام پھیرا تو کھڑے ہو گئے۔

(صحیح بخاری: ۱۱۶، صحیح مسلم: ۲۵۳۷)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری دور میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تھا لہٰذا آپ کا رفع یدین روایت کرنا آخری عمل ہے۔

سیدنا ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی، آپ نماز شروع کرتے وقت، رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد رفع یدین کرتے تھے۔

(السنن الکبریٰ للبیہقی ۷۳/۲ وقال: ''رواتہ ثقات'' وسندہ صحیح)

اس حدیث کے راوی سیدنا ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ شروع نماز، رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد رفع یدین کرتے تھے۔ (السنن الکبریٰ للبیہقی ۷۳/۲ وسندہ صحیح)

سیدنا ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کے راوی سیدنا عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ بھی شروع نماز، رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد رفع یدین کرتے تھے۔ (السنن الکبریٰ للبیہقی ۷۳/۲ وقال الذہبی فی المہذب فی اختصار السنن الکبیر ۴۹/۲ ح ۱۹۴۳: ''رواتہ ثقات'' وسندہ صحیح)

سیدنا عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ کے شاگرد (مشہور ثقہ تابعی امام) عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ بھی شروع نماز، رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد رفع یدین کرتے تھے۔

(السنن الکبریٰ للبیہقی ۷۳/۲ وسندہ صحیح، وقال ابن حجر فی التلخیص الحبیر ۲۱۹/۱ ح ۳۲۸: ''ورجالہ ثقات'')

عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ کے شاگرد ایوب السختیانی رحمہ اللہ بھی نماز شروع کرتے وقت، رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد رفع یدین کرتے تھے۔ (السنن الکبریٰ للبیہقی ۷۳/۲ وسندہ صحیح)

ایوب السختیانی رحمہ اللہ کے شاگرد (تبع تابعی) حماد بن زید رحمہ اللہ بھی شروع نماز، رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد رفع یدین کرتے تھے۔ (السنن الکبریٰ للبیہقی ۷۳/۲ وسندہ صحیح)

حماد بن زید رحمہ اللہ کے شاگرد ابوالنعمان محمد بن الفضل السدوسی رحمہ اللہ بھی شروع نماز، رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد رفع یدین کرتے تھے۔ (السنن الکبریٰ للبیہقی ۷۳/۲ وسندہ صحیح)

ابوالنعمان محمد بن الفضل رحمہ اللہ کے شاگرد امام بخاری رحمہ اللہ بھی رفع یدین کرتے تھے بلکہ آپ نے رفع یدین کے اثبات پر ایک کتاب ''جزء رفع الیدین'' لکھی ہے جو مطبوع و مشہور ہے۔

معلوم ہوا کہ رفع یدین پر مسلسل عمل دورِ نبوی، دورِ صحابہ، دورِ تابعین، دورِ تبع تابعین اور بعد کے ہر زمانے میں ہوتا رہا ہے لہٰذا اسے منسوخ یا متروک سمجھنا یا بغلوں میں بُتوں والے جھوٹے قصے کے ساتھ اس کا مذاق اُڑانا اصل میں حدیث اور سلف صالحین کے عمل کا مذاق اڑانا ہے۔

اگر رفع یدین منسوخ یا متروک ہوتا تو سیدنا ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ کبھی رفع یدین نہ کرتے کیونکہ انھوں نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آخری نمازیں پڑھی تھیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اپنے مصلے پر امام مقرر کیا تھا۔

مزید تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب ''نور العینین فی (اثبات) مسئلہ رفع الیدین'' (ص ۱۱۹۔۱۲۱) والحمد للہ (۱۷/ دسمبر ۲۰۰۸ء)

سوال کیا نماز میں رفع یدین کرنے سے نیکیاں ملتی ہیں؟

(حاجی نذیر خان دامان، حضرو)

الجواب جی ہاں! سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''**إنه یکتب في کل إشارة یشیرها الرجل بیده في الصلوٰة بکل إصبع حسنة أو درجة**'' نماز میں جو شخص (مسنون) اشارہ کرتا ہے، اسے ہر اشارے کے بدلے میں ہر انگلی پر ایک نیکی یا ایک درجہ ملتا ہے۔ (المعجم الکبیر للطبرانی ۱۷/ ۲۹۷ ح ۸۱۹ وسندہ حسن، مجمع الزوائد ۲/ ۱۰۳، وقال الہیثمی: ''واسنادہ حسن''، معرفۃ السنن والآثار للبیہقی ج ۱ ص ۲۲۵ قلمی)

اس روایت پر مفصل تحقیق کے لئے دیکھئے نور العینین (ص ۱۸۱۔۱۸۶)

یاد رہے کہ رفع یدین نہ کرنے پر کسی نیکی یا ثواب کا ملنا کسی بھی حدیث یا اثر سے ثابت نہیں ہے۔

مسئلہ رفع یدین اور سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ

سوال سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایت بیان کی جاتی ہے (بحوالہ سنن بیہقی) کہ وہ رکوع سے پہلے اور بعد میں رفع الیدین نہیں کرتے تھے۔ کیا یہ صحیح ہے؟

(ایک سائل)

الجواب سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی عدم رفع الیدین کے حوالے سے کوئی صحیح روایت نہیں مل سکی۔ جب کہ صحیح بخاری میں ان کا رفع الیدین کرنا ثابت ہے۔ ابو بکر بن عیاش کی روایت معلول ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔ اس روایت کو امام احمد بن حنبل اور امام ابن معین نے باطل وغیرہ قرار دیا ہے۔ [شہادت، دسمبر ۲۰۰۱ء]

سوال ایک روایت میں آیا ہے کہ "حدثنا ابن أبي داؤد وقال: ثنا أحمد ابن يونس قال: ثنا أبو بكر بن عياش عن حصين عن مجاهد قال: صليت خلف ابن عمر رضي الله عنه فلم يكن يرفع يديه إلا في التكبيرة الأولى من الصلوٰة" (شرح معانی الآثار ج ۱ ص ۲۲۵، ابن ابی شیبہ ج ۱ ص ۲۳۷)

اس روایت کی تحقیق بتائیں کہ صحیح ہے یا ضعیف؟ (محمد سعید جانڈیو)

الجواب شرح معانی الآثار اور مصنف ابن ابی شیبہ کی یہ روایت ضعیف ہے:

محدثین کرام مثلاً امام ابن معین، امام احمد بن حنبل اور امام بخاری وغیرہم نے روایت مذکورہ کو ضعیف و وہم قرار دیا ہے۔

امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ نے فرمایا:

"حديث أبي بكر عن حصين إنما هو توهم منه لا أصل له"

ابو بکر کی حصین سے روایت اس کا وہم ہے، اس روایت کی کوئی اصل نہیں ہے۔

(جزء رفع الیدین: ۱۶ و نصب الرایہ ۱/۳۹۲)

اس روایت پر امام ابن معین کی جرح خاص اور مفسر ہے۔ اس کے مقابلے میں منکرینِ رفع یدین لاکھ جتن کریں، یہ حدیث بہر حال باطل و مردود ہے۔ ابن معین کا نقادِ حدیث میں

جو مقام ہے وہ حدیث کے ابتدائی طالب علموں پر بھی پوشیدہ نہیں ہے۔

اس روایت کے بارے میں امام احمد بن حنبل نے فرمایا:

"رواه أبو بكر بن عياش عن حصين عن مجاهد عن ابن عمر وهو باطل"

اسے ابو بکر بن عیاش نے حصین عن ابن عمر کی سند سے روایت کیا ہے اور یہ باطل ہے۔

(مسائل احمد روایت ابن ہانی ج ۱ ص ۵۰)

ائمۂ حدیث نے ابو بکر بن عیاش کی اس روایت کو وہم وخطا بھی قرار دیا ہے، لہٰذا ان کی یہ روایت باطل و بے اصل ہے۔

تنبیہ بلیغ: راقم الحروف کی قدیم تحقیق یہ تھی کہ ابو بکر بن عیاش رحمہ اللہ جمہور محدثین کے نزدیک ضعیف راوی ہیں۔ بعد میں جب دوبارہ تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ وہ جمہور محدثین کے نزدیک صدوق و مُوثّق راوی ہیں لہٰذا میں نے اپنی سابقہ تحقیق سے علانیہ رجوع کیا۔ دیکھئے ماہنامہ الحدیث حضرو: ۲۸ ص ۵۴ (تحریر ۲۲ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ)

تفصیل کے لئے دیکھئے نور العینین فی مسئلۃ رفع الیدین (ص ۱۶۸)

خلاصہ یہ کہ قاری ابو بکر بن عیاش رحمہ اللہ کی یہ روایت شاذ و ضعیف ہے جبکہ اس کے برعکس صحیح بخاری و دیگر کتب حدیث سے ثابت ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد زمانۂ تابعین میں بھی رفع یدین کرتے تھے۔

(دیکھئے حدیث السراج ۲/ ۳۴ ح ۱۱۵)

بلکہ رفع یدین نہ کرنے والے کو کنکریوں سے مارتے تھے۔ (دیکھئے جزء رفع الیدین للبخاری، وغیرہ)

[شہادت، جولائی ۲۰۰۰ء]

سوال سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے ترکِ رفع یدین کی جو روایت منسوب ہے (طحاوی ج ۱ ص ۱۱۰، وغیرہ) اس کے بارے میں سرفراز خان صفدر نے لکھا ہے:

" امام بیہقی" وغیرہ نے اس کو جو بلاوجہ باطل اور موضوع قرار دیا ہے تو یہ ان کا وہم اور تعصب ہے..." (خزائن السنن ج ۲ ص ۱۰۱)

کیا محدثین کرام میں کسی قابلِ اعتماد محدث نے اسے صحیح یا حسن کہا ہے؟ (ایک سائل)

الجواب میرے علم کے مطابق ایک محدث بھی ایسا نہیں ہے جس نے اسے صحیح یا حسن کہا ہو۔ بلکہ امام بیہقی کے علاوہ دوسرے محدثین نے بھی اسے وہم، لا اصل لہ اور باطل کہا ہے۔ مثلاً امام ابن معین رحمہ اللہ (جو کہ عند الفریقین مستند اور قابلِ اعتماد محدث اور امام ہیں) نے فرمایا: یہ روایت ابوبکر بن عیاش کا وہم ہے۔ اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

(جزء رفع الیدین ص ۵۶)

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے (جو کہ ائمہ اربعہ میں سے ہیں) اس روایت کے بارے میں فرمایا: '' هو باطل '' یعنی یہ روایت باطل ہے۔

(مسائل احمد روایۃ اسحاق بن ابراہیم بن ہانی النیسابوری ج ا ص ۵۰)

فنِ حدیث اور علل کے ان ماہر محدثین کرام کے مقابلے میں ایسے لوگوں کی تصحیح و تحسین کا کیا اعتبار ہے جو بذاتِ خود ایک فریقِ مخالف کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کی زندگیاں کذب بیانیوں، افتراء پردازیوں، تناقضات اور مغالطوں سے بھری پڑی ہیں۔

(ہفت روزہ الاعتصام لاہور، ۲۷/ جون ۱۹۹۷ء)

سوال ایک روایت میں آیا ہے کہ '' عن عبدالعزيز بن حكيم قال: رأيت ابن عمر يرفع يديه حذو أذنيه في أول تكبيره ولم يرفعهما فيما سوى ذلك ''

(موطأ امام محمد ص ۹) (محمد سعید چانڈیو)

الجواب اس روایت کی سند سخت ضعیف ہے۔

ا: اس کا بنیادی راوی محمد بن الحسن بن فرقد الشیبانی سخت مجروح ہے۔ قاضی ابو یوسف نے اس راوی کے بارے میں کہا: اس کذاب یعنی محمد بن الحسن سے کہو: یہ مجھ سے جو روایتیں بیان کرتا ہے کیا اس نے سنی ہیں؟ [تاریخ بغداد ۲/ ۱۸۰، وسندہ حسن، ماہنامہ الحدیث: ۵۵ ص ۲۹]

امام یحییٰ بن معین نے کہا: جهمي كذاب. وہ جہمی کذاب تھا۔

(کتاب الضعفاء للعقیلی ۴/ ۵۲ وسندہ صحیح، لسان المیزان ۵/ ۱۲۲ [دوسرا نسخہ ۶/ ۲۸]، ماہنامہ الحدیث: ۵۵ ص ۱۳)

[مزید تحقیق کے لئے ماہنامہ الحدیث: ۵۵ میں تحقیقی مضمون ''تائید ربانی اور ابن فرقد شیبانی'' کا مطالعہ کریں۔]

حافظ ذہبی جیسے متاخرین نے اسے صرف موطأ امام مالک کی روایت میں قوی قرار دیا ہے۔ یہ قوی قرار دینا محل نظر ہے تاہم روایت مذکورہ موطأ امام مالک کی ہرگز نہیں ہے۔

۲: اس کا دوسرا راوی محمد بن ابان بن صالح الجعفی بھی بالاتفاق ضعیف ہے۔

(دیکھئے نور العینین ص ۱۷۳، اور کتب اسماء الرجال) [شہادت، جولائی ۲۰۰۰ء]

مسئلہ رفع الیدین وعدمِ رفع یدین

سوال کیا یہ بات درست ہے کہ رفع الیدین اور عدم رفع الیدین (یعنی کندھوں تک ہاتھ نہ اٹھانا) دونوں عمل صحیح احادیث سے ثابت ہیں؟ نیز اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو نماز میں کبھی رفع الیدین کرتا ہے اور کبھی نہیں؟ (طارق علی بروہی، کراچی)

الجواب نماز میں تکبیر اولیٰ، رکوع سے پہلے اور اس کے بعد والا رفع الیدین صحیح اور متواتر احادیث سے ثابت ہے۔ دیکھئے قطف الازہار المتناثرۃ للسیوطی، لقط اللآلی المتناثرۃ للزبیدی، نظم المتناثر من الحدیث المتواتر للکتانی اور میری کتاب ''نور العینین فی (اثبات) مسئلہ رفع الیدین'' (ص ۸۶، ۸۷، ونسخہ جدید ص ۱۲۲، ۱۲۳)

رفع یدین کے متواتر ہونے کا اعتراف دیوبندیوں میں انور شاہ کاشمیری صاحب نے بھی کیا ہے۔ (دیکھئے نیل الفرقدین ص ۲۲)

متواتر حدیث (یونانی علمِ کلام اور متعارض و متناقض اُصولِ فقہ والوں کے نزدیک بھی) قطعی اور یقینی ہوتی ہے، اس کے صحیح ہونے میں کوئی شک نہیں ہوتا جیسا کہ اصول میں مقرر ہے۔ اس کے مقابلے میں مخالفین رفع یدین دو قسم کی روایات پیش کرتے ہیں:

① وہ صحیح روایتیں جن میں رکوع سے پہلے اور بعد والے رفع یدین کا ذکر ہی نہیں ہے، مثلاً صحیح مسلم میں سیدنا جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ والی حدیث

سیدنا جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ والی حدیث (جس میں سرکش گھوڑوں کی دموں کا ذکر آیا

ہے) کے بارے میں محمود حسن دیوبندی صاحب فرماتے ہیں:
"باقی اذناب خیل کی روایت سے جواب دینا بردئے انصاف درست نہیں کیونکہ وہ سلام کے بارے میں ہے۔" (تقاریر شیخ الہند ص ۶۵ مطبوعہ ادارہ تالیفات اشرفیہ، ریلوے روڈ ملتان)
اس حدیث کے بارے میں محمد تقی عثمانی دیوبندی صاحب فرماتے ہیں:
"لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ اس حدیث سے حنفیہ کا استدلال مشتبہ اور کمزور ہے، کیونکہ ابن القبطیہ کی روایت میں سلام کے وقت جو تصریح موجود ہے اس کی موجودگی میں ظاہر اور متبادر یہی ہے کہ حضرت جابرؓ کی یہ حدیث رفع عند السلام ہی سے متعلق ہے۔"
(درس ترمذی ج ۲ ص ۳۶)

② وہ روایتیں جن سے ترکِ رفع یدین کا اشارہ ملتا ہے، مثلاً حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ لیکن انصاف یہ ہے کہ یہ ساری روایتیں اصولِ حدیث کی رو سے ضعیف و مردود ہیں۔
راقم الحروف نے نور العینین (ص ۹۶ تا ص ۱۰۶، طبع جدید ص ۱۲۵۔۱۵۸) میں متعدد دلائل سے سفیان ثوری کی سند سے سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب روایت کا ضعیف و مردود ہونا ثابت کیا ہے اور لکھا ہے کہ "یہ حدیث علت قادحہ کے ساتھ معلول ہے اور سنداً اور متناً دونوں طرح سے ضعیف ہے" (ص ۹۶، واللفظ لہ، طبع جدید ص ۱۳۰)
ایک مجہول شخص "ابو بلال جھنگوی" نے تحفہ اہلحدیث (نمبر ۲) نامی کتابچہ لکھا ہے جسے ادارہ "العزیز" نزد جامع مسجد صدیقیہ، گلہ برف خانہ، سیالکوٹ روڈ کھوکھر کی گوجرانوالہ، سے شائع کیا گیا ہے۔ اس کتابچہ کے صفحہ ۱۵۹ پر اس مجہول مصنف نے حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھا ہے کہ "زبیر علی زئی.... نے نور العینین میں صحیح کہا"!!
حالانکہ راقم الحروف نے اس روایت کو نہ صحیح کہا اور نہ حسن، بلکہ اس کے برعکس اس روایت کا ضعیف، معلول اور مردود ہونا ثابت کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ مجہول مصنف کذاب اور ساقط العدالت ہے۔ بعض لوگ اس قسم کی کتابیں، رسالے اور مضامین وغیرہ پڑھ کر بغلیں بجانا شروع کر دیتے ہیں کہ ہم نے اہلِ حدیث کو شکست دے دی، حالانکہ ان لوگوں

کے لئے مناسب یہ ہے کہ وہ اپنے افتراءات، اکاذیب اور دھوکہ دہی پر بغلیں جھانکیں۔

یہ مجہول شخص بعد میں معروف ہو گیا مگر کذب وافتراء کے ساتھ، اس کا نام ولقب ابو بلال محمد اسماعیل جھنگوی ہے۔ اسماعیل جھنگوی مذکور کے اکاذیب وافتراءات اور مکر وفریب کے لئے دیکھئے ماہنامہ الحدیث: ۳۵ (ص ۵۱ تا ۶۰، اسماعیل جھنگوی کے پندرہ جھوٹ)

پچھلے ہفتے ایک صاحب، محمد یوسف لدھیانوی (دیوبندی) کی کتاب ''اختلافِ اُمت اور صراطِ مستقیم'' لے آئے۔ جب راقم الحروف نے مسند الحمیدی ومسند ابی عوانہ کے قلمی نسخوں اور دیگر دلائل سے لدھیانوی صاحب کی خیانتیں اور اکاذیب ثابت کر دیئے تو انھوں نے بعد از تحقیق دیوبندی مذہب کو الوداع کہہ کر کتاب وسنت کا راستہ اختیار کر لیا۔ والحمدللہ

مختصر یہ کہ رفع یدین قبل الرکوع وبعدہ کا ترک، منسوخ یا ممنوع ہونا کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ تفصیل کے لئے امام بخاری کی جزء رفع الیدین، وغیرہ کا مطالعہ کریں۔

تنبیہ: تحقیقِ بالا سے ثابت ہوا کہ نماز میں رکوع سے پہلے اور بعد والا رفع یدین ہمیشہ کرنا چاہئے اور اسے کبھی ترک نہیں کرنا چاہئے۔ جو شخص کبھی کرتا ہے اور کبھی نہیں کرتا، اس کا موقف صحیح احادیث کے خلاف ہونے کی وجہ سے غلط ہے۔ [شہادت، فروری ۲۰۰۰ء]

مسند حمیدی اور رفع یدین

سوال مسند الحمیدی (نسخہ دیوبندیہ بتحقیق الاعظمی) میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ترکِ رفع یدین کی جو روایت منسوب ہے اور جسے بعض ''محقق'' قسم کے ''علماء'' رفع یدین کے خلاف پیش کرتے ہیں: مثلاً سرفراز خان صفدر صاحب دیوبندی۔

(دیکھئے خزائن السنن ج ۲ ص ۹۹)

آپ نے ''نور القمرین'' وغیرہ میں متعدد دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ نسخہ دیوبندیہ کی روایت محرف ہے اور صحیح روایت وہی ہے جو کہ نسخہ ظاہریہ وغیرہا میں موجود ہے، جس میں رفع یدین کا اثبات ہے۔ جزاکم اللہ خیراً

کیا آپ کے علم میں یہی روایت حدیث کی کسی دوسری کتاب میں امام حمیدی رحمہ اللہ کی سند کے ساتھ موجود ہے؟ (ایک سائل)

الجواب حافظ ابونعیم اصبہانی رحمہ اللہ (متوفی ۴۳۰ھ) کی کتاب "المسند المستخرج علی صحیح الإمام مسلم" میں امام حمیدی کی یہی روایت اثبات رفع یدین کے ساتھ موجود ہے۔ (دیکھئے ج ۲ ص ۱۲، مطبوعہ عباس احمد الباز مکۃ المکرمہ)

(ہفت روزہ الاعتصام لاہور، ۲۷/ جون ۱۹۹۷ء)

مسئلہ رفع یدین اور موطا امام مالک

سوال موطأ امام مالک میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور سیدنا مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ سے مروی رفع الیدین والی احادیث میں صرف رکوع کے بعد رفع الیدین کا ذکر ہے جبکہ سنا ہے کہ امام بخاری نے امام مالک سے ہی سند لی ہے، یعنی دونوں کی سند ایک ہے؟ (سید عبدالناصر، ضلع مردان)

الجواب سیدنا مالک بن حویرث کی روایت موطأ امام مالک میں نہیں ہے جبکہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت موجود ہے، "مالك عن ابن شهاب عن سالم بن عبدالله عن ابن عمر، أن رسول الله ﷺ كان إذا افتتح الصلوٰة رفع يديه حذو منكبيه وإذا كبر للركوع وإذا رفع رأسه من الركوع رفعهما كذلك وقال: سمع الله لمن حمده، ربنا ولك الحمد، وكان لايفعل ذلك في السجود" (موطأ امام مالک ص ۱۱۳، حدیث: ۵۹ روایۃ عبدالرحمٰن بن قاسم)

موطأ امام مالک کی اس روایت میں شروع نماز، رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد تین مقامات پر رفع الیدین کا اثبات ہے۔ یہی روایت امام بخاری نے نقل کی ہے۔ امام بخاری اور موطأ امام مالک کی سند اور متن ایک ہی ہے۔ لہٰذا مدینہ کے امام اور بخارا کے امام کی روایت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ [شہادت، دسمبر ۲۰۰۱ء]

رفع یدین اور سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ

سوال ایک روایت میں آیا ہے: ''قال أبو حنيفة: حدثنا حماد عن إبراهيم عن علقمة والأسود عن عبدالله بن مسعود رضي الله عنه أن رسول الله ﷺ كان لا يرفع يديه إلا عند افتتاح الصلاة ثم لا يعود شيً من ذلك''

(اعلاء السنن ج ۳ ص ۵۷ ح ۸۲۶ حاشیہ بحوالہ کتاب الآثار لامام محمد) (محمد سعید چانڈیو)

الجواب دیوبندیوں کی اعلاء السنن نامی کتاب میں روایتِ مذکورہ کو خوارزمی (متوفی ۶۶۵ھ) کی کتاب ''جامع المسانید'' (ج ۱ ص ۳۵۳، ۳۵۲) سے، ابو محمد الحارثی کی سند سے نقل کیا ہے۔ (ج ۳ ص ۵۷ حاشیہ)

خوارزمی مذکور غیر موثق ہے یعنی اس کی عدالت (ثقہ وصدوق ہونا) معلوم نہیں ہے۔

ابو محمد عبداللہ بن محمد بن یعقوب الحارثی الاستاذ جھوٹ بولنے میں بھی پورا استاد تھا۔

اس کے بارے میں ابو احمد الحافظ اور حاکم نیشاپوری نے فرمایا: وہ حدیث گھڑتا تھا۔

(کتاب القراءت للبیہقی ص ۱۵۴، دوسرا نسخہ ص ۱۷۸ ح ۳۸۸ وسندہ صحیح)

کسی نے بھی اس کی توثیق نہیں کی۔ خطیب بغدادی اور خلیلی وغیرہما نے اس پر جرح کی۔ حافظ ذہبی نے کہا: وہ عجیب کمزور روایتیں لاتا تھا۔ (دیوان الضعفاء ص ۱۷۶، رقم ۲۲۹۷)

نیز دیکھئے نور العینین (ص ۴۳)

جب محدثین کرام ''متہم'' کا لفظ استعمال کریں، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ محدثین کرام نے اسے کذاب ووضاع قرار دیا ہے۔ اس لفظ کا مطلب اردو والی تہمت لگانا نہیں ہے۔ مثلاً اسماعیل بن یحییٰ الشیبانی کے بارے میں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: ''متهم بالكذب''

(التقریب: ۱۴۵)

حالانکہ ثقہ محدث یزید بن ہارون نے کہا:

''كان إسماعيل الشعيري كذاباً'' اسماعیل الشعیری کذاب تھا۔

(الضعفاء للعقیلی ۹۶/۱ وسندہ صحیح، تہذیب الکمال ۱۵۹/۱، تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۹۳)

اس قسم کی دیگر مثالوں کے لئے التہذیب والتقریب میں کذابین کے حالات پڑھ لیں۔
روایتِ مذکورہ میں حارثی مذکور کا استاد محمد بن ابراہیم بن زیاد الرازی ہے۔
(جامع المسانید واعلاء السنن ج ۳ ص ۴۷، الاجوبۃ الفاضلۃ لعبدالحی لکھنوی ص ۲۱۴)
اس کے بارے میں امام دار قطنی نے گواہی دی:
"دجال یضع الحدیث" وہ دجال تھا، حدیثیں گھڑتا تھا۔
(الضعفاء والمتروکون للدارقطنی: ۴۸۷، لسان المیزان ج ۵ ص ۲۹)
الرازی مذکور کا استاد سلیمان الشاذ کونی ہے۔
(اعلاء السنن ج ۳ ص ۴۷، مسند ابی حنیفہ لعبداللہ بن محمد بن یعقوب الحارثی ص ۱۴۴ ح ۳۷۴)
الشاذ کونی مذکور جمہور محدثین کے نزدیک سخت مجروح ہے بلکہ اسماء الرجال کے مشہور امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ نے فرمایا: "کذاب عدو اللّٰہ ، کان یضع الحدیث"
وہ جھوٹا تھا، اللہ کا دشمن تھا، حدیثیں گھڑتا تھا۔ (کتاب الجرح والتعدیل ۴/۱۱۵، وسندہ صحیح)
مختصر یہ کہ یہ سلسلۂ سند کذابین پر ہی مشتمل ہے لہٰذا یہ روایت امام ابوحنیفہ سے ثابت ہی نہیں ہے۔ کتاب الآثار کا حوالہ، نرا وہم اور غلط ہے۔ یہ روایت کتاب الآثار میں قطعاً موجود نہیں ہے۔ [شہادت، جولائی ۲۰۰۰ء]

رفع یدین کے خلاف ایک نئی روایت: اخبار الفقہاء والمحدثین؟

سوال بعض لوگ رفع یدین کے خلاف ایک کتاب "اخبار الفقہاء والمحدثین" کا حوالہ پیش کر رہے ہیں مثلاً غلام مصطفیٰ نوری بریلوی لکھتے ہیں:
"آیئے ہم آپ کی خدمت میں وہ حدیث پیش کرتے ہیں جس میں صریحاً یہ مذکور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے رکوع والا رفع یدین کرتے تھے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع والا رفع یدین ترک کر دیا اور ابتدا کی رفع یدین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے رہے حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا یہ حدیث صحیح صریح مرفوع ہے۔
آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

امام حافظ ابوعبداللہ محمد بن حارث الخشنی القیروانی متوفی سنہ ۳۶۱ ہجری اپنی کتاب اخبار الفقہاء والمحدثین کے صفحہ ۲۱۴ پر سند صحیح سے مرفوعاً یہ حدیث نقل کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

حدثني عثمان بن محمد قال: قال لي عبيدالله بن يحيى :حدثني عثمان بن سوادة بن عباد عن حفص بن ميسرة عن زيد بن اسلم عن عبدالله بن عمر قال: كنا مع رسول الله ﷺ بمكة نرفع ايدينا في بدء الصلوٰة وفي داخل الصلوٰة عند الركوع فلما هاجر النبي ﷺ إلى المدينة ترك رفع اليدين في داخل الصلوة عند الركوع وثبت على رفع اليدين في بدء الصلوة ... توفي

(اخبار الفقہاء والمحدثین ص ۲۱۴)

ترجمہ: جناب عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ جب ہم رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ میں تھے تو ہم رفع یدین کرتے تھے نماز کی ابتداء میں اور نماز کے اندر رکوع کے وقت اور جب نبی پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے نماز کے اندر رکوع والا رفع یدین چھوڑ دیا اور ابتداء کی رفع یدین پر آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ثابت رہے حتیٰ کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہوگیا۔

ناظرین گرامی قدر: یہ حدیث پاک رفع یدین عندالرکوع کے نسخ میں کتنی واضح ہے۔ پھر بھی اگر کوئی نہ مانے تو اس کی مرضی ہے''

(ترک رفع یدین ص ۶۹۵، ۶۹۱ طبع اول جون ۲۰۰۴ء مکتبہ نوریہ رضویہ گلبرک اے فیصل آباد)

عرض ہے کہ کیا یہ روایت صحیح ہے؟ تحقیق سے جواب دیں۔ جزاکم اللہ خیراً

(حافظ عبدالوحید سلفی ۲/ مارچ ۲۰۰۵ء)

الجواب جناب غلام مصطفیٰ نوری بریلوی صاحب کی پیش کردہ یہ روایت کئی لحاظ سے موضوع اور باطل ہے۔

دلیل نمبر ۱: ''اخبار الفقہاء والمحدثین'' نامی کتاب کے شروع (ص ۵) میں اس کتاب کی

کوئی سند مذکور نہیں ہے اور آخر میں لکھا ہوا ہے: "تم الکتاب والحمدللہ حق حمدہ وصلی اللہ علی محمد وآلہ وکان ذلک فی شعبان من عام ۴۸۳ھ" کتاب مکمل ہوگئی اور سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جیسا کہ اس کی تعریف کا حق ہے اور محمد (ﷺ) اور آپ کی آل پر درود ہو۔ اور یہ (تکمیل) شعبان ۴۸۳ھ میں ہوئی ہے۔ (ص ۲۹۳)

اخبار الفقہاء کے مذکور مصنف محمد بن حارث القیر وانی (متوفی ۳۶۱ھ) کی وفات کے ایک سو بائیس (۱۲۲) سال بعد اس کتاب اخبار الفقہاء کی تکمیل کرنے اور لکھنے والا کون ہے؟ یہ معلوم نہیں! لہٰذا اس کتاب کا محمد بن حارث القیر وانی کی کتاب ہونا ثابت نہیں ہے۔

دلیل نمبر ۲: اس کے راوی عثمان بن محمد کا تعین ثابت نہیں ہے۔ بغیر کسی دلیل کے اس سے عثمان بن محمد بن احمد بن مدرک مراد لینا غلط ہے۔ اس ابن مدرک سے محمد بن حارث القیر وانی کی ملاقات کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

حافظ ذہبی لکھتے ہیں: "عثمان بن محمد بن خشیش القیروانی عن ابن غانم قاضي إفریقیة أظنه، کان کذاباً" عثمان بن محمد بن خشیش القیر وانی، ابن غانم قاضی افریقیہ سے روایت کرتا ہے، میرا خیال ہے، یہ کذاب تھا۔ (المغنی فی الضعفاء ج ۲ ص ۵۰ ت ۴۰۵۹)

عثمان بن محمد: کذاب قیروانی ہے اور محمد بن حارث بھی قیروانی ہے لہٰذا ظاہر یہی ہوتا ہے کہ عثمان بن محمد سے یہاں مراد یہی کذاب ہے۔

یاد رہے کہ عثمان بن محمد بن احمد بن مدرک کا ثقہ ہونا معلوم نہیں ہے۔ محمد بن الحارث القیر وانی کی طرف منسوب کتاب میں لکھا ہوا ہے:

" قال خالد بن سعد: عثمان بن محمد ممن عني بطلب العلم و درس المسائل وعقد الوثائق مع فضله وکان مفتي أهل موضعه توفی ۳۲۰"

خالد بن سعد نے کہا: عثمان بن محمد طلبِ علم پر توجہ دینے والوں میں سے ہے، اس نے مسائل پڑھائے اور فضیلت کے ساتھ دستاویزیں لکھیں۔ وہ اپنے موضع (علاقے) کا مفتی تھا، ۳۲۰ھ کو فوت ہوا۔ (اخبار الفقہاء والمحدثین ص ۲۱۶)

اس عبارت میں توثیق کا نام ونشان نہیں ہے۔

غلام مصطفیٰ نوری بریلوی نے اس عبارت کا ترجمہ درج ذیل لکھا ہے:

''جناب خالد بن سعد نے فرمایا کہ عثمان بن محمد ان میں سے ہے جنہوں نے مجھ سے علم حاصل کیا ہے اور مسائل کا درس لیا ہے اور یہ پختہ عقد والے ہیں اور صاحبِ فضیلت ہیں اور اپنے موضع کے مفتی تھے۔'' (ترک رفع یدین ص ۴۹۳) !!

دلیل نمبر۳: عثمان بن سوادہ بن عباد کے حالات ''اخبار الفقہاء والمحدثین'' کے علاوہ کسی کتاب میں نہیں ملے۔ اخبار الفقہاء میں لکھا ہوا ہے:

''قال عثمان بن محمد قال عبیداللّٰہ بن یحي: کان عثمان بن سوادة ثقة مقبولاً عند القضاۃ والحکام....''

چونکہ عثمان بن محمد مجروح یا مجہول ہے لہٰذا عبیداللہ بن یحییٰ سے یہ توثیق ثابت نہیں ہے۔

نتیجہ: عثمان بن سوادہ مجہول الحال ہے اس کی پیدائش اور وفات بھی نامعلوم ہے۔

دلیل نمبر۴: عثمان بن سوادہ کی حفص بن میسرہ سے ملاقات اور معاصرت ثابت نہیں ہے۔

حفص کی وفات ۱۸۱ھ ہے۔

دلیل نمبر۵: محمد بن حارث کی کتابوں میں ''اخبار القضاۃ والمحدثین'' کا نام تو ملتا ہے مگر ''اخبار الفقہاء والمحدثین'' کا نام نہیں ملتا۔

دیکھئے الاکمال لابن ماکولا (۲۶۱/۳) الانساب للسمعانی (۳۷۲/۲)

ہمارے اس دور کے معاصرین میں سے عمر رضا کحالہ نے ''اخبار الفقہاء والمحدثین'' کا ذکر کیا ہے۔ (معجم المؤلفین ۲۰۴/۳)

اسی طرح معاصر خیر الدین الزرکلی نے بھی اس کتاب کا ذکر کیا ہے۔ (الاعلام ۷۵/۶)

جدید دور کے یہ حوالے اس کی قطعی دلیل نہیں ہیں کہ یہ کتاب محمد بن حارث کی ہی ہے۔

قدیم علماء نے اس کتاب کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

دلیل نمبر۶: مخالفین رفع یدین جس روایت سے دلیل پکڑ رہے ہیں اس کے شروع میں

لکھا ہوا ہے: ''وكان يحدث بحديث رواه مسندًا في رفع اليدين وهو من غرائب الحديث وأراه من شواذها '' اور وہ رفع یدین کے بارے میں ایک حدیث سند سے بیان کرتا تھا۔ یہ غریب حدیثوں میں سے ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ شاذ روایتوں میں سے ہے۔ (اخبار الفقہاء والمحدثین ص ۲۱۴)

یہ عام طالب علموں کو بھی معلوم ہے کہ شاذ روایت ضعیف ہوتی ہے۔

غلام مصطفیٰ نوری صاحب نے ''کمال دیانت'' سے کام لیتے ہوئے ''من شواذها'' کی جرح کو چھپالیا ہے۔

ان دلائل کا تعلق سند کے ساتھ ہے۔ اب متن کا جائزہ پیشِ خدمت ہے:

دلیل نمبر ۷: اس روایت کے متن میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے کے بعد رکوع والا رفع یدین چھوڑ دیا۔ جبکہ صحیح و مستند احادیث سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ مدینہ منورہ میں رفع یدین کرتے تھے۔

ابو قلابہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ جب نماز پڑھتے تو تکبیر کے ساتھ رفع یدین کرتے اور جب رکوع کرتے تو رفع یدین کرتے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو رفع یدین کرتے اور فرماتے کہ رسول اللہ ﷺ اسی طرح کرتے تھے۔

(صحیح مسلم ۱/۱۶۸ ح ۳۹۱ و صحیح بخاری ۱/۱۰۲ ح ۷۳۷)

مالک بن حویرث اللیثی رضی اللہ عنہ اس وقت رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے تھے جب آپ ﷺ (مدینہ منورہ میں) غزوۂ تبوک کی تیاری کر رہے تھے۔

(دیکھئے فتح الباری ج ۲ ص ۱۱۰ ح ۶۲۸)

وائل بن حجر الحضرمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے نبی ﷺ کو دیکھا آپ شروع نماز، رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد رفع یدین کرتے تھے۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۷۳ ح ۴۰۱)

عینی حنفی لکھتے ہیں: ''وائل بن حجر أسلم في المدينة في سنة تسع من الهجرة '' اور وائل بن حجر مدینہ میں نو (۹) ہجری کو مسلمان ہوئے تھے۔ (عمدۃ القاری ج ۵ ص ۲۷۴)

۹ھ میں جو وفود نبی ﷺ کے پاس آئے تھے، حافظ ابن کثیر الدمشقی نے ان میں وائل رضی اللہ عنہ کی آمد کا ذکر کیا ہے۔ (البدایہ والنہایہ ج۵ ص۷۱)

اس کے بعد (اگلے سال ۱۰ھ) آپ دوبارہ آئے تھے، اس سال بھی آپ نے رفع یدین کا ہی مشاہدہ فرمایا تھا۔ (سنن ابی داود: ۷۲۷، صحیح ابن حبان، الاحسان ۳/۱۶۹ ح ۱۸۵۷)

معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے مدینہ منورہ میں رفع یدین نہیں چھوڑا بلکہ آپ ﷺ مدینہ میں بھی رکوع سے پہلے اور بعد والا رفع یدین کرتے رہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اخبار الفقہاء والی روایت موضوع ہے۔

دلیل نمبر ۸: سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ شروع نماز، رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد رفع یدین کرتے تھے۔ (صحیح ابن خزیمہ ۱/۳۴۴ ح ۶۹۴، ۶۹۵ وسندہ حسن)

یہ بات عام طالب علموں کو بھی معلوم ہے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے پاس مدینہ منورہ میں تشریف لائے تھے وہ آپ ﷺ کے آخری چار سالوں میں آپ کے ساتھ رہے ہیں۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد والا رفع یدین کرتے تھے۔ (جزء رفع الیدین للبخاری بتحقیقی: ۲۲)

اس روایتِ مذکورہ میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے شاگرد اور امام ابوحنیفہ کے استاد عطاء بن ابی رباح بھی رکوع سے پہلے اور بعد والا رفع یدین کرتے تھے۔ (جزء رفع الیدین: ۶۲ وسندہ حسن)

معلوم ہوا کہ مدینہ منورہ میں رکوع والا رفع یدین متروک یا منسوخ بالکل نہیں ہوا تھا لہٰذا "اخبار الفقہاء" والی روایت جھوٹی روایت ہے۔

دلیل نمبر ۹: مشہور تابعی نافع رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما شروع نماز، رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد اور دو رکعتیں پڑھ کر اٹھتے وقت (چاروں مقامات پر) رفع یدین کرتے تھے۔ (صحیح بخاری ۱/۱۰۲ ح ۷۳۹)

یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کے مطابق رفع یدین منسوخ

ہو جائے اور پھر بھی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما یہ رفع یدین کرتے رہیں ۔ آپ رضی اللہ عنہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں سب سے آگے تھے۔

دلیل نمبر ۱۰: نافع فرماتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جس شخص کو دیکھتے کہ رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد رفع یدین نہیں کرتا تو اسے کنکریاں مارتے تھے۔

(جزء رفع الیدین: ۱۵ و سندہ صحیح)

علامہ نووی اس روایت کے بارے میں لکھتے ہیں: " **باسناده الصحيح عن نافع**" نافع تک اس کی سند صحیح ہے۔ (المجموع شرح المہذب ج ۳ ص ۴۰۵)

یہ کس طرح ممکن ہے کہ رفع یدین بروایت ابن عمر منسوخ ہو جائے پھر اس کی "منسوخیت" کے بعد بھی سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اس نامعلوم و مجہول جاہل کو ماریں جو رفع یدین نہیں کرتا تھا۔ امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کسی ایک صحابی سے رفع یدین کا نہ کرنا ثابت نہیں ہے۔ (دیکھئے جزء رفع الیدین ۴۰، ۷۶، والمجموع للنووی ۳/ ۴۰۵)

معلوم ہوا کہ رفع یدین نہ کرنے والا آدمی، صحابہ کرام میں سے نہیں تھا بلکہ کوئی مجہول و نامعلوم شخص ہے۔

خلاصۃ التحقیق: ان دلائل سابقہ سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ "اخبار الفقہاء والمحدثین" والی روایت موضوع اور باطل ہے لہٰذا غلام مصطفیٰ نوری بریلوی صاحب کا اسے "حدیث صحیح" کہنا جھوٹ اور مردود ہے۔ **وما علينا إلا البلاغ** (۲۱/ محرم ۱۴۲۶ھ)

[الحدیث: ۱۱]

رفع یدین کے خلاف ایک بے اصل روایت اور طاہر القادری صاحب

سوال جناب حافظ صاحب! بندہ آپ کے "الحدیث" کا مطالعہ کرتا ہے الحمدللہ آپ خوب محنت شاقہ سے اس کا اصدار کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس کو قائم و دائم رکھے۔ آمین پچھلے دنوں ہمارے ایک محسن ڈاکٹر طاہر حسین صاحب جو ہمارے قریب ہی ٹیکسٹائل یونیورسٹی میں لیکچرار ہیں، انھوں نے بتایا کہ طاہر القادری کی کتاب انٹرنیٹ پر انھوں نے دی

ہے۔جس کا نام منہاج السوی انھوں نے رکھا ہے اور اس کے اندر رفع الیدین کی احادیث کو صحیحین اور دوسری کتب سے توڑ مروڑ کر ذکر کیا ہے تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ ان کا جواب مطلوب ہے تو الحمدللہ کوشش کرنے کے بعد آپ کی کتاب نور العینین مل گئی جس میں مطلوبہ جواب بھی حاصل ہو گئے مگر ایک دلیل جو انھوں نے ۱۱۴ نمبر پر ذکر کی ہے جس کا متن یہ ہے:

" عن ابن عباس رضي الله عنهما أنه قال :إن العشرة الذين بشرلهم رسول الله ﷺ بالجنة ما كانوا يرفعون أيديهم إلا لإفتتاح الصلاة، قال السّمرقندي: و خلاف هؤلاء الصحابة قبيح "

اس کی تخریج انھوں نے کی ہے۔ اخرجہ السمرقندی فی تحفۃ الفقہاء (۱/۱۳۲، ۱۳۳) والکاسانی فی بدائع الصنائع (۱/۲۰۷) والعینی فی عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری (۵/۲۷۲)

تو نور العینین میں تلاش کرنے سے اس کا جواب نہیں مل سکا لہٰذا معذرت سے آپ کو تکلیف دی جاتی ہے کہ اس اثر کی پوری تحقیق کر کے بندہ کو ارسال کر دیں۔ جوابی لفافہ ساتھ ہے اور اگر پہلے یہ آپ کی نظر سے نہیں گزری تو الحدیث میں بھی اس کو تحریر کریں تا کہ باقی قارئین الحدیث بھی اس سے فائدہ اٹھائیں۔ جزاکم اللہ خیراً في الدنيا والآخرة .

(سید عبدالحلیم چک نمبر ۲۰۳ ر۔ب مانانوالہ فیصل آباد)

الجواب مشہور ثقہ امام عبداللہ بن المبارک المروزی رحمہ اللہ نے فرمایا:

"الإسناد من الدين ولولا الإسناد لقال من شاء ما شاء"

اسناد دین میں سے ہیں (اور) اگر سند نہ ہوتی تو جس کے جو دل میں آتا کہتا۔

(صحیح مسلم، ترقیم دار السلام: ۳۲، ماہنامہ منہاج القرآن لاہور ج ۲۰ شمارہ: ۱۱، نومبر ۲۰۰۶ء ص ۲۲)

اس سنہری قول سے معلوم ہوا کہ بے سند بات مردود ہوتی ہے۔ ادارہ منہاج القرآن کے بانی محمد طاہر القادری صاحب اس کی تشریح میں "فرماتے" ہیں:

"پس روایت حدیث، علم حدیث، علم تفسیر اور مکمل دین کا مدار اسناد پر ہے۔ سند کے بغیر کوئی چیز قبول نہ کی جاتی تھی۔" (ماہنامہ منہاج القرآن ج ۲۰ شمارہ: ۱۱ ص ۲۳)

اس تمہید کے بعد عرض ہے کہ علاء الدین محمد بن احمد بن ابی احمد السمر قندی نے تحفۃ الفقہاء نامی کتاب میں لکھا ہے: " والصحيح مذهبنا لما روي عن ابن عباس أنه قال: إن العشرة الذين بشر لهم رسول الله ﷺ بالجنة ما كانوا يرفعون أيديهم إلا لا فتتاح الصلوٰة .

قال السمرقندي: وخلاف هؤلاء الصحابة قبيح "

اور صحیح ہمارا (حنفی) مذہب ہے، اس وجہ سے کہ جو ابن عباس (رضی اللہ عنہ) سے روایت کیا گیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: بے شک عشرہ مبشرہ جنھیں رسول اللہ ﷺ نے جنت کی خوش خبری دی، وہ شروع نماز کے سوا رفع یدین نہیں کرتے تھے۔ سمرقندی نے کہا: اور ان صحابہ کی مخالفت بُری (حرکت) ہے۔ (ج ۱ص ۱۳۲، ۱۳۳، دوسرا نسخہ ص ۶۶، ۶۷)

سمرقندی کے بعد تقریباً یہی عبارت علاء الدین ابو بکر بن مسعود الکاسانی (متوفی ۵۸۷ھ) نے بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع (ج ۱ص ۲۰۷) میں اور بدر الدین محمود بن احمد العینی (متوفی ۸۵۵ھ) نے بحوالہ بدائع الصنائع اپنی کتاب عمدۃ القاری (ج ۵ص ۲۷۲) میں نقل کر رکھی ہے۔ ملا کاسانی نے بدائع الصنائع کے شروع میں یہ اشارہ کر دیا ہے کہ انھوں نے اپنے استاد محمد بن احمد بن ابی احمد السمر قندی سے لے کر اپنی کتاب مرتب کی ہے۔ (ج ۱ص ۲)

معلوم ہوا کہ اس روایت کا دارومدار سمرقندی مذکور پر ہے۔ سمرقندی صاحب ۵۵۳ ہجری میں فوت ہوئے۔ دیکھئے معجم المؤلفین (ج ۳ص ۶۷ ت ۱۱۷۵۰)

یعنی وہ پانچویں یا چھٹی صدی ہجری میں پیدا ہوئے تھے۔ فقیر محمد جہلمی تقلیدی نے انھیں حدیقۂ ششم (چھٹی صدی کے فقہاء وعلماء کے بیان) میں ذکر کیا ہے۔ (حدائق الحنفیہ ص ۲۶۷)

سمرقندی مذکور سے لے کر صدیوں پہلے ۶۸ ھ میں فوت ہونے والے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ تک کوئی سند اور حوالہ موجود نہیں ہے لہٰذا یہ روایت بے سند اور بے حوالہ ہونے کی وجہ سے مردود ہے۔

تنبیہ بلیغ: ایسی بے سند و بے حوالہ روایت کو "أخرجه السمرقندي في تحفة الفقهاء"

إلخ ،اس کی تخریج سمرقندی نے تحفۃ الفقہاء میں کی ہے الخ، کہہ کر سادہ لوح عوام کو دھوکا نہیں دینا چاہئے۔لوگ تو یہ سمجھیں گے کہ سمرقندی کوئی بہت بڑا محدث ہوگا جس نے یہ روایت اپنی سند کے ساتھ اپنی کتاب تحفۃ الفقہاء میں نقل کر رکھی ہے۔حالانکہ سمرقندی کا محدث ہونا ہی ثابت نہیں ہے بلکہ وہ ایک تقلیدی فقیہ تھا جس نے یہ روایت بغیر کسی سند اور حوالے کے ''رُوِيَ'' کے گول مول لفظ سے لکھ رکھی ہے۔اب عوام میں کس کے پاس وقت ہے کہ اصل کتاب کھول کر تحقیق کرتا پھرے۔!

عام طور پر غیر ثابت اور ضعیف روایت کے لئے صیغۂ تمریض ''رُوِيَ'' وغیرہ کے الفاظ بیان کئے جاتے ہیں، دیکھئے مقدمۃ ابن الصلاح مع شرح العراقی (ص ۱۳۶ نوع ۲۲)

لہٰذا جس روایت کی کوئی سند سرے سے موجود ہی نہ ہو اور پھر بعض الناس اسے ''رُوِيَ'' وغیرہ الفاظ سے بیان کریں تو ایسی روایت موضوع، بے اصل اور مردود ہی ہوتی ہے۔

سمرقندی و کاسانی کی پیش کردہ یہ بے سند و بے حوالہ روایت متن اور اصولِ روایت واصولِ درایت کے لحاظ سے بھی مردود ہے۔

دلیل اول: امام ابوبکر بن ابی شیبہ رحمہ اللہ (متوفی ۲۳۵ھ) فرماتے ہیں:

" حدثنا هشيم قال :أخبرنا أبو جمرة قال :رأيت ابن عباس يرفع يديه إذا افتتح الصلوٰة وإذا ركع وإذا رفع رأسه من الركوع "

ہمیں ہشیم نے حدیث بیان کی، کہا: ہمیں ابو جمرہ نے خبر دی، کہا: میں نے ابن عباس (رضی اللہ عنہ) کو دیکھا آپ شروع نماز اور رکوع کرتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع یدین کرتے تھے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱ ص ۲۳۵ ح ۲۴۳۱)

اس روایت کی سند حسن لذاتہ یا صحیح ہے۔ معلوم ہوا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بذاتِ خود رکوع سے پہلے اور بعد والا رفع یدین کرتے تھے لہٰذا یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ انھوں نے رفع یدین کے خلاف کوئی روایت بیان کر رکھی ہو۔من ادعى خلافه فعليه أن يأتي بالدليل .

دلیل دوم: عشرۂ مبشرہ میں سے اول صحابی سیدنا ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ رکوع سے پہلے اور

رکوع کے بعد رفع یدین کرتے تھے۔ دیکھئے امام بیہقی کی کتاب السنن الکبریٰ (ج ۲ ص ۷۳)
وقال: "رواته ثقات" اس کے راوی ثقہ (قابلِ اعتماد) ہیں۔
تنبیہ: اس روایت کی سند بالکل صحیح ہے اور اس پر بعض الناس کی جرح مردود ہے۔ دیکھئے میری کتاب نور العینین فی مسئلۃ رفع الیدین (ص ۱۱۹ تا ۱۲۱)
دلیل سوم: سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے بھی رکوع سے پہلے اور بعد والا رفع یدین مروی ہے۔ دیکھئے نصب الرایہ (ج ۱ ص ۴۱۶) ومسند الفاروق لابن کثیر (ج ۱ ص ۱۶۵، ۱۶۶) وشرح سنن الترمذی لابن سید الناس (قلمی ج ۲ ص ۲۱۷) وسندہ حسن، دیکھئے نور العینین (ص ۱۹۵ تا ۲۰۴) اس روایت کی سند حسن ہے اور یہ روایت شواہد کے ساتھ صحیح لغیرہ ہے۔
دلیل چہارم: سیدنا ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر عشرۂ مبشرہ میں سے کسی ایک صحابی سے بھی رکوع سے پہلے اور بعد والے رفع یدین کا ترک، ممانعت یا منسوخیت قطعاً ثابت نہیں ہے۔
تنبیہ: طاہر القادری صاحب نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ترک رفع یدین کی تین روایات لکھی ہیں۔ (المنہاج السوی طبع چہارم ص ۲۲۸، ۲۲۹ ح ۲۵۸، ۲۶۰، ۲۶۱)
یہ تینوں روایات اُصولِ حدیث کی رُو سے ضعیف ہیں۔ دیکھئے نور العینین (ص ۲۳۱، ۲۳۴، ۲۳۶)

ان میں سے پہلی روایت کے راوی محمد بن جابر پر خود امام دارقطنی وامام بیہقی نے جرح کر رکھی ہے۔ اہلِ سنت کے جلیل القدر امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اس روایت کے بارے میں فرماتے ہیں: "هذا حديث منكر" یہ حدیث منکر ہے۔

(المسائل: روایۃ عبداللہ بن احمد ج ۱ ص ۲۴۲ ت ۳۲۷)

ابھی تک ماہنامہ الحدیث حضرو اور نور العینین کی محولہ تنقید و جرح کا کوئی جواب ہمارے پاس نہیں آیا۔ والحمد للہ
خلاصۃ التحقیق: محمد طاہر القادری صاحب کی مسئولہ روایتِ مذکورہ بے سند اور بے حوالہ ہونے کی وجہ سے بے اصل، باطل اور مردود ہے۔ وما علینا إلا البلاغ

(۹/ فروری ۲۰۰۷ء) [الحدیث: ۳۵]

سجدۂ تلاوت کرتے وقت رفع یدین کا ثبوت

سوال کیا سجدۂ تلاوت کرتے وقت تکبیر کے ساتھ رفع یدین کا ثبوت ہے؟ وضاحت فرمادیں۔ جزاک اللہ خیراً (طاہر نذیر، جلال بلگن گوجرانوالہ)

الجواب سجدۂ تلاوت میں تکبیر کہنا صریح حدیث سے ثابت ہے۔

(سنن ابی داود ح ۱۴۱۳، السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۲ ص ۳۲۵، مصنف عبدالرزاق ج ۳ ص ۳۴۳ ح ۵۹۱۱)

اس کی سند عبداللہ العمری عن نافع کی وجہ سے حسن ہے۔

تفصیل کے لئے دیکھئے نیل المقصود (ح ۱۱۵۶) اور میزان الاعتدال (ج ۲ ص ۴۶۵)

جب تکبیرات ثابت ہوگئیں تو درج بالا حدیث کی رُو سے رفع یدین بھی ثابت ہوگیا۔

لہٰذا راجح یہی ہے کہ سجدۂ تلاوت کی تکبیر کے ساتھ رفع یدین بھی کرنا چاہئے۔

درج بالا حدیث سے مراد وہ حدیث ہے، جس میں آیا ہے، اور آپ (ﷺ) ہر تکبیر پر رفع یدین کرتے تھے جو تکبیر آپ رکوع سے پہلے کہتے تھے حتیٰ کہ آپ کی نماز ختم ہو جاتی۔

(سنن ابی داود: ۷۲۲، وھو حدیث صحیح)

مُدرکِ رکوع کی رکعت کا حکم

سوال کیا مدرکِ رکوع کی رکعت ہو جاتی ہے؟ مدلل جواب دیں۔ جزاکم اللہ خیراً

(ڈاکٹر ابو جابر عبداللہ دامانوی، کراچی)

الجواب اس مسئلے میں علماء کے دو موقف ہیں:

اول: یہ رکعت ہو جاتی ہے۔

دوم: یہ رکعت نہیں ہوتی۔

اول الذکر علماء کے دلائل کا مختصر و جامع جائزہ درج ذیل ہے:

۱) ابو داود (۸۹۳) ابن خزیمہ (۱۶۲۲، وأعله ولم یصححه) حاکم (۱/۲۱۶، ۲۷۳، ۲۷۶) دار قطنی (۱/۳۴۷ ح ۱۲۹۹) اور بیہقی (۲/۸۹) نے

"يحيى بن أبي سليمان عن زيد بن أبي عتاب وسعيد المقبري عن أبي هريرة"
کی سند سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إذا جئتم ونحن سجود فاسجدوا ولا تعدوا شيئًا ومن أدرك الركعة فقد أدرك الصلوٰة))

جب تم آؤ اور ہم سجدے میں ہوں تو سجدہ کرو اور اسے کچھ بھی نہ شمار کرو اور جس نے رکعت پالی تو اس نے نماز پالی۔

اس روایت کے راوی یحییٰ بن ابی سلیمان کے بارے میں امام بخاری نے فرمایا:

"منكر الحديث" (جزء القراءۃ:۲۳۹)

ابن خزیمہ نے فرمایا: "دل اس سند پر مطمئن نہیں ہے کیونکہ میں یحییٰ بن ابی سلیمان کو جرح یا تعدیل کی رُو سے نہیں جانتا" (صحیح ابن خزیمہ ۳/۵۷، ۵۸ و نصر الباری ص۲۶۲)

یحییٰ مذکور کو جمہور محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے لہٰذا حاکم کا اس کی روایت کو صحیح کہنا مردود ہے۔

تنبیہ: یہ روایت مدرکِ رکوع کی دلیل نہیں ہے بلکہ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ جو رکعت پالے اس نے نماز پالی۔

۲) بیہقی نے "عن عبدالعزيز بن رفيع عن رجل عن النبي ﷺ" کی سند سے روایت کیا ہے کہ

((إذا جئتم والإمام راكع فاركعوا وإن كان ساجدًا فاسجدوا ولا تعتدوا بالسجود إذا لم يكن معه الركوع))

جب تم آؤ اور امام رکوع میں ہو تو رکوع کرو اور جب سجدے میں ہو تو سجدہ کرو اور سجدے شمار نہ کرو جب تک ان کے ساتھ رکوع نہ ہو۔ (۸۹/۲)

اس روایت میں "رجل" (آدمی) مجہول ہے اور اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ یہ صحابی ہے۔

تنبیہ: بیہقی کی ایک روایت (۲۹۶/۲) میں "سفيان (الثوري) عن عبدالعزيز بن رفيع عن شيخ من الأنصار" کی سند سے ان الفاظ جیسا مفہوم مروی ہے۔ اس روایت

کی سند دو وجہ سے ضعیف ہے:

اول: سفیان ثوری مدلس ہیں اور روایت معنعن ہے۔

دوم: شیخ من الانصار مجہول ہے اور یہ کہنا کہ "والصحیح أنه صحابي" غلط ہے۔

۳) دار قطنی (۱/۳۴۶ ح ۱۲۹۸) بخاری (جزء القراءۃ: ۲۰۸) ابن خزیمہ (۱۵۹۵) بیہقی (۸۹/۲) عقیلی (۳۹۸/۴) اور ابن عدی (۲۶۸۴/۷) وغیرہم نے

"یحیی بن حمید عن قرة عن ابن شهاب عن أبي سلمة عن أبي هريرة"

کی سند سے روایت کیا کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

((من أدرك ركعة من الصلوٰة فقد أدركها قبل أن يقيم الإمام صلبه))

جس نے امام کے پیٹھ اٹھانے سے پہلے نماز کی رکعت پالی تو اس نے نماز پالی۔

اس روایت کی سند قرہ بن عبدالرحمٰن بن حیویل کی وجہ سے ضعیف ہے۔ قرہ جمہور محدثین کے نزدیک ضعیف ہے۔ اس روایت کے بارے میں شیخ امین اللہ پشاوری فرماتے ہیں:

" وسنده ضعيف " اور اس کی سند ضعیف ہے۔ (فتاویٰ الدین الخالص ج ۴ ص ۲۱۸)

اس روایت کی ایک دوسری سند ہے جس میں متہم راوی ہے۔ [ایضاً ۲۱۸/۴]

لہٰذا یہ سند سخت ضعیف و مردود ہے۔

٤) بیہقی (۹۰/۲) نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ "من لم يدرك الإمام راكعًا لم يدرك تلك الركعة" جس نے امام کو رکوع میں نہ پایا اس نے رکعت نہیں پائی۔

اس روایت کی سند میں علی بن عاصم جمہور محدثین کے نزدیک ضعیف و مجروح ہے لہٰذا اس روایت کو "وإسناده صحيح" کہنا غلط ہے۔ اس روایت کی دوسری سند میں ابو اسحاق السبیعی مدلس ہیں لہٰذا وہ سند بھی ضعیف ہے۔ جب تک سند صحیح و حسن نہ ہو تو "ورجاله موثقون" کہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

۵) ابن ابی شیبہ (۹۹/۱) طحاوی (۲۲۳/۱) اور بیہقی (۹۰/۲) نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

سے روایت کیا کہ وہ مدرکِ رکوع کو مدرکِ رکعت سمجھتے تھے۔

اس کی سند صحیح ہے لیکن یہ صحابی کا فتویٰ ہے۔

٦) ابن ابی شیبہ (۲۴۳/۱) نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ان کا فتویٰ نقل کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ مدرکِ رکوع کو مدرکِ رکعت سمجھتے تھے۔

اس روایت کی سند حفص اور ابن جریج کی تدلیس کی وجہ سے ضعیف ہے۔ السنن الکبریٰ للبیہقی (۹۰/۲) میں اس کا ایک ضعیف شاہد بھی ہے۔ اس میں ولید بن مسلم ہیں جو کہ تدلیسِ تسویہ بھی کرتے تھے اور سماع مسلسل کی تصریح نہیں ہے۔

٧) بیہقی (۹۰/۲) نے زید بن ثابت اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ ''من أدرك الركعة قبل أن يرفع الإمام رأسه فقد أدرك السجدة'' جس نے امام کے سر اٹھانے سے پہلے رکوع پالیا تو اس نے سجدہ پالیا یعنی رکعت پالی۔

اس روایت کی سند انقطاع کی وجہ سے ضعیف ہے۔ امام مالک نے یہ نہیں بتایا کہ انھیں یہ روایت کس ذریعے سے پہنچی ہے۔ اس موقوف روایت کی دیگر سندیں بھی ہیں۔

ان آثار کے مقابلے میں امام بخاری فرماتے ہیں:

''حدثنا عبيد بن يعيش قال: حدثنا يونس قال: حدثنا (ابن) إسحاق قال: أخبرني الأعرج قال سمعت أباهريرة رضي الله عنه يقول: لايجزئك إلا أن تدرك الإمام قائمًا قبل أن تركع'' ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تیری رکعت اس وقت تک جائز نہیں ہوتی جب تک تو رکوع سے پہلے امام کو حالتِ قیام میں نہ پالے۔

(جزء القراءة: ۱۳۲ وسندہ حسن، نصر الباری ص ۱۸۲، ۱۸۳)

ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا: '' لا يركع أحد كم حتّٰى يقرأ بأم القرآن'' سورۂ فاتحہ پڑھ لینے کے بغیر تم میں سے کوئی بھی رکوع نہ کرے۔ (جزء القراءة: ۱۳۳ وسندہ صحیح)

معلوم ہوا کہ اس مسئلے میں صحابۂ کرام کے درمیان اختلاف ہے۔ جب اختلاف ہو جائے تو کتاب وسنت کی طرف رجوع کرنے کا حکم ہے۔

۸) ابن ابی شیبہ (۱/۲۵۶ ح ۲۶۳۱) نے عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ وہ رکوع میں چلتے چلتے صف میں شامل ہو جاتے تھے۔

اس روایت کی سند ابن تمیم کی وجہ سے ضعیف ہے۔

تنبیہ: اس روایت کا مدرکِ رکوع سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۹) بیہقی (۲/۹۰) نے ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ وہ رکوع میں چلتے ہوئے صف میں شامل ہو گئے۔ یہ سند تدلیسِ تسویہ کرنے والے ولید بن مسلم کی تدلیس اور ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن الحارث کے انقطاع کی وجہ سے ضعیف ہے۔ یہ کہنا کہ انھوں نے زید بن ثابت سے یہ روایت لی ہے، بے دلیل ہے۔

۱۰) مسند احمد (۵/۴۲ ح ۲۰۴۳۵) میں آیا ہے کہ ابوبکرہ رضی اللہ عنہ رکعت ملنے کے لئے چل کر آئے تھے۔ اس روایت کی سند بشار بن عبدالملک الخیاط المزنی کی وجہ سے ضعیف ہے۔ اسے ''سندہ حسن'' کہنا غلط ہے۔ بشار کو ابن معین نے ضعیف کہا اور سند کے اتصال میں بھی نظر ہے۔

۱۱) بعض لوگ کہتے ہیں کہ سعید بن المسیب، میمون اور شعبی (تابعین) اس کے قائل تھے کہ مدرکِ رکوع مدرکِ رکعت ہوتا ہے۔ (دیکھئے مصنف ابن ابی شیبہ ۱/۲۴۳، ۲۴۴)

تابعین کے یہ آثار سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ وغیرہ کے آثار اور مرفوع احادیث کے عموم کے خلاف ہونے کی وجہ سے مردود ہیں۔

۱۲) طبرانی نے سیدنا علی بن ابی طالب اور سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ جو رکوع نہ پائے تو وہ سجدہ شمار نہ کرے۔

یہ آثار باسند صحیح ثابت نہیں ہیں۔

۱۳) ایک روایت میں آیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لا تبادروني بركوع ولا بسجود فإنه مهما أسبقكم به إذا ركعت تدركوني به إذا رفعت وإني قد بدنت))

مجھ سے پہلے رکوع اور سجدے نہ کرو۔ پس بے شک میں جتنا تم سے پہلے رکوع کروں گا تو تم مجھے اس کے ساتھ پالوگے جب میں سر اٹھاؤں گا، میرا بدن بھاری ہوگیا ہے۔ (سنن ابی داود: ۶۱۹ وسندہ حسن)

یہ روایت مدرکِ رکوع کی دلیل نہیں ہے مگر عینی حنفی نے اسے اپنے دلائل میں پیش کردیا ہے۔ دیکھئے عمدۃ القاری (۱۵۳/۳)!

۱۴) ابن ابی شیبہ (۲۴۲/۱) نے عروہ بن الزبیر (تابعی) اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ وہ دونوں جب امام کو رکوع میں پاتے تو دو تکبیریں کہتے، ایک تکبیرِ افتتاح دوسری تکبیرِ رکوع۔ یہ روایت زہری کی تدلیس کی وجہ سے ضعیف ہے اور ادراکِ رکوع کی دلیل نہیں ہے۔

۱۵) ابن ابی شیبہ (۲۵۵/۱) نے محمد بن سیرین سے نقل کیا کہ ابوعبیدہ (بن عبداللہ بن مسعود) آئے اور لوگ رکوع میں تھے تو وہ چل کر صف میں شامل ہوگئے اور بیان کیا کہ ان کے والد نے ایسا ہی کیا تھا۔

یہ روایت منقطع ہے کیونکہ ابوعبیدہ نے اپنے والد سے کچھ نہیں سنا۔

۱۶) ایک روایت میں آیا ہے کہ "عبدالعزیز بن رفیع عن ابن مغفل المزني قال قال النبي ﷺ: ((ولا تعتدوا بالسجود إذا لم تدركوا الركعة))

(مسائل احمد واسحاق ۱۲۷/۱، الصحیحۃ: ۱۱۸۸)

اس روایت میں اگر ابن مغفل سے مراد عبداللہ بن مغفل المزنی رضی اللہ عنہ ہیں تو ان سے عبدالعزیز بن رفیع کی ملاقات کا کوئی ثبوت نہیں ہے اور اگر شداد بن معقل ہیں تو یہ سند منقطع ہے۔

خلاصہ یہ کہ اس سلسلے کی تمام مرفوع روایات بلحاظِ سند ضعیف ہیں۔

رہے آثارِ صحابہ تو ان میں اختلاف ہے۔

دوم: جو علماء کہتے ہیں کہ مدرکِ رکوع کی رکعت نہیں ہوتی کیونکہ اس کے دو فرض رہ گئے ہیں:

① قیام ② سورۂ فاتحہ

ان لوگوں کا قول حق بجانب ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((لا تفعلوا إلا بأم القرآن فإنه لا صلوٰة لمن لم يقرأ بها)) سورۂ فاتحہ کے سوا کچھ نہ پڑھو کیونکہ جو اُسے نہیں پڑھتا تو اس کی نماز نہیں ہوتی۔ (کتاب القراءۃ للبیہقی: ۲۲۱ وسندہ حسن، وصححہ البیہقی / نافع بن محمود ثقہ وثقہ الدارقطنی والبیہقی وابن حبان وابن حزم والذہبی وغیرہم)

امام بخاری اور بہت سے جلیل القدر علماء اس کے قائل تھے کہ مدرکِ رکوع کی رکعت نہیں ہوتی۔ تفصیل کے لئے دیکھئے مولانا محمد یونس قریشی رحمہ اللہ کی کتاب ''اتمام الخشوع باحکام مدرک الرکوع'' اور مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ کا رسالہ ''رکوع میں ملنے والے کی رکعت، جانبین کے دلائل کا جائزہ'' وما علینا إلا البلاغ (۲۶/رجب ۱۴۲۷ھ)

[الحدیث: ۳۰]

سوال کیا امام کے ساتھ رکوع میں ملنے سے رکعت ہو جاتی ہے؟ (ایک سائل)

الجواب جو شخص رکوع میں مل جائے اور سورۂ فاتحہ نہ پڑھ سکے تو اس کی وہ رکعت نہیں ہوتی کیونکہ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جہری نماز کے مقتدیوں کو فرمایا: ((لا تفعلوا إلا بأم القرآن فإنه لا صلوٰة لمن لم يقراء بها))

تم سورۂ فاتحہ کے علاوہ اور کچھ نہ پڑھو، کیونکہ یقیناً جو شخص سورۂ فاتحہ نہیں پڑھتا اس کی نماز نہیں ہوتی۔ (کتاب القراءت للبیہقی ص ۶۴ ح ۱۲۱، وقال: ھذا اسناد صحیح)

تفصیل کے لئے دیکھئے ماہنامہ شہادت (ج ۶ شمارہ ۱۱، نومبر ۱۹۹۹ء ص ۳۳)

[شہادت، جنوری ۲۰۰۰ء]

سوال جس نے امام کے ساتھ رکوع پا لیا تو اس نے رکعت پا لی، یہ روایت ترمذی میں ہے۔ بعض لوگ اس کو ضعیف اور بعض صحیح گردانتے ہیں۔ (حبیب اللہ۔ پشاور)

الجواب یہ روایت میرے علم کے مطابق سنن ابی داود (۸۹۳) وغیرہ میں موجود ہے۔ اس کے بنیادی راوی یحییٰ بن ابی سلیمان کو امام بخاری اور جمہور محدثین نے ضعیف و مجروح قرار دیا ہے۔ امام ابن خزیمہ (۱۶۲۲) نے بھی اس روایت پر جرح کی ہے اور اس

روایت کے تمام شواہد ضعیف ہیں۔

تنبیہ: شیخ البانی "مسائل احمد واسحاق" لاسحاق بن منصور المروزی سے اس کا ایک شاہد لائے ہیں۔(دیکھئے الصحیحہ ج ۳ ص ۱۸۵ ح ۱۱۸۸)

جس پر دو طرح سے کلام ہے:

(۱) اسحاق بن منصور تک صحیح سند مطلوب ہے۔

مطبوعہ مسائل احمد واسحاق میں یہ روایت نہیں ملی۔

(۲) عبدالعزیز بن رفیع کی عبداللہ بن مغفل سے ملاقات کا ثبوت مطلوب ہے۔ مختصر یہ کہ یہ روایت اپنے تمام شواہد کے ساتھ ضعیف ہے۔ [شہادت جنوری ۲۰۰۳ء]

رکوع اور سجدے میں مختلف دعائیں کرنا

سوال رکوع اور سجدہ میں صرف ایک ہی دعا پڑھ سکتے ہیں یا دو تین اکٹھی بھی ملا کر پڑھ سکتے ہیں۔ مثلاً سبحان ربی الاعلیٰ اور سبحانک اللھم ... اکٹھی پڑھ سکتے ہیں؟

(ظفر اقبال، شکر گڑھ)

الجواب مسنون دعائیں پڑھنا جائز ہے چاہے ایک ہو یا کئی۔ واللہ اعلم

رسول اللہ ﷺ نے تشہد کی دعا کے بارے میں فرمایا: ((ثُمَّ لِيَتَخَيَّرْ مِنَ الدُّعَاءِ أَعْجَبَهُ إِلَيْهِ فَيَدْعُوْ .)) پھر اُسے جو دعا پسند ہو، اسے اختیار کر کے پڑھے۔ (صحیح بخاری: ۸۳۵)

[شہادت، اگست ۲۰۰۰ء]

رکوع کے بعد ہاتھوں کی کیفیت

سوال جب آدمی رکوع سے اٹھے تو ہاتھ کہاں رکھے؟ (صبغت اللہ محمدی)

الجواب رکوع سے کھڑے ہونے کے بعد نمازی ہاتھ باندھے یا کھلے رکھے، اس بارے میں علماء کے دو موقف ہیں:

① ہاتھ باندھ لے۔

یہ موقف استاذِ محترم شیخ ابو محمد بدیع الدین الراشدی السندھی رحمہ اللہ اور بعض دیگر علماء کا ہے۔ استاذِ محترم نے اس سلسلے میں متعدد رسائل لکھے ہیں۔ مثلاً:

''زیادة الخشوع بوضع الیدین فی القیام بعد الرکوع'' وغیرہ،

انھوں نے حالتِ قیام میں ہاتھ باندھنے والی احادیث کے عموم سے استدلال کیا ہے۔

تنبیہ: سنن ابی داود (۶۴۳) کی روایت میں '' السدل'' (کپڑا لٹکانے) سے منع آیا ہے لیکن یہ روایت نہ حسن ہے اور نہ صحیح بلکہ ضعیف ہے۔ میرے علم کے مطابق یہ حدیث، سیدنا ابو ہریرہ اور سیدنا ابو جحیفہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس کی تین سندیں ہیں:

۱۔ عسل بن سفیان عن عطاء عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ

(جامع ترمذی، ابواب الصلوٰة، باب ماجاء فی کراهیة السدل فی الصلوٰة ح ۳۷۸)

عسل بن سفیان جمہور محدثین کے نزدیک ضعیف ہے۔ (مجمع الزوائد للہیثمی ج ۲ ص ۲۶۷)

اور اسے امام بخاری، ابن معین اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ نے مجروح قرار دیا ہے۔ ابن حبان کے سوا کسی نے توثیق نہیں کی جبکہ ابن حبان نے خود اسے کتاب المجروحین من المحدثین و الضعفاء و المتروکین میں بھی ذکر کیا ہے۔ (ج ۲ ص ۱۹۵)

لہٰذا حافظ ابن حبان کے دونوں قول متناقض ہو کر ساقط ہو گئے۔

دیکھئے میزان الاعتدال (ج ۲ ص ۵۵۲ ترجمہ عبدالرحمٰن بن ثابت بن الصامت)

۲۔ الحسن بن ذکوان عن سلیمان الاحول عن عطاء عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ

(سنن ابی داود، الصلوٰة، باب السدل فی الصلوٰة ح ۶۴۳)

امام ابو داود رحمہ اللہ نے اس حدیث کے ضعیف ہونے کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ (ایضاً)

الحسن بن ذکوان مدلس ہیں اور اگر سماع کی تصریح کریں تو حسن درجہ کے راوی ہیں۔

صحیح بخاری میں اُن کی صرف ایک حدیث ہے۔

دیکھئے کتاب الرقاق باب صفة الجنة والنار (۶۵۶۶)

صحیح بخاری والی روایت میں الحسن بن ذکوان نے "حدثنا" کہہ کر سماع کی تصریح کر رکھی ہے اور اس کے بہت سے شواہد بھی ہیں۔ (دیکھئے ہدی الساری للحافظ ابن حجر ص ۳۹۸)

عمران بن مسلم القصیر نے ان کی متابعت تامہ کر رکھی ہے۔

(المعجم الکبیر للطبرانی ج ۱۸ ص ۱۳۶ ح ۲۸۴ باختلاف یسیر)

یعنی یہی حدیث الحسن بن ذکوان کے علاوہ عمران (صدوق حسن الحدیث) نے بھی بیان کی ہے۔

تہذیب التہذیب (ج ۲ ص ۲۴۱) وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عمرو بن خالد الواسطی: کذاب سے تدلیس کرتے تھے۔ کذاب سے تدلیس کرنے والے کی معنعن روایت سخت ضعیف و مردود ہوتی ہے بلکہ موضوع ہونے کا شبہ بھی رہتا ہے لہٰذا یہ سند سخت ضعیف ہے۔

۳۔ أحمد (بن يحي بن الربيع بن سليمان البغدادي) قال: حدثنا محمد بن عبدالله بن بزيع قال: حدثنا عبدالرحمٰن بن عثمان أبو بحر البكراوي قال: حدثنا سعيد بن أبي عروبة عن عامر الأحول عن عطاء عن أبي هريرة ... إلخ (المعجم الاوسط للطبرانی ج ۲ ص ۱۶۴ ح ۱۳۰۲، وتحفۃ الاحوذی ج ۱ ص ۲۹۶ مختصراً)

احمد بن یحیٰی کا ذکر تاریخ بغداد (ج ۵ ص ۲۰۳) میں ہے۔ لیکن اس کی توثیق مذکور نہیں لہٰذا یہ شخص مجہول الحال ہے۔ ابو بحر البکراوی ضعیف ہے۔ (دیکھئے التقریب: ۳۹۴۳)

اسے جمہور محدثین نے (حافظے کی وجہ سے) ضعیف قرار دیا ہے۔ سعید بن ابی عروبہ مدلس ہیں، انھیں حافظ ذہبی نے مدلس کہا ہے۔

(دیکھئے الفتح المبین فی تحقیق طبقات المدلسین ص ۳۹، اور سیر اعلام النبلاء للذہبی ج ۶ ص ۴۱۵)

اس سند میں سعید کے اختلاط والی علت بھی ہے لہٰذا یہ سند ان چار خامیوں کی وجہ سے ضعیف ہے۔

۴۔ الحسین بن اسحاق التستری: ثنا أبو الربيع الزهراني ثنا حفص بن أبي داود

عن الهيثم بن حبيب عن عون بن أبي جحيفة عن أبيه . إلخ

(المعجم الكبير للطبرانی ج ۲۲ ص ۱۱۱، ۱۱۲ ح ۲۸۳)

المعجم الاوسط للطبرانی (ج ۷ ص ۹۵، ۹۶ ح ۶۱۶۰) اور المعجم الصغیر (ج ۲ ص ۳۸) میں

یہ روایت حفص بن ابی داود: ثنا الهيثم بن حبيب الصيرفي عن علي بن الأقمر عن أبي جحيفة کی سند سے مروی ہے۔

حفص بن ابی داود الاسدی الکوفی القاری: ''متروك الحديث مع إمامته في القرء اة'' ہے۔ (تقریب التہذیب: ۱۴۰۵)

ابو مالک النخعی عن علی بن الاقمر عن ابی جحیفۃ کی سند سے بھی یہ روایت مروی ہے۔

(الکبیر للطبرانی ج ۲۲ ص ۱۳۳ ح ۳۵۳، کشف الاستار فی زوائد البزار ج ۱ ص ۲۸۶ ح ۵۹۵)

ابو مالک تک دونوں سندیں ضعیف ہیں اور ابو مالک النخعی متروک ہے۔

(دیکھئے تقریب التہذیب: ۸۳۳۷)

بزار نے اسے خطا قرار دیتے ہوئے علی بن الاقمر عن ام عطیہ کی روایت کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن یہ روایت مجھے نہیں ملی۔ واللہ اعلم

خلاصہ یہ کہ یہ روایت اپنی تمام اسانید کے ساتھ ضعیف ہے لہٰذا بعض لوگوں کا اس سے استدلال کر کے رکوع کے بعد ارسال یدین سے منع کرنا صحیح نہیں ہے۔ اگر یہ روایت صحیح بھی ہوتی تو اس سے استدلال صحیح نہیں ہے کیونکہ یہاں سدل سے مراد گردن سے دو کندھوں کے درمیان، یہودیوں کی طرح کپڑا لٹکانا ہے جیسا کہ محدثین کرام نے بیان کیا ہے اور محدثین کرام ہی اپنی روایات کو سب سے بہتر جانتے ہیں۔

فائدہ: سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو نماز میں سدل کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: گویا یہ یہودی ہیں جو اپنے تہوار سے آئے ہیں۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ۲/۲۵۹ ح ۶۴۸۰ وسندہ صحیح)

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ نماز میں، یہودیوں کی مخالفت کرتے ہوئے سدل کو مکروہ سمجھتے تھے اور فرماتے: یہودی سدل کرتے ہیں۔ (ابن ابی شیبہ ۲/۲۵۹ ح ۶۴۸۳ وسندہ صحیح)

ابراہیم نخعی رحمہ اللہ (بھی) نماز میں (یہودیوں کے سدل کی طرح) کپڑا لٹکانے کو مکروہ سمجھتے تھے۔ (ابن ابی شیبہ ۲/۲۵۹ ح ۶۴۸۱ وسندہ صحیح)

۲ ہاتھ کھلے رکھے۔

یہ دوسرا موقف استاذِ محترم شیخ ابوالقاسم محب اللہ الراشدی [رحمہ اللہ] اور جمہور علماء کا ہے۔

اس پر وہ بعض عمومی دلائل اور عملِ محدثین سے استدلال کرتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے باسند صحیح نماز میں ارسال ثابت ہے۔

(مصنف ابن ابی شیبہ ۱/۳۹۱ ح ۳۹۵۰ وسندہ صحیح)

دونوں طرف استدلال عمومات سے ہے لہٰذا غیر صریح ہونے کی وجہ سے یہ مسئلہ اجتہادی ہے لہٰذا جو شخص حسبِ تحقیق جس صورت میں عمل کرے گا وہ عنداللہ ماجور ہوگا۔ (ان شاء اللہ)

امام اہلِ سنت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" أرجو أن لا يضيق ذلك إن شاء الله " میرے خیال میں اس (یعنی ہاتھ باندھنا یا چھوڑنا دونوں) میں کوئی تنگی نہیں ہے، ان شاء اللہ۔ یعنی دونوں طرح جائز ہے۔

(مسائل صالح بن احمد بن حنبل، قلمی صفحہ ۹۰ ومطبوع ج ۲ ص ۲۰۵ فقرہ نمبر ۶۷۷)

میری تحقیق میں راجح یہی ہے کہ دونوں طرح عمل کرنا جائز ہے۔ اس مسئلہ میں تشدد نہیں کرنا چاہئے اور نہ جوابی رسائل کا سلسلہ شروع کیا جائے۔

هذا ما عندي والله أعلم بالصواب [شہادت، فروری ۲۰۰۰ء]

سوال بعد از رکوع بحالت قیام، ہاتھوں کے ارسال کا ثبوت بالتفصیل عبارات اور حوالۂ کتب، دونوں مقامات پر لکھ کر ممنون فرمائیں۔

(ابوطلحہ حافظ ثناء اللہ شاہد القصوری)

الجواب اس سلسلے میں تفصیلی بحث، ماہنامہ شہادت، فروری ۲۰۰۰ء جلد نمبر ۷ شمارہ نمبر ۲ ص ۳۲، ۳۳ میں شائع ہو چکی ہے۔

امام ابوالشیخ الاصبہانی نے فرمایا: "حدثنا حاجب بن أبي بكر قال: ثنا أحمد

الدورقي، قال: ثنا بهز بن أسد عن يزيد بن إبراهيم عن عمرو بن دينار قال: كان ابن الزبير إذا قام فی الصلوٰة أرخى يديه"

(طبقات المحدثین باصبہان ج۱ص۲۰۰، ۲۰۱)

مفہوم: جب عبداللہ بن زبیر (رضی اللہ عنہ) نماز میں کھڑے ہوتے تو اپنے دونوں ہاتھ لٹکا دیتے تھے۔

حکمِ سند: صحیح ہے۔

تحقیقِ سند: حاجب بن ابی بکر ثقہ ہیں۔ دیکھئے اخبار اصبہان (ج۱ص۲) تاریخ بغداد (ج۸ص۲۷۱) طبقات اصبہان (ج۳ص۵۰۲) اور شذرات الذہب (ج۲ص۲۴۹)

احمد بن ابراہیم الدورقی، ثقہ حافظ تھے۔ (دیکھئے تقریب التہذیب:۳)

بهز بن أسد: ثقہ ثبت (تقریب التہذیب:۷۷۱)

يزيد بن إبراهيم: ثقة ثبت، إلا في روايته عن قتادة ففيها لين

(تقریب التہذیب:۷۶۸۴)

عمرو بن دینار: ثقة ثبت (تقریب التہذیب:۵۰۲۴)

خلاصہ یہ ہے کہ روایت صحیح ہے۔ اسے ابن ابی شیبہ (ج۱ص۳۹۱ح۳۹۵۰) اور ابن المنذر (فی الاوسط۳/۹۳) نے بھی یزید بن ابراہیم سے روایت کیا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے اثر کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں:

① وہ رکوع سے پہلے اور بعد، دونوں قیاموں میں ہاتھ لٹکاتے (یعنی ارسال کرتے) تھے۔

② وہ رکوع کے بعد والے قیام میں ہاتھ لٹکاتے (یعنی ارسال کرتے) تھے۔

اول الذکر صحیح اور مرفوع احادیث کے خلاف ہے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ ابن الزبیر رضی اللہ عنہ صحیح اور مرفوع احادیث کی مخالفت کریں اور کوئی ان کا رد بھی نہ کرے لہٰذا یہ مفہوم غلط ہے۔

تنبیہ: سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قدموں کو برابر رکھنا اور (نماز میں) ہاتھ کو ہاتھ پر رکھنا سنت میں سے ہے۔ (سنن ابی داود:۷۵۴ وسندہ حسن وانظا من ضعفہ)

ثانی الذکر مفہوم سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رکوع کے بعد ہاتھ چھوڑنا بالکل صحیح ہے اور یہ عمل کسی مرفوع حدیث کے خلاف نہیں لہٰذا یہی مفہوم راجح ہے۔ [شہادت، نومبر ۲۰۰۱ء]

رکوع کے بعد ہاتھ باندھنے والی روایت کی تحقیق

سوال کیا مسند احمد میں سیدنا وائل رضی اللہ عنہ کے حوالے سے کوئی ایسی حدیث موجود ہے جس میں انھوں نے کہا ہو کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ رکوع سے سر اٹھاتے تو رفع الیدین کرتے اور ہاتھ باندھ لیتے؟ اگر یہ حدیث موجود ہے تو آیا یہ صحیح ہے یا ضعیف وغیرہ۔ تخریج کے ساتھ بیان کریں۔ (محمد شاہد میمن)

الجواب یہ روایت مسند احمد (ج ۴ ص ۳۱۸) میں موجود ہے اور اس کے متن کے ساتھ استدلال میں نظر ہے تاہم اس کی سند بھی ضعیف ہے۔ سفیان ثوری مدلس ہیں اور عن سے روایت کر رہے ہیں۔ غیر صحیحین میں مدلس کی عن والی روایت ضعیف ہوتی ہے۔

[شہادت، جولائی ۲۰۰۱ء]

دوسری رکعت کے لئے اٹھتے وقت ہاتھوں کی کیفیت

سوال ماہنامہ شہادت نومبر ۲۰۰۲ء میں آپ کے مسائل میں خالد سیف حفظہ اللہ نے ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے کہ سجدوں سے اگلی رکعت کے لئے آٹا گوندھنے کی طرح بھی اٹھ سکتے ہیں۔ محترم! میں نے الشیخ ابو جابر حفظہ اللہ سے پوچھا تو انھوں نے کہا: اس طرح اٹھنا ثابت نہیں، اسی طرح الشیخ خواجہ محمد قاسم رحمہ اللہ نے ''قد قامت الصلوٰۃ'' میں تلخیص الحبیر للحافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے حوالے سے اس روایت کو ضعیف لکھا ہے۔ لیکن شیخ عبداللہ ناصر الرحمانی حفظہ اللہ اس رویت کو حسن قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ علامہ البانی رحمہ اللہ نے اسے حسن قرار دیا ہے، محترم اس تنازع کو بھی حل فرمائیں کہ درست موقف کس کا ہے؟ حوالہ ضرور دیجئے گا۔ (ایک سائل)

الجواب آٹا گوندھنے کی طرح اٹھنے والی روایت کا ایک راوی ہیثم بن عمران

الدمشقی ہے (الاوسط للطبرانی: ۴۰۱۹) جس سے ثقہ راویوں کی ایک جماعت روایت کرتی ہے مگر اس کی توثیق سوائے ابن حبان کے کسی سے ثابت نہیں ہے لہٰذا وہ مجہول الحال ہے۔ اصول حدیث کی رُو سے مجہول الحال کی عدمِ متابعت والی روایت ضعیف ہی ہوتی ہے لہٰذا یہ روایت ضعیف ہے اور اسے حسن قرار دینا غلط ہے۔ [شہادت، مارچ ۲۰۰۳ء]

سجدوں سے کیسے اٹھا جائے؟

سوال جلسۂ استراحت اور تشہد کے بعد، اٹھتے وقت ہتھیلیوں کے بل زمین پر ٹیک لگا کر اُٹھنا چاہیے یا غریب الحدیث للحربی کی روایت کے مطابق مٹھیاں بند کر کے، بند مٹھیوں پر اعتماد کر کے اٹھیں۔ [جیسا کہ علامہ البانی نے تمام المنہ میں بیان کیا ہے۔ (قال الالبانی حسن/ فی الضعیفہ ۳۹۲/۲)]

۲۵ نومبر ۱۹۹۴ء کو مولانا محبّ اللہ شاہ راشدی صاحب کا ایک مضمون ''الاعتصام'' میں شائع ہوا۔ لکھا تھا کہ کامل بن طلحہ کی روایت میں ''اعتمد على الأرض بيديه '' کے الفاظ ہیں اور یدین سے مراد ''كفين '' بہت سی احادیث میں دیکھا جاسکتا ہے۔ مٹھی بند کر کے اس پر ٹیک لگا کر اٹھنا ''اعتماد على الأنملة '' ہے نہ کہ علی الیدین ہے۔ لہٰذا ہتھیلیاں زمین پر ٹیک کر اٹھنا چاہیے۔

مزید لکھتے ہیں: ہیثم کی روایت میں ''يَعْجِن '' کی زیادتی ہے۔ کامل بن طلحہ، ہیثم سے اوثق ہیں اور انھوں نے یہ زیادتی ذکر نہیں کی۔ ہیثم نے اوثق راوی کی مخالفت کی ہے لہٰذا یہ روایت شاذ ہے۔ مولانا ارشاد الحق اثری فیصل آبادی (حفظہ اللہ) فرماتے ہیں کہ ہیثم کی روایت شاذ نہیں بلکہ اس میں زیادہ تفصیل ہے۔ مٹھیوں کے بل اٹھنے پر دونوں حدیثوں پر عمل ہو جاتا ہے۔ مولانا! آپ کی اس بارے میں کیا تحقیق ہے؟ (صفدر حسین، شیخ صاحب قسطوں والے، لاہور)

الجواب ابواسحاق الحربی کی روایتِ مذکورہ کا ایک راوی ہیثم بن عمران الدمشقی ہے جسے ابن حبان کے علاوہ کسی نے بھی ثقہ قرار نہیں دیا لہٰذا یہ راوی مجہول الحال ہے۔ حدیث کے عام طالب علموں کو بھی معلوم ہے کہ مجہول الحال کی منفرد روایت ضعیف ہوتی ہے۔

تفصیلی تحقیق کے لئے دیکھئے محترم محمد علی خاصخیلی کی کتاب ''التبیین فی مسئلۃ العجین رنماز میں اٹھتے وقت آٹا گوندھنے والے کی طرح اُٹھنے کی علمی تحقیق'' جسے مکتبہ اہل حدیث ٹرسٹ، اہلِ حدیث چوک کورٹ روڈ کراچی سے شائع کیا گیا ہے۔

یاد رہے کہ روایتِ مسئولہ میں وجۂ ضعف صرف ہیثم بن عمران کا مجہول ہونا ہے۔ کامل بن طلحہ کے تفرد اور شذوذ کا اعتراض مردود ہے۔ ہیثم بن عمران کی توثیق ثابت کرنے کے لئے شیخ البانی رحمہ اللہ نے جو قاعدہ بنایا ہے وہ کئی وجہ سے مردود ہے مثلاً:

سنن ابی داود (۳۴۸۹) کی ایک روایت میں آیا ہے ''من باع الخمر فلیشقص الخنازیر'' اس کا ایک راوی عمر بن بیان التغلبی ہے جس سے ایک جماعت نے حدیث بیان کی ہے اور ابن حبان نے ثقہ قرار دیا ہے۔ ابو حاتم الرازی نے کہا: ''معروف'' لیکن شیخ البانی نے عمر بن بیان کو مجہول الحال کہہ کر اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔ دیکھئے الضعیفہ (۱۰/۱۷۰، ۷ ح ۴۵۶۶)

خلاصۃ التحقیق: آٹا گوندھنے کی طرح اٹھنے والی روایت ضعیف ہے لہٰذا زمین پر سجدہ میں جانے کی طرح ہاتھ ٹیک کر اٹھنا چاہئے۔ (۸/ اگست ۲۰۰۷ء) [الحدیث:۴۲]

دو سجدوں کے درمیان رفع سبابہ

سوال مابین السجود اشارہ بالسبابہ کا ثبوت صحیح احادیث سے ہے یا نہیں؟

(محمد صدیق، ایبٹ آباد)

الجواب جو لوگ مابین السجود، اشارہ بالسبابہ کے قائل ہیں ان کی میرے علم کے مطابق دو ہی دلیلیں ہیں:

① كان رسول الله ﷺ إذا قعد في الصلوٰة جعل قدمه اليسرى بين فخذه و ساقه و فرش قدمه اليمنى ، ووضع يده اليسرى على ركبته اليسرى ووضع يده اليمنى على فخذه اليمنى و أشار باصبعه . رسول اللہ ﷺ جب نماز میں (تشہد) بیٹھتے تو اپنا بایاں پاؤں اپنی ران اور پنڈلی کے درمیان کر لیتے اور اپنا دایاں پاؤں بچھا لیتے۔ اپنا بایاں ہاتھ گھٹنے پر اور دایاں ہاتھ ران پر رکھ دیتے تھے اور اپنی انگلی

(رفع سبابہ) سے اشارہ کرتے تھے۔ (صحیح مسلم:۵۷۹، وترقیم دارالسلام:۱۳۰۷)

أن النبي ﷺ كان إذا جلس في الصلوٰة وضع يديه على ركبتيه ورفع اصبعه اليمنى التي تلي الإبهام فدعا بها.... إلخ نبی ﷺ جب نماز میں (تشہد) بیٹھتے تو اپنے ہاتھ گھٹنوں پر رکھتے اور دائیں ہاتھ کی انگلی (رفع سبابہ) اٹھاتے جو انگوٹھے سے ملی ہوئی ہے، پھر اس کے ساتھ دعا بھی کرتے۔ (صحیح مسلم:۵۸۰/۱۱۴ وترقیم دارالسلام:۱۳۰۹)

استدلال "كان إذا قعد (جلس) في الصلوٰة" جب آپ ﷺ نماز میں بیٹھ جاتے" سے ہے، فی الصلوٰۃ کے الفاظ عام ہیں جو تشہد اور جلوس بین السجدتین دونوں پر مشتمل ہیں۔

یہ استدلال صحیح نہیں ہے، پہلی روایت صحیح مسلم میں عثمان بن حکیم عن عامر بن عبداللہ بن الزبیر عن ابیہ اور دوسری روایت محمد بن عجلان عن عامر بن عبداللہ عن ابیہ کی سند سے موجود ہے اور یہی روایت سنن نسائی (باب موضع البصر عند الاشارۃ تحریک السبابۃ ج ۳ ص ۳۹ ح ۱۲۷۶، تعلیقات سلفیہ) میں ابن عجلان عن عامر بن عبداللہ عن ابیہ کی سند سے درج ذیل متن کے ساتھ موجود ہے: "أن رسول الله ﷺ كان إذا قعد في التشهد وضع كفه اليسرى.... إلخ"

روایت ثانیہ صحیح مسلم میں ہی درج ذیل الفاظ کے ساتھ موجود ہے:

" كان إذا قعد في التشهد وضع يده اليسرى على ركبته اليسرى إلخ "

(ح ۵۸۰/۱۱۵ ودارالسلام:۱۳۱۰)

معلوم ہوا کہ یہاں فی الصلوٰۃ سے مراد فی التشہد ہے، والحديث يفسر بعضه بعضًا۔ یہی جواب اس باب کی باقی عام روایات کا ہے کہ وہ تشہد پر محمول ہیں۔

② عبدالرزاق أخبرنا سفيان عن عاصم بن كليب عن أبيه عن وائل بن حجر قال: رأيت النبي ﷺ .... وسجد فوضع يديه حذو أذنيه ثم جلس فافترش رجله اليسرى ثم وضع يده اليسرى على ركبته اليسرى ووضع ذراعه اليمنى على فخذه اليمنى ثم أشار بسبابته .... ثم سجد فكانت يداه

حذاء أذنيه . (مسند احمد ۴/ ۳۱۷ ح ۱۸۸۵۸، واللفظ لہ، عبدالرزاق فی المصنف ۲/ ۶۸ ح ۲۵۲۲ والطبرانی فی الکبیر ۲۲/ ۳۴، ۳۵ ح ۸۱)

اس روایت میں دو سجدوں کے درمیان اشارہ کرنے کی صراحت ہے لیکن بلحاظ سند یہ روایت ضعیف ہے۔ اس کے راوی سفیان الثوری مشہور مدلسین میں سے تھے۔ دیکھئے میری کتاب نور العینین (ص ۱۰۰، ۱۰۳، طبع جدید ص ۱۳۸۔ ۱۳۹) عمدۃ القاری للعینی (ج ۳ ص ۱۱۲) الجوہر النقی (۸/ ۲۶۲) اور ارشاد الساری للقسطلانی (۱/ ۲۸۶) وغیرہ

غیر صحیحین میں مدلس کی عدمِ تصریحِ سماع اور عدمِ متابعت معتبرہ والی روایت ضعیف ہوتی ہے۔

بعض محققین نے اس روایت کو محدث عبدالرزاق (ثقہ حافظ) کے تفرد کی وجہ سے شاذ قرار دیا ہے۔ (دیکھئے تمام المنہ ص ۲۱۶)

حالانکہ یہ جرح اصول حدیث کی رو سے بلکہ ہر لحاظ سے غلط و مردود ہے۔ وجہ ضعف صرف عنعنہ سفیان ثوری ہے۔ واضح رہے کہ عبدالرزاق کا تفرد یہاں چنداں مضر نہیں۔ دوسرے اگر ایک ہزار راوی ایک زیادت سند یا متن میں ذکر نہ کریں اور ایک ثقہ ذکر کرے تو عدم ذکر سے زیادت ذکر والی روایت معلول نہیں ہوتی، الا یہ کہ کسی راوی کے وہم پر محدثین کا اجماع ہو یا جمہور محدثین نے اس کی روایت کو معلول قرار دیا ہو، یہ دونوں باتیں یہاں مفقود ہیں، مختصر یہ کہ سفیان ثوری کی یہ معنعن روایت عدم تصریح سماع کی وجہ سے ضعیف و مردود ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ دونوں سجدوں کے درمیان اشارۂ سبابہ نہ کرنا ہی راجح ہے۔

[شہادت، مارچ ۲۰۰۴ء]

سجدوں میں ایڑیاں ملانا

سوال رسول اللہ ایک دن میں پانچ بار نماز پڑھتے تھے۔ سنن و نوافل اس کے علاوہ ہیں، جن صحابہ نے رسول اللہ (ﷺ) کی نماز ذکر کی ہے انھوں نے نماز میں حالت سجدہ میں ایڑیاں ملانا ذکر (نہیں) کیا ہے۔ اس لئے میں نماز میں سجدے میں ایڑیاں نہیں ملاتا۔ (جس روایت میں آیا ہے کہ سجدے میں آپ ﷺ کے دونوں پاؤں ملے ہوئے تھے

۔اس سے مراد یہ ہے کہ) میرے خیال میں رسول اللہ (ﷺ) نماز کے بغیر ہی سجدہ ریز تھے۔کیا محدثین نے مذکورہ روایت کو حالتِ نماز پر محمول کیا ہے؟ کیا محدثین نے حالت نماز میں سجدے کی حالت میں ایڑیاں ملانے کے باب باندھے ہیں؟

نوٹ: میرا مقصد سمجھنا، تحقیق کرنا اور ان شاء اللہ اس پر عمل کرنا ہے، محض اعتراض کرنا نہیں۔جوابی لفافے کے ذریعے جواب دیجئے۔جزاک اللہ والسلام

(صفدر حسین [شیخ صاحب قسطوں والے] لاہور)

الجواب سجدے کی حالت میں ایڑیوں کا ملانا آپ ﷺ سے باسند صحیح ثابت ہے۔ دیکھئے صحیح ابن خزیمہ (۶۵۴) وصحیح ابن حبان (الاحسان: ۱۹۳۰) والسنن الکبریٰ للبیہقی (۲/۱۱۶) وصححہ الحاکم (۱/۲۲۸، ۲۲۹) علی شرط الشیخین ووافقہ الذہبی۔

اب اگر ایک ہزار راویوں نے بھی اسے روایت نہیں کیا تو کوئی بات نہیں صرف ایک صحابی کی روایت بھی کافی ہے لہٰذا امام ہو یا مقتدی یا منفرد ہر نمازی کو یہ چاہئے کہ سجدے میں اپنے دونوں پاؤں ملالے۔محدثین کرام نے پاؤں ملانے والی حدیث کو کتاب الصلوٰۃ میں سجدوں میں پاؤں ملانے کے باب میں ذکر کیا ہے۔مثلاً امام ابن خزیمہ فرماتے ہیں:

"باب ضم العقبین فی السجود "سجدوں میں ایڑیاں ملانے کا باب، لہٰذا آپ کا خیال صحیح نہیں ہے۔ (۸/ اگست ۲۰۰۷ء) [الحدیث:۴۷]

تشہد میں رفع سبابہ کا مسئلہ

سوال تشہد کی حالت میں شروع ہی سے انگلی کو حرکت دینی شروع کردینی چاہئے یا درود کے بعد جب دعائیں شروع کریں تو حرکت دیں؟ دو سجدوں کے درمیان بھی انگلی کو حرکت دینی چاہئے یا نہیں؟ درود کے بعد انگلی کو حرکت دینا کون سی حدیث سے ثابت ہے؟

(ظفر اقبال، شکر گڑھ)

الجواب تشہد کی حالت میں شروع سے ہی انگلی کھڑی کردی جائے، جیسا کہ احادیث کے عموم سے ثابت ہے:

''كان رسول الله ﷺ إذا قعد فى الصلوٰة ... و أشار بأ صبعه''

(صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب صفۃ الجلوس فی الصلوٰۃ وکیفیۃ موضع الیدین علی الفخذین حدیث:۵۷۹)

جب دعا کریں یعنی درود کے بعد تو شہادت کی انگلی کو حرکت دیں۔

(سنن النسائی، الافتتاح باب موضع الیمین من الشمال فی الصلوٰۃ ح ۸۹۰، وسندہ صحیح ،فرأیتہ یحرکھا یدعوبھا)

فائدہ: عاشق الٰہی میرٹھی دیوبندی نے لکھا ہے:

''تشہد میں جو رفع سبابہ کیا جاتا ہے اس میں تردد تھا کہ اس اشارہ کا بقاء کس وقت تک کسی حدیث میں منقول ہے یا نہیں حضرت قدس سرہ (یعنی رشید احمد گنگوہی دیوبندی) کے حضور میں پیش کیا گیا فوراً ارشاد فرمایا

''ترمذی کی کتاب الدعوات میں حدیث ہے کہ آپ نے تشہد کے بعد فلاں دعا پڑھی اور اس میں سبابہ سے اشارہ فرمارہے تھے'' اور ظاہر ہے کہ دعا قریب سلام کے پڑھی جاتی ہے پس ثابت ہوگیا کہ اخیر تک اس کا باقی رکھنا حدیث میں منقول ہے اور یہ بھی فرمایا کہ لوگ اس مسئلہ کو باب التشہد میں ڈھونڈتے ہیں اور وہاں ملتا نہیں، اس سے سمجھتے ہیں کہ حدیث میں نہیں ہے امام ربانی کا سرعت انتقال ذہنی اور ملکہ استنباط وفقاہت ان دونوں واقعہ سے اظہر من الشمس ہے۔'' (تذکرۃ الرشید ج ۱ ص ۱۱۳، تفقہ اور افتاء)

راقم الحروف کے خیال میں گنگوہی صاحب کا اشارہ اس حدیث کی طرف ہے جس میں لکھا ہوا ہے: ''إن رجلاً كان يدعو بأصبعيه فقال رسول الله ﷺ: أحّد أحّد''

(سنن ترمذی کتاب الدعوات باب ۱۰۴ قبل احادیث شتی من ابواب الدعوات حدیث:۳۵۵۷)

لیکن یہ سند محمد بن عجلان کی تدلیس کی وجہ سے ضعیف ہے۔ [شہادت، اگست ۲۰۰۰ء]

سوال قعدہ میں التحیات کے وقت سبابہ کی انگلی سے جو اشارہ کیا جاتا ہے کیا انگلی کو اٹھائے رکھنا چاہئے یا ہلاتے رہنا چاہئے، یا ویسے ہی رکھنا چاہئے، کون سا عمل زیادہ درست ہے؟ (طارق علی بروہی، کراچی)

الجواب صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ تشہد (التحیات) کے لئے بیٹھتے وقت ہی

دائیں ہاتھ کی انگلیوں کا حلقہ بنا کر شہادت کی انگلی (سبابہ) کو تھوڑا سا خم دے کر کھڑا رکھا جائے اور دعا کے وقت اسے حرکت دی جائے۔

دیکھئے سنن ابی داود (کتاب الصلوٰۃ باب الاشارۃ فی التشہد حدیث: ۹۹۱ وسندہ حسن، وصحیحہ ابن خزیمہ: ۷۱۵، ۷۱۶ وابن حبان، الموارد: ۴۹۹ واخطأ من ضعفہ)

کلمۂ شہادت کے وقت یا صرف لا الٰہ پر شہادت والی انگلی اٹھانا اور الا اللہ پر رکھ دینا (میرے علم کے مطابق) کسی حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ [شہادت، فروری ۲۰۰۰ء]

پہلے تشہد میں درود

سوال کیا چار فرضوں کے درمیان والے تشہد میں درود شریف پڑھنا ضروری ہے؟ اس کے نہ پڑھنے سے نماز باطل ہو جاتی ہے؟ کیا اللہ کے نبی ﷺ سے یہ بات ثابت ہے؟ حدیث سے وضاحت فرمائیں۔ (اشفاق احمد)

الجواب احادیث کے مطالعہ کے بعد راقم الحروف اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ دو تشہدوں والی نماز میں تشہد اول میں درود شریف پڑھنا جائز بلکہ افضل ہے اور نہ پڑھنا بھی جائز ہے۔ اس سلسلے میں ضروری وواجب والی کوئی بات نہیں۔ باطل کا فتویٰ لگانا خود باطل ہے۔ جواز کو جواز کی جگہ پر ہی رکھنا چاہئے۔ ان اجتہادی مسائل میں غلو کرنا انتہائی ناپسندیدہ بات ہے۔ [شہادت، جون ۲۰۰۱ء]

آخری رکعات میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ کسی سورت کا ملانا

سوال چار اور تین رکعت والی نمازوں میں آخری دو یا ایک رکعت میں صرف سورۂ فاتحہ پڑھنا یا اس کے ساتھ کوئی سورت ملانا کونسا عمل زیادہ صحیح ہے؟ (طارق علی بروہی، کراچی)

الجواب چار رکعت والی نماز کی آخری دو رکعتوں اور تین رکعت والی نماز کی آخری رکعت میں سورۂ فاتحہ پڑھنا بھی صحیح ہے، اور اس کے ساتھ اگر سورت ملا لیں تو یہ بھی صحیح ہے، یہ دونوں عمل صحیح احادیث سے ثابت ہیں۔

دیکھئے صحیح بخاری (صفۃ الصلوٰۃ باب یقرأ فی الاخریین بفاتحۃ الکتاب ح ۷۷۶) اور صحیح مسلم (الصلوٰۃ باب القراءۃ فی الظہر والعصر ح ۴۵۱ و ۴۵۴)

[شہادت، فروری ۲۰۰۰ء]

نماز سے متعلق دیگر مسائل

غیبت سے وضو اور نماز کا اعادہ؟

سوال ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ دو آدمیوں نے ظہر یا عصر کی نماز ادا کی اور وہ دونوں روزے سے تھے۔ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو آپ نے فرمایا: تم وضو اور نماز دہراؤ البتہ روزہ رکھے رہو اور کسی دوسرے دن اس کی قضا دو۔ انھوں نے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کس لئے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم نے فلاں انسان کی غیبت کی ہے۔ (مشکوۃ المصابیح کتاب الآداب باب حفظ اللسان ص ۳۷ ح ۴۸۷۳)

کیا یہ روایت صحیح ہے؟ (محمد محسن سلفی، کراچی)

الجواب یہ روایت امام بیہقی کی کتاب شعب الایمان (۳۰۳/۵ ح ۶۷۴۹) میں "مثنی بن بکر عن عباد بن منصور عن عکرمة عن ابن عباس" کی سند سے موجود ہے۔

عباد بن منصور قول راجح میں ضعیف، مدلس اور مختلط راوی تھا۔

دیکھئے تہذیب التہذیب وغیرہ اور مثنیٰ بن بکر مجہول ہے۔ (لسان المیزان ۱۴/۵ ت ۶۸۸۹)

لہٰذا یہ روایت ضعیف و مردود ہے۔

ترکِ نماز سے خارج از ملت ہونا

سوال ایک حدیث میں آیا ہے:

"فمن ترکها متعمدًا فقد خرج من الملة" (الترغیب والترہیب: ۹۷۷ مجمع الزوائد ۲۱۶/۴)

جس نے عمداً نماز چھوڑی تو وہ ہماری ملت سے خارج ہو گیا۔ اس حدیث کی تخریج درکار ہے۔

(محمد محسن سلفی، کراچی)

الجواب امام طبری رحمہ اللہ نے فرمایا: ''حدثنا يحي بن أيوب العلاف: حدثنا سعيد بن أبي مريم: حدثنا نافع بن يزيد: حدثنا سيار (في الأصل: سكن) بن عبدالرحمٰن عن يزيد بن قودر (في الأصل: قوذر) عن سلمة بن شريح عن عبادة بن الصامت قال: أو صانا رسول الله ﷺ بسبع خلال فقال: لا تشركوا بالله شيئًا و إن قطعتم أو حرقتم أو صلبتم ولا تتركوا الصلوٰة متعمدين، فمن تركها متعمدًا فقد خرج من الملة، ولا ترتكبوا المعصية فانها سخط الله، ولا تقربوا الخمر فانها رأس الخطايا كلها ولا تفروا من الموت أو القتل و إن كنتم فيه ولا تعص والديك و ان أمراك أن تخرج من الدنيا كلها فاخرج ولا تضع عصاك عن أهلك و أنصفهم من نفسك''

(جامع المسانید والسنن لابن کثیر ۱۱۹/۷ ح ۴۸۶۷)

اسے محمد بن نصر المروزی (تعظیم قدر الصلوٰۃ ۸۸۹/۲ ح ۹۲۰، وھو کتاب الصلوٰۃ لہ) امام بخاری (التاریخ الکبیر ۷۵/۴ مختصراً) ابن ابی حاتم الرازی (التفسیر ۱۴۱۴/۵ ح ۸۰۵۸ مختصراً) ہبۃ اللہ الالکائی (شرح اصول واعتقاد اہل السنۃ والجماعۃ ۸۲۲/۴، ۸۲۳ ح ۱۵۲۲، فیما یقال) نے سعید بن ابی مریم المصری: ثقہ ثبت فقیہ/ تقریب التہذیب: ۲۲۸۶) کی سند سے روایت کیا ہے، ضیاء المقدسی نے کتاب: الاحادیث المختارہ (۲۸۷/۸۔۲۸۸ ح ۳۵۱) میں امام طبرانی کی سند اور (ح ۳۵۰) دوسری سند سے سعید بن ابی مریم سے روایت کیا ہے۔

امام بخاری فرماتے ہیں: ''لا یعرف إسنادہ'' اس کی سند معروف نہیں ہے۔

سلمہ بن شریح کو ابن حبان نے کتاب الثقات (۳۱۸/۴) میں ذکر کیا ہے۔

حافظ ضیاء المقدسی نے اس کی حدیث کو المختارہ میں لا کر صحیح قرار دیا ہے جو کہ توثیق ہے۔

یزید بن قودر کو بھی ابن حبان اور ضیاء المقدسی نے ثقہ قرار دیا ہے، باقی راوی ثقہ وصدوق ہیں، اس لحاظ سے یہ سند حسن ہے، لیکن شیخ البانی رحمہ اللہ نے سلمہ بن شریح کے بارے میں حافظ ذہبی کے قول: '' لا یعرف '' (میزان الاعتدال ۱۹۰/۲ ت ۳۴۰۲) سے استدلال

کرتے ہوئے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے اور الترغیب والترہیب للمنذری کے تین معلقین کا رد کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ولا شاهد لفقرة الخروج من الملة و غيرها و قد وقع في مثله بعض من نظن فيه العلم من الكتاب المعاصرين"

اور ملت (اسلامیہ) سے خروج وغیرہ کے فقرے کا کوئی شاہد نہیں ہے۔ معاصر لکھاریوں میں سے بعض (یعنی الشیخ عبدالرحمٰن بن عبدالجبار الفریوائی، الہندی) جن کے علم کے بارے میں ہم (حسن) ظن رکھتے ہیں اسی خطا میں گر گئے ہیں (یعنی اس روایت کو شواہد کی وجہ سے صحیح قرار دیا ہے حالانکہ یہ روایت ضعیف ہے۔) (ضعیف الترغیب والترہیب ۱/۱۶۱، تحت ح ۳۰۰)

تنبیہ: حافظ المنذری نے اس حدیث کے بارے میں لکھا ہے:

"بإسنادين لا بأس بهما" (الترغیب والترہیب ۱/۳۷۹ ح ۷۹۷)

حالانکہ اس کی صرف ایک ہی سند ہے، ممکن ہے کہ ان کی مراد یہ ہو کہ "باسنادین عن سعید بن ابی مریم" واللہ اعلم۔ اب اس حدیث کے شواہد کا جائزہ درج ذیل ہے:

① "عن أبي الدرداء قال: أو صاني خليلي ﷺ أن لا تشرك بالله شيئًا وإن قطعت وحرقت ولا تترك صلوة مكتوبة متعمدًا ، فمن تركها فقد برئت منه الذمة ولا تشرب الخمر فانها مفتاح كل شر"

سیدنا ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھے میرے خلیل (نبی) ﷺ نے وصیت فرمائی: یہ کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا اگرچہ تمھارے ٹکڑے کر دیئے جائیں اور تمھیں جلا دیا جائے تو بھی فرض نماز ترک نہ کرنا۔ جس نے اسے (نماز کو) چھوڑ دیا تو وہ ذمے سے بری ہے۔ شراب نہ پینا کیونکہ ہر برائی کی جڑ یہی (شراب) ہے۔ (سنن ابن ماجہ: ۴۰۳۴، ۳۳۷۱ مختصراً، وسندہ حسن وحسنہ البوصیری وقال الالبانی فی الاول: "حسن" فی الثانی "صحیح" یعنی بشواہدہ)

② عن أميمة مولاة رسول الله ﷺ عن رسول الله ﷺ قال:" لا تشرك بالله شيئًا و ان قطعت و حرقت بالنار ، ولا تعصين والديك و ان أمراك أن

تخلي عن أهلك و دنياك فتخلّه ولا تشر بن خمرًا فإنها رأس كل شرو لا تتركن صلوٰة متعمدًا فمن فعل ذلك برئت منه ذمة اللّٰه و ذمة رسوله ، ولا تفرن يوم الزحف ، فمن فعل ذلك باء بسخط من اللّٰه و مأواه جهنم و بئس المصير ولا تزدادن في تخوم أرضك فمن فعل ذلك يأتي به على رقبته يوم القيامة من مقدار سبع أرضين و أنفق على أهلك من طولك ، ولا ترفع عصاك عنهم و أخفهم فى اللّٰه " (الطبرانی فی الکبیر ۲۴/۱۹۰ ح ۴۷۹ وقال الہیثمی : وفیہ یزید بن سنان الرھاوی وثقہ البخاری وغیرہ والاکثر علی تضعیفہ وبقیۃ رجالہ ثقات، مجمع الزوائد ۴/۲۱۷)

یزید بن سنان الرہاوی ضعیف ہے۔ (التقریب:۷۷۲۷)

اسے امام احمد اور جمہور محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔

③ عن معاذ بن جبل رضي اللّٰه عنه عن رسول اللّٰه ﷺ قال:" لا تشرك باللّٰه و إن قتلت و حرقت ولا تعقن والديك و إن أمراك أن تخرج من أهلك ومالك ولا تتركن صلوة مكتوبة متعمدًا فإن من ترك صلوٰة مكتوبة متعمدًا فقد برئت منه ذمة اللّٰه ولا تشر بن خمرًا فإنه رأس كل فاحشة و إياك و المعصية فإن بالمعصية حل سخط اللّٰه عزوجل وإياك والفرار من الزحف و إن هلك الناس و إذا أصاب الناس موتان و أنت منهم فاثبت و أنفق على عيالك من طولك ولا ترفع عنهم عصاك أدبًا ، وأخفهم فى اللّٰه "

(احمد ۵/۲۳۸ ح ۲۲۴۲۵)

یہ روایت منقطع ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔ حافظ المنذری نے کہا:

"فإن عبدالرحمٰن بن جبير بن نفير لم يسمع من معاذ "

(الترغیب والترہیب ۱/۳۸۳ ح ۸۰۷)

المعجم الکبیر للطبرانی (۲۰/۸۲ ح ۱۵۶) میں اس مفہوم کی دوسری سند بھی ہے جس میں عمرو بن واقد ہے جس کے بارے میں حافظ ہیثمی نے کہا:"وهو كذاب "(مجمع الزوائد

۲۱۵/۴)اور ابن حجر نے کہا: "متروك" (التقریب:۵۱۳۲)

④ مكحول عن أم أيمن رضي الله عنها أنها سمعت رسول الله ﷺ يوصي بعض أهله فقال : لا تشرك ((بالله شيئًا و إن قطعت أو حرقت بالنار ولا تفريوم الزحف و إن أصاب الناس موت و أنت فيهم فاثبت و أطع والديك و إن أمراك أن تخرج من مالك ولا تترك الصلوة متعمدًا فإنه من ترك الصلوٰة متعمدًا فقد برئت منه ذمة الله ، إياك والخمر فإنها مفتاح كل شر وإياك والمعصية فإنها تسخط الله ، لا تنازع الأمر أهله و إن رأيت أن لك ، أنفق على أهلك من طولك ولا ترفع عصاك عنهم و أخفهم في الله عزوجل.)) (مسند عبد بن حمید المنتخب:۱۵۹۲، واللفظ له، احمد ۴۲۱/۶ ح ۲۷۹۰۸ مختصراً والبیہقی ۳۰۴/۷)

یہ روایت منقطع ہے حافظ ابن السکن نے کہا:

"هو مرسل لأن مكحولاً لم يدرك أم أيمن" (الاصابہ ۴/۴۳۲ ت ۱۱۶)

تاریخ دمشق لابن عساکر (۱۷۰/۶۵) میں اس روایت کی سند مکحول وسلیمان بن موسیٰ عن ام ایمن سے ہے۔ یہ سند بھی منقطع اور ضعیف ہے۔

⑤ عن أبي ريحانة بلفظ : لا تشرك بالله شيئًا و إن قطعت و حرقت بالنار وأطع والديك و إن أمراك أن تخلي من أهلك و دنياك ولا تدعن صلوٰة متعمدًا فإن من تركها فقد برئت منه ذمة الله و ذمة رسوله ولا تشربن خمرًا فإنها رأس كل خطيئة ولا تزدادن في تخوم أرضك فإنك تأتي بها يوم القيامة من مقدار سبع أرضين " (اتحاف السادة المتقین ۳۹۲/۶)

مجھے اس روایت کی سند کہیں نہیں ملی، ایسی بے سند روایات مردود کے حکم میں ہوتی ہیں۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ "فقد خرج من الملة " کے الفاظ صرف عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ والی روایت ہی میں ہیں، دوسری کسی روایت میں نہیں، اس جواب کے شروع میں یہ تحقیق گزر چکی ہے کہ سیدنا عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ کی سند حسن ہے۔

تنبیہ(۱): المعجم الاوسط للطبرانی (۴/۲۱۱ ح ۳۳۷۲) کی ایک روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((من ترك الصلوٰة متعمدًا فقد كفر جهارًا))

اس روایت کے راویوں پر مختصر تبصرہ درج ذیل ہے:

① جعفر (بن محمد الفریابی): كان ثقة أمينًا حجة . (تاریخ بغداد ۷/۲۰۰ ت ۳۶۶۵)

② محمد بن ابی داود الانباری: اس کے حالات نامعلوم ہیں، شیخ البانی رحمہ اللہ کا یہ خیال ہے کہ یہ شخص کتاب الثقات لابن حبان (۹/۹۵) اور تہذیب التہذیب (۹/۱۷۷ ت ۳۱۲) کا راوی محمد بن سلیمان بن ابی داود الحرانی ہے۔ (السلسلۃ الضعیفۃ ۶/۱۲ ح ۲۵۰۸) ابن ابی داود الحرانی کی وفات ۲۱۳ھ ہے۔ (تہذیب الکمال ۱۶/۳۲۴) جبکہ جعفر الفریابی کی پیدائش ۲۰۷ھ ہے۔ (سیر اعلام النبلاء ۱۴/۹۶) جعفر الفریابی نے حدیث لکھنے کی ابتدا ۲۲۴ھ میں یعنی الحرانی کی وفات کے بعد شروع کی تھی۔ لہٰذا یہ ظاہر ہے کہ یہ ابن ابی داود کوئی دوسرا شخص ہے، الحرانی کے شیوخ میں ہاشم بن القاسم کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

③ ہاشم بن القاسم: أبو النضر ثقة ثبت (التقریب: ۷۲۵۶)

④ ابوجعفر الرازی: حسن الحدیث ، و ثقه الجمهور .

(دیکھئے تسہیل الحاجۃ: ۷۰ ونیل المقصود: ۱۱۸۲)

لیکن اگر وہ ربیع بن انس سے روایت کرے تو لوگ اس کی روایت سے بچتے ہیں۔

(الثقات لابن حبان ۴/۲۲۸)

یعنی ابوجعفر الرازی کی ربیع بن انس سے روایت ضعیف ہوتی ہے۔

⑤ ربیع بن انس: حسن الحدیث ہیں۔ (نیل المقصود ۱/۴۷ ح ۱۱۸۲)

⑥ انس بن مالک رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہ روایت ضعیف ہے۔

تنبیہ(۲): عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ والی روایت میں ''فمن تركها متعمدًا فقد خرج من الملة'' کے الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مطلقاً نماز (الصلوٰۃ) پڑھنا

چھوڑ دے، کبھی نہ پڑھے تو یہ شخص ملت سے خارج ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ جو شخص سستی وغیرہ کی وجہ سے کبھی کبھار بعض نمازیں نہیں پڑھتا تو ایسا شخص یہاں مراد نہیں ہے۔ واللہ اعلم

[شہادت، اگست ۲۰۰۴ء]

ننگے سر نماز پڑھنے کا حکم

سوال سیدنا محمد ﷺ نے حج اور عمرہ کے علاوہ کبھی ننگے سر نماز پڑھی ہے یا نہیں؟

(عبدالواحد، سندھ)

الجواب میرے علم میں ایسی کوئی حدیث نہیں ہے جس میں یہ صراحت ہو کہ نبی ﷺ نے حج یا عام حالت میں کبھی ننگے سر نماز پڑھی ہو۔ واللہ اعلم

لیکن عمومی دلائل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے حج وعمرہ میں ننگے سر ہی نماز پڑھی ہوگی کیونکہ حالت احرام میں سر کو ڈھانپنا ممنوع ہے۔

اسی طرح سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے کہ نبی ﷺ نے ایک کپڑے میں التحاف کرتے ہوئے نماز پڑھی ہے۔ (صحیح بخاری: ۳۷۰، وصحیح مسلم: ۳۰۰۸)

اگر ایک کپڑے میں التحاف اور اشتمال کے ساتھ نماز پڑھی جائے تو سر ننگا رہتا ہے، صرف کندھے اور باقی جسم ٹخنوں سے اوپر تک ڈھکا جاتا ہے۔

یہاں بطورِ تنبیہ عرض ہے کہ مردوں کے لئے ننگے سر نماز پڑھنے کے جواز پر متعدد دلائل موجود ہیں:

① کتاب وسنت میں ایسی کوئی نص صحیح نہیں ہے کہ مردوں کی نماز ننگے سر نہیں ہوتی۔

② ایک صحیح حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی نوجوان عورت کی نماز دوپٹے کے بغیر قبول نہیں کرتا۔ (سنن ابی داود: ۶۴۱)

اسے ابن خزیمہ، ابن حبان، حاکم اور ذہبی نے صحیح کہا ہے۔

(دیکھئے نیل المقصود فی التعلیق علیٰ سنن ابی داود ج ۱ ص ۲۲۴ لراقم الحروف)

اس حدیث سے بطورِ مفہوم المخالفہ معلوم ہوتا ہے کہ مرد کی نماز ننگے سر ہو جاتی ہے۔

غالباً انھی دلائل اوران جیسے دوسرے دلائل کی بنیاد پر حنفی فقہاء نے عاجزی وخشوع کی نیت سے ننگے سر نماز پڑھنا مردوں کے لئے جائز قرار دیا ہے۔

دیکھئے فتاویٰ عالمگیری ج ا ص ۱۰۶، فتاویٰ شامی ج ا ص ۴۷۴

حنفیوں کو چھوڑیئے! دیوبندی وبریلوی حضرات بھی ننگے سر نماز جائز ہونے کے قائل ہیں۔

دیکھئے فتاویٰ دارالعلوم دیوبند (ج ۴ص ۹۴) احکام شریعت لاحمد رضا خان بریلوی (ص ۱۳۰)

[شہادت، جولائی ۱۹۹۹ء]

مرد اور عورت کی نماز میں فرق اور انوار خورشید دیوبندی

سوال ''حدیث اور اہلِ حدیث'' نامی کتاب میں بارہ روایات لکھ کر یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ ''عورت اور مرد کی نماز ایک جیسی نہیں بلکہ دونوں میں فرق ہے''

(ص ۴۷۹ تا ص ۴۸۳)

ان روایتوں پر مختصر اور جامع تبصرہ لکھیں۔ (اشفاق احمد)

الجواب ''حدیث اور اہلِ حدیث'' نامی دیوبندی کتاب کی روایات مذکورہ پر علی الترتیب تبصرہ درج ذیل ہے:

۱۔ عن وائل بن حجر .... (معجم طبرانی کبیر ج ۲۲ ص ۱۸)

☆ اس روایت کی بنیادی راویہ ''ام یحییٰ بنت عبدالجبار'' کے بارے میں حافظ ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ولم أعرفها'' اور میں نے اسے نہیں پہچانا۔ (مجمع الزوائد ج ۲ ص ۱۰۳، وج ۹ ص ۳۷۴)

ماسٹر امین اوکاڑوی دیوبندی نے لکھا ہے کہ ''ام یحییٰ مجہولہ ہیں''

(مجموعہ رسائل ج ا ص ۳۴۶ طبع اول)

مجہول کی روایت ضعیف ہوتی ہے جیسا کہ اصولِ حدیث میں مقرر ہے۔

۲۔ عن عبدربه بن سليمان بن عمير قال: رأيت ام الدرداء ترفع يديها في الصلوٰة حذو منكبيها (جزء رفع الیدین للبخاری ص ۷)

☆ اس روایت سے مصنف ومفرّق کا مدعا پورا نہیں ہوتا کیونکہ کندھوں اور کانوں تک دونوں طرح رفع یدین کرنا صحیح ہے اور سنت سے ثابت ہے۔ دوسرے یہ کہ اسی روایت میں رکوع سے پہلے اور بعد والا رفع یدین بھی موجود ہے۔ (دیکھئے جزء رفع الیدین حدیث:۲۵)

یہاں بطورِ فائدہ عرض ہے کہ ام الدرداء رضی اللہ عنہا نماز میں مردوں کی طرح بیٹھتی تھیں اور وہ فقیہ تھیں۔ کانت أم الدرداء تجلس في صلاتها جلسة الرجل و كانت فقيهة .

(صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب سنۃ الجلوس فی التشہد قبل حدیث ۸۲۷، التاریخ الصغیر للبخاری ج ۱ ص ۲۲۳ تغلیق التعلیق لابن حجر ج ۲ ص ۳۲۹)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ جو لوگ نماز پڑھنے میں مرد اور عورت کی نماز میں فرق کرتے ہیں وہ فقیہ نہیں ہیں۔

۳۔ عن ابن جريج قال: قلت لعطاء ..... (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱ ص ۲۳۹)

☆ یہ کوئی حدیث نہیں ہے بلکہ عطاء بن ابی رباح کا قول ہے، اس قول کے آخر میں عطاء فرماتے ہیں: "وإن تركت ذلك فلا حرج" اور اگر عورت ایسا کرنا ترک کر دے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

یعنی عطاء رحمہ اللہ کے نزدیک عورت اگر مردوں کی طرح رفع الیدین کرے تو بھی صحیح ہے۔ چونکہ یہ قول "حدیث اور اہلِ حدیث" کے مصنف کے خلاف تھا لہٰذا اس نے خیانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے چھپا لیا ہے۔

۴۔ عن يزيد بن أبي حبيب أنه ﷺ مر على امرأتين

(مراسیل ابی داود ص ۸، السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۲ ص ۲۲۳)

☆ اس روایت کے بارے میں امام بیہقی کہتے ہیں: "حديث منقطع" یعنی یہ روایت منقطع ہے۔ امام طحاوی نے شرح معانی الآثار (ج ۲ ص ۱۶۴، دوسرا نسخہ ج ۳ ص ۲۵۳) "باب الرجل یسلم فی دار الحرب وعندہ اکثر من اربع نسوۃ" کے تحت لکھا ہے کہ "وخالفهم في ذلك آخرون ... وممن ذهب إلى هذا القول أبو حنيفة وأبو يوسف

رحمة الله عليهما وكان من الحجة لهم في ذلك أن هذا الحديث منقطع"
یعنی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ منقطع حدیث کو حجت نہیں سمجھتے تھے۔ امام طحاوی لکھتے ہیں کہ حدیثاً منقطعًا لا يثبته أهل الخبر لأنهم لا يحتجون بالمنقطع" (ج ا ص ۱۷۵، دوسرا نسخہ ا/۱۰۴) یعنی (تمام) اہل خبر (اہلِ حدیث) منقطع حدیث کو حجت نہیں سمجھتے۔ نیز دیکھئے شرح معانی الآثار (ج ا ص ۱۹ ، ۵۷، ج ۲ ص ۱۳۰، ۱۸۳، ۴۵۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۳۲۴، ۴۷۰ نسخہ ایچ ایم سعید کمپنی کراچی)

خلاصہ یہ ہے کہ یہ روایت امام ابوحنیفہ، قاضی ابو یوسف اور محدثین کے نزدیک منقطع ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔

۵۔ عن ابن عمر رضي الله عنه مرفوعًا:

إذا جلست المرأة في الصلوٰة .... إلخ (کنز العمال ج ۷ ص ۵۴۹)

☆ کنز العمال حدیث: ۲۰۲۰۲ حوالہ مذکورہ کے بعد لکھا ہوا ہے کہ عدق وضعفه/ ابن عمر یعنی اسے ابن عدی اور بیہقی نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے اور اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

ابن عدی کی کتاب الکامل فی ضعفاء الرجال (ج ۲ ص ۶۳۱) اور السنن الکبریٰ للبیہقی (ج ۲ ص ۲۲۳) میں یہ روایت ابو مطیع الحکم بن عبداللہ البلخی کی سند سے موجود ہے۔

ابو مطیع جہمی متروک تھا۔ اس پر شدید جرح کے لئے دیکھئے میزان الاعتدال (ج ا ص ۵۷۴) بعض لکھتے ہیں کہ وہ "صالح مرجئ" تھا۔

لیکن ابو حاتم رازی سے روایت ہے: "كان مرجئًا كذابًا" یعنی وہ مرجئ اور (نیک ہونے کے باوجود) جھوٹا تھا۔ (لسان المیزان ج ۲ ص ۴۰۸)

۶۔ عن أبي إسحاق عن الحارث عن علي....

(مصنف ابن ابی شیبہ ج ا ص ۲۷۹، السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۲ ص ۲۲۲)

☆ یہ سند سخت ضعیف ہے۔ الحارث الاعور ضعیف رافضی تھا۔ بعض علماء نے اسے کذاب بھی قرار دیا ہے۔ اس تفصیل کے لئے تہذیب التہذیب وغیرہ کتبِ رجال کا مطالعہ کریں۔

ابواسحاق السبیعی مدلس تھے، عن سے روایت کر رہے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ یہ قول سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ثابت ہی نہیں ہے۔

۷۔ عن ابن عباس أنه سئل عن صلاة المرأة .... (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱ ص ۲۸۰)

☆ عبداللہ بن عباس سے اس قول کے راوی بکیر بن عبداللہ بن الاشج ہیں۔ امام حاکم فرماتے ہیں کہ بکیر کا عبداللہ بن حارث بن جزء (متوفی ۸۶ھ) سے سماع ثابت نہیں ہے۔ "وإن روايته عن التابعين." اوران کی روایت صرف تابعین سے ہے۔

(تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۴۳۲)

معلوم ہوا کہ عبداللہ بن حارث بن جزء رحمہ اللہ سے بہت پہلے فوت ہونے والے ابن عباس (متوفی ۶۸ھ) سے بھی بکیر کا سماع ثابت نہیں ہے لہٰذا یہ سند منقطع ہے۔

۸۔ عن إبراهيم .... (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱ ص ۲۷۰ و بیہقی ج ۲ ص ۲۲۲)

☆ ابراہیم نخعی کے اس قول کی سند میں مغیرہ (بن مقسم) راوی مدلس ہیں اور عن سے روایت کر رہے ہیں۔ دیوبندیوں کی مستند کتاب "آثار السنن" حدیث: ۳۵۳ کے حاشیہ: ۱۲۵ ص ۹۷ پر لکھا ہوا ہے کہ "قلت: عنعنة المدلس لا يحتج بها لمظنة التدليس" یعنی میں (نیموی) کہتا ہوں کہ مدلس کے عن سے حجت نہیں پکڑی جا سکتی کیونکہ تدلیس کا گمان ہے۔

۹۔ عن مجاهد .... (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱ ص ۲۷۰)

☆ اس کا راوی لیث بن ابی سلیم جمہور کے نزدیک ضعیف اور مدلس تھا۔ حافظ ابن حجر کا یہ فیصلہ ہے کہ وہ اختلاط کی وجہ سے متروک ہو گیا تھا۔ دیکھئے تہذیب التہذیب و آثار السنن حاشیہ تحت حدیث: ۲۱۰، اس کے باوجود نیموی صاحب نے لیث کی ایک روایت کو "وإسناده صحيح" لکھ دیا ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

۱۰۔ عن ابن عمر أنه سئل .... (جامع المسانید ج ۱ ص ۴۰۰)

☆ اس کا بنیادی راوی ابو محمد الحارثی (عبداللہ بن محمد بن یعقوب) کذاب ہے۔ دیکھئے

میزان الاعتدال ولسان المیزان ، باقی راوی قبیصہ الطبری ، زکریا بن یحییٰ النیسابوری ، عبداللہ بن احمد بن خالد الرازی ، زر بن نجیح وغیرہم سب مجهول ہیں جنھیں حارثی نے گھڑ لیا تھا۔ دوسری سند میں بھی قاضی عمر بن حسن الاشنانی مجروح اور علی بن محمد البزار، احمد بن محمد بن خالد اور زر بن نجیح سب مجہول ہیں۔ ابن خسرو معتزلی نے بھی اسے اشنانی کی سند سے ہی روایت کیا ہے لہٰذا خلاصہ یہ ہے کہ یہ روایت موضوع ہے۔

١١۔ عن أبي هريرة عن النبي ﷺ قال:

((التسبیح للرجال والتصفیق للنساء)) یعنی نبی ﷺ نے فرمایا: تسبیح مردوں کے لئے ہے اور تصفیق (ایک ہاتھ کی پشت پر دوسرے ہاتھ کی پشت مارنا) عورتوں کے لئے۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۶۰، ح ۱۲۰۳، صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۸۰، ح ۴۲۲، ترمذی ج ۱ ص ۸۵ ح ۳۶۹)

☆ یہ حدیث بالکل صحیح ہے مگر تسبیح و تصفیق کے فرق سے یہ قطعاً ثابت نہیں ہوتا کہ مردوں اور عورتوں کے نماز پڑھنے میں بھی فرق ہے۔

١٢۔ عن عائشة قالت: قال رسول اللہ ﷺ: ((لا تقبل صلوٰة الحائض إلا بخمار)) یعنی بالغہ عورت کی نماز اوڑھنی کے بغیر قبول نہیں ہوتی۔

(ترمذی ج ۱ ص ۸۶ ح ۳۷۷، ابوداود ج ۱ ص ۹۴ ح ۶۴۱)

☆ یہ حدیث بھی صحیح ہے، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عورت کی نماز ننگے سر نہیں ہوتی مگر مرد کی نماز ننگے سر ہو جاتی ہے۔ پردے میں فرق سے یہ مسئلہ قطعاً ثابت نہیں ہوتا کہ عورت دوسرے طریقے سے نماز پڑھے گی اور مرد دوسرے طریقے سے۔

رسول اللہ ﷺ تمام انسانوں کے لئے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں، چاہے مرد ہوں یا عورتیں۔ لہٰذا جس طرح رسول اللہ ﷺ نے نمازیں پڑھی تھیں، عورتیں بھی اسی طرح ہی پڑھیں گی۔ اِلا یہ کہ کسی خاص مسئلے میں صحیح دلیل سے فرق و تخصیص ثابت ہو جائے۔ دوپٹا اور تصفیق کے بارے میں فرق تو حدیث سے ثابت ہے مگر نماز کے طریقے میں فرق یہ کسی حدیث سے ثابت نہیں۔ اب آپ خود فیصلہ کریں کہ ''حدیث اور اہلِ حدیث'' جیسی کتابوں

سے صحیح العقیدہ لوگوں کو کیوں کر کتاب وسنت سے ہٹایا جا سکتا ہے؟ اس موضوع پر تفصیلی معلومات کرنے کے لئے میری کتاب ''علمی مقالات'' (جلد اول) کا مطالعہ کریں جو یقیناً تشفی کا باعث بنے گا۔ (ان شاء اللہ) [شہادت، جون ۲۰۰۱ء]

نماز میں مخصوص آیات کا جواب دینا

سوال نماز میں قرآن کی چند آیاتِ کا جواب دینا جیسا کہ احادیث میں مذکور ہے۔ کیا یہ درست ہے اور ان کا جواب تمام مقتدیوں کو دینا چاہیے یا صرف امام کو اور اگر مقتدی جواب دے تو وہ جہری طور پر دے یا دل میں؟ (طارق علی بروہی، کراچی)

الجواب صحیح مسلم (صلاۃ المسافرین باب استحباب تطویل القراءۃ فی صلوٰۃ اللیل ح۷۷۲) میں ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب رات کی نماز میں تسبیح والی آیت پڑھتے تو تسبیح فرماتے جب دعا والی آیت پڑھتے تو دعا فرماتے اور جب تعوذ و پناہ والی آیت پڑھتے تو آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتے تھے۔

امام ابو بکر بن ابی شیبہ نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ (سیدنا) ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ نے جمعہ کی نماز پڑھی۔ جب آپ نے ﴿ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ﴾ کی تلاوت کی تو کہا: سَبِّحِ اسْمِ رَبِّيَ الْأَعْلَى. (المصنف ج۲ص۵۰۸ ح۸۶۴۰ وسندہ صحیح)

تقریباً یہی عمل، سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ اور سیدنا عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ وغیرہما سے ثابت ہے۔ (المصنف ۵۰۹/۲ ح۸۶۴۲ وسندہ صحیح و ح۸۶۴۷ وسندہ صحیح)

لہٰذا امام کے لئے جائز ہے کہ جمعہ وغیرہ میں آیت کی تلاوت کے بعد کبھی کبھار اس کا جواب بھی عربی زبان میں ہی جہراً یا سراً دے دے تاہم مجھے ایسی کوئی دلیل نہیں ملی کہ مقتدی حضرات بھی آیات کا جواب دیں گے! لہٰذا نمازیوں کو چاہیے کہ وہ حالتِ جہر میں امام کے پیچھے صرف سورۂ فاتحہ پڑھیں۔ واللہ اعلم [شہادت، فروری ۲۰۰۰ء]

سوال سبح اسم ربک الاعلیٰ کے جواب میں سبحان ربی الاعلیٰ کہنے کی دلیل ارشاد فرمائیں؟ (ایک سائل)

الجواب نبی کریم ﷺ سے ﴿ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ﴾ پڑھنے کے بعد سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى پڑھنا ثابت نہیں ہے دیکھئے "شہادت" اسلام آباد (ج ۷ شمارہ ۱۲ ص ۴۱، دسمبر ۲۰۰۰ء) سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے باسند صحیح ثابت ہے کہ وہ ﴿ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ﴾ کے بعد سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى کہتے تھے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۲ ص ۵۰۹)

سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے نماز جمعہ میں ﴿ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ﴾ پڑھا تو کہا: سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى (مصنف ابن ابی شیبہ ۲/۵۰۸ وسندہ صحیح)

تقریباً یہی مسئلہ سیدنا عبداللہ بن الزبیر وعمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے اور کسی صحابی سے اس کی مخالفت مروی نہیں لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ امام کا سورۃ الاعلیٰ کی قراءت میں سبحان ربی الاعلیٰ کہنا بالکل صحیح ہے۔ (رہے مقتدی تو ان کے لئے سورۂ فاتحہ پڑھنا فرض ہے اور اس کے علاوہ حالت جہری میں دیگر قراءت ممنوع ہے، لہٰذا انہیں چپ رہنا چاہیے۔ واللہ اعلم)

[شہادت، اکتوبر ۲۰۰۳ء]

سورۂ غاشیہ کے اختتام پر جواب

سوال سورۂ غاشیہ کے اختتام پر ﴿ ثم ان علینا حسابھم ﴾ کے جواب میں "اللّٰھم حاسبنی حسابًا یسیرًا" کہنے کی دلیل مولانا مبشر احمد ربانی صاحب نے "آپ کے مسائل اور ان کا حل" میں ذکر کی ہے۔ جلد اول ص ۱۳۰ پر مولانا مبشر ربانی صاحب کہتے ہیں کہ اللہ کے نبی ﷺ اپنی نماز میں ((اللّٰھم حاسبنی حسابًا یسیرًا)) کہتے۔ امام حاکم نے اسے مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے، ذہبی نے موافقت کی۔

(مسند احمد ۶/۴۸، ابن خزیمہ: ۸۴۹، مستدرک الحاکم: ۱/۵۰، ۲۰۰) (ایک سائل)

الجواب یہ روایت "اللّٰھم حاسبنی حسابًا یسیرًا" بغیر تصریح سورۂ غاشیہ کے درج ذیل کتابوں میں موجود ہے:

مسند احمد (۶/۴۸ ح ۲۴۷۱۹ و ۶/۱۸۵ ح ۲۶۰۳۱)، صحیح ابن خزیمہ (۲/۳۰، ۳۱ ح ۸۴۹)

صحیح ابن حبان (الاحسان ۹/۲۳۱، ۲۳۲ ح ۷۲۸۷)

مستدرک الحاکم (۱/۲۵۵ ح ۹۳۶) وصححہ علیٰ شرط مسلم ووافقہ الذہبی
اس کی سند حسن لذاتہ ہے لیکن سورۃ الغاشیۃ کے ساتھ خاص کر اس دعا کا پڑھنا ثابت نہیں ہے۔ [شہادت، اکتوبر ۲۰۰۳ء]

قراءت کی غلطی کا نماز پر اثر

سوال نماز میں قراءت کی کس قسم کی غلطیوں سے نماز فاسد ہو جاتی ہے؟ مثلاً درمیان میں حرف چھوڑنا، ایک کی جگہ دوسرا حرف بولنا، زائد حرف بولنا، زیر زبر کی غلطی۔ (سید عبدالناصر، ضلع مردان)

الجواب اس سلسلے میں دلیل کے لئے قاری حضرات سے رابطہ قائم کریں۔ راقم الحروف کی تحقیق میں اگر نادانستہ غلطی ہو جائے تو ﴿ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَآ أَخْطَأْتُم بِهِ ﴾ [الاحزاب:۵] کی رو سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔ واللہ اعلم [شہادت، دسمبر ۲۰۰۱ء]

ہر تکبیر پر رفع یدین کرنا؟

سوال نماز کے اندر ہر تکبیر کے وقت رفع الیدین کرنا سنت ہے یا نہیں؟ کیونکہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ کا موقف تھا کہ ہر تکبیر پر رفع الیدین کرنا سنت ہے۔ (ایک سائل)

الجواب اس سلسلہ کی تمام روایات ضعیف ہیں۔ شیخ صاحب رحمہ اللہ کو اس مسئلہ میں تسامح ہوا ہے۔ تاہم یاد رہے کہ صحیح حدیث سے یہ ثابت ہے کہ رکوع سے پہلے ہر تکبیر پر رفع یدین کرنا چاہئے۔ دیکھئے سنن ابی داود (۷۲۲ بتحقیقی وھو حدیث صحیح)

[شہادت، جولائی ۲۰۰۱ء]

سجدۂ سہو رہ جائے تو نماز کا حکم؟

سوال امام تین رکعت پڑھ کر اٹھنا بھول گیا پھر بیٹھ گیا، مقتدی نے لقمہ دیا پھر امام کھڑا ہو گیا اور رکعت پوری کر دی اور سجدہ سہو نہیں کیا، اس نماز کا کیا حکم ہے؟ امام اور مقتدیوں کی نماز کا کیا حکم ہے لوٹائی جائے یا نہیں؟ (ظفر اقبال، کامرہ)

الجواب ایسی نماز کا دوبارہ پڑھنا ثابت نہیں ہے لہٰذا نماز ہو گئی ہے دوبارہ لوٹانے کی ضرورت نہیں۔ [شہادت، دسمبر ۲۰۰۳ء]

صلوٰۃ المسلمین پر ایک نظر

سوال مسعود احمد صاحب کی تصنیف ''صلوٰۃ المسلمین'' پر ڈنکے کی چوٹ پر عمل کیا جارہا ہے، کیا مذکورہ کتاب صحیح ترین احادیث پر مشتمل ہے؟ کیا مذکورہ کتاب پر عمل پیرا ہوا جا سکتا ہے؟ مذکورہ کتاب میں جو جو مسائل ترتیب دیئے گئے ہیں، کیا وہ مستند ترین ہیں؟

(عبدالستار سومرو، کراچی)

الجواب مسعود احمد خارجی تکفیری کی تصنیف ''صلوٰۃ المسلمین'' دو قسم کی مرویات پر مشتمل ہے:

① صحیح وحسن احادیث

یہ روایات انھوں نے اہلِ حدیث محققین و دیگر علماء مثلاً حافظ ابن حجر عسقلانی، علامہ شوکانی اور شیخ البانی رحمہم اللہ وغیرہم سے صراحتاً نقل کر رکھی ہیں۔ والحمد للہ

② ضعیف ومردود روایات

مثلاً ''صلوٰۃ المسلمین'' اشاعت پنجم (ص ۳۰۵ تا ۳۰۷) ایک قنوت موجود (لکھا ہوا) ہے جسے مسعود صاحب نے مصنف عبدالرزاق (ج ۳ ص ۱۱۶) سے نقل کر کے ''سندہ صحیح'' لکھ رکھا ہے۔ مصنف عبدالرزاق میں اس کی سند ''**عن معمر عن عمرو عن الحسن**'' إلخ منقول ہے۔ (دیکھئے مصنف عبدالرزاق ح ۴۹۸۲)

عمرو سے مراد عمرو بن عبید ہے۔

دیکھئے مصنف عبدالرزاق (۱۹۹۸۵) اور تہذیب الکمال (ج ۱۴ ص ۲۷۶)

عمرو بن عبید المعتزلی سخت مجروح تھا۔ اسے یونس بن عبید، حمید الطویل، عوف الاعرابی، ابن عون اور ایوب السختیانی نے کذاب قرار دیا۔ حمید الطویل نے کہا کہ وہ حسن بصری پر جھوٹ بولتا ہے۔ ابو حاتم الرازی اور الفلاس وغیرہما نے اسے متروک قرار دیا ہے۔

دیکھئے میزان الاعتدال (۲۷۳/۳۔۲۸۰) اور تہذیب التہذیب (۶۹/۸۔۷۳)

ایسی موضوع سند کو "سندہ صحیح" کہنا مسعود صاحب جیسے لوگوں کا ہی کام ہے۔

مسعود صاحب کے سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھیں کہ انھیں حدیث وقرآن کا علم بھی نہیں ہے اور وہ سلف صالحین کے فہم سے قرآن وحدیث نہیں سمجھتے بلکہ اپنے فہم کو ہی سند و حجت سمجھتے ہیں، لہٰذا کتاب مذکور پر بغیر تحقیق کے عمل نہ کیا جائے۔ اس سلسلے میں مکتبۃ الحدیث حضرو اور مکتبہ اسلامیہ کی شائع کردہ کتاب "مختصر صحیح نماز نبوی" کا مطالعہ تمام مسلمانوں کے لئے مفید ہے۔ [شہادت، مارچ ۲۰۰۰ء]

امام احمد کی کتاب الصلوٰۃ؟

سوال کیا کتاب الصلوٰۃ امام احمد بن حنبل کی کتاب ہے؟ (ایک سائل)

الجواب عرب ممالک وغیرہ سے شائع شدہ "کتاب الصلوٰۃ" کا امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی کتاب ہونا ثابت نہیں ہے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"وکتاب الرسالة فی الصلوٰة – قلت: هو موضوع علی الإمام"

اور کتاب: الرسالۃ فی الصلوٰۃ – میں کہتا ہوں کہ یہ امام (احمد بن حنبل) پر موضوع (من گھڑت) ہے۔ (سیر اعلام النبلاء ج ۱۱ ص ۳۳۰)

قاضی ابوالحسین محمد بن ابی یعلیٰ نے طبقات الحنابلہ میں اس کی سند لکھی ہے:

"أخبرنا المبارك قال: أخبرنا إبراهيم قال: أخبرنا أبو عمر قال: أخبرنا طيب قال: أخبرنا أحمد بن القطان الهيتي قال: حدثنا سهل التستري، قرئ علٰى مهنا بن يحي الشامي: هٰذا كتاب في الصلوٰة.."

اس سند کے کئی راویوں کے حالات نامعلوم ہیں مثلاً طیب، ابوعمر وغیرہما۔

تنبیہ: راقم الحروف نے مقدمہ نماز نبوی (مقدمۃ التحقیق) میں لکھا تھا:

"ائمۂ مسلمین نے نماز کے موضوع پر متعدد کتابیں لکھی ہیں مثلاً ابونعیم الفضل بن دکین (متوفی ۲۱۸ھ) کی کتاب الصلوٰۃ وغیرہ، عصر حاضر میں اردو اور علاقائی زبانوں میں نماز پر

متعدد کتابیں شائع ہوئی ہیں۔" (قلمی ص۱)

جسے دارالسلام لاہور کے "**مصححین**" نے درج ذیل الفاظ میں شائع کردیا:

"نماز کی اس اہمیت کے پیشِ نظر بہت سے ائمہ مسلمین نے نماز کے موضوع پر متعدد کتابیں لکھی ہیں مثلاً ابونعیم الفضل بن دکین رحمہ اللہ (متوفی ۲۱۸ھ) اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ (متوفی ۲۴۱) کی کتاب الصلوٰۃ وغیرہ۔ علاوہ ازیں عصرِ حاضر میں بھی اردو اور علاقائی زبانوں میں متعدد کتابیں شائع ہوئی ہیں۔" (نماز نبوی ص۱۸)

اس پیراگراف میں "اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ (متوفی ۲۴۱)" کے الفاظ دارالسلام کے **مصححین** کا اضافہ ہیں جن سے راقم الحروف بری الذمہ ہے۔

(بعد میں) مدیر مکتبہ دارالسلام نے اس عبارت مذکورہ کے بارے میں اپنے پیڈ پر لکھ کر دیا کہ "تسامح کی وجہ سے چھپ گئی ہے۔ جس پر ادارہ مقدمۃ التحقیق کے مؤلف سے معذرت خواہ ہے، عبدالعظیم اسد، دارالسلام لاہور ۱۸/۸/۲۰۰۰"

اس معذرت نامہ کی اصل میرے پاس محفوظ ہے۔ دیکھئے ماہنامہ الحدیث حضرو (۵ ص۲۲)

فائدہ: بعد میں دارالسلام والوں نے اس غلطی کی اصلاح کردی اور اضافہ شدہ الفاظ کو حذف کردیا۔ جزاہم اللہ خیراً

دیکھئے نمازِ نبوی (تصحیح وتخریج سے مزین جدید ایڈیشن) [الحدیث:۲۸]

فرض نمازیں اور ان کی رکعات

سوال دن رات میں کتنی نمازیں فرض ہیں؟ قرآن وحدیث سے جواب دیں۔

(فیاض خان دامانوی، بریڈفورڈ)

الجواب نبی کریم ﷺ نے جب سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف بھیجا تو فرمایا: ((فأخبرهم أن الله فرض عليهم خمس صلوات في يومهم وليلتهم))

پس انہیں بتاؤ اللہ نے ان پر دن رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔

(صحیح البخاری: ۷۳۷۲ وصحیح مسلم ۱۹/۱۲۱)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ" فرض اللّٰہ الصلوٰۃ حین فرضھا رکعتین رکعتین فی الحضرو السفر فاقرت صلوٰۃ السفر و زید فی صلوٰۃ الحضر"

اللہ نے جب نماز فرض کی تو سفر اور حضر (گھر اور حالتِ اقامت) میں دو دو رکعتیں فرض کیں پھر سفر کی نماز تو اسی پر قائم رہی اور حضر (گھر اور حالتِ اقامت) والی نماز میں اضافہ کر دیا گیا۔ (صحیح بخاری: ۳۵۰ وصحیح مسلم: ۱۵۷۰/۶۸۵)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے دوسری روایت میں آیا ہے:" فرضت الصلوٰۃ رکعتین ثم هاجر النبي ﷺ ففرضت أربعًا وترکت صلوٰۃ السفر علی الأولیٰ"

نماز دو (دو) رکعتیں فرض ہوئی پھر نبی ﷺ نے ہجرت فرمائی تو چار (چار) رکعتیں فرض کر دی گئیں اور سفر کی نماز کو اس کے پہلے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ (صحیح بخاری: ۳۹۳۵)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:" فرض اللّٰہ الصلوٰۃ علی لسان نبیکم ﷺ فی الحضر أربعًا وفی السفر رکعتین وفی الخوف رکعة"

اللہ تعالیٰ نے تمھارے نبی ﷺ کی زبان مبارک کے ذریعے سے حضر میں چار رکعتیں، سفر میں دو اور خوف میں ایک رکعت نماز فرض کی۔ (صحیح مسلم: ۱۵۷۵/۶۸۷)

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:" کان أول ما افترض علی رسول اللّٰہ ﷺ الصلوٰۃ رکعتان رکعتان إلا المغرب فإنھا کانت ثلاثًا، ثم أتم اللّٰہ الظھرو العصر و العشاء الآخرۃ أربعًا فی الحضر وأقر الصلوٰۃ علی فرضھا الأول فی السفر"

رسول اللہ ﷺ پر پہلے دو دو رکعتیں نماز فرض ہوئی تھی سوائے مغرب کے، وہ تین رکعات فرض تھی۔ پھر اللہ نے حضر میں ظہر، عصر اور عشاء کی نماز چار (چار) کر دی اور سفر والی نماز اپنی پہلی حالت پر (دو دو سوائے مغرب کے) فرض رہی۔

(مسند الامام احمد ج ۶ ص ۲۷۲ ح ۲۶۸۶۹ دوسرا نسخہ: ۲۶۳۳۸ وسندہ حسن لذاتہ)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہی روایت ہے:" فرضت صلوٰۃ السفر والحضر رکعتین فلما أقام رسول اللّٰہ ﷺ بالمدینة زید فی صلوٰۃ الحضر رکعتان رکعتان

وتركت صلوٰة الفجر لطول القراءة وصلوٰة المغرب لأنها وتر النهار"
سفر اور حضر میں دو (دو) رکعتیں نماز فرض ہوئی۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں اقامت اختیار کی تو حضر کی نماز میں دو دو رکعتوں کا اضافہ کر دیا گیا اور صبح کی نماز کو طولِ قراءت اور مغرب کی نماز کو دن کے وتر ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیا گیا۔

(صحیح ابن حبان ۴/۱۸۰ ح ۲۷۲۷ دوسرا نسخہ: ۲۷۳۸ و صحیح ابن خزیمہ ۲/۷۱ ح ۹۴۴ وسندہ حسن)

تنبیہ: اس روایت کے راوی محبوب بن الحسن بن ہلال بن ابی زینب حسن الحدیث ہیں، انھیں جمہور محدثین نے ثقہ و صدوق قرار دیا ہے۔

ان احادیثِ صحیحہ سے معلوم ہوا کہ دن رات میں پانچ نمازیں (ہر مکلّف پر) فرض ہیں۔

۱۔ نمازِ فجر ۲۔ نمازِ ظہر ۳۔ نمازِ عصر
۴۔ نمازِ مغرب ۵۔ نمازِ عشاء

نمازِ فجر اور نمازِ عشاء کا خاص طور پر ذکر قرآن مجید میں ہے۔ (سورۃ النور: ۵۸)
ظہر کا اشارہ سورۂ بنی اسرائیل میں موجود ہے۔ (آیت: ۷۸)
نیز دیکھئے کتاب الأم للامام الشافعی (۱/ ۶۸)

اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے کہ دن رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں۔

حافظ ابن حزم (متوفی ۴۵۶ھ) فرماتے ہیں: "اس پر اتفاق (اجماع) ہے کہ پانچ نمازیں فرض ہیں۔ اس پر اتفاق (اجماع) ہے کہ خوف و امن، سفر و حضر میں صبح کی نماز دو رکعتیں (فرض) ہے اور خوف و امن، سفر و حضر میں مغرب کی نماز تین رکعتیں (فرض) ہے۔ اس پر اتفاق (اجماع) ہے کہ حالتِ امن میں مقیم پر ظہر، عصر اور عشاء کی نمازیں چار چار رکعات (فرض) ہیں۔" (مراتب الاجماع ص ۲۴، ۲۵)

احادیثِ صحیحہ مذکورہ سے یہ بھی ثابت ہے کہ گھر میں (حالتِ امن میں) صبح کی نماز دو رکعتیں، ظہر کی چار، عصر کی چار، مغرب کی تین اور عشاء کی چار رکعتیں فرض ہے۔ حالتِ سفر میں مغرب کے علاوہ باقی نمازیں دو دو رکعتیں فرض ہیں۔ کفار کے ساتھ جہاد کرتے وقت

حالتِ خوف میں صبح ومغرب کے علاوہ باقی نمازیں ایک ایک رکعت فرض ہیں۔

تنبیہ بلیغ: سفر میں قصر کرنا افضل ہے لیکن پوری نماز پڑھنا بھی بالکل جائز اور صحیح ہے جیسا کہ صحیح احادیث اور آثارِ صحابہ سے ثابت ہے۔ امام ابوبکر محمد بن ابراہیم بن المنذر النیسابوری (متوفی ۳۱۸ھ) نے فرمایا:

"۳۴: اجماع ہے کہ نماز ظہر کا وقت زوال آفتاب ہے۔

۳۵: اجماع ہے کہ مغرب کی نماز غروب آفتاب کے بعد واجب ہوتی ہے۔

۳۶: اجماع ہے کہ نماز فجر کا وقت طلوع فجر (صبح صادق) ہے۔" (کتاب الاجماع، مترجم ص ۲۴)

خلاصۃ التحقیق: صحیح احادیث اور اجماع سے دن رات میں ہر مکلف پر پانچ نمازوں کا فرض ہونا ثابت ہے اور اسی طرح ان نمازوں کے اوقات اور رکعتوں کی تعداد بھی صحیح احادیث واجماع سے ثابت ہے۔ والحمدللہ (۲۷/ ذوالحجہ ۱۴۲۶ھ) [الحدیث: ۲۳]

نماز میں قراءت کی ترتیب

سوال اگر کوئی امام عشاء کی فرض چار رکعتوں میں پہلی رکعت میں قل اعوذ برب الناس اور دوسری رکعت میں سورۃ الاخلاص پڑھے تو اس صورت میں ہماری نماز کیسے ہوگی؟

(ایک سائل)

الجواب بہتر یہی ہے کہ قرآن مجید ترتیب کے ساتھ پڑھا جائے جیسا کہ عام احادیث سے ثابت ہے لیکن بغیر ترتیب کے پڑھنا بھی جائز ہے۔

صحیح حدیث میں آیا ہے کہ نبی ﷺ نے نماز میں سورۃ النساء پڑھی پھر سورۂ آل عمران پڑھی۔ (صحیح مسلم: ۷۷۲ باب استحباب تطویل القراءۃ فی صلاۃ اللیل، دوسری نسخہ ج ۱ ص ۲۶۴)

لہٰذا صورتِ مذکورہ میں آپ کی نماز ہوگئی ہے۔ [شہادت، فروری ۲۰۰۲]

نماز میں جوتے سامنے رکھنا

سوال ماہنامہ ''محدث'' نومبر ۱۹۹۹ء شعبان ۱۴۲۰ھ ج ۳۱ عدد ۱۱، علامہ البانی رحمہ اللہ نمبر ص ۶۱ تا ۶۳۔ شیخ حافظ ثناء اللہ المدنی حفظہ اللہ کا مضمون ہے، اس میں لکھا ہے کہ شیخ مدنی نے علامہ البانی سے ایک سوال پوچھا کہ جوتے سامنے رکھ کر نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ علامہ البانی نے جائز قرار دیا تو شیخ مدنی نے طبرانی صغیر ص ۱۶۵ مطبع انصاری دہلی سے ایک روایت پیش کی تو علامہ البانی نے اسے ضعیف قرار دیا، پھر شیخ مدنی نے علامہ صاحب کا تبصرہ الشیخ عبداللہ روپڑی رحمہ اللہ کو بھیجا تو انھوں نے تفصیلی جواب لکھا پھر علامہ البانی رحمہ اللہ نے خاموشی اختیار کر لی۔ میں نے اس سلسلے میں الشیخ مدنی کو خط بھی لکھا مگر تا حال کوئی جواب نہیں آیا۔ محترم! میری اس مسئلے پر اپنے جامعۃ الدراسات کے ایک استاذ سے بات ہوئی تو انھوں نے بھی شیخ مدنی کی حمایت کی۔ اس مسئلے میں حق بات کیا ہے؟ دلائل سے وضاحت فرمائیں۔ (ایک سائل)

الجواب شاید آپ کی مراد طبرانی کی درج ذیل حدیث ہے: ''إذا خلع أحدكم نعليه في الصلوة فلا يجعلهما بين يديه فيأتم بهما ... '' إلخ

اگر تم میں سے کوئی نماز میں جوتے اُتارے تو اپنے سامنے نہ رکھے، پس اُن کے ساتھ اقتدا کرے... الخ (المعجم الصغیر ج ۲ ص ۱۳، ۱۴ ح ۸۱۸ بترقیمی)

شیخ علامہ البانی رحمہ اللہ نے اسے ''ضعیف جدًا'' قرار دیا ہے۔

(السلسلۃ الضعیفۃ ج ۲ ص ۳۱۵ ح ۹۸۲)

اس کے دو راوی زیاد بن ابی زیاد الجصاص اور ابو سعید المسیب بن شریک الشقری دونوں سخت مجروح و متروک تھے لہٰذا یہاں شیخ البانی رحمہ اللہ کی تحقیق بالکل صحیح ہے۔ والحمد للہ

[شہادت، مارچ ۲۰۰۳ء]

نوافل، وتر اور قنوت کا بیان

سنن اور وتر کی قضا کا مسئلہ

سوال کیا صبح کی سنت اور وتر کی قضا ضروری ہے؟ (ایک سائل)

الجواب صبح کی سنتوں اور وتر کی قضا پڑھنا ہی راجح ہے۔ واللہ اعلم

وتروں کے بعد نوافل کا حکم

سوال وتر آخری نماز ہونی چاہئے یا وتروں کے بعد بھی نوافل ادا کر سکتے ہیں؟

چند احباب کہتے ہیں، وتر آخری نماز ہونی چاہئے اور جو دو رکعت بعد از وتر ثابت ہیں وہ رسول اللہ ﷺ کا خاصہ ہے، کیا یہ درست ہے؟ اور کیا تراویح اور وتر کے بعد نوافل پڑھ سکتے ہیں؟ (ظفر اقبال، شکر گڑھ)

الجواب حدیث میں آیا ہے کہ وتر کو رات کی آخری نماز بناؤ لہٰذا وتر کے بعد نوافل پڑھنا، بہتر نہیں ہے۔ بعض روایات میں آپ ﷺ کا وتر کے بعد دو رکعتیں بیٹھ کر پڑھنا ثابت ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص وتر کے بعد دو رکعتیں پڑھ لے تو جائز ہے۔ ہمارے لئے بہتر یہی ہے کہ ہم حکم پر عمل کریں۔ واللہ اعلم

اگر کوئی شخص تراویح اور وتر کے بعد نوافل پڑھتا ہے تو یہ عمل حرام یا ممنوع نہیں، لیکن بہتر یہی ہے کہ وتر کو رات کی آخری نماز بنایا جائے۔ یاد رہے کہ امام کے ساتھ تراویح پڑھنے والے کو ساری رات کے قیام کا ثواب ملتا ہے۔

دیکھئے سنن الترمذی (۸۰۶ وسندہ صحیح وقال الامام الترمذی رحمہ اللہ: ھذا حدیث حسن صحیح)

[شہادت، اگست ۲۰۰۰ء]

وتر کے بعد تہجد؟

سوال ''وتر'' اگر شروع رات میں پڑھ لیا جائے اور کوئی شخص رات کے پچھلے حصے میں جاگ جائے تو کیا تہجد پڑھ سکتا ہے؟! (محمد عادل شاہ، برطانیہ)

الجواب اگر شروع رات میں وتر پڑھ لیا جائے تو بہتر ہے کہ بعد میں تہجد کی نماز نہ پڑھی جائے کیونکہ ارشادِ نبوی ہے: ((اجعلوا آخر صلاتكم بالليل وترًا .))

رات میں اپنی آخری نماز وتر کو بناؤ۔ (صحیح بخاری: ۹۹۸، صحیح مسلم: ۷۴۹ ببعض معناہ بلفظ مختلف)

تاہم اگر کوئی شخص وتر کے بعد بھی تہجد پڑھنا چاہتا ہے تو یہ حرام نہیں بلکہ جائز ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے سفر میں وتر کے بعد دو رکعتیں پڑھنے کا حکم دے کر اجازت فرما دی کہ دو رکعتیں پڑھ سکتے ہیں۔ دیکھئے صحیح ابن خزیمہ (ج ۲ ص ۱۵۹ ح ۱۱۰۶، وسندہ حسن) وصحہ ابن حبان (موارد الظمآن: ۶۸۳) اور صحیح مسلم (۷۳۸ب، دارالسلام: ۱۷۲۴)

سیدنا طلق بن علی رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ رمضان میں قیام کیا اور وتر پڑھ لیا پھر اپنی مسجد میں گئے تو اپنے ساتھیوں کو نماز پڑھائی لیکن وتر نہیں پڑھا اور کہا:

میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ((لا وتران في ليلة .))

ایک رات میں وتر کی نماز دو دفعہ نہیں ہے۔ (سنن ابی داود: ۱۴۳۹، وسندہ صحیح)

معلوم ہوا کہ وتر کے بعد بھی تہجد کی نماز جائز ہے لیکن دو دفعہ وتر پڑھنے جائز نہیں ہیں۔

وما علینا إلا البلاغ (۲۹/ نومبر ۲۰۰۸ء)

قنوت پڑھنے کے لئے تکبیر کہنا

سوال کیا کسی روایت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قنوت پڑھنے کے لئے بھی تکبیر کہی جائے؟ (ندیم انبالوی)

الجواب عبدالرزاق (ج ۳ ص ۱۰۹ ح ۴۹۵۹) ابن ابی شیبہ (۲/ ۳۱۵) اور طحاوی (معانی الآثار ۱/ ۲۵۰) نے صحیح سند کے ساتھ مخارق (بن خلیفہ) عن طارق بن شہاب

روایت کیا ہے کہ" صليت خلف عمر صلاة الصبح فلما فرغ من القراءة فى الركعة الثانية كبر ثم قنت ثم كبر فركع "

میں نے عمر (رضی اللہ عنہ) کی اقتدا میں صبح کی نماز پڑھی، جب آپ دوسری رکعت میں قراءت سے فارغ ہوئے تو اللہ اکبر کہی تو دعائے قنوت پڑھی پھر تکبیر کہی اور رکوع کیا۔

اس کی سند صحیح ہے، مخارق بن خلیفہ الاحمسی بالاتفاق ثقہ ہیں۔

معلوم ہوا کہ قنوت نازلہ میں تکبیر کہنا سنت خلفائے راشدین ہے۔ دوسرے صحابہ مثلاً سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے بھی اس کی تائید مروی ہے۔

جب تکبیر ثابت ہوگئی تو رفع یدین بھی ثابت ہوگیا۔

یہاں یہ بھی یاد رہے کہ قنوت نازلہ میں (دعا کی طرح) ہاتھ اٹھانا رسول اللہ ﷺ (مسند احمد ج ۳ ص ۱۳۷، وسندہ صحیح) اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ وغیرہم سے ثابت ہے۔

لہٰذا راجح یہی ہے کہ تکبیر کہہ کر رفع یدین کیا جائے پھر دعا کی طرح ہاتھ اٹھالئے جائیں۔

واللہ اعلم [شہادت، جون ۱۹۹۹ء]

قنوتِ وتر رکوع سے پہلے یا بعد میں؟

سوال کیا قنوتِ وتر میں رکوع سے پہلے ہاتھ اُٹھائے جائیں گے اور اس کی کیا دلیل ہے؟ (ایک سائل)

الجواب سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ويقنت قبل الركوع اور رسول اللہ ﷺ نماز وتر میں رکوع سے پہلے قنوت پڑھتے تھے۔

(سنن نسائی ج ۳ ص ۲۳۵ حدیث: ۱۷۰۰، سنن ابن ماجہ: ۱۱۸۲)

یہ حدیث صحیح ہے کیونکہ سفیان الثوری کی متابعت فطر بن خلیفہ نے کر رکھی ہے۔

دیکھئے سنن الدارقطنی (ج ۲ ص ۳۱ ح ۱۶۴۴)

اسے الضیاء المقدسی نے المختارۃ میں روایت کیا ہے لہٰذا راجح یہی ہے کہ قنوتِ وتر رکوع سے پہلے کی جائے جیسا کہ راقم الحروف نے اپنی کتاب ہدیۃ المسلمین فی جمع الاربعین

من صلاة خاتم النبیین ﷺ (نماز کی صحیح اور مستند چالیس حدیثیں ص ۵۸ حدیث: ۲۸) میں صراحت کی ہے۔

السنن الکبریٰ للبیہقی (۳۸/۳، ۳۹) اور مستدرک الحاکم (۱۷۲/۳) کی جس روایت سے رکوع کے بعد والا قنوت ثابت ہوتا ہے۔ ''إذا رفعت رأسي ولم یبق إلا السجود'' اس کی سند الفضل بن محمد بن مسیّب الشعرانی کی وجہ سے ضعیف ہے۔ حاکم نے اسے ثقہ جبکہ الحسین بن محمد القتبانی نے کذاب کہا ہے، ابن الاخرم کہتے ہیں: '' صدوق إلا إنه کان غالیًا في التشیع '' (لسان المیزان ج۴ ص ۴۴۸ ت ۱۳۶۸)

ابو حاتم نے کہا: تکلموا فیه (الجرح والتعدیل ۶۹/۷ ت ۳۷ ۱۱۹)

لہٰذا اس پر جرح ہی راجح ہے۔

ابن مندہ نے یہی روایت الفضل بن محمد بن مسیّب سے ''أن أقول إذا فرغت من قراءتي في الوتر '' کے الفاظ کے ساتھ بیان کی ہے۔

(التوحید لابن مندہ ج ۲ ص ۱۹۱، وسندہ صحیح الی الفضل بن محمد بن المسیب)

اس سے رکوع سے پہلے قنوت ثابت ہوتا ہے لہٰذا الفضل مذکور کی روایت میں تعارض ثابت ہو گیا، اس کا دوسرا راوی ابوبکر عبدالرحمٰن بن عبدالملک بن شیبہ بھی متکلم فیہ ہے۔

(دیکھئے تہذیب الکمال ج ۱۱ ص ۲۸۴)

صحیح بخاری میں اس کی صرف دو روایتیں ہیں جو کہ متابعات میں ہیں، امام بخاری رحمہ اللہ نے اس سے حجت نہیں پکڑی۔ (دیکھئے ہدی الساری مقدمہ فتح الباری ص ۴۱۸)

مختصر یہ کہ بعد از رکوع والی روایت بلحاظ سند ضعیف ہے، جبکہ قنوتِ نازلہ میں بعد از رکوع ہی قنوت ثابت ہے۔ باقی قنوتِ وتر میں ہاتھ اٹھانے کی کسی صحیح حدیث میں وضاحت مذکور نہیں ہے لہٰذا بہتر یہی ہے کہ ہاتھ نہ اُٹھائے جائیں تاہم اگر کوئی دوسرے عام دلائل کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہاتھ اُٹھاتا ہے تو یہ بھی جائز ہے۔ واللہ اعلم [شہادت، جنوری ۲۰۰۰ء]

سوال وتر نماز میں دعائے قنوت رکوع سے پہلے پڑھنی چاہئے یا رکوع کے بعد؟

اور قنوت میں ہاتھ اٹھانے چاہئیں یا نہیں؟ (محمد شاہد میمن)

الجواب رکوع سے پہلے پڑھنی چاہئے اور بہتر یہ ہے کہ ہاتھ نہ اٹھائے جائیں۔

[شہادت، جولائی ۲۰۰۱ء]

قنوتِ وتر میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا؟

سوال کیا قنوت وتر میں ہاتھ اُٹھا کر دعا کرنا ثابت ہے؟ (ایک سائل)

الجواب ابو حاتم الرازی رحمہ اللہ (متوفی ۲۷۷ھ) فرماتے ہیں:

" قال لي أبو زرعة :ترفع يديك في القنوت؟ قلت :لا! فقلت له : فترفع أنت؟ قال :نعم :فقلت :ماحجتك ؟قال:حديث ابن مسعود ، قلت :رواه ليث بن أبي سليم ، قال: حديث أبي هريرة ، قلت:رواه ابن لهيعة ،قال:حديث ابن عباس، قلت :رواه عوف ، قال: فما حجتك في تركه ؟ قلت :حديث أنس أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان لا يرفع يديه في شيء من الدعاء إلا في الإستسقاء،فسكت "

ابوزرعہ (الرازی رحمہ اللہ، متوفی ۲۶۴ھ) نے مجھ سے پوچھا: کیا آپ قنوت میں ہاتھ اُٹھاتے ہیں؟ میں نے کہا: نہیں! پھر میں نے ان سے پوچھا: کیا آپ (قنوت میں) ہاتھ اُٹھاتے ہیں؟ انھوں نے کہا: جی ہاں، میں نے پوچھا: آپ کی دلیل کیا ہے؟ انھوں نے کہا: حدیث ابن مسعود، میں نے کہا: اسے لیث بن ابی سلیم نے روایت کیا ہے۔ انھوں نے کہا: حدیث ابی ابوہریرہ، میں نے کہا: اسے ابن لہیعہ نے روایت کیا ہے۔ انھوں نے کہا: حدیث ابن عباس، میں نے کہا: اسے عوف (الاعرابی) نے روایت کیا ہے۔ تو انھوں نے پوچھا: آپ کے پاس (قنوت میں) ہاتھ نہ اٹھانے کی کیا دلیل ہے؟ میں نے کہا: حدیث انس کہ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی دعا میں ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے سوائے استسقاء کے تو وہ (ابوزرعہ رحمہ اللہ)

خاموش ہو گئے۔

(تاریخ بغداد ج ۲ ص ۷۶ ت ۴۵۵ وسندہ حسن، وذکرہ الذہبی فی سیر اعلام النبلاء ۱۳/۲۵۳)

اس حکایت کے راویوں کا مختصر تذکرہ درج ذیل ہے:

(۱) أبو منصور محمد بن عيسى بن عبد العزيز: وكان صدوقًا

(تاريخ بغداد ٢/ ٤٠٦ ت ٩٣٧)

(۲) صالح بن أحمدبن محمد الحافظ: وكان حافظًا، فهمًا، ثقةً ثبتًا

(تاريخ بغداد ٩/ ٣٣١ ت ٤٨٧١)

(۳) القاسم بن أبي صالح بندار: كان صدوقًا متقنًا للحديث

(لسان الميزان ٤/ ٤٦٠ ت ٦٦٨٥)

تنبیہ: قاسم بن ابی صالح پر تشیع کا الزام ہے جو یہاں روایت حدیث میں مردود ہے۔ صالح بن احمد کے قول سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کا قاسم بن ابی صالح سے سماع قبل از اختلاط ہے لہٰذا یہ سند حسن لذاتہ ہے۔

اب ان روایات کی مختصر تحقیق پیشِ خدمت ہے جنھیں امام ابوزرعہ اور امام ابوحاتم نے باہم مناظرے میں پیش کیا ہے۔

۱: حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ (جزء القراءۃ للبخاری تحقیقی: ۹۹ مصنف ابن ابی شیبہ ۱/۳۰۷ ح ۲۹۵۳، المعجم الکبیر ۹/۳۲۷ ح ۹۴۲۵ السنن الکبریٰ للبیہقی ۲/۴۱)

اس کی سند لیث بن ابی سلیم (ضعیف ومدلس) کے ضعف کی وجہ سے ضعیف ہے۔ یہاں پر یہ بات سخت تعجب خیز ہے کہ نیموی تقلیدی نے اس سند کو "إسناده صحيح" لکھ دیا ہے۔ (دیکھئے آثار السنن: ۴۳۵) حالانکہ جمہور محدثین نے لیث مذکور کو ضعیف ومجروح قرار دیا ہے۔

زیلعی حنفی نے کہا: "وليث هذا الظاهر أنه ليث بن أبي سليم وهو ضعيف"

[اور ظاہر ہے کہ یہاں لیث سے مراد لیث بن ابی سلیم ہے اور وہ ضعیف ہے۔]

(نصب الرایۃ ۲/۹۶)

لیث مذکور پر جرح کے لئے دیکھئے احسن الکلام (سرفراز خان صفدر دیوبندی ج ۲ ص ۱۲۸) جزء القراءۃ بتحریفات امین اوکاڑوی (ص ۷۰ ح ۵۸)

۲: حدیث ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ (السنن الکبریٰ للبیہقی ۳/ ۴۱)

اس کی سند ابن لہیعہ کی تدلیس اور اختلاط کی وجہ سے ضعیف ہے۔

۳: حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ

(مصنف ابن ابی شیبہ ۲/ ۳۱۶ ح ۷۰۴۲، ۷۰۴۳ والاوسط لابن المنذر: ۵/ ۲۱۳)

یہ روایت قنوت فجر سے متعلق ہے۔ اس روایت کی دو سندیں ہیں: پہلی میں سفیان ثوری مدلس ہیں اور دوسری میں ہشیم بن بشیر مدلس ہیں لہٰذا یہ دونوں سندیں ضعیف ہیں۔ ابو حاتم رازی نے اس روایت کو عوف الاعرابی کی وجہ سے ناقابل حجت قرار دیا ہے۔ حالانکہ وہ الجرح والتعدیل میں عوف کو ''صدوق صالح الحدیث'' کہتے ہیں (۷/ ۱۵)

تنبیہ: عوف الاعرابی پر جرح مردود ہے۔ انھیں جمہور محدثین نے ثقہ وصدوق قرار دیا ہے لہٰذا وہ حسن الحدیث یا صحیح الحدیث تھے۔ صحیحین میں ان کی تمام روایات صحیح ہیں۔

۴: حدیث انس رضی اللہ عنہ (صحیح البخاری: ۱۰۰۳ و صحیح مسلم: ۶۷۷/ ۲۹۷)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ امام ابو حاتم الرازی رحمہ اللہ حسن لغیرہ حدیث کو حجت نہیں سمجھتے تھے۔ کیونکہ امام ابو زرعہ الرازی رحمہ اللہ کی ذکر کردہ تینوں روایات ایک دوسرے کی تائید کرتی ہیں اور ان کا ضعف شدید نہیں ہے۔ جو لوگ ضعیف + ضعیف سے حسن لغیرہ بنا دیتے ہیں، ان کے اصول پر یہ روایات باہم مل کر حسن لغیرہ بن جاتی ہیں۔ آپ نے دیکھ لیا ہے کہ ابو حاتم رازی حسن لغیرہ روایات کو حجت نہیں سمجھتے تھے۔

فائدہ: عامر بن شبل الجرمی (ثقہ راوی) سے روایت ہے کہ ''رأیت أبا قلابۃ یرفع یدیہ فی قنوتہ'' میں نے ابو قلابہ (ثقہ تابعی) کو دیکھا، وہ اپنے قنوت میں ہاتھ اُٹھاتے تھے۔ (السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۳ ص ۴۱ وسندہ حسن)

قنوت نازلہ میں (دعا کی طرح) ہاتھ اُٹھانا ثابت ہے۔ (مسند احمد ۳/ ۱۳۷ ح ۱۲۴۲۹، وسندہ صحیح)

امام اہل سنت احمد بن حنبل اور امام اسحاق بن راہویہ بھی قنوت وتر میں ہاتھ اُٹھانے کے قائل تھے۔ (دیکھئے مسائل ابی داود ص ٦٦ و مسائل احمد واسحاق روایۃ اسحاق بن منصور الکوسج ۲۱۱/۱ ت ۴۶۵، ۵۹/۲ ت ۳۴۶۸)

خلاصہ: قنوت وتر میں دعا کی طرح ہاتھ اُٹھائیں یا نہ اُٹھائیں، دونوں طرح جائز ہے لیکن بہتر یہی ہے کہ حدیث انس رضی اللہ عنہ و دیگر دلائل کی رُو سے قنوت میں ہاتھ نہ اٹھائے جائیں۔

واللہ أعلم [الحدیث:۱۴]

نمازِ وتر میں دعائے قنوت والی ایک روایت

سوال کیا وتروں میں قنوت رکوع سے پہلے پڑھنے کی روایت جو کہ جزء رفع الیدین للبخاری میں ہے، صحیح ہے؟ (ایک سائل)

الجواب جزء رفع الیدین للبخاری (ص ۱۴۷۳، ح ۹۹) والی روایت لیث عن عبدالرحمٰن بن الأسود عن أبیه عن عبداللہ (یعنی ابن مسعود) کی سند سے مروی ہے۔ اس میں مذکور ہے کہ ثم یرفع یدیه قبل الرکعة پھر (عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ) اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے (اور) رکوع سے پہلے قنوت پڑھتے تھے۔

اس کی سند لیث بن ابی سلیم کے ضعف، تدلیس اور اختلاط کی وجہ سے ضعیف ہے۔

لیث بن ابی سلیم پر جرح کیلئے تقریب التہذیب، تہذیب التہذیب، الاغتباط فی معرفۃ من رمی بالاختلاط کتابوں کا مطالعہ کریں جیسا کہ استاذ محترم مولانا ابو محمد بدیع الدین الراشدی رحمہ اللہ نے اشارہ کیا ہے۔ اس علت قادحہ کے باوجود محمد یوسف بنوری دیوبندی اور نیموی صاحبِ آثار السنن (ص ۱۶۹ ح ۶۳۵) دونوں نے اس اثر کو صحیح قرار دیا ہے۔! غالباً وہ لیث بن ابی سلیم کو غلطی سے لیث بن سعد سمجھ بیٹھے ہیں۔

عبدالرحمٰن بن الاسود بن یزید (۹۸ھ یا ۹۹ھ) میں فوت ہوئے تھے۔

(دیکھئے تہذیب الکمال ج ۱۱ ص ۱۰۸)

جبکہ لیث بن سعد ۹۳ھ میں پیدا ہوئے۔ چار یا پانچ سال کے بچے کا کوفہ آکر

عبدالرحمٰن مذکور سے ملاقات کرنا کہیں ثابت نہیں ہے۔ جبکہ محدثینِ کرام نے عبدالرحمٰن کے شاگردوں میں لیث بن ابی سلیم، اور زائدہ بن قدامہ کے استادوں میں لیث بن ابی سلیم کا تذکرہ کیا ہے۔ (دیکھئے تہذیب الکمال ج۱۱ص۱۰۷، و ج۶ص۲۰۷) [شہادت، جنوری ۲۰۰۰ء]

نمازِ ظہر سے پہلے دو سنتیں

سوال کیا نمازِ ظہر سے پہلے دو سنت پڑھنا صحیح حدیث سے ثابت ہے؟

(حافظ محمد سعد، ہری پور)

الجواب ثابت ہے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

''صليت مع النبي ﷺ سجدتين قبل الظهر'' میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ ظہر سے پہلے دو رکعت پڑھی ہیں۔

(صحیح البخاری:۱۱۷۲، صحیح مسلم:۷۲۹، و ترقیم دارالسلام:۱۶۹۸، و مترجم مع تحریفات امین اکاڑوی ج۱ص۵۵۵)

اس روایت میں سجدتین کا لفظ ہے جس کا ترجمہ رکعتیں ہے اسی طرح سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی روایت (سنن الترمذی:۳۴۲۳ وقال: ''حسن صحیح'') میں ''فإذا قام من سجدتين رفع يديه'' سے مراد ''من ركعتين'' ہے۔

نیز دیکھئے جزء رفع الیدین للبخاری بتحقیقی (ح۱ص۳۲) [شہادت، مئی ۲۰۰۴ء]

نمازِ عصر سے پہلے چار سنتیں

سوال کیا نمازِ عصر سے پہلے چار رکعت سنت پڑھنا صحیح احادیث سے ثابت ہے؟

(حافظ محمد سعد، ہری پور)

الجواب سنن الترمذی (۴۲۹) سنن ابن ماجہ (۱۱۶۱) میں علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ''كان النبي ﷺ يصلي قبل العصر أربع ركعات'' نبی ﷺ عصر سے پہلے چار رکعتیں پڑھتے تھے۔ یہ روایت شواہد کے ساتھ حسن ہے۔ دیکھئے الاوسط للطبرانی (۳/ ۲۷۵، ۲۷۶ ح ۲۶۰۱) سنن الترمذی (۴۳۰) و سنن ابی داود (۱۲۷۱) میں ابن عمر عن

النبی ﷺ کی سند سے روایت ہے کہ ((رحم الله إمرًا صلى قبل العصر أربعًا)) اللہ اس آدمی پر رحم کرے جو عصر سے پہلے چار رکعتیں پڑھے۔ اس کی سند حسن ہے، اسے ابن خزیمہ (۱۱۹۳) اور ابن حبان، الموارد (۶۱۶) نے صحیح قرار دیا ہے۔

امام اسحاق بن راہویہ کے نزدیک یہ رکعتیں سلام کے بغیر دو تشہدوں سے پڑھنا چاہئیں تاہم حدیث ((صلوٰة الليل و النهار مثنىٰ مثنىٰ)) (سنن ابی داود: ۱۲۹۵، سنن الترمذی: ۵۹۷ وسندہ حسن) کی رو سے بہتر یہی ہے کہ یہ چار رکعتیں دو دو کر کے دو سلاموں سے پڑھی جائیں۔ [شہادت، مئی ۲۰۰۴ء]

نمازِ مغرب سے پہلے دو رکعتیں

سوال گزارش یہ ہے کہ "حدیث اور اہل حدیث" نامی ایک رسالہ شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ مغرب سے پہلے دو رکعت نفل پڑھنا مسنون نہیں۔ اس کو ثابت کرنے کے لئے انھوں نے چند احادیث کو دلیل بنا کر پیش کیا ہے۔ کیا وہ احادیث صحیح ہیں؟ وہ احادیث یہ ہیں:

① عن طاؤس قال: سئل ابن عمر عن الركعتين قبل المغرب فقال: ما رأيت أحدًا على عهد رسول الله ﷺ يصليها.... (ابوداود ج ۱ ص ۱۸۲)

② وعن حماد قال: سألت إبراهيم عن الصلاة قبل المغرب؟ فنهاني عنها وقال: أن النبي ﷺ وأبابكر وعمر لم يصلوها.

(کتاب الآثار للامام ابی حنیفۃ بروایت الامام محمد ص ۳۲)

③ وعن عبدالله بن بريدة عن أبيه أن النبي ﷺ قال بين كل أذانين صلاة إلا المغرب. (کشف الاستار عن زوائد مسند البزار ج ۱ ص ۳۳۴)

اور اسی طرح دوسری احادیث ہیں۔ کیا وہ احادیث صحیح ہیں؟ (صبغت اللہ محمدی، کھپرو)

الجواب آپ کی مسئولہ روایات کی تحقیق حسب ذیل ہے:

① عن طاؤس... إلخ. (ابوداود ج ۱ ص ۱۸۲ حدیث نمبر ۱۲۸۴)

اس کی سند حسن ہے۔اسے شعیب یا ابوشعیب کی ''جہالت'' قرار دے کر ضعیف قرار دینا صحیح نہیں۔اس روایت کے آخر میں لکھا ہوا ہے کہ ورخص فی الرکعتین بعد العصر '' اور آپ نے عصر کے بعد دو رکعتوں کی اجازت دی'' چونکہ روایت کا یہ حصہ دیوبندیوں اور بریلویوں کے مذہب کے خلاف ہے لہٰذا وہ یہودیوں کی تقلید کرتے ہوئے اسے چُھپا لیتے ہیں۔سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا مغرب سے پہلے دو رکعتوں کو نہ دیکھنا، ان رکعتوں کے عدم وجود کی دلیل نہیں کیونکہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مغرب سے پہلے دو رکعتیں پڑھی ہیں اور انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا اور منع نہیں فرمایا۔(دیکھئے صحیح البخاری:۵۰۳، ۶۲۵ و صحیح مسلم:۸۳۶، ۸۳۷ وغیرہما)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم منع کیوں فرما سکتے تھے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا:

((صلوا قبل المغرب)) مغرب سے پہلے دو رکعتیں پڑھو۔ (صحیح البخاری:۱۱۸۳)

یاد رہے کہ اس حدیث کے آخری ٹکڑے ''لمن شاء'' کے مطابق یہ حکم وجوبی نہیں بلکہ استحبابی ہے۔

عبداللہ المزنی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:''أن رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم صلّی قبل المغرب رکعتین'' بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب سے پہلے دو رکعتیں پڑھیں۔

(صحیح ابن حبان، موارد الظمآن:۶۱۷ وھذا إسناد صحیح علی شرط مسلم، مختصر قیام اللیل للمروزی، اختصار المقریزی ص ۶۴ وقال النیموی: واسنادہ صحیح، آثار السنن حدیث:۶۹۴)

ظاہر ہے کہ دو سچے گواہوں میں سے جو گواہ کہتا ہے کہ میں نے دیکھا ہے، اس کی بات اس گواہ کے مقابلے میں سچ اور حق تسلیم کی جائے گی جو کہتا ہے کہ میں نے نہیں دیکھا۔کیونکہ عدمِ رؤیتِ بعض، عدمِ وجود پر دلیل نہیں ہے۔سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی عدمِ رؤیت سے صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ دو رکعتیں پڑھنا واجب نہیں ہے بلکہ مستحب ہے۔ دیوبندیوں اور بریلویوں کا عدمِ وجوب والی روایت کو عدمِ وجود والی دلیل بنالینا ہر لحاظ سے غلط اور باطل ہے۔

② عن حماد قال: سألت إبراهيم (النخعي) عن الصلاة قبل المغرب فنهاني عنها ... إلخ (الآثار لمحمد بن الحسن بن فرقد الشيبانی ص۱۹۲ ح۱۴۵)

یہ روایت کئی لحاظ سے مردود ہے مثلاً (۱) محمد بن الحسن الشیبانی صاحبِ کتاب الآثار سخت مجروح راوی تھا۔ اسماء الرجال کے مستند عند الفریقین امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ نے فرمایا: محمد (بن الحسن) جہمی ہے جو کذاب ہے۔ (الضعفاء للعقیلی ج۴ص۵۲ وسندہ صحیح)

اور فرمایا: "ليس بشيئ" یعنی یہ کوئی چیز نہیں ہے۔ (تاریخ ابن معین روایۃ الدوری: ۱۷۷)

قاضی ابو یوسف نے کہا: اس کذاب یعنی محمد بن حسن سے کہو، یہ جو روایتیں مجھ سے بیان کرتا ہے، کیا اس نے سنی ہیں؟ (تاریخ بغداد ۲/۱۸۰، وسندہ حسن)

۲: حماد بن ابی سلیمان آخری عمر میں اختلاط کا شکار ہو گئے تھے، حافظ نور الدین الہیثمی (متوفی ۸۰۷ھ) نے یہ قاعدہ بتایا ہے کہ حماد سے صرف شعبہ، سفیان الثوری اور ہشام الدستوائی کی روایت ہی مقبول ہے۔ (دیکھئے مجمع الزوائد ج۱ص۱۱۹، ۱۲۰)

یعنی حماد سے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی روایت (حماد کے اختلاط کی وجہ سے) غیر مقبول ہے۔ یہ روایت اس مفہوم کے ساتھ ایک دوسری ضعیف سند سے مروی ہے۔

(مصنف عبد الرزاق ۲/۴۳۵ ح۳۹۸۵)

جس کی تفصیل راقم الحروف نے انوار السنن تحقیق آثار السنن (ص۱۴۰) میں لکھ دی ہے۔

③ اس روایت کے سلسلے میں عرض ہے کہ کشف الاستار کے حاشیہ میں لکھا ہوا ہے: اس کا راوی حیان بن عبید اللہ ہے جسے امام ابن عدی نے (ضعیف راویوں میں) ذکر کیا ہے اور کہا گیا ہے کہ آخری عمر میں اختلاط کا شکار ہو گیا تھا۔ (بحوالہ مجمع الزوائد ۲/۲۳۱)

اس مختلط کی روایت، صحیح روایات کے خلاف ہونے کی وجہ سے منکر ہو کر مردود ہے۔

یاد رہے کہ کسی مستند امام نے حیان بن عبید اللہ المختلط کی روایت کو صحیح یا حسن نہیں کہا، حتیٰ کہ آثار السنن کے مصنف نیموی نے بھی اسے اپنے دلائل میں ذکر نہیں کیا۔

مختصراً عرض ہے کہ آپ کی ذکر کردہ آخری دونوں روایتیں ضعیف و مردود ہیں۔

اول الذکر روایت کا تعلق عدمِ وجوب سے ہے، عدمِ وجود یا عدمِ استحباب سے نہیں۔

والحق أحق أن يتبع

آخر میں عرض ہے کہ ''حدیث اور اہلِ حدیث'' نامی کتاب کا مصنف انوار خورشید اپنے اسلاف حسن بن زیاد اللؤلؤی، بشر بن غیاث المریسی اور محمد بن شجاع الثلجی وغیرہم کی طرح سخت کذاب اور وضاع ہے۔

انوار خورشید کے کذاب ہونے کی دلیل نمبر ۱:

صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نماز میں صفیں قائم کرتے وقت ایک دوسرے کے قدم سے قدم اور کندھے سے کندھا ملاتے تھے۔

(صحیح البخاری وغیرہ، حدیث اور اہلِ حدیث طبع مئی ۱۹۹۳ء ص ۵۰۹)

اور (روایت ہے کہ) جو شخص کندھے سے کندھا نہ ملاتا اسے ''بدکا ہوا خچر'' قرار دیتے تھے۔

(دیکھئے حدیث اور اہلِ حدیث ص ۵۱۵ بحوالہ فتح الباری ج ۲ ص ۳۵۳)

ان صحیح آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم کا مذاق اڑاتے ہوئے انوار خورشید نے لکھا ہے کہ ''نیز غیر مقلدین کو چاہئے کہ گردن سے گردن بھی ملایا کریں کیونکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں اس کا بھی ذکر ہے'' (حدیث اور اہلِ حدیث ص ۵۱۹)

حالانکہ کسی حدیث میں بھی گردن سے گردن ملانے کا کوئی ذکر نہیں۔ ((وحاذوا بالأعناق)) کا مطلب ''اور گردنوں کو برابر رکھو'' ہے، گردنیں ملانا نہیں۔

انوار خورشید کے کذاب ہونے کی دلیل نمبر ۲:

انوار خورشید نے لکھا ہے کہ ''پھر حضرت امام ابوحنیفہ اور امام بخاری رحمہما اللہ دونوں بزرگ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہیں'' (حدیث اور اہلحدیث ص ۲۳)

یاد رہے کہ بعد میں انوار خورشید نے اپنی کذب بیانی کو محسوس کرتے ہوئے ''حدیث اور اہلِ حدیث'' کے تازہ ایڈیشن یا ایڈیشنوں میں سے یہ عبارت نکال کر لکیریں ڈال دی ہیں مثلاً: دیکھئے حدیث اور اہلحدیث (طبع سادس، جولائی ۱۹۹۷ء)

اور اس بات کا اشارہ تک نہیں دیا کہ "حدیث اور اہلِ حدیث" نامی کتاب کی سابق عبارت غلط اور کذب بیانی تھی۔ واللہ من ورائھم محیط۔ [شہادت، اکتوبر ۲۰۰۱ء]

چار سنتیں دو دو کر کے پڑھیں

سوال کیا ظہر یا عصر کی چار سنت کو ایک سلام کے ساتھ ادا کرنا جائز ہے؟

(ایک سائل)

الجواب سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((صلوٰۃ اللیل والنھار مثنیٰ مثنیٰ))

رات اور دن کی (نفل، سنت) نماز دو دو (رکعتیں) ہے۔ (سنن ابی داود: ۱۲۹۵ وسندہ حسن)

اسے ابن خزیمہ (۱۲۱۰) ابن حبان (۶۳۶) اور جمہور محدثین نے صحیح قرار دیا ہے۔

(دیکھئے میری کتاب نیل المقصود فی التعلیق علی سنن ابی داود ج ۱ ص ۳۷۱)

معرفۃ علوم الحدیث للحاکم [ص ۵۸ ح ۱۰۱] میں اس کی ایک مؤید روایت ہے جس کی سند حسن ہے، اس کے باوجود امام حاکم نے اسے "وھم" قرار دیا ہے۔!

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ "صلوٰۃ اللیل والنھار مثنیٰ مثنیٰ"

رات اور دن کی (نفل) نماز دو دو (رکعتیں) ہے۔

(السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۲ ص ۴۸۷ وسندہ صحیح ولا علۃ فیہ)

اس سے معلوم ہوا کہ سنن ابی داود والی حدیث سابق: صحیح لغیرہ ہے۔ اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ یہ چار سنتیں دو دو کر کے دو سلاموں کے ساتھ پڑھنی چاہئیں۔

نافع (تابعی) سے روایت ہے کہ (سیدنا) عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہ) دن کو چار چار رکعتیں (سنت) پڑھتے تھے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۲ ص ۲۷۴ ح ۶۶۳۴ وسندہ صحیح)

عبداللہ بن عمر العمری (صدوق حسن الحدیث عن نافع، ضعیف عن غیرہ) عن نافع کی سند سے روایت ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما رات کو دو دو رکعت اور دن کو چار رکعت (نوافل) پڑھتے تھے، پھر سلام پھیرتے تھے۔ (مصنف عبدالرزاق ۲/ ۵۰۱ ح ۴۲۲۵ واسنادہ حسن)

اس روایت کی دوسری سند سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحیح لغیرہ ہے۔

(دیکھئے مصنف عبدالرزاق ح ۴۲۲۶)

امام ابن المنذر النیسابوری نے اسے " ثابت عن ابن عمر " یعنی ابن عمر (رضی اللہ عنہ) سے ثابت قرار دیا ہے۔ (الاوسط ۲۳۶/۵)

تنبیہ: عبداللہ بن عمر العمری کی مصنف عبدالرزاق والی روایت الاوسط میں " أخبرنا عبیداللہ بن عمر عن نافع عن ابن عمر " إلخ کی سند سے چھپی ہوئی ہے!

اس اثر سے معلوم ہوا کہ ایک سلام سے چار سنتیں پڑھنا بھی جائز ہے۔

لیکن بہتر یہی ہے کہ مرفوع حدیث کی رُو سے وتر کے علاوہ تمام سنتیں اور نوافل دو دو کر کے پڑھے جائیں۔

حسن بصری (تابعی) رحمہ اللہ فرماتے ہیں: " صلوۃ النهار ركعتان ركعتان " دن کی نماز دو دو رکعتیں ہے۔ (مسائل الامام احمد واسحاق بن راہویہ، روایہ اسحاق بن منصور الکوسج ۲۰۵/۱ فقرہ: ۴۳۳ وسندہ صحیح، الاشعث ھو ابن عبدالملک الحمرانی)

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ دن کی نفل نماز دو دو کر کے پڑھتے تھے۔ (ایضاً فقرہ: ۴۰۵)

لقد كان لكم في رسول الله أسوة حسنة . وما علينا إلا البلاغ

[الحدیث: ۱۳]

دن اور رات کی نماز دو دو رکعتیں ہیں

سوال " صلوۃ الليل والنهار مثنى مثنى " [رات اور دن کی نماز دو دو رکعت ہے۔] صححه ابن حبان وقال النسائي: هذا خطأ"

(بلوغ المرام للحافظ ابن حجر رحمہ اللہ ص ۱۰۶ رقم الحدیث ۳۵۸ دارالکتب قصہ خوانی بازار پشاور)

اس حدیث کی صحت کیسی ہے؟ (ایک سائل)

الجواب یہ روایت اپنے شواہد کے ساتھ حسن ہے۔ [رواہ ابو داود (۱۲۹۵) والترمذی (۵۹۷) وابن ماجہ (۱۳۲۲) والنسائی (۲۲۷/۳ ح ۱۶۶۷) واحمد (۲۶/۲، ۵۱،

وصحیح ابن حبان (الاحسان ۴/۸۶ ح ۲۴۷۳) کذا فی بلوغ المرام بتحقیقی (ص ۴۰ ح ۲۹۱)]

معرفۃ علوم الحدیث للحاکم (ص ۵۸) میں اس کا ایک لاباس بہ شاہد بھی ہے۔

امام بیہقی نے صحیح سند کے ساتھ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے موقوفاً نقل کیا ہے کہ

"صلوۃ اللیل والنهار مثنی مثنی، یرید به التطوع"

رات اور دن کی نفل نماز دو دو رکعت ہے۔ (ج ۲ ص ۴۸۷)

یہ روایت مرفوع حکماً ہے۔ دیکھئے الموطأ بتحقیقی (ص ۳۷ ح ۲۶۰) والحمد للہ

[شہادت، مارچ ۲۰۰۳ء]

نماز تسبیح کی تحقیق اور اس کے مسائل

سوال نماز تسبیح والی حدیث صحیح ہے یا ضعیف؟ اس کی مختصر و جامع تخریج کیجئے، اگر صحیح ہے تو اس کے ضروری مسائل بھی بیان کریں۔ (ڈاکٹر نسیم، اسلام آباد)

الجواب صلاۃ التسبیح کے بارے میں میرے علم کے مطابق تین احادیث قابلِ حجت ہیں:

① حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ

② حدیث (جابر بن عبداللہ) الانصاری رضی اللہ عنہ

③ حدیث عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ

ان احادیث کی مختصر و جامع تخریج علی الترتیب درج ذیل ہے:

حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ

عبدالرحمٰن بن بشر بن الحكم النيسابوري: حدثنا موسى بن عبدالعزيز: حدثنا الحكم بن أبان عن عكرمة عن ابن عباس أن رسول الله ﷺ قال ..... إلخ . (سنن ابی داود: ۱۲۹۷، سنن ابن ماجہ: ۱۳۸۷)

اس کی سند حسن لذاتہ ہے۔

اس حدیث کے راویوں کا تذکرہ درج ذیل ہے:

① عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ مشہور جلیل القدر صحابی ہیں۔

② عکرمہ ابو عبداللہ، مولیٰ ابن عباس، ان کی حدیث صحیح مسلم میں مقروناً، اور صحیح بخاری و سنن اربعہ میں بطور حجت موجود ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: ''ثقة ثبت، عالم بالتفسير، لم يثبت تكذيبه عن ابن عمر ولا تثبت عنده بدعة''

(تقریب التہذیب: ۴۶۷۳)

حافظ ذہبی فرماتے ہیں: ''ثقة ثبت، أعرض عنه مالك و احتج به الجمهور، كان يرى السيف فيما بلغنا'' (رسالہ فی الرواۃ الثقات المتکلم فیہم بما لا یوجب الرد ص ۱۸)

امام مالک کا اعراض کرنا ان کے ضعیف ہونے کی دلیل نہیں۔ اور ''یری السیف'' کی تردید حافظ ابن حجر نے کر دی ہے لہٰذا عکرمہ مذکور کے متعلق اعدل الاقوال یہ ہے کہ وہ صحیح الحدیث ہیں۔

③ الحکم بن ابان، سنن اربعہ کے مرکزی راوی ہیں۔ ابن معین، ابن نمیر، ابن المدینی، احمد بن حنبل، العجلی المعتدل اور نسائی وغیرہم نے انھیں ثقہ قرار دیا ہے۔

دیکھئے تہذیب الکمال (۲/ ۲۳۹ تحقیق بشار عواد)

ان پر ابن حبان، ابن خزیمہ، ابن عدی اور عقیلی کی جرح مردود ہے۔

حافظ ذہبی نے کہا: ''ثقة، صاحب سنة'' إلخ (الکاشف ج ۱ ص ۱۸۱)

آپ کے بارے میں جمہور کی توثیق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اعدل الاقوال یہ ہے کہ آپ حسن الحدیث ہیں۔

④ موسیٰ بن عبدالعزیز، آپ سے ایک جماعت نے حدیث بیان کی ہے۔ ابن معین، نسائی، ابو داود، ابن شاہین وغیرہم جمہور نے توثیق کی ہے۔ صرف ابن المدینی اور السلیمانی کی جرح ملتی ہے جو کہ جمہور کے خلاف ہونے کی وجہ سے مردود ہے لہٰذا آپ حسن الحدیث ہیں۔

⑤ عبدالرحمٰن بن بشر بن الحکم، صحیح بخاری، صحیح مسلم وغیرہما کے راوی اور ثقہ ہیں۔

(تقریب التہذیب: ۳۸۱۰)

بشر بن الحکم اور اسحاق بن ابی اسرائیل نے ان کی متابعت کر رکھی ہے۔ (المستدرک ج۱ ص۳۱۸)
اس کی سند میں کوئی انقطاع، علت یا شذوذ نہیں ہے لہٰذا یہ حدیث حسن ہے۔

حدیث کے متن کا خلاصہ

حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کے متن کا خلاصہ درج ذیل ہے:

① چار رکعتیں اس طرح پڑھی جائیں کہ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ اور ایک سورت پڑھی جائے۔
② پہلی رکعت میں قراءت کے بعد، رکوع سے پہلے، حالتِ قیام میں "سبحان اللّٰہ و الحمد للّٰہ و لا إلٰہ إلا اللّٰہ و اللّٰہ أکبر" پندرہ دفعہ پڑھا جائے۔
③ رکوع میں یہی ذکر دس مرتبہ پڑھیں۔
④ رکوع سے اٹھ کر دس دفعہ پڑھیں۔
⑤ سجدۂ اولیٰ میں دس دفعہ پڑھیں۔
⑥ دو سجدوں کے درمیان جلسہ میں دس دفعہ پڑھیں۔
⑦ دوسرے سجدہ میں دس دفعہ پڑھیں۔
⑧ پھر سجدہ سے اُٹھ کر بیٹھیں اور جلسہ استراحت میں دس دفعہ پڑھیں۔ (کل تسبیحات ۷۵)
⑨ چاروں رکعتیں اسی طرح پڑھیں۔
⑩ یہ نماز ہر ہفتہ، ہر مہینہ، ہر سال یا زندگی میں کم از کم ایک دفعہ پڑھیں۔

حدیث (جابر) الانصاری رضی اللہ عنہ

أبو توبة الربیع بن نافع: حدثنا محمد بن مهاجر عن عروة بن رویم: حدثني الأنصاري أن رسول اللّٰه ﷺ قال لجعفر بهذا الحدیث (إلخ)

(سنن ابی داود: ۱۲۹۹، السنن الکبریٰ للبیہقی ج۳ ص۵۲)

اس کی سند صحیح ہے، راویوں کا مختصر تعارف درج ذیل ہے:

① الانصاری سے مراد جابر بن عبداللہ الانصاری رضی اللہ عنہ ہیں۔ جیسا کہ حافظ مزی نے تہذیب الکمال (قلمی ۳/۱۶۶۶) میں اور حافظ ابن حجر نے ''الامالی'' میں صراحت کی ہے۔

(تخریج الترشیح لبیان صلاۃ التسبیح ص ۴۹، الفتوحات الربانیہ ج ۴ ص ۳۱۴)

② عروہ بن رویم: آپ کو ابن معین، دحیم الشامی اور نسائی وغیرہم نے ثقہ کہا ہے۔
دیکھئے تہذیب الکمال (۵/۱۵۳)

صرف مرسل روایات بیان کرنے کا الزام ہے جو کہ اصول حدیث کی رو سے کوئی جرح نہیں ہے۔ لہٰذا آپ کے بارے میں اعدل الاقوال یہ ہے کہ آپ ثقہ ہیں۔

③ محمد بن مہاجر الانصاری صحیح مسلم کے راوی اور ثقہ ہیں۔ (التقریب:۶۳۳۱)

④ ابوتوبہ الربیع بن نافع صحیح بخاری و صحیح مسلم کے راوی اور ''ثقة حجة عابد'' ہیں۔

(تقریب التہذیب:۱۹۰۲)

لہٰذا یہ حدیث صحیح ہے۔ اس کا متن سابق حدیث کے مشابہ ہے۔

حدیث عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ

''حدثنا محمد بن سفيان الأبلي :حدثنا حبان بن هلال أبو حبيب :حدثنا مهدي بن ميمون :حدثنا عمرو بن مالك عن أبي الجوزاء :حدثني رجل كانت له صحبة ، يرون أنه عبدالله بن عمر ''إلخ (سنن ابی داود:۱۲۹۸)

اس کی سند ضعیف ہے۔ راویوں کا تعارف درج ذیل ہے:

① عبداللہ بن عمرو بن العاص مشہور جلیل القدر صحابی ہیں۔

② ابوالجوزاء اوس بن عبداللہ کتبِ ستہ کے راوی اور ثقہ ہیں۔

(التقریب:۵۷۷، الکاشف ۱/۹۰)

③ عمرو بن مالک النکری کی کمزور توثیق حافظ ابن حبان نے کی ہے جبکہ بخاری، ابن عدی نے جرح کی ہے۔ راجح یہی ہے کہ النکری مذکور ضعیف ہے۔

جبکہ عمران بن مسلم نے اس کی متابعت کر رکھی ہے۔ (النکت الظراف ج ۶ ص ۲۸۱)

تنبیہ: عمرو بن مالک مذکور نے ایک روایت بیان کی ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے قحط کے دنوں میں لوگوں سے کہا: ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر چھت میں سوراخ کر دیں، لوگوں نے ایسا ہی کیا تو بہت زیادہ بارش ہوئی۔ (سنن الدارمی ج ۱ ص ۴۳ ح ۹۳)

یہ روایت متعدد وجوہ سے ضعیف ہے، ان میں سے ایک وجہ عمرو مذکور کا ضعیف ہونا بھی ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ حدیث ابن عباس حسن لذاتہ ہے اور اس کا ایک شاہد صحیح ہے۔ ان کے علاوہ باقی جتنی روایات ہیں سب بلحاظ سند ضعیف یا مردود ہیں اور عبداللہ بن عمرو بن العاص والی روایت بطورِ تنبیہ اور فائدہ کے ذکر کی گئی ہے۔

بعض علماء مثلاً امام ترمذی، ابن الجوزی اور العقیلی نے صلاۃ التسبیح والی روایات پر جرح کی ہے جبکہ شیخ الاسلام عبداللہ بن المبارک، خطیب بغدادی، ابوسعد سمعانی، ابوموسیٰ المدینی، حافظ العلائی، حافظ البلقینی، حافظ ابن ناصر الدین وغیرہم نے اسے صحیح و حسن قرار دیا ہے۔

نمازِ تسبیح سے متعلق بعض ضروری مسائل

① فی کل جمعہ سے مراد جمعہ کا دن یا ہفتہ کے سات دن ہیں۔ دونوں مفہوم محتمل ہیں جبکہ اول راجح ہے۔ واللہ اعلم

② امام ابن المبارک کی تحقیق یہ ہے کہ اگر یہ نماز رات کو پڑھی جائے تو ہر دو رکعتوں پر سلام پھیر دیں اور اگر دن کو پڑھی جائے تو مرضی ہے کہ ایک سلام سے چار رکعتیں پڑھیں یا دو پر سلام پھیر دیں۔ (سنن الترمذی: ۴۸۱، الحاکم ج ۱ ص ۳۱۹، ۳۲۰)

③ اس میں قراءت سراً ہی مسنون ہے۔ تاہم رات میں معمولی جہر سے قراءت کرنا بھی جائز ہے۔ (الفتاوی الکبریٰ للہیتمی ج ۱ ص ۱۹۱، لانہ کسائر النوافل)

④ امام ابن المبارک کے نزدیک اگر کوئی شخص اس نماز میں بھول جائے تو سجدہ سہو میں دس تسبیحات نہیں پڑھے گا بلکہ عام نمازوں کی طرح سجدہ کی دعائیں پڑھے گا۔ اس لئے کہ اس حدیث میں تسبیحات کی کل تعداد تین سو ہے۔ مقدار مذکورہ سے زیادہ نہیں کرنا چاہئے۔

(سنن الترمذی: ۴۸۱)

⑤ صلاۃ التسبیح میں کسی خاص سورت کی تحدید ثابت نہیں ہے جو میسر ہو پڑھ لیں۔
دیکھئے سورۃ المزمل: ۲۰

⑥ احادیث مرفوعہ سے، اس نماز میں جلسۂ استراحت کا ذکر صراحتاً موجود ہے لہٰذا بعض علماء (مثلاً ابن السبارک) کے عمل کی بنیاد پر جلسہ ترک نہیں کرنا چاہئے۔ یہی تحقیق عبدالحیٔ لکھنوی حنفی کی ہے۔ (الآثار المرفوعۃ بحوالہ تحفۃ الاحوذی ج ۱ص ۳۵۱)

⑦ محقق اہل حدیث مولانا خواجہ محمد قاسم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:
"نیز معلوم ہونا چاہئے نماز تسبیح با جماعت کا ہرگز کوئی ثبوت نہیں ہے، نہ مردانہ کا، نہ زنانہ کا۔ زنانہ کا ذکر میں نے خاص طور پر اس لئے کیا ہے کہ انھیں آج کل اس کا زیادہ شوق چرایا ہوا ہے۔ یہ عام طور پر ماہ رمضان میں چاشت کے وقت با جماعت نماز تسبیح پڑھتی ہیں۔ حالانکہ نبی علیہ السلام سے نہ رمضان کا ذکر ہے، نہ جماعت کا ذکر ہے، نہ چاشت کا ذکر ہے۔"

(حی علی الصلوٰۃ ص ۱۹۷)

حنفیوں کے نزدیک ویسے بھی تراویح کے علاوہ نفلوں کی جماعت مکروہ ہے۔
بعض لوگوں نے عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کر کے نماز تسبیح کی جماعت کو جائز قرار دیا ہے۔ جس میں یہ ذکر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں چاشت کی نماز پڑھائی تھی۔ (مسند احمد ۴۳/۳ ح ۱۶۴۷۹)

راجح یہی ہے کہ عمومات سے استدلال کی بجائے نص کو اپنے مورد پر خاص سمجھا جائے۔ ورنہ کوئی "حضرت" اگر سنن راتبہ مثلاً رکعات الظہر وغیرہ کی جماعت شروع کر دے تو اسے کس دلیل سے منع کریں گے؟ (واللہ اعلم بالصواب) [شہادت، ستمبر ۱۹۹۹ء]

سوال صلوٰۃ التسبیح کی روایات کے بارے میں البانی نے بہت لمبی چوڑی بحث کی ہے اور بہت مشکل سے "حسن" کے درجہ میں لائے ہیں۔ جب کہ آپ نے "ھدیۃ المسلمین" کتاب (ص ۷۱) میں بغیر کسی تفصیل کے صحیح قرار دیا ہے، تفصیل چاہیے۔ (حبیب اللہ، پشاور)

الجواب صلوٰۃ التسبیح کے سلسلے میں درج ذیل احادیث بلحاظ سند مضبوط ہیں:

(۱) حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ یہ روایت سنن ابی داود (۱۲۹۷) اور ابن ماجہ (۱۳۸۷) میں موجود ہے اور اس کی سند حسن ہے۔

اسے ابوبکر الآجری وغیرہ نے صحیح کہا ہے۔ (الترغیب والترہیب ۱/ ۴۶۷)

حکم بن ابان کی حدیث حسن کے درجے سے نہیں گرتی۔ تفصیلی بحث کے لئے دیکھئے الترشیح لبیان صلوٰۃ التسبیح (ص ۲۸۔۳۳ مع التخریج) اور کتب الرجال

(۲) حدیث الانصاری رضی اللہ عنہ

یہ روایت سنن ابی داود (۱۲۹۹) میں موجود ہے، اس کی سند انصاری تک صحیح ہے اور انصاری سے مراد جابر بن عبداللہ الانصاری رضی اللہ عنہ ہیں۔

دیکھئے تہذیب الکمال (۳/ ۱۶۶۶) ذالفتوحات الربانیہ (۴/ ۳۱۴) وحاشیۃ الترشیح ص ۴۹)

(۳) حدیث عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما

یہ روایت سنن ابی داود (۱۲۹۸) میں ہے۔ عمران بن مسلم نے عمرو بن مالک کی متابعت کر رکھی ہے۔ (النکت الظراف ۶/ ۲۸۱)

حسن لذاتہ روایت کے اگر شواہد ہوں تو وہ صحیح لغیرہ بن جاتی ہے لہٰذا نمازِ تسبیح والی روایت صحیح ہے۔ والحمدللہ [شہادت جنوری ۲۰۰۳ء]

نمازِ استسقاء کا طریقہ

سوال بلوغ المرام باب الاستسقاء میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ استسقاء، نمازِ عید کی طرح پڑھی۔ (رواہ الخمسہ وصححہ الترمذی وابوعوانہ وابن حبان) اولاً: روایت ہذا کی (الف) تخریج درکار ہے۔ ثانیاً: کیا اس روایت سے نمازِ استسقاء، نمازِ عید کی طرح (زائد تکبیرات کے ساتھ) ادا کرنی ثابت و صحیح ہے؟ (تنویر سلفی، ضلع ایبٹ آباد)

الجواب ① یہ روایت کہ "ثم صلّی رکعتین کما یصلی فی العید" الخ بلحاظِ سند حسن ہے۔ اسے ابو داود (کتاب الصلوٰۃ، باب جماع أبواب صلوٰۃ الاستسقاء

وتفریعھا ح ۱۱۶۵) ترمذی (۵۵۸) ابن ماجہ (۱۲۶۶) اور احمد (۱/ ۲۳۰، ۲۶۹، ۳۵۵) نے روایت کیا ہے۔ اسے ابن حبان (الاحسان ۴/ ۲۲۹ ح ۲۸۵۱، موارد الظمآن: ۶۰۳) ابن خزیمہ (۱۴۰۵) اور ابو عوانہ (۶/ ۳۳، القسم المفقود) نے صحیح کہا ہے۔ اس کے ایک راوی ہشام بن اسحاق حسن الحدیث تھے۔ انھیں ابن خزیمہ، ترمذی اور ابن حبان نے ثقہ قرار دیا ہے۔ حافظ ذہبی نے کہا: ''صدوق'' (الکاشف ۳/ ۱۹۴ ت ۶۰۶۰)

اس روایت سے امام شافعی وغیرہ نے یہ دلیل پکڑی ہے کہ صلوٰۃ الاستسقاء میں عیدین کی طرح بارہ تکبیریں کہنی چاہئیں۔ جب کہ جمہور نے اس کی یہ تاویل کی ہے کہ اس سے عیدین کی دو رکعتوں جیسی تعداد، قراءت بالجہر اور خطبہ سے پہلے کی نماز مراد ہے۔ واللہ اعلم

(دیکھئے عون المعبود ج ۱ ص ۴۵۳)

شوافع نے امام شافعی رحمہ اللہ کی تائید میں ایک صریح روایت بھی پیش کی ہے جس کا راوی محمد بن عبدالعزیز منکر الحدیث ہے۔ دیکھئے تحفۃ الاحوذی (ج ۱ ص ۳۹۰)

جمہور نے اپنی تائید میں المعجم الاوسط للطبرانی (ج ۱۰ ص ۴۶ ح ۹۱۰۴) سے ایک روایت پیش کی ہے۔ جس کا ایک راوی عبداللہ بن حسین بن عطاء ضعیف ہے۔

(دیکھئے تقریب التہذیب: ۳۲۷۵)

دوسرے راوی مسعدۃ بن سعد العطار کے حالات نہیں ملے لہٰذا یہ دونوں روایتیں ضعیف ہیں۔ اس سلسلے میں امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک قوی ہے۔ تاہم دوسرے مسلک پر عمل کی بھی گنجائش ہے۔ واللہ اعلم [شہادت، اکتوبر ۲۰۰۱ء]

سجدۂ تلاوت واجب یا سنت؟

سوال اگر سجدۂ تلاوت والی آیت پڑھی جائے تو کیا پڑھنے اور سننے والے پر سجدۂ تلاوت واجب ہوتا ہے یا سنت ہے؟ (محمد صفدر حضروی)

الجواب مشہور صحابی اور کاتبِ وحی زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''قرأت علی النبي صلی اللہ علیہ وسلم ﴿وَالنَّجْمِ﴾ فلم یسجد فیھا''

میں نے نبی ﷺ کو سورۂ نجم پڑھ کر سنائی تو آپ نے (سن کر) سجدہ نہیں کیا۔
(صحیح بخاری:۱۰۷۳، صحیح مسلم:۵۷۷/۱۰۶)

اس حدیث اور دیگر احادیث سے معلوم ہوا کہ سجدۂ تلاوت سنت ہے، واجب نہیں ہے۔

خلیفۂ راشد امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے جمعہ کے دن منبر پر فرمایا: ''یا أیها الناس! إنا نمرّ بالسجود فمن سجد فقد أصاب ومن لم یسجد فلا إثم علیه''
اے لوگو! ہم سجدہ کی آیت پڑھتے چلے جاتے ہیں۔ پس جو کوئی سجدہ کرے تو اس نے اچھا کیا اور جو سجدہ نہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ (صحیح بخاری:۱۰۷۷)

کسی صحابی سے خلیفۂ راشد کے اس فتوے کا انکار مروی نہیں ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ خلفائے راشدین اور صحابۂ کرام کے نزدیک سجدۂ تلاوت واجب نہیں بلکہ سنت ہے۔
(رضی اللہ عنہم اجمعین)

شیخ محمود بن احمد العینی (متوفی ۸۵۵ھ) لکھتے ہیں:

''وذهب الشافعي و مالك في أحد قولیه و أحمد و إسحاق والأوزاعي و داود إلی أنها سنة و هو قول عمر و سلمان و ابن عباس و عمران بن الحصین و به قال اللیث و... ''إلخ شافعی، ایک قول میں مالک، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، اوزاعی اور داود کی تحقیق یہ ہے کہ سجدہ تلاوت سنت ہے اور یہی قول عمر، سلمان فارسی، ابن عباس اور عمران بن حصین (رضی اللہ عنہم) کا ہے اور اسی پر لیث بن سعد نے فتویٰ دیا ہے۔ (عمدۃ القاری ج۷ ص۹۵)

بعض لوگ جو سجدۂ تلاوت کو واجب کہتے ہیں (اپنے زعم میں) حدیثِ مرفوع
''السجدة علی من سمعها و علی من تلاها''
سجدہ اس پر ہے جو اسے سنے اور سجدہ کی آیت تلاوت کرے (الہدایہ مع الدرایہ ج۱ ص۱۶۳، باب فی سجود التلاوۃ) سے استدلال کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ حدیثِ رسول نہیں ہے بلکہ ابن عمر رضی اللہ عنہ صحابی کی طرف منسوب قول ہے۔

(مصنف ابن ابی شیبہ ۲/۶ ح ۴۲۲۵ وسندہ ضعیف، ونصب الرایہ ج ۲ ص ۱۷۸، الدرایہ ص ۱۶۴)

اس قول کی سند عطیہ العوفی (ضعیف ومدلس) کی وجہ سے ضعیف ہے۔

دوسرے یہ کہ اس قول میں بھی وجوب یا فرضیت کی صراحت نہیں ہے۔

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے تھے: اللہ تعالیٰ نے ہم پر سجدۂ تلاوت فرض نہیں کیا سوائے اس کے کہ ہم اپنی مرضی سے یہ سجدہ کریں۔ (صحیح البخاری ۱/۱۴۷ ح ۱۰۷۷، تغلیق التعلیق ۲/۴۱۳، ۴۱۴)

خلاصہ یہ ہے کہ سجدۂ تلاوت سنت ہے، فرض یا واجب نہیں۔ [شہادت، مئی ۱۹۹۹ء]

قصر نماز کا بیان

سفر کی مسافت اور قصر نماز

سوال ① کیا ۱۲ میل سفر کی نیت سے گھر سے نکلا جائے تو نمازِ قصر کر سکتا ہے؟
② کسی جگہ پر قیام کی نیت چار دن سے زیادہ ہو تو نماز کو پورا پڑھنا چاہئے یا قصر؟

(عابد الرحمٰن)

الجواب صحیح مسلم کتاب صلوٰۃ المسافرین باب اول ج۱ ص۲۴۲ حدیث:۶۹۱ میں ہے: "عن یحیٰی بن یزید الهنائي قال: سألت أنس بن مالك عن قصر الصلوٰة ؟ فقال: كان رسول الله ﷺ إذا خرج مسيرة ثلاثة أميال أو ثلاثة فراسخ ـ شعبة الشاك ـ صلّى ركعتين."

یحیٰ بن یزید الهنائی سے روایت ہے کہ میں نے انس بن مالک (رضی اللہ عنہ) سے نمازِ قصر کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ جب تین میل یا تین فرسخ (نو میل) کے لئے نکلتے تو دو رکعتیں پڑھتے۔ تین میل یا تین فرسخ کے بارے میں شعبہ کو شک ہے۔

شک کو دُور کرتے ہوئے نو میل کو اختیار کریں، جو کہ عام گیارہ میل کے برابر ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ کم از کم گیارہ میل (تقریباً ۲۰ یا ۲۲ کلومیٹر) کے سفر پر قصر کرنا جائز ہے۔

اگر کسی شخص کی نیت چار دن سے زیادہ قیام کی ہو تو بھی قصر پڑھے گا تاہم روایتِ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی رو سے اگر اس کا ارادہ بیس دن یا اس سے زیادہ ہو تو اسے نماز پوری پڑھنی چاہئے۔

صحیح بخاری (ابواب تقصیر الصلوٰۃ، باب ما جاء فی التقصیر وکم یقیم حتیٰ یقصر ج۱ ص۱۴۷ حدیث:۱۰۸۰) میں ہے: "عن ابن عباس قال: أقام رسول الله ﷺ تسعة

عشر يقصر، فنحن إذا سافرنا تسعة عشر قصرنا وإن زدنا أتممنا"

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک جگہ) انیس دن قیام کیا۔ آپ قصر کرتے رہے۔ پس ہم جب انیس دن (قیام) کا سفر کرتے تو قصر کرتے اور اگر اس سے زیادہ (قیام) کرتے تو پوری (نماز) پڑھتے۔

اس کے مقابلے میں تین یا چار دن کی کوئی صریح دلیل نہیں ہے۔

[شہادت، اپریل ۲۰۰۱ء، الحدیث:۳۶]

سفر میں نمازِ قصر کا مسئلہ

سوال سسرال میں قصر نماز کے بارے میں کیا حکم ہے؟

منتقی الاخبار کے مصنف امام عبدالسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ج اص ۲۱۶ پر یہ باب قائم کیا:

سسرال میں قصر کا مسئلہ:

حدیث ۱۵۲۸: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے منیٰ میں چار رکعتیں پڑھیں۔ لوگوں نے اس پر اعتراض کیا تو آپ نے فرمایا: جب سے میں مکہ میں آیا ہوں تو میں نے نکاح کر لیا ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: جو کسی شہر میں نکاح کر لے وہ مقیم جیسی نماز پڑھے۔ (رواہ احمد)

کیا یہ بات درست ہے کہ سسرال میں قصر نماز نہیں؟ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیں۔ جزا کم اللہ خیراً (خرم ارشاد محمدی)

الجواب منتقی الاخبار والی روایت مسند احمد (۱/۶۲ ح ۴۴۳) ومسند الحمیدی (۳۶) میں "عكرمة بن إبراهيم الباهلي: حدثنا عبدالله بن عبدالرحمن بن أبي ذباب عن أبيه أن عثمان بن عفان صلى بمنىٰ.. " کی سند سے مروی ہے۔

امام بیہقی نے فرمایا: " فهذا منقطع وعكرمة بن إبراهيم ضعيف "پس یہ منقطع ہے اور عکرمہ بن ابراہیم ضعیف ہے۔ (معرفۃ السنن والآثار قلمی ج ۲ ص ۴۲۵، نصب الرایہ ۳/۱۷۲)

عکرمہ بن ابراہیم کو جمہور محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔

دیکھئے لسان المیزان (ج ۴ ص ۲۱۰)

حافظ ہیثمی نے کہا: ''وفيه عكرمة بن إبراهيم وهو ضعيف'' (مجمع الزوائد ۲/۱۵۶)

اس کے برعکس سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے منیٰ میں نماز پوری پڑھنے کے بعد خطبہ میں ارشاد فرمایا: ''يا أيها الناس إن السنة سنة رسول الله ﷺ وسنة صاحبيه ولكنه حدث العام من الناس فخفت أن يستنوا''

اے لوگو! سنت وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ اور آپ کے دونوں ساتھیوں (سیدنا ابوبکر اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہما) سے ثابت ہے۔ لیکن اس سال لوگوں کی وجہ سے رش ہوا ہے لہٰذا مجھے یہ خوف ہوا کہ یہ لوگ اسے ہی اپنا نہ لیں (یعنی اپنے گھروں میں بھی چار کے بجائے دو فرض پڑھنے نہ لگیں۔) (السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۳ ص ۱۴۴، وسندہ حسن، وانظر معرفۃ السنن والآثار ۲/۴۲۹)

اس سے معلوم ہوا کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے اس وجہ سے سفر میں نماز پوری پڑھی تاکہ ناسمجھ لوگ غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائیں۔

یاد رہے کہ سفر میں پوری نماز پڑھنا بھی جائز ہے جیسا کہ صحیح احادیث و آثارِ صحابہ سے ثابت ہے۔

اگر کسی شخص کا سسرال دوسرے شہر اور سفر کی مسافت پر ہو تو بہتر یہی ہے کہ وہ وہاں قصر کرے لیکن پوری بھی پڑھ سکتا ہے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: میں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، آپ (سفر میں) قصر کرتے رہے اور میں پوری (نماز) پڑھتی رہی۔ آپ نے روزے نہیں رکھے اور میں روزے رکھتی رہی؟

تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''أحسنت يا عائشة!'' اے عائشہ! تو نے اچھا کیا ہے۔

(سنن النسائی ج ۳ ص ۱۲۲ ح ۱۴۵۷ وسندہ صحیح، سنن الدارقطنی ۲/۱۸۷ ح ۲۲۷۰ وقال: ''وهو إسناد حسن'' وصححہ البیہقی ۳/۱۴۲)

اس روایت کے راوی العلاء بن زہیر جمہور محدثین کے نزدیک ثقہ و صدوق تھے۔ ان پر

حافظ ابن حبان کی جرح مردود ہے لہٰذا بعض علماء کا اس حدیث کو "منکر" یا ضعیف کہنا غلط ہے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہی روایت ہے: "أن النبي ﷺ كان يقصر في السفر ويتم ويفطر ويصوم" بے شک نبی ﷺ سفر میں قصر بھی کرتے تھے اور پوری نماز بھی پڑھتے تھے۔ روزہ رکھتے بھی اور نہیں بھی رکھتے تھے۔

(سنن الدارقطنی ۲/۱۸۹ ح ۲۲۷۵ وقال: " وهذا إسناد صحيح ")

اس روایت کی سند صحیح ہے۔ سعید بن محمد بن ثواب سے شاگردوں کی ایک جماعت روایت کرتی ہے، دیکھئے تاریخ بغداد (۹/۹۵) حافظ ابن حبان نے انھیں کتاب الثقات میں ذکر کر کے کہا: "مستقيم الحديث" یعنی وہ ثقہ ہیں۔ (ج ۸ ص ۲۷۲)

حافظ دارقطنی نے ان کی بیان کردہ سند کو صحیح کہہ کر اسے ثقہ قرار دیا۔ ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں ان سے روایت لی ہے۔ (۲/۱۳۴ ح ۱۰۶۲)

لہٰذا انھیں مجہول و غیر موثق قرار دینا غلط ہے۔

تنبیہ: عطاء بن ابی رباح پر تدلیس کا الزام باطل و مردود ہے۔

ایک اور روایت میں آیا ہے کہ

"أن رسول الله ﷺ كان يتم الصلوٰة في السفر ويقصر"

بے شک رسول اللہ ﷺ سفر میں پوری نماز بھی پڑھتے تھے اور قصر بھی کرتے تھے۔ (سنن الدارقطنی ۲/۱۸۹ ح ۲۲۷۶ وقال: " المغيرة بن زياد ليس بالقوي " شرح معانی الآثار ۱/۴۱۵ ومصنف ابن ابی شیبہ ۲/۴۵۲ ح ۸۱۸۷ وسندہ حسن)

مغیرہ بن زیاد جمہور کے نزدیک موثق راوی ہیں لہٰذا ان پر "ليس بالقوي" والی جرح مردود ہے۔

خلاصہ یہ کہ نبی ﷺ سے سفر میں پوری نماز پڑھنے کا جواز صحیح حدیث سے ثابت ہے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے سفر میں پوری نماز پڑھنا ثابت ہے۔

(مثلاً دیکھئے صحیح بخاری: ۱۰۹۰ و صحیح مسلم: ۲/۱۵۷۲/۶۸۵)

تنبیہ: سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے سفر میں وفات تک قصر کرنا بھی ثابت ہے۔

(دیکھئے صحیح بخاری: ۱۱۰۲، وصحیح مسلم: ۶۷۹/۱۵۷۹)

مشہور تابعی ابو قلابہ (عبداللہ بن زید الجرمی) نے فرمایا: "إن صلیت فی السفر رکعتین فالسنة وإن صلیت أربعًا فالسنة" اگر تم سفر میں دو رکعتیں پڑھو تو سنت ہے اور اگر چار رکعتیں پڑھو تو بھی سنت ہے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ۴۵۲/۲ ح ۸۱۸۸ وسندہ صحیح)

عطاء بن ابی رباح نے فرمایا کہ: اگر قصر کرو تو رخصت ہے اور اگر چاہو تو پوری نماز پڑھ لو۔ (ابن ابی شیبہ ۴۵۲/۲ ح ۸۱۹۱ وسندہ صحیح)

سعید بن المسیب نے فرمایا: اگر چاہو تو دو رکعتیں پڑھو اور اگر چاہو تو چار پڑھو۔

(ابن ابی شیبہ ۴۵۲/۲ ح ۸۱۹۲ وسندہ صحیح)

امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا: "التقصیر رخصة له فی السفر ، فإن أتم الصلوٰة أجزأ عنه" سفر میں قصر کرنا رخصت ہے اور اگر کوئی پوری نماز پڑھے تو جائز ہے۔

(سنن الترمذی: ۵۴۴)

امام ترمذی سے امام شافعی تک، ان اقوال کی صحیح سندوں کے لئے دیکھیں کتاب العلل للترمذی مع الجامع (ص ۸۸۹) والحمد للہ (۲۷/ ذوالحجہ ۱۴۲۶ھ)

[الحدیث: ۲۳]

آبائی گھر میں قصر نماز کا حکم

سوال میں اسلام آباد میں گورنمنٹ ملازم ہوں۔ جب کہ میرا اصل ذاتی گھر فیصل آباد میں ہے۔ اسلام آباد میں رہتے ہوئے تو میں نماز مکمل ادا کرتا ہوں، اگر فیصل آباد میں دو یا تین دن کے لیے جانا ہو تو وہاں قصر ادا کروں یا مکمل؟ (جبکہ بعض شیوخ سے پوچھا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ اسلام آباد میں بھی مکمل نماز پڑھنی پڑے گی اور فیصل آباد میں بھی مکمل البتہ دورانِ سفر میں قصر پڑھو گے، مکمل نماز پڑھنے کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اسلام آباد میں میں ملازم ہوں، اور فیصل آباد میں مکمل پڑھنے کی وجہ یہ ہے کہ وہاں میرا ذاتی گھر ہے اور ان کے

بقول جہاں جائیداد ہو وہاں نماز مکمل پڑھنی پڑے گی) اب سوال یہ ہے کہ نماز قصر کے لیے علت سفر ہے یا ذاتی جائیداد کا نہ ہونا اس کی بھی وضاحت کر دیں۔

نیز یہ بھی بتائیے کہ میری زوجہ اپنے والدین کے گھر میں نماز قصر ادا کرے یا مکمل ادا کرے یا اس کو بھی والد کی جائیداد کے حصہ دار ہونے کے لحاظ سے نماز مکمل پڑھنی پڑے گی؟

(حفیظ الرحمٰن، اسلام آباد)

الجواب صورتِ مسؤلہ میں آپ کے لیے بہتر اور راجح یہی ہے کہ ذاتی گھر اور اسلام آباد، دونوں جگہ پوری نماز پڑھیں۔ چونکہ سفر میں پوری نماز پڑھنی جائز ہے اور آپ کا مسئلہ اجتہادی ہے لہٰذا شک سے نکلنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ دونوں جگہ پوری نماز پڑھی جائے۔ سفر میں پوری نماز پڑھنا، سیدنا عثمان اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے۔ بلکہ سنن نسائی (ج ۳ ص ۱۲۲ ح ۱۴۵۷) وسنن دار قطنی (ج ۲ ص ۱۸۸) کی ایک صحیح حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر میں پوری نماز پڑھنے کو احسن یعنی اچھا قرار دیا ہے۔

اس روایت کو امام دار قطنی نے حسن کہا ہے۔ العلا بن زہیر جمہور کے نزدیک ثقہ راوی تھے اور ان پر حافظ ابن حبان کی جرح مردود ہے۔ اس روایت کے کئی شواہد بھی ہیں، مثلاً دار قطنی (۱۸۸/۲ ح ۲۲۷۵) اور بیہقی (۱۴۱/۳) نے صحیح سند سے نقل کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر میں پوری نماز پڑھی ہے۔ اسے امام دار قطنی نے "إسناد صحیح" کہا۔ اس کا راوی سعید بن محمد بن ثواب ہے جس سے ایک جماعت روایت کرتی ہے۔ اسے دار قطنی نے صحیح الحدیث یعنی ثقہ قرار دیا ہے۔ امام ابن حبان نے کتاب الثقات (ج ۸ ص ۲۷۲) میں "مستقیم الحدیث" کہا ہے لہٰذا شیخ البانی رحمہ اللہ کا ارواء الغلیل (ج ۳ ص ۷) میں اسے "مجہول الحال" کہنا صحیح نہیں ہے۔

مختصر یہ کہ راجح قول کے مطابق سفر میں قصر کرنا افضل ہے اور پوری نماز پڑھنا جائز ہے لہٰذا شک سے بچتے ہوئے آپ دونوں مقامات پر پوری نماز پڑھیں۔

اور یہی حکم آپ کی زوجہ کے لئے ہے کہ وہ اپنے والدین کے گھر میں پوری نماز پڑھیں گی۔ واللہ اعلم

[شہادت، فروری ۲۰۰۲ء]

آبائی مقام میں قصر نماز کا حکم

سوال میرے والدین عرصہ بیس (۲۰) سال سے تحصیل بہاولنگر میں رہتے ہیں جب کہ ہماری زمین ہارون آباد اور بہاولپور میں ہے جس کا بہاولپور سے بالترتیب فاصلہ ۵۰ اور ۲۵۰ کلومیٹر ہے۔ ہماری مرکزی مسجد کے عالم صاحب کہتے ہیں کہ وہاں تم (قصر) نماز نہیں کر سکتے کیونکہ وہاں تمھاری زمین ہے۔ اب کیا ہم وہاں (قصر) نماز نہیں کر سکتے ہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔ (ابوفہد، بہاولپور)

الجواب صحیح بخاری میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

"أقام رسول الله ﷺ تسعة عشر يقصر، فنحن إذا سافرنا تسعة عشر قصرنا وإن زدنا أتممنا" رسول اللہ ﷺ نے انیس (۱۹) دن قیام کیا۔ آپ قصر کرتے رہے۔ پس ہم جب انیس دن سفر (ایک مقام پر قیام کے ساتھ) کرتے تو قصر کرتے اور اگر زیادہ دن (قیام کرتے) رہتے تو پوری نماز پڑھتے۔

(کتاب قصر الصلوٰۃ [ابواب التقصیر] باب ماجاء فی التقصیر وکم یقیم حتی یقصر [ح ۱۰۸۰])

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بیس دن سے زیادہ قیام کی صورت میں پوری نماز پڑھنی چاہئے۔ آپ اپنے گھر اور اپنی زمینوں پر پوری نماز پڑھیں کیونکہ آپ وہاں مسافر کے حکم میں نہیں ہیں۔ نیز دیکھئے ماہنامہ شہادت اپریل ۲۰۰۱ء [شہادت، جولائی ۲۰۰۱ء]

جمع بین الصلاتین کا مسئلہ

سوال اگر مغرب کی نماز پڑھنے مسجد جائیں، موسم خراب ہو، بارش ہو رہی ہو اور مزید بارش کا امکان بھی ہو تو کیا مغرب کے ساتھ عشاء کی نماز بھی ادا کی جا سکتی ہے؟ اور اگر ادا کی جا سکتی ہے تو کیا اس میں شہر یا گاؤں کی کوئی تخصیص ہے؟ (ایک سائل)

الجواب سیدنا نافع (تابعی) سے روایت ہے:

" أن عبدالله بن عمر كان إذا جمع الأمراء بين المغرب والعشاء في المطر

جمع معهم "جب اصحابِ اقتدار (خلفاء وغیرہ) بارش میں مغرب اور عشاء کی نماز جمع کرتے تو وہ ان کے ساتھ جمع کر لیتے تھے۔

(موطأ امام مالک ج ۱ص ۱۴۵ کتاب قصر الصلوٰۃ فی السفر باب الجمع بین الصلاتین فی الحضر والسفر)

اس کی سند بالکل صحیح ہے لہٰذا اگر تیز بارش کا عذر ہو تو مغرب و عشاء کی نمازیں جمع کرنا جائز ہے۔ [شہادت، مارچ ۲۰۰۲]

بغیر عذر کے جمع بین الصلاتین جائز نہیں ہے

سوال میں مسافر نہیں ہوں لیکن جہاں کام کرتا ہوں بعض دفعہ وہاں منیجر نماز کے لئے بریک ٹائم نہیں دیتا کبھی (گاہک) کی وجہ سے اور کبھی بغیر کسی وجہ کے تو کیا ایسے میں کوئی ظہر کے ساتھ عصر ملا سکتا ہے۔ایک عربی عالم نے یہاں کہا ہے کہ نماز قضا کرنے سے بہتر ہے کہ جمع کر و ظہر کو عصر کے ساتھ مگر اسے روز کا معمول مت بناؤ۔ (محمد عادل شاہ، برطانیہ)

الجواب اگر شدید مجبوری اور شرعی عذر ہو تو کبھی کبھار دو نمازیں جمع کر کے پڑھنا جائز ہے۔تفصیل کے لئے دیکھئے ماہنامہ الحدیث: ۵۲ص ۱۷ تا ۲۵

ویسے آپ کے لئے بہتر اور مناسب یہ ہے کہ اس نوکری کو چھوڑ کر کوئی دوسری جائز نوکری تلاش کر لیں جہاں پابندی سے نمازیں پڑھ سکیں۔

جمعہ کا بیان

خطبۂ مسنونہ اور بعض مروج الفاظ

سوال مسنون خطبہ میں الفاظ "ونؤمن به ونتوكل عليه" اور "ونشهد أن لا...... ونشهد أن محمدًا..." حدیث صحیح سے ثابت ہیں؟ (تنویر سلفی، ضلع ایبٹ آباد)

الجواب یہ الفاظ ثابت نہیں ہیں۔ [شہادت، اکتوبر ۲۰۰۱ء]

خطبۂ جمعہ میں اشعار پڑھنا

سوال خطبۂ جمعہ (دورانِ تقریر) میں اشعار پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

(تنویر سلفی، ضلع ایبٹ آباد)

الجواب اگر اشعار صحیح ہوں، کتاب وسنت کے مطابق ہوں تو انھیں خطبہ وغیرہ میں پڑھنا جائز ہے۔ [شہادت، اکتوبر ۲۰۰۱ء]

اختلافی مسائل پر خطبات

سوال مقلدین سے جو محدثین کے اختلافی مسائل ہیں، ان پر خطبہ پڑھنا کیسا ہے جب کہ لاؤڈ سپیکر کی آواز ان کی مسجد میں جاتی ہو اور اچانک کسی فتنہ کا خدشہ ہو۔

(محمد منور بن ذکی، ریاض سعودی عرب)

الجواب مسجد کی کمیٹی اور مقتدیوں کے مشورے کے مطابق اختلافی مسائل پر عندالضرورت خطبہ جائز ہے، تاہم بہتر یہی ہے کہ ترغیب وترہیب اور اتباع کتاب وسنت پر خطبہ ہو۔ [شہادت، اگست ۲۰۰۱ء]

دورانِ خطبہ میں سلام کا جواب دینا

سوال جب خطیب خطبۂ جمعہ دے رہا ہو تو کوئی آدمی آ کر سلام عرض کرے تو کیا

دورانِ خطبہ میں سلام کا جواب دینا حدیث سے ثابت ہے یا نہیں؟ وضاحت فرمائیں۔

(اشفاق احمد)

الجواب نماز کی حالت میں سلام اور اس کا جواب، رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے اور آپ کی وفات کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی۔ دیکھئے صحیح مسلم (۵۴۰)، سنن ابی داود (۹۲۷)، السنن الکبریٰ للبیہقی (ج۲ص۲۵۹) اور مصنف ابن ابی شیبہ (ج۲ص۴۷) وغیرہ

جب نماز میں سلام کا جواب جائز ہے تو دورانِ خطبہ میں بطریقِ اولیٰ سلام کا جواب جائز ہے۔ [شہادت، جون ۲۰۰۱ء]

حالتِ خطبہ میں دو رکعت نماز

سوال درج ذیل الفاظ سے مشہور حدیث کے بارے میں تحقیق درکار ہے:

" إذا صعد الخطيب المنبر فلا يتحدثن أحدكم ومن يتحدث فقد لغا ومن لغا فلا جمعة له، أنصتوا لعلكم ترحمون "

اس حدیث کی تحقیق کے تحت مسئلہ کی محقق و مدلل وضاحت بھی فرمادیں۔

جزاکم اللہ خیراً۔ (ذکاء الرحمٰن ذکی (درجہ سابعہ) دارالعلوم تقویۃ الاسلام، اوڈانوالہ، ضلع فیصل آباد)

الجواب یہ روایت مجھے حدیث کی کسی کتاب میں سند کے ساتھ نہیں ملی۔

اسے شیخ عبدالمتعال (بن محمد) الجبری نے اپنی کتاب "المشتهر من الحديث الموضوع والضعيف والبديل الصحيح" میں ذکر کیا ہے۔

(۱۶۸، وموسوعۃ لأحادیث والآثار الضعیفۃ والموضوعۃ ج۱ص۵۰۳ح۱۶۲۵)

شیخ البانی رحمہ اللہ نے فرمایا: "باطل، قد اشتهر بهذا اللفظ على الألسنة وعلق على المنابر ولا أصل له " یہ روایت باطل ہے۔ یہ زبانوں پر مشہور ہے اور منبروں پر اسے لکھ کر لٹکایا جاتا ہے، اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

(سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ ۱/۱۲۲ح۸۷)

اس بے اصل اور موضوع روایت کے دو شاہد (تائید والی روایتیں) ہیں:

① عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ (السنن الکبریٰ للبیہقی ۳/۱۹۳)

یہ سند تین وجہ سے ضعیف ہے:

اول: الحسن بن علی (یا علی بن الحسن) العسکری کی توثیق نا معلوم ہے۔

دوم: محمد بن عبدالرحمٰن بن (سہیل یا سہم) کی توثیق نا معلوم ہے۔

سوم: یحییٰ بن ابی کثیر مدلس تھے اور روایت عن سے ہے۔

(دیکھئے تقریب التہذیب: ۷۶۳۲ والنکت علی ابن الصلاح ۲/۶۴۳ واتحاف المہرۃ ۳/۳۲۵ ح ۳۱۲۲)

امام دارقطنی نے فرمایا: ''ويحيى بن أبي كثير معروف بالتدليس''

(العلل الواردۃ ۱۱/۱۴۴ سوال: ۲۱۶۳)

② عن ابن عمر رضی اللہ عنہ، رواہ الطبرانی فی الکبیر بحوالہ مجمع الزوائد (۲/۱۸۴)

یہ روایت المعجم الکبیر للطبرانی میں نہیں ملی اور نہ اس کی پوری سند کسی کتاب سے دستیاب ہوسکی ہے۔ ایوب بن نہیک جمہور محدثین کے نزدیک ضعیف و مجروح راوی ہے۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: ''والجواب عن حديث ابن عمر بأنه ضعيف فيه أيوب ابن نهيك وهو منكر الحديث قاله أبو زرعة وأبو حاتم والأحاديث الصحيحة لا تعارض بمثله'' حدیثِ ابن عمر کا جواب یہ ہے کہ یہ (بلحاظِ سند) ضعیف ہے۔ اس (کی سند) میں ایوب بن نہیک (راوی) منکر الحدیث (یعنی سخت ضعیف) ہے جیسا کہ ابوزرعہ اور ابوحاتم نے فرمایا ہے، اور صحیح احادیث کو ایسی (مردود) روایت کی بنا پر رد نہیں کیا جاسکتا۔ (فتح الباری ۲/۴۰۹ تحت ح ۹۳۰)

ایوب سے اوپر اور نیچے سند نا معلوم ہے اور ایسی بے سند و باطل روایتوں پر اعتماد کرنا جائز نہیں ہے۔

خلاصۃ التحقیق: یہ روایت باطل اور مردود ہے۔

صحیح بخاری (۱۱۶۶) اور صحیح مسلم (۸۷۵) میں حدیث ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

''جب تم میں سے کوئی شخص آئے اور امام خطبہ دے رہا ہو تو یہ شخص دو رکعتیں پڑھے۔''

اس صحیح حدیث کے خلاف یہ بے سند، ضعیف و مردود روایتیں سرے سے مردود ہیں۔

سیدنا ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ نے (نبی ﷺ کی وفات کے بعد) جمعہ کے دن، مسجد میں خطبہ کے دوران میں آکر دو رکعتیں پڑھیں۔ بعض مَروانی سپاہیوں نے انھیں منع کرنے کی کوشش کی مگر انھوں نے فرمایا: ''میں ان دو رکعتوں کو کس طرح چھوڑ سکتا ہوں جب کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے کہ....''

(جزء رفع الیدین: ۱۶۲، وسندہ حسن، سنن ابی داود: ۱۶۷۵، سنن الترمذی: ۵۱۱ وقال: ''حسن صحیح'')

حالتِ خطبہ میں آپس میں باتیں کرنے کی ممانعت کے لئے دیکھئے صحیح بخاری (۹۳۴) و صحیح مسلم (۸۵۱)

ابن عون رحمہ اللہ نے فرمایا: حسن (بصری رحمہ اللہ) آتے اور امام (جمعہ کا) خطبہ دے رہا ہوتا تھا تو وہ دو رکعتیں پڑھتے تھے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۲ ص ۱۱۱ ح ۵۱۶۵ وسندہ صحیح)

وما علینا إلا البلاغ (۴/محرم ۱۴۲۷ھ) [الحدیث: ۲۴]

خطبۂ جمعہ کے لئے آنے والا دو رکعتیں پڑھے

سوال اصحابِ رسولؐ جب بھی خطبہ جمعہ کے وقت مسجد میں آتے تھے تو اصحاب رسول دو رکعت پڑھ کر بیٹھتے تھے۔ حدیث سے ثابت کریں!

(ماسٹر فضل حسین دیوبندی، بذریعہ ثناء اللہ مکی۔ گوجرانوالہ)

الجواب سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جمعہ کے دن نبی ﷺ خطبہ دے رہے تھے کہ ایک آدمی مسجد میں داخل ہوا۔ آپ نے فرمایا: کیا تو نے نماز پڑھی ہے؟ اس نے کہا: نہیں، آپ (ﷺ) نے فرمایا: پس دو رکعتیں پڑھو۔ (صحیح البخاری: ۹۳۱ و صحیح مسلم: ۸۷۵)

سیدنا جابر بن عبداللہ الانصاری رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے خطبے میں فرمایا: اگر تم میں سے کوئی شخص جمعہ کے دن (جمعہ پڑھنے کے لئے) آئے اور امام (خطبے کے لئے) نکل چکا ہو تو وہ شخص دو رکعتیں پڑھے۔ (صحیح مسلم: ۸۷۵/۵۷ واللفظ لہ و صحیح بخاری: ۱۱۶۶)

سیدنا ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ جمعہ کے دن آئے، مروان (بن الحکم) خطبہ دے رہا تھا۔

آپ نے چوکیداروں کی مخالفت کے باوجود نماز پڑھی۔

(سنن الترمذی:۵۱۱ وقال: "حدیث حسن صحیح" ومسند الحمیدی:۷۴۱)

معلوم ہوا کہ صحابۂ کرام خطبہ جمعہ کے وقت دو رکعتیں پڑھ کر بیٹھتے تھے۔ کسی ایک صحیح روایت سے بھی یہ ثابت نہیں کہ خطبہ جمعہ کے وقت کوئی صحابی مسجد میں آیا ہو اور دو رکعتیں پڑھے بغیر بیٹھ گیا ہو۔ وما علينا إلا البلاغ [الحدیث:۱۶]

رکعاتِ جمعہ ایک سلام کے ساتھ

سوال احناف صلوٰۃ الجمعہ سے پہلے (مخصوص) چار رکعت سنتیں پڑھنے کے لئے درج ذیل روایت پیش کرتے ہیں:

اعلاء السنن (ج ۷ صفحہ ۱۳، حدیث:۱۷۶۲)

اس روایت کی سنداً کیا حیثیت ہے؟ (ابوفہد، بہاولپور)

الجواب یہ روایت المعجم الاوسط (ج ۲ ص ۳۶۸ ح ۱۶۴۰) میں موجود ہے۔ امام طبرانی رحمہ اللہ نے فرمایا: "حدثنا أحمد (ابن الحسين بن نصر الخراساني) قال: حدثنا شباب العصفري قال: حدثنا محمد بن عبدالرحمن السهمي قال: حدثنا حصين بن عبدالرحمن السلمي عن أبي إسحاق عن عاصم بن ضمرة عن علي قال: كان رسول الله ﷺ يصلي قبل الجمعة أربعًا وبعدها أربعًا ، يجعل التسليم في آخر هن ركعة." سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جمعہ سے پہلے اور بعد میں چار چار رکعات پڑھتے تھے، اور سلام آخری (چوتھی) رکعت میں پھیرتے تھے۔

اس روایت کو زیلعی حنفی نے نصب الرایہ (ج ۲ ص ۲۰۶) میں نقل کیا ہے۔ مگر اس میں بہت سی مطبعی یا نقل در نقل کی غلطیاں واقع ہو گئی ہیں: ① ابو اسحاق کا واسطہ گر گیا ہے۔

② شباب العصفری کے بجائے "سفیان العصفری" چھپ گیا ہے۔

③ محمد بن عبدالرحمٰن السہمی کے بجائے "محمد بن عبدالرحمٰن التیمی" لکھا ہوا ہے نیز یہ روایت

کئی وجہ سے ضعیف ہے:

① ابواسحاق السبیعی مدلس ہیں۔

دیکھئے صحیح ابن حبان (الاحسان ج ۱ ص ۹۰) اور طبقات المدلسین بتحقیقی (ص ۵۸)

ان کے شاگرد امام شعبہ رحمہ اللہ نے فرمایا: كفيتكم تدليس ثلاثة: الأعمش وأبي إسحاق وقتادة . یعنی میں تمھیں تین اشخاص کی تدلیس کے لیے کافی ہوں، اعمش، ابواسحاق اور قتادہ۔ (مسالۃ التسمیۃ لمحمد بن طاہر المقدسی ص ۴۷ وسندہ صحیح، معرفۃ السنن والآثار للبیہقی ۱/ ۸۶، طبقات المدلسین لابن حجر ص ۱۵۱، دوسرا نسخہ: الفتح المبین ص ۸۳)

اس قول سے دو مسئلے معلوم ہوتے ہیں:

۱: اعمش، ابواسحاق اور قتادہ مدلس تھے۔

۲: اعمش، ابواسحاق اور قتادہ سے شعبہ کی روایت صحیح ہوتی ہے۔ یاد رہے کہ روایتِ مذکورہ، غیر شعبہ کی سند سے ہے اور مدلس کی عن والی روایت ضعیف ہوتی ہے۔

② ابواسحاق آخری عمر میں مختلط ہو گئے تھے۔

③ محمد بن عبدالرحمٰن السہمی ضعیف ہے۔

اسے بخاری اور یحییٰ بن معین نے ضعیف کہا۔ جب کہ ابن عدی نے عندي لا بأس به کہا ہے۔ (لسان المیزان ۵/ ۲۷۷، فتح الباری ۲/ ۴۲۶ تحت ح ۹۳۷)

امام ابن عدی کے نزدیک عام طور پر "لا بأس به" ضعیف ہوتا ہے۔ جیسا کہ انھوں نے جعفر بن میمون کے ترجمے میں کہا: "وأرجو انه لا بأس به ويكتب حديثه في الضعفاء" (الکامل لابن عدی ۲/ ۵۶۲م، دوسرا نسخہ ۲/ ۳۷۰)

ابوحاتم نے "ليس بمشهور" کہا۔ ان سب کے مقابلے میں حافظ ابن حبان نے اسے کتاب الثقات میں ذکر کیا جو کہ جمہور کی جرح کے مقابلے میں مردود ہے۔ ظفر احمد تھانوی دیوبندی نے اس مردود توثیق اور سکوت حافظ ابن حجر کی وجہ سے اس روایت کو حسن قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری (۲/ ۴۲۶ تحت حدیث: ۹۳۷)

میں اس روایت اور راوی پر جرح کر رکھی ہے۔ انھوں نے امام اثرم سے نقل کیا ہے کہ یہ حدیث کمزور ہے۔ ظفر احمد تھانوی نے طبرانی کی المعجم الکبیر سے اس کا ایک شاہد نقل کیا ہے۔ (اعلاء السنن ج ۷ ص ۱۴ ح ۱۷۶۳) حالانکہ اس کی سند میں مبشر بن عبید (کذاب) راوی ہے۔ تھانوی نے المعجم الکبیر کو دیکھے بغیر لکھ دیا ہے کہ "وأما إسناده عند الطبراني في الكبير فسالم عن مبشر بن عبيد هذا" یعنی طبرانی کبیر میں اس کی سند میں مبشر بن عبید موجود نہیں ہے (انتھی کلام التھانوی) حالانکہ طبرانی کبیر (۱۲/۱۲۹ ح ۱۲۶۷۴) کی اس سند میں یہ راوی موجود ہے اور عینی حنفی نے بھی المعجم الکبیر کی سند میں مبشر بن عبید کا وجود تسلیم کیا ہے۔ اس قسم کی شعبدہ بازیوں کی وجہ سے تھانوی صاحب جیسے حضرات صحیح کو ضعیف اور ضعیف کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ [شہادت، جولائی ۲۰۰۱ء]

نمازِ جمعہ رہ جانے کی صورت میں ظہر کی ادائیگی

سوال جس شخص کی جمعہ کی نماز فوت ہو جائے تو آیا وہ نمازِ جمعہ ادا کرے گا یا ظہر؟

(ایک سائل)

الجواب وہ نمازِ ظہر پڑھے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((من أدرك من الجمعة ركعة فليصل إليها أخرى)) جو شخص جمعہ میں سے ایک رکعت پالے تو اس کے ساتھ دوسری آخری رکعت ملا لے۔ (سنن ابن ماجہ: ۱۱۲۱، وھو حدیث صحیح)

ایک روایت میں ہے کہ ((من أدرك ركعة من يوم الجمعة فقد أدركها وليضف إليها أخرى)) جو شخص جمعہ کے دن جمعہ کی نماز سے ایک رکعت پالے تو اس نے جمعہ پالیا اور وہ اس کے ساتھ دوسری رکعت ملا لے۔

(سنن الدارقطنی ج ۲ ص ۱۳ ح ۱۵۹۲، وسندہ حسن)

اس حدیث کے راوی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"من أدرك ركعة من الجمعة فقد أدركها إلا أنه يقضي ما فاته"

جس نے جمعہ کی ایک رکعت پالی اس نے جمعہ پالیا اور یہ کہ وہ فوت شدہ (ایک رکعت) ادا

کرے گا۔ (السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۳ص ۲۰۴ وسندہ صحیح)

یہی قول امام زہری رحمہ اللہ سے ثابت ہے اور وہ اسے ''وھي السنة '' اور یہ سنت ہے۔ قرار دیتے تھے۔ (دیکھئے موطأ امام مالک ج ۱ص ۱۰۵)

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے شہر (مدینہ طیبہ) میں علماء کو اسی قول پر پایا ہے۔ (ایضاً) یہی قول عروہ بن الزبیر، سالم بن عبداللہ بن عمر، نافع بن عمر، وغیرہم کا ہے۔ دیکھئے مصنف ابن ابی شیبہ (ج ۲ص ۱۲۹، ۱۳۰) وغیرہ

[ان دلائل و آثار سے ثابت ہوا کہ جو شخص جمعہ کی ایک رکعت بھی نہ پا سکے تو وہ پھر دو رکعتیں نہیں پڑھے گا، لہٰذا وہ ایسی حالت میں چار رکعتیں پڑھے گا۔]

ان دلائل و آثار کے مقابلے میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

''جس کا جمعہ فوت ہو جائے وہ دو رکعتیں پڑھے۔ یہ ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔''

(اخبار اصبہان لابی نعیم الاصبہانی ج ۲ص ۲۰۰ ملخصاً)

اس روایت کی سند ضعیف ہے۔ محمد بن نوح بن محمد کا ذکر اخبار اصبہان اور طبقات ابی الشیخ (ج ۳ص ۱۱۵) میں ہے تاہم اس کی توثیق معلوم نہیں۔ احمد بن الحسین اور محمد بن جعفر کا تعین بھی مطلوب ہے۔ [شہادت، جولائی ۲۰۰۱ء]

سوال اگر کسی شخص کو جمعہ کے دن امام اس حالت میں ملے کہ تشہد میں ہو۔ اور وہ شخص جماعت میں شامل ہو جائے تو آیا وہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد دو (۲) رکعت ادا کرے گا یا چار (۴) رکعت؟ (محمد شاہد میمن)

الجواب یہ شخص ظہر کی چار رکعتیں پڑھے گا۔ اسی پر امام ابن منذر النیسابوری نے اجماع نقل کیا ہے۔ (الاجماع ص ۳۸ رقم ۵۶، الاوسط ج ۴ص ۱۰۷) [شہادت، جولائی ۲۰۰۱ء]

سورۂ اعلیٰ کی قراءت اور سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰى کہنا

سوال کیا نمازِ جمعہ میں امام و مقتدی کے لئے ''سبّح اسم ربّك الأعلىٰ '' کی قراءت کے بعد سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰى کہنا جائز ہے؟ (ایک سائل)

الجواب سنن ابی داود (کتاب الصلوٰۃ باب الدعاء فی الصلوٰۃ) کی ایک روایت میں ہے: ''انّ النبي ﷺ کان إذا قرأ ﴿ سبّح اسم ربّك الاعلیٰ ﴾ قال : سبحان ربي الأعلیٰ '' نبی ﷺ جب: سبّح اسم ربّك الأعلیٰ پڑھتے تو کہتے: سبحان ربي الأعلیٰ .

یہ روایت مسند احمد (ج ۱ ص ۲۳۲) وغیرہ میں بھی ہے اور اسے حاکم، ذہبی (المستدرک مع التلخیص ج ۱ ص ۲۶۳ ـ ۲۶۴) اور علامہ عزیزی نے صحیح کہا ہے لیکن اس کی سند ابو اسحاق السبیعی رحمہ اللہ کے عنعنہ کی وجہ سے ضعیف ہے کیونکہ ابو اسحاق مشہور مدلس ہیں۔

(دیکھئے کتب مدلسین)

شعبہ والی روایت موقوف روایت مصنف ابن ابی شیبہ (ج ۲ ص ۵۰۹) میں ہے کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سبّح اسم ربّك الأعلیٰ کے بعد سبحان ربي الأعلیٰ کہتے تھے اور اس کی سند صحیح ہے۔ صحیح مسلم وغیرہ میں نبی ﷺ کی رات کی نماز میں آیاتِ رحمت پر رحمت کی دعا اور آیاتِ عذاب پر عذاب سے تعوّذ (پناہ مانگنا) ثابت ہے۔

مصنف ابن ابی شیبہ میں سیدنا ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ سے باسند صحیح ثابت ہے کہ انھوں نے (نماز جمعہ میں) سبح اسم ربّك الأعلیٰ پڑھا تو کہا: سبحان ربي الأعلیٰ

(ج ۲ ص ۵۰۸)

اسی طرح امام ابن ابی شیبہ نے سیدنا عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے صحیح سندوں کے ساتھ سبح اسم ربّك الأعلیٰ کی قراءت کے بعد سبحان ربي الأعلیٰ کہنا روایت کیا ہے۔ اس طرح کے آثار دیگر ائمہ سلف سے بھی مروی ہیں۔ میرے علم کے مطابق کسی صحابی رضی اللہ عنہم سے اس کی مخالفت مروی نہیں لہٰذا ثابت ہوا کہ امام کا سورۃ الاعلیٰ کی قراءت میں سبحان ربي الأعلیٰ کہنا بالکل صحیح ہے۔ رہے مقتدی تو ان کے لئے سورۃ الفاتحہ پڑھنا فرض ہے اور اس کے علاوہ حالتِ جہری میں دیگر قراءت ممنوع ہے لہٰذا انھیں چپ رہنا چاہئے۔ واللہ اعلم (ہفت روزہ الاعتصام لاہور، ۲۷/ جون ۱۹۹۷ء)

عیدین کا بیان

عید کے دن نمازِ جمعہ کا اختیار

سوال ایک ہی دن عید اور جمعۃ المبارک آ جائیں تو آیا عید پڑھ لینے سے جمعہ ساقط ہو جاتا ہے یا کہ نہیں یعنی جمعہ پڑھنا ضروری ہے یا نہیں؟ قرآن وسنت کے حوالہ سے وضاحت فرمائیں۔ (حافظ شفیق، باغ آزاد کشمیر)

الجواب اگر عید اور جمعہ ایک دن میں جمع ہو جائیں تو عید پڑھنے والے کے لئے یہ رخصت ہے کہ وہ اس دن نمازِ جمعہ نہ پڑھے بلکہ نماز ظہر ہی پڑھ لے۔ سیدنا زید بن ارقم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک دفعہ عید اور جمعہ ایک دن میں اکٹھے ہو گئے (یعنی جمعہ کے دن عید تھی) آپ نے عید کی نماز پڑھانے کے بعد نماز جمعہ کی رخصت دی اور فرمایا: ((من شاء أن يصلي فليصل .)) جو نماز جمعہ پڑھنا چاہے تو پڑھ لے۔

(سنن ابی داود: ۱۰۷۰، وسندہ حسن، وصححہ ابن خزیمہ: ۱۴۶۴، والحاکم ۲۸۸/۱ ووافقہ الذہبی)

اس کے راوی ایاس بن ابی رملہ جمہور محدثین کے نزدیک ثقہ وصدوق ہیں لہٰذا انھیں مجہول کہنا صحیح نہیں ہے۔ احکام العیدین للفریابی (ص ۲۱۱۔ ۲۱۸) میں اس کے بہت سے شواہد بھی ہیں۔ [شہادت، دسمبر ۲۰۰۰ء]

مسجد میں نمازِ عید کی ادائیگی

سوال کیا عید کی نماز مسجد میں ہو جاتی ہے؟ (محمد منور بن زکی، ریاض سعودی عرب)

الجواب اگر مجبوری ہو تو عید کی نماز مسجد میں ہو جاتی ہے۔ امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''یاأیھا الناس! إن رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یخرج بالناس إلی المصلی، یصلی بھم لأنہ أرفق بھم وأوسع علیھم وأن المسجد کان

لايسعهم قال: فإذا كان هذا المطر فالمسجد أرفق۔"

اے لوگو! بے شک رسول اللہ ﷺ لوگوں کو عیدگاہ لے جاتے تاکہ انھیں نماز پڑھائیں۔ یہ بات زیادہ آسان اور وسعت والی تھی اور (چونکہ) مسجد میں وہ لوگ سما نہیں سکتے تھے۔ پس اگر بارش ہو تو مسجد میں (عید کی) نماز پڑھ لو، یہ زیادہ آسان بات ہے۔

(السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۳ ص ۳۱۰ وسندہ قوی)

اس سلسلے میں ایک ضعیف حدیث بھی مروی ہے۔ دیکھئے سنن ابی داود (ح ۱۱۶۰)

لیکن ضعیف روایت کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے۔ [شہادت، اگست ۲۰۰۱ء]

شاہراہ عام پر نمازِ عید کی ادائیگی

سوال اگر عیدگاہ نہ ہو تو کیا سڑک یا 60/70 گز کے پلاٹ پر عید کی نماز ادا کرنا مناسب ہے؟ (محمد منور بن ذکی، ریاض سعودی عرب)

الجواب اگر عیدگاہ نہ ہو تو کھلے میدان، سڑک کے قریب یا کھلے پلاٹ میں عید کی نماز پڑھنا جائز ہے۔ [شہادت، اگست ۲۰۰۱ء]

سوال کئی اہلحدیث آبادی کی مسجد میں یا مسجد کے باہر سڑک کو بلاک کر کے عید کے اجتماعات کرتے ہیں، ان کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ (ظفر عالم، لاہور)

الجواب عید کا اجتماع کھلے میدان اور عیدگاہ میں کرنا چاہئے۔ روڈ اور سڑکیں بلاک کرنا، اگر اس سے لوگوں کو تکلیف ہوتی ہو تو صحیح نہیں ہے۔ اس سے اجتناب کیا جائے۔

لا ضرر ولا ضرار کے اصول کا یہی تقاضا ہے۔ [شہادت، اگست ۲۰۰۱ء]

خطبہ عید اور منبر

سوال عید کا خطبہ منبر پر دیا جائے گا یا بغیر منبر کے؟ اگر بغیر منبر کے دیا جائے گا تو کیا طریقہ ہوگا؟ (محمد منور بن ذکی، ریاض سعودی عرب)

الجواب صحیح بخاری (۹۵۶)، صحیح مسلم (۸۹)، سنن ترمذی (۲۱۷۲)، سنن ابی داود

(۱۱۴۰) اور سنن ابن ماجہ (۱۲۷۵) کی صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ عید کے دن منبر نہیں نکالا جائے گا لہٰذا خطبہ بغیر منبر کے دیا جائے۔ [شہادت، اگست ۲۰۰۱ء]

تکبیراتِ عیدین میں رفع یدین

سوال زوائد تکبیرات عید میں رفع الیدین کرنا چاہئے یا نہیں؟

(محمد منور بن ذکی، ریاض سعودی عرب)

الجواب حدیث: ''کان یرفع یدیه في کل تکبیرة کبرها قبل الرکوع'' کی رو سے تکبیراتِ عیدین میں رفع الیدین کرنا چاہئے۔ یہ حدیث صحیح ہے۔

دیکھئے سنن ابی داود (۷۲۲) اور مسند احمد (۱۳۴،۱۳۳/۲)

اس حدیث کے مفہوم میں تکبیرات عیدین شامل ہیں جیسا کہ امام بیہقی اور امام ابن المنذر نے سمجھا ہے۔ [شہادت، اگست ۲۰۰۱ء]

سوال کیا تکبیراتِ عیدین میں رفع الیدین کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

(ابوطلحہ حافظ ثناء اللہ شاہد القصوری)

الجواب سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ " ویرفعها في کل تکبیرة یکبرها قبل الرکوع حتی تنقضی صلاته"

اور آپ (ﷺ) ہر تکبیر میں رفع الیدین کرتے تھے جو تکبیر آپ رکوع سے پہلے کہتے تھے حتیٰ کہ آپ کی نماز ختم ہو جاتی۔ (سنن ابی داود: ۷۲۲)

اس روایت کی سند صحیح ہے۔ بقیہ بن الولید نے سماع کی تصریح کر دی ہے اور وہ صحیح الحدیث راوی تھے۔ الزبیدی کا نام محمد بن الولید بن عامر ہے جو بالاتفاق ثقہ ہیں نیز ابن اخی الزہری نے ان کی متابعت کر رکھی ہے۔ (مسند احمد ۱۳۳/۲۔۱۳۴، وصححہ ابن الجارود: ۱۷۸)

ابن اخی الزہری: صحیح الحدیث ہیں اور امام زہری نے سماع کی تصریح کر رکھی ہے۔ شیخ البانی رحمہ اللہ نے بھی اس روایت کا صحیح ہونا تسلیم کیا ہے اور بعد میں تاویل کر دی ہے۔

اس صحیح حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ رکوع سے پہلے ہر تکبیر میں رفع الیدین ہوگا،

چاہے وہ رکوع سے منسلک ہو یا عیدین والی تکبیرات ہوں۔سلف صالحین میں سے امام بیہقی اور امام ابن المنذر رنے اس حدیث سے یہی استدلال کیا ہے۔سلف صالحین میں سے کسی کا امام بیہقی اور امام ابن المنذر رپر اس مسئلے میں رد ثابت نہیں ہے۔

امام اوزاعی،امام شافعی اور امام احمد،سب عیدین کی تکبیر میں رفع الیدین کے قائل ہیں۔

(الاوسط لابن المنذر ج ۴ ص ۲۸۲، السنن الکبریٰ للبیہقی ۳ /۲۹۳ المجموع للنووی ۵/ ۱۵، ۱۶، الام للشافعی ۱ /۲۳۷ مسائل ابی داود ص ۵۹، ۶۰ من ہامش الاوسط)

امام جعفر بن محمد الفریابی نے صحیح سند کے ساتھ امام اوزاعی سے نقل کیا ہے کہ "ارفع یدیك مع کلھن" ان سب تکبیرات میں رفع الیدین کرو۔(احکام العیدین ص ۱۸۲ ح ۱۳۶ وقال محققہ: إسنادہ صحیح)

امام جعفر الفریابی نے کہا:ثنا صفوان :ثنا الولید قال: سألت مالك بن أنس عن ذلك فقال:أرفع یدیك مع كل تكبیرة، ولم أسمع فیه شیئًا"

یعنی ولید بن مسلم الشامی رحمہ اللہ نے کہا: میں نے اس سلسلے میں (امام) مالک بن انس سے سوال کیا تو انھوں نے فرمایا: جی ہاں! ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کرو اور میں نے اس بارے میں کوئی چیز نہیں سنی۔(احکام العیدین ص ۱۸۲، ۱۸۳ ح ۱۳۷ وقال محققہ: إسنادہ صحیح)

امام مالک رحمہ اللہ کے قول: "میں نے کوئی چیز نہیں سُنی" کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں نے اس کے خلاف کچھ نہیں سنا جیسا کہ ان کے فتوے سے معلوم ہو رہا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں نے اس کی واضح دلیل نہیں سنی اور یہ بھی ممکن ہے کہ میں نے اس مسئلے میں کچھ بھی نہیں سنا۔واللہ اعلم

یاد رہے کہ مرفوع صحیح حدیث جو اس کی صریح دلیل ہے، اس جواب کے شروع میں ذکر کردی گئی ہے۔والحمدللہ

خلاصہ یہ کہ تکبیراتِ عیدین میں رفع الیدین، رسول اللہ ﷺ کی حدیث اور سلف صالحین سے ثابت ہے۔اس کے مقابلے میں ایسی کوئی صحیح حدیث نہیں ہے جس سے صراحتاً یہ ثابت ہو کہ آپ ﷺ تکبیراتِ عیدین میں رفع الیدین نہیں کرتے تھے۔ [شہادت، نومبر ۲۰۰۱ء]

تکبیراتِ عیدین اور جنازہ میں رفع یدین

سوال کیا تکبیراتِ عیدین اور جنازہ میں ہر تکبیر کے ساتھ رفع یدین کرنا چاہئے یا نہیں؟ (راجہ شفاعت حسین سلفی، راولپنڈی)

الجواب عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی صحیح احادیث میں پانچ مقامات پر رفع یدین کی صراحت ہے:

① شروع نماز میں تکبیر تحریمہ کے ساتھ ② رکوع سے پہلے
③ رکوع سے اُٹھتے وقت (متفق علیہ) ④ دو رکعتیں پڑھ کر اٹھتے وقت (صحیح بخاری)
⑤ رکوع سے پہلے ہر تکبیر کے ساتھ "ویر فعهما في كل تكبيرة يكبرها قبل الركوع" اور آپ رکوع سے پہلے ہر تکبیر کے ساتھ رفع یدین کرتے تھے۔

(سنن ابی داود مع عون المعبود ج ۱ ص ۲۶۳ ح ۷۲۲، وھو حدیث صحیح)

یہ روایت بلحاظ سند صحیح ہے۔ مسند احمد (ج ۲ ص ۱۳۳، ۱۳۴) اور المنتقی لابن الجارود (۱۷۸) میں اس کی دوسری سندیں بھی ہیں۔

محدثین میں سے امام بیہقی (ج ۳ ص ۲۹۲، ۲۹۳) اور ابن المنذر نے اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے تکبیرات عیدین کا جواز ثابت کیا ہے۔ کسی قابلِ ذکر محدث سے ان کی مخالفت منقول نہیں ہے۔ اصول فقہ میں یہ مسئلہ مقرر ہے کہ عموم لفظ کا اعتبار ہوتا ہے، اسے خصوصِ سبب سے مقید کرنا صحیح نہیں۔ (العبرة لعموم اللفظ ، لا لخصوص السبب ...)

امام بیہقی وغیرہ کی تائید میں ابن الترکمانی لکھتے ہیں: "اراد ة [لعله :أراده] العموم في كل تكبيرة تقع قبل الركوع و يندرج في ذلك تكبيرات العيدين"

(الجوہر النقی ج ۳ ص ۲۹۳)

اس حدیث سے مراد رکوع سے پہلے ہر تکبیر ہے اور اس میں عیدین کی تکبیرات بھی شامل ہیں۔

اس مقام پر حسبِ عادت اور مخالفت برائے مخالفت کے اصول کی بنا پر ابن الترکمانی

کے کلام میں بہت زیادہ تخلیط و اضطراب ہے۔ تاہم ان کا یہ دعویٰ بالکل باطل ہے کہ یہ حدیث بقیہ کے علاوہ کسی نے بیان نہیں کی۔ حالانکہ ابن اخی الزہری نے بھی یہی روایت بیان کر رکھی ہے۔ (دیکھئے مسند احمد ۲/۱۳۳، ۱۳۴) اور بقیہ کے بارے میں بھی حق یہی ہے کہ وہ صدوق وحسن الحدیث ہیں بشرطیکہ سماع کی تصریح کریں۔

محدثین کے اس فہم کی تائید ان آثار سے بھی ہوتی ہے جن میں تکبیرات عیدین میں رفع یدین کا ثبوت موجود ہے۔

① امام اوزاعی رحمہ اللہ نے کہا کہ تمام تکبیروں کے ساتھ (عیدین میں) رفع یدین کرنا چاہئے۔ (احکام العیدین للفریابی ص۱۸۲ ح ۱۳۶، واسنادہ صحیح)

② امام مالک رحمہ اللہ نے بھی فرمایا کہ تکبیرات عیدین کے ساتھ رفع یدین کرنا چاہئے اور (لیکن) میں (امام مالک) نے اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں سنا۔

(احکام العیدین ح ۱۳۷، واسنادہ صحیح)

③، ④ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کا بھی یہی موقف ہے کہ تکبیرات عیدین میں رفع یدین کرنا چاہئے۔ (الام ج۱ ص ۲۳۷، مسائل احمد روایۃ ابی داود ص۵۹، ۶۰)

حنفیہ میں سے محمد بن الحسن الشیبانی سے بھی یہی موقف مروی ہے۔

(الاوسط لابن المنذر ج۴ ص ۲۸۲، الاصل ج۱ ص ۳۷۴، ۳۷۵)

اس مسئلہ میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے ایک ضعیف روایت بھی مروی ہے:

”حدثنا موسی بن هارون قال: ثنا أبي قال: ثنا إسحاق بن عیسی قال: ثنا ابن لهیعة عن بکر بن سوادة عن أبي زرعة اللخمي قال: کان عمر بن الخطاب یرفع یدیه في کل تکبیرة من الصلوٰة علی الجنازة و في الفطر والأضحی“

(الاوسط لابن المنذر ۴/۲۸۲، السنن الکبریٰ للبیہقی ۳/۲۹۳ وقال: ”هذا منقطع“)

سند کا مختصر تعارف:

ابوزرعہ اللخمی، قسطنطنیہ پر حملہ آور مسلم جرنیلوں میں سے تھا۔

(مختصر تاریخ دمشق لابن منظور ج۲۸ ص ۳۲۵، ۳۲۶)

بکر بن سوادۃ ثقہ فقیہ تھے۔ (التقریب:۷۴۲)

ابن لہیعہ المصری، اختلاط سے پہلے صدوق وحسن الحدیث تھے۔ اسحاق بن عیسیٰ کا ان سے سماع قبل از اختلاط ہے۔ دیکھئے میزان الاعتدال (ج۲ ص۴۷۷)

ولید بن مسلم نے اسحاق کی متابعت کر رکھی ہے۔ (السنن الکبریٰ للبیہقی ج۳ ص۲۹۳)

مختصر أعرض ہے کہ یہ سند تین وجہ سے ضعیف ہے:

① ابو زرعہ اللخمی کی ثقاہت معلوم نہیں ہے۔

② ابن لہیعہ مدلس ہیں اور عن سے روایت کر رہے ہیں۔

③ سند منقطع ہے۔

درج بالا آثار سلف اور حدیث مرفوع کے مقابلے میں ایسی کوئی صریح دلیل نہیں ہے جس میں یہ مذکور ہو کہ تکبیرات عیدین میں رفع یدین نہیں کرنا چاہئے۔

نمازِ جنازہ کی تکبیروں میں رفع یدین کا ثبوت

امام دارقطنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''قال أحمد بن محمد بن الجراح و ابن مخلد، قالا: ثنا [عمر] بن شبة قال: حدثنا يزيد بن هارون [قال:] أخبرنا يحيي بن سعيد عن نافع عن ابن عمر: أن النبي ﷺ كان إذا صلّى علىٰ جنازة رفع يديه في كل تكبيرة و إذا انصرف سلّم.'' سیدنا ابن عمر (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب نمازِ جنازہ پڑھتے تو ہر تکبیر کے ساتھ رفع یدین کرتے اور جب پھرتے (نماز ختم کرتے) تو سلام کہتے تھے۔ (کتاب العلل للدارقطنی ج۱۳ ص۲۲ ح۲۹۰۸)

اس روایت کی سند حسن لذاتہ ہے۔ امام دارقطنی اور یحییٰ بن سعید الانصاری دونوں تدلیس کے الزام سے بری ہیں۔ دیکھئے الفتح المبین فی تحقیق طبقات المدلسین (ص۲۶، ۳۲)

عمر بن شبہ صدوق حسن الحدیث ہیں۔ احمد بن محمد بن الجراح اور محمد بن مخلد دونوں ثقہ ہیں۔ دیکھئے تاریخ بغداد (۴۰۹/۴ ت ۲۳۱۲، ۳/۳۱۰، ۳۱۱ ت ۱۴۰۶)

نماز جنازہ کی تکبیروں میں رفع یدین کرنا، درج ذیل اسلاف سے ثابت ہے:
عبداللہ بن عمر، عمر بن عبدالعزیز، عطاء بن ابی رباح، محمد بن سیرین وغیرہم۔ دیکھئے مصنف ابن ابی شیبہ (ج ۳ ص ۲۹۶، ۲۹۷) وغیرہ

کتاب الدعاء

دعا واذکار اور فضائل کا بیان

فرض نماز کے بعد اجتماعی دعا

سوال نماز باجماعت کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا اجتماعی طور پر ثابت ہے یا نہیں؟ اگر کسی وقت کر لی جائے اور کبھی نہ کی جائے تو کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟ کون سا طریقہ صحیح ہے، اگر کوئی کرنے والوں کے ساتھ دعا نہ کرے تو گناہ گار تو نہیں ہوگا؟

(ابو طاہر محمدی، خانیوال)

الجواب نماز باجماعت کے بعد امام اور مقتدیوں کا ہاتھ اٹھا کر اجتماعی دعا کرنا ثابت نہیں ہے۔ اس بات کی صراحت حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم اور علامہ شاطبی رحمہم اللہ وغیرہم نے کر رکھی ہے۔ مثلاً دیکھئے الفتاویٰ الکبریٰ (۱/۲۱۹) زاد المعاد (۱/۲۵۷) اور الاعتصام (۱/۳۴۹، ۳۵۲)

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے فرمایا:

''و أما الدعاء بعد السلام من الصلوٰۃ مستقبل القبلة أو المامومين فلم يكن ذلك من هديه ﷺ أصلاً ولا روي عنه بإسناد صحيح ولا حسن''

نماز کے اختتام پر سلام کے بعد قبلہ رخ ہو کر یا مقتدیوں کی طرف چہرہ کر کے دعا کرنا نبی کریم ﷺ سے اصلاً ثابت نہیں ہے۔ یہ بات کسی صحیح اور حسن سند بھی مروی نہیں ہے۔

(زاد المعاد ج ۱ ص ۲۵۷ طبع مؤسسۃ الرسالہ بیروت)

جب ایک بات صراحتاً ثابت ہی نہیں ہے اور سلف صالحین سے اس پر نکیر بھی ثابت ہے تو بعض عمومی دلائل کی رُو سے اس پر خواہ مخواہ زور دینا اور اجتماعی دعا نہ کرنے والوں پر فتویٰ لگانا انتہائی غلط اور مذموم حرکت ہے۔

بعض لوگ فرض نماز کے بعد انفرادی دعا میں رفع یدین کے بارے میں چند روایات

پیش کرتے ہیں:

① وعن محمد بن أبي يحي الأسلمي قال : رأيت عبدالله بن الزبير ورأى رجلاً رافعًا يديه يدعو قبل أن يفرغ من صلوته ، فلما فرغ منها قال: أن رسول الله ﷺ لم يكن يرفع يديه حتى يفرغ من صلوته .

(تحفۃ الاحوذی ج ۱ص ۲۴۵ ومجمع الزوائد ج ۱۰ص ۱۶۹، واللفظ لہ، بحوالہ طبرانی وقال: رجالہ ثقات)

اس روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا فرماتے تھے۔

تحقیق: اس روایت کی مکمل سند المعجم الکبیر للطبرانی کے مطبوعہ نسخہ سے غائب ہے لیکن حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس روایت کی سند کو ہمارے لئے محفوظ کر لیا ہے۔ والحمد للہ

فرماتے ہیں: ''رواه الطبراني عن سليمان بن الحسن العطار عن أبي كامل الجحدري عن الفضل (!) بن سليمان عنه به''

یعنی عن محمد بن ابی یحیٰی الاسلمی عن عبداللہ بن الزبیر بہ۔ (جامع المسانید والسنن ج ۷ص ۵۲۶)

[بعد میں یہ روایت المعجم الکبیر للطبرانی (ج ۱۳، ۱۴، ص ۹۲ ح ۳۲۴) میں مل گئی ہے۔ اس کا راوی الفضیل بن سلیمان النمیری جمہور محدثین کے نزدیک ضعیف راوی ہے، صحیحین میں اس کی تمام روایات شواہد و متابعات کی وجہ سے صحیح ہیں لیکن یہ روایت شاہد یا متابع نہ ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔ دیکھئے السلسلۃ الضعیفۃ للالبانی (۵۶/۶ ح ۲۵۴۴)

لہٰذا یہ سند ضعیف ہے۔ نیز دیکھئے میری کتاب ہدیۃ المسلمین حدیث: ۲۲]

② عن الفضل بن عباس قال رسول الله ﷺ: ((الصلوة مثنى مثنى ، تشهد في كل ركعتين ، و تخشع و تضرع و تمسكن و تذرع و تقنع يديك، يقول: ترفعهما إلى ربك مستقبلاً ببطونهما وجهك و تقول :يا ربّ يا ربّ .)) (سنن ترمذی مع تحفۃ الاحوذی ج ۱ص ۲۹۹ ح ۳۸۵)

اس کا راوی عبداللہ بن نافع بن العمیاء مجہول ہے جیسا کہ تقریب التہذیب (۳۶۵۸) اور تحفۃ الاحوذی میں لکھا ہوا ہے۔

امام بخاری نے فرمایا: " لم يصح حديثه "اس کی حدیث صحیح نہیں ہے۔(التاریخ الکبیر ۲۱۳/۵)
امام ابن خزیمہ نے بھی اس روایت کے ثابت ہونے میں شک کیا ہے۔
(صحیح ابن خزیمہ ج۲ ص ۲۲۱)
صحیح ابن حبان میں مجھے یہ روایت نہیں ملی اور نہ امام ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے۔ واللہ اعلم
خلاصۃ التحقیق: یہ روایت ضعیف و مردود ہے۔

③ "عن أبي هريرة أن رسول الله ﷺ رفع يديه بعد ما سلّم وهو مستقبل القبلة ... إلخ "
(تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۵۴۲ تفسیر سورۃ النساء آیت: ۹۸، بحوالہ ابن ابی حاتم وتحفۃ الاحوذی ج ۱ ص ۲۴۵)
اس روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سلام کے بعد قبلہ رخ ہو کر ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی تھی۔ اس روایت کا ایک راوی علی بن زید بن جدعان ہے جسے جمہور محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: "ضعیف" (تقریب التہذیب: ۴۷۳۴)
صحیح مسلم میں اس کی روایت ثابت البنانی (ثقہ) کی متابعت میں ہے۔ حافظ المزی فرماتے ہیں: "روى له البخاري في الأدب (المفرد وهو غير الصحيح) ومسلم مقرونًا بثابت البناني والباقون " (تہذیب الکمال ج ۱۳ ص ۲۷۵)

④ "عن الأسود العامري عن أبيه قال: صليت مع النبي ﷺ الفجر فلما سلم انحرف و رفع يديه و دعا "(فتاوی نذیریہ ج ۱ ص ۵۶۶ بحوالہ مصنف ابن ابی شیبہ)
یہ روایت مصنف ابن ابی شیبہ میں مجھے نہیں ملی اور نہ کسی دوسری کتاب میں سنداً ومتناً ملی ہے۔ مصنف ابن ابی شیبہ (ج ۱ ص ۳۰۲) میں جو روایت ہے وہ " انحرف " پر ختم ہے۔ اس میں "ورفع يديه و دعا" کے الفاظ نہیں ہیں۔ یہ الفاظ کسی ناقل کا وہم ہیں جنھیں فتاوی نذیریہ میں سہواً نقل کر دیا گیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ انفرادی دعا بعد از فرائض میں ہاتھ اٹھانے والی تمام روایات بھی سنداً ضعیف ہیں۔ یہاں بطورِ تنبیہ عرض ہے کہ نماز کے بعد مختلف اذکار اور دعائیں آپ ﷺ سے بطریق تواتر ثابت ہیں۔ اسی طرح دعا میں ہاتھ

اٹھانا بھی متواتر ہے۔ مالک بن یسار السکونی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((إذا سألتم الله فسلوه ببطون أكفكم ولا تسألوه بظهورها.))
اگر تم اللہ سے سوال (دعا) کرو تو ہتھیلیاں اوپر کر کے یعنی سیدھے ہاتھوں سے مانگو، ہتھیلیوں کی پشت اوپر کر کے نہ مانگو۔ (سنن ابی داود الصلوٰۃ باب الدعاء ح ۱۴۸۶، وسندہ حسن ولہ شاہد عند الطبرانی وقال الہیثمی فی مجمع الزوائد ۱۰/۱۶۹، ورجالہ رجال الصحیح غیر عمار بن خالد الواسطی وھو ثقہ)

اس مفہوم کی دوسری روایات بھی ہیں۔

حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لا يجتمع ملأ فيدعو بعضهم و يؤمن البعض إلا أجابهم الله))

(مسلمانوں کا) کوئی گروہ اگر جمع ہو اور بعض ان کا دعا کرے دوسرے آمین کہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی دعا قبول کر لیتا ہے۔ (المستدرک للحاکم ج ۳ ص ۳۴۷ ح ۵۴۷۸، مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۱۷۰، بحوالہ الطبرانی وھذا فی المعجم الکبیر ج ۴ ص ۲۱، ۲۲ ح ۳۵۳۵، ۳۵۳۶، ابن عساکر ۱۲/۵۴)

اس روایت کی سند منقطع ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔ عبداللہ بن ہبیرہ کی سیدنا حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ سے ملاقات ثابت نہیں ہے۔ سیدنا حبیب رضی اللہ عنہ ۴۲ ہجری میں فوت ہوئے۔ دیکھئے تقریب التہذیب (۱۱۰۶) جبکہ عبداللہ بن ہبیرہ ۴۱ ہجری میں پیدا ہوئے تھے۔ دیکھئے تقریب التہذیب (۳۶۷۸)

مختصراً عرض ہے کہ فرائض ونوافل کے بعد امام اور مقتدیوں کا اجتماعی دعا کرنا ثابت نہیں ہے، ہاتھ اٹھانے کی صراحت کے ساتھ انفرادی دعا والی روایات بھی غیر ثابت ہیں۔

مجوزین حضرات عمومی دلائل اور بعض غیر ثابت روایات سے استدلال کرتے ہیں۔ راجح یہی ہے کہ کبھی کبھار کسی کی درخواست پر مانگ لیں تو جائز ہے۔

یہی حکم نمازِ جمعہ یا جلسہ واجتماع کے بعد والی اجتماعی دعا کا ہے۔

دعا کے بعد منہ پر ہاتھ پھیرنا دو صحابیوں، سیدنا عبداللہ بن عمر اور سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے۔

(الادب المفرد للبخاری باب ٢٧٦ ص ۲۱۴ ح ٦٠٩ وسنده حسن، ہدیۃ المسلمین لراقم الحروف ص ۴۵، دوسرا نسخہ ص ۵۸)

لہٰذا اس عمل کو جاہلوں کا کام بتانا صحیح نہیں ہے۔ [شہادت، جون ۲۰۰۰ء]

سوال (بعض) لوگ ہر نماز کے بعد امام کے ساتھ ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے ہیں اور دعا مانگنا ضروری سمجھتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ جو نماز کے بعد امام کے ساتھ ہاتھ اٹھا کر دعا نہیں مانگے گا، اس کی نماز نہیں۔ کیا یہ بات صحیح ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔ (صبغت اللہ محمدی)

الجواب ہر نماز کے بعد امام اور مقتدیوں کا اجتماعی دعا مانگنا کسی صحیح یا حسن حدیث سے ثابت نہیں ہے، اگر مطالبۂ دعا، یا کبھی کبھار دعا مانگ لی جائے تو عمومی دلائل کی رو سے جائز ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ جو شخص امام کے ساتھ اجتماعی دعا نہ مانگے، اس کی نماز نہیں ہوتی، ان کا یہ قول باطل بلکہ ڈھٹائی ہے جس کے وہ مرتکب ہیں۔ ان پر لازم ہے کہ وہ اپنے اس قول سے توبہ کریں۔ متعدد علماء نے اس اجتماعی دعا کو بدعت قرار دیا ہے۔ مثلاً:

١۔ ابن تیمیہ (الفتاویٰ الکبریٰ ج ١ ص ١٨٨، ١٨٩)

٢۔ ابن القیم (زاد المعاد ج ١ ص ٢٥٧ قال: فلم یکن ذلک من ہدیہ ﷺ اصلا ولا روی باسناد صحیح ولا حسن)

٣۔ الشاطبی (الاعتصام ج ١ ص ٢٥٢) وغیرہم بلکہ دور جدید میں بعض دیوبندیوں نے بھی اسے بدعت قرار دیا۔ دیکھئے کتاب: ''رجل رشید'' (ص ١٧٠، ١٧١، ١٧٣، ١٧٤)

[شہادت، فروری ۲۰۰۰ء]

سوال کیا یہ درست ہے کہ نماز استسقاء کے علاوہ کسی نماز کے بعد اجتماعی طور پر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کا صحیح احادیث میں کوئی ثبوت نہیں اور احادیث میں حضور ﷺ کی شب وروز کی جو دعائیں منقول ہیں وہ ویسے ہی بغیر ہاتھ اٹھائے مانگی گئی ہیں؟

(طارق علی بروہی، کراچی)

الجواب نماز استسقاء کے علاوہ کسی اجتماعی دعا کا ثبوت مجھے یاد نہیں ہے تاہم عمومی دلائل کی رو سے ضرورت کے وقت اجتماعی دعا مانگنا جائز ہے جیسا کہ قبل ازیں گزر چکا ہے۔

[شہادت، فروری ۲۰۰۰ء]

سوال ایک امام صاحب ہر فرض نماز کے بعد اجتماعی دعا منگواتے ہیں یعنی کرواتے ہیں۔ جبکہ بعض لوگ اپنی بقیہ نماز ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں امام مذکور کا عمل کیا حیثیت رکھتے ہے؟ (راشد گلزار، اسلام آباد)

الجواب فرض نماز کے بعد اجتماعی دعا کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اگر بغیر التزام ولزوم کبھی کبھار اجتماعی دعا کرلی جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

لہٰذا امام مذکور کا عمل صحیح نہیں ہے۔

یہاں بطور تنبیہ عرض ہے کہ طبرانی کی ایک روایت میں انفرادی طور پر، نماز کے بعد ہاتھ اٹھانے کا ذکر ہے۔

(جامع المسانید لابن کثیر ج ۷ ص ۵۲۶ سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ للالبانی ۶/ ۵۶ ح ۲۵۴۴ وقال: ضعیف)

اس روایت کا راوی فضیل بن سلیمان جمہور محدثین کے نزدیک ضعیف ہے لہٰذا یہ روایت ضعیف ہی ہے۔ اس روایت کی تصحیح کے بارے میں محترم الاثری حفظہ اللہ کا موقف صحیح نہیں ہے۔ [شہادت، مارچ ۲۰۰۲]

فرض نماز پڑھنے کے بعد آیت الکرسی پڑھنے کی فضیلت

سوال کیا ہر نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھ کر جنت میں جانیوالی حدیث کی سند درست ہے؟ (ایک سائل)

الجواب امام نسائی کی السنن الکبریٰ (ح ۹۹۲۸) اور عمل الیوم واللیلۃ (ح ۱۰۰) میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((من قرأ آیة الکرسي في دبر کل صلوٰة مکتوبة لم یمنعه من دخول الجنة إلا أن یموت .))

جو شخص ہر فرض نماز کے آخر میں (یعنی بعد میں) آیت الکرسی پڑھتا ہے تو اسے جنت میں داخل ہونے سے موت کے علاوہ کوئی چیز نہیں روکتی۔

اس کی سند حسن ہے، اسے ابن حبان نے بھی صحیح قرار دیا ہے۔

دیکھئے اتحاف المہرۃ (۲۵۹/۶ رقم: ۶۴۸)

[شہادت، اکتوبر ۱۹۹۹ء]

تعزیت میں اجتماعی دعا کی حیثیت

سوال کیا برموقع تعزیت مروجہ اجتماعی دعا (ایک ساتھ ہاتھ اُٹھا کر) قرآن وحدیثِ صحیح سے ثابت ہے؟ (تنویر سلفی، ضلع ایبٹ آباد)

الجواب ثابت نہیں ہے لہٰذا یہ بدعت ہے۔ [شہادت، اکتوبر ۲۰۰۱ء]

یہ ایک ایسی بدعت ہے جو روز بروز عام ہو رہی ہے لہٰذا اس سے اجتناب کرتے ہوئے احسن طریقے سے دوسرے لوگوں کو سمجھانا چاہئے۔

خطبۂ نکاح کے بعد اجتماعی دعا

سوال انعقادِ نکاح کے اختتام پر ہاتھ اٹھا کر اجتماعی دعا کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ نیز اس موقع پر مسنون دعا کون سی ہے؟ (محمد صدیق، ایبٹ آباد)

الجواب انعقادِ نکاح کے اختتام پر مروجہ دعا کی کوئی دلیل مجھے معلوم نہیں ہے۔ سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے جب نکاح کیا تو معلوم ہونے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((بارك الله لك ....)) إلخ

(صحیح البخاری: ۵۱۵۵ واللفظ لہ، صحیح مسلم: ۷۹/ ۱۴۲۷، وترقیم دارالسلام: ۳۴۹۰)

اسی مفہوم کی اور دعائیں بھی ہیں مثلاً: ((بارك الله لك و بارك عليك و جمع بينكما في خير)) (سنن ابی داود: ۲۱۳۰، واللفظ لہ، الترمذی: ۱۰۹۱، وقال: حدیث حسن صحیح، وابن ماجہ: ۱۹۰۵، وصححہ ابن حبان والحاکم ووافقہ الذہبی)

[شہادت، اپریل ۲۰۰۴ء]

دعا میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ

سوال کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے دعا مانگنا جائز ہے؟

(ایک بہن، ٹنڈو آدم سندھ)

الجواب نبی ﷺ کے واسطے سے دعا مانگنا نہ قرآن سے ثابت ہے اور نہ حدیث سے لہٰذا یہ بدعت ہے۔ عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ والی روایت کا تعلق زندہ کی دعا سے ہے، وسیلے سے نہیں۔ کیونکہ آپ نے ان کے بارے میں دعا مانگنے کا وعدہ فرمایا تھا۔ کسی ایک صحیح حدیث میں بھی آپ ﷺ کی وفات کے بعد آپ کے وسیلے سے دعا مانگنا ثابت نہیں اور نہ سلف صالحین مثلاً صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین اور تبع تابعین نے اس پر عمل کیا ہے۔ وہ سب بغیر وسیلے کے براہِ راست اللہ سے ہی مانگتے رہے ہیں لہٰذا صرف اللہ سے ہی بغیر کسی واسطے کے دعا مانگنی چاہئے۔

تنبیہ: طبرانی کی جس روایت میں سیدنا عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ کے بارے میں وفات کے بعد دعا کا ذکر آیا ہے، اس کی سند ضعیف ہے۔ دیکھئے شیخ البانی کی کتاب: التوسل واحکامہ

[شہادت، اگست ۲۰۰۱ء]

نبی اکرم ﷺ کے وسیلے سے دعا؟

سوال نبی اکرم ﷺ کے وسیلے اور آپ کے صدقے سے دعا کرنا کیسا ہے؟

(حاجی نذیر خان، دامان حضرو)

الجواب نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد آپ کے وسیلے اور آپ کے صدقے سے دعا کرنا قرآن، حدیث، اجماع اور آثار سلف صالحین سے قطعاً ثابت نہیں ہے۔

تفصیل کے لئے دیکھئے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتاب ''الوسیلۃ'' وغیرہ۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب قحط ہوتا تو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ عباس بن عبدالمطلب (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ استسقاء کرتے (یعنی نماز استسقاء پڑھتے) تو فرماتے:

اے اللہ ہم تیری طرف نبی ﷺ (کی دعا) کے ذریعے سے توسل کرتے تھے تو تُو ہمیں پانی پلاتا تھا اور ہم نبی (ﷺ) کے چچا کے ذریعے (یعنی اُن کی دعا) سے توسل کرتے ہیں لہٰذا ہم پر پانی نازل فرما۔ پھر بارش ہوتی تھی۔ (صحیح بخاری: ۱۰۱۰)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ فوت شدہ کا کوئی وسیلہ نہیں بلکہ زندہ آدمی کی نماز اور دعا کا وسیلہ ثابت ہے۔ اس حدیث میں توسل سے مراد زندہ آدمی کی دعا ہے۔

فقہ حنفی کی مشہور کتاب الہدایہ میں لکھا ہوا ہے کہ

"ویکرہ ان یقول فی دعائه بحق فلان او بحق انبیاءك ورسلك لا نه لا حق للمخلوق علی الخالق" اور دعا میں بحق فلان یا بحق انبیاء ورسل کہنا مکروہ ہے کیونکہ خالق پر مخلوق کا کوئی حق نہیں ہے۔ (ہدایہ اخیرین ص ۴۷۵ کتاب الکراہیۃ)

بغیر کسی وسیلے کے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنی چاہئے کیونکہ اللہ تعالیٰ سب جانتا ہے اور علیم و قدیر ہے۔ تمام انبیاء و شہداء اور صالحین بغیر کسی وسیلے کے ڈائریکٹ صرف ایک اللہ رب العالمین سے ہی دعائیں مانگتے تھے۔

فرض نماز کے بعد ماتھے پر ہاتھ رکھنا

سوال بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ فرض نماز سے سلام پھیرنے کے بعد فوراً اپنے ماتھے پر دایاں ہاتھ رکھ دیتے ہیں یا اسے پکڑ لیتے ہیں اور کوئی دعا پڑھتے رہتے ہیں۔ کیا اس عمل کی کوئی دلیل قرآن و سنت میں موجود ہے؟ تحقیق کر کے جواب دیں، جزاکم اللہ خیراً

(اسد اللہ، خیر باڑہ، غازی ہزارہ)

الجواب سلام الطویل المدائنی عن زید العمی عن معاویہ بن قرہ عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی سند سے روایت ہے: کان رسول اللہ ﷺ إذا قضی صلاته مسح جبهته بیده الیمنی ثم قال: ((أشهد أن لا إله إلا الله الرحمٰن الرحیم، اللّٰهم اذهب عني الهم والحزن))

رسول اللہ ﷺ جب اپنی نماز پوری کرتے (تو) اپنی پیشانی کو دائیں ہاتھ سے چھوتے پھر فرماتے: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے وہ رحمٰن و رحیم ہے۔ اے اللہ! غم اور مصیبت مجھ سے دور کر دے۔ (عمل الیوم واللیلۃ لابن السنی: ح ۱۱۲ واللفظ لہ، الطبرانی فی الاوسط ۲۴۳/۳ ح ۲۵۲۰ دوسرا نسخہ: ۲۴۹۹، کتاب الدعاء للطبرانی ۱۰۹۶/۲ ح ۶۵۹، الأمالی لابن سمعون: ح ۱۲۱، نتائج

الافکار لابن حجر ۲/۳۰۱، حلیۃ الاولیاء لابی نعیم الاصبہانی ۲/۳۰۱، ۳۰۲)

اس روایت کی سند سخت ضعیف ہے۔ سلام الطّویل المدائنی: متروک ہے۔ (التقریب: ۲۷۰۲)

امام بخاری نے فرمایا: "ترکوہ" (کتاب الضعفاء مع تحقیقی: تحفۃ الاقویاء ص ۵۱ ت: ۱۵۵)

حاکم نیشاپوری نے کہا: اس نے حمید الطّویل، ابوعمرو بن العلاء اور ثور بن یزید سے موضوع احادیث بیان کی ہیں۔ (المدخل الی الصحیح ص ۱۴۴ ت: ۷۳)

حافظ ہیثمی نے کہا: " وقد أجمعوا على ضعفه " اور اس کے ضعیف ہونے پر اجماع ہے۔ (مجمع الزوائد ج ۱ ص ۲۱۲)

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: " والحديث ضعيف جدًا بسببه " اور (یہ) حدیث سلام الطّویل کے سبب کی وجہ سے سخت ضعیف ہے۔ (نتائج الافکار ۲/۳۰۱)

اس سند کا دوسرا راوی زید العمی: ضعیف ہے۔ (تقریب التہذیب: ۲۱۳۱)

اسے جمہور (محدثین) نے ضعیف قرار دیا ہے۔ (مجمع الزوائد ۱۰/۱۱۰، ۲۶۰)

حافظ ہیثمی لکھتے ہیں: " وبقية رجال أحد إسنادي الطبراني ثقات وفي بعضهم خلاف " اور طبرانی کی دو سندوں میں سے ایک سند کے بقیہ راوی ثقہ ہیں اور ان میں سے بعض میں اختلاف ہے۔ (مجمع الزوائد ۱۰/۱۱۰)

طبرانی والی دوسری سند تو کہیں نہیں ملی، غالباً حافظ ہیثمی کا اشارہ البزار کی " حدثنا الحارث ابن الخضر العطار: ثنا عثمان بن فرقد عن زيد العمي عن معاوية بن قرة عن أنس بن مالك رضي الله عنه .... إلخ " والی سند کی طرف ہے۔

(دیکھئے کشف الاستار ۴/۲۲ ح ۳۱۰۰)

عرض ہے کہ الحارث بن الخضر العطار کے حالات کسی کتاب میں نہیں ملے۔ اور یہ عین ممکن ہے کہ اس نے عثمان بن فرقد اور زید العمی کے درمیان سلام الطّویل المدائنی کے واسطے کو گرا دیا ہو۔ اگر نہ بھی گرایا ہو تو یہ سند اس کے مجہول ہونے کی وجہ سے مردود ہے۔

دوسری روایت: کثیر بن سلیم عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی سند سے مروی ہے:

كان رسول الله ﷺ إذا قضى صلاته مسح جبهته بيمينه ثم يقول :

((باسم الله الذي لا إله غيره ، اللّٰهم اذهب عني الهم والحزن ، ثلاثًا))

رسول اللہ ﷺ جب اپنی نماز پوری کرتے تو دائیں ہاتھ سے اپنی پیشانی کا مسح کر کے تین دفعہ فرماتے: اس اللہ کے نام کے ساتھ (شروع) جس کے علاوہ کوئی (برحق) الٰہ نہیں ہے، اے اللہ! میرے غم اور مصیبت کو دور کر دے۔

(الکامل لابن عدی ۷/۱۹۹ ترجمۃ کثیر بن سلیم، واللفظ لہ، الاوسط للطبرانی ۴/۲۶۱ ح ۳۲۰۲ وکتاب الدعاء للطبرانی ۲/۱۰۹۵ ح ۶۵۸، لأمالی للشجری ۱/۲۴۹ وتاریخ بغداد ۱۲/۴۸۰ ونتائج الافکار ۲/۳۰۱، ۳۰۲)

کثیر بن سلیم کے بارے میں امام بخاری فرماتے ہیں: ”منكر الحديث“

(کتاب الضعفاء محققی تحفۃ الاقویاء: ۳۱۶)

جسے امام بخاری منکر الحدیث کہہ دیں، ان کے نزدیک اس راوی سے روایت حلال نہیں ہے۔

(دیکھئے لسان المیزان ج ۱ ص ۲۰)

کثیر بن سلیم کے بارے میں امام نسائی فرماتے ہیں: ”متروك الحديث“

(کتاب الضعفاء والمتروکین: ۵۰۶)

متروک راوی کی روایت شواہد و متابعات میں بھی معتبر نہیں ہے۔

دیکھئے اختصار علوم الحدیث للحافظ ابن کثیر (ص ۳۸، النوع الثانی، تعریفات اخری للحسن)

خلاصۃ التحقیق: یہ روایت اپنی تینوں سندوں کے ساتھ سخت ضعیف ہے۔

شیخ البانی رحمہ اللہ نے بھی اسے ” ضعيف جدًا“ سخت ضعیف قرار دیا ہے۔

(السلسلۃ الضعیفۃ ۲/۱۱۴ ح ۶۶۰)

تنبیہ: سیوطی نے بھی اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ (الجامع الصغیر: ۶۷۴۱)

محمد ارشاد قاسمی دیوبندی نے اسے بحوالہ الجامع الصغیر و مجمع الزوائد نقل کر کے ”بسند ضعيف“ لکھا ہے (یعنی اس کی سند ضعیف ہے) لیکن اس غالی دیوبندی نے عربی عبارت (جس میں روایتِ مذکورہ پر جرح ہے) کا ترجمہ نہیں لکھا۔

دیکھئے ''الدعاء المسنون'' (ص ۲۱۲ پسند کردہ ''مفتی'' نظام الدین شامزئی دیوبندی)
دیوبندی و بریلوی حضرات سخت ضعیف و مردود روایات عوام کے سامنے پیش کر کے دھوکا دے رہے ہیں۔ کیا یہ لوگ اللہ کی پکڑ سے بے خوف ہیں؟

الغرض اس ساری بحث کا ماحصل یہ ہے کہ نماز کے بعد، ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دعا کرنے کا کوئی ثبوت نبی کریم ﷺ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین و تابعین عظام رحمہم اللہ سے نہیں ہے لہٰذا اس پر عمل سے مکمل اجتناب کرنا چاہیے۔ وما علینا إلا البلاغ

(۱۹/صفر ۱۴۲۶ھ) [الحدیث:۱۳]

دانوں والی مروجہ تسبیح کی شرعی حیثیت

سوال آج کل رائج تسبیح جو کہ نماز کے بعد لوگ کرتے ہیں جو کہ دانوں میں پروئی ہوتی ہے، اس کا کیا حکم ہے۔ کیا یہ بدعت ہے یا نہیں؟ یاد رہے کہ ہمارے ہاں ایک نابینا حافظ صاحب ہیں جو کہ اپنے آپ کو حافظ الحدیث کہتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ دانوں والی تسبیح ثابت ہے اور حدیث دارقطنی کا حوالہ دیتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اگر کوئی اس حدیث کو ضعیف ثابت کرے تو منہ مانگا انعام دوں گا۔ براہ مہربانی تفصیل بیان کریں۔ (ابو طاہر محمدی، خانیوال)

الجواب مروجہ آلۂ تسبیح کا صریح ثبوت میرے علم میں نہیں ہے، لہٰذا اس سے بچنا بہتر ہے۔ مجوزین حضرات ان روایات سے استدلال کرتے ہیں جن میں گٹھلیوں پر گننا مذکور ہے، مثلاً ایک عورت گٹھلیوں یا کنکریوں پر تسبیح پڑھ رہی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تجھے میں اس کام سے زیادہ آسان و افضل نہ بتا دوں؟ پھر آپ نے اسے ایک دعا سکھائی۔
دیکھئے سنن ابی داود کتاب الوتر باب التسبیح بالحصی حدیث: ۱۵۰۰

اس کی سند حسن ہے، اسے امام ترمذی (۳۵۶۸) نے ''حسن غریب'' ابن حبان (الموارد: ۲۳۳۰) حاکم (۱/۵۴۸) اور ذہبی نے صحیح کہا ہے۔ حافظ الضیاء المقدسی نے المختارہ میں ذکر کیا ہے۔ بعض جدید ''محققین'' کا اسے ضعیف کہنا غلط ہے۔ اس حسن لذاتہ

روایت کے بہت سے شواہد بھی ہیں۔

دیکھئے "المنحة في السبحة" للسیوطی (الحاوی للفتاوی ۲/۲)

دیگر آلاتِ تسبیح پر تسبیح واذکار پڑھنا جائز ہے، بدعت نہیں ہے۔ تاہم افضل یہی ہے کہ ہاتھ کی انگلیوں پر یہ گنتی کی جائے۔

دارقطنی والی روایت فی الحال مجھے یاد نہیں ہے۔ واللہ اعلم [شہادت، جون ۲۰۰۰ء]

سوال شیخ امین اللہ حفظہ اللہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص تذکیر کے لئے (یعنی یاد رکھنے کے لئے) تسبیح کے دانے پر ذکر کرتا ہے تو جائز ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟

(حبیب اللہ۔ پشاور)

الجواب سنن ابی داود (۱۵۰۰) کی ایک روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک عورت کھجور کی گٹھلیوں یا کنکریوں پر تسبیح پڑھ رہی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے اسے اس سے بہتر کام ایک دعا سکھائی (یعنی آپ نے اسے کنکریوں اور گٹھلیوں پر تسبیح پڑھنے سے منع نہیں فرمایا) اسے ترمذی (۳۵۶۸) نے "حسن غریب" ابن حبان (۲۳۳۰) ذہبی (تلخیص المستدرک ۱/۵۴۷، ۵۴۸) اور ضیا مقدسی (المختارة ۳/۲۰۹، ۲۱۰ ح ۱۰۱۰، ۱۰۱۱) نے صحیح قرار دیا ہے۔

احمد بن صالح (المصری)، عبداللہ بن وہب، عمرو بن الحارث، سعید بن ابی ہلال اور عائشہ بنت سعد، سب ثقہ وقابل اعتماد ہیں، سعید مذکور پر اختلاط کا الزام مردود ہے، خزیمہ مذکور کی توثیق ابن حبان، ترمذی، ذہبی اور ضیاء المقدسی نے کر رکھی ہے لہٰذا حافظ ابن حجر وغیرہ کا اسے (لایعرف) کہنا صحیح نہیں ہے۔ اس روایت کے بہت سے شواہد ہیں (مثلاً دیکھئے المنحة فی السبحة للسیوطی والحاوی للفتاوی ج ۲ ص ۲۔۷) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے حالانکہ یہ روایت حسن لذاتہ ہے اور شواہد کے ساتھ صحیح ہے۔

[شہادت جنوری ۲۰۰۳ء]

صف میں کھڑے ہونے کی دعا

سوال صف میں کھڑے ہونے کی دعا: "اللّٰھم آتنی أفضل ماتؤتي عبادك

الصالحین ''کوفضیلۃ الشیخ امین اللہ (حفظہ اللہ) صحیح گردانتے ہیں جب کہ بعض اہلِ حدیث علماء اس کوضعیف کہتے ہیں۔ (حبیب اللہ۔ پشاور)

الجواب یہ روایت عمل الیوم واللیلۃ للنسائی (۹۳ والسنن الکبریٰ لہ:۹۹۲۱) میں محمد بن مسلم بن عائذ کی سند سے موجود ہے۔ اسے ابن خزیمہ (۴۵۳) وابن حبان (موارد: ۱۶۰۹) نے صحیح قرار دیا ہے۔ ابن عائذ مذکور کا ذکر مستدرک الحاکم (ج ۱ ص ۲۰۷) سے گر گیا ہے جب کہ مستدرک کی دوسری روایت (ج ۲ ص ۴۷) میں اس کا ذکر موجود ہے۔ اسے حاکم اور ذہبی دونوں نے صحیح (علیٰ شرط مسلم) قرار دیا ہے۔

ابن عائذ مذکور کو بعض علماء نے مجہول اور لا یعرف کہا ہے جب کہ امام (متعدل) العجلی، حافظ ابن حبان، امام ابن خزیمہ وغیرہم نے ثقہ وصحیح الحدیث قرار دیا ہے اور یہی راجح ہے لہٰذا یہ سند صحیح ہے۔ [شہادت جنوری ۲۰۰۲ء]

دوسجدوں کے درمیان دعا کی تحقیق

سوال دوسجدوں کے درمیان مشہور دعا ''اللّٰھم اغفرلي وارحمني واھدني وعافني وارزقني'' یہ حدیث صحیح ہے یا ضعیف؟ اگر ضعیف ہے تو کون سی دعا پڑھنی چاہیے؟ (محمد شاہد میمن)

الجواب اس روایت کی سند تو بے شک ضعیف ہے لیکن اس دعا کا ایک قوی شاہد صحیح مسلم (۲۶۹۷) میں موجود ہے لہٰذا اس دُعا پر عمل صحیح ہے۔ علاوہ ازیں دوسجدوں کے درمیان ''رَبِّ اغْفِرْلِي رَبِّ اغْفِرْلِي'' پڑھنا بھی ثابت ہے۔

دیکھئے سنن ابی داود (۸۷۴) والنسائی (۱۰۷۰) [شہادت، جولائی ۲۰۰۱ء]

دوسجدوں کے درمیان دعا

سوال صلوٰۃ النبی نئے ایڈیشن میں جلسہ کی دعا ''رب اغفرلی، رب اغفرلی'' ہے جب کہ پرانے ایڈیشن میں (نماز نبوی) میں لمبی دعا ہے۔ اس لمبی دعا کی

شرعی حیثیت تحریر فرمائیں۔ (ظفر عالم، لاہور)

الجواب "اللّٰهم اغفرلي وارحمني واهدني وعافني وارزقني" والی دعا کی سند حبیب بن ابی ثابت کی تدلیس کی وجہ سے ضعیف ہے تاہم برادر محترم مولانا غلام مصطفیٰ ظہیر کی توجہ دلانے پر اس کا شاہد مل گیا۔ یہی دعا "من وعن" رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو نماز میں پڑھنے کا حکم دیا۔

(صحیح مسلم کتاب الذکر والدعاء باب فضل التھلیل والتسبیح والدعاء ص ۲۶۹۷)

اگر چہ اس میں سجدوں کے درمیان کی صراحت نہیں ہے مگر نماز کے عموم میں سجدوں کا درمیان بھی شامل ہے لہٰذا حبیب بن ابی ثابت والی روایت اس شاہد کی وجہ سے حسن ہے۔

والحمدللہ [شہادت، اگست ۲۰۰۱ء]

سوال (نماز میں) مابین السجود کی مشہور دعا "اللّٰهم اغفرلي وارحمني واهدني وعافني وارزقني" کو القول المقبول کے محقق جناب عبدالرؤف صاحب نے ضعیف قرار دیا ہے۔ کیا واقعی روایت ہذا ضعیف ہے؟ (تنویر سلفی، ضلع ایبٹ آباد)

الجواب اس روایت کی سند حبیب بن ابی ثابت کی تدلیس کی وجہ سے ضعیف ہے لیکن صحیح مسلم (کتاب الذکر والدعاء باب فضل التھلیل والتسبیح والدعاء ح ۲۶۹۷) میں ہے: كان الرجل إذا أسلم علّمه النبي ﷺ الصلوٰة ثم أمره أن يدعو بهؤلاء الكلمات ((اللّٰهم اغفرلي وارحمني واهدني وعافني وارزقني))

جب کوئی آدمی مسلمان ہوتا تو نبی ﷺ اسے نماز سکھاتے تھے پھر حکم دیتے کہ یہ کلمات پڑھے ((اللّٰهم اغفرلي وارحمني واهدني وعافني وارزقني)) اس عمومی مفہوم والے شاہد کی وجہ سے حبیب والی روایت حسن ہے اگر چہ بہتر یہی ہے کہ "رب اغفرلي رب اغفرلي" والی روایت پڑھے جو کہ بلحاظ سند صحیح ہے۔ (دیکھئے سنن ابی داود: ۸۷۴ وسندہ صحیح)

[شہادت، اکتوبر ۲۰۰۱ء]

آئینہ دیکھتے وقت کی دعا

سوال آئینہ دیکھتے وقت یہ دعا نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے یا نہیں؟

" اَللّٰهُمَّ كَمَا حَسَّنْتَ خَلْقِيْ فَحَسِّنْ خُلُقِيْ "

(ابوقتادہ، بستی بلوچاں فروکہ ضلع سرگودھا)

الجواب یہ روایت سخت ضعیف ہے۔ دیکھئے عمل الیوم واللیلۃ لابن السنی (۱۶۳) بتحقیق الشیخ سلیم الھلالی (عجالۃ الراغب المتمنی ج۱ص ۲۱۷)

اس کا راوی الحسین بن ابی السری متروک، عبدالرحمٰن بن اسحاق الواسطی ضعیف اور نعمان بن سعد مجہول ہے۔ [الحدیث:۲۰]

کھانا کھانے سے پہلے کی دعا

سوال کھانا کھاتے وقت بِسْمِ اللّٰهِ وَعَلٰى بَرَكَةِ اللّٰهِ (مستدرک حاکم) پڑھنا۔ اس کی سند کیسی ہے؟ (ابوقتادہ، بستی بلوچاں فروکہ ضلع سرگودھا)

الجواب یہ روایت المستدرک للحاکم (۱۰۷/۴ ح ۷۰۸۴) میں موجود ہے۔ اسے حاکم اور ذہبی دونوں نے صحیح کہا ہے لیکن اس کا راوی ابومجاہد عبداللہ بن کیسان المروزی جمہور محدثین کے نزدیک ضعیف ہے لہٰذا یہ روایت ضعیف ہے۔ [الحدیث:۲۰]

دَم اور اَذکار سے بیماری کا علاج

سوال اگر کوئی شخص جنات یا جادو کے اثر سے بیمار ہو تو کیا کسی عامل سے اس کا علاج کرانا جائز ہے؟ (ایک سائل)

الجواب اگر کوئی شخص (جادو یا جنات کے اثر، وغیرہ کی وجہ سے) بیمار ہو تو اس کا علاج کرانا جائز ہے۔ اگر کسی عامل سے علاج کرائیں تو صحیح العقیدہ عامل کا انتخاب کریں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((من استطاع منكم أن ينفع أخاه فليفعل))

جو شخص اپنے بھائی کو فائدہ پہنچا سکے تو ضرور پہنچائے۔ (صحیح مسلم: ۲۱۹۹ وترقیم دارالسلام: ۵۷۲۷)

نبی ﷺ نے فرمایا: ((تداووا)) علاج کرو۔

(سنن ابی داود: ۳۸۵۵ وسندہ صحیح وصححہ الترمذی: ۲۰۳۸ والحاکم ۳۹۹/۴ والذہبی)

حرام (مثلاً شرکیہ منتروں) سے علاج نہیں کرنا چاہئے۔

طارق بن سوید الجعفی رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے دوائیوں میں خمر (شراب) کے استعمال کے بارے میں پوچھا تو آپ نے انھیں منع کیا اور فرمایا: ((إنه ليس بدواء ولكنه داء)) یہ دوا نہیں بلکہ بیماری ہے۔ (صحیح مسلم: ۱۹۸۴ وترقیم دارالسلام: ۵۱۴۱)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "إن الله عزوجل لم يجعل شفاء كم فيما حرّم عليكم" بے شک اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں تم پر حرام قرار دی ہیں اُن میں تمھارے لئے (کوئی) شفاء نہیں رکھی۔ (کتاب الاشربۃ للامام احمد: ۱۳۰ وسندہ صحیح، وصحیح البخاری قبل ح ۵۶۱۴)

دَم اگر شرکیہ نہ ہو تو اس کا جواز صحیح حدیث سے ثابت ہے۔

(دیکھئے صحیح مسلم، الطب/ السلام، باب لاباس بالرقی مالم یکن فیہ شرک، ح ۲۲۰۰ وترقیم دارالسلام: ۵۷۳۲)

ان دلائل و دیگر دلائل کی رُو سے یہ علاج کرانا صحیح اور جائز ہے۔ والحمدللہ

(۱۳/ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ) [الحدیث: ۲۶]

تکبیراتِ عیدین کے الفاظ

سوال عیدین کی تکبیرات جس کے الفاظ یہ ہیں:

" الله أكبر كبيرًا والحمدلله كثيرًا وسبحان الله بكرة وأصيلا "

اس تکبیر میں کیا حرج ہے؟ اس کی بھی وضاحت کریں۔ (ابوطلحہ حافظ ثناء اللہ شاہد القصوری)

الجواب میرے علم کے مطابق یہ الفاظ، تکبیراتِ عیدین میں ثابت نہیں البتہ نماز میں ضرور ثابت ہیں۔

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے کہ لوگوں میں سے ایک آدمی نے کہا:

" الله اكبر كبيرًا والحمدلله كثيرًا وسبحان الله بكرة وأصيلا "

تو آپ ﷺ نے پوچھا: یہ کلمات کس نے کہے ہیں؟ اس آدمی نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں نے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے ان (کلمات) کے لئے تعجب ہے، ان کے لئے آسمان کے دروازے کھل گئے ہیں۔

(صحیح مسلم، کتاب المساجد باب مایقال بین تکبیرۃ الاحرام والقراءۃ ح ۶۰۱)

تکبیراتِ عیدین میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے "اللّٰہ أکبر کبیرًا، اللّٰہ أکبر کبیرًا، اللّٰہ أکبر و أجل، اللّٰہ أکبر وللّٰہ الحمد" اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے "اللّٰہ أکبر، اللّٰہ أکبر کبیرًا" کے الفاظ ثابت ہیں۔

(دیکھئے مصنف ابن ابی شیبہ ۲/۱۶۷ ح ۵۶۴۵، السنن الکبریٰ للبیہقی ۳/۳۱۶)

اس سلسلے میں مرفوعاً "اللّٰہ أکبر، اللّٰہ أکبر، لا الٰہ إلا اللّٰہ و اللّٰہ أکبر، اللّٰہ أکبر وللّٰہ الحمد" کے الفاظ جو سنن دار قطنی (۲/۴۹ ح ۱۷۲۱) کی روایت میں آئے ہیں؛ وہ روایت عمرو بن شمر (کذاب) وغیرہ کی وجہ سے موضوع ہے۔

اسے حافظ ذہبی نے سخت ضعیف بلکہ موضوع (من گھڑت) کہا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ یہ الفاظ ابراہیم نخعی سے باسند صحیح ثابت ہیں۔

دیکھئے مصنف ابن ابی شیبہ (۲/۱۶۷ ح ۵۶۴۹ وسندہ صحیح) [شہادت، نومبر ۲۰۰۱ء]

سوال بروز عیدین و ایام تشریق میں پڑھے جانے والے (تکبیر کے) مشہور الفاظ "اللّٰہ أکبر اللّٰہ أکبر، لا إلٰہ إلا اللّٰہ، و اللّٰہ أکبر، اللّٰہ أکبر، وللّٰہ الحمد" کیا یہ کسی صحیح حدیث و صحیح روایت سے

① نبی کریم ﷺ سے ثابت ہیں؟ ② کسی صحابی سے ثابت ہیں؟

③ کسی تابعی سے ثابت ہیں؟ ④ محدثین عظام سے ثابت ہیں؟

⑤ ان کے ان مواقع پر پڑھنے کی شرعی حیثیت واضح فرمائیں۔

نوٹ: القول المقبول لحافظ عبدالرؤف (ص ۲۶۰ تا ۲۶۶ میں) میں تفصیل ہے مگر سمجھ نہیں آ رہی۔ (محمد صدیق، ایبٹ آباد)

الجواب ایک حدیث میں آیا ہے کہ نبی ﷺ ایام عید کی تکبیروں میں درج ذیل کلمات کہتے تھے: ''اللّٰه أكبر اللّٰه أكبر، اللّٰه أكبر، لا إله إلا اللّٰه، واللّٰه أكبر، اللّٰه أكبر، وللّٰه الحمد'' (سنن الدارقطنی ج ۲ ص ۴۹، ۵۰ ح ۱۷۲۱)

اس روایت کی سند موضوع ہے۔ عمرو بن شمر کذاب راوی ہے۔ جابر الجعفی سخت ضعیف رافضی ہے۔ نائل بن نجیح ضعیف ہے۔ دیکھئے کتب اسماء الرجال وغیرہ

ایک روایت میں آیا ہے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ تکبیرات عیدین میں درج ذیل الفاظ پڑھتے تھے: ''اللّٰه أكبر كبيرًا اللّٰه أكبر كبيرًا، اللّٰه أكبر وأجل، اللّٰه أكبر وللّٰه الحمد'' (مصنف ابن ابی شیبہ ۲/۱۶۷ ح ۵۶۵۰)

اس کی سند صحیح ہے۔

سیدنا سلمان الفارسی رضی اللہ عنہ یہ الفاظ پڑھتے تھے: ''اللّٰه أكبر اللّٰه أكبر اللّٰه أكبر''

(مصنف عبدالرزاق ۱۱/۲۹۴، ۲۹۵ ح ۲۰۵۸۱، والبیہقی ۳/۳۱۶، وسندہ حسن)

ابراہیم النخعی کہتے ہیں: ''كانوا يكبرون يوم عرفة وأحدهم مستقبل القبلة في دبر الصلوة: اللّٰه أكبر اللّٰه أكبر، لا إله إلا اللّٰه، واللّٰه أكبر، اللّٰه أكبر، وللّٰه الحمد''

(مصنف ابن ابی شیبہ ج ۲ ص ۱۶۷ ح ۵۶۴۹ وسندہ صحیح)

درج بالا تکبیرات صحابہ وتابعین سے ثابت ہیں لہٰذا ایام عیدین میں انھیں پڑھنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ اقتداء بالسلف کی رو سے ثواب کی امید ہے۔ مختصر یہ کہ آپ کی ذکر کردہ دعا پڑھنی تابعین سے ثابت ہے اور اس پر عمل صحیح ہے۔ والحمدللہ [شہادت، مئی ۲۰۰۴ء]

بازار میں داخل ہوتے وقت دعا کی تحقیق

سوال ایک حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص کسی بازار میں داخل ہو کر '' لا إله إلا اللّٰه وحده لا شريك له، له الملك وله الحمد وهو على كل شئ قدير'' پڑھے تو اس کے لئے ایک لاکھ نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور ایک لاکھ گناہ معاف فرما دیئے جاتے ہیں۔

کیا یہ حدیث صحیح ہے؟ (خرم ارشاد محمدی۔ دولت نگر، پنجاب)

الجواب اس روایت کی بہت سی سندیں ہیں جن میں سے دوسندوں پر کلام درج ذیل ہے:

پہلی سند: کتاب الدعاء للطبرانی میں ہے: "حدثنا عبید بن غنام والحضرمي قالا: ثنا أبو بكر بن أبي شيبة: ثنا أبو خالد الأحمر عن المهاجر بن حبيب قال: سمعت سالم بن عبدالله ابن عمر يقول: سمعت ابن عمر يقول: سمعت عمر رضي الله عنه يقول: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول:

((من دخل سوقًا من الأسواق ، فقال: لا إله إلاالله ....))"

(رقم الحدیث:۷۹۲، ۷۹۳)

یہ سند دو وجہ سے ضعیف ہے:

۱: ابوخالد الاحمر مدلس تھے۔ (دیکھئے جزء القراءۃ للبخاری تحقیقی: ۲۶۷)

اور یہ روایت معنعن (عن سے) ہے۔ مدلس کی معنعن روایت ضعیف ہوتی ہے۔

۲: امام علی بن عبداللہ المدینی نے مسند عمر میں لکھا ہے کہ ابوخالد الاحمر نے مہاجر بن حبیب سے ملاقات نہیں کی ہے۔ [مسند الفاروق لابن کثیر ج ۲ ص ۶۴۲ حدیث فی تضعیف ثواب توحید اللہ وذکرہ] یعنی یہ سند منقطع ہے۔

معلوم ہوا کہ یہ سند ضعیف ہے۔ یہاں پر یہ بات انتہائی عجیب وغریب ہے کہ شیخ سلیم الہلالی نے اس ضعیف ومنقطع روایت کو "وهو إسناد حسن لذاته" لکھ دیا ہے!

(عجالۃ الراغب المتمنی ج ۱ ص ۲۳۹ ح ۱۸۳)

اس ضعیف سند کو " إسناد حسن لذاته " کہنا یا لکھنا سرے سے باطل ومردود ہے۔

دوسری سند: مستدرک الحاکم میں ہے:

" مسروق بن المرزبان: ثنا حفص بن غياث عن هشام بن حسان عن عبدالله ابن دينار عن ابن عمر رضي الله عنهما قال قال رسول الله ﷺ: من دخل السوق فباع فيها واشترى فقال: لا إله إلا الله .... " إلخ

(المستدرک ج ۱ ص ۵۳۹ ح ۱۹۷۵ وقال: ھذا إسناد صحیح علی شرط الشیخین ولم یخرجاہ وتعقبہ الذہبی)

یہ روایت دو وجہ سے ضعیف ہے:

۱: حفص بن غیاث مدلس تھے۔ (طبقات المدلسین ۱/۹، وطبقات ابن سعد ۶/۳۹۰)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا حفص بن غیاث کو مدلسین سے باہر نکالنا (النکت علی کتاب ابن الصلاح ۲/۶۳۷) صحیح نہیں ہے۔

۲: ھشام بن حسان بھی مدلس تھے۔ (طبقات المدلسین: ۳/۱۱۰، المرتبۃ الثالثۃ)

اور یہ روایت معنعن ہے۔ اس واضح ضعف کے باوجود شیخ سلیم الھلالی نے اس سند کو "فھذا إسناد حسن لذاته" لکھ دیا ہے۔ (عجالۃ الراغب المتمنی ۱/۲۴۱)!

اس سلسلے کی دوسری ضعیف و مردود روایتوں کے لئے دیکھئے کتاب العلل الکبیر للترمذی (۲/۹۱۲ وقال البخاری وأبو حاتم الرازی: ھذا حدیث منکر) المستدرک للحاکم (۱/۵۳۹) وعجالۃ الراغب المتمنی (۱/۲۳۷۔۲۴۳) والصحیحۃ للالبانی (۷/۳۸۱۔۳۹۱ ح ۳۱۳۹) والموسوعۃ الحدیثیۃ (مسند الامام احمد ۱/۴۱۱۔۴۱۳)

اس حدیث کو علامہ شوکانی (تحفۃ الذاکرین ص ۲۷۳) علامہ البانی رحمہ اللہ اور سلیم الہلالی وغیرہم کا حسن یا صحیح قرار دینا غلط ہے۔ بلکہ حق یہی ہے کہ یہ روایت اپنی تمام سندوں کے ساتھ ضعیف ہی ہے۔ وما علینا إلا البلاغ [الحدیث:۱۴]

عشرۂ ذوالحجہ میں تکبیرات کا اہتمام

سوال ذوالحجہ کے آغاز سے ایام التشریق کے اختتام تک جو تکبیرات کا اہتمام کیا جاتا ہے وہ نمازوں کے بعد خصوصاً پڑھنا کیسا ہے؟

(محمد منور بن ذکی، ریاض سعودی عرب)

الجواب مصنف ابن ابی شیبہ (ج ۲ ص ۱۶۵ ح ۵۶۳۰) میں حسن سند کے ساتھ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ " أنه كان يكبر بعد صلاة الفجر يوم عرفة إلى صلاة العصر من آخر أيام التشريق ويكبر بعد العصر " سیدنا علی رضی اللہ عنہ عرفات

والے دن نمازِ فجر کے بعد آخری یوم تشریق (۱۳/ ذوالحجہ) کی نماز عصر کے بعد تک تکبیریں کہتے تھے۔

لہٰذا یہ تکبیرات صحیح ہیں لیکن ذوالحجہ کے پہلے دن سے تکبیریں کہنے والی بات محلِ نظر ہے۔

[شہادت، اگست ۲۰۰۱ء]

روایت ''اللّٰهم أجر نی من النّار'' کی تحقیق

سوال جو شخص صبح وشام ''اللّٰهم أجر نی من النّار'' سات دفعہ پڑھتا ہے تو اس کے لئے آگ سے نجات ہے، یہ روایت مشکوۃ کتاب الدعوات میں ہے، میں نے کہیں پڑھا ہے کہ شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس کو ضعیف گردانا ہے، ابھی مجھے یاد نہیں ہے۔

(حبیب اللہ، پشاور)

الجواب یہ روایت سنن ابی داود (۵۰۷۹، ۵۰۸۰) السنن الکبریٰ للنسائی (۹۹۳۹ وعمل الیوم واللیلۃ: ۱۱۱) اور صحیح ابن حبان (موارد الظمآن: ۲۳۴۶) میں موجود ہے۔

حافظ منذری نے الترغیب و الترہیب (ج ۱ ص ۳۰۳، ۳۰۴ ح ۶۶۳) میں اس روایت کے حسن ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے، حافظ ابن حجر نے نتائج الافکار میں اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ (نتائج الافکار فی تخریج احادیث الاذکار ۲/۳۲۶)

اس حدیث کے راوی مسلم بن الحارث رضی اللہ عنہ صحابی تھے۔ (تجرید اسماء الصحابۃ للذہبی ۲/۷۵ وغیرہ)

حارث بن مسلم کے بارے میں اختلاف ہے، دارقطنی وغیرہ نے انھیں مجہول سمجھا اور بعض علماء نے انھیں صحابہ میں ذکر کیا۔

مثلاً دیکھئے معرفۃ الصحابۃ لأبی نعیم الاصبہانی (ج ۲ ص ۷۹۴ ت ۶۵۹)

جس کے صحابی ہونے میں اختلاف ہو اور جرح مفسر ثابت نہ ہو تو وہ حسن الحدیث راوی ہوتا ہے۔ دیکھئے التلخیص الحبیر (ج ۱ ص ۴۷ ح ۷۰) وغیرہ

حارث بن مسلم مذکور کی توثیق ابن حبان، ہیثمی (مجمع الزوائد ۸/۹۹) ابن حجر اور المنذری (کما تقدم) نے کر رکھی ہے لہٰذا وہ حسن الحدیث تھے۔ والحمد للہ

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ شیخ البانی رحمہ اللہ کا اس روایت کو حارث بن مسلم کی جہالت کی وجہ سے ضعیف قرار دینا صحیح نہیں ہے بلکہ یہ روایت حسن لذاتہ ہے۔

[شہادت، جنوری ۲۰۰۳ء]

کالے علم سے بچنے کا طریقہ

سوال کیا کالا علم واقعی موجود ہے اس کا اثر ہوتا ہے یا نہیں، اس سے بچنے کا کیا طریقہ ہے؟ (عبدالقادر، دیپالپور)

الجواب کالا علم جادو کو کہا جاتا ہے۔ جادو کا جزئی و عارضی اثر ہونا قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔ مصری جادوگروں کی پھینکی ہوئی رسیوں اور لاٹھیوں کے بارے میں موسیٰ علیہ السلام نے یہ خیال کیا تھا کہ یہ (سانپ) دوڑ رہے ہیں۔ لہٰذا موسیٰ علیہ السلام نے خوف محسوس کیا۔

(دیکھئے سورۃ طٰہٰ:۶۶، ۶۷ وغیرہ)

جادو سے بچنے کے لئے معوذتین، آیت الکرسی اور دیگر مسنون دعائیں پڑھیں۔

[شہادت، اکتوبر ۱۹۹۹ء]

جنات سے بچاؤ کیسے ممکن ہے؟

سوال جنات کے بارے میں قرآن کی سورت (جن) میں ذکر ملتا ہے لیکن کیا جنات کی طاقت انسان سے زیادہ ہے اور ایک باعمل مسلمان جنات سے آخر کیونکر محفوظ رہ سکتا ہے۔ ان جنات کے علاوہ بلاؤں اور پریوں کو بہت سے لوگوں نے دیکھا ہے۔ ایک اور قسم کی مخلوق ہے جو کہ گہری نیند میں صرف اور صرف انسان کا گلہ اس طرح دباتی ہے کہ چیخ کی آواز بھی کوئی نہیں سن سکتا۔ کیا قرآن وسنت کی روشنی میں مندرجہ بالا مخلوق کے بارے میں کچھ کہا جا سکتا ہے؟ (منظور الٰہی، راولپنڈی)

الجواب جنات وشیاطین کے شر سے بچنے کے لئے سورۃ البقرہ پڑھنی چاہئے۔

دیکھئے صحیح مسلم (۷۸۰) عربی نسخہ (۱/۵۳۹) صلوٰۃ المسافرین (ب ۲۹)

آیت الکرسی پڑھنا بھی ثابت ہے۔

مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: وقاية الإنسان من الجن والشيطان للشيخ وحيد عبدالسلام بالي اور الصارم البتار في التصدي للسحرة الأشرار .

[شہادت، جولائی ۱۹۹۹ء]

تنبیہ: اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے، اس سلسلے میں اس کا مطالعہ مفید رہے گا۔ (ان شاء اللہ)

سو دفعہ درود پڑھنا

سوال کیا درود پڑھنے کے لئے دن میں ۱۰۰ بار پڑھنے کی تخصیص ہے؟ اگر ہے تو حوالہ درکار ہے۔ (حبیب اللہ۔ پشاور)

الجواب سو دفعہ پڑھنے والی ضعیف و مردود روایات المعجم الصغیر للطبرانی (ج ۲ ص ۴۸ ح ۹۱۵) الترغیب والترہیب (ج ۲ ص ۴۹۵) اور اتحاف المتقین (ج ۵ ص ۵۱) وغیرہ میں موجود ہیں۔ الزبیدی نے "وھو حدیث حسن" قرار دیا ہے(!)

لہٰذا سو دفعہ کی قید کے بغیر ہر مسلمان کو چاہیے کہ کثرت سے آپ ﷺ پر درود پڑھے کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا: ((من صلّى عليّ واحدةً صلّى الله عليه عشراً)) جو شخص مجھ پر ایک دفعہ درود پڑھے تو اللہ اس پر دس دفعہ رحمتیں نازل فرماتا ہے۔ (صحیح مسلم ح ۴۰۸)

[شہادت جنوری ۲۰۰۳ء]

استخارہ کب اور کتنے دن کرنا ہے؟

سوال استخارہ کتنے روز کرنا مسنون ہے؟ استخارہ کن امور میں مستحب ہے؟

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو فرمایا: جب تم کسی کام کو کرنے لگو تو اپنے رب سے سات مرتبہ استخارہ کرو پھر جس بات پر دل مطمئن ہو جائے اسے اختیار کرو، اسی میں خیر ہوگی۔ یہ حدیث ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب اذکار مسنونہ میں ابن السنی

کی ''عمل الیوم واللیلۃ'' کے حوالے سے نقل کی ہے۔استخارہ کرنا مستحب ہے یا واجب؟ ہمارے فاضل مولوی ہیں، وہ کسی کو ایک ماہ تک استخارہ کرنے کا کہہ رہے تھے۔میں نے انھیں یہ حدیث بتائی مگر پھر بھی وہ اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔دلیل مانگنے پر نہ دی۔ مجھے اب ایک صحابی کا اثر یاد آرہا ہے مگر حوالہ یاد نہیں جس میں صحابی تین دن تک استخارہ کا کہتے ہیں۔ (محمد جعفر ابوعثمان)

الجواب استخارے کے لیے دنوں کی شرط نہیں ہے۔جب بھی مباح امور میں سے کوئی مشکل اور پیچیدہ مسئلہ ہو تو استخارہ کرلیں جیسا کہ صحیح حدیث سے ثابت ہے۔

(دیکھئے صحیح بخاری: ۱۱۶۲، ۶۳۸۲)

استخارہ کرنا مستحب ہے واجب نہیں کیونکہ ''من غیر فریضۃ'' کے الفاظ بھی عدم وجوب پر دلالت کرتے ہیں۔ (دیکھئے فتح الباری ج ۱۱ص ۱۸۵ تحت ح ۶۳۸۲)

امام بخاری نے اس حدیث (۱۱۶۲) پر ''باب ما جاء فی التطوع مثنیٰ مثنیٰ'' باندھا ہے۔ یعنی امام بخاری بھی اس حدیث کو تطوع (نفل) سے متعلق سمجھتے ہیں۔ابن السنی کی جس روایت کا حوالہ حافظ ابن القیم نے اذکار مسنونہ میں دیا ہے وہ روایت عمل الیوم واللیلۃ میں ''عبيدالله بن الحميري: ثنا إبراهيم بن البراء بن النضر بن أنس ابن مالك عن أبيه عن جده'' کی سند سے موجود ہے۔

اس کی سند سخت ضعیف ہے۔

النضر بن حفص بن النضر بن انس بن مالک غیر معروف ہے۔

دیکھئے لسان المیزان (۶/ ۱۹۱ ت ۸۸۰۲، دوسرا نسخہ ۷/ ۱۹۲ ت ۸۸۷۷)

ابراہیم بن العلاء اور عبیداللہ بن الحمیری بھی غیر معروف ہیں۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: ''لكن سنده واهٍ جدًا'' لیکن اس کی سند بہت زیادہ کمزور ہے۔

(فتح الباری ج ۱۱ص ۱۸۷)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اپنی کتاب الکلم الطیب (ص ۷۱ ح ۱۱۶) میں ''ویذکر

عن أنس'' لکھ کر اس کے ضعیف ہونے کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔
آپ نے جس اثر کی طرف اشارہ کیا ہے وہ مجھے بھی یاد نہیں ہے۔ واللہ اعلم

[شہادت، فروری ۲۰۰۲]

دورانِ تلاوت سلام کرنا

سوال ایک شخص قرآن مجید کی تلاوت کر رہا ہے، کیا اسے سلام کہنا جائز ہے؟

(شیر محمد، بیاڑ۔ کوہستان)

الجواب امام اہلِ سنت ابو عبداللہ احمد بن محمد بن حنبل الشیبانی رحمہ اللہ (۱۶۴ھ تا ۲۴۱ھ) نے فرمایا: '' ثنا عبداللّٰه بن يزيد :أنبانا قباث بن رزين اللخمي قال: سمعت علي بن رباح اللخمي يقول :سمعت عقبة بن عامر الجهني يقول: كنا جلوسًا في المسجد نقرأ القرآن ، فدخل علينا رسول الله ﷺ فسلّم علينا فرددنا عليه السلام ،ثم قال:((تعلموا كتاب اللّٰه واقتنوه (قال قباث: و حسبته قاله :و تغنوا به) فوالذي نفس محمد بيده !لهو أشد تفلتًا من المخاض من العقل.)) ''

عقبہ بن عامر الجہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم مسجد میں بیٹھے قرآن پڑھ رہے تھے تو رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے، پھر آپ نے ہمیں سلام کہا تو ہم نے سلام کا جواب دیا۔ پھر آپ نے فرمایا: اللہ کی کتاب کا علم حاصل کرو اور اسے (اپنے حافظے میں) جمع کرو۔ [قباث (راوی) نے کہا: میرے خیال میں انھوں (علی بن رباح) نے یہ (جملہ بھی) کہا: اور اسے خوش الحانی سے پڑھو۔] پس اس ذات کی قسم ہے کہ جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے، بے شک وہ (قرآن) رسیوں میں بندھی ہوئی اونٹنی سے تیز (دل و دماغ سے) نکل جاتا ہے۔ (مسند احمد ۴/۱۵۰ ح ۱۷۴۹۰، وسندہ حسن)

یہ روایت حسن ہے۔ اسے امام ابو عبدالرحمٰن النسائی (۲۱۵ھ تا ۳۰۳ھ) نے بھی احمد بن نصر (بن زیاد النیسابوری) عن عبداللہ بن یزید (ابی عبدالرحمٰن) المقریٔ کی سند سے

روایت کیا ہے۔

(السنن الکبریٰ للنسائی ج ۵ ص ۱۸، ۱۹، حدیث ۸۰۳۵ کتاب فضائل القرآن باب ۲۸، الامر بتعلم القرآن والعمل به)

اب راویوں کا مختصر تعارف پڑھ لیں:

① عبداللہ بن یزید المکی المقریٔ کتبِ ستہ کے بنیادی راوی اور بالاتفاق ثقہ (یعنی قابل اعتماد) تھے۔ حافظ ابن حجر نے فرمایا: "ثقة فاضل، أقرأ القرآن نيفًا و سبعين سنة مات سنة ثلاث عشرة وقد قارب المائة وهو من كبار شيوخ البخاري"

وہ ثقہ فاضل تھے۔ انھوں نے ستر سال سے کچھ زیادہ (لوگوں کو) قرآن پڑھایا ہے۔ آپ ۲۱۳ھ میں تقریباً سو سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ آپ امام بخاری کے بڑے اساتذہ میں سے تھے۔ (تقریب التہذیب مع التعقیب ص ۲۸۷ ت ۳۷۱۵)

② قباث بن رزین "صدوق مقرئ" یعنی سچے قاریٔ قرآن تھے۔

(تقریب التہذیب ص ۴۲۲ ت ۵۵۰۸)

انھیں ابن حبان نے ثقہ، ابوحاتم الرازی نے "لا بأس بحديثه" اور احمد بن حنبل نے "لا بأس به" قرار دیا ہے۔ (تہذیب الکمال ج ۱۵ ص ۲۰۸)

③ علی بن رباح اللخمی، صحیح مسلم اور سنن اربعہ کے راوی اور "ثقہ" تھے۔ (التقریب ص ۲۷۱)

امام بخاری نے الادب المفرد اور خلق افعال العباد میں ان سے روایت لی ہے۔

④ عقبہ بن عامر مشہور (جلیل القدر) صحابی اور "فقیہ فاضل" تھے۔ (التقریب: ۴۶۴۱)

قباث کی وجہ سے یہ سند حسن لذاتہ ہے۔ شیخ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے کہا:

"هذا إسناد صحيح" یعنی یہ سند صحیح ہے۔ (سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ ۷/ ۸۴۷ ح ۳۲۸۵)

یہ سلسلۂ صحیحہ کی آخری جلد ہے جو تین جلدوں میں شائع ہوئی ہے اور حدیث نمبر ۴۰۳۵ پر ختم ہوگئی ہے۔ اس کے آخر میں لکھا ہوا ہے کہ

"هذا آخر ما حققه الشيخ من هذه " السلسلة " المباركة إن شاء الله وكان ذلك أواخر شهر جمادى الأولى عام ۱۴۲۰ھ" (الصحیحۃ ج ۷ ص ۱۷۴۱)

اس کے بعد شیخ البانی فوت ہو گئے۔ رحمہ اللہ

روایتِ مذکورہ سے درج ذیل مسائل ثابت ہوتے ہیں:

۱: قرآن پڑھنے والے کو سلام کہنا جائز ہے۔

۲: قرآن مجید پڑھنے والا، اس سلام کا جواب دے گا۔

۳: قرآن مجید کا علم حاصل کرنا، اسے یاد کرنا اور اس پر عمل کرنا چاہئے، حدیثِ مذکور کے راویوں نے قراءت قرآن کا علم حاصل کر کے اس کی تعلیم دی ہے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ

۴: قرآن، خوش الحانی اور اصولِ تجوید و قراءت کے مطابق پڑھنا چاہئے۔

''وتغنوا به'' کے الفاظ، اس روایت کی بعض دوسری اسانید میں بغیر شک کے مروی ہیں اور شواہد کے ساتھ بالکل صحیح ہیں۔

۵: یہ روایت مصنف ابن ابی شیبہ (ج ۱۰ ص ۴۷۷ ح ۲۹۹۸۲) صحیح ابن حبان (موارد الظمان حدیث نمبر ۱۷۸۸) وغیرہما میں اختصار کے ساتھ مروی ہے جو کہ چنداں مضر نہیں ہے۔ حدیث اگر ایک جگہ مختصر اور دوسری جگہ طویل و مفصل مروی ہو تو یہ ضعف کی دلیل نہیں ہوا کرتی بشرطیکہ سند صحیح یا حسن ہو۔

۶: یہاں پر ایک بات بطورِ فائدہ عرض ہے کہ مسند احمد میں ''حدثنا عبداللّٰه: حدثني أبي'' کا مطلب یہ ہے کہ ''حدثنا عبداللّٰه بن أحمد بن حنبل: حدثني أبي أحمد ابن حنبل'' امام احمد بن حنبل، زوائد کو چھوڑ کر اس کتاب ''المسند'' کے مصنف ہیں اور عبداللہ بن احمد، ان کے بیٹے، ان سے اس کتاب کے راوی ہیں لہٰذا مسند احمد کی غیر زوائد والی روایات ''حدثني أبي'' کے بعد سے شروع ہوتی ہیں۔

۷: بعض لوگ کہتے ہیں کہ کھانا کھانے والوں کو سلام نہیں کہنا چاہئے (!) حالانکہ میرے علم کے مطابق اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ جب نمازی اور قاریٔ قرآن کو سلام کہنا جائز ہے تو کھانا کھانے والے کو سلام کرنا کس طرح ناجائز ہے؟

۸: مسجد میں دخول کے وقت لوگوں کو سلام کہنا مسنون ہے۔

۹: نمازی کو حالتِ نماز میں بھی باہر سے آنے والا سلام کہہ سکتا ہے جیسا کہ صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ رسول اللہ ﷺ ایک دفعہ نماز پڑھ رہے تھے تو جابر (بن عبداللہ الانصاری) رضی اللہ عنہ نے آپ کو سلام کہا۔ آپ نے (زبان کے بجائے) اشارے سے جواب دیا۔

(دیکھئے صحیح مسلم کتاب المساجد، باب تحریم الکلام فی الصلوٰۃ ونسخ ما کان من اباحتہ ح ۵۴۰/۳۶)

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اسی پر عمل تھا۔

نافع (مولیٰ عبداللہ بن عمر، مشہور تابعی) سے روایت ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے ایک نمازی کو سلام کہا تو اس نے (لاعلمی کی وجہ سے) زبان سے جواب دے دیا، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''إذا سلّم علی أحدکم وهو یصلّي فلا یتکلم ولکن یشیر بیده''

جب تم میں سے کسی کو حالتِ نماز میں سلام کہا جائے تو وہ زبان سے جواب نہ دے بلکہ اپنے ہاتھ سے اشارہ کر دے۔

(مصنف ابن ابی شیبہ ج ۲ ص ۷۴، السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۲ ص ۲۵۹ واللفظ لہ، وسندہ صحیح)

اس روایت کی سند بالکل صحیح ہے۔ مصنف عبدالرزاق وغیرہ میں دیگر آثار بھی ہیں جن کی طرف راقم الحروف نے نیل المقصود فی التعلیق علیٰ سنن ابی داود (مخطوط ج ۱ ص ۲۹۶ ح ۹۲۷) میں اشارہ کر دیا ہے۔

۱۰: قرآن مجید حفظ کرنے والے طالب علموں کو چاہئے کہ حفظ پر خوب محنت کریں۔ سبق، سبقی اور منزل کا خاص خیال رکھیں۔ اگر ہو سکے تو چھٹی والے دن، گزشتہ ہفتے کی ساری منزل، زبانی پڑھ لیں یا کسی کو سنا دیں، ورنہ یاد رکھیں کہ قرآن مجید، کثرتِ مراجعت کے بغیر جلدی بھول جاتا ہے۔ [شہادت، نومبر ۲۰۰۲ء]

سورۂ حشر کی آخری تین آیات کی فضیلت اور اس کی تحقیق

سوال مسنون دعاؤں کے بعض مجموعوں میں سیدنا معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث درج ہے کہ جو کوئی صبح کے وقت تین دفعہ اعوذ باللہ السمیع العلیم اور ایک دفعہ سورۃ

الحشر کی تین آیات مبارکہ: ھواللہ سے ھوالعزیز الحکیم (۲۲ تا ۲۴) پڑھے، تو ستر ہزار فرشتے مقرر کر دیئے جاتے ہیں جو شام تک اس کے لئے دعا کرتے رہتے ہیں اگر وہ اس روز مرجائے تو اسے شہادت کا ثواب حاصل ہوگا اور جو کوئی شام کے وقت یہ وظیفہ پڑھتا ہے وہ بھی یہی مرتبہ حاصل کرتا ہے۔ یہ حدیث، حدیث کی کون سی کتاب میں درج ہے آیا یہ صحیح ہے یا ضعیف و نا قابل عمل ہے؟ (محمد اسلم طاہر محمدی، لاہور کینٹ)

الجواب معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب یہ روایت درج ذیل کتابوں میں ''أبو أحمد الزبيري عن خالد بن طهمان أبي العلاء: حدثني نافع بن أبي نافع عن معقل بن يسار'' مروی ہے: (سنن الترمذی، کتاب فضائل القرآن باب ۲۲ ح ۲۹۲۲ تحقیقی ومسند احمد ۵/۲۶ ح ۲۰۵۷۲، سنن الدارمی ۲/۴۵۸ ح ۳۴۲۸ وعمل الیوم واللیلۃ لابن السنی ح ۸۰)، عجالۃ الراغب المتمنی / تحقیق الشیخ سلیم بن عید ابی اسامہ الہلالی ۱/۱۳۱ ح ۸۱، المعجم الکبیر للطبرانی ۲۰/۲۲۹ ح ۵۳۷، کتاب الدعاء ۲/۹۳۴ ح ۳۰۸، شعب الایمان للبیہقی: ۲۵۰۲، نتائج الافکار لابن حجر ۲/۴۰۵، فضائل القرآن لابن الضریس ص ۱۰۴ ح ۲۳۰، الکشف والبیان للثعلبی: ہذا تفسیرہ ۹/۲۸۹ تہذیب الکمال للمزی ۱۹/۳۱، معالم التنزیل للبغوی ۴/۳۲۷، الامالی لابن بشران ۲۰۳/۱۰۹، التدوین فی اخبار قزوین للرافعی ۲/۴۹۵ بحوالہ الشیخ الہلالی)

کتاب الدعاء کے محقق اور حافظ ہیثمی کی نافع بن ابی نافع پر جرح صحیح نہیں ہے۔

قول راجح میں نافع ثقہ ہیں انھیں یحییٰ بن معین (تاریخ الدوری: ۸۵۱) نے ثقہ قرار دیا ہے۔

خالد بن طہمان سچا مگر اختلاط کی وجہ سے ضعیف ہے۔ (صدوق، ضعيف من جهة اختلاطه كما حققته في تخريج سنن الترمذي: ۲۹۳۲، ثم كتبته بالاختصار) اور یہ قطعاً ثابت نہیں ہے کہ اس نے اختلاط سے پہلے یہ حدیث بیان کی ہو لہٰذا یہ سند ضعیف ہے۔ شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس روایت پر جرح کی ہے۔

دیکھئے ارواء الغلیل ۲/۵۸ تحت ح ۳۴۲)

اس روایت کی تائید میں کوئی صحیح یا حسن روایت موجود نہیں ہے۔ (دیکھئے نتائج الافکار ۲/۴۰۶)

اور حق یہی ہے کہ یہ روایت ضعیف ہونے کی وجہ سے قابل عمل نہیں ہے۔

وما علينا إلا البلاغ [شہادت، نومبر ۲۰۰۴ء]

سورۂ یٰسٓ کے فضائل

سوال جو شخص ہر صبح سورت یٰسین کی تلاوت کرتا ہے تو اس کی دن کی تمام حاجتیں پوری ہوں گی۔ اس روایت کی تحقیق مطلوب ہے۔ (ملخصاً از مکتوب حبیب اللہ پشاور)

الجواب یہ روایت سنن الدارمی (ج ۲ ص ۴۵۷ ح ۳۴۲۱ وطبعۃ محققۃ ح ۳۴۶۱) میں "عطاء بن أبي رباح (تابعي) قال: بلغني ان رسول الله ﷺ قال" کی سند سے موجود ہے۔ اور دارمی ہی سے صاحبِ مشکوۃ نے (ح ۲۱۷۷ بتحقیقي) نقل کی ہے۔

یہ روایت مرسل ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے اور "بلغني" کا فاعل نامعلوم ہے۔

سورہ یٰسٓ کی فضیلت میں درج ذیل مرفوع روایات بھی ضعیف ومردود ہیں:

۱۔ "إن لكل شئ قلبًا وقلب القرآن يٰس ومن قرأ يٰس كتب الله له بقرأتها قراءة القرآن عشر مرات"

(جامع ترمذی ح ۲۸۸۷ من حدیث قتادۃ عن انس رضی اللہ عنہ و تبلیغی نصاب ص ۲۹۲ فضائل قرآن ص ۵۸)

امام ترمذی اس روایت کے ایک راوی ہارون ابو محمد کے بارے میں فرماتے ہیں "شیخ مجهول" لہذا یہ روایت ہارون مذکور کے مجہول ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔ شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے موضوع قرار دیا ہے۔ (الضعیفۃ ج ۱ ص ۲۰۲ ح ۱۶۹)

امام ابوحاتم الرازی نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس حدیث کا راوی: مقاتل بن سلیمان (کذاب) ہے (علل الحدیث ج ۲ ص ۵۶ ح ۱۶۵۲) جبکہ سنن ترمذی وسنن الدارمی (ج ۲ ص ۴۵۶ ح ۳۴۱۹) تاریخ بغداد (ج ۴ ص ۱۶۷) میں مقاتل بن حیان (صدوق) ہے۔ واللہ اعلم

درج بالا روایت کا ترجمہ جناب زکریا صاحب تبلیغی دیوبندی نے درج ذیل الفاظ میں لکھا ہے: "ہر چیز کے لئے ایک دل ہوا کرتا ہے۔ قرآن شریف کا دل سورہ یٰسٓ ہے جو شخص سورۂ یٰسٓ پڑھتا ہے حق تعالیٰ شانہ، اس کے لئے دس قرآنوں کا ثواب لکھتا ہے"

۲۔ اس باب میں سیدنا ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ والی روایت کے بارے میں امام ترمذی نے لکھا ہے کہ ''ولا یصح من قبل إسناده وإسناده ضعیف'' (ترمذی: ۲۲۸۸۷)

۳۔ ''إن لکل شئ قلباً وقلب القرآن یٰس''

(کشف الاستار عن زوائد البزار ار ج ۳ ص ۸۷ ح ۲۳۰۴ من حدیث عطاء عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ)

اس حدیث کے بارے میں شیخ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''وحمید ھذا مجھول کما قال الحافظ فی التقریب وعبدالرحمن بن الفضل شیخ البزار لم أعرفه'' (الضعیفہ ج ا ص ۲۰۴)

یعنی اس کا (بنیادی) راوی حمید (المکی مولیٰ آل علقمۃ/تفسیر ابن کثیر ۳/۵۷۰) مجہول ہے جیسا کہ حافظ (ابن حجر) نے تقریب التہذیب میں کہا ہے اور بزار کے استاد: عبدالرحمٰن بن الفضل کو میں نہیں جانتا۔

معلوم ہوا کہ یہ روایت دوراویوں کی جہالت کی وجہ سے ضعیف ہے۔

۴۔ ''من قرأ یٰس فی لیلة أصبح مغفوراً له..'' إلخ

(مسند ابی یعلی ج ۱۱ ص ۹۳، ۹۴ ح ۶۲۲۴ وغیرہ من طریق ہشام بن زیاد عن الحسن قال: سمعت اباہریرہ بہ)

اس روایت کی سند سخت ضعیف ہے۔ ہشام بن زیاد متروک ہے۔ (التقریب ص ۳۶۴ ت: ۷۲۹۲)

۵۔ ''من قرأ یٰس في لیلة ابتغاء وجه اللّٰه غفرله في تلك اللّیلة''

(الدارمی ح ۳۴۲۰ وغیرہ)

اس روایت کی سند انقطاع کی وجہ سے ضعیف ہے۔ حسن بصری کی سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ملاقات ثابت نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ مدلس ہیں اور عن سے روایت کررہے ہیں۔

۶۔ ''من قرأ یٰس فی لیلة ابتغاء وجه اللّٰه غفرله''

(صحیح ابن حبان: موارد الظمآن ح ۶۶۵ وغیرہ عن الحسن (البصری) عن جندب رضی اللہ عنہ بہ)

اس روایت کی سند انقطاع کی وجہ سے ضعیف ہے۔ ابوحاتم رازی نے کہا: ''لم یصح للحسن سماع من جندب'' (المراسیل ص ۴۲) نیز دیکھئے حدیث سابق: ۵

۷۔ ''من قرأ يٰسٓ ابتغاء وجه الله تعالٰى غفرله ماتقدم من ذنبه فاقرؤوها عند موتاكم '' (البیهقی فی شعب الایمان ح ۲۴۵۸ من حدیث معقل بن یسار رضی اللہ عنہ)

اس کی سند ایک مجہول راوی: ابوعثمان غیر النہدی اور اس کے باپ کی جہالت کی وجہ سے ضعیف ہے۔ یہ روایت مختصراً مسند احمد (۲۶/۵، ۲۷) مستدرک الحاکم (۵۶۵/۱) صحیح ابن حبان (الاحسان ۲۶۹/۷ ح ۲۹۹۱ ونسخہ محققہ ح: ۳۰۰۲) سنن ابی داود (۳۱۲۱) اور سنن ابن ماجہ (۱۴۴۸) میں موجود ہے، اس حدیث کو امام دارقطنی نے ضعیف قرار دیا ہے۔

مسند احمد (۱۰۵/۴) میں اس کا ایک ضعیف شاہد بھی ہے۔

۸۔ ''من قرأ يسٓ فی ليلة أصبح مغفوراً له''

(حلیۃ الاولیاء ۱۳۰/۴ من حدیث عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ)

اس کی سند ابومریم عبدالغفار بن القاسم الکوفی کی وجہ سے موضوع ہے۔ ابومریم مذکور کذاب اور وضاع تھا۔ دیکھئے لسان المیزان (ج ۴ ص ۵۰، ۵۱)

۹۔ ''من قرأ يسٓ عدلت له عشرين حجة ومن كتبها ثم شربها أدخلت جوفه ألف يقين وألف رحمة ونزعت منه كل غل وداء'' (حلیۃ الاولیاء ج ۷ ص ۱۳۶) من حديث الحارث (الأعور) عن علي به ''

یہ روایت حارث اعور کے شدید ضعف (مع تدلیس أبي اسحاق) کی وجہ سے سخت ضعیف ہے۔

۱۰۔ ''لوددت إنها في قلب كل إنسان من أمّتي يعني يسٓ''

(البزار: کشف الاستار ۸۷/۳ ح ۲۳۰۵ من حدیث ابن عباس)

اس کا راوی ابراہیم بن الحکم بن ابان ضعیف ہے۔ (التقریب: ۱۶۶)

۱۱۔ '' من قرأ سورة يس وهو فی سكرات الموت أو قريب عنده جاءه خازن الجنة بشربة من شراب الجنة فسقاها إياه وهو على فراشه فيشرب فيموت ريان ويبعث ريان ولا يحتاج إلى حوض من حياض الأنبياء''

(الوسیط للواحدی ۵۰۹/۳)

یہ روایت موضوع ہے۔ یوسف بن عطیہ الصفار متروک تھا۔ (دیکھئے تقریب التہذیب:۷۸۷۲)
اور ہارون بن کثیر مجہول ہے۔ دیکھئے لسان المیزان (ج ۶ ص ۲۱۸)

۱۲۔ "من قرأیس فکانما قرأ القرآن عشر مرات" (شعب الایمان للبیہقی ح ۲۴۵۹)
یہ روایت حسان بن عطیہ کی وجہ سے مرسل ہے۔

۱۳۔ "سورة یس تدعی فی التوراة المنعمة..." إلخ
(شعب الایمان ح ۲۴۶۵ والضعفاء للعقیلی ج ۴ ص ۱۴۳، الامالی للشجری ج ۱ ص ۱۱۸ تاریخ بغداد للخطیب ج ۲ ص ۳۸۷، ۳۸۸ والموضوعات لابن الجوزی ص ۲۴۷ ج ۱ وتبلیغی نصاب ص ۲۹۲، ۲۹۳ فضائل قرآن ص ۵۸، ۵۹)
اس روایت کی سند موضوع ہے محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی بکر الجدعانی متروک الحدیث ہے اور دوسرے کئی راوی مجہول ہیں۔ امام بیہقی فرماتے ہیں: "وھو منکر" امام عقیلی نے بھی اسے منکر قرار دیا ہے۔ اس کی ایک دوسری سند تاریخ بغداد اور الموضوعات لابن الجوزی میں ہے۔ اس کا راوی محمد بن عبد بن عامر السمرقندی کذاب اور چور تھا۔

۱۴۔ "إني فرضت علی أمّتي قراءة یس کل لیلة فمن دام علی قراءتها کل لیلة ثم مات مات شهیدًا" (الامالی للشجری ج ۱ ص ۱۱۸)
یہ روایت موضوع ہے۔ اس کے کئی راویوں مثلاً عمر بن سعد الوقاصی، ابو حفص بن عمر بن حفص اور ابو عامر محمد بن عبدالرحیم کی عدالت نامعلوم ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ سورت یٰسین کی فضیلت میں تمام مرفوع روایات ضعیف ومردود ہیں۔

امام دارمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "حدثنا عمرو بن زرارة: حدثنا عبدالوهاب: حدثنا راشد، أبو محمد الحماني عن شهر بن حوشب قال: قال ابن عباس: من قرأ یٰسٓ حین یصبح، أعطي یسر یومه حتی یمسي، ومن قرأها في صدر لیلة أعطي یسر لیلته حتی یصبح" ہمیں عمرو بن زرارہ نے حدیث بیان کی: ہمیں عبدالوہاب الثقفی نے حدیث بیان کی: ہمیں راشد ابو محمد الحمانی نے حدیث بیان کی، وہ شہر بن حوشب سے بیان کرتے ہیں کہ (سیدنا) ابن عباس (رضی اللہ عنہما) نے فرمایا: جو شخص صبح کے

وقت یٰسین پڑھے تو اسے شام تک آسانی عطا ہو گی۔ اور جو شخص رات کے وقت یٰسین پڑھے تو اسے صبح تک آسانی عطا ہو گی (یعنی اس کے دن و رات آرام و راحت سے گزریں گے۔) (سنن الدارمی ۱/۴۵۷ ح ۳۴۲۲ دوسرا نسخہ: ۳۴۶۲ وسندہ حسن)

اس روایت کے راویوں کا مختصر تعارف درج ذیل ہے:

① عمرو بن زرارہ: ثقة ثبت (تقریب التہذیب: ۵۰۳۲)

② عبدالوہاب الثقفی: ثقة تغير قبل موته بثلاث سنين . (التقریب: ۴۲۶۱)

لكنه ما ضر تغيره حديثه فإنه ماحدث بحديث في زمن التغير.

(میزان الاعتدال ۲/۶۸۱)

③ راشد بن نجیح الحمانی: صدوق ربما أخطأ. (تقریب التہذیب: ۱۸۵۷)

وحسن له البوصيري. (زوائد ابن ماجہ: ۳۳۷۱)

یہ حسن الحدیث راوی تھے۔

④ شہر بن حوشب مختلف فیہ راوی ہیں، جمہور محدثین نے ان کی توثیق کی ہے۔

(كما حققته في كتابي: تخريج النهاية في الفتن والملاحم ص ۱۱۹، ۱۲۰)

حافظ ابن کثیر ان کی ایک روایت کو حسن کہتے ہیں۔ (مسند الفاروق ج ۱ ص ۲۲۸)

میری تحقیق میں یہ راوی حسن الحدیث ہیں۔ واللہ اعلم

خلاصہ یہ کہ یہ سند حسن لذاتہ ہے۔ [الحدیث: ۱۷]

نیز دیکھئے ماہنامہ شہادت اسلام آباد، جنوری ۲۰۰۳ء

سورۂ ملک اور عذابِ قبر

سوال کیا سورۃ الملک کی تلاوت عذابِ قبر سے نجات دلائے گی؟ صحیح احادیث کے حوالے سے رہنمائی فرمادیں۔ (سید جاوید مسعود غزنوی، اٹک)

الجواب سورہ ملک (۶۷- تَبَارَكَ الَّذِىْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ... إلخ) کی فضیلت میں درج ذیل احادیث مروی ہیں۔

۱: "يحي بن عمرو بن مالك النكري عن أبيه عن أبي الجوزاء عن ابن عباس قال :ضرب بعض أصحاب النبي ﷺ خباء ه على قبر وهو لا يحسب أنه قبر ، فإذا فيه إنسان يقرأ سورة الملك حتى ختمها ، فأتى النبي ﷺ فقال :يا رسول الله !ضربت خباء ي على قبر وأنا لا أحسب أنه قبر ، فإذا فيه إنسان يقرأ سورة الملك حتى ختمها فقال النبي ﷺ :((هي المانعة ، هي المنجية ، تنجيه من عذاب القبر)) هذا حديث غريب من هذا الوجه وفي الباب عن أبي هريرة" یحییٰ بن عمرو بن مالک النکری سے روایت ہے کہ،اس نے اپنے باپ (عمرو بن مالک النکری) سے،اس نے ابوالجوزاء سے اس نے (عبداللہ) بن عباس (رضی اللہ عنہ) سے بیان کیا کہ: نبی ﷺ کے ایک صحابی نے ایک قبر پر خیمہ لگا دیا اور انھیں پتا نہیں تھا کہ یہ قبر ہے،کیا دیکھتے ہیں کہ ایک انسان (پوری) سورۃ الملک پڑھ کر اس کا ختم کر رہا ہے،تو انھوں نے نبی ﷺ کے پاس آکر کہا: یا رسول اللہ! میں نے ایک قبر پر خیمہ لگایا اور مجھے یہ خبر نہیں تھی کہ وہاں قبر ہے،کیا دیکھتا ہوں کہ ایک انسان سورۃ الملک آخر تک پڑھ کر اس کا ختم کر رہا ہے؟ تو نبی ﷺ نے فرمایا:"یہ روکنے والی ہے، یہ نجات دینے والی ہے، یہ اسے قبر کے عذاب سے نجات دینے والی ہے" یہ حدیث اس سند سے غریب (اجنبی) ہے، اور اس باب میں ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے بھی (حدیث) مروی ہے۔

(سنن الترمذی ۴/۱۶۴ ح ۲۸۹۰ و نسخہ مخطوطہ ص ۱/۱۸۷)

اسے یحییٰ بن عمرو بن مالک کی سند کے ساتھ درج ذیل محدثین نے بھی روایت کیا ہے:
ابونعیم الاصبہانی (حلیۃ الاولیاء ۳/۸۱) البیہقی (اثبات عذاب القبر، تحقیقی ح ۱۴۶، وقال: تفرد به يحي بن عمرو بن مالك وهو ضعيف) محمد بن نصر المروزی (مختصر قیام اللیل للمقریزی ص ۱۴۵، ۱۴۶) ابن عدی الجرجانی (الکامل فی ضعفاء الرجال ۷/۲۶۶۲) الطبرانی (المعجم الکبیر ۱۲/۱۷۵ ح ۱۲۸۰۱) اور المزی (تہذیب الکمال ۲۰/۱۸۱، ۱۸۲)

یہ روایت بلحاظِ اصولِ حدیث: ضعیف و مردود ہے، اس کے راوی یحییٰ بن عمرو بن

مالک کے بارے میں امام بیہقی رحمہ اللہ نے فرمایا: ''وہ ضعیف ہے۔''

حافظ ذہبی نے فرمایا: ''ضعیف'' (الکاشف: ۳/۲۳۲)

حافظ ابن حجر العسقلانی نے گواہی دی: '' ضعيف ، ويقال :إن حماد بن زيد كذبه ''

(تقریب التہذیب: ۷۶۱۴)

اس راوی پر دیگر محدثین کی جرح کے لئے دیکھئے تہذیب الکمال وتہذیب التہذیب اور میزان الاعتدال وغیرہ۔

۲: ''شعبة عن قتادة عن عباس الجشمي عن أبي هريرة عن النبي ﷺ قال : ((إن سورة من القرآن ثلاثون آية ، شفعت لرجل حتى غفرله ، وهي تبارك الذي بيده الملك)) هذا حديث حسن'' ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: بے شک قرآن کی ایک سورت، تیس (۳۰) آیتوں والی نے اپنے پڑھنے والے کی سفارش کی حتی کہ اسے بخش دیا گیا، یہ سورۃ الملک ہے۔ یہ حدیث حسن ہے۔

(سنن الترمذی: ۲۸۹۱)

اس حدیث کی سند حسن لذاتہ ہے، اسے ابوداود (۱۴۰۰) اور ابن ماجہ (۳۷۸۶) وغیرہما نے بھی امام شعبہ سے بیان کیا ہے۔ حافظ ابن حبان (موارد الظمان: ۱۷۶۶) حاکم (۲/۴۹۷، ۴۹۸) اور ذہبی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

تنبیہ ۱: اس روایت پر بعض کی جرح مبہم ومردود ہے۔

تنبیہ ۲: قتادہ سے اگر شعبہ روایت کریں تو قتادہ کی روایت سماع پر محمول ہوتی ہے۔

۳: '' سليمان بن داود بن يحي البصري :نا شيبان بن فروخ :نا سلام بن مسكين عن ثابت عن أنس قال قال رسول الله ﷺ : ((سورة من القرآن ما هي إلا ثلاثين آية خاصمت عن صاحبها حتى أدخلته الجنة وهي سورة تبارك)) '' انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قرآن کی ایک سورت، جس کی تیس آیتیں ہیں، نے اپنے پڑھنے والے کا دفاع کیا حتی کہ اسے جنت میں داخل کر

دیا، یہ سورت تبارک (الذي بيده الملك) ہے۔

(المعجم الصغیر للطبرانی ۱/۱۷۶ ح ۲۶۷ والاوسط: ۳۶۶۷، المختارہ للضیاء المقدسی ۵/۱۱۴، ۱۱۵ ح ۱۷۳۸، ۱۷۳۹)

اس روایت کے راوی ابوایوب سلیمان بن داود بن یحییٰ مولیٰ بنی ہاشم کے حالات توثیق مطلوب ہیں۔

۴: "ليث (بن أبي سليم) عن أبي الزبير عن جابر: أن النبي ﷺ كان لا ينام حتى يقرأ: ﴿الم تنزيل، وتبارك الذي بيده الملك﴾

جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ سورۃ السجدۃ اور سورۃ الملک پڑھنے کے بغیر نہیں سوتے تھے۔ (سنن الترمذی: ۲۸۹۲)

یہ روایت لیث بن ابی سلیم کی سند سے درج ذیل کتابوں میں بھی موجود ہے۔

مسند احمد (۳/۳۴۰ ح ۱۴۷۱۴) مسند عبد بن حمید (ح: ۱۰۳۸، ولیث صرح بالسماع عندہ) مسند الدارمی (ح: ۳۴۱۴، دوسرا نسخہ: ح ۳۴۵۴) قیام اللیل للمروزی مختصر المقریزی (ص ۱۴۶) مصنف ابن ابی شیبہ (۱۰/۴۴۲ ح ۲۹۸۰۷) السنن الکبریٰ للنسائی (ح ۱۰۵۴۲ وعمل الیوم واللیلۃ ح: ۷۰۷) عمل الیوم واللیلۃ لابن السنی (ح: ۶۷۵، دوسرا نسخہ ح: ۶۷۷) شیخ سلیم الہلالی نے اس روایت کی طویل تخریج کر رکھی ہے۔

لیث بن ابی سلیم ضعیف راوی ہے لیکن مغیرہ بن مسلم (صدوق / تقریب التہذیب: ۶۸۵۰) نے یہی روایت ابوالزبیر المکی سے بیان کر رکھی ہے۔

(دیکھئے السنن الکبریٰ للنسائی: ۱۰۵۴۲ وعمل الیوم واللیلۃ: ۷۰۶، والادب المفرد للبخاری: ۱۲۰۷)

ابوالزبیر مدلس راوی تھے۔ دیکھئے میری کتاب "الفتح المبین فی تحقیق طبقات المدلسین" (۳/۱۰۱) اور روایت معنعن (عن سے) ہے لہٰذا یہ سند ضعیف ہے۔

ابوالزبیر سے پوچھا گیا کہ آپ نے یہ روایت جابر (بن عبداللہ الانصاری رضی اللہ عنہ) سے سنی ہے؟ انھوں نے کہا: مجھے یہ خبر صرف صفوان یا ابن صفوان نے (مرسلاً) بتائی ہے۔

(سنن الترمذی: ۲۸۹۲)

حافظ ابن حجر نے کمال تحقیق کرتے ہوئے فرمایا ہے: " وعلى هذا فهو مرسل أو معضل " اس لحاظ سے یہ روایت مرسل یا معضل (منقطع) ہے۔ (نتائج الافکار ۳/۲۶۷)

حافظ ابن حجر کے اس کلام پر شیخ سلیم بن عید الہلالی السّلفی لکھتے ہیں:

" وهذا كلام في غاية التحقيق ، وقد خفي هذا على شيخنا الألباني – رحمه الله في الصحيحة (۱۳۰/۲)فجعل رواية زهير بن معاوية هذه عن صفوان أو ابن صفوان عن جابر وهذا خطأ منه – رحمه الله ، فإن صفوان لم يروه عن جابر وإنما منتهاه عن صفوان نفسه ...... "

اور یہ کلام تحقیق کے انتہائی اعلیٰ مقام پر ہے اور یہ ہمارے استاذ شیخ الالبانی رحمہ اللہ پر پوشیدہ رہ گیا۔ انھوں نے اپنی کتاب الصحیحہ میں زہیر بن معاویہ کی روایت کو صفوان یا ابن صفوان عن جابر سمجھ لیا اور یہ ان کی غلطی ہے، رحمہ اللہ، بے شک صفوان نے یہ روایت جابر (رضی اللہ عنہ) سے بیان نہیں کی، یہ تو ان کا اپنا قول ہے۔ (عجالۃ الراغب المتمنی ۲/۷۶۹)

یا مرسل ہے۔

خلاصۃ التحقیق: یہ روایت بلحاظ سند ضعیف ہے۔

۵: عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

" يؤتى رجل من جوانب قبره ، فجعلت سورة من القرآن تجادل عنه حتى منعته " ایک آدمی کی قبر میں قرآن کی ایک سورت (تیس آیتوں والی) نے آدمی کا دفاع کیا حتیٰ کہ وہ شخص عذاب سے بچ گیا، (مرہ تابعی کہتے ہیں کہ) میں نے اور مسروق (تابعی) نے غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ سورۃ الملک ہے۔ (دلائل النبوۃ للبیہقی ۷/۴۱ وسندہ حسن)

اس روایت کی دوسری سندوں کے لئے دیکھئے مستدرک الحاکم (۴۹۸/۲) وغیرہ، ایک روایت میں ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

" سورة تبارك هي المانعة تمنع بإذن الله من عذاب القبر ......" إلخ

سورۃ الملک، اللہ کے اذن سے، عذاب قبر سے بچاتی ہے۔

(اثبات عذاب القبر للبیہقی ح ۱۴۵ بتحقیقی وسندہ حسن)

٦: خالد بن معدان رحمہ اللہ (تابعی، متوفی ۱۰۳ھ) سونے سے پہلے سورۃ السجدہ اور سورۃ الملک ضرور پڑھتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ دو سورتیں پڑھنے والے کی سفارش کریں گی اور اسے عذاب قبر سے بچائیں گی۔ (مسند دارمی ۲/۴۵۵ ح ۳۴۱۳ وسندہ حسن، أضواء المصابیح ۲۱۷۶ ب)

یہ روایت دارمی (من الحذاق) کی عبداللہ بن صالح کاتب اللیث سے روایت ہونے کی وجہ سے حسن ہے، صحیح حدیث کی دو قسمیں انتہائی اہم ہیں:

① صحیح لذاتہ ② حسن لذاتہ

صحیح حدیث کی طرح حسن حدیث بھی حجت ہوتی ہے۔

خلاصۃ التحقیق: سونے سے پہلے سورۂ تبارک پڑھنا صحیح ہے اور موجب ثواب ہے۔

واﻟﺤﻤﺪ للہ [الحدیث:۴]

پانی پینے کے بعد کی دعا

سوال کیا پانی پینے کے بعد کوئی خاص دعا ثابت ہے؟

درج ذیل الفاظ پڑھنے کیسے ہیں؟

"الحمد للّٰه الذي سقاناه عذبًا فراتًا برحمته و لم يجعله ملحًا أجاجًا بذنوبنا"

[حمد وثنا اللہ ہی کے لئے ہے جس نے ہمیں اپنی رحمت سے میٹھا خوش گوار پانی پلایا اور ہمارے گناہوں کی وجہ سے اُسے کھارا نمکین نہیں بنایا] (حوالہ مجھے معلوم نہیں)

تحقیق کر کے جواب دیں۔ جزاکم اللہ خیراً (ابومحمد تنویر الدین سلفی، ستیانہ بنگلہ)

الجواب ابن ابی حاتم الرازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "حدثنا أبي: حدثنا عثمان بن سعيد بن مرة: حدثنا فضيل بن مرزوق عن جابر عن أبي جعفر عن النبي ﷺ أنه كان إذا شرب الماء قال: "الحمد للّٰه الذي سقاناه عذبًا فراتًا برحمته ولم يجعله ملحًا أجاجًا بذنوبنا" (تفسیر ابن کثیر ۶/۱۰۵، الواقعہ: ۷۰)

جابر سے مراد جابر بن یزید الجعفی ہے اور اس کی سند سے یہ روایت درج ذیل کتابوں میں بھی موجود ہے: حلیۃ الاولیاء (۸/۱۳۷، وفی سندہ تصحیف) کتاب الشکر لابن ابی الدنیا (۷۰)

شعب الایمان للبیہقی (۴/۱۱۵ ح ۴۴۷۹ من طریق ابن ابی الدنیا) کتاب الدعاء للطبرانی (۸۹۹ و حرّفه محققه تحریفًا قبیحًا) اس روایت کی سند سخت ضعیف و مردود ہے۔ جابر الجعفی پر جمہور محدثین نے جرح کی ہے اور امام زائدہ بن قدامہ رحمہ اللہ نے فرمایا: جابر الجعفی کذاب تھا، وہ علی (رضی اللہ عنہ) کی رجعت پر ایمان رکھتا تھا۔ (تاریخ ابن معین روایۃ الدوری: ۱۳۹۹، وسندہ صحیح)

امام سفیان بن عیینہ المکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے جابر الجعفی سے کچھ باتیں سنیں تو جلدی سے باہر نکل گیا، مجھے یہ خوف تھا کہ ہمارے اوپر چھت گر پڑے گی۔

(الکامل لابن عدی ۲/۵۳۹ وسندہ صحیح، دوسرا نسخہ ۲/۳۳۰)

ان کے علاوہ دوسرے محدثین کرام سے بھی جابر الجعفی پر شدید جرحیں ثابت ہیں اور ان جروح کی تائید میں عرض ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا: "ما رأيت أحدًا أكذب من جابر الجعفي" میں نے جابر الجعفی سے زیادہ جھوٹا کوئی نہیں دیکھا۔

(تاریخ یحییٰ بن معین، روایۃ الدوری: ۱۳۹۸، وسندہ حسن)

نیز دیکھئے میری کتاب الفتح المبین فی تحقیق طبقات المدلسین (ص ۷۵)

حافظ ابن حجر العسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "ضعفه الجمهور" اسے جمہور نے ضعیف قرار دیا ہے۔ (طبقات المدلسین ۵/۱۳۳)

خلاصۃ التحقیق: یہ روایت سخت ضعیف و مردود ہے۔ نیز دیکھئے اتحاف المتقین للزبیدی (۵/۲۲۳) اور الضعیفہ للالبانی (۹/۲۱۷ ح ۴۲۰۲)

تنبیہ: پانی پینے کے بعد یہ (مذکورہ) دعا پڑھنا امام حسن بصری رحمہ اللہ سے ثابت ہے۔ امام ابن ابی الدنیا نے کہا: مجھے اسحاق بن اسماعیل (الطالقانی) نے حدیث بیان کی: ہمیں جریر بن (عبدالحمید) نے عبداللہ بن شبرمۃ سے حدیث بیان کی کہ حسن (بصری) جب پانی پیتے تو یہ (دعا) پڑھتے تھے۔ (کتاب الشکر: ۷۰ وسندہ صحیح، موسوعۃ الامام ابن ابی الدنیا ۱/۴۸۷)

لہٰذا پانی پینے کے بعد آثارِ سلف صالحین کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ دعا پڑھنا جائز ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ اُس بندے سے راضی ہو جاتا ہے جو کھانا کھاتا ہے تو اس پر

اللہ کی حمد بیان کرتا ہے اور مشروب پیتا ہے تو اس پر اللہ کی حمد بیان کرتا ہے۔ (صحیح مسلم:۲۷۳۴)

سیدنا ابو ایوب الانصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کھاتے یا پیتے تو فرماتے: ((الحمد للّٰه الذي أطعم وسقٰى وسوّغه و جعل له مخرجًا))

حمد وثنا اللہ ہی کے لئے ہے جس نے کھلایا، پلایا، اسے خوش گوار بنایا اور (نظامِ انہضام مقرر کر کے) مخرج بنا دیا۔ (سنن ابی داود:۳۸۵۱ وسندہ صحیح)

یہ دعا پڑھنا زیادہ بہتر ہے۔ وما علینا إلا البلاغ [الحدیث:۵۵]

کتاب الجنائز

موت کے وقت کلمہ پڑھنا

سوال ایک کلمہ گو مسلمان ساری عمر شرک و بدعات کے کام کرتا رہا اور مرتے وقت اس کی زبان پر کلمہ طیبہ جاری ہو جاتا ہے کیا ایسے آدمی کیلئے بھی ''دخل الجنة'' والی حدیث صادق آتی ہے نیز کلمہ گو مشرک کا جنازہ پڑھنا سنت سے ثابت ہے جبکہ آخری کلام کلمہ ہو۔

(ایک سائل)

الجواب جو شخص دین اسلام کا مخالف ہو مثلاً یہودی، عیسائی وغیرہ اس شخص کا آخری عمر میں کلمہ شہادت پڑھنا اس کیلئے مفید ہے۔ رہا وہ شخص جو یہ کلمہ پڑھ کر بھی کفر و شرک کرتا تھا مثلاً مرزائی وغیرہ تو جب تک وہ اپنے کفر و شرک سے برأت نہیں کرے گا اس کا کلمہ پڑھنا چنداں مفید نہیں ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے: ((من قال لا إله إلا الله و كفر بما يعبد من دون الله حرم ماله و دمه و حسابه على الله)) جس نے لا إله إلا الله کہا اور اللہ کے سوا جس کی عبادت کی جاتی ہے اس کا انکار کیا تو اس کا مال اور خون حرام ہے اور اس کا حساب اللہ پر ہے۔ (صحیح مسلم: ۲۳)

اس میں استدلال ''كفر بما يعبد من دون الله'' سے ہے۔ مزید تفصیل کیلئے صحیح مسلم کا باب مذکور مع شروح دیکھ لیں۔ [ماہنامہ شہادت، اگست ۲۰۰۰ء] (دوبارہ ۱۰/ستمبر ۲۰۰۷ء)

[الحدیث: ۴۲]

میت کے سلسلے میں چند بدعات اور ان کا رد

سوال بعض لوگ میت کو غسل دینے کے بعد یا میت کو گھر سے جنازہ گاہ (جہاں میت کی نمازِ جنازہ پڑھی جاتی ہے) کی طرف لے جانے کے بعد حلوہ تقسیم کرتے ہیں جسے قبر کا توشہ کہا جاتا ہے۔ اس (حلوے) توشے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ دلیل سے بیان کریں۔

(ایک سائل)

الجواب اس (حلوے) توشے کا ثبوت قرآن و حدیث میں قطعاً نہیں ہے اور نہ سلف

صالحین سے یہ عمل ثابت ہے لہٰذا یہ بدعت ہے۔ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ .)) اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ (صحیح مسلم: ۸۶۷/۲۰۰۵)

مشہور متبع سنت صحابی سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَ إِنْ رَآهَا النَّاسُ حَسَنًا . '' ہر بدعت گمراہی ہے اگرچہ لوگ اسے حسن (اچھا ہی) سمجھتے ہوں۔

(السنۃ للمروزی: ۸۲ وسندہ صحیح)

میت کے گھر والوں پر غم و پریشانی آئی ہوئی ہے اور انھیں اس رسم پر مجبور کیا جا رہا ہے کہ لوگوں کا منہ میٹھا کرنے کے لئے (حلوہ) توشہ پکا کر کھلائیں۔ حالانکہ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اردگرد کے لوگ کھانا پکا کر میت کے گھر والوں کو کھلاتے۔ جب سیدنا جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ جہاد فی سبیل اللہ میں شہید ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے لوگوں سے فرمایا:

((اِصْنَعُوْا لِآلِ جَعْفَرٍ طَعَامًا ، فَإِنَّهُ قَدْ أَتَاهُمْ أَمْرٌ يَشْغَلُهُمْ .))

آلِ جعفر (جعفر رضی اللہ عنہ کے گھر والوں) کے لئے کھانا تیار کرو کیونکہ ان پر ایسی بات آگئی ہے جس نے انھیں مشغول کر دیا ہے۔

(سنن ابی داود: ۳۱۳۲، مسند الحمیدی بتحقیقی: ۵۳۸ وسندہ حسن وصححہ الترمذی: ۹۹۸ والحاکم ۳۷۲/۱ والذہبی)

شیخ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے شیخ محمد البرکوی رحمہ اللہ کی کتاب جلاء القلوب (۷۷) سے نقل کیا ہے کہ لوگوں کا اہلِ میت کی طرف سے کھانا کھانے کی دعوت قبول کرنا بدعت ہے۔ دیکھئے احکام الجنائز وبدعہا (ص ۲۵۶ فقرہ: ۱۱۳)

دوحہ قطر کے قاضی شیخ احمد بن حجر البوطامی فرماتے ہیں: ''میت کے گھر والوں اور متعلقین کا تعزیت و سوگ کے لئے مجلس منعقد کرنا اور تعزیت کے لئے آنے والوں کے واسطے تین دنوں تک کھانا تیار کرنا بدعت ہے۔ بعض لوگ یہ مبتدعانہ کام ایک ہفتہ تک کرتے ہیں، اور یہ فضول خرچی سے کام لیتے ہیں، مثلاً بہت سے جانور ذبح کرتے ہیں. اور انواع و اقسام کے کھانے بناتے ہیں اور لوگ مختلف اطراف و جوانب سے آتے اور کھاتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ میت کے ورثاء چھوٹے چھوٹے، یتیم بچے ہوتے ہیں پھر بھی لوگ

ان کے اموال کو اس کام میں خرچ کر ڈالتے ہیں، اس کے حرام ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے، کیونکہ یہ یتیموں کا مال زوروزبردستی اور جور وظلم کے ساتھ کھا جانے کے مترادف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا﴾ جو لوگ یتیموں کا مال ظلماً کھاجاتے ہیں بے شک وہ لوگ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ کھا رہے ہیں۔ (النساء:۱۰)

یہاں تک کہ وہ متاخرین بھی جو بہت سی بدعات کو حسنہ قرار دیئے ہوئے ہیں اس فعل کو "بدعتِ ضالہ" کہتے ہیں کیونکہ اس میں سنت کی مخالفت پائی جاتی ہے، اس لئے کہ سنت یہ ہے کہ میت کے گھر والوں کے لئے ان کے پڑوسی لوگ کھانا تیار کریں، اور کھلائیں جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِصْنَعُوْا لِآلِ جَعْفَرٍ طَعَامًا .))... جعفر (جو جنگ موتہ میں شہید ہو گئے تھے) کی اولاد اور گھر والوں کے لئے کھانا تیار کرو۔ (عام کتب حدیث)

دوسری بات یہ ہے کہ ایسا کرنا اسراف وفضول خرچی ہے، تیسری بات یہ ہے کہ اس میں باطل وناحق (طریقے سے) لوگوں کا مال کھالیا جاتا ہے کیونکہ میت کے ورثاء کبھی کبھی فقراء ہوتے ہیں یا یتیم بچے ہوتے ہیں کبھی کبھی یہ لوگ قرض لے کر کھلانے پلانے والا یہ قبیح وشنیع کام دوسرے لوگوں کے ڈر سے کرتے ہیں۔" (بدعات اوران کا شرعی پوسٹ مارٹم ص ۶۷۵۔۶۷۶)

خلاصہ یہ کہ مسئولہ بالا عمل جائز نہیں بلکہ بدعت سیئہ ہے۔

تنبیہ: فتاویٰ سمرقندی کی ایک روایت میں آیا ہے کہ (سیدنا) عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

اے مومنو! قرآن کو مُردوں کی نجات کا وسیلہ بناؤ تو حلقہ بنالو اور کہو: اے اللہ! اس میت کو قرآنِ مجید کی حرمت سے بخش دے۔ الخ

اس روایت کی سند مردود ہے۔ اس میں عباس بن سفیان راوی نامعلوم ہے۔ اگر اس سے کتاب الثقات لابن حبان والا مجہول الحال راوی مراد لیا جائے تو ابواللیث سمرقندی کی اس سے ملاقات ثابت نہیں ہے اور اگر یہ کوئی دوسرا مجہول شخص ہے تو اس کی اسماعیل بن ابراہیم

عرف ابن علیہ سے ملاقات کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ (۲۶/نومبر ۲۰۰۷ء)

[الحدیث:۴۵]

سوال بعض لوگ جب میت کو جنازہ گاہ لے جاتے ہیں تو ساتھ ہی گڑ چینی یا صابون وغیرہ اور کچھ رقم بھی لے جاتے ہیں۔ جنازہ گاہ میں جنازے سے پہلے یا بعد میں بعض لوگ (مولوی حضرات وغیرہ) ایک دائرہ بنا کر اس سامان کے اردگرد بیٹھ جاتے ہیں۔ اس سامان پر قرآن مجید رکھ کر یہ لوگ باری باری اسے ہاتھ لگاتے ہیں اور ایک دوسرے کو بخشتے رہتے ہیں، اسے حیلۂ اسقاط کہا جاتا ہے۔

اس عمل کے بعد یہ لوگ یہ رقم اور سامان وغیرہ آپس میں یا لوگوں میں تقسیم کر دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ میت بخشی گئی ہے یا اس کا ثواب بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ اس عمل حیلۂ اسقاط کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ (ایک سائل)

الجواب اس مسئولہ طریقے حیلۂ اسقاط کا کوئی ثبوت قرآن و حدیث میں نہیں ہے اور نہ سلف صالحین کے آثار سے یہ طریقہ ثابت ہے لہٰذا یہ عمل بالکل بدعت ہے جسے بعض متاخر تقلیدی علماء نے گھڑ لیا ہے۔ ائمۂ اربعہ اور ان کے شاگردوں سے بھی یہ حیلہ ثابت نہیں ہے۔ یہ سمجھنا کہ اس حیلے سے میت کے ذمہ نمازیں وغیرہ معاف ہو جائیں گی بلا دلیل ہے۔

میت کے ذمہ اگر رمضان کے کچھ روزے باقی ہوں تو اس کی طرف سے فقراء و مساکین کو بطورِ فدیہ کھانا کھلانا چاہئے جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''لا یصلي أحد عن أحد ولا یصوم أحد عن أحد ولکن یطعم عنه مکان کل یوم مدًا من حنطة'' ''کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی طرف سے نہ نماز پڑھے اور نہ روزہ رکھے بلکہ اس شخص کی طرف سے (روزے کے) ہر دن کے بدلے میں ایک مُد (دو رطل) گندم کا کھانا کھلانا چاہئے۔ (السنن الکبریٰ للنسائی ۲/۱۷۵ ح ۲۹۱۸ وسندہ صحیح)

اگر کسی مرنے والے کے ذمے نذر کے روزے باقی ہوں تو صحیح حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ مَاتَ وَعَلَيْهِ صِيَامٌ صَامَ عَنْهُ وَلِيُّهُ .)) جو شخص مر جائے اور

اس پر (نذر کے) روزے ہوں تو اس کا ولی (وارث) اس کی طرف سے روزے رکھے۔

(صحیح بخاری: ۱۹۵۲، صحیح مسلم: ۱۱۴۷)

بعض الناس میں حیلۂ اسقاط کے مروجہ طریقے سے اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے کی کوشش کی جاتی ہے، مثلاً مال تو ایک ہزار روپے کا ہے مگر اسے ایک دوسرے کو بخشواتے اور پھیرے دلواتے ہوئے ہزاروں روپے کے ثواب تک پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

سرفراز خان صفدر دیوبندی نے اپنی کتاب ''المنہاج الواضح / راہِ سنت'' میں بعض نام نہاد متاخر (تقلیدی) فقہاء سے اس حیلے کا جواز نقل کیا ہے۔ (دیکھئے ص ۲۷۸۔۲۸۳)

حالانکہ نہ تو اس حیلے کا کوئی ثبوت ہے اور نہ ان متاخر تقلیدی فقہاء کی ائمہ اربعہ اور سلف صالحین کے مقابلے میں کوئی حیثیت ہے۔ [الحدیث: ۴۵]

سوال بعض لوگ نمازِ جنازہ سے پہلے یا بعد میں صفوں میں گڑ چینی تقسیم کرتے ہیں اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ (ایک سائل)

الجواب یہ عمل بالکل بدعت ہے۔ کتاب وسنت سے اس کا کوئی ثبوت نہیں لہٰذا ایسے اعمال سے کلی طور پر اجتناب کرنا چاہئے۔ [الحدیث: ۴۵]

سوال جس گھر میں کوئی آدمی فوت ہو جاتا ہے تو اس کے گھر والے کھانا تیار کر کے میت کے دفن کے بعد عام لوگوں کو کھلاتے ہیں چاہے کھانے والے امیر ہوں یا غریب، اسے خیرات کہا جاتا ہے اور اُمید یہ رکھی جاتی ہے کہ اس طرح سے ثواب ملے گا، اس کھانے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ (ایک سائل)

الجواب ایسا کھانا کھلانا بدعت ہے اور کتاب وسنت میں اس کی کوئی دلیل نہیں۔

بلکہ سیدنا جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے گھر والوں کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

آلِ جعفر کے لئے کھانا تیار کرو کیونکہ ان پر ایسی بات (مصیبت) آگئی ہے جس نے انھیں مشغول کر دیا ہے۔ (سنن ابی داود: ۳۱۳۲، وسندہ حسن)

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ میت کے گھر والے دوسرے لوگوں کے لئے کھانا

تیار نہیں کریں گے بلکہ لوگ ان کے لئے کھانا پکا کر بھیجیں گے تاکہ وہ ان ایامِ غم میں کھانا پکانے کی طرف سے بے فکر رہیں۔ رہا مسئلہ ایصالِ ثواب کا تو اس کا مروجہ دعوتِ طعام سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ میت کی وفات کے تین دنوں کے بعد کسی وقت بھی میت کی طرف سے فقراء و مساکین میں ایصالِ ثواب کیا جا سکتا ہے۔ [الحدیث:۴۵]

سوال بعض علاقوں میں ایسا ہوتا ہے کہ مرنے والے کے بعض رشتہ دار اور دوست اس کی وفات کے بعد چار پائیوں یا چٹائیوں وغیرہ پر تین یا چالیس دنوں کے لئے بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر جو لوگ تعزیت کے لئے آتے ہیں تو ان میں سے ہر آدمی با آوازِ بلند یہ کہتا ہے کہ دعا کریں۔ پھر سب لوگ ہاتھ اُٹھا کر دعا کرتے ہیں۔

اس طرح کی مروجہ دعا، متعین جگہ پر اہلِ میت اور لوگوں کا اجتماع، تعزیت کے دنوں کا تعین اور مروجہ طریقۂ تعزیت کا ثبوت کیا ہے؟ قرآن و حدیث سے جواب دیں۔ جزاکم اللہ خیراً.

(ایک سائل)

الجواب چالیس دنوں تک تعزیت کے لئے بیٹھنا، ہر آدمی کا با آوازِ بلند دعا کا مطالبہ کرنا اور پھر سب لوگوں کا میت کے لئے ہاتھ اُٹھا کر دعا کرنا یہ سب بدعت ہے جس کا کوئی ثبوت شریعتِ مطہرہ میں موجود نہیں ہے۔

سیدنا جعفر بن ابی طالب الطیار رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آلِ جعفر کو تین دنوں کی مہلت دی پھر ان کے پاس جا کر فرمایا: آج کے بعد میرے بھائی پر نہ رونا۔

(سنن ابی داود: ۴۱۹۲، وسندہ صحیح)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ میت پر تین دنوں سے زیادہ سوگ کرنا جائز نہیں ہے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب زید بن حارثہ، جعفر (طیار) اور عبداللہ بن رواحہ (رضی اللہ عنہم) کی شہادت کی خبر آئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ گئے، آپ کے چہرے پر غم کے آثار نظر آ رہے تھے۔ (صحیح بخاری: ۱۲۹۹، صحیح مسلم: ۹۳۵ و ترقیم دار السلام: ۲۱۶۱)

اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ میت کا (تعزیت والوں کے لئے) بیٹھنا جائز ہے۔ واللہ اعلم

یاد رہے کہ عورت اپنے خاوند کی وفات پر چار مہینے دس دن سوگ منائے گی۔

تعزیت کی ایک مشہور دعا درج ذیل ہے:

((إِنَّ لِلّٰهِ مَا أَخَذَ وَلَهُ مَا أَعْطَى وَكُلٌّ عِنْدَهُ بِأَجَلٍ مُّسَمًّى .)) بے شک اللہ ہی کے لئے ہے جو وہ لے لے اور اُسی کا ہے جو وہ عطا فرمائے اور ہر چیز اس کے پاس ایک خاص وقت تک کے لئے ہے۔ (صحیح بخاری: ۱۲۸۴، واللفظ لہ، صحیح مسلم: ۹۲۳ وترقیم دار السلام: ۲۱۳۵)

میت پر تعزیت کے لئے لوگوں کا بار بار دعا کی درخواست کرنا اور اجتماعی طور پر ہاتھ اُٹھا کر دعا کرنا کسی حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ سیدنا عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ سے ثابت شدہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے) تین دن گزرنے کے بعد ہمارے پاس تشریف لائے تو ہمارے سر منڈوا دیئے پھر آپ نے میرا (ایک) ہاتھ پکڑ کر بلند کیا پھر فرمایا: اے اللہ! آلِ جعفر کی نگہبانی فرما اور عبداللہ بن جعفر کے لئے برکت نازل فرما۔ (مسند احمد ۱/۲۰۴ ح ۱۷۵۰، وسندہ صحیح)

اس حدیث سے مروجہ دعا کا کوئی ثبوت نہیں ملتا بلکہ صرف پیار سے نابالغ بچے کے ایک ہاتھ کو آسمان کی طرف بلند کرنا ثابت ہے ورنہ صرف ایک ہاتھ سے دعا کرنا کیسا ہے؟

ایک غالی دیوبندی نعیم الدین نے ''رجل رشید'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ نعیم الدین نے اس کتاب میں اپنے دیوبندی علماء کے کئی فتوے نقل کئے ہیں جن میں تعزیت کی مروجہ دعا کو غیر ثابت اور غیر درست قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً دارالافتاء دارالعلوم کراچی کے محمد کمال الدین اور محمود اشرف دونوں لکھتے ہیں: ''مروجہ طریقہ کے مطابق تعزیت کے لئے ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھنا اور دعا کرنا شرعاً ثابت نہیں ہے۔ اس لئے تعزیت کے لئے رسمی طور پر ہاتھ اٹھانا درست نہیں۔ کیونکہ تعزیت کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ میت اور اس کے اقارب کیلئے زبانی دعا کی جائے اور ان کو صبر دلایا جائے، البتہ انفرادی طور پر اگر میت کیلئے ہاتھ اٹھا کر مغفرت اور بلندی درجات کی دعا کر لی جائے تو شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں۔'' (رجل رشید ص ۱۷۱)

دیوبندی مفتی رشید احمد لدھیانوی ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

''تعزیت کی دعا میں ہاتھ اٹھانا بدعت ہے۔'' (احسن الفتاویٰ ج۴ص ۲۴۵، رجل رشید ص ۱۷۳)

نعیم الدین دیوبندی اپنے قاری عبدالرشید دیوبندی سے نقل کرتے ہیں، وہ اپنے والد دیوبندی مفتی عبدالحمید سے کہ قاری لطف اللہ دیوبندی صاحب جب ایک حادثہ میں فوت ہوئے تو ایک دیوبندی عالم ''تعزیت کے لئے ان کے پاس تشریف لے گئے اور دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے .... فقیر اللہ صاحب نے فوراً فرمایا کہ مولانا کیا یہ حدیث سے ثابت ہے؟ انھوں نے عرض کیا کہ حضرت غلطی ہوئی اور ہاتھ چھوڑ دیئے۔'' (دیکھئے رجل رشید ص ۱۶۹)

یہ فقیر اللہ دیوبندی صاحب قاری لطف اللہ دیوبندی کے والد اور دیوبندی مدرسے جامعہ رشیدیہ ساہیوال کے بانی تھے جنھوں نے اپنے بیٹے کی موت پر مروجہ دعا سے اشارتاً منع کر دیا تھا۔

تعجب ہے کہ ہمارے علاقے میں دیوبندی حضرات بغیر کسی انکار اور جھجک کے اس مروجہ دعا پر عمل پیرا ہیں حالانکہ ان کے اپنے مفتیانِ کرام اس عمل کو بدعت و غیر ثابت قرار دے چکے ہیں۔ اسی طرح بعض الناس کے بعض نام نہاد علماء کو ''کیا یہ حدیث (دلیل) سے ثابت ہے؟'' والے سوال سے سخت چڑ ہے۔ حالانکہ طرزِ عمل یہ ہونا چاہئے کہ دلیل پوچھنے والے سے ناراض نہ ہوں، اگر دلیل معلوم ہو تو بیان کر دیں یا پھر کہہ دیں کہ دلیل معلوم نہیں ہے۔

[الحدیث:۴۵]

میّت کے لئے ہاتھ اُٹھا کر اجتماعی دعائیں؟

سوال جو لوگ میّت کے گھر تین دن تک ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر دعا کرتے ہیں، کیا یہ اسلام میں جائز ہے؟ (حاجی نذیر خان، دامان حضرو)

الجواب میّت کے گھر یا اہل میّت کے پاس جا کر، تین دن تک بار بار ہاتھ اُٹھا کر دعا کرنے کا کوئی ثبوت اسلام میں نہیں لہٰذا یہ کام بدعت ہے۔

مفتی رشید احمد لدھیانوی دیوبندی نے لکھا:

"تعزیت کی دُعا میں ہاتھ اُٹھانا بدعت ہے" (احسن الفتاویٰ ج۴ ص۲۴۵)

دیوبندی مدرسے خیر المدارس ملتان سے فتویٰ جاری ہوا:

"تعزیت مسنونہ میں آپ ﷺ اور صحابہ کرام سے ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگنا ثابت نہیں"

(رجل رشید تصنیف نعیم الدین دیوبندی ص۱۷۳)

"دارالعلوم" دیوبند کے مفتی نے فتویٰ لکھا:

"تعزیت کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ کیف ما اتفق انفرادی طور پر میت کے گھر جائے اور گھر والوں کو صبر کی تلقین کرے اور تسلی کے کچھ کلمات کہہ دے، ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا ثابت نہیں۔"

(حبیب الرحمٰن دیوبندی کا فتوی بحوالہ رجل رشید ص۱۷۰)

دیوبندی مدرسے دارالعلوم کراچی والوں نے فتویٰ دیا:

"مروجہ طریقہ کے مطابق تعزیت کیلئے ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھنا اور دعا کرنا شرعاً ثابت نہیں ہے، اس لئے تعزیت کیلئے رسمی طور پر ہاتھ اٹھانا درست نہیں۔" (رجل رشید ص۱۷۱)

حیرت ہے اُن لوگوں پر جو اس کام کو بدعت اور غیر ثابت قرار دے کر بھی تعزیت کی اجتماعی دعاؤں میں سرگرم رہتے ہیں۔! [الحدیث:۶۱]

جمعرات کی روٹی اور چالیسویں وغیرہ؟

سوال ہمارے علاقے میں یہ رواج ہے کہ میّت والے گھر سات (۷) دن کے بعد جمعرات کی روٹی ملاّ (امام) کے گھر بھیجتے ہیں اور چالیس (۴۰) دن بعد چالیسواں کرتے ہیں اور ایک سال بعد عرس کرتے ہیں۔ کیا یہ اسلام میں جائز ہے؟

(حاجی نذیر خان، دامان حضرو)

الجواب جمعرات کی روٹی، چالیسواں اور عرس کا کوئی ثبوت کتاب وسنت میں نہیں ہے بلکہ یہ سارے کام بدعت ہیں جن سے بچنا ضروری ہے۔

(تفصیل کے لیے دیکھئے "معجم البدع" ص۱۶۲)

بعض لوگ ان بدعات کو ایصالِ ثواب کا نام دیتے ہیں، عرض ہے کہ اگر اس قسم کا ایصالِ ثواب اسلام میں جائز ہوتا تو سلف صالحین، صحابہ، تابعین ومَن بعدہم ضرور کرتے۔ اُن کا اس طرح کے کام نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ بدعات ہیں جن کا ایصالِ ثواب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ [الحدیث:٦١]

قبروں پر اجتماعی دعائیں اور سورۂ یٰسین کی تلاوت؟

سوال بعض لوگ قبروں پر جا کر، ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر دعا کرتے ہیں اور سورۂ یٰسین کی تلاوت کرتے ہیں، کیا یہ جائز ہے؟ (حاجی نذیر خان، داماں حضرو)

الجواب اس سوال کے دونوں حصوں کا جواب علی الترتیب درج ذیل ہے:

① لوگوں کا قبروں پر جا کر اجتماعی دعا کرنا ثابت نہیں ہے۔ صرف دفن کے بعد حکم ہے کہ تم اس میّت کے لئے دعا کرو۔ دیکھئے سنن ابی داود (٣٢٢١ وسندہ حسن وصححہ الحاکم ٣٧٠/١ ووافقہ الذہبی)

جن قبروں کی عبادت کی جاتی ہے، وہاں جا کر قبر والے کے لئے بھی ہاتھ اُٹھا کر دعا نہیں مانگنی چاہئے تاکہ مشرکین ومبتدعین سے مشابہت (تشبہ) نہ ہو۔ اگر کوئی شخص ایسی قبر پر پہنچ جائے جہاں صاحبِ قبر صحیح العقیدہ تھا تو دل ہی میں اس کے لئے دعا کرلے کہ اللہ تعالیٰ اُس کی مغفرت فرمائے اور درجات بلند کرے۔

اگر کوئی اکیلا شخص قبرستان جائے تو اُس کے لئے یہ جائز ہے کہ قبرستان والوں کے لئے ہاتھ اُٹھا کر دعا کرے۔ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ بقیع کے قبرستان تشریف لے گئے اور آپ نے ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگی۔ دیکھئے مسلم (٩٧٤ ب، دارالسلام:٢٢٥٦)

یہ بہتر ہے کہ قبلہ رُخ ہو کر دعا مانگی جائے۔

② قبرستان میں یا میت کے پاس سورۂ یٰسین کی تلاوت کرنا کسی حدیث یا اثر سے ثابت نہیں لہٰذا یہ عمل بدعت ہے۔ (دیکھئے شیخ رائد بن صبری بن ابی علفہ کی کتاب: معجم البدع ص ٦٧٩)

[الحدیث:٦١]

میت کو کہاں دفن کیا جائے؟

سوال ہمارا شہر بزرگوں اور پیروں کی وجہ سے بہت مشہور ہے اور ان کے عقیدت مند و مرید اپنے گاؤں یا شہر کے قبرستان کو چھوڑ کر سینکڑوں میل دور اپنی میت کو ہمارے شہر کے قبرستان میں عقیدت کی بنیاد پر دفن کرتے ہیں۔ ایک میت دفن کرنے کے ساتھ ساتھ کئی نئی قبریں فرضی بنا کر جاتے ہیں تاکہ ان میں اپنی اور میتیں دفن کریں گے، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ (ریاض احمد، تونسہ شریف)

الجواب سنت سے یہی ثابت ہے کہ میت جہاں فوت ہوا سے وہیں (اسی علاقہ میں) دفن کرنا چاہیے۔ جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ''ہم نے اُحد کے دن مقتولوں کو (جنت البقیع میں) دفن کرنے کے لیے اٹھایا تو ایک منادی کرنے والے نے اعلان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حکم دیتے ہیں کہ مقتولین کو ان کی جائے قتل پر ہی دفن کرو۔''

(سنن ابی داود: ۳۱۶۵، ترمذی: ۱۷۱۷، وقال: ''حسن صحیح'' نسائی ۴/ ۷۹، ابن ماجہ: ۱۵۱۶)

اسے ابن الجارود (۵۵۳) ابن حبان (۷۷۴،۷۷۵) اور ابن خزیمہ نے صحیح کہا ہے۔ اس کے راوی نبیح العنزی ثقہ ہیں۔ دیکھئے: کتب الرجال ونیل المقصود (۱۵۳۳)

ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھائی عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کو جب دور سے لا کر مکہ میں دفن کیا گیا تو ام المومنین نے فرمایا: اگر میں (یہاں) موجود ہوتی تو عبدالرحمٰن کو وہیں دفن کر دیا جاتا جہاں فوت ہوا تھا۔ (سنن ترمذی: ۱۰۵۵، مصنف عبدالرزاق ۳/ ۵۱۷ ح ۶۵۳۵ وسندہ صحیح واللفظ لہ)

اس قسم کے دیگر آثار بھی ہیں۔ دیکھئے السنن الکبریٰ للبیہقی (ج ۴/ ۵۷) وغیرہ

[شہادت، جولائی ۱۹۹۹ء] [الحدیث: ۳۶]

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اور غسلِ وفات

سوال ایک تبلیغی دیوبندی خطیب سے اکثر یہ واقعہ سننے میں آیا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جب بیمار ہوئیں تو حضرت علیؓ کہیں کام کے لئے گئے ہوئے تھے تو حضرت فاطمہؓ نے اپنی خادمہ کو فرمایا کہ میرے لئے غسل کا پانی اور کپڑے رکھو انہوں نے پانی رکھا اور

حضرت فاطمہؓ نے غسل فرمایا۔انہوں نے کہا میرے فلاں کپڑے نکالو، انہوں نے کالے کپڑے پہنے، کہا: میری چارپائی کمرے کے بیچ میں کر دو، بیچ کمرے کے کر دی، لیٹ کر قبلے کی طرف منہ کر کے کہا: اب میں مر رہی ہوں علیؓ کو کہہ دینا میرا غسل ہو گیا ہے میرا کندھا بھی ننگا نہیں ہونا چاہیے جب حضرت علی آئے تو پیغام ملا تو کہا اسی پر عمل ہو گا تو اُسی طرح دفنا دیا گیا۔ (محمد عثمان، پنڈ دادن خان قمر)

الجواب یہ ضعیف و منکر روایت ہے۔اسے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے ''محمد ابن إسحاق عن عبيد الله بن علي بن أبي رافع عن أبيه عن أم سلمیٰ'' کی سند سے روایت کیا ہے۔

(مسند احمد ۶/۴۶۱، ۴۶۲ ح ۲۷۶۱۵، اُسد الغابۃ ج ۵ ص ۵۹۰، معرفۃ الصحابۃ لابی نعیم ۶/۳۵۰۷ ح ۷۹۴۴)

یہ سند ضعیف و منکر ہے۔محمد بن اسحاق بن یسار مدلس ہیں اور روایت عن سے ہے۔

عبیداللہ بن علی بن ابی رافع: لین الحدیث (ضعیف) ہے۔ (التقریب: ۴۳۲۲)

علی بن ابی رافع کی توثیق مجھے معلوم نہیں ہے۔

یہی روایت ابن سعد (الطبقات ۸/۲۷) عمر بن شبہ (تاریخ المدینہ ۱/۱۰۸، ۱۰۹)

ابن شاہین (۶۳۶) اور ابن الجوزی (العلل المتناہیہ: ۴۱۹، الموضوعات ۳/۲۷۷) نے ''محمد بن إسحاق عن عبيدالله (عبدالله) [علي] بن علي (فلان) بن أبي رافع عن أبيه عن أمه سلمیٰ'' کی سند سے روایت کی ہے۔

اس سند میں بھی محمد بن اسحاق مدلس اور ابن علی بن ابی رافع ضعیف ہے۔ابن الجوزی نے کہا: ''هذا حديث لا يصح'' یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ذہبی نے کہا: ''هذا منكر'' یہ منکر (روایت) ہے۔ (سیر اعلام النبلاء ۲/۱۲۹، نیز دیکھئے مجمع الزوائد ۹/۲۱۱)

مصنف عبدالرزاق (۳/۴۱۱ ح ۶۱۲۶ دوسرا نسخہ: ۶۱۵۲) الآحاد والمثانی لابن ابی عاصم (۵/۳۵۶ ح ۲۹۴۰) المعجم الکبیر للطبرانی (۲۲/۳۹۹ ح ۹۹۶) اور حلیۃ الاولیاء لابی نعیم الاصبہانی (۲/۴۳) میں اس قصے کی تائید والا قصہ عبداللہ بن محمد بن عقیل سے مروی ہے۔

یہ قصہ دو وجہ سے ضعیف ہے:

① عبداللہ بن محمد بن عقیل (قولِ راجح میں) جمہور محدثین کے نزدیک ضعیف ہے۔

② عبداللہ بن محمد بن عقیل نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا زمانہ نہیں پایا لہٰذا یہ سند منقطع ہے۔

دیکھئے مجمع الزوائد للہیثمی (۲۱۱/۹) ونصب الرایہ (۲۵۱/۲ وقال: ''بسند ضعیف و منقطع'')

تنبیہ: مصنف عبدالرزاق اور الآحاد والمثانی میں عبدالرزاق کا استاد محمد بن راشد لکھا ہوا ہے جبکہ باقی کتابوں میں معمر (بن راشد) ہے۔ نصب الرایہ (۲۵۱/۲) میں بھی معمر ہی ہے۔

محمد بن راشد المکحولی اور معمر بن راشد دونوں عبدالرزاق کے استاد اور ابن عقیل کے شاگرد ہیں۔

حافظ ابن کثیر نے کہا: ''وما روي من أنها اغتسلت قبل وفاتها وأوصت أن لا تغسل بعد ذلك فضعيف لا يعول عليه ، والله أعلم'' اور جو روایت کیا گیا ہے کہ انھوں (سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا) نے اپنی وفات سے پہلے غسل کیا اور یہ وصیت کی کہ اس کے بعد انھیں غسل نہ دیا جائے تو یہ ضعیف ہے، اس پر اعتماد نہیں کیا جاتا۔ واللہ اعلم

(البدایہ والنہایہ ۳۳۸/۶)

خلاصۃ التحقیق: یہ روایت اپنی تمام سندوں کے ساتھ ضعیف و منکر ہے لہٰذا مردود ہے۔

اس کے مقابلے میں محمد بن موسیٰ (بن ابی عبداللہ الفطری ابو عبداللہ المدنی) نے کہا: فاطمہ (رضی اللہ عنہا) کو علی (رضی اللہ عنہ) نے غسل دیا تھا۔ (طبقات ابن سعد ۲۸/۸ و تاریخ المدینہ ۱۰۹/۱)

اس روایت کی سند محمد بن موسیٰ (صدوق) تک صحیح ہے لیکن منقطع ہونے کی وجہ سے یہ بھی ضعیف ہے۔ اس قسم کی ایک ضعیف روایت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے۔

دیکھئے المستدرک للحاکم (۱۶۳/۳، ۱۶۴ ح ۴۷۶۹) حلیۃ الاولیاء (۴۳/۲) السنن الکبریٰ للبیہقی (۳۹۶/۳) تاریخ المدینہ (۱۰۹/۱) اور التلخیص الحبیر (۱۴۳/۲ ح ۷۰۹ وقال: واسنادہ حسن)

بعض علماء کا سیدہ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا والی روایت کو حسن قرار دینا محلِ نظر ہے۔

(۲۷/ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ) [الحدیث: ۲۸]

نبی ﷺ کے غسل کے بارے میں ایک روایت کی تحقیق

سوال درج ذیل روایت کی تحقیق درکار ہے:

جب رسول اللہ ﷺ کو غسل دیا گیا تو پانی آپ کی آنکھوں کے گڑھوں پر بلند ہو گیا۔ علی رضی اللہ عنہ نے اسے پی لیا تو انہیں اولین اور آخرین کا علم دے دیا گیا۔ (کلیم حسین شاہ، راولپنڈی)

الجواب یہ روایت بے سند و بے اصل ہے۔ اسے عبدالحق دہلوی نے اپنی کتاب "مدارج النبوۃ" میں "روایت کیا گیا ہے کہ" کے الفاظ سے بے سند و بے حوالہ لکھا ہے۔

(جلد دوم ص ۵۹۶، اردو مترجم، مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ، ۴۰ اردو بازار لاہور)

مشہور صوفی احمد بن محمد القسطلانی (متوفی ۹۲۳ھ) لکھتے ہیں:

"وذكر ابن الجوزي أنه روى عن جعفر بن محمد قال: كان الماء يستنقع في جفون النبي ﷺ فكان علي يحسوه، وأما ماروي أن علياً لما غسله ﷺ امتص ماء محاجر عينيه فشربه وأنه قدورث بذلك علم الأولين والآخرين، فقال النووي: ليس بصحيح"

ابن جوزی نے ذکر کیا ہے کہ جعفر بن محمد سے روایت کی گئی ہے کہ نبی ﷺ کی پلکوں پر پانی جمع ہو جاتا تھا تو علی (رضی اللہ عنہ) اسے پی لیتے تھے۔ اور یہ جو روایت کی گئی ہے کہ جب علی (رضی اللہ عنہ) نے آپ ﷺ کو غسل دیا تو آپ کی پلکوں کا پانی چوس کر پی لیا۔ اس وجہ سے انھیں اولین و آخرین کا علم دیا گیا، پس نووی نے کہا: یہ صحیح نہیں ہے۔

(المواهب اللدنية بالمنح المحمدية ج ۳ ص ۳۹۶)

یہ دونوں روایتیں بالکل بے اصل اور من گھڑت ہیں۔ جعفر بن محمد الصادق رحمہ اللہ کی طرف منسوب روایت کہیں بھی با سند نہیں ملی۔ جو لوگ رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ بولنے سے نہیں شرماتے وہ جعفر صادق پر جھوٹ بولنے سے کس طرح شرما سکتے ہیں۔ ابن جوزی کی اصل کتاب دیکھنی چاہیے تاکہ یہ معلوم ہو کہ اگر ابن جوزی نے یہ بے سند روایت بیان کی ہے تو اس پر کیا جرح کی ہے؟

خلاصۃ التحقیق: خط کی مسئولہ روایت موضوع، بے اصل و بے سند ہے۔

وما علینا إلا البلاغ [الحدیث:٢١]

جنازے کے ساتھ ذکر بالجہر؟

سوال جنازہ کے پیچھے آواز بلند کرنا اس کی ممانعت میں احادیث وآثار وارد ہوئے ہیں یا صحابہ کرام کا ناپسندیدگی کا اظہار کرنا؟ صحیح وضعیف دلائل بیان فرمادیں تاکہ لوگوں کو سمجھانے میں آسانی رہے، یہ بھی الحدیث میں شائع کردیں۔

(محمد رمضان سلفی خطیب جامع بیت المکرّم اہلحدیث، عارف والا)

الجواب جنازے کے ساتھ بلند آواز سے ذکر کرنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آثارِ سلف صالحین سے ثابت نہیں ہے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ آتے جاتے وقت جب نبی ﷺ جنازے کے پیچھے چلتے تو آپ سے لا الہ الا اللہ کے علاوہ کچھ بھی نہیں سُنا جاتا تھا۔ (الکامل لابن عدی ١/٢٦٩، ٤/١٦٠٧، ١٦٠٨ ونصب الرایہ ٢/٢٩٢ وجاء الحق/ مفتی احمد یار نعیمی بریلوی، طبع قدیم ج ٣ ص ٤٠٤)

اس روایت کا راوی ابراہیم بن احمد بن عبدالکریم عرف ابن ابی حمید الحرانی الضریر جھوٹا تھا۔ ''کان یضع الحدیث'' وہ حدیثیں گھڑتا تھا۔ (الکامل لابن عدی ١/٢٦٩ لسان المیزان ١/٢٨)

نتیجہ: یہ سند موضوع ہے۔

ایک دوسری روایت میں آیا ہے: ''أکثروا فی الجنازۃ قول: لا إلہ إلا اللّٰہ'' جنازہ میں کثرت سے لا الہ الا اللہ کہو۔

(الدیلمی ١/٣٢١ بحوالہ سلسلۃ الضعیفۃ والموضوعۃ للالبانی ٦/١٤ ح ٢٨٨١)

اس میں عبداللہ بن محمد بن وہب، یحییٰ بن محمد بن صالح اور خالد بن مسلم القرشی نامعلوم راوی ہیں۔

نتیجہ: یہ روایت موضوع وبے اصل ہے۔ وما علینا إلا البلاغ (١٢/ رجب ١٤٢٦ھ)

[الحدیث:١٩]

قبرستان جانے کے مقاصد

سوال میں احمد خان پھلاڈیوں صوبہ سندھ سے لکھ رہا ہوں۔ایک مسئلہ ہے کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اہلحدیث حضرات جب قل ختم چہلم وغیرہ کو نہیں مانتے تو قبرستان جا کر کیا کرتے ہیں؟ مطلب ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا قبرستان جا کر کیا معمول تھا؟ قرآن پڑھنا بھی قبرستان پر منع ہے؟ لوگ کہتے ہیں کہ آپ مردہ کو قرآن پڑھ کر بخشنے کے بھی خلاف ہیں؟ اس مسئلہ پر ایک سیر حاصل بحث بحوالہ کتاب وسنت لکھ کر درج ذیل پتہ پر بھیج دیں۔

(احمد خان مری بلوچ سندھ)

الجواب قبرستان جانے کے کئی مقاصد ہیں:

1. نبی کریم ﷺ کی سنت ہے۔آپ ﷺ قبرستان جا کر مُردوں کے لئے دعائیں کرتے تھے۔سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

"حتی جاء البقیع فقام،فأطال القیام ،ثم رفع یدیه ثلاث مرات،ثم انحرف فانحرفت..."

حتی کہ آپ (ﷺ) بقیع (مدینہ کے قبرستان) پہنچ کر کھڑے ہوگئے ،آپ (کافی) لمبی دیر کھڑے رہے۔پھر آپ نے تین دفعہ (دعا کے لئے) ہاتھ اُٹھائے۔ پھر آپ (ﷺ) واپس لوٹے تو میں (بھی) واپس لوٹی....

(صحیح مسلم، کتاب الجنائز باب مایقال عند دخول القبور والدعا لأہلہا ح ۱۰۳/۹۷۴ وترقیم دارالسلام:۲۲۵۶)

پھر آپ ﷺ نے اپنی زوجہ طیبہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو بتایا کہ جبریل (علیہ السلام) نے آکر مجھے کہا: آپ کا رب آپ کو حکم دیتا ہے کہ بقیع والوں (کی قبروں) کے پاس جا کر اُن کے لئے (دعائے) استغفار کرو۔ (مسلم:۹۷۴ حوالہ مذکورہ)

عبداللہ بن ابی ملیکہ (ثقہ فقیہ تابعی) سے روایت ہے:

" أن عائشة أقبلت ذات یوم من المقابر،فقلت لها:یا أم المؤمنین! من أین أقبلت ؟قالت :من قبر أخي عبد الرحمٰن بن أبي بكر ،فقلت

لها: أليس كان رسول الله ﷺ نهى عن زيارة القبور؟ قالت: نعم كان نهى ثم أمر بزيارتها"

بے شک ایک دن (سیدہ) عائشہ (رضی اللہ عنہا) قبرستان سے آئیں تو میں نے ان سے پوچھا: اے ام المومنین! آپ کہاں سے آئی ہیں؟ انھوں نے فرمایا: اپنے بھائی عبدالرحمٰن بن ابی بکر (رضی اللہ عنہ) کی قبر سے۔ میں نے انھیں کہا: کیا رسول اللہ ﷺ نے قبروں کی زیارت سے منع نہیں کیا تھا؟ انھوں نے فرمایا: جی ہاں! آپ نے منع کیا تھا پھر زیارت (کی رخصت) کا حکم دے دیا تھا۔

(المستدرک للحاکم ۱/۳۷۶ ح ۱۳۹۲، والبیہقی ۴/۷۸ وسندہ صحیح، وصححہ الذہبی والبوصیری وغیرہما، دیکھئے احکام الجنائز للالبانی ص ۱۸۱)

اس حدیث سے دو مسئلے ثابت ہوئے:

اول: قبروں کی زیارت سے منع والا حکم منسوخ ہے۔

دوم: عورتوں کے لئے جائز ہے کہ وہ کبھی کبھار اپنے قریبی رشتہ داروں کی قبروں کی زیارت کرلیں۔ صحیح بخاری (۱۲۸۳) کی ایک حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی ﷺ نے ایک عورت کو (اپنے بچے کی) قبر کے پاس روتے دیکھا تو صبر کی نصیحت کی [مگر آپ نے اسے قبر پر آنے سے منع نہیں کیا]۔ دیکھئے فتح الباری (ج ۳ ص ۱۴۸)

تنبیہ (۱): عورتوں کا کثرت سے قبروں کی زیارت کرنا ممنوع ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

"أن رسول الله ﷺ لعن زوارات القبور" بے شک رسول اللہ ﷺ نے قبروں کی بہت زیادہ زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت بھیجی ہے۔

(سنن الترمذی، کتاب الجنائز باب ماجاء فی کراهية زيارة القبور للنساء ح ۱۰۵۶ وقال: "هذا حديث حسن صحيح" وصححہ ابن حبان، الاحسان: ۳۱۷۸ وسندہ حسن)

تنبیہ (۲): عورتوں کا غیر لوگوں کی قبروں کی زیارت کرنا ممنوع ہے۔ سنن ابی داود کی

ایک حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی ﷺ نے (اپنی امت کو سمجھانے کے لئے) اپنی پیاری بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: اگر تو کُدی (قبرستان) تک چلی جاتی تو... پھر آپ نے سخت الفاظ بیان فرمائے۔

(ح ۳۱۲۳ وسندہ حسن، وصححہ الحاکم علی شرط الشیخین ۱/۳۷۴،۳۷۳ ووافقہ الذہبی (!) وحسنہ المنذری والہیثمی)

اس حدیث کے راوی ربیعہ بن سیف جمہور محدثین کے نزدیک ثقہ وصدوق ہیں۔

(دیکھئے نیل المقصود قلمی ۲/۱۴۷ ح ۳۱۲۳ وعمدۃ المساعی فی تحقیق سنن النسائی قلمی ۱/۱۸۸ ح ۱۸۸۱)

اس شدید وعید والی حدیث سے ثابت ہے کہ عورتوں کے لئے غیر مردوں کی قبروں پر جانا ممنوع ہے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ((فزوروا القبور فإنها تذكركم الموت)) پس قبروں کی زیارت کرو کیونکہ یہ (زیارت) تمھیں موت یاد دلائے گی۔

(ح ۱۰۸/۹۷۶ ودارالسلام: ۲۲۵۹)

سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((ونهيتكم عن زيارة القبور فمن أراد أن يزور فليزر ولا تقولوا هجرًا))

اور میں نے تمھیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا، پس جو شخص زیارت کرنا چاہے تو کر لے اور (وہاں) باطل باتیں نہ کہنا۔

(سنن النسائی ۴/۸۹ ح ۲۰۳۵ والسنن الکبری للنسائی: ۲۱۶۰ وإسنادہ صحیح / عمدۃ المساعی ۱/۲۰۳)

2 قبرستان میں جانے سے موت اور آخرت کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ انسان نصیحت وعبرت حاصل کرتا ہے جیسا کہ ابھی گزر چکا ہے۔

3 قبرستان میں جا کر مسلمان مُردوں کے لئے دعائے استغفار کی جاتی ہے۔

نبی ﷺ (بعض اوقات) رات کے آخری پہر مدینے کے قبرستان بقیع غرقد جا کر یہ دعا فرماتے: ((اللّٰهم اغفر لأهل بقيع الغرقد))

اے اللہ بقیع غرقد والوں کو بخش دے۔ (صحیح مسلم ۱۰۲/۹۷۴ ودارالسلام: ۲۲۵۵)

تفصیلی دلائل کے لئے شیخ البانی رحمہ اللہ کی ''کتاب الجنائز'' وغیرہ دیکھ لیں۔
مختصراً عرض ہے کہ اہلِ سنت یعنی اہلِ حدیث قبرستان جا کر مُردوں کے لئے دعا کرتے ہیں اور آخرت وموت کو یاد کرتے ہیں۔ اس طرح نبی کریم ﷺ کی سنت مبارکہ پر عمل بھی ہو جاتا ہے۔

اہلِ حدیث لوگ قبروں پر جا کر باطل (کتاب وسنت کے مخالف) اعمال نہیں کرتے اور نہ باطل باتیں کرتے ہیں۔ قبروں پر جا کر مُردوں سے دعائیں کرنا، انھیں اللہ کے سامنے بطور وسیلہ پیش کرنا، شرکیہ وبدعیہ حرکات کرنا، چادریں چڑھانا، قل اور چہلم کرنا، قرآن مجید پڑھ کر اس کا ثواب مُردوں کو بخشنا، وغیرہ کاموں کا کوئی ثبوت قرآن وحدیث واجماع اور آثار سلف صالحین سے نہیں ملتا لہٰذا یہ سب اعمال باطل ہیں اور اہل حدیث ان سے مکمل طور پر اجتناب کرتے ہیں۔

قبروں پر جو شرکیہ اعمال اور منافی کتاب وسنت حرکات ہو رہی ہیں آپ خود جا کر ان کا نظارہ کر سکتے ہیں تا کہ ان لوگوں کا بذاتِ خود رد کر سکیں۔ ان قبر پرستوں کی قبر پرستی پر ''أصل عبادة الأوثان'' بتوں کی عبادت کی اصل، کا باب باندھ کر علامہ جلال الدین السیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) لکھتے ہیں:

''ولهذا تجد أقوامًا كثيرةً من الضالين يتضرعون عند قبر الصالحين و يخشعون ويتذللون ويعبدونهم بقلوبهم عبادة لا يفعلونها في بيوت اللّٰه المساجد، بل ولا في الأسحار بين يدي اللّٰه تعالىٰ ويرجون من الصلوة عندها والدعاء ما لا يرجونه في المساجد التي تشد إليها الرحال''

اور اس لئے آپ دیکھتے ہیں کہ بہت سے گمراہ لوگ نیک لوگوں کی قبروں کے پاس گڑگڑاتے، خشوع اور عاجزی کرتے (ہوئے مانگتے) ہیں۔ اور اپنے دلوں سے ان (مُردوں) کی ایسی عبادت کرتے ہیں جو اللہ کے (مقرر کردہ) گھروں: مسجدوں میں (اللہ کی عبادت) نہیں کرتے۔ بلکہ سحری کے وقت اللہ کے سامنے

کھڑے ہو کر ایسی عبادت نہیں کرتے، یہ لوگ قبروں کے پاس نماز و دعاء سے ایسی امیدیں رکھتے ہیں جو وہ مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ میں بھی نہیں رکھتے۔

(الامر بالا تباع والنہی عن الابتداع ص ۶۳)

یہاں یہ بات بھی یاد رہے کہ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ کے علاوہ کسی مسجد یا جگہ کی طرف خاص ثواب و برکت کے لئے سفر کرنا ثابت نہیں ہے۔ دیکھئے صحیح البخاری (۱۱۸۹) وصحیح مسلم (۱۳۹۷)

ایک دفعہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کوہِ طور پر تشریف لے گئے تو سیدنا بصرہ بن ابی بصرہ الغفاری رضی اللہ عنہ نے انھیں فرمایا: اگر مجھے آپ کے جانے سے پہلے پتا چل جاتا تو آپ نہ جاتے، پھر انھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سنائی۔

دیکھئے موطأ امام مالک (ج ۱ص ۱۰۹ ح ۲۳۹ وسندہ صحیح)

اسے ابن حبان (موارد الظمآن: ۱۰۲۴) نے صحیح کہا ہے اور یہ روایت اپنے بعض متن کے ساتھ مختصر اسنن ابی داود (۱۰۴۶) وسنن الترمذی (۴۹۱ وقال: حسن صحیح) وصحیح ابن خزیمہ (۱۷۳۸) اور المستدرک للحاکم (۱/۲۷۸، ۲۷۹ وصححہ علی شرط الشیخین ووافقہ الذہبی) میں موجود ہے۔

معلوم ہوا کہ کوہِ طور پر ثواب حاصل کرنے کے لئے سفر کر کے جانا جائز نہیں ہے تو قبروں کی طرف سفر کر کے جانا بھی جائز نہیں ہے۔ اسی لئے شاہ ولی اللہ الدھلوی الحنفی (متوفی ۱۱۷۶ھ) لکھتے ہیں:

" والحق عندي أن القبر ومحل عبادة ولي من أولياء الله والطور كل ذلك سواء في النهي، والله أعلم "

اور میرے نزدیک حق یہ ہے کہ بے شک قبر، اللہ کے ولیوں میں سے کسی ولی کی عبادت گاہ اور کوہِ طور ممانعت میں سب برابر ہیں۔ واللہ اعلم

(حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ص ۱۹۲ من ابواب الصلوٰۃ / المساجد)

آپ ان لوگوں سے کہہ دیں کہ رسم قل، ملاجی کا ختم شریف اور چہلم وغیرہ اعمال کا

کوئی ثبوت قرآن وحدیث میں نہیں ہے۔قرآن پڑھ کر مُردوں کو بخش دینا بھی کسی دلیل سے ثابت نہیں ہے جبکہ آیت: ﴿وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى﴾
انسان کو وہی ملے گا جس کی وہ کوشش کرے (سورۃ النجم:۳۹) سے ثابت ہے کہ قرآن مجید کا ثواب مُردوں کو نہیں پہنچتا۔

حافظ ابن کثیر الدمشقی (متوفی ۷۷۴ھ) لکھتے ہیں:" ومن هذه الآية الكريمة استنبط الشافعي رحمه الله ومن اتبعه أن القراءة لا يصل اهداء ثوابها إلى الموتى لأنه ليس من عملهم ولا كسبهم ولهذا لم يندب إليه رسول الله ﷺ أمته ولا حثهم عليه ولا أرشدهم إليه بنص ولا إيماء ولم ينقل ذلك عن أحد من الصحابة رضي الله عنهم ولو كان خيرًا لسبقونا إليه ..."
اس آیت کریمہ سے (امام) شافعی رحمہ اللہ اور ان کے متبعین نے یہ (مسئلہ) استنباط کیا ہے کہ قراءت کا ثواب مُردوں کو بخشنے سے نہیں پہنچتا کیونکہ یہ ان کے اعمال اور کمائی سے نہیں ہے۔اس لئے رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کو اس طرف ترغیب اور حکم نہیں دیا اور نہ کوئی صریح یا غیر صریح بات ارشاد فرمائی ہے اور نہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں کسی ایک سے یہ کام ثابت ہے۔اگر یہ کام بہتر ہوتا تو ہم سے پہلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس پر عمل کرتے۔

(تفسیر ابن کثیر بتحقیق عبدالرزاق المہدی ج ۶ ص ۳۸، سورۃ النجم:۳۹)

امید ہے کہ اب آپ یہ مسئلہ سمجھ گئے ہوں گے۔ان شاء اللہ (۹/ربیع الاول ۱۴۲۶ھ)

[الحدیث:۱۴]

قبر کے سرہانے آگ جلانا منع ہے

سوال جب میّت کو دفن کر کے آتے ہیں تو رات کو اس کی قبر کے سرہانے آگ جلاتے ہیں۔کیا یہ آگ جلانا جائز ہے؟ (حاجی نذیر خان، دامان حضرو)

الجواب دن کو میّت دفن کر کے رات کو اس کی قبر کے سرہانے آگ جلانا کسی دلیل سے ثابت نہیں لہٰذا ایسا کرنا بدعت ہے۔مشہور ثقہ تابعی امام سعید بن ابی سعید المقبری رحمہ

اللہ سے روایت ہے کہ (سیدنا) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات کے بعد آگ لے جانے سے منع فرمایا تھا۔ (موطأ امام مالک ۱/۲۲۶ ح ۵۳۲ وسندہ صحیح)

یعنی سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اپنے رشتہ داروں اور متعلقین کو وصیت فرمائی تھی کہ میرے مرنے کے بعد میرے ساتھ آگ لے کر نہ جانا۔ [الحدیث:۶۱]

پکی قبریں بنانا منع ہے

سوال ہمارے علاقے میں تقریباً ہر قبر پکی ہے۔ کیا قبر پکی کرنے کی کوئی دلیل ہے؟ (حاجی نذیر خان، دامان حضرو)

الجواب قبر پکی (پختہ) کرنے کی کوئی دلیل بھی شریعت میں موجود نہیں بلکہ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ ((نهى رسول الله ﷺ أن يجصص القبر و أن يقعد عليه و أن يبنى عليه)) رسول اللہ ﷺ نے قبر پکی کرنے سے، اس پر بیٹھنے سے اور اس پر عمارت بنانے سے منع فرمایا۔ (صحیح مسلم: ۹۷۰، ترقیم دارالسلام: ۲۲۴۵)

امام شافعی اور جمہور علماء کا یہی مسلک ہے کہ قبر پکی کرنا مکروہ (حرام) ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے شرح صحیح مسلم للنووی (ج ۱ ص ۳۱۲ درسی نسخہ) الموسوعۃ الفقہیہ (ج ۳۲ ص ۲۵۰) اور ''بدعات کا شرعی پوسٹ مارٹم'' ص ۴۳۶ [الحدیث:۶۱]

نمازِ جنازہ جہراً یا سراً؟

سوال نمازِ جنازہ (الف) امام با آواز بلند پڑھے (قراءۃ، درود، دعائیں) یا آہستہ پڑھے، مسنون کیا ہے؟

(ب) شہداء کی غائبانہ نمازِ جنازہ بااہتمام پڑھنا شرعاً کیسا ہے؟

(ج) نمازِ جنازہ کے موقع پر طاق صفیں بنانا ضروری ہے یا مستحب؟

(د) عورت اور غیر شادی شدہ کی میت پر دعا (نماز جنازہ) میں الفاظ ''و زوجا خيرا من زوجه'' کو ترک کرنا شرعاً کیسا ہے؟ (محمد صدیق سلفی، ضلع ایبٹ آباد)

الجواب (الف) امام نمازِ جنازہ بلند آواز سے پڑھے یا آہستہ دونوں طرح جائز ہے۔ بلند آواز سے پڑھنے کی دلیل کے لئے دیکھئے سنن النسائی کتاب الجنائز باب الدعاء (ج۴ص۷۵،۷۶ح۱۹۹۱،۱۹۹۲، وھو حدیث صحیح)

(ب) شہداء کی نمازِ جنازہ نہ پڑھنا بھی ثابت ہے۔ دیکھئے صحیح البخاری (کتاب الجنائز الصلوٰۃ علی الشھید، حدیث نمبر ۱۳۴۳) اور پڑھنا بھی ثابت ہے۔ (صحیح بخاری حدیث نمبر ۱۳۴۴) رہا با اہتمام پڑھنا تو یہ میرے نزدیک ثابت نہیں ہے۔ واللہ اعلم

(ج) نمازِ جنازہ کے موقع پر طاق صفیں بنانا، نہ ضروری ہے اور نہ مستحب۔ صحیح مسلم (کتاب الجنائز باب فی التکبیر علی الجنازۃ ح ۹۵۲) میں ہے کہ جابر بن عبداللہ الانصاری رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "فصفّنا صفّین" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (جنازہ میں) ہماری دو صفیں بنائی تھیں۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ صفیں طاق ہوں یا جفت دونوں طرح جائز ہے۔

(د) عورت کے لئے اگر ضمائر کو نہ بدلا جائے تو "ہ" سے مراد "المیت" ہو جائے گا۔ اگر ضمائر بدل لی جائیں تو عورت ہی مراد ہو گی۔

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ﴾ (سورۂ ابراہیم: ۴) سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ زبان کا اعتبار ہوتا ہے۔

(ر) "وزوجًا خیرًا من زوجھا" کو ترک کرنا مسنون نہیں ہے۔ بہتر یہی ہے کہ یہ دعا اسی طرح پڑھی جائے جس طرح صحیح احادیث میں وارد ہے۔ [شہادت، اکتوبر ۲۰۰۰ء]

سوال نمازِ جنازہ میں امام سورۂ فاتحہ اور دوسری سورت بلند آواز سے پڑھے گا یا سری؟ (محمد شاہد میمن)

الجواب اگر سارے لوگ سورۂ فاتحہ پڑھنے والے ہوں تو سراً پڑھنا افضل ہے۔ بصورتِ دیگر برائے تعلیم جہراً افضل ہے۔ اس طریقے سے تمام دلائل میں تطبیق ہو جاتی ہے۔ [شہادت، جولائی ۲۰۰۱ء]

تکبیراتِ جنازہ میں رفع یدین

سوال نمازِ جنازہ میں تکبیر کے وقت رفع الیدین کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اس بارے میں البانی رحمہ اللہ کی کتاب (جنازے کے مسائل) میں ترمذی اور دارقطنی سے دو حدیثیں پیش کی گئی ہیں، جس میں پہلی تکبیر کے وقت رفع الیدین کرنے کا حکم ہے۔ اس کی مکمل تفصیل بتائیے۔ (ابوطلحہ حافظ ثناء اللہ شاہد القصوری)

الجواب نمازِ جنازہ کی تکبیروں کے وقت رفع الیدین کرنا بالکل صحیح ہے۔

امام دارقطنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''**قال أحمد بن محمد بن الجراح و ابن مخلد، قالا: ثنا [عمر] بن شبة قال: حدثنا يزيد بن هارون [قال:] أخبرنا يحي بن سعيد عن نافع عن ابن عمر: أن النبي ﷺ كان إذا صلّى علىٰ جنازة رفع يديه في كل تكبيرة و إذا انصرف سلّم.**'' سیدنا ابن عمر (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب نمازِ جنازہ پڑھتے تو ہر تکبیر کے ساتھ رفع یدین کرتے اور جب پھرتے (نماز ختم کرتے) تو سلام کہتے تھے۔ (کتاب العلل للدارقطنی ج ۱۳ ص ۲۲ ح ۲۹۰۸)

اس روایت کی سند حسن لذاتہ ہے۔ امام دارقطنی اور یحییٰ بن سعید الانصاری دونوں تدلیس کے الزام سے بری ہیں۔ دیکھئے الفتح المبین فی تحقیق طبقات المدلسین (ص ۲۶، ۳۲)

عمر بن شبہ صدوق حسن الحدیث ہیں۔ احمد بن محمد بن الجراح اور محمد بن مخلد دونوں ثقہ ہیں۔

دیکھئے تاریخ بغداد (۴/۴۰۹ ت ۲۳۱۲، ۳/۳۱۰، ۳۱۱ ت ۱۴۰۶)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نمازِ جنازہ کی ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کرتے تھے۔

(جزء رفع الیدین للبخاری بتحقیق شیخنا ابی محمد بدیع الدین الراشدی السندھی ص ۱۸۴ ح ۱۰۹۔ ۱۱۱)

اس کی سند صحیح ہے اور اسے ابن ابی شیبہ (۳/۲۹۶) اور بیہقی (۴/۴۴) وغیرہما نے بھی روایت کیا ہے۔

حافظ ابن حجر العسقلانی نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔ (التلخیص الحبیر ج ۲ ص ۱۴۶ ح ۸۰۷)

شیخ البانی رحمہ اللہ نے بھی اسے ''**بسند صحيح**'' کہا ہے۔ (حاشیہ احکام الجنائز)

جنازے کی تکبیرات میں رفع الیدین کرنا قیس بن ابی حازم رحمہ اللہ (تابعی کبیر) نافع بن جبیر رحمہ اللہ، عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ، مکحول رحمہ اللہ، وہب بن منبہ رحمہ اللہ اور الزہری رحمہ اللہ سے ثابت ہے۔ (دیکھئے جزء رفع الیدین ح ۱۱۲، ۱۱۴، ۱۱۸)

یہی قول (وعمل) عطاء بن ابی رباح، سالم بن عبداللہ بن عمر، اوزاعی، شافعی، احمد اور اسحاق بن راہویہ وغیرہم کا ہے۔ (الاوسط لابن المنذر ج ۵ ص ۴۲۷)

امام مالک رحمہ اللہ سے بھی ایک قول، تکبیرات جنائز میں رفع الیدین کرنا پسندیدہ ہے، مروی ہے۔ (ایضاً)

حافظ ابن حجر نے دارقطنی کی کتاب العلل سے ایک حدیث نقل کی ہے جس میں نبی ﷺ سے نمازِ جنازہ میں رفع الیدین کرنا مروی ہے۔ (التلخیص الحبیر ج ۲ ص ۱۴۶)

مجھے اس کی سند نہیں ملی۔ اگر عمر بن شبہ تک سند صحیح ہو تو یہ سند حسن ہے کیونکہ عمر بن شبہ بذاتِ خود صدوق حسن الحدیث راوی تھے۔

[بعد میں سند مل گئی ہے جو کہ عمر بن شبہ تک صحیح ہے لہٰذا یہ روایت حسن لذاتہ ہے۔ دیکھئے کتاب العلل للدارقطنی ۱۳/ ۲۲ ح ۲۹۰۸]

اس کے مقابلے میں شیخ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے جو دو روایتیں پیش کی ہیں ان پر مختصر و جامع تبصرہ سُن لیں۔

۱: "عن أبي هريرة أن رسول الله ﷺ كبر على جنازة فرفع يديه في أول تكبيرة ووضع اليمنى على اليسرى"

(احکام الجنائز للالبانی ص ۱۱۵ والترمذی ح ۱۰۷۷، تحقیقی وقال: "غریب"، البیہقی ۴/ ۳۸، الدارقطنی ۲/ ۷۴ ح ۱۸۱۲ مختصراً و ۱۸۱۳، وابوالشیخ فی طبقات الاصبہانیین ص ۲۶۲ بحوالہ البانی)

اس کی سند ضعیف ہے۔ اسے شیخ البانی رحمہ اللہ نے بھی "بسند ضعیف" قرار دیا ہے۔

اس کا راوی ابوفروہ یزید بن سنان التمیمی الرہاوی ضعیف ہے۔ (تقریب التہذیب ص ۵۵۸)

اس پر جرح کے لئے تہذیب التہذیب اور میزان الاعتدال وغیرہما دیکھیں۔

یحییٰ بن یعلیٰ (الاسلمی) ضعیف (تقریب التہذیب ص ۵۵۶ وتہذیب التہذیب ج ۲۳۴/۲۴) نے یہی روایت یونس بن خباب عن الزہری نقل کی ہے۔

تحفۃ الاشراف (۱۰/۱۳۱۱۷)

خلاصہ یہ کہ یہ روایت بلحاظِ سند ضعیف ہے۔

۲: ''عن ابن عباس أن رسول اللهﷺ كان يرفع يديه على الجنازة في أول تكبيرة ثم لايعود'' (سنن دارقطنی ج ۲ ص ۷۵ ح ۱۸۱۴، وقال محشیہ: ''اسنادہ ضعیف'')

ان دونوں روایتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نمازِ جنازہ کی صرف پہلی تکبیر میں ہی رفع الیدین کرتے تھے۔

دوسری سند بھی ضعیف ہے۔اس کا راوی حجاج بن نصیر ضعیف ہے۔

(تقریب التہذیب ص ۹۶، ۹۸ وزاد: کان یقبل التلقین)

دوسرا راوی الفضل بن السکن مجہول ہے، کما قال العقیلی رحمہ اللہ

شیخ البانی رحمہ اللہ بھی اسے مجہول کہتے ہیں۔(احکام الجنائز ص ۱۱۶)

یہ راوی مجہول العین ہے اور مجہول العین راوی کی روایت سخت ضعیف بلکہ بعض اوقات موضوع بھی ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ یہ روایت اپنی دونوں (یا تینوں) سندوں کے ساتھ ضعیف ہی ہے لہٰذا مردود ہے۔ [شہادت، نومبر ۲۰۰۱ء]

سوال کیا نماز جنازہ کی تکبیرات میں رفع الیدین کا ثبوت احادیثِ صحیحہ میں ملتا ہے؟ (حافظ شاہد محمود، مدینہ منورہ)

الجواب امام دارقطنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''قال أحمد بن محمد بن الجراح وابن مخلد، قالا: ثنا [عمر] بن شبة قال: حدثنا يزيد بن هارون [قال:] أخبرنا يحي بن سعيد عن نافع عن ابن عمر: أن النبيﷺ كان إذا صلّى على جنازة رفع يديه في كل تكبيرة و إذا انصرف سلّم.'' سیدنا ابن

عمر (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب نماز جنازہ پڑھتے تو ہر تکبیر کے ساتھ رفع یدین کرتے اور جب پھرتے (نماز ختم کرتے) تو سلام کہتے تھے۔ (کتاب العلل للدارقطنی ج ۱۳ ص ۲۲ ح ۲۹۰۸)

اس روایت کی سند حسن لذاتہ ہے۔ امام دارقطنی اور یحییٰ بن سعید الانصاری دونوں تدلیس کے الزام سے بری ہیں۔ دیکھئے الفتح المبین فی تحقیق طبقات المدلسین (ص ۲۶، ۳۲)

عمر بن شبہ صدوق حسن الحدیث ہیں۔ احمد بن محمد بن الجراح اور محمد بن مخلد دونوں ثقہ ہیں۔ دیکھئے تاریخ بغداد (۴/۴۰۹ ت ۲۳۱۲، ۳/۳۱۰، ۳۱۱ ت ۱۴۰۶)

سیدنا عبداللہ بن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ وہ جنازے کی ہر تکبیر پر رفع الیدین کرتے تھے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ۳/۲۹۶ ح ۱۱۳۸۰، جزء رفع الیدین للبخاری بتحقیق شیخنا الامام ابی محمد بدیع الدین شاہ الراشدی السندھی رحمہ اللہ ح ۱۱۰، والبیہقی ۴/۴۴ وسندہ صحیح)

کسی صحابی سے جنازے کی تکبیرات پر ترک رفع الیدین ثابت نہیں ہے۔ لہٰذا راجح یہی ہے کہ نماز جنازہ کی ہر تکبیر پر رفع الیدین کرنا چاہیے۔ یاد رہے کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اتباع سنت میں بہت احتیاط کرتے تھے۔ [شہادت، فروری ۲۰۰۲]

عورتوں کا نمازِ جنازہ پڑھنا

سوال عورتوں کا باپردہ نماز جنازہ پڑھنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ یاد رہے کہ آج کل مسجد نبوی اور مسجد الحرام میں بھی عورتیں نماز جنازہ پڑھتی ہیں۔ میں نے ایک کتاب میں کافی عرصہ پہلے پڑھا تھا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے جنازہ پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کہا تھا کہ ان کا جنازہ مسجد نبوی میں ادا کرنا تاکہ ہم امہات المومنین جنازہ پڑھ سکیں، اس کے بارے میں تفصیل سے وضاحت فرمائیں۔ (ایک سائل)

الجواب مردوں کی طرح عورتوں کا بھی (بعض اوقات) مُردوں کی نماز جنازہ پڑھنا ثابت ہے۔ ابن ابی طلحہ کی رسول اللہ ﷺ نے نماز جنازہ پڑھی۔ آپ ﷺ کے پیچھے سیدنا ابوطلحہ رضی اللہ عنہ (صف میں) کھڑے تھے اور سیدنا ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے پیچھے دوسری (صف

میں) سیدہ ام سلیم رضی اللہ عنہا تھیں۔

(المستدرک للحاکم ج ۱ ص ۳۶۵ ح ۱۳۵۰، وسندہ حسن، السنن الکبریٰ ج ۴ ص ۳۰، ۳۱)

وقال الحاکم: "ھذا صحیح علی شرط الشیخین، وسنۃ غریبۃ في أباحۃ صلوٰۃ النساء علی الجنائز" یہ حدیث، بخاری ومسلم کی (قائم کردہ) شرط پر صحیح ہے اور اوپری (عجیب وغریب) سنت (حدیث) ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں بھی نماز جنازہ پڑھ سکتی ہیں۔

وقال الہیثمی فی مجمع الزوائد: "رواہ الطبرانی فی الکبیر ورجالہ رجال الصحیح" (۳۴/۳)

[شہادت، جولائی ۲۰۰۰ء]

[تنبیہ: سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ والی حدیث صحیح مسلم (کتاب الجنائز باب الصلوٰۃ علی الجنازہ فی المسجد ح ۹۷۳، ترقیم دارالسلام: ۲۲۵۲) میں موجود ہے۔]

یاد رہے کہ عورتوں کو جنازے کے ساتھ جانے سے منع کیا گیا ہے مگر یہ ممانعت تحریمی نہیں ہے لہٰذا عورتوں کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ عام جنازے نہ پڑھیں لیکن حرمین (بیت اللہ اور مسجدِ نبوی) میں یا خاص مواقع پر وہ نمازِ جنازہ پڑھ سکتی ہیں۔

غائبانہ نمازِ جنازہ کا حکم؟

سوال غائبانہ نمازِ جنازہ کا کیا حکم ہے؟ یہ کن حالات میں پڑھا جائے گا؟

(ایک سائل)

الجواب نجاشی رضی اللہ عنہ اور شہدائے اُحد کا غائبانہ نمازِ جنازہ ثابت ہے۔

(دیکھئے صحیح بخاری: ۱۳۱۷، وصحیح مسلم: ۹۵۲)

حسب ضرورت غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھنا جائز ہے۔ اسے معمول نہیں بنانا چاہئے جیسا کہ دیگر نصوص سے واضح ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

[شہادت، جنوری ۲۰۰۰ء]

سوال کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہدائے احد کا جنازہ پڑھا تھا؟ (ایک سائل)

الجواب رسول اللہ ﷺ نے شہدائے اُحد کی نمازِ جنازہ ان کے دفن سے پہلے بھی پڑھی تھی۔ دیکھئے شرح معانی الآثار للطحاوی (ج ۱ ص ۵۰۳، باب الصلوٰۃ علی الشہداء وسندہ حسن، ابن اسحاق حسن الحدیث فی الاحکام والعقائد وغیرہا وصرح بالسماع)

اور دفن کے تقریباً آٹھ سال بعد بھی پڑھی تھی۔ (صحیح البخاری کتاب الجنائز: باب الصلوٰۃ علی الشہید ح ۱۳۴۴، وصحیح مسلم کتاب الفضائل: باب اثبات حوض نبینا ﷺ وصفاتہ ح ۲۲۹۶) [شہادت، جنوری ۲۰۰۰ء]

سوال بخاری شریف میں روایت ہے کہ (آپ ﷺ نے) شہید کی نماز جنازہ نہیں پڑھی۔ (ص ۱۷۹ جلد نمبر ۱، باب الصلوٰۃ علی الشہید)

حدیث کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں: "ولم یغسلوا ولم یصل علیھم"

[اور نہ انھیں غسل دیا گیا اور نہ ان کی نماز پڑھی گئی۔]

اس کے بعد دوسری روایت ہے کہ "خرج یومًا فصلّٰی علٰی أھل أحد صلاتہ" [الخ]

[آپ ایک دن نکلے تو آپ ﷺ نے اہلِ اُحد پر وہ نماز پڑھی جو آپ ﷺ فوت ہونے والوں پر پڑھتے تھے... الخ]

پہلی روایت میں تو واضح طور پر ہے کہ آپ ﷺ نے نماز جنازہ نہیں پڑھی اور نہ حکم دیا ہے۔ لیکن دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ ایک دن نکلے اور دعا کی اُحد والوں کے لئے، تو کیا اس لفظ (فصلّٰی) سے نماز جنازہ ثابت ہوتا ہے؟ (ایک سائل)

الجواب شہیدوں کی نماز جنازہ نہیں پڑھی، کا مطلب ہے کہ آپ ﷺ نے اُن کی شہادت کے بعد فوراً اسی دن نماز جنازہ نہیں پڑھی تھی اور جس روایتِ مذکورہ میں پڑھنا آیا ہے، اس کا مطلب ہے کہ دوسرے تیسرے دن یا آٹھ سال کے بعد جنازہ پڑھا تھا لہٰذا اس میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ [شہادت، مارچ ۲۰۰۱ء]

ایک میت کا دو مرتبہ جنازہ

سوال کیا میت پر دوبارہ جنازہ پڑھنا جائز ہے؟ (ساجد، بیاڑ، کوہستان)

الجواب شرح معانی الآثار للامام الطحاوی رحمہ اللہ میں سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما

سے روایت ہے: " أن رسول الله ﷺ أمر يوم أحد بحمزة فسجي ببردة، ثم صلّى عليه فكبر تسع تكبيرات ، ثم أتي بالقتلى يصفون ، ويصلي عليهم وعليه معهم" بے شک نبی ﷺ نے احد کے دن حکم دیا تو سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کو ایک چادر میں لپیٹا گیا۔ پھر آپ ﷺ نے ان کی نماز جنازہ پڑھی تو آپ نے نو تکبیرات کہیں۔ پھر آپ ﷺ کے پاس دوسرے شہداء لائے جاتے، انھیں صف میں رکھا جاتا تو آپ ان کی اور ان کے ساتھ سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کی بھی نماز جنازہ پڑھتے رہے۔

(ج ۱ ص ۵۰۳ باب الصلوٰۃ علی الشہداء)

اس روایت کے سارے راوی ثقہ ہیں۔ اس کی سند کے ایک بنیادی راوی محمد بن اسحاق بن یسار ہیں جو کہ مغازی کے امام تھے۔ احمد رضا خان بریلوی نے لکھا:

"ہمارے علمائے کرام قدست اسرارھم کے نزدیک بھی راجح محمد بن اسحاق کی توثیق ہی ہے۔ محقق علی الاطلاق فتح میں زیر مسئلہ یستحب تعجیل المغرب فرماتے ہیں: ابن اسحاق کی توثیق ہی واضح اور حق ہے......" الخ

(فتاویٰ رضویہ ج ۵ ص ۵۹۲، منیر العین فی حکم تقبیل الابہامین ص ۱۴۵)

زکریا صاحب تبلیغی دیوبندی نے لکھا:

"وقال في رواية البزار محمد بن إسحاق وهو مدلس وهو ثقة"

[اور کہا: بزار کی روایت میں محمد بن اسحاق ہیں اور وہ ثقہ مدلس ہیں۔] (تبلیغی نصاب ص ۵۹۵)

زیلعی حنفی نے کہا: "وابن إسحاق الأكثر على توثيقه، وممن وثقه البخاري" اور اکثر نے ابن اسحاق کو ثقہ قرار دیا ہے اور آپ کی توثیق کرنے والوں میں سے امام بخاری بھی تھے۔ (نصب الرایہ ۴/۷)

عینی حنفی نے کہا: "وتعليل ابن الجوزي بابن إسحاق ليس بشيء لأن ابن إسحاق من الثقات الكبار عند الجمهور" ابن جوزی کا ابن اسحاق (کی اس روایت) پر جرح کرنا کچھ چیز بھی نہیں ہے کیونکہ جمہور کے نزدیک ابن اسحاق بڑے ثقہ

راویوں میں سے تھے۔ (عمدۃ القاری ج ۷ ص ۲۷۰)

محمد ادریس کاندھلوی دیوبندی نے لکھا: ''جمہور علماء نے اس کی توثیق کی ہے۔''

(سیرت المصطفیٰ ج ۱ ص ۷۶)

[جس راوی پر جرح ہو اور جمہور محدثین نے اس کی توثیق کر رکھی ہو تو ایسے راوی کی روایت حسن لذاتہ ہوتی ہے اِلا یہ کہ کسی خاص روایت میں بذریعہ تعلیلِ محدثین وہم وخطا ثابت ہو جائے تو یہ روایت مستثنیٰ ہو جائے گی اور اسی طرح خاص دلیل مثلاً خاص جرح عام دلیل مثلاً عام توثیق پر مقدم ہوتی ہے۔]

محمد بن اسحاق نے سماع کی تصریح کر رکھی ہے اور ان کی حدیث کے متعدد شواہد موجود ہیں۔ مثلاً دیکھئے سنن ابن ماجہ (۱۵۱۳) سنن دارقطنی (۱۱۸/۴ ح ۴۱۶۴) السنن الکبریٰ للبیہقی (۱۲/۴) مسند احمد (۲۶۳/۱ ح ۴) مستدرک الحاکم (ج ۲ ص ۱۱۹، ۱۲۰ ج ۳ ص ۱۹۷، ۵۹۵، ۵۹۶) سنن نسائی (ج ۴ ص ۶۰، ۶۱ ح ۱۹۵۵، کتاب الجنائز باب الصلوٰۃ علی الشہداء) اور سیرت ابن ہشام (ج ۳ ص ۱۰۲)

لہٰذا اس حسن صحیح روایت سے معلوم ہوا کہ جس میت کی نماز جنازہ ادا کی گئی ہو اس کا دوسرا جنازہ پڑھنا جائز ہے، چاہے پڑھنے والے وہی ہوں جنھوں نے پہلا جنازہ پڑھا ہو یا کوئی دوسرے ہوں۔ وما علینا إلا البلاغ [شہادت، جنوری ۲۰۰۱ء]

میت کی طرف سے صدقہ

سوال کیا کسی مرنے والے کی طرف سے صدقہ کیا جا سکتا ہے؟ جبکہ کہا جاتا ہے کہ احادیث میں جو مرحومین کی طرف سے صدقہ وخیرات کرنے کا ذکر ہے وہ کسی نہ کسی منت کی وجہ سے ہے اور چونکہ منت بھی بمنزلہ قرض کے ہے، اس لئے اس کا ادا کرنا ضروری ہے۔ جیسا کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کا اپنی والدہ کی طرف سے صدقہ کرنے والی احادیث میں منت وغیرہ کا ذکر ملتا ہے؟ (طارق علی بروہی، کراچی)

الجواب میت کی طرف سے صدقہ کا جواز صحیح احادیث سے ثابت ہے جس کی تفصیل کی

فی الحال گنجائش نہیں تاہم ایک صحیح حدیث پیشِ خدمت ہے:

رسول اللہ ﷺ نے عمرو بن العاص اور ہشام بن العاص رضی اللہ عنہما دونوں سے فرمایا:

((إنه لو كان مسلمًا فأعتقتم عنه أو تصد قتم عنه أو حججتم عنه بلغه ذلك))

اگر وہ (العاص بن وائل السہمی) مسلمان ہوتا تو اس کی طرف سے تم غلام آزاد کرتے یا صدقہ کرتے یا حج کرتے تو اسے (ثواب) پہنچتا۔ (سنن ابی داود کتاب الوصایا باب ماجاء فی وصیة الحربی یسلم... ح ۲۸۸۳، السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۶ ص ۲۷۹ وسندہ حسن)

اسے کسی منت یا وصیت وغیرہ سے مشروط کرنا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ حدیث کے الفاظ عام ہیں اور ان کے مقابلے میں ایسا کوئی صریح قرینہ نہیں جو انھیں منت یا وصیت وغیرہ سے خاص کر سکے۔ [شہادت، فروری ۲۰۰۰ء]

میت کی چارپائی قبلہ رُخ اُٹھانا

سوال میت کو اٹھا کر لے جاتے وقت چارپائی کا رُخ قبلہ کی طرف کرنا سنت ہے؟ دلائل سے بتائیں۔! (ڈاکٹر نسیم اختر، اسلام آباد)

الجواب اس کی صریح دلیل مجھے نہیں ملی۔ عام مسلمانوں کا عمل بلانکیر جاری ہے کہ میت کو لے جاتے وقت اس کا سر آگے کی طرف ہوتا ہے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ "البيت الحرام قبلتكم أحياءً وأمواتًا" یعنی بیت اللہ تمھارے زندہ اور مردہ، دونوں کا قبلہ ہے۔ دیکھئے سنن ابی داود (کتاب الوصایا، باب ماجاء فی التشدید فی اکل مال الیتیم ح ۲۸۷۵) اس کی سند ضعیف ہے۔

لیکن مسلمانوں کے درمیان یہی عمل متواتر ہے۔

نیز دیکھئے المحلی لابن حزم (ج ۵ ص ۱۷۳، مسئلہ ۶۱۵)

خلاصہ یہ کہ میت کو قبلہ رخ کرنا مستحب بالاجماع ہے۔ [شہادت، ستمبر ۲۰۰۱ء]

میت کی چارپائی قبر کی کس جانب رکھی جائے

سوال میت کی چارپائی قبر کی کس جانب رکھنی چاہیے؟ وضاحت فرمائیں۔

(ڈاکٹر نسیم اختر، اسلام آباد)

الجواب بہتر یہی ہے کہ دائیں طرف رکھیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ عام کاموں میں تیمن (دائیں طرف) کو پسند فرماتے تھے۔ واللہ اعلم

فائدہ: حارث بن عبداللہ الاعور کا جنازہ سیدنا عبداللہ بن یزید بن زید بن حصین الانصاری الخطمی رضی اللہ عنہ نے پڑھایا پھر اُسے قبر میں پاؤں والی طرف سے قبر میں داخل کیا اور فرمایا: یہ سنت میں سے ہے۔ (سنن ابی داود: ۳۲۱۱ وسندہ صحیح، السنن الکبریٰ للبیہقی ۴/۵۴، وقال: "ھذا إسنادہ صحیح وقد قال: ھذا من السنة، فصار کالمسند")

سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے بھی میت کو قبر کے پاؤں والی طرف سے اُتارنے کا حکم دیا تھا۔

(مصنف ابن ابی شیبہ ۳/۳۲۷ ح ۱۱۶۷۶، وسندہ صحیح)

مشہور ثقہ تابعی امام شعبی رحمہ اللہ نے ایک میت کو قبر کے پاؤں کی طرف سے اُتارا تھا۔

(مصنف ابن ابی شیبہ ۳/۳۲۸ ح ۱۱۶۸۴، وسندہ حسن)

اسی مسئلے کے بارے میں امام شعبی نے فرمایا: اللہ کی قسم! یہ سنت ہے۔

(ابن ابی شیبہ ۳/۳۲۸ ح ۱۱۶۸۰، وسندہ صحیح)

ابراہیم نخعی نے میت کو قبلے کی طرف سے قبر میں داخل کیا تھا۔

(ابن ابی شیبہ ۳/۳۲۸ ح ۱۱۶۹۱، وسندہ صحیح) [شہادت، ستمبر ۲۰۰۱ء]

نمازِ جنازہ میں سلام کیسے پھیریں

سوال نمازِ جنازہ میں دونوں طرف سلام پھیرنا چاہیے یا صرف ایک طرف؟

(ابو ثاقب محمد صفدر حضروی)

الجواب سنن نسائی (الصغریٰ ۴/۷۵ ح ۱۹۹۱ ترقیم التعلیقات السلفیہ) میں سیدنا ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ " السنة فی الصلوة علی الجنازة أن یقرأ في

التكبيرة الأولىٰ بأم القرآن مخافة، ثم يكبر ثلاثًا والتسليم عند الآخرة“

نمازِ جنازہ میں سنت یہ ہے کہ پہلی تکبیر میں سورۂ فاتحہ، سراً (خفیہ) پڑھے پھر تین تکبیریں کہے اور آخر میں سلام پھیر دے۔ یہ روایت صحیح ہے اور امام نسائی کی السنن الکبریٰ (ج ۱ ص ۶۴۴ ح ۲۱۱۶) میں بھی موجود ہے۔ اسے ابن الملقن نے تحفۃ المحتاج (ح ۷۸۸) اور حافظ ابن حجر نے فتح الباری (۳/۲۰۴، ۲۰۳ ح ۱۳۳۵) میں صحیح کہا ہے۔

مصنف عبدالرزاق (ج ۳ ص ۴۸۹، ۴۹۰ ح ۶۴۲۸) اور منتقی ابن الجارود (ح ۵۴۰ واللفظ لہ) میں سیدنا ابوامامہ بن سہل بن حنیف (رضی اللہ عنہ) سے اسی روایت میں آیا ہے کہ

”السنة في الصلوٰة على الجنازة أن تكبر ثم تقرأ بأم القرآن ثم تصلّي على النبي ﷺ ثم تخلص الدعاء للميت ولا تقرأ إلا في التكبيرة الأولىٰ ثم تسلّم (!) في نفسه عن يمينه“

نمازِ جنازہ میں سنت یہ ہے کہ تو تکبیر کہے پھر سورہ فاتحہ پڑھے پھر نبی ﷺ پر درود بھیجے، پھر خالصتاً میت کے لئے دعا کرے اور (فاتحہ کی) قراءت صرف پہلی تکبیر میں ہی کرے پھر اپنی دائیں طرف خفیہ سلام پھیر دے۔

اس روایت کی سند صحیح ہے۔ امام ابن شہاب الزہری نے سماع کی تصریح کر دی ہے۔ ابوامامہ اسعد بن سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ صغار صحابہ میں سے تھے، انھوں نے نبی ﷺ کو دیکھا تھا مگر سنا کچھ نہیں۔ (دیکھئے تقریب التہذیب ص ۳۹، واسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ ۱/۷۱، تجرید اسماء الصحابۃ ج ۱ ص ۰ اللذہبی اور الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ لابن حجر ج ۱ ص ۹۷، القسم الثانی)

صحابی صغیر ہو یا کبیر، اہل سنت کے راجح مسلک میں صحابہ کی مراسیل بھی صحیح و مقبول ہوتی ہیں۔ دیکھئے اختصار علوم الحدیث ابن کثیر (ص ۵۸ طبع دار السلام) تیسیر مصطلح الحدیث (ص ۷۴) اور عام کتب اصول حدیث۔

محمد عبیداللہ الاسعدی (دیوبندی) نے لکھا ہے کہ

”مرسل صحابی...... جمہور کے نزدیک مقبول ولائق احتجاج ہے“ الخ

(علوم الحدیث ص ۱۲۷ بہ نظر ثانی وتقریظ: حبیب الرحمٰن اعظمی دیوبندی)

امام ابن الجارود النیسابوری رحمہ اللہ (متوفی ۳۰۷ھ) نے منتقی ابن الجارود میں اسے روایت کر کے صحیح قرار دیا ہے۔

ایک روایت کے بارے میں اشرف علی تھانوی نے کہا: "وأورد هذا الحديث ابن الجارود في المنتقي فهو صحيح عنده" إلخ

[ابن الجارود نے منتقی میں یہ حدیث روایت کی لہٰذا یہ ان کے نزدیک صحیح ہے۔ الخ]

(بوادر النوادر ص ۱۳۵)

ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث رجال (یا رجل) من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی۔

(الاوسط لابن المنذر ج ۵ ص ۴۴۶، اثر ۳۱۸۷، السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۴ ص ۴۰ و معانی الآثار للطحاوی ۱/ ۵۰۰، المستدرک للحاکم ۱/ ۳۶۰)

اسے حاکم اور ذہبی دونوں نے صحیح کہا ہے۔

صحابی اگر "من السنة" [یہ سنت میں سے ہے] یا اس جیسے الفاظ کہے تو یہ مرفوع کے حکم میں ہوتا ہے۔ دیکھئے تیسیر مصطلح الحدیث (ص ۱۳۲) اور عام کتب اصول الحدیث

ظفر احمد تھانوی دیوبندی نے بھی محدثین (وعلماء) کے نزدیک "السنۃ" کو مرفوع حدیث کے درجہ میں داخل کیا ہے۔

دیکھئے قواعد فی علوم الحدیث (ص ۱۲۶) اور اعلاء السنن (ج ۱۹ ص ۱۲۶)

مختصر یہ ہے کہ یہ حدیث صحیح بھی ہے اور مرفوع بھی ہے۔ اس حدیث سے امام ابو بکر محمد بن ابراہیم بن المنذر النیسابوری رحمہ اللہ (متوفی ۳۱۸ھ) وغیرہ نے یہ مسئلہ ثابت کیا ہے کہ نمازِ جنازہ میں صرف دائیں طرف سلام پھیرنا چاہئے۔ دیکھئے الاوسط (ج ۵ ص ۴۴۸)

اس استدلال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ابن ابی شیبہ نے کہا: "حدثنا علي بن مسهر عن عبيد الله عن نافع عن ابن عمر أنه كان إذا صلى على الجنازة رفع يديه فكبر فإذا فرغ سلّم على يمينه واحدة" (المصنف ج ۳ ص ۳۰۷ ح ۱۱۴۹۱)

یعنی ابن عمر رضی اللہ عنہ جب نماز جنازہ پڑھتے تو رفع یدین کرتے پھر تکبیر کہتے، پھر جب (نماز

سے) فارغ ہوتے تو اپنی دائیں طرف ایک سلام پھیرتے تھے۔ (اس کی سند بالکل صحیح ہے)

یہ سلام دائیں طرف پھیرنا چاہئے۔

امام ابوحنیفہ کے استاد امام مکحول الشامی (تابعی) نے نماز جنازہ میں اپنی دائیں طرف ایک سلام پھیرا تھا۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۳ ص ۳۰۸ ح ۱۱۵۰۶ وسندہ صحیح)

ابراہیم بن یزید النخعی بھی نماز جنازہ میں ایک طرف (دائیں طرف) ایک سلام پھیرنے کے قائل تھے۔

(مصنف عبدالرزاق ج ۳ ص ۴۹۳ ح ۶۴۴۵، وابن ابی شیبہ ج ۳ ص ۳۰۷ ح ۱۱۴۹۶، وسندہ صحیح)

اس کی سند صحیح ہے۔

امام عبداللہ بن المبارک فرماتے ہیں کہ جو شخص جنازے میں دو سلام پھیرتا ہے وہ جاہل ہے جاہل ہے۔ (مسائل ابی داود ص ۱۵۴، وسندہ صحیح)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ نماز جنازہ میں صرف ایک سلام اور دائیں طرف ہی پھیرنا چاہئے۔ یہی قول اکثر اہل علم کا ہے اور عبدالرحمٰن بن مہدی، احمد بن حنبل و اسحاق بن راہویہ وغیرہم سے مروی ہے۔ دیکھئے الاوسط (ج ۵ ص ۴۴۷)

حرمین (مکہ و مدینہ) میں اسی پر عمل ہو رہا ہے۔ والحمد للہ

جو لوگ دونوں طرف سلام پھیرنے کے قائل ہیں ان کے دلائل کا مختصر جائزہ درج ذیل ہے:

”عن عبداللّٰه بن أبي أوفى .... ثم سلّم عن يمينه وعن شماله“

(السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۴ ص ۴۳)

اس روایت کی سند تین علتوں کی وجہ سے ضعیف ہے:

① اس کا راوی ابراہیم بن مسلم الہجری ضعیف ہے۔ اسے امام بخاری، امام سفیان بن عیینہ اور جمہور محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔

دیکھئے تحفۃ الاقویاء فی تحقیق کتاب الضعفاء للبخاری بتحقیقی (ترجمہ: ۱۰)

حافظ ابن حجر نے فرمایا: ”لين الحديث رفع موقوفات“ (تقریب التہذیب ص ۲۷)

یعنی وہ روایت حدیث میں کمزور تھا، اس نے موقوف روایات کو مرفوع بیان کر دیا تھا۔

② شریک بن عبداللہ القاضی کو امام دارقطنی وغیرہ نے مدلس قرار دیا ہے۔

(طبقات المدلسین لابن حجر، ۵۶، المرتبۃ الثانیہ)

اگرچہ شریک رحمہ اللہ تدلیس سے برأت کا اعلان کرتے تھے اور '' آپ کی تدلیس زیادہ نہیں ہے'' (دیکھئے التبیین لاسماء المدلسین لابن العجمی ص ۳۳ ت ۳۳)

لیکن عین ممکن ہے کہ وہ تدلیس التسویہ سے برأت کا اعلان کرتے تھے۔ رہا مسئلہ کم یا زیادہ تدلیس کا تو اس بارے میں راجح یہی ہے کہ جو شخص ساری زندگی میں صرف ایک مرتبہ بھی تدلیس کرے اس کی عن والی منفرد روایت غیر مقبول ہوتی ہے۔

امام شافعی نے فرمایا: ''ومن عرفناه دلس مرة فقد أبان لنا عورته''

ہم نے جسے ایک دفعہ تدلیس کرتے ہوئے جان لیا تو اس کی حیثیت ہمارے سامنے واضح ہو گئی۔ (الرسالۃ ص ۳۷۹ رقم ۱۰۳۳)

اور فرمایا: '' فقلنا :لا نقبل من مدلس حديثًا حتى يقول فيه حدثني أو سمعت''

ہم نے کہا: ہم کسی مدلس سے کوئی حدیث قبول نہیں کرتے الا یہ کہ وہ سماع کی تصریح کرے۔

(ایضاً ص ۳۸۰ رقم ۱۰۳۵)

نیز دیکھئے علوم الحدیث لابن الصلاح (ص ۹۹ نوع ۱۲)

③ ابراہیم بن مسلم الہجری سے یہ روایت شاگردوں کی ایک جماعت نے بیان کی ہے مگر کسی روایت میں دونوں طرف سلام پھیرنے کا ذکر نہیں۔

دیکھئے مسند احمد (۳۸۳،۳۵۶،۴) سنن ابن ماجہ (۱۵۹۲،۱۵۰۳) مسند الحمیدی بتحقیقی (۷۱۸) معانی الآثار للطحاوی (۴۹۵/۱) المستدرک للحاکم (۳۶۰)

خود شریک القاضی سے ابونعیم نے بغیر تسلیمتین کے یہ روایت بیان کی ہے۔

معانی الآثار للطحاوی طبع مکہ مکرمہ (ج ۱ ص ۴۹۵) وطبع کراچی پاکستان (ج ۱ ص ۳۳۲)

مختصر یہ کہ یہ روایت کئی علتوں کی وجہ سے ناقابل حجت ہے۔ اسے شیخ البانی رحمہ اللہ

نے بھی ضعیف قرار دیا ہے۔ (احکام الجنائز ص ۱۲۸)

تنبیہ: حافظ ابن حجر نے اتحاف المہرۃ (ج ۲ ص ۵۰۸ ح ۶۸۹۶) میں بحوالہ طحاوی بجائے شریک کے "اسرائیل" نقل کیا ہے۔ واللہ اعلم

(۲) حدیث عبداللہ بن مسعود رضي اللہ عنہ، عنہ ﷺ : التسلیم علی الجنازۃ مثل التسلیم فی الصلوٰۃ.

(السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۴ ص ۴۳ والمعجم الکبیر للطبرانی ج ۱۰ ص ۱۰۰ ح ۱۰۰۲۲)

اسے حافظ ہیثمی نے "رجالہ ثقات" مجمع الزوائد (۳/۳۴)

حافظ نووی نے "إسنادہ جید" کہا۔ (المجموع شرح المہذب ۵/۲۳۹)

شیخ البانی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔ (احکام الجنائز ص ۱۲۷ فقرہ ۸۳۰)

یہ روایت بھی تین وجہ سے ضعیف ہے:

① حماد بن ابی سلیمان آخری عمر میں اختلاط کا شکار ہو گئے تھے۔

(دیکھئے الطبقات الکبریٰ لابن سعد ج ۶ ص ۳۳۳)

اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ زید بن ابی انیسہ کا سماع حماد کے اختلاط سے پہلے کا ہے۔

حافظ ہیثمی بذاتِ خود لکھتے ہیں کہ "**ولا یقبل من حدیث حماد إلا ماروا ہ عنہ القدماء شعبۃ وسفیان الثوري والدستوائی ومن عدا ہولاء رووا عنہ بعد الإختلاط**" حماد کی صرف وہی روایت مقبول ہے جو اس سے قدیم شاگردوں: شعبہ، سفیان الثوری اور (ہشام) اور الدستوائی نے بیان کی ہے۔ ان (تینوں) کے علاوہ سب لوگوں نے اس کے اختلاط کے بعد ہی روایت کی ہے۔ مجمع الزوائد (۱/۱۱۹، ۱۲۰)

② حماد بن ابی سلیمان مدلس تھے۔ (طبقات المدلسین ۴۵، المرتبۃ الثانیہ)

اور یہ روایت معنعن ہے۔

③ ابراہیم النخعی بھی مدلس تھے۔

(ایضاً: ۳۵: المرتبۃ الثانیہ، ابکار المنن فی تنقید آثار السنن للشیخ عبدالرحمٰن المبارکپوری رحمہ اللہ ص ۲۱۴)

اور یہ روایت معنعن ہے۔

میری تحقیق میں کسی ایک صحابی یا تابعی سے (سوائے ابراہیم نخعی) باسند صحیح یا حسن نمازِ جنازہ میں دونوں طرف سلام پھیرنا ثابت نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ نمازِ جنازہ میں صرف دائیں طرف سلام پھیرنا ہی راجح ہے۔

نمازِ جنازہ میں قراءت خفیہ (سراً) بھی صحیح ہے اور جہراً بھی۔

دیکھئے سنن النسائی (ج ۴ ص ۷۴، ۷۵ ح ۱۹۸۹) ''جهر'' منتقی ابن الجارود (ح ۵۳۷)

ابن الجارود کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ امام جہراً پڑھے گا اور مقتدی سراً (ح ۵۳۶)

[شہادت، اپریل تا جون ۲۰۰۲ء]

غیر محرم کی میت کو کندھا دینا

سوال کیا اجنبی آدمی غیر محرم عورت کی میت کو کندھا دے سکتا ہے اور کیا غیر محرم کی میت کو قبر میں اتار سکتا ہوں۔ قرآن وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

(محمد عمران، رائیونڈ)

الجواب صحیح بخاری کی ایک مفصل حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: ''((هل فيكم من أحد لم يقارف الليلة ؟)) فقال أبو طلحة: أنا، قال: ((فانزل في قبرها)) قال: فنزل في قبرها فقبرها. '' تم میں سے کون آج رات (اپنی بیوی کے پاس) نہیں گیا؟ تو ابوطلحہ نے کہا: میں، آپ نے فرمایا: تم اس (میری بیٹی) کی قبر میں اترو، وہ قبر میں اترے پھر اسے (یعنی دخترِ رسول کی نعش مبارک کو) قبر میں اتارا۔ (صحیح بخاری: ۱۳۴۲)

ایک روایت میں آیا ہے: ((لا يدخل القبر رجل قارف أهله)) جو شخص اپنی بیوی کے پاس گیا ہے وہ قبر میں نہ اترے۔ (مسند احمد ۳/ ۲۲۹ ح ۱۳۳۳۱، وسندہ صحیح علی شرط مسلم)

چونکہ ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ، رسول اللہ ﷺ کی بیٹی کے محرم نہیں تھے لہٰذا اس حدیث سے ثابت ہوا کہ غیر محرم مرد فوت شدہ عورت کو قبر میں اتار سکتا ہے۔

جب اتارنا جائز ہوا تو جنازے کو کندھا دینا بطریق اولیٰ جائز ہے۔ واللہ اعلم

اس روایت سے یہ مسئلہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ افضل یہی ہے کہ عورت کی میت کو قبر میں وہی شخص اتارے جس نے اس رات اپنی بیوی سے جماع نہ کیا ہو۔ وما علینا إلا البلاغ

[شہادت، جون ۲۰۰۳ء]

قبر پر پانی چھڑکنا

سوال قبر پر پانی چھڑکنے کے بارے میں کوئی صحیح یا حسن روایت درکار ہے؟

(محسن سلفی، کراچی)

الجواب سنن ابن ماجہ والی روایت "ورش علی قبرہ ماء" اور آپ ﷺ نے سعد (بن معاذ) رضی اللہ عنہ کی قبر پر پانی چھڑکا تھا۔ (الجنائز باب ما جاء فی ادخال المیت القبر ح ۱۵۵۱) مندل بن علی اور محمد بن عبید اللہ ابی رافع کی وجہ سے ضعیف ہے۔ تسہیل الحاجہ (ص ۱۰۷) مصنف عبدالرزاق (۶۴۸۱، ۶۴۸۲) اور السنن الکبریٰ للبیہقی (۴۱۱/۳) میں قبر پر پانی چھڑکنے والی کئی ضعیف ومردود روایات موجود ہیں۔ [شہادت، مئی ۲۰۰۳ء]

سوال قبر پر (مٹی ڈالنے کے بعد) پانی چھڑکنے سے متعلق احادیث کی تحقیق و حکم درکار ہے۔

(محمد صدیق، ایبٹ آباد)

الجواب قبر پر پانی چھڑکنے والی تمام روایات بلحاظ سند ضعیف ہیں جیسا کہ راقم الحروف نے تخریج الاحادیث (ماہنامہ شہادت مئی ۲۰۰۳ء ربیع الاول ۱۴۲۴ھ ج ۱۰ شمارہ ۵ میں ص ۳۴) پر ایک سوال کے جواب میں اشارہ کیا۔

صحیح مسلم میں ہے: "انتهى رسول الله ﷺ إلى قبر رطب"

رسول اللہ ﷺ ایک تر و نرم قبر کے پاس پہنچے۔ (ج ۱ ص ۳۰۹ ح ۹۵۴ وترقیم دارالسلام: ۲۲۱۱)

"رطب" نرم ونازک، تر وتازہ اور تر کو کہتے ہیں۔ (القاموس الوحید ص ۶۳۵)

یہ لفظ یابس (خشک) کی ضد ہے۔ یعنی حدیث مذکورہ میں پانی سے تر و نرم قبر کا ذکر ہے۔

محدث عبدالرزاق نے اس مفہوم کی ایک روایت "باب الرش علی القبر" کے تحت ذکر

کی ہے۔ (ج ۳ ص ۵۰۱ ح ۶۴۸۳)

خلاصہ یہ کہ قبر پر پانی چھڑکنا جائز ہے۔ [شہادت، مارچ ۲۰۰۴ء]

اعادۂ روح اور منکر نکیر

سوال کیا نکیرین کے سوال وجواب اور حساب کتاب کے بعد روح پھر میت کے بدن سے نکال لی جاتی ہے؟ (وقار علی، لاہور)

الجواب چونکہ قبر میں اعادہ روح برزخی ہوتا ہے جس کا دنیاوی اعادے سے کوئی تعلق نہیں لہٰذا نکالنے یا داخل ہونے سے دنیاوی زندگی ثابت نہیں ہوتی اور نہ اس کی کیفیت ہمیں معلوم ہے۔ جس کا علم ہی نہیں اس کے بارے میں قیاس آرائیوں سے بچنا چاہیے۔

[شہادت، دسمبر ۲۰۰۳ء]

سوال براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت سے اعادۂ روح ثابت ہوتا ہے جبکہ دیگر احادیث مثلاً (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹے) ابراہیم کے لئے جنت میں دودھ پلانے والی موجود ہے اور عمرو بن لحی کو جہنم میں دیکھنا وغیرہ سے جنت یا دوزخ میں روح کی موجودگی بھی ثابت ہوتی ہے۔ دونوں قسم کی احادیث میں تطبیق دے دیں اور بتا دیں کہ روح کا اصل مقام کہاں ہے؟ (وقار علی، لاہور)

الجواب حدیث براء اور دیگر احادیث میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

اعادۂ روح برزخی ہے۔ دیکھئے شرح عقیدہ طحاویہ (ص ۴۵۰)

اور عمرو بن لحی والا واقعہ بھی برزخی ہے۔ قبر کا تعلق جنت یا جہنم سے عالم برزخ میں قائم ہے جسے ہم دنیا میں محسوس نہیں کر سکتے۔ [شہادت، فروری ۲۰۰۴ء]

عذابِ قبر

سوال میت پر عذاب ہوتا ہے زندہ لوگوں کے رونے سے جو کہ (بین کر کر کے روتے ہیں) عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ و عبداللہ بن عمر کا یقین و مرفوع (!) اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے (بخاری، مسلم، نسائی، موطا امام مالک)

خلاف سوال نمبر۲: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''اللہ عافیت دے ابوعبدالرحمٰن (عبداللہ بن عمر) کو، وہ بھول گئے، ایک یہودن عورت کی قبر تھی جس پر اس کے گھر والے رو رہے تھے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہاں سے گزر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ لوگ اوپر رو رہے ہیں اور نیچے اسکو عذاب قبر ہو رہا ہے۔

خلاصہ: دونوں میں سے صحیح کون ہیں؟ اگر دونوں صحیح ہیں تو حضرت عائشہ نے خلاف کیوں کہا؟ ان دونوں کا اصل پورے دلائل سے پوری دنیا تک پہنچے۔ (ایک سائل)

الجواب یہ بات بالکل صحیح ثابت ہے کہ میت پر لوگوں کے بین کر کے آواز کے ساتھ رونے کی وجہ سے عذاب ہوتا ہے، یہ عذاب والی روایت اپنے مفہوم کے ساتھ درج ذیل صحابہ نے بیان کی ہے:

عمر بن الخطاب، عبداللہ بن عمر (صحیح البخاری: ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸ و صحیح مسلم: ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹)

عمران بن حصین (النسائی ۴/ ۱۵، ح ۱۸۵۵ و صححہ ابن حبان: ۷۴۲)

مغیرہ بن شعبہ (البخاری: ۱۲۹۱ و مسلم: ۹۳۳)

سمرہ بن جندب (الطبرانی فی الکبیر ۷/ ۲۱۶ ح ۶۸۹۶) وغیرہم

یہ حدیث متواتر ہے۔ دیکھئے قطف الازھار المتناثرہ فی الاخبار المتواترۃ للسیوطی (ح ۴۴) ونظم المتناثر من الحدیث المتواتر للکتانی (ح ۱۰۶)

اس پر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور سیدنا عمر و دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی احادیث میں کوئی تعارض نہیں ہے، امیر المؤمنین فی الحدیث اور امام الدنیا فی فقہ الحدیث امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" يعذب الميت ببعض بكاء أهله عليه إذا كان النوح من سنته فإذا لم يكن من سنته فهو كما قالت عائشة رضي الله عنها لا تزر وازرة وزر أخرى "

میت کو اس کے گھر والوں کے بعض رونے پیٹنے کی وجہ سے عذاب ہوتا ہے بشرطیکہ یہ رونا پیٹنا اس کی رضا مندی سے جاری ہوا اور اگر وہ اس طریقے کو جاری کرنے والا نہیں تھا تو وہی بات ہے جو عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ کوئی شخص دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

(صحیح البخاری کتاب الجنائز باب ۳۲ قبل ح ۱۲۸۴)

یعنی اگر کوئی شخص رونے پیٹنے پر راضی تھا اور اس سے منع نہیں کرتا تھا تو اس پر عذاب ہوگا۔ اور اگر کوئی شخص اس پر راضی نہیں تھا یا یہ حرکت خود بھی نہیں کرتا تھا اور اس سے منع کرتا تھا تو اس پر اس کی وجہ سے عذاب نہیں ہوگا۔ اس طرح دونوں طرح کے اقوال میں تطبیق ہو جاتی ہے اور یہی راجح ہے۔ والحمد للہ [الحدیث:۱][شہادت، جولائی ۲۰۰۴ء]

فرقہ مسعودیہ: کے اعتراضات اور ان کے جوابات

سوال مسند احمد کی حدیث براء بن عازب میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((فتعاد روحه في جسده)) (مشکوۃ باب مایقال عند من حضرہ الموت، الفصل الثالث)

اس حدیث کو کن کن محدثین نے صحیح قرار دیا ہے؟ ان کے نام اور حوالہ جات مفصل تحریر کریں۔ کتاب اور صفحہ نمبر ضرور تحریر کیجئے گا۔ زاذان اور منہال بن عمرو کو کن محدثین نے قابلِ حجت قرار دیا ہے۔ ابن تیمیہ، ابن قیم اور البانی کی تحقیق کو یہ لوگ تسلیم نہیں کرتے۔

(وقار علی ہبین الیکٹرونکس امین پارک لاہور)

الجواب آپ کے سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں۔

۱: حدیثِ براء بن عازب رضی اللہ عنہ، حدیث کی درج ذیل کتابوں میں تفصیل اور اختصار کے ساتھ منہال بن عمرو عن زاذان عن البراء بن عازب کی سند کے ساتھ موجود ہے۔

(۱) سنن ابی داود (ح ۳۲۱۲، ۴۷۵۳، ۴۷۵۴)

(۲) سنن ابن ماجہ (ح ۱۵۴۸، ۱۵۴۹)

(۳) سنن النسائی (۴/ ۷۸ ح ۲۰۰۳)

(۴) مسند الامام احمد (۴/ ۲۸۷، ۲۸۸ ۲۹۷)

(۵) زوائد مسند احمد لعبد اللہ بن أحمد (۴/ ۲۹۶)

(۶) مصنف عبد الرزاق (۳/ ۵۸۰ ـ ۵۸۲ ح ۶۷۳۷)

(۷) مسند الطیالسی (ص ۱۰۲، ۱۰۳، ح ۷۵۳)

(۸) مصنف ابن ابی شیبہ (۳/ ۳۸۰۔۳۸۲ ح ۱۲۰۵۸)

(۹) زہد ہناد بن السری (۱/ ۲۰۵۔۲۰۷ ح ۳۳۹)

(۱۰) مسند ابی عوانہ کما فی اتحاف المہرۃ لابن حجر (۲/ ۴۵۹ ح ۲۰۶۳)

(۱۱) الشریعہ للآجری (ص ۳۶۷۔۳۷۰ ح ۸۶۴۔۸۶۷)

(۱۲) زوائد الزہد لحسین بن الحسن المروزی (ص ۴۳۰۔۴۳۳ ح ۱۲۱۹)

(۱۳) التوحید لابن خزیمہ (ص ۱۱۹، ۱۲۰)

(۱۴) المستدرک للحاکم (۱/ ۳۷۔۳۹/ ۴۰) وقال: "صحیح علی شرط الشیخین"

وقال الذہبی: "و هو علی شرطهما"

(۱۵) تفسیر الطبری (۸/ ۱۲۹، ۱۳۰/ ۱۴۳)

(۱۶) عذاب القبر للبیہقی (۲۰) وقال (۱۹): "هذا حدیث کبیر صحیح الإسناد"

(۱۷) شعب الایمان للبیہقی (۳۹۵) وقال: "هذا حدیث صحیح الإسناد"

(۱۸) المعجم الاوسط للطبرانی (ح ۳۰۲۳، ۴۱۳۷)

(۱۹) تفسیر ابن ابی حاتم (۵/ ۱۴۷۷، ۱۴۷۸ ح ۸۴۶۵)

(۲۰) مسند الرویانی (۱/ ۲۶۳۔ ۲۶۷ ح ۳۹۲)

(۲۱) تاریخ دمشق لابن عساکر (۶۳/ ۲۶۸، ۲۶۹)

اسے درج ذیل محدثین نے صحیح قرار دیا ہے:

(۱) بیہقی (۲) حاکم (۳) ذہبی

(۴) القرطبی فی التذکرۃ فی أحوال الموتی وأمور الآخرۃ (ص ۱۱۹)

(۵) ابوعوانہ روی حدیثہ فی صحیحہ (کتاب الروح ص ۶۰ اتحاف المہرۃ ۲/ ۴۵۹)

بعض لوگوں نے زاذان اور منہال بن عمرو پر جرح کی ہے لہٰذا ان دونوں راویوں کے حالات علی الترتیب وبالتفصیل پیش خدمت ہیں:

الیاقوت والمرجان في توثیق أبي عمر زاذان

ابوعمر زاذان الکندی الکوفی صحیح مسلم اور سنن اربعہ کے راوی ہیں۔

صحیح مسلم: (۱۶۵۷، ۱۹۹۷/ ۵۷)

ترمذی: (۱۸۴۶، [۱۸۶۸ وقال: حسن صحیح]، ۱۹۸۶، ۲۵۶۶، ۳۸۱۲)

ابوداود: (۲۴۹، ۳۲۱۲، ۳۷۶۱، ۵۱۶۸)

النسائی: (۱۲۸۳، ۲۰۰۳، ۵۶۴۸)

ابن ماجہ: (۵۹۹، ۱۵۴۸، ۱۵۴۹، ۱۵۵۵، ۴۰۲۱)

ابن خزیمہ: (۲۷۹۱)

ابن حبان: (الاحسان ۲/ ۱۳۴ ح ۹۱۰)

اب زاذان پر جرح مع تبصرہ پیش خدمت ہے:

۱۔ سلمہ بن کہیل: ''أبو البختري الطائي أعجب اليّ''

(کتاب المعرفۃ والتاریخ لیعقوب بن سفیان ۲/ ۷۹۵ وسندہ صحیح)

یعنی اس کے بجائے مجھے ابوالبختری الطائی زیادہ محبوب و پسندیدہ ہے۔

یہی قول دوسرے علماء نے اختصار و تفصیل اور معمولی اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے۔ دیکھئے تھذیب التھذیب وغیرہ، ابوالبختری سعید بن فیروز الطائی صحاح ستہ کے راوی اور ثقہ تھے۔ دیکھئے تھذیب الکمال للمزی (۷/ ۲۷۸، ۲۷۹)

تنبیہ: سلمہ بن کہیل ۱۲۱ھ یا ۱۲۳ھ میں فوت ہوئے۔ (تھذیب الکمال ۷/ ۴۵۹، ۴۶۰)

وہب بن وہب الاسدی المدنی القاضی ۱۲۱ھ یا اس کے بعد پیدا ہوا۔

دیکھئے سیر اعلام النبلاء (۹/ ۳۷۵ قال: توفی سنۃ مائتین ولہ بضع وسبعون سنۃ)

لہٰذا سلمہ بن کہیل کے قول کا مصداق وہب بن وہب قطعاً نہیں ہے اور کتاب المعرفۃ کی صراحت ''الطائی'' اس سلسلے میں فیصلہ کن ہے کیونکہ الطائی صرف سعید بن فیروز ہے وہب بن وہب نہیں۔ سعید بن فیروز الطائی چونکہ ثقہ تھے لہٰذا انھیں زاذان پر ترجیح دینا کوئی جرح نہیں ہے۔ سلمہ بن کہیل نے ابوالبختری الطائی کے ایک قول کو بطور حجت پیش کیا ہے۔

(المعجم لابن الاعرابی: ۴۳۱ وسندہ قوی)

۲۔الحکم بن عتیبہ: حکم نے زاذان سے روایت نہ لینے کا سبب یہ بیان کیا:

" أكثر، يعني من الرواية "اس نے بہت سی روایتیں بیان کی ہیں۔

(الجرح والتعدیل ۳/۶۱۴ وسندہ صحیح وکتب اخریٰ)

ظاہر ہے کہ بہت سی روایتیں بیان کرنا کوئی جرح نہیں بلکہ خوبی ہے۔سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بہت سی حدیثیں بیان کی ہیں حتی کہ بعض علماء نے ان کے بارے میں بھی کہہ دیا تھا کہ "أكثر أبو هريرة" ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) نے کثرت کردی۔

(صحیح مسلم:۲۴۹۲/۱۶۰، وصحیح البخاری:۲۰۴۷)

۳۔ ابواحمد الحاکم الکبیر النیسابوری: " ليس بالمتين عندهم "وہ ان کے نزدیک المتین نہیں تھے۔ (تاریخ دمشق لابن عساکر ۲۰/۲۱۳)

یہ جرح کئی لحاظ سے مردود ہے۔

ا: المتین کی نفی کا یہ مطلب نہیں کہ وہ متین (بغیر الف لام) بھی نہیں ہے لہٰذا ایسا راوی، اگر جمہور سے توثیق ثابت ہو تو حسن الحدیث سے کم نہیں ہوتا۔

ب: "عندھم" یعنی ان (نامعلوم لوگوں) کے نزدیک لیس بالمتین ہونا اس لئے بھی مردود ہے کہ یہ نامعلوم لوگ کون ہیں؟ ظاہر ہے کہ مجہول کی جرح کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

ج: ابواحمد الحاکم (پیدائش ۲۹۰ھ أو قبلها ۲۸۵ھ وفات ۳۷۸ھ) بہت بعد کے علماء میں سے ہیں، امام ابن معین وغیرہ کے مقابلے میں مجہول لوگوں سے ان کی نقل کردہ جرح مردود ہے۔

۴۔ حافظ ابن حجر العسقلانی: " صدوق يرسل وفيه شيعية "

(تقریب التہذیب:۱۹۸۸)

یعنی یہ سچے تھے، مرسل روایتیں بیان کرتے تھے اور ان میں شیعیت ہے۔

مرسل روایتیں بیان کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔امام ابوداود کی کتاب المراسیل پڑھ لیں۔

امام عطاء بن ابی رباح وغیرہ بہت سے تابعین مرسل روایتیں بیان کرتے تھے۔

"فيه شيعية" [اُن میں شیعیت ہے۔] والی بات دو وجہ سے مردود ہے:

اول: حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں اس قول کا ذکر وماً خذ بیان نہیں کیا اور تقریب التہذیب، تہذیب ہی کا خلاصہ ہے۔ جب اصل میں ایک قول ہے ہی نہیں تو خلاصے میں کہاں سے آگیا؟

دوم: حافظ ابن حجر سے پہلے یہ قول محمد بن عمر الواقدی (کذاب) سے مروی ہے۔

عن محمد بن عمر (الواقدی): "وكان من شيعة علي" اور وہ بھی جماعت میں سے تھے۔

(کتاب الکنیٰ للدولابی ۲/۴۲ وتاریخ دمشق لابن عساکر ۲۰/۲۱۸)

واقدی کذاب ومتروک تھا۔ دیکھئے میزان الاعتدال وغیرہ۔

ابراہیم بن ہاشم غیر موثق ہے۔ دیکھئے تاریخ بغداد (۶/۲۰۲، ۲۰۳)

محمد بن ابراہیم بن ہاشم بھی غیر موثق ہے۔ (انظر تاریخ بغداد ۱/۳۹۹)

محمد بن ابراہیم کا شاگرد صاحب الکنیٰ محمد بن احمد بن حماد الدولابی ضعیف ہے۔

دیکھئے میزان الاعتدال (۳/۴۵۹)

معلوم ہوا کہ "فيه شيعية" والا قول ہر لحاظ سے باطل ہے۔ یہ کل جرح تھی۔ ابن حبان کی جرح کا ذکر آخر میں آرہا ہے اب زاذان کی توثیق وتعدیل بھی پڑھ لیں۔

۱۔ یحییٰ بن معین: ثقة (سوالات ابن الجنید: ۲۶۹)

۲۔ خطیب بغدادی: كان ثقة (تاریخ بغداد ۸/۴۸۷)

۳۔ العجلی: ثقة (تاریخ الثقات: ۴۵۰)

۴۔ مسلم: احتج به في صحيحه (۱۶۵۷، ۱۹۹۷/ ۵۷)

۵۔ ابن عدی: وأحاديثه لا باس بها إذا روى عنه ثقة (الکامل ۳/۱۰۹۱)

۶۔ ابن سعد: وكان ثقه قليل الحديث (الطبقات الکبریٰ ۶/۱۷۹)

۷۔ ابو عوانہ الاسفرائنی: احتج به في صحيحه (۵/۲۸۹، ۲۹۰)

۸۔ ابن الجارود: روى له في المنتقى: ۸۴۲

معلوم ہوا کہ ابن الجارود کے نزدیک زاذان صحیح الحدیث ہے۔
دیکھئے میرا مضمون "نصر الرب فی توثیق سماک بن حرب" (ق ص ۱۴) میری کتاب: تحقیقی اور علمی مقالات (ج ۱ص ۴۳۴)

۹۔ الحاکم: صحح له في المستدرك

۱۰۔ الذہبی: وكان ثقة صادقًا (سیر اعلام النبلاء ۴/ ۲۸۰)

حافظ ذہبی نے میزان الاعتدال (۲/ ۶۳) میں "صح" لکھ کر اپنے نزدیک زاذان کی توثیق کا اشارہ کر دیا ہے اور یہ کہ اس پر جرح باطل ہے۔
دیکھئے لسان المیزان (۲/ ۱۵۹ ترجمۃ: حارث بن محمد بن ابی اسامۃ)

۱۱۔ ابن شاہین: ثقة (الثقات: ۴۱۷)

۱۲۔ ابن خزیمہ: احتج به في صحيحه (۲۷۹۱)

۱۳۔ ابونعیم اصبہانی: "الناصح المجاب والرابح المثاب" (حلیۃ الاولیاء ۴/ ۱۹۹)
ابونعیم اصبہانی نے زاذان کو اہل السنہ کے اولیاء میں ذکر کیا ہے۔ (حلیۃ الاولیاء ۴/ ۱۹۹۔ ۲۰۴)
معلوم ہوا کہ وہ ان کے نزدیک شیعہ نہیں تھے۔

☆ امام النسائی: ليس به باس (تاریخ دمشق ۲۰/ ۲۱۲، وسندہ ضعیف)
اس میں امام نسائی کے شاگرد اور بیٹے ابوموسیٰ عبدالکریم بن احمد بن شعیب النسائی کے حالات نہیں ملے، باقی ساری سند صحیح ہے۔

۱۴۔ بیہقی: صحح له في شعب الإيمان (۳۹۵) واثبات عذاب القبر (ح ۱۹) محققی

۱۵۔ القرطبی: صحح له في التذكرة (ص ۱۱۹) كما تقدم

۱۶۔ ابن کثیر: " أحد التابعين: فرزقه الله التوبة على يد عبدالله بن مسعود وحصلت له إنابة ورجوع إلى الحق وخشية شديدة"
(البدایۃ والنہایۃ ۹/ ۵۰)

۱۷۔ ابن حجر العسقلانی: " صدوق يرسل وفيه شيعية" (تقریب: ۱۹۸۸)

یہ سل اور فیہ شیعیہ کا جواب پر گزر چکا ہے متقدمین کی اصطلاح میں تشیع اور رفض کا فرق ہے لہٰذا یہ لفظ، جو کہ ثابت بھی نہیں ہے حافظ ابن حجر کے نزدیک بھی جرح نہیں ہے۔

حافظ ابن حجر عن البراء والی حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں:

''کما ثبت فی الحدیث'' [جیسا کہ حدیث میں ثابت ہوا۔]

(فتح الباری ۳/۲۳۵ تحت ح ۱۳۷۴)

۱۸۔ ابو موسیٰ الاصبہانی: حسنہ (الترغیب والترہیب ۴/۳۶۹)

۱۹۔ ابن القیم: قال فی حدیثہ: ''فالحدیث صحیح، لا شك فیہ''

(کتاب الروح ص ۶۵)

۲۰۔ ابن تیمیہ: حسن حدیثہ (مجموع فتاویٰ ۴/۲۹۰)

۲۱۔ الضیاء المقدسی: أخرج حدیثہ فی المختارۃ (۲/۷۴ ح ۴۵۱)

۲۲۔ المنذری: ثقۃ مشہور (الترغیب والترہیب ۴/۳۶۹ ح ۵۲۲۱)

۲۳۔ الترمذی: صحح لہ کما تقدم (ص ۲۳)

معلوم ہوا کہ محدثین کرام کی بہت بڑی اکثریت زاذان کو ثقہ وصدوق اور صحیح الحدیث وحسن الحدیث قرار دیتی ہے لہٰذا چند علماء کی غیر مفسر وغیر ثابت جرح ان کے مقابلے میں مردود ہے۔

حافظ ابن حبان کا زاذان کے بارے میں رویہ عجیب وغریب ہے وہ انھیں کتاب الثقات (۴/ ۲۶۵) میں ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں: ''یخطئ کثیرًا'' وہ بہت غلطیاں کرتا تھے۔

ظاہر ہے کہ جو بہت غلطیاں کرے وہ ضعیف ہوتا ہے ثقہ نہیں ہوتا لہٰذا اسے کتاب الثقات میں ذکر کرنے کا کیا فائدہ؟ اگر ثقہ ہے تو وہ ''یخطئ کثیرًا'' بالکل نہیں ہے۔

گویا حافظ ابن حبان کا قول اور الثقات میں راوی کا ذکر دونوں متناقض ہو گئے۔ اگر امام ابن حبان کے دو اقوال میں تعارض وتناقض واقع ہو جائے تو دونوں ساقط ہو جاتے ہیں (قال الذہبی: '' فتساقط قولاہ '' میزان الاعتدال ۲/۵۵۲ ترجمۃ عبدالرحمان بن ثابت

بن الصامت) یہی اصول دیگر لوگوں کے بارے میں بھی ہے۔

حافظ ابن حبان نے زاذان کو کتاب: مشاہیر علماء الأمصار (ت:۱۵۷۷ میں بھی ذکر کیا ہے (ص ۱۰۴) اور کہا: "و کان یھم فی الشيء بعد الشيء" یعنی اسے بعض دفعہ بعض اشیاء میں وہم ہو جاتا تھا۔ معلوم ہوا کہ ابن حبان نے "یخطئ کثیراً" سے رجوع کرلیا ہے۔ اس رجوع کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ابن حبان زاذان کی روایت اپنی صحیح میں لائے ہیں۔ (الاحسان ۲/۱۳۴ ح ۹۱۰)

یعنی یہ ان کے نزدیک صحیح الحدیث تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ زاذان پر منکرینِ عذاب القبر کی نقل کردہ تمام جرحیں باطل و مردود ہیں اور زاذان ابو عمر ثقہ و صحیح الحدیث تھے۔ والحمدللہ

المستدرک للحاکم (۱/ ۳۹) میں مختصر روایت میں ابو اسحاق السبیعی نے زاذان کی متابعت کر رکھی ہے، براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے اسے عدی بن ثابت بھی بیان کرتے ہیں (کتاب الروح ص ۶۶) اس کا راوی عیسیٰ بن المسیب جمہور کے نزدیک ضعیف ہے۔

خلاصۃ التحقیق: زاذان ابو عمر رحمہ اللہ ثقہ و صحیح الحدیث ہیں اور اُن پر ڈاکٹر مسعود عثمانی وغیرہ کی جرح مردود ہے۔ والحمدللہ

منہال بن عمرو، میزان جرح و تعدیل میں

منہال بن عمرو صحیح بخاری و سنن اربعہ کے راوی ہیں۔

صحیح البخاری: ۳۳۷۱، ۵۵۱۵، سورۃ حم السجدۃ باب: اقبل ح ۴۸۱۶

ابوداود: ۳۱۰۶، ۴۷۳۷، ۵۲۱۷

ترمذی: ۲۰۶، ۲۰۸۳، ۳۳۵۵، ۳۶۱۱، ۳۷۸۱، ۳۸۷۲

نسائی: ۵۴۵۱، ۳۰۰۹، ۸۹۳، ۸۹۴

ابن ماجہ: ۱۲۰، ۳۳۹، ۶۱۵، ۹۷۱، ۱۵۴۸، ۱۵۴۹، ۲۱۱۲، ۳۵۲۵، ۴۰۲۱

ابن حبان: الاحسان: ۶۹۲۱، ۲۹۶۷، موارد: ۷۱۴، ۲۲۲۹

ابن خزیمہ: ۲۸۳۰

المختارة للضياء المقدسی ۳/ ۳۶۸_۳۸۶ ح۳۹۴_۴۱۲

الحاکم: ا/ ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۴/ ۲۱۳

اب منہال پر جرح کے اقوال مع تبصرہ پیش خدمت ہیں:

ا: شعبہ = امام احمد بن حنبل نے فرمایا:

"ترك شعبة المنهال بن عمرو على عمد" شعبہ نے جان بوجھ کر منہال کو ترک کر دیا تھا۔ (الضعفاء للعقیلی ۴/ ۲۳۶ والجرح والتعدیل ۸/ ۳۵۷)

شعبہ ۱۶۰ھ میں فوت ہوئے اور امام احمد ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے لہٰذا یہ قول بے سند اور منقطع ہونے کی وجہ سے مردود ہے۔

وہب بن جریر سے روایت ہے کہ شعبہ نے فرمایا:

أتيت منزل منهال بن عمرو فسمعت منه صوت الطنبور فرجعت ولم أسأله. میں منہال بن عمرو کے گھر کے پاس آیا تو میں نے وہاں سے طنبور (باجے) کی آواز سنی میں واپس چلا گیا اور اس سے پوچھا تک نہیں۔

وہب نے کہا کہ میں نے کہا: " وهلا سألته فعسى كان لا يعلم "

اور آپ نے اس سے پوچھا کیوں نہیں؟ ہوسکتا ہے کہ اسے پتہ ہی نہ ہو۔

(کتاب الضعفاء للعقیلی ۴/ ۲۳۷)

معلوم ہوا کہ امام شعبہ کی جرح صحیح نہیں ہے۔

حافظ ذہبی اس جیسی شعبہ کی جرح نقل کر کے فرماتے ہیں: " وهذا لا يوجب غمز الشيخ " اور اس سے شیخ پر جرح لازم نہیں ہوتی۔ (میزان الاعتدال ۴/ ۱۹۲)

ا۔ شعبہ کی منہال پر جرح اس کی بیان کردہ ایک خاص حدیث " حديث ابی بشر عن مجاهد: حديث الطير " سے ہے۔

دیکھئے کتاب العلل لاحمد (۱۲۷۱) وموسوعة اقوال احمد (۳/ ۴۰۴) واللفظ له

امام بخاری فرماتے ہیں: روی عنه منصور وشعبة (التاریخ الکبیر ۱۲/۸)
یعنی منہال سے منصور اور شعبہ نے روایت بیان کی ہے۔

راقم الحروف نے اپنے رسالہ ''نصر الرب'' میں ثابت کیا ہے کہ شعبہ عام طور پر اپنے نزدیک صرف ثقہ سے روایتیں کرتے تھے۔ (ص ۱۳)

لیکن حافظ ذہبی نے بغیر کسی مستند حوالے کے لکھا ہے: ''ثم ترکه بآخره'' (الکاشف: ۵۷۵۲) یعنی شعبہ نے آخر میں منہال کو ترک کر دیا تھا۔ واللہ اعلم

۲۔ مغیرہ (بن مقسم) صاحب ابراہیم: مغیرہ سے منسوب جرح تاریخ دمشق (۶۳/۲۷۳، ۲۷۴) میں مذکور ہے اس کا راوی محمد بن عمر الحنفی مجہول ہے۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: ''محمد بن عمر الحنفي راوي الحکایة فیه نظر''
(اس) حکایت کے راوی محمد بن عمر الحنفی میں نظر ہے۔ (تہذیب التہذیب ۱۰/۳۲۰)

۳۔ یحییٰ القطان: حاکم نے بغیر سند اور بغیر کسی حوالے کے نقل کیا کہ غمزہ یحیٰ بن سعید (القطان) یعنی: یحییٰ القطان نے منہال پر جرح کی۔ (میزان الاعتدال ۴/۱۹۲)

یہ جرح تین وجہ سے مردود ہے:

① جرح غیر مفسر ہے ② جرح کے ثبوت میں نظر ہے
③ جمہور محدثین کی توثیق کے خلاف ہے۔

۴۔ جوزجانی نے کہا: سيئ المذهب (احوال الرجال: ۴۳)

تاریخ دمشق میں یہ اضافہ ہے: وقد جرى حديثه (۶۳/۲۷۵)

۵۔ ابن حزم نے کہا: ليس بالقوي (سیر اعلام النبلاء ۵/۱۸۴)

۶۔ یحییٰ بن معین: اس کی شان گھٹاتے تھے۔ (تاریخ دمشق ۶۳/۲۷۵)

اس کے راوی احوص بن مفضل کو دارقطنی نے ليس به بأس کہا اور ابن حجر نے کہا:

''وأورد.... حديثًا منكرًا ليس في سنده ما يتهم به غيره''

(لسان المیزان ۱/ ۳۳۲ ت ۱۰۲۲)

تنبیہ: احوص بن المفضل کے بارے میں راجح یہی ہے کہ وہ لیس بہ بأس (یعنی صدوق حسن الحدیث) تھے۔ دیکھئے سوالات السہمی للدارقطنی (۲۰۸)

ان جارحین کے مقابلے میں معدلین وموثقین کے اقوال بھی پڑھ لیں:

۱۔ یحییٰ بن معین: ثقة (تاریخ یحییٰ بن معین: ۱۹۸۷، الجرح والتعدیل ۸/ ۳۵۷)

۲۔ العجلی: ثقة (تاریخ الثقات: ۱۶۴۳)

۳۔ الدارقطنی: صدوق (سوالات الحاکم للدارقطنی: ۴۸۴)

۴۔ البخاری: روى له في صحيحه (۳۳۷۱، ۵۵۱۵، قبل ح ۴۸۱۶)

۵۔ ابن خزیمہ: روى له في صحيحه (۲۸۳۰)

۶۔ ابن حبان: روى له في صحيحه (موارد: ۷۱۴، ۲۲۲۹، الاحسان: ۶۹۲۱، ۲۹۶۷)

۷۔ الضیاء المقدسی: روى له في المختارة (۳/ ۳۶۸۔ ۳۸۶ ح ۳۹۴۔ ۴۱۲)

۸۔ الحاکم: صحح له في المستدرك (۱/ ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۴/ ۲۱۳) وغیرہ

۹۔ الترمذی: قال في حديثه: "حسن صحيح" (۲۰۶۰)

۱۰۔ ابن شاہین: ثقة (الثقات: ۱۴۱۲)

۱۱۔ بیہقی: صحح حديثه (شعب الایمان: ۳۹۵)

۱۲۔ ابو عوانہ: روى له في صحيحه (اتحاف المہرة ۲/ ۴۵۹ ح ۲۰۶۳)

۱۳۔ الذہبی: صحح حديثه (تلخیص المستدرک ۱/ ۳۷۔ ۴۰)

ذہبی نے میزان الاعتدال میں منہال کے ساتھ "صح" کی علامت لکھی ہے۔ (۴/ ۱۹۲)

تعدیلِ زاذان (حوالہ نمبر ۱۰) میں بحوالہ لسان المیزان (۲/ ۱۵۹) گزر چکا ہے کہ حافظ ذہبی کے نزدیک ایسے راوی پر جرح باطل ہوتی ہے اس کے باوجود حافظ ذہبی نے سیر اعلام النبلاء (۵/ ۱۸۴) میں یہ عجیب وغریب بات لکھ دی ہے:

"حديثه في شأن القبر بطوله فيه نكارة وغرابة"

یعنی اس کی عذاب القبر والی حدیث میں اجنبیت اور اوپرا پن ہے۔

ذہبی کا یہ قول ان کی تعدیل کے مقابلے میں باطل ہے۔

۱۴۔ محمد بن اسحاق بن یحییٰ بن مندہ: صحح حدیثہ فی کتاب الایمان (۲/۸۲۰ ح ۸۴۴)

۱۵۔ ابن حجر العسقلانی: صدوق / ربما وهم (تقریب التہذیب: ۶۹۱۸)

ایسا راوی حافظ ابن حجر اور عام محدثین کے نزدیک حسن درجے کا ہوتا ہے۔

تحریر تقریب التہذیب میں حافظ ابن حجر کے قول پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہوا ہے:

"بل ثقة فقد وثقه الأئمة: ابن معين والنسائي والعجلي وذكره ابن حبان في الثقات ولم يجرح بجرح حقيقي .. " (۳/۴۲۱)

☆ النسائی: حافظ المزی نے بغیر کسی سند کے نسائی سے نقل کیا کہ "ثقہ" یعنی منہال ثقہ ہے۔

(تہذیب الکمال ۱۸/۳۱۲)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ جمہور محدثین کے نزدیک منہال ثقہ وصدوق تھے لہٰذا ان کی یہ روایت صحیح یا حسن لذاتہ ہے۔ان کی بیان کردہ حدیث کی تائید والی روایتیں بھی ہیں مثلاً: سنن ابن ماجہ (کتاب الزہد باب ذکر الموت والاستعداد لہ (ح ۴۲۶۲) والی حدیث "ثم تصير إلى القبر" یعنی پھر قبر میں روح چلی جاتی ہے۔اس کی سند بالکل صحیح ہے:

["حدثنا أبو بكر بن أبي شيبة حدثنا شبابة عن ابن أبي ذئب عن محمد بن عمرو بن عطاء عن سعيد بن يسار عن أبي هريرة "إلخ]

اس سند میں نہ زاذان ہیں اور نہ منہال بن عمرو، اسے البوصیری (زوائد) المنذری (الترغیب والترہیب ۴/۳۷۰) اور ابن القیم (الروح ص ۱۵۵) نے صحیح کہا ہے۔

تعدیلِ زاذان میں (ص ۲۷) پر متابعت والی دو روایتیں گزر چکی ہیں مزید تفصیل کیلئے میرے بھائی محترم مولانا ابو جابر عبداللہ الدامانوی کی کتاب الدین الخالص حصہ اول پڑھ لیں۔ [الحدیث: ۱۴]

نوحہ کرنے کے بارے میں ایک روایت

سوال ایک برائے نام مولوی صاحب نے ایک ماتمی تعزیتی اجتماع میں بیان کیا کہ دو قسم کے انسان ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے:

① نوحہ کرنے والی مسلمان عورت

② جس مسلمان نے کسی مسلمان کی توہین کر دی ہو۔

مذکورہ مولوی صاحب نے کہا کہ حوالہ حدیثوں میں موجود ہے، مولویوں سے پوچھ لیں ۔آپ فرمائیں کہ کیا یہ درست ہے کہ مذکورہ بالا دو قسم کے مسلمان واقعی ابدی دوزخی ہیں۔مولوی صاحب نے کہیں عمداً جھوٹ تو نہیں کہا؟ مجلس میں موجود ایک مستند عالم دین نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔آپ سے گزارش ہے کہ قرآن وسنت کی روشنی میں مختصر جواب سے آگاہ فرمائیں۔ (محمد صدیق سلفی، ایبٹ آباد)

الجواب نوحہ اور توہینِ مسلم دو ایسے جرم ہیں، جن پر شدید وعیدیں وارد ہیں لیکن قلتِ فہم نصوص کی وجہ سے خوارج کی طرح مسلمانوں کی تکفیر کر کے انھیں ابدی جہنمی قرار دینا غلط ہے۔نصوصِ متواترہ سے ثابت ہے کہ صحیح العقیدہ گناہ گار آخر کار دوزخ سے نکال دیئے جائیں گے۔والحمدللہ

مولوی صاحب کی بیان کردہ روایت میرے علم میں نہیں ہے۔ [شہادت، اکتوبر ۲۰۰۰ء]

مردے پر اعمال پیش ہونا

سوال کیا مردے پر زندہ کے اعمال پیش ہوتے ہیں جیسا کہ عبداللہ بن رواحہ کے عزیزوں کا واقعہ تفسیر ابن کثیر (ج ۳ ص ۴۳۹) میں ہے۔اور کیا مردہ اپنی قبر کی زیارت کرنے والے کو پہچانتا ہے؟ (جامع الصغیر ج ۲ ص ۱۵۱)

عرضِ اعمال کے لئے دیکھئے حدیث انس بن مالک (مسند احمد ج ۳ ص ۱۶۴) (ایک سائل)

الجواب مردے پر زندہ کے اعمال پیش ہونے والی کوئی روایت بھی صحیح نہیں ہے۔

تفسیر ابن کثیر (۴۳۹/۳ تحت آیۃ ۵۲، ۵۳ من سورة الروم) میں عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے اقارب والا واقعہ بے اصل ہے۔ جو لوگ اسے صحیح سمجھتے ہیں ان پر یہ لازم ہے کہ وہ اس کی پوری سند مع توثیق اسماء الرجال پیش کریں۔

صرف کسی کتاب کا حوالہ دے دینا کافی نہیں ہے۔ مثلاً تفسیر ابن کثیر میں عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب بے اصل قصے سے پہلے ابن ابی الدنیا کی کتاب سے منقول ایک روایت کا راوی خالد بن عمرو الاموی، کذاب، منکر الحدیث، متروک الحدیث ہے۔

دیکھئے تہذیب الکمال (۳۹۴/۵، ۳۹۵)

اسی ایک مثال سے ان بے اصل روایات کی حقیقت سمجھ لیں۔

جس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مردہ اپنی قبر میں زیارت کرنے والے کو پہچانتا ہے اس کی راویہ فاطمہ بنت الریان کے حالات نہیں ملے۔

دیکھئے السلسلۃ الضعیفۃ للشیخ الالبانی رحمہ اللہ (۴۷۵/۹ ح ۴۴۹۳)

شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس مفہوم کی دیگر روایات پر بھی جرح کر کے یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہ روایت ''ضعیف'' ہے۔ دیکھئے السلسلۃ الضعیفۃ (ص ۴۷۳ تا ۴۷۶)

آپ کی ذکر کردہ مسند احمد والی روایت (ج ۳ ص ۱۶۵ ح ۱۲۶۸۳) بھی ''عمن سمع'' والے مجہول راوی کی وجہ سے ضعیف ہے۔ [شہادت، فروری ۲۰۰۴ء]

دفنانے کے بعد قبر کے پاس کھڑا ہونا

سوال صحیح مسلم (۱۲۱، ترقیم دارالسلام: ۳۲۱) میں ہے کہ مرتے وقت حضرت عمرو بن العاص نے اپنے بیٹے کو وصیت کی کہ میرے مرنے کے بعد مجھے دفن کر کے اتنی دیر تک قبر کے پاس ٹھہرے رہنا جتنی دیر میں اونٹ ذبح کر کے اس کا گوشت تقسیم کیا جاتا ہے۔
کیا یہ روایت صحیح ہے؟ کیا صاحب قبر کو اپنی قبر کے پاس کھڑے رہنے کا علم ہوتا ہے اور اس سے اسے تسلی اور اطمینان بھی حاصل ہوتا ہے؟ (وقار علی، لاہور)

الجواب یہ روایت بالکل صحیح ہے۔ ابو عاصم الضحاک بن مخلد النبیل پر جرح باطل

ہے، یہ صحیحین کے بنیادی راوی ہیں۔انھیں بخاری، مسلم، یحییٰ بن معین، العجلی، محمد بن سعد وغیرہم جمہور محدثین نے ثقہ قرار دیا ہے۔ایسے راوی پر ایک دو علماء کی جرحیں باطل و مردود ہوتی ہیں۔ روایت کا ترجمہ پڑھ کر مفہوم خود سمجھ لیں یا کسی قریبی صحیح العقیدہ عالم سے ترجمہ کروا کر سن لیں۔حدیث صحیح پر ایمان لانے میں ہی دونوں جہانوں کی کامیابی ہے۔

[شہادت، فروری ۲۰۰۴ء]

علیین اور سجین کیا ہے؟

سوال کیا علیین جنت کا ایک مقام اور سجین دوزخ کے ایک مقام کا نام ہے؟

(وقار علی، لاہور)

الجواب سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ والی حدیث میں علیین اور سجین کی کتابوں میں لکھنے کا ذکر آیا ہے۔ (مسند احمد ۴/ ۲۸۷، ۲۸۸ ح ۱۸۵۳۴)

اس کی سند صحیح ہے جیسا کہ گزر چکا ہے۔علیین میں جسے لکھ دیا گیا وہ جنت میں اور سجین والا دوزخ میں ہے۔

[شہادت، فروری ۲۰۰۴ء]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز جنازہ کیسے پڑھی گئی؟

سوال کچھ علمائے کرام کو یہ درس دیتے ہوئے سنا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر نماز جنازہ ادا کی۔براہِ مہربانی پوری تفصیل سے لکھیں کہ یہ کس طریقہ پر صحابۂ کرام نے اللہ کے نبی کی نماز جنازہ ادا کی اور الفاظ کون سے ادا کیے؟ (ایک سائل)

الجواب سیدنا ابو عسیب یا ابو عسیم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

لوگوں نے (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد) کہا: ہم آپ کا جنازہ کیسے پڑھیں؟ کہا: (حجرے میں) گروہ در گروہ داخل ہو جاؤ، (سید ابو عسیب یا ابو عسیم رضی اللہ عنہ نے) کہا: پس وہ لوگ اس دروازے سے داخل ہوتے (اور) آپ کی نماز جنازہ پڑھتے پھر دوسرے دروازے سے باہر نکل جاتے.... الخ

(مسند الامام احمد ج ۵ ص ۸۱ ح ۲۱۰۴۷ و إسنادہ صحیح، الموسوعۃ الحدیثیۃ ج ۳۴ ص ۳۶۵)

نبی کریم ﷺ کی نماز جنازہ پڑھنے والے صحابی کی اس گواہی سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام نے آپ ﷺ کے متعدد جنازے پڑھے تھے۔ یہ روایت طبقات ابن سعد (ج ۲ ص ۲۸۹) میں بھی صحیح سند کے ساتھ موجود ہے۔

بعض الناس کا یہ کہنا کہ لوگوں نے نماز جنازہ نہیں پڑھی بلکہ صرف درود پڑھا تھا اس کا کوئی حوالہ باسند صحیح مجھے نہیں ملا۔ سیدنا ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

نماز جنازہ میں سنت یہ ہے کہ تم تکبیر کہو پھر سورہ فاتحہ پڑھو پھر نبی ﷺ پر درود پڑھو، پھر خاص طور پر میت کے لئے دعا کرو، قراءت صرف پہلی تکبیر میں کرو پھر اپنے دل میں (یعنی سراً) دائیں طرف سلام پھیر دو۔

(منتقی ابن الجارود: ۵۴۰ ومصنف عبدالرزاق: ۶۴۲۸ وسندہ صحیح، الحدیث حضرو: ۳ ص ۲۶)

یہ بات ظاہر ہے کہ جس عمل کو صحابہ کرام سنت سمجھتے تھے وہ اسی پر عامل تھے لہٰذا جو شخص یہ کہتا ہے کہ صحابہ نے آپ ﷺ کا مسنون جنازہ نہیں پڑھا بلکہ صرف درود ہی پڑھا تھا وہ صحیح دلیل پیش کرے۔

ان مختلف جماعتوں کی نماز جنازہ میں امام کون کون تھے اس کا کوئی ثبوت کسی صحیح حدیث میں نہیں ہے۔ واللہ اعلم [الحدیث: ۱۶]

قبرستان میں عورتوں کا جانا

سوال کیا عورتوں کا قبرستان جانا کبھی کبھار جائز ہے کہ نہیں؟ (ایک سائل)

الجواب عورتوں کا اپنے قریبی رشتہ داروں کی قبروں کی زیارت کے لئے کبھی کبھار قبرستان جانا جائز ہے۔

ابن ابی ملیکہ رحمہ اللہ (تابعی) سے روایت ہے کہ ایک دن عائشہ (رضی اللہ عنہا) قبرستان سے آئیں تو میں نے پوچھا: اے ام المومنین! آپ کہاں سے آئی ہیں؟

انھوں نے فرمایا: اپنے بھائی عبدالرحمٰن بن ابی بکر (رضی اللہ عنہ) کی قبر سے۔

میں نے کہا: کیا رسول اللہ ﷺ نے قبروں کی زیارت سے منع نہیں کیا تھا؟

انھوں نے فرمایا: جی ہاں! آپ نے منع کیا تھا پھر (بعد میں) زیارت کا حکم دے دیا تھا۔

(المستدرک للحاکم ۱/۳۷۶ ح ۱۳۹۲، وسندہ صحیح وصححہ الذہبی)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عورتوں کے لئے قبرستان جانے کی ممانعت والی حدیث منسوخ ہے لیکن دو باتیں یاد رکھیں:

۱: رسول اللہ ﷺ نے اُن عورتوں پر لعنت بھیجی ہے جو کثرت سے قبروں کی زیارت کرتی ہیں۔ دیکھئے سنن الترمذی (۱۰۵۶، وقال: "حسن صحیح" وسندہ حسن) وصححہ ابن حبان (الاحسان: ۳۱۷۸)

۲: اپنے محارم کے علاوہ غیروں کی قبروں کی زیارت کے لئے جانا عورتوں کے لئے جائز نہیں ہے۔ (دیکھئے سنن ابی داود: کتاب الجنائز باب فی التعزیہ ح ۳۱۲۳ وسندہ حسن واُخطا من ضعفہ)

[الحدیث: ۵۷]

اصول، تخریج اور تحقیقِ روایات

مسئلہ تدلیس اور محدثین

سوال بعض محدثین مدلس راوی کی عن والی روایت کو مطلقاً نہیں مانتے خواہ وہ بخاری مسلم کی کیوں نہ ہو اور بعض اہلِ حدیث علماء مدلس راوی طبقۂ اولیٰ اور ثانیہ کی عن والی روایت قبول کرتے ہیں۔ البانی رحمہ اللہ بعض جگہ بلکہ اکثر جگہ پر مدلس راوی کی عن والی روایت (بغیر تحدیث اور ثقہ متابعت کے) صحیح یا حسن گردانتے ہیں لیکن بعض جگہ وہ مدلس راوی کی سکتات والی روایت میں حسن بصری اور فاتحہ خلف الامام والی روایت (فجر کی نماز) میں مکحول اور محمد بن اسحاق پر شدید جرح کرتے ہیں۔ اور بعض محدثین کا یہ قول ہے کہ اگر (مدلس راوی) ثقہ اساتذہ سے روایت کرنے میں تدلیس کرے تو وہ قابل قبول ہوگی۔ یعنی ابن عبدالبر، سیوطی اور ابن حبان وغیرہ۔

غالباً صرف امام شافعی اس کو نہیں مانتے۔ سدل فی الصلاۃ والی روایت میں ایک مدلس راوی عن سے روایت کرتا ہے بغیر تحدیث اور ثقہ متابعت کے، البانی رحمہ اللہ اس کو صحیح گردانتے ہیں۔ (حبیب اللہ۔ پشاور)

الجواب بعض علماء کے نزدیک اگر مدلس راوی ضعیف راویوں سے تدلیس کرے تو اس کی عن والی روایت ضعیف ہوتی ہے۔ مثلاً حافظ ذہبی نے کہا:

” ثم إن کان المدلّس عن شیخه ذا تدلیس عن ثقات فلا باس و إن کان ذا تدلیس عن الضعفاء فمردود “ پھر اگر مدلس اپنے ثقہ استاذوں [illegible] تدلیس کرے تو (اس کی روایت میں) کوئی حرج نہیں ہے اور اگر ضعیف [illegible] تدلیس کرے تو (اس کی روایت) مردود ہے۔ (الموقظہ ص ۴۵)

لیکن تدلیس کے بارے میں راجح وہی مسلک ہے جو امام شافعی رحمہ اللہ نے کتاب الرسالۃ میں لکھا ہے کہ ”ومن عرفناہ دلس مرۃ .... لا نقبل من مدلس حدیثاً حتی یقول فیه حدثني أو سمعت“ (ص ۳۷۹، ۳۸۰ فقرۃ ۱۰۳۳، ۱۰۳۵)

یعنی جس آدمی سے ساری زندگی میں صرف ایک دفعہ تدلیس ثابت ہو جائے تو اس کی عدم تصریحِ سماع اور عدمِ متابعت والی روایت (غیر صحیحین میں) ضعیف ہوتی ہے۔ بشرطیکہ اس راوی کا مدلس ہونا صحیح ثابت ہو جائے، صحیحین کا استثناء دوسرے دلائل کے ساتھ ثابت ہے۔ تفصیل کے لئے میرا رسالہ "التأسيس في مسئلة التدليس" دیکھیں۔ لہٰذا سدل سے ممانعت والی مرفوع روایت ضعیف ہی ہے۔ [شہادت جنوری ۲۰۰۳ء]

سفیان ثوری رحمہ اللہ اور اُن کی تدلیس

سوال سفیان ثوری رحمہ اللہ کی تدلیس اور معنعن روایات کے بارے میں آپ کے نزدیک راجح قول کیا ہے؟ (محمد محسن سلفی، کراچی)

الجواب سفیان ثوری کے بارے میں راجح یہی ہے کہ وہ (ثقہ امام فقیہ مجتہد امیر المومنین فی الحدیث ہونے کے ساتھ ساتھ) مدلس بھی تھے اور ضعفاء وغیرہم سے تدلیس کرتے تھے لہٰذا غیر صحیحین میں ان کی معنعن روایت، عدمِ متابعت وعدمِ تصریحِ سماع کی صورت میں ضعیف ومردود ہوتی ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا انھیں طبقۂ ثانیہ میں شمار کرنا صحیح نہیں بلکہ وہ طبقۂ ثالثہ کے فرد ہیں، جیسا کہ حافظ العلائی (صحیح یہ ہے کہ حاکم) نے انھیں طبقۂ ثالثہ میں ذکر کیا ہے۔ (دیکھئے جامع التحصیل ص ۹۹، اور نور العینین ص ۱۲۷، طبع جدید ص ۱۳۸)

حافظ ابن حبان رحمہ اللہ نے فرمایا: "**أما المدلسون الذين هم ثقات وعدول فإنا لا نحتج بأخبارهم إلا ما بينوا السماع فيما رووا مثل الثوري والأعمش وأبي إسحاق وأضرابهم.... إلخ**" اور ایسے مدلس راوی جو ثقہ وعادل تھے تو ہم ان کی احادیث سے حجت نہیں پکڑتے سوائے اس کے کہ وہ تصریحِ سماع کریں جو انھوں نے روایت کیا ہے، مثلاً ثوری، اعمش، ابو اسحاق اور ان جیسے دوسرے.....الخ

(الاحسان ج ۱ ص ۹۰ وفیہ: ثم بدل ھم، دوسرا نسخہ ج ۱ ص ۱۶۱)

اور یہی تحقیق راجح وصحیح ہے۔ راقم الحروف نے اسے نور العینین (طبع جدید ص ۱۳۴، ۱۳۸) اور التاسیس فی مسئلۃ التدلیس (مطبوعہ ماہنامہ محدث لاہور جنوری ۱۹۹۶ء ج ۲۷ عدد ۴،

ماہنامہ الحدیث حضرو: ۳۴) میں اختیار کیا ہے۔

یاد رہے کہ عبدالرشید انصاری صاحب کے نام میرے ایک خط (۱۹/۸/۱۴۰۸ھ) میں سفیان ثوری کے بارے میں یہ لکھا گیا تھا:

''طبقہ ثانیہ کا مدلس ہے جس کی تدلیس مضر نہیں ہے'' (جرابوں پر مسح ص ۴۰)

میری یہ بات غلط ہے میں اس سے رجوع کرتا ہوں لہٰذا اسے منسوخ و کالعدم سمجھا جائے گا۔

عینی حنفی نے لکھا ہے: ''وسفیان من المدلسین والمدلس لا یحتج بعنعنته إلا أن یثبت سماعه من طریق آخر'' اور سفیان (ثوری) مدلسین میں سے ہیں اور مدلس کی عن والی روایت سے حجت نہیں پکڑی جاتی اِلا یہ کہ دوسری سند سے سماع کی تصریح ثابت ہو جائے۔ (عمدۃ القاری ۳/۱۱۲) [شہادت، اپریل ۲۰۰۳ء]

روایات میں وجۂ ترجیح

سوال کسی حدیث میں ایک راوی موصول اور دوسرا موقوف روایت بیان کرے تو کونسی (روایت) کو ترجیح دی جائے گی۔ موصول کو یا موقوف کو؟ تفصیل ضرور لکھیں۔ نیز زیادتی ثقہ کے بارے میں علمائے حدیث کا راجح موقف کیا ہے؟ (ایک سائل)

الجواب اس بارے میں محدثین کا اختلاف ہے۔ میری تحقیق میں اگر موصول کا راوی ثقہ اور منقطع کے راوی ثقات ہیں، یا مرفوع کا راوی ثقہ اور موقوف کے راوی ثقات ہیں تو موصول و مرفوع کو ترجیح ہوگی بشرطیکہ روایتِ مذکورہ کو جمہور محدثین نے شاذ و معلول نہ قرار دیا ہو۔

[زیادتیٔ ثقہ پر راقم الحروف کی مفصل تحقیق کے لئے دیکھئے تحقیقی مقالات جلد دوم: صحیح مسلم کی ایک حدیث کا دفاع]

تنبیہ: صحیحین کی روایات کو بھی دوسری روایات پر عام ترجیح حاصل ہے۔

[شہادت، فروری ۲۰۰۲ء]

حاکم، ترمذی اور ابن حبان کا تساہل؟!

سوال امام حاکم رحمہ اللہ کی تصحیح اور امام ترمذی رحمہ اللہ کی تحسین اور امام ابن حبان رحمہ اللہ کی توثیق کا جمہور محدثین کے نزدیک کیا اعتبار ہے؟ (ایک سائل)

الجواب

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علٰی رسولہ الأمین ، أما بعد:

مذکورہ تینوں محدثین کے بارے میں تحقیقی جواب علی الترتیب درج ذیل ہے:

۱) معرفۃ علوم الحدیث، تاریخ نیشاپور، المدخل اور المستدرک علی الصحیحین جیسی کتبِ مفیدہ کے مصنف ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ بن محمد بن حمدویہ بن نعیم عرف ابن البیع النیسابوری رحمہ اللہ (متوفی ۴۰۵ھ) کے بارے میں محدثینِ کرام کے درمیان اختلاف تھا۔

جرح کی تفصیل درج ذیل ہے:

ا: ابوالفضل بن الفلکی الہمذانی (علی بن الحسین بن احمد بن الحسن رحمہ اللہ، متوفی ۴۲۷ھ) سے روایت ہے کہ "وکان ابن البیع یمیل إلی التشیع" حاکم تشیع کی طرف مائل تھے۔ (تاریخ بغداد ۵/۴۷۴ ت ۳۰۲۴)

یہ قول ابن الفلکی سے ثابت نہیں ہے کیونکہ "بعض أصحابنا" مجہول راوی ہے۔

۲: محمد بن طاہر المقدسی الحافظ نے کہا: حاکم نے کہا: حدیث الطیر (سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور پرندے کے گوشت) والی حدیث صحیح ہے اور صحیحین میں یہ روایت نہیں لی گئی۔

ابن طاہر نے کہا: یہ موضوع حدیث ہے جسے کوفہ کے ساقط راویوں نے مشہور اور مجہول راویوں کی سند کے ساتھ انس (رضی اللہ عنہ) وغیرہ سے بیان کیا ہے۔ حاکم کی حالت دو باتوں سے خالی نہیں ہے۔ یا تو وہ صحیح سے جاہل تھا لہٰذا اُس کے قول پر اعتماد نہیں کرنا چاہئے۔ یا وہ جانتا تھا پھر اس کے خلاف کہتا تھا تو وہ اس طرح معاند کذاب بن جاتا ہے۔

(المنتظم لابن الجوزی ۱۵/۱۱۰)

ابن طاہر کی یہ جرح کئی وجہ سے مردود ہے مثلاً:

اول: حاکم کی وفات کے بعد ابن طاہر المقدسی ۴۴۸ھ میں پیدا ہوئے تھے لہٰذا اُن کی حاکم سے بے سند نقل مردود ہے۔

دوم: حدیث الطیر کی بہت سی سندوں میں سے تاریخ دمشق لابن عساکر (۱۹۲/۴۵) میں امام دارقطنی والی روایت حسن لذاتہ ہے۔

اس روایت کی مختصر تحقیق درج ذیل ہے:

① ابن عساکر کے استاذ ابو غالب بن البناء ثقہ تھے۔ دیکھئے سیر اعلام النبلاء (۶۰۳/۱۹)

② ابن البناء کے استاذ ابوالحسین بن الآبنوسی ثقہ تھے۔ دیکھئے النبلاء (۸۵/۱۷)

③ ابن الآبنوسی کے استاذ امام دارقطنی مشہور ثقہ امام تھے۔

④ امام دارقطنی کے استاذ محمد بن مخلد بن حفص الدوری ثقہ تھے۔

دیکھئے تاریخ بغداد (۳۱۱/۳ ت ۱۴۰۶)

⑤ محمد بن مخلد کے استاذ حاتم بن اللیث بن الحارث الجوهری ثقہ تھے۔

دیکھئے تاریخ بغداد (۲۴۵/۸ ت ۴۳۴۶)

⑥ حاتم بن اللیث کے استاذ عبیداللہ بن موسیٰ بن باذام العبسی الکوفی صحیحین کے راوی اور ثقہ وصدوق تھے۔ حافظ ابن حجر نے کہا: ''ثقة كان يتشيع'' وہ ثقہ تھے (اور) تشیع کے قائل تھے۔ (تقریب التہذیب: ۴۳۴۵)

ثقہ وصدوق عندالجمہور راوی پر تشیع وغیرہ کی جرح سے اُس کی حدیث ضعیف نہیں ہو جاتی بلکہ حسن یا صحیح رہتی ہے لہٰذا یہاں تشیع کی جرح مردود ہے۔

⑦ عبیداللہ بن موسیٰ کے استاذ عیسیٰ بن عمر الاسدی الہمدانی ابو عمر القاری الاعمیٰ، صاحب الحروف ثقہ تھے۔ دیکھئے تقریب التہذیب (۵۳۱۴)

⑧ عیسیٰ بن عمر القاری کے استاذ اسماعیل بن عبدالرحمٰن بن ابی کریمہ السدی (سدی کبیر) صحیح مسلم کے راوی اور جمہور محدثین کے نزدیک موثق ہونے کی وجہ سے صدوق حسن الحدیث تھے۔ نیز دیکھئے تحریر تقریب التہذیب (۱۳۶/۱ ت ۴۶۳)

آپ پر تشیع کا الزام ہے جو کہ جمہور کی توثیق کے بعد یہاں مردود ہے۔

فائدہ: جمہور محدثین کے نزدیک ثقہ وصدوق راوی پر اگر بدعتی ہونے کا اعتراض ہو اور اس کی روایت بظاہر اس کے مسلک کی تائید میں ہو، تب بھی صحیح یا حسن ہوتی ہے۔

تفصیل کے لئے دیکھئے ''التنکیل بما فی تأنیب الکوثری من الاباطیل'' (۴۲/۱۔۵۲)

اور اس سلسلے میں جوزجانی (بدعتی) کا اصول صحیح نہیں ہے لہٰذا روایتِ مذکورہ کو تشیع کا الزام لگا کر رد کرنا غلط ہے۔

⑨ اسماعیل بن عبدالرحمٰن السدی کے استاذ سیدنا انس بن مالک مشہور صحابی تھے۔ رضی اللہ عنہما

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ امام دارقطنی کی بیان کردہ اس روایت کی سند حسن لذاتہ ہے جس میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس تحفے میں پرندے لائے گئے تو آپ نے انھیں تقسیم کر دیا اور ایک پرندہ رکھ لیا پھر فرمایا: اے میرے اللہ! میرے پاس اس پرندے کا گوشت کھانے کے لئے وہ شخص بھیج جسے تُو اپنی مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب رکھتا ہے۔

پھر علی بن ابی طالب (رضی اللہ عنہ) تشریف لائے تو انھوں نے آپ کے ساتھ وہ پرندہ کھایا۔

امام دارقطنی نے فرمایا: اس حدیث کو صرف عیسیٰ بن عمر نے سدی سے بیان کیا ہے۔

اس حدیث کے بہت سے شواہد بھی ہیں مثلاً:

① حديث قطن بن نسير بسنده عن عبدالله بن المثنى عن عبدالله بن أنس بن مالك عن أبيه ... إلخ (دیکھئے الکامل لابن عدی ۵۰۷/۲، دوسرا نسخہ ۳۸۵/۲)

اس میں قطن بن نسیر جمہور کے نزدیک ضعیف ہے اور باقی سند حسن لذاتہ ہے۔

② حديث الطبراني بسنده عن يحي بن أبي كثير عن أنس بن مالك رضي الله عنه ... إلخ (المعجم الاوسط ۴۴۲/۲، ۴۴۳ ح ۱۷۶۵)

اس کی سند دو وجہ سے ضعیف ہے:

اول: امام طبرانی کا استاذ ابوبکر احمد بن الجعد الوشاء نامعلوم التوثیق ہے۔

دوم: یحییٰ بن ابی کثیر کی سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت منقطع و مدلّس ہے۔

③ حديث الطبراني بسنده عن سفينة رضي الله عنه ... إلخ

(المعجم الکبیر ۷/۸۲ ح ۶۴۳۷)

اس کی سند دو وجہ سے ضعیف ہے:

اول: طبرانی کے استاذ عبید العجلی کی توثیق نامعلوم ہے۔

دوم: سلیمان بن قرم ضعیف ہے۔

جو لوگ جمع تفریق کر کے حدیث کو حسن لغیرہ بنا لیتے ہیں، اُن کے اصول سے بھی حدیث الطیر حسن بنتی ہے۔ حافظ ابن حجر نے اپنے جوابات میں ترمذی والی روایت کو ''وھو حدیث حسن'' قرار دیا ہے۔ (دیکھئے ''اجوبۃ الحافظ ابن حجر العسقلانی عن احادیث المصابیح'' المطبوع مع المشکوٰۃ تخریج الالبانی ۳/۱۷۹۱، الطبعۃ الثانیہ ۱۴۰۵ھ)

تنبیہ: حدیث الطیر کی تصحیح پر ایک دیوبندی فخر الدین الغلانی نے عربی زبان میں ''نیل الخیر بحدیث الطیر'' نامی کتاب لکھی ہے جو ہمارے پاس موجود ہے۔

اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ حافظ ابن طاہر کا حدیث الطیر کی وجہ سے حاکم نیشاپوری پر اعتراض مردود ہے۔

۳: روایت ہے کہ شیخ الاسلام ابو اسماعیل عبداللہ بن محمد الہروی رحمہ اللہ نے کہا:

ابو عبداللہ الحاکم حدیث میں امام اور رافضی خبیث ہے۔ (لسان المیزان ۵/۲۳۳، دوسرا نسخہ ۶/۲۵۱)

یہ قول تین وجہ سے مردود ہے:

اول: باسند صحیح ابن طاہر سے مروی نہیں ہے۔

دوم: حافظ ذہبی نے اسے رد کر دیا ہے۔ دیکھئے میزان الاعتدال (۳/۶۰۸)

سوم: یہ قول جمہور کی توثیق کے خلاف ہے۔

۴: بعض علماء نے حاکم کی تصحیح فی المستدرک پر کلام کیا ہے جس کا اُن کی عدالت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ حاکم کے بارے میں ابو عبدالرحمٰن السلمی (ضعیف) کی روایت بھی مردود ہے۔

اس جرح کے مقابلے میں جمہور کی توثیق کے بعض حوالے درج ذیل ہیں:

① خطیب بغدادی نے کہا: ''وكان ثقة ''اور وہ (حاکم) ثقہ تھے۔

(تاریخ بغداد ۴۷۳/۵ ت ۳۰۲۴)

② ابن الجوزی نے کہا: ''وكان ثقة ''اور وہ ثقہ تھے۔ (المنتظم ۱۰۹/۱۵ ت ۳۰۵۹)

③ حافظ ذہبی نے ''صح '' کی رمز لکھ کر اُن کی توثیق ثابت کی اور فرمایا:

''إمام صدوق لكنه يصحح في مستدركه أحاديث ساقطة ... ''وہ سچے امام تھے لیکن وہ اپنی مستدرک میں ساقط روایات کو صحیح کہتے تھے...الخ (میزان الاعتدال ۶۰۸/۳)

اور فرمایا: ''الإمام الحافظ الناقد العلامة شيخ المحدثين ... ''

(سیر اعلام النبلاء ۱۶۳/۱۷)

حافظ ذہبی نے مزید لکھا: ''وكان من بحور العلم على تشيع قليل فيه ''

وہ علم کے سمندروں میں سے تھے اور اُن میں تھوڑا سا تشیع تھا۔ (النبلاء ۱۶۵/۱۷)

④ حافظ ابن کثیر نے انھیں علم، حفظ، امانت، دیانت اور ثقاہت وغیرہ سے موصوف قرار دیا۔ دیکھئے البدایہ والنہایہ (نسخہ محققہ ۲۴/۱۳)

⑤ ابوسعد السمعانی نے حاکم کو فضیلت، علم، معرفت، حفظ اور فہم سے متصف قرار دیا۔

دیکھئے الانساب (۴۳۲/۱، البیع)

⑥ حافظ ابن حجر نے اُن کا دفاع کیا اور انھیں جلیل القدر قرار دیا۔

دیکھئے لسان المیزان (۲۳۳/۵، دوسرا نسخہ ۲۵۱/۶)

⑦ ابوالحسن عبدالغافر بن اسماعیل الفارسی رحمہ اللہ (متوفی ۵۲۹ھ) نے کہا:

''إمام أهل الحديث في عصره و العارف به حق معرفته ''

آپ اپنے زمانے میں اہلِ حدیث کے امام اور حدیث کی معرفت کا حق رکھتے تھے۔

(الحلقۃ الاولیٰ من تاریخ نیسابور، المنتخب من السیاق ص ۵)

⑧ عبدالوہاب بن علی بن عبدالکافی السبکی (متوفی ۷۷۱ھ) نے کہا:

''كان إمامًا جليلاً وحافظًا حفيلاً، اتفق على امامته وجلالته و عظم قدره ''

آپ جلیل القدر امام اور بہت بڑے حافظ تھے، آپ کی امامت، جلالت اور عظمتِ قدر پر اتفاق ہے۔ (طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۲ص ۴۴۳ ت ۳۲۹)

⑨ ابوالخیر محمد بن محمد الجزری (متوفی ۸۳۳ھ) نے کہا:

"وكان إمامًا ثقة صدوقًا إلا أن في مستدركه أحاديث ضعيفة ..."

وہ ثقہ صدوق امام تھے لیکن اُن کی (کتاب) مستدرک میں ضعیف حدیثیں ہیں...

(غایۃ النہایۃ فی طبقات القراء ج ۲ص ۱۸۵ ات ۳۱۷۸)

⑩ امام بیہقی نے ایک حدیث کے تحت حاکم کو ثقہ کہا۔

دیکھئے السنن الکبریٰ للبیہقی (۷۳/۲) اور نور العینین (طبع جدید ص ۱۱۹، ۱۲۰)

جمہور کی اس توثیق کے بعد حاکم نیشاپوری پر جرح مردود ہے اور خلاصہ یہ کہ وہ ثقہ و صدوق شیعی تھے۔

حافظ ذہبی نے امام یحییٰ بن معین، ابو حاتم الرازی اور جوزجانی کے بارے میں کہا کہ یہ متعنت (متشدد) تھے اور پھر فرمایا:

"وقسم في مقابلة هولاء كأبي عيسى الترمذي و أبي عبدالله الحاكم و أبي بكر البيهقي: متساهلون و قسم كالبخاري وأحمد بن حنبل و أبي زرعة و ابن عدي معتدلون منصفون."

اور ان کے مقابلے میں ایک قسم مثلاً ابوعیسیٰ الترمذی، ابوعبداللہ الحاکم اور ابوبکر البیہقی متساہل تھے اور ایک قسم مثلاً بخاری، احمد بن حنبل، ابوزرعہ (الرازی) اور ابن عدی معتدل، انصاف کرنے والے تھے۔ (ذکر من یعتمد قولہ فی الجرح والتعدیل ص ۱۵۹، یا ص ۲)

حافظ ذہبی نے اصولِ حدیث میں اپنی ایک مشہور کتاب میں لکھا:

"... ومنهم من هو معتدل و منهم من هو متساهل.

فالحاد فيهم: يحي بن سعيد وابن معين و أبو حاتم و ابن خراش وغيرهم.

والمعتدل فيهم: أحمد بن حنبل والبخاري وأبو زرعة.

والمتساهل کالترمذي والحاکم والدارقطني في بعض الأوقات."

اوران محدثین میں بعض معتدل اور بعض متساہل تھے۔

اُن میں یحییٰ بن سعید (القطان)، ابن معین، ابو حاتم (الرازی) اور ابن خراش (الرافضی) متشدد تھے۔

احمد بن حنبل، بخاری اور ابوزرعہ (الرازی) معتدل تھے۔

ترمذی، حاکم اور بعض اوقات میں دارقطنی متساہل تھے۔ (الموقظہ ص ۸۳)

تنبیہ: امام دارقطنی کے بارے میں حافظ ذہبی کا بیان محلِ نظر ہے۔

ذہبی کے بعد عام علماء اُنھی کے نقشِ قدم پر چلے مثلاً سخاوی نے کہا:

"وقسم منهم متسمح کالترمذي والحاکم، قلت: وکابن حزم ... وقسم معتدل کأحمد والدارقطني وابن عدي."

اور اُن میں سے ایک قسم متساہل تھی مثلاً ترمذی اور حاکم، میں (سخاوی) نے کہا: اور مثلاً ابن حزم .... اور ایک قسم معتدل تھی مثلاً احمد (بن حنبل)، دارقطنی اور ابن عدی۔

(الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ ص ۱۶۸، المتکلمون فی الرجال ص ۱۳۷)

اس تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ حاکم نیشاپوری ثقہ وصدوق ہونے کے ساتھ حدیث پر صحیح کا حکم لگانے میں متساہل تھے۔

تنبیہ: میزان الاعتدال اور لسان المیزان وغیرہما میں حاکم کے بارے میں بہت سے اقوال باسند صحیح ثابت نہیں ہیں لہٰذا بغیر تحقیق کے ان اقوال سے بچ کر رہیں۔

۲) امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ الترمذی رحمہ اللہ (متوفی ۲۷۹ھ) ثقہ متفق علیہ تھے۔ دیکھئے الارشاد فی معرفۃ علماء الحدیث للخلیلی (۳/۹۰۵)

انھیں حافظ ابن حبان (الثقات ۹/۱۵۳) اور ذہبی (میزان الاعتدال ۳/۶۷۸) وغیرہما نے ثقہ قرار دیا۔ امام ترمذی کے تصحیح وتحسین میں تساہل کا ذکر میزان الاعتدال میں بھی ملتا ہے۔ مثلاً حافظ ذہبی نے کہا: "فلهذا لا یعتمد العلماء علٰی تصحیح الترمذي"

پس اس وجہ سے ترمذی کی تصحیح پر علماء اعتماد نہیں کرتے۔

(میزان الاعتدال ۳/ ۴۰۷ ترجمہ کثیر بن عبداللہ العوفی)

حافظ ذہبی نے مزید کہا: ''فلا یغتر بتحسین الترمذي فعند المحاققة غالبها ضعاف'' پس ترمذی کی تحسین سے دھوکا نہیں کھانا چاہئے کیونکہ محققین کے نزدیک ایسی غالب (عام، اکثر) روایتیں ضعیف ہیں۔ (میزان الاعتدال ۴/ ۴۱۶ ترجمۃ یحییٰ بن یمان)

امام ترمذی کو متساہل قرار دینے میں ذہبی کے بعد عام علماء انھی کے نقشِ قدم پر چلے کہ امام ترمذی متساہل تھے۔

۴) حافظ محمد بن حبان ابو حاتم البستی رحمہ اللہ (متوفی ۳۵۴ھ) کے بارے میں محدثینِ کرام کے درمیان اختلاف تھا۔

ابوالفضل احمد بن علی بن عمرو السلیمانی، یحییٰ بن عمار، ابو اسماعیل الہروی، ابو علی النیسابوری، محمد بن طاہر المقدسی اور عبدالصمد بن محمد بن محمد بن صالح (؟) نے اُن پر جرح کی بلکہ سلیمانی نے انھیں کذابین میں شمار کر کے ابو حاتم سہل بن السری الحافظ سے نقل کیا:

''لا تکتب عنه فإنه کذاب'' اُس سے نہ لکھو کیونکہ وہ کذاب ہے۔

(معجم البلدان لیاقوت الحموی ۱/ ۴۱۹)

ابو حاتم سہل بن السری بن الخضر الخذاء البخاری الحافظ کی صریح توثیق کہیں نہیں ملی اور ثقہ محدث سلیمانی کے بارے میں حافظ ذہبی نے لکھا:

'' رأیت للسلیماني کتاباً فیه حط علی کبار فلا یسمع منه ما شذ فیه . ''

میں نے سلیمانی کی کتاب دیکھی ہے جس میں اکابر پر جرح ہے لہٰذا اُن کی شاذ بات کو نہ سنا جائے۔ (سیر اعلام النبلاء ۱۷/ ۲۰۲)

بعض کی اس جرح کے مقابلے میں جمہور کی توثیق درج ذیل ہے:

۱: خطیب بغدادی نے حافظ ابن حبان کے بارے میں کہا:

''وکان ثقة ثبتاً فاضلاً فهماً'' اور آپ ثقہ ثبت، فاضل سمجھدار تھے۔

(تاریخ دمشق لابن عساکر ۵۵/ ۱۸۹، وسندہ صحیح)

۲: اُن کے شاگرد حاکم نیشاپوری نے اُن سے اپنی کتاب المستدرک علی الصحیحین (۲/۴۵۲ ح ۳۶۸۸) میں روایت لی اور کہا: ''صحیح علی شرط مسلم''

معلوم ہوا کہ وہ اپنے شاگرد حاکم کے نزدیک ثقہ وصدوق تھے۔

حاکم نے کہا: آپ لغت، فقہ، حدیث اور وعظ میں علم کا خزانہ تھے اور عقل مند مردوں میں سے تھے۔ (تاریخ دمشق ۱۸۹/۵۵، وسندہ صحیح، تاریخ نیشاپور طبقۃ شیوخ الحاکم ص ۴۰۱ ت ۲۹۳)

نیز دیکھئے الانساب للسمعانی (۱/۳۴۹) اور تاریخ الاسلام للذہبی (۲۶/۱۱۲) وغیرہما

حاکم نے مزید کہا: '' أبو حاتم کبیر فی العلوم و کان یحسد بفضلہ و تقدمہ''

ابو حاتم (ابن حبان) علم میں بڑے تھے اور آپ کی فضیلت اور (علم میں) آگے بڑھنے کی وجہ سے آپ سے حسد کیا جاتا تھا۔ (تاریخ دمشق ۱۹۰/۵۵، وسندہ صحیح، تاریخ نیشاپور ص ۴۰۲)

۳: الضیاء المقدسی نے آپ سے اپنی مشہور کتاب المختارۃ میں روایتیں لیں۔ مثلاً: دیکھئے ج ۱ ص ۳۹۹ ح ۲۸۲، ج ۲ ص ۳۷۷ ح ۷۵۹

۴: حافظ ذہبی نے اُن کی بیان کردہ ایک حدیث کو مسلم کی شرط پر صحیح کہا۔

دیکھئے تلخیص المستدرک (۲/۴۵۲)

حافظ ذہبی نے کہا: '' الإمام العلامۃ الحافظ المجود شیخ خراسان ...''

امام علامہ حافظ، بہترین روایتیں بیان کرنے والے، خراسان کے شیخ ...(سیر اعلام النبلاء ۱۶/۹۳)

نیز دیکھئے تذکرۃ الحفاظ (۳/۹۲۰ ت ۸۷۹) وغیرہ۔

۵: حافظ ابن ماکولا نے کہا: '' وکان من الحفاظ الأثبات '' اور وہ (ابن حبان) ثقہ حفاظ میں سے تھے۔ (الاکمال ۲/۳۱۶)

حافظ ابن ماکولا نے مزید کہا: ''حافظ جلیل کثیر التصانیف '' آپ کثرت سے کتابیں لکھنے والے جلیل الشان حافظ تھے۔ (الاکمال ۱/۴۳۲، تاریخ دمشق ۱۹۰/۵۵)

۶: حافظ ابو سعد السمعانی نے کہا: ''امام عصرہ ، صنف تصانیف لم یسبق إلی مثلھا '' وہ اپنے زمانے کے امام تھے، آپ نے ایسی کتابیں لکھیں جیسی آپ سے پہلے کسی

نے نہیں لکھی تھیں۔ (الانساب ج ا ص ۳۴۸، ۳۴۹ بست)

۷: یاقوت الحموی نے کہا: ''کان بحرًا فی العلوم ... '' وہ علوم کا دریا تھے۔

(معجم البلدان ۱/۴۱۵)

۸: ابن اثیر الجزری نے کہا: وہ اپنے زمانے کے امام تھے، آپ نے ایسی کتابیں لکھیں جیسے آپ سے پہلے کسی نے نہیں لکھیں۔ (اللباب فی تہذیب الانساب ۱/۱۰۵)

۹: حافظ ابن کثیر نے کہا: ''و أحد الحفاظ الکبار المصنفین المجتہدین''

اور وہ بڑے حفاظ، مصنفین (اور) مجتہدین میں سے تھے۔ (البدایہ والنہایہ ۱۱/۲۲۷ وفیات ۳۵۴ھ)

۱۰: عبدالوہاب بن علی السبکی نے کہا: ''الحافظ الجلیل الإمام ... ''

(طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ۲/۱۰۰ ت ۱۲۵)

۱۱: ابن العماد الحنبلی نے کہا: '' صاحب الصحیح کان حافظًا ثبتًا إمامًا حجۃ ... ''
صحیح (ابن حبان) والے، آپ ثقہ حافظ، امام (حدیث میں) حجت تھے...

(شذرات الذہب ۳/۱۶)

۱۲: ابن عساکر نے لکھا: '' أحد الأئمۃ الرحالین و المصنفین المحسنین ''
آپ کثرت سے سفر کرنے والے اماموں سے ایک اور بہترین مصنفین میں سے تھے۔

(تاریخ دمشق ۵۵/۱۸۷)

۱۳: فقیہ احمد بن محمد بن علی الطبسی نے انھیں ''شیخ '' کہا۔ دیکھئے تاریخ دمشق (۵۵/۱۹۱)

ان کے علاوہ اور بھی کئی علماء سے ان کی تعریف وثناء مروی ہے مثلاً ابوسعد عبدالرحمٰن بن محمد الادریسی وغیرہ۔

اس تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ امام ابن حبان ثقہ وصدوق تھے اور جمہور کی توثیق کے مقابلے میں اُن پر جرح مردود ہے۔

حاکم نیشاپوری کے تذکرہ میں گزر چکا ہے کہ حافظ ذہبی اور سخاوی نے ابن حبان کو متساہل قرار دیا۔ ان کے علاوہ دوسرے علماء نے بھی انھیں متساہل (اور بعض اوقات متشدد)

قرار دیا ہے۔ ذہبیٔ عصر شیخ عبدالرحمٰن بن یحییٰ المعلمی الیمانی رحمہ اللہ نے ابن حبان کی توثیق کے پانچ درجے مقرر کئے:

① جنھیں وہ صراحتاً مستقیم الحدیث اور متقن وغیرہ کہتے تھے۔

② وہ راوی جو اُن کے اساتذہ میں سے تھے جن کی مجالس میں ابن حبان بیٹھتے تھے۔

③ کثرتِ حدیث کی وجہ سے مشہور راوی تھے۔

④ ابن حبان کے کلام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس راوی کو اچھی طرح جانتے تھے۔

⑤ جو ان چاروں اقسام کے علاوہ (مثلاً مجہول و مستور) تھے۔

دیکھئے التنکیل (ج ۱ ص ۴۳۷، ۴۳۸ ت ۱۹۹)

اس سے معلوم ہوا کہ مجہول اور مستور راویوں کی توثیق میں امام ابن حبان متساہل تھے لہٰذا ایسے مقام پر اگر وہ منفرد ہوں تو اُن کی توثیق مقبول نہیں ہے۔

بعض ثقہ و صدوق راویوں پر امام ابن حبان کی جرح تشدد پر مبنی قرار دے کر رد کر دی گئی تھی۔

خلاصۃ التحقیق: حاکم، ترمذی اور ابن حبان توثیق و تصحیح میں متساہل تھے لہٰذا جس روایت کی تصحیح یا راوی کی توثیق میں اُن کا تفرد ہو تو یہ مقبول نہیں ہے لیکن جس راوی کی توثیق پر دو یا زیادہ جمع ہوں اور مقابلے میں جمہور کی صریح جرح نہ ہو تو ایسا راوی صدوق حسن الحدیث ہوتا ہے۔

فائدہ: ہمارے نزدیک بعض محدثین کو متساہل یا متشدد وغیرہ قرار دینے کے چکر سے یہ بہتر ہے کہ ہر راوی کے بارے میں تعارض اور عدمِ تطبیق کی صورت میں ہمیشہ جمہور محدثین کو ترجیح دی جائے۔ اس طرح نہ تو کوئی تعارض واقع ہوتا ہے اور نہ اسماء الرجال کا علم بازیچۂ اطفال بنتا ہے۔ وما علینا إلا البلاغ (۱۰/ جنوری ۲۰۰۹ء)

[الحدیث: ۵۹]

تنبیہ ضروری بر غلام مصطفیٰ نوری

سوال غلام مصطفیٰ نوری قادری بریلوی نے ایک کتاب لکھی ہے:

''تسوید وجہ الشیطانی بتوثیق الامام محمد بن الحسن الشیبانی''

اس کتاب میں غلام مصطفیٰ صاحب نے ماہنامہ الحدیث حضرو میں شائع شدہ آپ کے مضمون کا اپنے گمان میں جواب دیا ہے اور شیبانی مذکور کی توثیق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔آپ سے درخواست ہے کہ اس کتاب ''تسوید وجہ الشیطانی'' کا مدلل جواب دیں۔

جزاکم اللہ خیراً (محمد شفیق بن محمد رفیق، فیصل آباد)

الجواب

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلٰوۃ والسلام علٰی رسولہ الأمین، أما بعد:

راقم الحروف نے ''النصر الربانی فی ترجمۃ محمد بن الحسن الشیبانی'' کے نام سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں میزان الاعتدال اور لسان المیزان کی عبارات ترجمہ کرنے کے ساتھ ان کی تحقیق پیش کی تھی اور بعض فوائد کا اضافہ بھی کیا تھا۔ یہ مضمون ماہنامہ الحدیث حضرو: ۷ص ۱۱ تا ۲۰ میں ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا تھا اور بعد میں تحقیق واختصار سے کام لیتے ہوئے اس مضمون کو ''محمد بن الحسن بن فرقد الشیبانی اور محدثینِ کرام'' کے عنوان سے چار صفحات پر لکھ دیا تھا۔ آپ کی ارسال کردہ کتابِ مذکور کے مطالعہ کے بعد بعض الناس کے شبہات کا جواب دیتے ہوئے اس مضمون میں کافی اضافہ کر کے اس کا نام ''تائید ربانی اور ابن فرقد شیبانی'' رکھ دیا ہے۔ ''تسوید وجہ الشیطانی'' کے مصنف غلام مصطفیٰ نوری بریلوی صاحب اپنی اس کتاب میں شیبانی مذکور کی توثیق کے بارے میں متاخر علماء سے صرف دو حوالے پیش کر سکے ہیں:

۱: حاکم نے اس کی حدیث کو صحیح کہا ہے۔

عرض ہے کہ حافظ ذہبی نے بالدبوس کہہ کر اس تصحیح کو رد کر دیا ہے جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

۲: ہیثمی نے اس کی حدیث کو حسن کہا ہے۔

عرض ہے کہ حاکم اور ہیثمی کے حوالے جمہور محدثین اور کبار علماء مثلاً امام احمد، امام یحییٰ بن معین اور امام فلاس وغیرہم کے مقابلے میں کس طرح پیش ہو سکتے ہیں؟ نوری بریلوی صاحب اپنی تسوید اور ترکِ رفع یدین دونوں کتابوں کی رُو سے اسماء الرجال اور علمِ حدیث سے سراسر ناواقف، کذب وافتراء کے مرتکب اور وادیٔ تعارض وتناقض میں غوطہ زن ہیں جس کی فی الحال دس (۱۰) مثالیں پیشِ خدمت ہیں:

① امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی شیبانی پر ایک جرح کے راوی احمد بن سعد بن ابی مریم المصری ہیں جو ۲۵۳ھ میں فوت ہوئے اور ثقہ وصدوق راوی تھے۔ ان کے بارے میں نوری صاحب لکھتے ہیں: ''سنن الدارقطنی ج ۳ ص ۵ پر امام دارقطنی نے اس راوی کو ضعیف قرار دیا ہے۔'' (تسوید ص ۵۰)

عرض ہے کہ امام دارقطنی نے فرمایا: ''**وأبو بکر بن أبي مریم ضعیف**''

(سنن دارقطنی ج ۳ ص ۴ ح ۲۷۷۷)

نیز دیکھئے موسوعۃ اقوال الدارقطنی (۲/۷۳۹ ت ۴۰۱۵)

ابوبکر بن ابی مریم راوی اور ہے اور احمد بن سعد بن ابی مریم اور ہیں۔ دونوں کو ایک قرار دینا نوری صاحب کی بہت بڑی جہالت ہے۔ ابوبکر بن ابی مریم الغسانی الشامی ۱۵۶ھ میں فوت ہوا تھا اور علی بن احمد بن سلیمان المصری ۲۲۷ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ (دیکھئے النبلاء ۱۴/۴۹۶)

کیا وہ اپنی پیدائش سے بہت عرصہ پہلے فوت ہونے والے کے پاس پڑھنے کے لئے عالمِ برزخ میں تشریف لے گئے تھے؟ جس شخص کو اسماء الرجال کی الف باء کا پتا نہیں وہ کس زعم اور بل بوتے پر بڑی بڑی کتابیں اور ردود لکھ رہا ہے؟!

کیا بریلویت میں کوئی بھی اسے سمجھانے والا نہیں کہ یہ کام چھوڑ دو اور کوئی دوسرا دھندا کرو جسے تم جانتے ہو؟!

② صحیحین وسنن اربعہ کے راوی اور مشہور امام ابوحفص عمرو بن علی بن بحر بن کنیز الصیرفی الفلاس رحمہ اللہ (متوفی ۲۴۹ھ) کے بارے میں نوری صاحب نے لکھا ہے:

''جس کی ثقاہت نہیں ملی'' (تسوید ص ۳۵)

عرض ہے کہ حافظ ابن حجر العسقلانی نے کہا: ''ثقة حافظ'' (تقریب التہذیب:۵۰۸۱)

جس شخص کو تقریب التہذیب دیکھنے کا طریقہ نہیں آتا وہ اتنی بڑی ڈینگیں کیوں مار رہا ہے؟

اس طرح راویوں کے بارے میں نوری صاحب کی جہالت کی اور بھی کئی مثالیں ہیں۔

مثلاً دیکھئے تسوید ص ۳۲، ۳۵، ۵۰

③ مستدرک الحاکم (۴/۳۴۱ ح ۷۹۹۰) کی ایک حدیث کے بارے میں نوری صاحب نے لکھا ہے: ''اس حدیث کو امام حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔ اور اس کی تلخیص میں امام ذہبی نے بھی صحیح کہا ہے....'' (تسوید ص ۸۰، ۶۷، نیز دیکھئے ص ۸۴)

عرض ہے کہ حافظ ذہبی نے اس حدیث کو صحیح نہیں بلکہ ''بالدبوس'' [ڈنڈے کے زور سے] (!) کہہ کر حاکم پر تعاقب کیا ہے۔ نیز دیکھئے فیض القدیر للمناوی (۶/۴۸۹)

معلوم ہوا کہ نوری صاحب کا دعویٰ صریح جھوٹ پر مبنی ہے۔

④ امام بخاری رحمہ اللہ کے بارے میں امام ابو حاتم کا ذکر کرتے ہوئے نوری صاحب نے لکھا ہے: ''لیکن ان میں بھی تشدد تھا جس کی وجہ سے انھوں نے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو متروک تک کہہ دیا۔'' (تسوید ص ۴۷)

عرض ہے کہ امام ابو حاتم نے امام بخاری کو قطعاً متروک نہیں کہا، رہا روایت ترک کرنا تو یہ جمہور کی توثیق کے بعد کوئی جرح نہیں ہے۔

⑤ نوری صاحب نے راقم الحروف کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا ہے:

''آپ نے تو الجزء المفقود من المصنف عبدالرزاق کا صرف اس لئے انکار کر دیا ہے کہ اس کے ناسخ کی سند مؤلف تک نہیں ہے۔'' الخ (تسوید ص ۱۳)

عرض ہے کہ بریلویوں کے گھڑے ہوئے الجزء المفقود کے موضوع اور من گھڑت ہونے پر راقم الحروف نے دس دلیلیں دی ہیں جن میں سے صرف دسویں دلیل کے جواب سے ہی ساری بریلویت عاجز اور دم بخود ہے۔

دیکھئے ''جعلی جزء کی کہانی اور علمائے ربانی'' (ص۲۲ تا ۲۷، اور ص۲۹ تا ۳۳)

لہٰذا نوری صاحب کا یہ کہنا کہ ''صرف اس لئے انکار کر دیا ہے....'' جھوٹ ہے۔

فائدہ: اس جعلی جزء کے بارے میں مولانا عبدالرؤف بن عبدالمنان بن حکیم محمد اشرف سندھو حفظہ اللہ (فاضل مدینہ یونیورسٹی) نے کہا: ''یہ مکمل جزء جس میں کل چالیس اُحادیث ہیں محل نظر ہے بلکہ من گھڑت اور بے اُصل ہے اس کے بارے میں عربی زبان میں بہت تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ اسی طرح ''محدث'' اور ''الاعتصام'' وغیرہ میں بھی اس جزء کے ردّ میں مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

جب اس جزء کے بارے میں شور مچا تو حمیری نے اس کی توثیق کے لئے قلمی نسخہ ''مرکز جمعة الماجد للثقافة و التراث'' بھیجا جو کہ دوبئ میں قلمی نسخوں کا بہت بڑا مرکز ہے اس مرکز میں بحیثیت مُدَقِقُ المخطوطات۔ قلمی نسخوں کی جانچ پڑتال کا۔ کام کرنے والے ہمارے فاضل دوست شیخ شہاب الدین بن بہادر جنگ نے بتایا کہ جب ہم نے اس نسخہ کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ جعلی نسخہ ہے اور اس کی کوئی اصل نہیں ہے لہٰذا مرکز کی طرف سے دلائل وشواہد پر مبنی ایک رپورٹ تیار کر کے حمیری کو بھیج دی کہ یہ جعلی نسخہ ہے۔

شیخ محمد زیاد بن عمر نے ''شبكة سحاب السلفية''[1] میں اس مکذوب اور مصنوعی جزء پر اپنے ردّ میں ذکر کیا ہے[2] کہ شیخ ادیب کمدانی نے۔ جو کہ عیسی حمیری کی ادارت میں کام کر چکے ہیں۔[3] مجھے ٹیلیفون پر دوران گفتگو بتایا کی حمیری نے مجھے جب یہ مخطوط دکھایا تو میں نے دیکھ کر کہا کہ یہ من گھڑت ہے اور ان سے کہا کہ جس شخص نے آپ کو یہ مخطوط (قلمی نسخہ) لا کر دیا ہے اسے پوچھیں کہ جس اُصل قلمی نسخے سے اس کو نقل کیا گیا ہے وہ کہاں ہے تو

....

① یہ انٹرنیٹ پر ایک روم کا نام ہے۔

② ان کا رداب کتابی شکل میں بھی 'مجموع في كشف حقيقة الجزء المفقود (المزعوم) من مصنف عبدالرزاق'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

③ یہ حمیری دوبئ اوقاف کے مدیر رہ چکے ہیں۔

اس نے جواب دیا کہ روس کے ایک مکتبہ سے اس کو نقل کیا گیا تھا اور وہ مکتبہ لڑائی میں جل گیا ہے پھر حمیری نے اس سے مطالبہ یہ کیا کہ اس جزء کا باقی حصہ کہاں ہے مجھے وہ بھی بھیجو مگر حمیری کی اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ ایک طرف تو یہ بات ہے جب کہ اس نسخہ کے آخر میں لکھا ہے کہ اس کو (۹۳۳م) میں بغداد میں لکھا گیا۔

بہر حال بہت سے ایسے شواہد و دلائل ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ جزء من گھڑت بناوٹی اور خانہ ساز ہے اور ''مصنف عبدالرزاق'' کے ساتھ اس جزء کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ واضح رہے کہ حمیری کو یہ جزء ہندوستان کے ایک محمد امین برکاتی قادری نے لا کر دیا تھا۔''

(احناف کی چند کتب پر ایک نظر ص ۴۵)

⑥ جب امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ نے شیبانی مذکور پر جرح کی تو نوری صاحب نے انھیں متشدد و متعنت قرار دیا۔ دیکھئے تسوید ص ۴۴

اور جب ابن معین سے مرضی والی روایت آئی تو نوری صاحب نے علانیہ لکھا: ''امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ حدیث وفقہ ونقد الرجال کی مسلم شخصیت ہیں۔'' (تسوید ص ۲۷)

ایک ہی امام کی بات اگر مرضی کے خلاف ہو تو متشدد اور متعنت کا فتویٰ اور اگر مرضی کے مطابق ہو تو مسلّم شخصیت قرار دے کر تعریف کرنا وادیٔ تعارض وتناقض میں غرق ہونے کی دلیل ہے۔

⑦ ایک تابعی محارب بن دثار رحمہ اللہ جب رفع یدین کرنے کی ایک حدیث کی ایک سند میں آئے تو نوری صاحب نے امام بخاری رحمہ اللہ کا رد کرتے ہوئے لکھا:

''جس کی سند میں محارب بن دثار ہے۔ جس کے متعلق امام ابن سعد نے کہا کہ لا یحتجون به کہ محدثین اس کے ساتھ دلیل نہیں پکڑتے۔

پھر یہ شخص حضرت سیدنا عثمان غنی ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق اس کے نظریات درست نہیں تھے۔ ان مقدس حضرات کے ایمان کی گواہی یہ شخص نہیں دیتا تھا۔ تعجب ہے ایسے لوگوں سے امام رفع یدین پر دلیل

پکڑتے ہیں۔'' (ترک رفع یدین، مطبوعہ جون ۲۰۰۴ء ص ۴۲۳، ۴۲۴)

نیز محارب بن دثار کو متکلم فیہ قرار دے کر میزان الاعتدال سے جرح نقل کرنے کے بعد نوری صاحب لکھتے ہیں:

''اب آپ خود غور کریں کیا ایسے شخص کی روایت حجت ہو سکتی ہے جو حضرت عثمان غنی ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت علی شیرِ خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا گستاخ ہو۔''

(ترک رفع یدین ص ۴۴۰)

حالانکہ اسی کتاب میں نوری صاحب محارب بن دثار کی اسی روایت سے ایک استدلال کرتے ہوئے خود لکھتے ہیں:

''حضرت محارب بن دثار جو کہ کوفہ کے قاضی تھے اور صاحب علم و فضل تھے۔''

(ترک رفع یدین ص ۲۵۶)

اُن سے کوئی پوچھے کہ ایک ہی راوی کی کہیں زبردست تعریف اور کہیں شدید جرح آپ کیوں کرتے ہیں؟

⑧ ایک روایت میں آیا ہے کہ (امام) ابوعبید نے فرمایا: میں نے محمد بن الحسن سے زیادہ قرآن کا کوئی بڑا عالم نہیں دیکھا۔ اس کی سند نوری صاحب نے تاریخ بغداد (۱۷۵/۲) اور مناقب ابی حنیفہ واصحابہ للصیمری (ص ۱۲۳) سے پیش کی ہے جس میں احمد بن محمد بن الصلت بن مغلس الحمانی عرف ابن عطیہ ہے۔ ابن عطیہ مذکور کے بارے میں ذہبی نے کہا:

''وضاع'' وہ جھوٹی روایات گھڑنے والا ہے۔ (دیوان الضعفاء ۲۹/۱ ت ۵۰)

اور فرمایا: وہ ہلاک کرنے والا ہے۔ (میزان الاعتدال ۱۰۵/۱ ت ۴۱۰)

امام دارقطنی اور ابن ابی الفوارس نے کہا: وہ حدیث گھڑتا تھا۔

ابن عدی نے کہا: میں نے جھوٹے لوگوں میں اتنا بے شرم کوئی نہیں دیکھا۔

ابن حبان نے کہا: پس میں نے جان لیا کہ وہ حدیث گھڑتا ہے۔

دیکھئے لسان المیزان (ج ۱ ص ۲۷۰، ۲۷۱)

اورحافظ ذہبی نے کہا: "کذاب وضاع " یہ جھوٹا، حدیثیں گھڑنے والا ہے۔

(میزان الاعتدال ۱/۱۴۰ ح ۵۵۵)

اس کذاب کی روایت نوری صاحب بطور استدلال پیش کر رہے ہیں۔ سبحان اللہ!

⑨ ایک ثقہ عند الجمہور راوی محمد بن المظفر کے بارے میں نوری صاحب نے ابوالولید باجی کی جرح نقل کی: "کہ اس میں تشیع ظاہر ہے۔" (تسوید ص ۴۴)

اورتھوڑا آگے جا کر محمد بن عمران المرزبانی کے بارے میں کہا:

"یہ اگر چہ اہل تشیع اور صاحب اعتزال تھا مگر عتیقی نے کہا کہ حدیث کی روایت میں یہ ثقہ ہے۔" (تسوید ص ۴۲)

مرضی کے مطابق معتزلی اور رافضی راوی بھی مقبول اور مرضی کے خلاف معمولی تشیع والا راوی بھی سخت مجروح؟ کیا "خوب" انصاف ہے؟!

⑩ محمد بن فضیل ایک راوی ہیں جن کے بارے میں نوری صاحب لکھتے ہیں:

"پھر اس اثر کی سند مین محمد بن فضیل ہے جس کے متعلق ابوداود نے کہا یہ شیعہ ہے۔ ابن سعد نے کہا اس کے ساتھ دلیل نہ پکڑی جائے۔" (ترکِ رفع یدین ص ۴۲۴)

دوسری جگہ نوری صاحب نے محمد بن فضیل مذکور کی روایت کردہ ایک سند کے بارے میں لکھا: "اس سند کے تمام راوی صحیح بخاری شریف کے راوی ہیں اور ثقہ ثبت ہیں۔"

(ترکِ رفع یدین ص ۴۵۷)

اس طرح کی اور بھی کئی مثالیں ہیں۔ ثابت ہوا کہ غلام مصطفیٰ نوری قادری صاحب اسماء الرجال اور علمِ حدیث سے بالکل ناواقف، جاہل اور کورے ہیں اور دن رات اس کوشش میں مصروف ہیں کہ سفید کو سیاہ اور سیاہ کو سفید ثابت کر دیں۔

خلاصہ یہ کہ "تسوید وجہ الشیطانی..." والی کتاب مردود ہے اور اس کا مصنف علم و انصاف اور صدق و اعتدال سے کوسوں دور ہے۔

غلام مصطفیٰ بریلوی صاحب میرا نام لے کر مجھ پر رد کر رہے ہیں اور حال یہ ہے کہ وہ

میرے نام سے بالکل بے خبر ہیں۔ میرا نام محمد زبیر ہے اور قبیلہ علی زئی مگر بریلوی صاحب بار بار ''زبیر زئی'' کی رٹ لگا رہے ہیں۔ دیکھئے اس کی تسوید (ص ۴، ۵....)

علیزئی مرکب کو صرف زئی قرار دینا بہت بڑی جہالت ہے۔

حسن بن زیاد لؤلؤی حنفی کے بارے میں امام یحییٰ بن معین نے فرمایا: ''کذاب''

(تاریخ ابن معین، روایۃ الدوری: ۱۷۶۵)

ان کے علاوہ ابو حاتم الرازی، دارقطنی، شافعی، محمد بن رافع النیسابوری، الحسن بن علی الحلوانی، یزید بن ہارون، یعلیٰ بن عبید، نسائی اور عقیلی وغیرہم نے اس پر شدید جرحیں کی ہیں۔ دیکھئے ماہنامہ الحدیث: ۱۶ص ۳۰ تا ۳۷

امام یزید بن ہارون سے لؤلؤی کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا: کیا وہ مسلمان ہے؟ (الضعفاء للعقیلی ۱/ ۲۲۷ وسندہ صحیح)

حافظ ہیثمی نے کہا: اور وہ متروک ہے۔ (مجمع الزوائد ۶/ ۲۶۲)

امام محمد بن رافع النیسابوری نے فرمایا: حسن بن زیاد (نماز میں) امام سے پہلے سر اٹھاتا تھا اور امام سے پہلے سجدہ کرتا تھا۔

(الضعفاء للعقیلی ۱/ ۲۲۷، ۲۲۸ وسندہ صحیح، اخبار القضاۃ لوکیع بن خلف ۳/ ۱۸۹، الحدیث: ۱۶ص ۳۲)

ایسے مجروح عند الجمہور راوی کے بارے میں غلام مصطفیٰ صاحب نے ''اقوال الاخیار فی ثناء امام حسن بن زیاد'' لکھا ہے۔ (دیکھئے اس کی تسوید ص ۱۱۰)

معلوم ہوا کہ نوری بریلوی صاحب عدل وانصاف سے ہزاروں میل دور ضد، تعصب اور عناد کی وادی میں سرپٹ دوڑے جا رہے ہیں اور رات کو دن ثابت کرنے کے لئے ہر حیلہ بروئے کار لا رہے ہیں۔ لؤلؤی کے بارے میں ایک تحقیقی مضمون پیشِ خدمت ہے:

تلخیص نصب العماد فی جرح الحسن بن زیاد

حسن بن زیاد اللؤلؤی (متوفی ۲۰۴ھ) کے بارے میں محدثینِ کرام اور علمائے عظام کی گواہیاں اور تحقیقات پیشِ خدمت ہیں:

۱: امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ نے فرمایا: ''وحسن اللؤلؤي كذاب ''اور حسن (بن زیاد) اللؤلؤی کذاب ہے۔ (تاریخ ابن معین، روایۃ الدوری: ۱۷۶۵، الجرح والتعدیل ۳/۱۵، وسندہ صحیح، الکامل لابن عدی ۲/۷۳۱، دوسرا نسخہ ۳/۱۶۰، الضعفاء للعقیلی ۱/۲۲۸، اخبار القضاۃ ۳/۱۸۹، وسندہ صحیح)

۲: امام دارقطنی نے کہا: ''كذاب كوفي متروك الحديث ''

(تاریخ بغداد ۷/۳۱۷ وسندہ صحیح)

۳: یعقوب بن سفیان الفارسی نے کہا: ''الحسن اللؤلؤي كذاب ''

(المعرفۃ والتاریخ ۳/۵۶، تاریخ بغداد ۷/۳۱۷ وسندہ صحیح)

۴: امام نسائی نے کہا: ''والحسن بن زياد اللؤلؤي كذاب خبيث ''

(الطبقات للنسائی آخر کتاب الضعفاء ص ۲۶۶، دوسرا نسخہ ص ۳۱۰)

۵: امام یزید بن ہارون رحمہ اللہ سے حسن بن زیاد اللؤلؤی کے بارے میں پوچھا گیا کہ آپ کا اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟ انھوں نے فرمایا: ''أَوَ مسلم هو ؟ ''کیا وہ مسلمان ہے؟ (الضعفاء للعقیلی ۱/۲۲۷ وسندہ صحیح، دوسرا نسخہ ۱/۲۴۶، تاریخ بغداد ۷/۳۱۶ وسندہ صحیح، اخبار القضاۃ لمحمد بن خلف بن حیان: وکیع ۳/۱۸۹، وسندہ صحیح)

۶: امام محمد بن رافع النیسابوری رحمہ اللہ نے فرمایا: حسن بن زیاد اللؤلؤی امام سے پہلے سر اٹھاتا تھا اور امام سے پہلے سجدہ کرتا تھا۔ الخ (الضعفاء للعقیلی ۱/۲۲۷، ۲۲۸ وسندہ صحیح، دوسرا نسخہ ۱/۲۴۷، تاریخ بغداد ۷/۳۱۶ وسندہ صحیح، اخبار القضاۃ ۳/۱۸۹، وسندہ صحیح)

۷: حسن بن علی الحلوانی رحمہ اللہ نے فرمایا: میں نے لؤلؤی کو دیکھا، اس نے سجدے میں ایک لڑکے کا بوسہ لیا تھا۔ (تاریخ بغداد ۷/۳۱۶ وسندہ صحیح، یاد رہے کہ تاریخ بغداد میں کاتب کی غلطی سے حسن بن علی الحلوانی کے بجائے حسن بن زیاد الحلوانی چھپ گیا ہے۔)

۸: یعلیٰ بن عبید رحمہ اللہ نے کہا: ''اتق اللؤلؤي '' لؤلؤی سے بچو۔

(الضعفاء للعقیلی ۱/۲۲۷ وسندہ صحیح، دوسرا نسخہ ۱/۲۴۶، تاریخ بغداد ۷/۳۱۶ وسندہ صحیح)

۹: ابو حاتم الرازی نے کہا: ''ضعيف الحديث، ليس بثقة ولا مأمون ''وہ حدیث

میں ضعیف تھا، ثقہ اور قابلِ اعتماد نہیں تھا۔ (الجرح والتعدیل ۳/۱۵، علل الحدیث ۲/۴۳۲ ح ۲۸۰۶)

۱۰: اسحاق بن اسماعیل الطالقانی (ثقہ عند الجمہور) نے کہا: ہم وکیع (بن الجراح) کے پاس تھے کہ کہا گیا۔ بے شک اس سال بارش نہیں ہو رہی، قحط ہے۔ تو انھوں نے فرمایا: قحط کیوں نہ ہو؟ حسن اللؤلؤی اور حماد بن ابی حنیفہ، جو قاضی بنے بیٹھے ہیں۔ (الضعفاء للعقیلی ۱/۲۲۸ وسندہ صحیح)

تنبیہ: اس عبارت کا ترجمہ ماہنامہ الحدیث (عدد ۱۶ ص ۳۶) میں غلط چھپ گیا تھا۔

۱۱: جوزجانی نے کہا: اسد بن عمرو، محمد بن الحسن اور لؤلؤی سے اللہ فارغ ہو چکا ہے۔

(احوال الرجال ص ۷۶، ۷۷ رقم: ۹۶۔۹۹)

یعنی اللہ نے ہمیں اُن سے نجات دے دی ہے یا یہ کہ وہ اللہ کی عدالت میں حاضر ہو کر اپنے اپنے مقامات پر پہنچ چکے ہیں۔ واللہ اعلم

۱۲: عقیلی نے حسن بن زیاد کو کتاب الضعفاء میں ذکر کر کے جروح نقل کیں اور کسی قسم کا دفاع نہیں کیا۔

۱۳: ابن الجوزی نے اسے کتاب الضعفاء والمتروکین (۱/۲۰۲ ت ۸۲۱) میں ذکر کیا۔

۱۴: ابن عدی نے کہا: اور وہ ضعیف ہے۔ الخ (الکامل ۲/۷۳۲)

۱۵: ابن شاہین نے اسے تاریخ اسماء الضعفاء والکذابین (ص ۷۲ ترجمہ: ۱۱۸) میں ذکر کیا.

۱۶: حافظ سمعانی نے کہا: لوگوں نے اس میں کلام کیا ہے اور وہ حدیث میں کچھ چیز نہیں ہے۔ (الانساب ۵/۱۴۶)

۱۷: ابن اثیر نے کہا: اور وہ روایت میں سخت ضعیف ہے، کئی (علماء) نے اسے کذاب کہا ہے اور وہ بڑا فقیہ تھا۔ (غایۃ النہایہ فی طبقات القراء ۱/۲۱۳ ت ۹۷۵)

۱۸: حافظ ہیثمی نے کہا: اور وہ متروک ہے۔ (مجمع الزوائد ۶/۲۶۲)

۱۹: حافظ ذہبی نے کہا: اس کے ضعف کی وجہ سے انھوں (محدثین) نے کتبِ ستہ میں اُس سے روایت نہیں لی اور وہ فقہ میں سردار تھا۔ (العبر فی خبر من غبر ۱/۲۷۰ وفیات ۲۰۴ھ)

ذہبی نے اسے دیوان الضعفاء (۱/۱۸۵ ت ۹۰۵) میں بھی ذکر کیا ہے۔

۲۰: زیلعی حنفی نے حسن بن زیاد کے بارے میں لکھا: ''ونقل عن آخرین أنهم رموه بحبّ الشباب وله حکایات تدل علٰی ذلك '' پھر انھوں (ابن عدی) نے دوسروں سے نقل کیا کہ یہ لڑکوں سے محبت کرتا تھا اور اُس کے قصے اِس پر دلالت کرتے ہیں۔

(نصب الرایہ ۱/ ۵۲)

جمِ غفیر اور جمہور محدثین کی اس جرح کے مقابلے میں درج ذیل توثیق مروی ہے:

۱: مسلمہ بن قاسم نے اسے ثقہ کہا۔

عرض ہے کہ مسلمہ مذکور بذاتِ خود ضعیف ومشبہ تھا۔ دیکھئے میزان الاعتدال (۴/ ۱۱۲) اور لسان المیزان (۶/ ۳۵)

۲: حاکم نے اس سے المستدرک میں روایت لی ہے۔

عرض ہے کہ مجھے حسن بن زیاد اللؤلؤی کی کوئی روایت المستدرک میں تصحیح کے ساتھ نہیں ملی اور حاکم کا مستدرک میں صرف روایت لینا حاکم کے نزدیک بھی راوی کی توثیق نہیں ہے۔ نیز دیکھئے المستدرک (۳/ ۵۸۹ ح ۶۴۹۲)

۳: ابوعوانہ نے المستخرج (۱/ ۹ ح ۱۲) میں اُس سے روایت لی۔

عرض ہے کہ اس روایت میں لؤلؤی کی صراحت نہیں اور اگر صراحت ہوتی بھی تو جمہور کی جرح کے مقابلے میں مردود ہے۔

نیز دیکھئے میزان الاعتدال (۲/ ۴۹۱، لسان المیزان ۳/ ۳۲۸ ترجمۃ عبداللہ بن محمد البلوی)

۴: اگر کوئی کہے کہ ابن حبان نے اسے کتاب الثقات میں ذکر کیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ لؤلؤی کی صراحت کے ساتھ کتاب الثقات میں ہمیں اس کا ذکر نہیں ملا اور دوسرے یہ کہ اگر ابن حبان سے یہ توثیق ثابت بھی ہوتی تو جمہور کی جرح کے مقابلے میں مردود تھی۔

۵: اگر کوئی کہے کہ یحییٰ بن آدم نے کہا: میں نے حسن بن زیاد سے زیادہ کوئی فقیہ نہیں دیکھا۔ (اخبار ابی حنیفہ واصحابہ للصیمری ص ۱۳۱)

عرض ہے کہ یہ قول احمد بن محمد الصیرفی، محمد بن منصور اور محمد بن عبیداللہ الہمدانی کی وجہ

سے ثابت نہیں ہے۔ دیکھئے الحدیث: ۱۶ص ۳۷

محمد بن الحسن الشیبانی کے بارے میں راقم الحروف کا رسالہ ''تائیدِ ربانی اور ابن فرقد شیبانی''

پڑھ لیں۔ وما علینا إلا البلاغ (۲۹/ رمضان ۱۴۲۹ھ بمطابق ۳۰/ستمبر ۲۰۰۸ء)

[الحدیث: ۵۴]

سر کے بال زمین میں دفن کرنے کی روایت

سوال اس حدیث کے بارے میں تحقیق درکار ہے الحدیث میں شائع کر کے عنداللہ ماجور ہوں:

البدایہ والنہایہ مترجم نفیس اکیڈمی کراچی جلد پنجم صفحہ نمبر ۵۲۲ میں یہ واقعہ مذکور ہے:

ماریہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کے لئے ابراہیم نامی بیٹے کو جنم دیا اور آپ ﷺ نے ساتویں روز اس کا عقیقہ کیا اور اس کا سر منڈایا اور اس کے سر کے بالوں کے برابر مساکین میں چاندی صدقہ کی اور آپ کے حکم سے ان کے بال زمین میں دفن کر دیئے گئے اور اس کا نام ابراہیم رکھا۔ کیا مذکورہ روایت صحیح ہے اور رسول اللہ ﷺ نے عقیقہ کے روز بال منڈوا کر زمین میں دفن کرنے کا حکم دیا ہے وضاحت فرمادیں۔

(محمد رمضان سلفی خطیب جامع بیت المکرّم اہلحدیث، عارف والا)

الجواب یہ روایت البدایہ والنہایہ (عربی ج ۵ ص ۲۶۴ فی ذکر سراریہ علیہ السلام) میں الواقدی: حدثنا یعقوب بن محمد بن ابی صعصعۃ عن عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن ابی صعصعۃ کی سند سے مذکور ہے۔ واقدی مشہور کذاب ہے۔ دیکھئے کتاب الجرح والتعدیل (۲۱/۸)

عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن ابی صعصعۃ تابعی تھے۔ دیکھئے تقریب التہذیب (۳۴۳۱)

نتیجہ: یہ روایت واقدی کی وجہ سے موضوع ہے۔ [الحدیث: ۱۹]

تھوڑا کھانے کی فضیلت میں روایت

سوال اس حدیث کے بارے میں تحقیق درکار ہے الحدیث میں شائع کر کے

عنداللہ ماجور ہوں:

ا۔ لوگوں میں مشہور ہے کہ ایک حکیم رسول اللہ ﷺ کے پاس مدینہ میں حاضر ہوا آپ نے اس کو حکم دیا کہ مدینہ میں ہی رہے وہ ایک مہینہ ٹھہرا رہا ایک مہینے کے بعد اس نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ میرے پاس کوئی مریض نہیں آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہاں کے لوگ کھانا تب کھاتے ہیں جب ان کو سخت بھوک لگی ہوتی ہے اس لئے لوگ بیمار نہیں ہوتے۔

مہربانی کر کے وضاحت فرما دیں کیا یہ بات درست ہے یا رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس پر بہتان ہے۔

(محمد رمضان سلفی خطیب جامع بیت المکرّم اہلحدیث، عارف والا)

الجواب یہ روایت تلاش بسیار کے باوجود مجھے کہیں نہیں ملی۔

تنبیہ (۱): جس روایت کی سند اور حوالہ نہ ہو وہ مردود و بے اصل کے حکم میں ہوتی ہے اِلا یہ کہ کوئی شخص اس کی صحیح و حسن سند دریافت کر لے۔

تنبیہ (۲): یحییٰ بن جابر الطائی (ثقہ/ تابعی) فرماتے ہیں: "سمعت المقدام بن معدی کرب الکندي قال: سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: ((ماملأ ابن آدم وعاءً شرًا من بطن، حسب ابن آدم أکلات یقمن صلبه، فإن کان لا محالة فثلث طعام، وثلث شراب وثلث لنفسه))

میں نے مقدام بن معدی کرب الکندی (رضی اللہ عنہ) سے سنا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ: ابن آدم نے پیٹ سے زیادہ بُرا برتن کوئی نہیں بھرا۔ ابن آدم کے لیے اتنے لقمے کافی ہیں جن سے اُس کی پیٹھ سیدھی ہو جائے۔ اگر (پیٹ بھرنا) ضروری ہے تو تین حصے کرے: ایک تہائی کھانے کے لیے، ایک تہائی پینے کے لیے اور ایک تہائی سانس کے لیے۔ (مسند احمد ج ۴ ص ۱۳۲ ح ۱۷۳۱۸ وسندہ صحیح، وصححہ الحاکم ۴/ ۳۳۱ ح ۷۹۴۵ ووافقہ الذہبی)

یہ روایت سنن الترمذی (۲۳۸۰ وقال: ھذا حدیث حسن صحیح) اور صحیح ابن حبان (موارد الظمآن: ۱۳۴۹، الاحسان: ۶۷۳ دوسرا نسخہ: ۶۷۴) میں بھی موجود ہے۔ بعض لوگوں نے

یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ روایت یحییٰ اور سیدنا مقدام رضی اللہ عنہ کے درمیان منقطع ہے لیکن یہ دعویٰ مسند احمد میں تصریحِ سماع کے مقابلے میں مردود ہے۔ نیز دیکھئے السلسلۃ الصحیحۃ للشیخ الالبانی رحمہ اللہ (۵/۳۳۷ ح ۲۲۶۵) وارواء الغلیل (۷/۴۲ ح ۱۹۸۳)

اس روایت کو شیخ البانی رحمہ اللہ نے بھی صحیح قرار دیا ہے۔ والحمد للہ

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کھانا تھوڑا کھانا چاہیے۔ پیٹ بھرنے سے اجتناب بہتر اور افضل ہے۔ ایک مشہور حدیث میں آیا ہے کہ مسلمان ایک آنت میں کھاتا ہے اور کافر (ومنافق) سات آنتوں میں (یعنی بہت زیادہ) کھاتا ہے۔

دیکھئے صحیح البخاری (۵۳۹۴) وصحیح مسلم (۲۰۶۱)

یاد رہے کہ بعض اوقات خوب پیٹ بھر کر کھانا بھی جائز ہے جیسا کہ دوسرے دلائل سے ثابت ہے۔

ایک دفعہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کھانا کھایا "وشبعوا" اور پیٹ بھر کر کھایا۔

(صحیح البخاری: ۵۳۸۱ کتاب الأطعمۃ باب من أکل حتی شبع، صحیح مسلم: ۲۰۴۰)

نیز دیکھئے صحیح مسلم (۲۱۴۴ وترقیم دار السلام: ۶۳۲۲)

[الحدیث: ۱۹]

موسیٰ علیہ السلام کا ملک الموت (فرشتے) کو تھپڑ مارنا

سوال ایک حدیث میں آتا ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے ملک الموت کو تھپڑ لگایا تھا، کیا یہ حدیث ہے؟ (عطاء اللہ مکوانی، تھر پارکر)

الجواب یہ حدیث صحیح ہے۔ صحیحین وغیرہما کتبِ حدیث میں موجود ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے جو کتاب ہمام بن منبہ کو لکھائی اس میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔ (ح ۵۹)

یہ واقعہ موت کے ایک فرشتہ جو موسیٰ علیہ السلام کے پاس انسانی شکل میں بلا اطلاع آئے تھے کے ساتھ رونما ہوا۔ نیز دیکھئے میری کتاب: صحیح بخاری پر اعتراضات کا علمی جائزہ (ص ۳۱۔۳۳) [شہادت، اکتوبر ۱۹۹۹ء]

حدیثِ رکانہ رضی اللہ عنہ کی تحقیق

سوال کیا رکانہ رضی اللہ عنہ بن عبد یزید کی جو روایت سنن ابی داود (کتاب الطلاق باب فی البتۃ) میں امام شافعی رحمہ اللہ کی سند سے ہے، وہ صحیح ہے؟ نیز یہی روایت مندرجہ ذیل سندوں سے کس درجے کی ہے؟

۱: **حدثنا سليمان بن داود: نا جرير بن حازم عن الزبير بن سعيد عن عبدالله بن علي بن يزيد بن ركانة عن أبيه عن جده ....**

(سنن ابی داود کتاب الطلاق باب فی البتۃ ح ۲۲۰۸، مسند ابو داود طیالسی حدیث رقم: ۱۱۸۸)

۲: **حدثنا هناد: ناقبيصة عن جرير بن حازم ....**

(جامع ترمذی کتاب الطلاق باب ۲ ما جاء فی الرجل یطلق امراتہ البتۃ ح ۱۱۷۷) (ناصر رشید، راولپنڈی)

الجواب سنن ابی داود کے ہمارے نسخہ میں امام شافعی والی حدیث کا نمبر ۲۲۰۶ ہے۔ (نیز دیکھئے مسند الشافعی ص ۱۵۳، ترتیب سنجر بن عبداللہ الناصری: ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، الام ۷/۱۷۴) اس کی سند حسن لذاتہ ہے، اسے ابو داود، ابن حبان، حاکم اور قرطبی نے صحیح کہا ہے۔ امام بخاری نے اسے اضطراب سے معلول قرار دیا ہے حالانکہ اس روایت میں کوئی بھی اضطراب نہیں۔ حافظ ابن عبدالبر نے بعض مجہول لوگوں سے "ضعفوه" کا عندیہ دیا ہے۔ یہ ضعیف قرار دینے والے لوگ کون ہیں؟ ہمیں معلوم نہیں۔ تفصیل میری کتاب نیل المقصود فی التعلیق علی سنن ابی داود (ج ۲ ص ۵۶۲ قلمی) میں ہے۔ يسر الله لنا طبعه

بعض لوگوں نے اس حدیث کے تین راویوں کو مجہول وغیرہ کہہ کر کلام کیا ہے جس کا جواب درج ذیل ہے:

① امام شافعی کے چچا محمد بن علی بن شافع ثقہ تھے۔

امام شافعی نے فرمایا: میرے چچا ثقہ ہیں۔ (مسند الشافعی ص ۲۷۶، الام ۵/۱۷۴)

ابو داود نے ان کی حدیث کو صحیح کہا۔ (سنن الدارقطنی ۴/۳۳ ح ۳۹۳۳)

حاکم نے کہا: وہ اپنے زمانے میں قریش کے شیخ تھے۔ (المستدرک للحاکم ۲/۲۰۰ ح ۲۸۰۸)

اور حاکم نے ان کی روایت کے صحیح ہونے کی طرف اشارہ کیا۔

معلوم ہوا کہ محمد بن علی بن شافع ثقہ وصدوق تھے۔

② عبداللہ بن علی بن السائب کے بارے میں امام شافعی نے فرمایا: ثقہ

(مسند الشافعی ص ۲۷۶، الام ۱۷۴/۵)

حافظ ابن حبان نے انھیں کتاب الثقات (۳۴/۵) میں ذکر کیا۔ ابو داود نے ان کی بیان کردہ حدیث کو صحیح کہا جو کہ امام ابو داود کے نزدیک اُن کی توثیق ہے۔

تحریر تقریب التہذیب میں ہے: "بل: صدوق حسن الحدیث" (۲۴۱/۲ ت ۳۴۸۴)

ابن خلفون نے انھیں کتاب الثقات میں ذکر کیا۔ (ایضاً ص ۲۴۱)

خلاصہ یہ کہ عبداللہ بن علی ثقہ وصدوق تھے۔

③ نافع بن عجیر کو ابن حبان نے کتاب الثقات (۴۶۹/۵) میں ذکر کیا اور حاکم نے مستدرک (۲۱۱/۳ ح ۴۹۳۹) میں اور ابو داود نے اُن کی حدیث کو صحیح کہا۔

ابوالقاسم البغوی، ابونعیم الاصبہانی، ابوموسیٰ اور ابن حجر العسقلانی وغیرہم نے اُنھیں صحابہ میں ذکر کیا۔ دیکھئے الاصابہ (۵۴۵/۳ ت ۸۶۶۱)

خلاصہ یہ کہ نافع بن عجیر یا تو صحابی تھے یا ثقہ وصدوق تابعی تھے۔ رحمہ اللہ

اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ اُن راویوں کو مجہول و مستور قرار دے کر اس حدیث کو رد کر دینا غلط ہے۔

۱: جریر بن حازم عن الزبیر بن سعید والی روایت (سنن ابی داود: ۲۲۰۸) بلحاظ سند ضعیف ہے۔ اس کا راوی الزبیر بن سعید لین الحدیث تھا۔ (دیکھئے تقریب التہذیب: ۱۹۹۵)

۲: سنن ترمذی میں ہناد: نا قبیصۃ والی روایت وہی ہے جو سنن ابی داود والی ہے اور یہ سند بھی زبیر بن سعید ضعیف (کمزور حدیثیں بیان کرنے والے) راوی کی وجہ سے ضعیف ہے۔

[شہادت، مئی ۲۰۰۰ء]

طلاق کے بارے میں ایک روایت کی تحقیق

سوال سنن ابن ماجہ کی حدیث نمبر ۲۰۲۴ کس درجے کی ہے؟ اگر صحیح ہے تو....؟

(ناصر رشید، راولپنڈی)

الجواب ابن ماجہ والی روایت (۲۰۲۴) ''طلقني زوجي ثلاثًا'' (الطلاق باب من طلق ثلاثا في مجلس واحد) بلحاظ سند سخت ضعیف ہے۔ اس کا راوی اسحاق بن (عبداللہ بن) ابی فروہ بالاتفاق متروک ہے۔

دیکھئے حاشیۃ البوصیری علیٰ سنن ابن ماجہ (۳۴۵) وعام کتب الضعفاء والمتروکین۔

[شہادت، مئی ۲۰۰۰ء]

سوال کے متعلق ایک روایت کی تحقیق

سوال اس حدیث کی تخریج درکار ہے۔ مارفع قوم أكفهم إلى الله عزوجل يسألونه شيئًا إلا كان حقًا علىٰ أن يضع في أيديهم الذي سألوا .

(طبرانی، مجمع الزوائد ۱۰/ ۱۶۹، فیض القدیر ۵/ ۴۷۷، ضعیف الجامع الصغیر: ۵۰۷۲ عن سلمان رضی اللہ عنہ)

(ماسٹر محمد صدیق، حویلیاں ضلع ایبٹ آباد)

الجواب امام ابوالقاسم الطبرانی (متوفی ۳۶۰ھ) نے کہا:

''حدثنا يعقوب بن مجاهد البصري: ثنا المنذر بن الوليد الجارودي: ثنا أبي: ثنا شداد أبو طلحة الراسبي عن الجريري عن أبي عثمان عن سلمان رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ: مارفع قوم أكفهم إلى الله عزّوجلّ يسألونه شيئًا إلا كان حقًا على الله أن يضع في أيديهم الذي سألوا''

(المعجم الکبیر ج ۶ ص ۲۵۴ حدیث نمبر ۶۱۴۲)

ومن طريقه نقله الهيثمي في مجمع الزوائد (۱۰/ ۱۶۹) والمناوي في فيض القدير (۵/ ۴۷۷ ح ۷۹۱۲) ورمز السيوطي إلى أنه صحيح وقال الهيثمي:

"ورجاله رجال الصحيح" وضعفه الألباني في ضعيف الجامع۔

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی قوم، کسی چیز کے بارے میں سوال کرتے کرتے اللہ کے آگے اپنی ہتھیلیاں نہیں اٹھاتی مگر یہ کہ اللہ ان کی ہتھیلیوں میں وہ (چیز) رکھ دیتا ہے جس کے بارے میں انھوں نے سوال کیا تھا یعنی ان کی دعا قبول کر لیتا ہے۔

سند کی تحقیق: یہ سند ضعیف ہے۔ یعقوب بن مجاہد البصری کے حالات نہیں ملے۔ یاد رہے کہ یعقوب بن مجاہد ابوحزرہ المدنی القرشی علیحدہ شخص تھے جو کہ امام طبرانی کی ولادت سے پہلے تقریباً ۱۵۰ھ میں فوت ہو گئے تھے۔ سعید بن ایاس الجریری، آخری عمر میں اختلاط کا شکار ہو گئے تھے۔ (الکواکب النیرات فی معرفۃ من اختلط من الرواۃ الثقات ص ۳۵ تا ۳۷) اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ شداد بن سعید نے سعید بن ایاس الجریری سے اختلاط سے پہلے یہ حدیث سنی لہٰذا ان دو وجہ سے یہ سند ضعیف ہے۔ [شہادت، اپریل ۲۰۰۱ء]

چند روایات کی تحقیق

سوال درج ذیل احادیث کی تخریج درکار ہے:

① ماجتمع ثلاثة بدعوة قط إلا كان حقًّا على الله أن لا يرد أيديهم صفرًا.

[جب بھی تین آدمی کسی دعا کے ساتھ اکٹھے ہوں تو اللہ پر یہ حق ہے کہ ان کے ہاتھوں کو خالی نہ لوٹائے۔] (بیہقی۔ شعب الایمان۔ ابن عدی [۸۲۰/۲] ابو نعیم فی الحلیہ عن انس رضی اللہ عنہ)

②: لايجتمع ملأ فيدعو بعضهم ويؤمن بعضهم إلا أجابهم الله

[جب بھی کچھ لوگ اکٹھے ہو کر دعا کرتے ہیں اور کچھ آمین کہتے ہیں تو اللہ ان کی دعا قبول فرماتا ہے۔] (بیہقی۔ طبرانی کبیر [۲۲/۷] حاکم [۳۴۷/۳] عن حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ)

③: واقعہ علاء بن حضرمی رضي الله عنه .... نصب في الدعأ ورفع يديه وفعل الناس مثله (بعد نماز فجر کے) البداية والنهاية خلافة أبي بكر ذكر ردة أهل البحرين ودعوتهم إلى الاسلام

(البدایہ والنہایہ ۳۲۸/۶ و طبع بیروت جزء ۷ جلد ۳ صفحہ ۳۳۳، طبرانی صغیر: ۳۹۲)

مجمع الزوائد (۹/۲۷۶) اسی طرح کا مفہوم طبقات ابن سعد (۴/۳۶۳) میں ہے۔

④: تفسیری روایت

فإذا فرغت من الصلٰوة المكتوبة فانصب إلى ربك فى الدعاء وارغب إليه فى المسألة يعطك (معالم التنزیل مع لباب التاویل ۷/۲۲۰، دوسرا نسخہ ۴/۵۰۳)

⑤: اثر دعائے موسیٰ علیہ السلام وہارون علیہ السلام

قد أجيبت دعوتكما (القرآن) وقال ابن تيمية رحمه الله: كان أحدهما يدعو والآخر يؤمن (فتاویٰ مصرية)

كان موسٰى عليه السلام بن عمران: إذا دعا أمن عليه هارون عليه السلام: عن أبي هريرة رضي الله عنه.

[موسیٰ علیہ السلام جب دعا کرتے تو ہارون علیہ السلام آمین کہتے۔]

⑥: فتویٰ ابن تیمیہ رحمہ اللہ: والإجتماع على القراءة والذكر والدعاء حسن

[قراءت ذکر اور دعا پر اکٹھا ہونا اچھا ہے۔] (مختصر فتاویٰ مصریہ صفحہ ۹۳) [محمد صدیق، ایبٹ آباد]

الجواب امام ابو احمد بن عدی الجرجانی (متوفی ۳۶۵ھ) نے کہا:

"ثنا محمد بن أحمد بن أبي مقاتل: ثنا محمد بن يوسف بن أبي معمر: ثنا حبيب بن أبي حبيب: ثنا هشام بن سعد عن زيد بن أسلم عن أبيه عن أنس قال قال رسول الله ﷺ: ما اجتمع ثلاثة قط، فدعوا الله عزوجل إلا كان حقًا على الله عزوجل أن لا يردهم" (الکامل فی ضعفاء الرجال ج ۲ ص ۸۲۰)

حافظ ابو نعیم الاصبہانی (متوفی ۴۳۰ھ) نے کہا:

"حدثنا سليمان بن أحمد: ثنا المقدام بن داود: ثنا حبيب كاتب مالك: ثنا هشام بن سعد: حدثني زيد بن أسلم عن أنس بن مالك قال قال رسول الله ﷺ: ما اجتمع ثلاثة قط بدعوة إلا كان حقًا على الله أن لا ترد أيديهم، غريب من حديث زيد، لا أعلم رواه إلا حبيب عن هشام عنه" (حلیۃ الاولیاء ج ۳ ص ۲۲۶)

مفہوم متن: تین آدمی کبھی اکٹھے نہیں ہوتے، پھر وہ اللہ سے دعا کرتے ہیں مگر اللہ پر یہ حق ہے کہ وہ انھیں نہ لوٹائے۔ (یعنی تین آدمی جب بھی اکٹھے ہو کر دعا کرتے ہیں تو اللہ ان کی دعا قبول کرتا ہے، رد نہیں کرتا)

بیہقی کی شعب الایمان اور کتاب الدعوات، دونوں میں مجھے یہ روایت تلاشِ بسیار کے باوجود نہیں ملی۔ (والعلم عند اللہ)

درج بالا دونوں سندوں کا دارومدار حبیب کاتب مالک پر ہے جس کے بارے میں امام ابن عدی نے فرمایا: ''یضع الحدیث'' وہ حدیثیں گھڑتا تھا۔ (ج ۲ ص ۸۱۸)

ابوحاتم الرازی نے کہا: ''یکذب'' وہ جھوٹ بولتا تھا۔ (الجرح والتعدیل ج ۳ ص ۱۰۰)

یعنی یہ روایت موضوع ہے۔

④: امام طبرانی نے کہا:

''حدثنا بشر بن موسٰی: ثنا أبو عبدالرحمٰن المقري: ثنا ابن لهيعة: حدثني ابن هبيرة عن حبيب بن مسلمة الفهري و كان مستجاباً، أنه أمر على جيش فدرب الدورب، فلما لقي العدو قال للناس: سمعت رسول الله ﷺ يقول: ((لايجتمع ملأ فيدعو بعضهم ويؤمن سائرهم إلا أجابهم الله)) ثم أنه حمد الله وأثنى عليه فقال: اللّٰهم احقن دماء نا واجعل أجورنا، أجور الشهداء، فبيناهم هم علىٰ ذلك إذ نزل الهنباط أمير العدو، دخل على حبيب سرادقة، قال أبو القاسم: الهنباط بالرومية، صاحب الجيش.''

(المعجم الکبیر ج ۴ ص ۲۱، ۲۲ حدیث نمبر ۳۵۳۶)

حاکم نیشاپوری (متوفی ۴۰۵ھ) نے کہا:

''أخبرنا الشيخ الإمام أبو بكر بن إسحاق: أنا بشر بن موسٰى: ثنا أبو عبدالرحمٰن المقرئ: ثنا ابن لهيعة قال: حدثني أبو هبيرة عن حبيب بن مسلمة الفهرى ......'' إلخ (المستدرک ج ۳ ص ۳۴۷)

بیہقی کی شعب الایمان، الدعوات الکبریٰ اور السنن الکبریٰ میں یہ روایت نہیں ملی۔

مرفوع حدیث کا ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لوگوں کا کوئی گروہ اکٹھا نہیں ہوتا پھر بعض دعا کرتے اور باقی سارے آمین کہتے ہیں تو اللہ ان کی دعا قبول کر لیتا ہے۔

سند کی تحقیق: یہ سند منقطع ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔

تقریب التہذیب میں لکھا ہوا ہے کہ حبیب بن مسلمہ الفہری رضی اللہ عنہ ۴۲ھ میں فوت ہوئے اور عبداللہ بن ہبیرۃ، ابو ہبیرۃ المصری ۱۲۶ھ میں فوت ہوئے، ان کی عمر ۸۵ سال تھی یعنی وہ ۴۱ھ میں پیدا ہوئے۔ سیدنا حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے وقت وہ صرف ایک سال کے بچے تھے لہٰذا یہ سند منقطع ہے۔

③: واقعہ العلاء بن الحضرمي ....

"نصب في الدعاء ورفع يديه وفعل الناس مثله"

یہ واقعہ، البدایہ والنہایہ (ج ۶ ص ۳۳۳) میں بغیر کسی سند کے مذکور ہے۔

المعجم الصغیر للطبرانی (ج ۱ ص ۱۴۳) مجمع الزوائد (ج ۹ ص ۳۷۶) اور طبقات ابن سعد (ج ۴ ص ۳۶۳) میں "ورفع يديه وفعل الناس مثله" کے الفاظ نہیں۔

مفہوم متن: العلاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ نے دعا میں ہاتھ اٹھائے اور لوگوں نے (بھی) اسی طرح کیا۔

تحقیق: یہ روایت بلا سند ہونے کی وجہ سے مردود ہے۔

④: تفسیر معالم التنزیل للبغوی (ج ۴ ص ۵۰۳ سورۃ: الانشراح) میں لکھا ہوا ہے کہ

" قال ابن عباس وقتادة والضحاك ومقاتل والكلبي: فإذا فرغت من الصلوة المكتوبة، فانصب إلى ربك في الدعاء وارغب إليه في المسألة يعطك۔"

یعنی ابن عباس، قتادۃ، ضحاک، مقاتل اور کلبی کہتے ہیں کہ فرض نماز سے فارغ ہونے کے بعد اپنے رب سے دعا کرو۔ وہ تیرا سوال (پورا کر کے) تجھے عطا کرے گا۔

تحقیق: یہ بلا سند اقوال، تفسیر طبری (ج ۳۰ ص ۱۵۱، ۱۵۲) میں ضعیف سندوں سے مذکور

ہیں۔ تفسیر طبری صفحہ ۱۵۲ پر ضعیف سند سے لکھا ہوا ہے کہ

"الضحاك.....فإذا فرغت فانصب، يقول: من الصلوٰة المكتوبة قبل أن تسلم فانصب" یعنی "فانصب" کا مطلب یہ ہے کہ فرض نماز سے فارغ ہوتے وقت، سلام سے پہلے دعا کرو۔ لہٰذا ان اقوالِ غیر ثابتہ سے اجتماعی دعا کے قائلین کا مدعا پورا نہیں ہوتا۔

⑤: قد أجيبت دعوتكما کے سلسلے میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا قول (مختصر الفتاویٰ المصریہ ص ۹۳) محتاجِ دلیل ہے۔

عین ممکن ہے کہ ان کی دلیل تفسیر ابن کثیر (ج ۲ ص ۴۴۵) وغیرہ کے آثار و اقوال ہوں جو تفسیر طبری (ج ۱۱ ص ۱۱۰، ۱۱۱) تفسیر ابن ابی حاتم (ج ۶ ص ۱۹۸۰) اور تفسیر عبدالرزاق (ج ۱ ص ۱۶۱ ۲ حدیث ۱۱۷۱) میں ضعیف و غیر ثابت سندوں سے مذکور ہیں۔ واللہ اعلم

حدیث: "كان موسٰى بن عمران إذا دعا أمن عليه هارون"

تفسیر درمنثور (ج ۳ ص ۳۱۵) میں بغیر سند کے ابوالشیخ (الاصبہانی) سے اور کنز العمال (ج ۲ ص ۶۲۲ حدیث ۴۹۱۴) میں بحوالہ عبدالرزاق منقول ہے۔ مصنف عبدالرزاق (ج ۲ ص ۹۹ ح ۲۶۵۱) میں یہی روایت بشر بن رافع عن أبي عبدالله عن أبي هريرة إلخ کی سند سے مذکور ہے۔ بشر بن رافع ضعیف الحدیث تھا۔

دیکھئے تقریب التہذیب (۶۸۵) اور ابوعبداللہ کی توثیق بھی ثابت نہیں ہے۔

لہٰذا یہ سند دو وجہ سے ضعیف ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے قول: "والإجتماع على القراءة والذكر والدعاء حسن، إذا لم يتخذ سنة راتبة ولا اقترن به منكر من بدعة"

قراءت، ذکر اور دعاء پر اکٹھا ہونا اچھا ہے بشرطیکہ اسے سنت راتبہ نہ سمجھا جائے اور نہ اس کے ساتھ کسی بری بدعت کا اضافہ کر دیا جائے۔ (مختصر الفتاویٰ المصریہ ص ۹۲) کا تعلق بعض اوقات اتفاقی دعا سے ہے نہ کہ فرض نماز کے بعد کیونکہ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ خود لکھتے ہیں:

"وأما دعاء الإمام والمأمومين جميعًا عقيب الصلوٰة فهو بدعة، لم يكن على

عهد النبي ﷺ" یعنی امام اور مقتدیوں کا نماز کے بعد، اکٹھے ہو کر دعا کرنا بدعت ہے کیونکہ یہ عمل نبی ﷺ کے زمانے میں نہیں تھا۔ (الفتاویٰ الکبریٰ ج۱ ص۲۱۹ طبع دار المعرفۃ بیروت۔ لبنان)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ فرض نمازوں کے بعد اجتماعی دعا کا کوئی ثبوت نہیں ہے لیکن اگر کوئی شخص بغیر کسی التزام یا لزوم کے کبھی کبھار یہ دعا کر لیتا ہے تو عمومی دلائل کی رو سے جائز ہے۔ تاہم افضل یہی ہے کہ مسنون اذکار و تسبیحات پر اکتفاء کر کے اس "اجتماعی دعا" سے بچا جائے۔ واللہ اعلم [شہادت، مئی ۲۰۰۱ء]

کھڑے ہو کر جوتے پہننا

سوال سنن ابی داود، کتاب اللباس، باب فی الانتعال میں آیا ہے کہ " حدثنا محمد بن عبدالرحیم أبو یحیي قال: أخبرنا أبو أحمد الزبیری: حدثنا إبراهیم بن طهمان عن أبی الزبیر عن جابر قال: نهی رسول الله ﷺ أن ینتعل الرجل قائمًا " یعنی جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آدمی کو کھڑے ہو کر جوتے پہننے سے منع فرمایا ہے۔ (حدیث: ۴۱۳۵)

کیا یہ حدیث صحیح ہے؟ (ڈاکٹر نسیم اختر، اسلام آباد)

الجواب یہ روایت بلحاظِ سند ضعیف ہے۔ امام نسائی رحمہ اللہ سے مروی ہے:

"ذکر المدلسین: أعني قتادة، حجاج بن أرطاة، حمید، سلیمان التیمي، یونس ابن عبید، یحیي بن أبي کثیر، أبو إسحاق، الحکم بن عتیبة، مغیرة، إسماعیل ابن أبي خالد، أبو الزبیر، ابن أبي نجیح، ابن جریج، ابن أبي عروبة، هشیم، سفیان بن عیینة" (سیر اعلام النبلاء ج۷ ص۴۷)

یعنی ابوالزبیر، قتادہ اور سفیان بن عیینہ وغیرہم مدلسین میں سے تھے۔ (تفصیل کے لئے میری کتاب: الفتح المبین دیکھیں) امام نسائی نے ابوالزبیر رحمہ اللہ کے بارے میں فرمایا:

"وکان یدلس" اور وہ تدلیس کرتے تھے۔ (السنن الکبریٰ ۱/۶۴۰ ح ۲۱۰۱)

تدلیس کے بارے میں راجح اُصول یہی ہے کہ مدلس کی عن والی روایت نا قابل قبول

ہوتی ہے۔امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا:

" فقلنا: لانقبل من مدلس حديثاً حتى يقول فيه: حدثني أو سمعت "

پس ہم نے کہا: ہم کسی مدلس کی کوئی حدیث اس وقت تک قبول نہیں کریں گے جب تک وہ حدثنی یا سمعت نہ کہہ دے۔ (الرسالہ ص ۳۸۰ فقرہ نمبر ۱۰۳۵)

یعنی سماع کی تصریح کے بغیر مدلس کی روایت غیر مقبول ہے۔

لہٰذا ابوداود والی روایتِ مذکورہ کی سند ابوالزبیر کی تدلیس کی وجہ سے ضعیف ہے۔اس ضعیف روایت کے تین صحابہ، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ، سیدنا انس رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ضعیف شواہد بھی ہیں۔جن پر علی الترتیب تبصرہ درج ذیل ہے:

شاہد نمبر ①: سفیان (الثوری) عن عبداللہ بن دینار عن ابن عمر الخ (سنن ابن ماجہ ح ۳۶۱۹)

علی بن عبداللہ المدینی رحمہ اللہ نے کہا: " أن سفيان كان يدلس "

بے شک سفیان (ثوری) تدلیس کرتے تھے۔ (الکفایہ ص ۳۶۲ وسندہ صحیح)

امام سفیان ثوری کے شاگردوں ابوعاصم (سنن الدارقطنی ج ۳ ص ۱۰۲) یحییٰ بن سعید القطان اور عبداللہ بن المبارک نے بھی انھیں مدلس قرار دیا ہے۔ دیکھئے تہذیب التہذیب (ج ۱۱ ص ۱۹۲، ج ۴ ص ۱۰۲) وغیرہ لہٰذا یہ سند امام سفیان ثوری کی تدلیس کی وجہ سے ضعیف ہے۔

شاہد نمبر ②: عن انس رضی اللہ عنہ

سند اول: معمر عن قتادة عن أنس رضي الله عنه (سنن ترمذی ۱۷۷۶)

یہ سند قتادہ کی تدلیس کی وجہ سے ضعیف ہے۔

امام بخاری نے فرمایا: " لا يصح هذا الحديث " اور یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ (حوالہ مذکورہ)

سند دوم: عیینہ بن سالم عن عبیداللہ بن ابی بکر عن انس الخ

(کشف الاستار عن زوائد البزار ج ۳ ص ۳۶۶ ح ۲۹۵۹ ومجمع الزوائد ج ۵ ص ۱۳۹)

اس سند کے راوی عیینہ بن سالم صاحب الالواح پر جرح منقول ہے۔

دیکھئے لسان المیزان (ج ۴ ص ۴۴۴ ترجمہ نمبر ۶۳۵۶) اور توثیق کسی سے ثابت نہیں۔

لہٰذا یہ سند ضعیف ہے۔

شاہد نمبر③: عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ

سند اول: الحارث بن نبهان عن معمر عن عمار بن أبي عمار عن أبي هريرة ... إلخ (الترمذی:۱۷۷۵)

امام نسائی نے کہا: حارث بن نبہان: متروک الحدیث ہے۔

(کتاب الضعفاء والمتروکین ص ۱۶۵، ترجمہ نمبر ۱۱۶)

لہٰذا یہ سند سخت ضعیف ہے۔ امام بخاری نے بھی فرمایا کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔

سند دوم: ابومعاویہ عن الاعمش عن ابی صالح عن ابی ہریرہ الخ (ابن ماجہ:۳۶۱۸)

ابومعاویہ ثقہ تھے لیکن تدلیس بھی کرتے تھے۔

(دیکھئے طبقات ابن سعد ج ۶ ص ۳۹۲ وتہذیب التہذیب ج ۹ ص ۱۲۱)

لہٰذا یہ سند بھی ضعیف ہے۔ اعمش بھی مدلس تھے اور ضعفاء سے تدلیس کرتے تھے۔ ابوصالح سے ان کی روایت ہو یا کسی اور سے، تصریحِ سماع کے بغیر ان کی (صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے علاوہ ہر کتاب میں) ہر روایت ضعیف ہوتی ہے۔

سند سوم: سعید بن بشیر عن عمران بن داور عن سیف بن کریب عن ابی ہریرہ الخ

(المعجم لابن الاعرابی ج ۱ ص ۲۳۶، ۲۳۷ ح ۱۵۸، دوسرا نسخہ ح ۱۵۹)

اس میں سعید بن بشیر جمہور محدثین کے نزدیک ضعیف ہے اور سیف بن کریب کے حالات نہیں ملے لہٰذا یہ سند بھی ضعیف ہے۔

سند چہارم: عروہ بن علی السہمی عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ الخ (الضعفاء للعقیلی ج ۳ ص ۳۶۴)

عروہ بن علی کے بارے میں امام عقیلی نے کہا: "مجهول بالنقل" یعنی یہ مجہول راوی ہے۔

اس کی سند کا ایک راوی محمد بن حمید (الرازی) جمہور محدثین کے نزدیک ضعیف ہے لہٰذا یہ سند بھی ضعیف ہے۔

میرے علم کے مطابق کھڑے ہو کر جوتے پہننے کی ممانعت میں یہی احادیث مروی

ہیں اور شیخ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے السلسلۃ الصحیحہ (ج ۲ ص ۳۴۷ تا ۳۵۰ حدیث نمبر ۷۱۹) میں انھیں ذکر کر کے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے جو کہ اصولِ حدیث کی رو سے صحیح نہیں ہے۔

بعض لوگوں نے سفیان ثوری اور اعمش کی تدلیس کا دفاع کرنے کی کوشش کی ہے جو کہ بے سود ہے۔ ثابت شدہ حقیقت کا انکار کرنا علمی میدان میں کوئی وزن نہیں رکھتا اور بعض لوگوں نے ان تمام ضعیف سندوں کو ملا کر اس حدیث کو حسن کا درجہ تک پہنچانے کی کوشش کی ہے، یہ بھی اُصولِ حدیث کی رو سے غلط ہے۔

حافظ ابن کثیر الدمشقی رحمہ اللہ نے فرمایا:

"قلت :یکفی فی المناظرة تضعیف الطریق التی أبداها المناظر وینقطع، إذالأصل عدم ماسواها حتی یثبت بطریق أخری، واللّٰه أعلم"

میں نے کہا: مناظرہ میں مخالف جو سند پیش کرے اس کا ضعیف ثابت کر دینا ہی کافی ہے۔ وہ لاجواب ہو جائے گا۔ کیونکہ اصل یہی ہے کہ اس روایت کے علاوہ دوسری کوئی سند نہیں الا یہ کہ دوسری سند سے یہ بات ثابت ہو جائے۔ واللہ اعلم (اختصار علوم الحدیث ص ۸۵، نوع ۲۲)

خلاصہ یہ کہ یہ روایت اپنی تمام سندوں کے ساتھ ضعیف ہے۔ [شہادت، ستمبر ۲۰۰۱ء]

خطبۂ حجۃ الوداع کے بارے میں تحقیق

سوال درج ذیل حدیث کی تحقیق فرمائیں:

وعن فضالة بن عبيد الأنصاري عن رسول اللّٰه ﷺ أنه قال في حجة الوداع: ((هذا يوم حرام وبلد حرام فدمائكم وأموالكم وأعراضكم عليكم حرام مثل هذا اليوم وهذا اليوم إلى يوم تلقونه وحتى دفعة دفعها مسلم مسلمًا يريدبها سوءًا وسأخبركم من المسلم؟ المسلم من سلم الناس من لسانه ويده والمؤمن من أمنه الناس علىٰ أموالهم وأنفسهم والمهاجر من هجر الخطايا والذنوب والمجاهد من جاهد نفسه في طاعة اللّٰه .))

[رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا: یہ حرمت والا دن ہے اور حرمت والا شہر ہے، لہٰذا تمھارے خون، اموال اور عزتیں تم پر اس دن کی طرح قیامت تک حرام ہیں حتیٰ کہ اگر کوئی شخص برے ارادے سے کسی کو دھوکا دے تو وہ بھی حرام ہے۔ میں تمھیں بتاؤں گا کہ کون مسلمان ہے؟ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے لوگ محفوظ رہیں اور مومن وہ ہے جسے لوگ اپنے اموال اور جانوں کے بارے میں امین سمجھیں اور مہاجر وہ ہے جو غلطیوں اور گناہوں سے دور رہے، اور مجاہد وہ ہے جو اللہ کی اطاعت میں اپنے آپ سے جہاد کرے۔] (مجمع الزوائد ۳/۲۴۳ ح ۵۶۲۵ طبع دار الکتب العلمیہ بیروت) (محمد محسن سلفی، کراچی)

الجواب روایت مذکورہ کشف الاستار عن زوائد البزار للہیثمی (ج ۲ ص ۳۵ ح ۱۱۴۳) مجمع الزوائد (۳/۲۶۸) اور المعجم الکبیر للطبرانی (ج ۱۸ ص ۳۱۲ ح ۸۰۶) میں موجود ہے اور اس کی سند حسن ہے۔ [شہادت، فروری ۲۰۰۳ء]

کتاب: توحیدِ خالص (للشیخ بدیع الدین) کی بعض روایات

سوال ایک روایت شیخ بدیع الدین شاہ راشدی رحمہ اللہ نے توحید خالص ص ۱۳۷ پر نقل کی ہے کہ مشرکین حصین رضی اللہ عنہ کو نبی علیہ السلام سے مناظرہ کے لئے لائے۔ آپ نے اس سے پوچھا: جب مصیبت آتی ہے تو تُو کسے پکارتا ہے؟ حصین نے کہا: آسمان والے کو...الخ پیر صاحب رحمہ اللہ نے مزید کئی کتابوں کے حوالے دیئے اور کتاب الدعوات باب ۶۹ قصۃ تعلیم دعاء ص ۷۹۵، رقم الحدیث ۳۴۸۳۔ دار السلام، ریاض، نیز علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے کتاب العلو ص ۱۰۰ پر یہ حدیث دو سندوں کے ساتھ نقل کی ہے اور دونوں کو ضعیف لکھا ہے۔ اس کے متعلق آپ کی کیا تحقیق ہے؟ علامہ ذھبی رحمہ اللہ کی نقل کردہ احادیث میں لفظی اختلاف بھی ہے ص ۱۱۰۔ (ایک سائل)

الجواب روایتِ مذکور، حسن بصری کی تدلیس کی وجہ سے ضعیف ہے، وہ اس مفہوم کے بغیر عمران بن حصین عن ابیہ کی سند سے ایک حسن روایت ہے جو نسائی کی السنن الکبریٰ (۱۰۸۳۱) اور عمل الیوم واللیلۃ (۹۹۳) میں موجود ہے۔ (دیکھئے سنن ترمذی تحقیقی ج ۲ ص ۴۱۱)

[شہادت، مارچ ۲۰۰۳ء]

سوال پیر بدیع الدین شاہ رحمہ اللہ نے "توحید خالص" ص ۷۷ا پر کتاب العلو للعلامۃ الذہبی رحمہ اللہ ص ۱۱۳ کے حوالے سے ایک روایت نقل کی ہے:

"عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے شوریٰ کے دن لوگوں سے عثمان رضی اللہ عنہ کے لئے بیعت لی، اپنا سر آسمان کی طرف اٹھا کر کہا: "اللّٰھمّ اشھد" اسے حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے "البدایۃ والنہایۃ" ج ۷ ص ۱۴۷ میں بیان کیا ہے، حافظ ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کو تاریخ (طبری ج ۵ ص ۴۱) میں مسند (سند کے ساتھ) بیان کیا ہے۔ اس کی سند سے متعلق بھی بتادیں۔ جزاک اللہ خیراً (ایک سائل)

الجواب یہ روایت البدایۃ والنہایۃ (ج ۷ ص ۱۵۲) اور کتاب العلو للذہبی میں بلاسند ہے۔ تاریخ ابن جریر ج ۴ ص ۲۳۸ پر اس روایت کے ساتھ جو سند فٹ ہے اس کا ایک راوی عبدالعزیز بن ابی ثابت عمران بن عبدالعزیز بن عمر متروک ہے۔

دیکھئے تقریب التہذیب ص 215 وغیرہ

اس روایت سے پہلے والی روایت کی سندیں (ص ۲۲۷) بھی غیر واضح ہیں۔

خلاصہ یہ کہ روایت مذکورہ بلحاظِ سند ثابت نہیں ہے۔ واللہ اعلم [شہادت مارچ ۲۰۰۳ء]

صاحبِ قبر کی دو رکعتیں

سوال درج ذیل حدیث کی تحقیق کیا ہے:

"عن أبي هريرة رضي الله عنه أن رسول الله ﷺ مر بقبر فقال:

((من صاحب هذا القبر ؟)) فقالوا: فلان، فقال: ((ركعتان أحب إلى هذا من بقية دنيا كم)) " سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک قبر کے پاس سے گزرے، آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: یہ قبر کس شخص کی ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: فلاں شخص کی ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس قبر والے شخص کے نزدیک دو رکعتوں کا پڑھنا تمھاری دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ پسندیدہ ہے۔

(رواہ الطبرانی فی الاوسط ورجالہ ثقات: مجمع الزوائد ۲/ ۵۱۶) (ایک سائل)

الجواب امام طبرانی نے فرمایا:

''حدثنا أحمد قال :حدثنا حفص بن عبداللّٰه الحلواني قال :حدثنا حفص ابن غياث عن أبي مالك الأشجعي عن أبي حازم عن أبي هريرة أن رسول اللّٰه ﷺ مر بقبر فقال : ((من صاحب هذا القبر ؟)) فقالوا: فلان، فقال: ((ركعتان أحب إلى هذا من بقية دنيا كم)) لم يرو هذا الحديث عن أبي مالك إلا حفص بن غياث ، تفرد به حفص بن عبد اللّٰه''

(المعجم الاوسط ج ۱ ص ۵۰۲، ۵۰۳ ح ۹۲۴)

احمد بن یحییٰ (ص ۴۹۶ ح ۹۱۰) الحلوانی (ص ۱۷۴ ح ۸۵۷) کا ذکر سیر اعلام النبلاء (۱۳/ ۵۷۸) میں بلا توثیق مذکور ہے، دکتور محمد سعید البخاری نے کہا: ''لم أقف على ترجمته'' مجھے اس کا تذکرہ نہیں ملا۔ (کتاب الدعاء ج ۱ ص ۱۵۴)

اس سند کے ایک راوی حفص بن غیاث مدلس تھے۔

حافظ ابن سعد نے کہا: ''وكان ثقة مأمونا ثبتا إلا أنه كان يدلس'' وہ ثقہ مامون تھے سوائے یہ کہ وہ تدلیس کرتے تھے۔ (الطبقات الکبریٰ ۶/ ۳۹۰)

حافظ اثرم نے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے نقل کیا: ''أن حفصًا كان يدلس'' بے شک حفص تدلیس کرتے تھے۔ (تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۳۵۹)

انھیں دارقطنی (طبقات المدلسین بتحقیقی : ۹، المرتبہ الاولیٰ) العلائی (جامع التحصیل ص ۱۰۶) ابو زرعہ بن العراقی (کتاب المدلسین : ۱۳) السیوطی (۱۱) ابو محمود المقدسی اور مسفر الدمینی (التدلیس فی الحدیث ۱/۲۱) نے مدلسین میں ذکر کیا ہے۔

امام الشافعی رحمہ اللہ نے فرمایا:

''فقلنا :لا نقبل من مدلس حديثًا حتى يقول فيه :حدثني أو سمعت''

پس ہم نے کہا: ہم کسی مدلس سے کوئی حدیث اس وقت تک قبول نہیں کرتے جب تک وہ حدثنی یا سمعت نہ کہے (یعنی سماع کی تصریح کرے۔) (الرسالہ ص ۳۸۰ فقرہ: ۱۰۳۵)

ابن الصلاح الشہر زوری نے لکھا:

"والحكم بانه لا يقبل من المدلس حتى يبين ،قد أجراه الشافعي ، فيمن عرفناه دلس مرة،والله أعلم "اور حکم یہ ہے کہ مدلس جب تک (تصریح سماع کا) بیان نہ کرے اس کی روایت قبول نہ کی جائے ،اسے امام شافعی نے اس شخص کے بارے میں جاری کیا جس نے صرف ایک دفعہ (ہی) تدلیس کی ہے۔

(علوم الحدیث لابن الصلاح ص ۳۵ نوع:۱۲)

یاد رہے کہ حافظ ابن حجر کا حفص بن غیاث کو غیر مدلسین (انظر النکت علی ابن الصلاح ۲/۶۳۷) اور المرتبۃ الاولیٰ میں ذکر کرنا بلا دلیل ہے۔

خلاصہ یہ کہ درج بالا روایت دو علتوں کی وجہ سے ضعیف ومردود ہے۔ [شہادت، اپریل ۲۰۰۲ء]

روایت: موحد اور گناہ کی تحقیق

سوال درج ذیل حدیث کی تخریج درکار ہے:

"من لقي الله ، لا يعدل به شيئًا في الدنيا ، ثم كان عليه مثل جبال ذنوب غفر الله له" [جو شخص اللہ سے ملاقات کرے، اور وہ دنیا میں اس کے برابر کسی کو نہ سمجھتا تھا، پھر اگر اس کے گناہ پہاڑوں کے برابر ہوں تو اللہ اسے بخش دے گا۔]

(مشکوٰۃ المصابیح ح ۲۳۶۲ بحوالہ البیہقی فی البعث والنشور) (محمد محسن سلفی)

الجواب اس روایت کے بارے میں "ہدایۃ الرواۃ" تخریج المشکوٰۃ کے محقق فرماتے ہیں: "قلت لم أقف على إسناده ،والغالب عليه الضعف"

(ج ۲ص ۴۵۸ ح ۲۳۰۱)

میں نے کہا: مجھے اس کی سند نہیں ملی اور ایسی روایتوں پر غالب یہی ہے کہ ضعیف ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ امام بیہقی رحمہ اللہ نے فرمایا:

"أخبرنا أبو علي بن شاذان :أنبا عبد الله بن جعفر: ثنا يعقوب بن سفيان: ثنا يوسف بن عدي: ثنا عبد العزيز بن محمد الدراوردي عن عمارة بن

غزية عن عطاء بن أبي مروان عن أبيه عن أبي ذر قال قال رسول الله ﷺ :
((من لقي الله لايعدل به شيئاً في الدنيا ثم كان عليه مثل جبال ذنوب، غفر الله له)) " (کتاب البعث والنشور ص۴۳ ح ۴۴)

اس روایت کی سند صحیح ہے، راویوں کا مختصر تعارف درج ذیل ہے:

۱۔ ابوعلی الحسن بن ابی بکر احمد بن ابراہیم بن الحسن بن محمد بن شاذان البغدادی کے بارے میں خطیب بغدادی نے ابوالحسن بن رزقویہ سے نقل کیا: "ثقہ" (تاریخ بغداد، ج ۷ ص ۲۷۹ ت ۳۷۷۲) حافظ ذہبی نے کہا: "الإمام الفاضل الصدوق مسند العراق"

(سیر اعلام النبلاء ۱۷/ ۴۱۵)

۲۔ عبداللہ بن جعفر بن درستویہ کے بارے میں حافظ ذہبی نے کہا: "وكان ثقة"

(النبلاء ۱۵/ ۵۳۱)

ان پر ہبۃ اللہ اور برقانی کی جرح کے جواب کے لئے دیکھئے تاریخ بغداد (ج ۹ ص ۴۲) اور التنکیل لما فی تانیب الکوثری من الاباطیل (ج ۱ ص ۲۸۵۔ ۲۹۱)

۳۔ یعقوب بن سفیان الفارسی، سنن ترمذی اور سنن نسائی کے راوی تھے۔ انھیں ابن حبان نے کتاب الثقات میں ذکر کیا۔ (تہذیب الکمال ۲۰/ ۴۲۹، الثقات ۹/ ۲۸۷)

حافظ ذہبی نے کہا: "ثقة مصنف خير صالح" (الکاشف ۳/ ۲۵۴)

۴۔ یوسف بن عدی، صحیح بخاری ونسائی کے راوی تھے۔

ان کے بارے میں ابوحاتم الرازی اور ابوزرعہ نے کہا: " ثقة " (الجرح والتعدیل ۹/ ۲۲۷)

۵۔ عبدالعزیز بن محمد الدراوردی، کتبِ ستہ کے راوی اور جمہور کے نزدیک ثقہ وصدوق تھے۔ امام مالک وغیرہ ان کی توثیق کرتے تھے۔

دیکھئے تہذیب الکمال (ج ۱۱ ص ۵۲۷) ان پر جرح مردود ہے۔ والحمدللہ

۶۔ عمارہ بن غزیہ: صحیح مسلم وسنن اربعہ کے راوی تھے۔

احمد بن حنبل اور ابوزرعہ الرازی وغیرہما نے کہا: "ثقة" (تہذیب الکمال ج ۱۴ ص ۲۰)

ان پر عقیلی وابن حزم کی جرح مردود ہے۔

۷۔ عطاء بن ابی مروان نسائی کے راوی تھے۔انھیں احمد بن حنبل ،نسائی وغیرہما نے ثقہ کہا ہے۔ (تہذیب الکمال ۶۵/۱۳)

۸۔ ابو مروان الاسلمی ،سنن نسائی کے راوی تھے اور ان کے صحابی ہونے میں اختلاف ہے،انھیں عجلی (المعتدل) اور ابن حبان نے ثقہ قرار دیا ہے۔ (دیکھئے تہذیب الکمال ۲۸/۲۲)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہ سند صحیح (وغریب) ہے۔

بخاری (۱۲۳۷) اور مسلم (۹۴) وغیرہما میں اس کا معنوی شاہد ہے۔

''أتاني آت من ربي فأخبرني أو قال بشرني :أنه من مات عن أمتي لا يشرك بالله شيئا دخل الجنة'' [میرے پاس میرے رب کی طرف سے آنے والے نے آکر مجھے بتایا یا خوش خبری دی کہ میری امت میں سے جو بھی اللہ کے ساتھ شرک نہ کرتے ہوئے مرے گا تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔] [شہادت،اپریل ۲۰۰۳ء]

تعریف کے وقت دعا کرنا

سوال الادب المفرد للبخاری میں ایک روایت ہے:

''حدثنا مخلد بن مالك قال: حدثنا حجاج بن محمد قال :أخبرنا ابن المبارك عن بكر بن عبد الله المزني عن عدي بن أرطاة قال :كان الرجل من أصحاب النبي ﷺ إذا زكي قال: اللّٰهم! لا تؤاخذني بما يقولون واغفرلي مالا يعلمون'' ہمیں مخلد بن مالک نے حدیث بیان کی کہا: ہمیں حجاج بن محمد نے حدیث بیان کی، کہا: ہمیں عبداللہ بن المبارک نے خبر دی وہ بکر بن عبداللہ المزنی سے وہ عدی بن ارطاۃ سے بیان کرتے ہیں کہ صحابہ میں سے اگر کسی کی تعریف ہوتی تو وہ یہ کہتا: اے میرے اللہ! وہ جو کہہ رہے ہیں مجھے اس میں نہ پکڑ اور وہ جو جانتے نہیں اس میں مجھے معاف کردے۔ (باب ۳۲۶ ما یقول الرجل اذا زکی ح ۷۶۱)

اس روایت کو شیخ الالبانی رحمہ اللہ نے صحیح الادب المفرد میں صحیح الاسناد قرار دیا ہے۔

محدث البانی کی پیروی کرتے ہوئے سعید بن علی القحطانی نے حصن المسلم (طبع دار السلام ص ۲۰۴ وفی نسخہ ص ۱۵۸) میں بطور حجت پیش کیا ہے۔ اس روایت کی اصولِ حدیث کی رو سے تحقیق فرمائیں۔ جزاکم اللہ خیراً (محمد محسن سلفی)

الجواب یہ روایت عدمِ اتصال کی وجہ سے ضعیف الاسناد ہے۔

بکر بن عبداللہ المزنی ۱۰۶ھ یا ۱۰۸ھ میں فوت ہوئے۔ (تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۴۲۵)

(عبداللہ) ابن المبارک ۱۱۸ھ میں پیدا ہوئے۔ (تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۳۷)

یعنی امام ابن المبارک، بکر بن عبداللہ کی وفات کے بعد پیدا ہوئے لہٰذا یہ سند منقطع ہے، عین ممکن ہے کہ الادب المفرد میں ابن المبارک کا لفظ غلط ہو اور صحیح، المبارک (بن فضالۃ) عن بکر بن عبداللہ المزنی ہو جیسا کہ تہذیب الکمال (ج ۳ ص ۱۴۰، ۱۴۱ و ج ۷ ص ۴۱۸) سے ظاہر ہے۔

راقم الحروف نے جو امکان ظاہر کیا تھا، بعد میں التاریخ الکبیر للبخاری (ج ۲ ص ۵۸) سے اس کی تائید ہوگئی، وہاں یہی روایت ''حجاج بن محمد قال: ثنا مبارك بن فضالة عن بكر بن عبد الله المزني'' (إلخ) کی سند سے مکتوب ہے۔ والحمدللہ

مبارک بن فضالہ مشہور مدلس تھے۔ دیکھئے طبقات المدلسین لابن حجر (۹۳/۳) وتہذیب الکمال (۴۲۱/۱۷) وغیرہما، لہٰذا یہ روایت دونوں سندوں کے لحاظ سے ضعیف ومردود ہے۔

شعب الایمان للبیہقی (۲۲۸/۴ ح ۲۸۷۶) میں ''بقية نا محمد بن زياد عن بعض السلف'' سے اس کی تائید مروی ہے جو کہ ''بعض السلف'' کے نامعلوم ہونے کی وجہ سے مردود ہے۔ [شہادت، اپریل ۲۰۰۳ء]

نماز اور کفارۂ گناہ

سوال ایک روایت میں آیا ہے کہ

'' حدثني عبد الله بن أحمد بن شبويه قال: ثنا إسحق بن إبراهيم قال: ثني عمرو بن الحارث قال: ثني عبد الله بن سالم عن الزبيدي قال: حدثنا سليم

ابن عامر: أنه سمع أبا أمامة يقول :أن رجلاً أتى رسول الله ﷺ فقال:
يا رسول الله !أقم فيّ حد الله - مرة واثنتين - فأعرض عنه رسول الله ﷺ،
ثم أقيمت الصلاة ، فلما فرغ رسول الله ﷺ من الصلاة قال :
((أين هذا القائل: أقم فيّ حدالله ؟)) قال:أناذا ! قال:((هل أتممت
الوضوء وصليت معنا آنفًا ؟)) قال: نعم ! قال:((فإنك من خطيئتك كما
ولدتك أمك ، فلا تعد)) وأنزل الله حينئذ على رسوله : ﴿ أقم الصلاة
طرفي النهار وزلفًا من الليل ﴾ الآية " (سورۂ ہود آیت ۱۱۴، تفسیر الطبری ۶/۱۳۳)

(محسن سلفی، کراچی)

الجواب حدیث مذکور تفسیر ابن جریر (ج ۱۲ص ۸۲) اور تفسیر ابن کثیر (ج ۴ص ۲۸۸ وفی نسخۃ اُخری ج ۲ ص ۴۸۰ بحوالہ ابن جریر) میں موجود ہے۔ اس روایت کی سند حسن لذاتہ ہے۔ سلیم بن عامر الخبائری صحیح مسلم وغیرہ کے راوی اور ثقہ تھے۔ (تقریب التہذیب ص ۱۳۲)

محمد بن ولید بن عامر الزبیدی صحیحین کے راوی اور "ثقة ثبت من كبار أصحاب الزهري" تھے۔ (التقریب ص ۳۲۲)

عبداللہ بن سالم الاشعری صحیح بخاری کے راوی تھے۔ یحیٰی بن حسان اور عبداللہ بن یوسف نے ان کی تعریف کی۔ نسائی نے کہا: "ليس به بأس" اور ابن حبان نے ثقہ قرار دیا۔ دارقطنی نے ان کی توثیق کی۔ دیکھئے تہذیب التہذیب (۵/۴۰۰) وغیرہ

ذہبی نے کہا "صدوق فيه نصب" (الکاشف ۲/۸۰)

ابن حجر نے کہا "ثقة رمي بالنصب" (التقریب ص ۱۷۴)

نصب کا الزام مردود ہے جیسا کہ آگے آرہا ہے۔ ابن خزیمہ (۵۷۱) ابن حبان (الموارد: ۲۶۲، الاحسان: ۱۸۰۳) حاکم (۱/۲۲۳) ذہبی، دارقطنی (۱/۳۳۵) بیہقی (التلخیص الحبیر ۱/۲۳۶) اور ابن القیم (اعلام الموقعین ۲/۳۹۷) نے اس روایت کی تصحیح یا تحسین کی جو کہ توثیق کی ہی ایک قسم ہے۔

ان کے مقابلے میں ابو عبید الآجری نے ابو داود سے نقل کیا کہ وہ کہتا تھا:

''علی نے ابوبکر و عمر کے قتل پر اعانت کی ہے اور ابو داود اس کی مذمت کرتے تھے۔''

یہ جرح کئی لحاظ سے مردود ہے:

۱۔ یہ جرح جمہور محدثین کی توثیق کے خلاف ہے۔

۲۔ اس کا تعلق روایتِ حدیث سے نہیں بلکہ عقائد سے ہے۔

۳۔ ابو داود کی عبد اللہ بن سالم الاشعری سے ملاقات ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ان کی پیدائش سے پہلے ہی فوت ہو گئے تھے لہٰذا یہ قول منقطع ہے۔

۴۔ ابو عبید محمد بن علی بن عثمان الآجری کے حالات نامعلوم ہیں، سوالات الآجری کے محقق محمد علی قاسم العمری کو بھی اس کے حالات نہیں ملے۔ (دیکھئے ص ۴۱)

۵۔ اس بات کا بھی کوئی صحیح ثبوت نہیں ہے کہ آجری نے یہ کلام بیان کیا ہے۔ کیونکہ آجری تک صحیح سند مفقود ہے۔

عمرو بن الحارث الحمصی کو ابن حبان نے ''مستقیم الحدیث'' کہا یعنی ثقہ قرار دیا۔ (الثقات ۸/۴۸۰) ابن خزیمہ، حاکم، دارقطنی اور بیہقی وغیرہم نے ان کی توثیق کی۔

کسی روایت کو صحیح یا حسن قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا ہر راوی صحیح یا حسن قرار دینے والے کے نزدیک ثقہ یا صدوق ہے۔

(دیکھئے نصب الرایۃ ج ۱ ص ۱۴۹، ج ۳ ص ۲۶۴، لسان المیزان ج ۱ ص ۲۲۷، ج ۵ ص ۴۱۴، السلسلۃ الصحیحہ ج ۶ ص ۲۶۰ ح ۲۷۸۳ و ج ۷ ص ۱۶ ح ۳۰۰۷۔ بیان الوھم والایھام لابن القطان ۵/۳۹۵ ح ۲۵۶۲)

جمہور کی اس تعدیل کے مقابلے میں ذہبی کا قول ''غیر معروف العدالۃ'' (میزان الاعتدال ۳/۲۵۱) اور ابن حجر کا قول ''مقبول'' یعنی مجہول الحال، مردود ہے۔ یاد رہے کہ ذہبی کا قول ان کی تصحیحِ حدیث سے معارض ہے۔

وإذا تعارضا تساقطا (دیکھئے میزان الاعتدال ۲/۵۵۲)

خلاصہ یہ کہ عمرو بن الحارث حسن الحدیث تھے۔

اسحاق بن ابراہیم بن العلاء الزبیدی کو ابو حاتم، ابن معین، ابن خزیمہ، حاکم اور ذہبی وغیرہم نے موثق قرار دیا ہے۔

اس کے مقابلے میں بغیر کسی سند کے امام نسائی سے منقول ہے کہ انھوں نے کہا:

"لیس بثقة" (تہذیب التہذیب ۱/۱۸۹)

یہ بے سند قول ہر لحاظ سے ساقط ہے۔

آجری (غیر معروف العدالۃ) نے ابو داود اور محمد بن عوف سے اسحاق مذکور پر شدید جرح نقل کی ہے۔ جو آجری کی جہالت کی وجہ سے مردود ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ جرح آجری کی کتاب السؤالات میں نہیں ملی لہٰذا آجری تک سند میں بھی نظر ہے۔

یاد رہے کہ آجری کی عدالت نامعلوم ہونے کے باوجود حافظ ابن کثیر نے اس کی کتاب کو "کتاب مفید" لکھ دیا ہے۔ (اختصار علم الحدیث ص ۳۹) حالانکہ مصنف مذکور کی جہالت اور اس تک سند صحیح نہ ہونے کی وجہ سے کتاب مفید کے بجائے غیر مفید ہے۔

خلاصہ یہ کہ اسحاق بن ابراہیم پر جرح مردود ہے اور وہ حسن الحدیث راوی تھے۔

نیز دیکھئے میری کتاب "القول المتین فی الجہر بالتأمین" (ص ۸، ۹)

عبداللہ بن احمد بن شبویہ مستقیم الحدیث (الثقات لابن حبان ۸/۳۶۶) یعنی ثقہ تھے۔

ابو سعد الادریسی انھیں "من أفاضل الناس" کہتے تھے۔ (تاریخ بغداد ۹/۳۷۱)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہ روایت حسن لذاتہ ہے۔ صحیح مسلم (۲۷۶۵) مسند احمد (۵/ ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۶) اور صحیح ابن خزیمہ (۳۱۱) میں اس کا ایک شاہد (یعنی تائید کرنے والی روایت بھی ہے) لہٰذا حدیثِ مذکور صحیح لغیرہ ہے۔ [شہادت، مئی ۲۰۰۳ء]

کیا غیبت زنا سے بڑا گناہ ہے؟

سوال سیدنا ابو سعید الخدری اور سیدنا جابر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: غیبت زنا سے بھی سخت (گناہ) ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح: ۴۸۷۴)

کیا یہ روایت صحیح ہے؟ (محمد محسن سلفی، کراچی)

الجواب یہ روایت شعب الایمان (۳۰۶/۵ ح ۶۷۴۱، دوسرا نسخہ ج ۹ ص ۹۹ ح ۶۳۱۵ واللفظ لہ) میں ''عباد بن كثير عن الجريري عن أبي نضرة عن أبي سعيد وجابر بن عبد الله'' کی سند سے موجود ہے۔

عباد بن کثیر الثقفی البصری: متروک تھا۔ (دیکھئے تقریب التہذیب ص ۱۶۳)

احمد بن حنبل نے کہا: ''روى أحاديث كذب'' اس نے جھوٹی حدیثیں بیان کی تھیں۔

سعید بن ایاس الجریری کا حافظہ آخری عمر میں خراب ہوگیا تھا۔ عباد اُن کے پہلے شاگردوں میں سے نہیں تھا۔ خلاصہ یہ کہ یہ سند سخت ضعیف ہے۔ [شہادت، جون ۲۰۰۳ء]

کفارۂ غیبت

سوال انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: غیبت کا کفارہ یہ ہے کہ آپ نے جس شخص کی غیبت کی ہے اس کے لئے مغفرت کی دعا کریں۔ اے اللہ ہمیں اور اس کو معاف فرما۔ (بیہقی / الدعوات الکبیر بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح حدیث ۴۸۷۷)

یہ روایت کیسی ہے؟ (محمد محسن سلفی، کراچی)

الجواب یہ روایت امام بیہقی کی کتاب الدعوات الکبیر (۲۹۴/۲ ح ۵۰۷) میں عنبسہ بن عبدالرحمٰن القرشی عن ثابت البنانی عن انس بن مالک کی سند سے ہے۔

حافظ بیہقی نے فرمایا: ''في هذا الإسناد ضعف'' اس سند میں کمزوری ہے۔

عنبسہ بن عبدالرحمٰن متروک ہے۔ (دیکھئے تقریب التہذیب: ۵۲۰۶)

امام ابوحاتم نے فرمایا: یہ شخص حدیثیں گھڑتا تھا۔ (الجرح والتعدیل ۴۰۲/۶)

ابن جوزی نے یہ روایت اپنی کتاب الموضوعات (۱۱۸/۳، ۱۱۹) میں ذکر کی ہے۔

یہ روایت سخت ضعیف یا موضوع ہے۔ [شہادت، جون ۲۰۰۳ء]

صحابۂ کرام کا ہنسنا

سوال قتادہ رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا گیا:

کیا رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہنستے تھے؟ انھوں نے اثبات میں جواب دیا جبکہ ان کے دلوں میں ایمان پہاڑ سے بھی زیادہ تھا اور بلال بن سعد بیان کرتے ہیں کہ میں نے انہیں دیکھا کہ تیراندازی میں نشانوں پر تیراندازی کرتے ہوئے نشانوں کے درمیان دوڑا کرتے تھے اور آپس میں ہنستے کھیلتے تھے لیکن رات کے وقت عبادت گزار بن جاتے تھے۔

(مشکوٰۃ المصابیح حدیث ۴۷۴۹ شرح السنہ ۱۲/۳۱۸)

کیا یہ روایت صحیح ہے؟ (محمد محسن سلفی، کراچی)

الجواب یہ روایت شرح السنۃ للبغوی (۱۲/۳۱۸ قبل ح ۳۳۰۲) میں بلا کسی سند کے "قال معمر عن قتادۃ" الخ مروی ہے۔

صحیح مسلم (کتاب المساجد، باب فضل الجلوس فی مصلاہ بعد الصبح ح ۶۷۰) میں اس کی مؤید روایت موجود ہے۔ الادب المفرد للبخاری (۲۶۶) میں اس کے بعض مفہوم میں صحیح شاہد بھی موجود ہے: "كان أصحاب النبي ﷺ يتباد حون بالبطيخ فإذا كانت الحقائق كانوا هم الرجال" یعنی نبی ﷺ کے صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) ایک دوسرے پر تربوز، خربوز (کے ٹکرے) پھینکتے تھے اور جب حقائق (اہم معاملات) ہوتے تو وہ مردمیدان بنے ہوتے تھے۔ اس کی سند صحیح ہے۔ [شہادت، جون ۲۰۰۳ء]

عورت کے ذمہ چار کام ہیں

سوال عورت چار کام کرلے: فرض نمازیں، فرض روزے، خاوند کی اطاعت، شرمگاہ کی حفاظت تو اس کے لئے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے جائیں گے۔ اس حدیث کا حوالہ مطلوب ہے؟ (ایک سائل)

الجواب صحیح ابن حبان (موارد الظمآن: ۱۲۹۶) وغیرہ میں رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے: ((إذا صلت المرأة خمسها وصامت شهرها وحصنت فرجها و أطاعت بعلها: دخلت من أي أبواب الجنة شاء ت))

جب عورت پانچ نمازیں (ہمیشہ) پڑھے اور رمضان کے روزے رکھے اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرے اور اپنے خاوند کی اطاعت کرے تو جنت کے جس دروازے سے چاہے داخل ہوگی۔

اس روایت کی سند ضعیف ہے لیکن اس کے بہت سے شواہد ہیں جن کے ساتھ بعض لوگوں کے نزدیک یہ روایت حسن لغیرہ بن جاتی ہے۔ شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے حسن لغیرہ قرار دیا ہے۔ (صحیح الترغیب والترہیب ۲/۴۱۱ ح ۱۹۳۱، ۱۹۳۲)

اور ''آداب الزفاف'' میں اس سے استدلال کیا ہے کہ بیوی پر خاوند کی خدمت واجب ہے۔ (ص ۲۸۶)

تنبیہ: حسن لغیرہ روایت حجت نہیں ہوتی بلکہ ضعیف و غیر مقبول ہی کی ایک قسم ہے۔ دیکھئے ماہنامہ الحدیث حضرو: ۵ ص ۱۲۔۱۴

اس مسئلے: وجوب خدمت پر اور بھی بہت سی دلیلیں ہیں اور اسی طرح ادلۂ صحیحہ سے یہ ثابت ہے کہ خاوند پر بھی یہ واجب ہے کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ احسان و نیکی اور حسن و سلوک سے پیش آئے۔ تفصیل کے لئے آداب الزفاف پڑھ لیں۔ [شہادت، اکتوبر ۲۰۰۳ء]

نبی ﷺ اور درود کا جواب

سوال ابوداود کی حدیث ہے کہ جو شخص مجھ پر سلام پڑھتا ہے، میری روح میرے جسم میں لوٹائی جاتی ہے اور میں جواب دیتا ہوں، یہ حدیث سنداً کیسی ہے؟ اس سے بریلویوں کا استدلال ہے کہ نبی ﷺ قبر میں زندہ ہیں۔ (ایک سائل)

الجواب یہ روایت سنن ابی داود (کتاب المناسک باب زیارۃ القبور: ۲۰۴۱) اور مسند احمد (۲/۵۲۷) میں موجود ہے۔ اسے ابن الملقن (تحفۃ المحتاج ح ۱۱۵۱) وغیرہ نے صحیح کہا ہے لیکن راجح قول میں اس کی سند ضعیف ہے۔

یزید بن عبداللہ بن قسیط (راوی حدیث عن ابی ہریرہ) کا سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت ہے۔ دیکھئے السنن الکبریٰ للبیہقی (۱/۱۲۲، وسندہ حسن)

لیکن اس خاص روایت میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں اور ان کی عام روایتیں تابعین سے ہیں یعنی وہ تابعین عن الصحابہ سے روایت کرتے ہیں اور اس سند میں انھوں نے سماع کی تصریح نہیں کی لہٰذا اس سند میں انقطاع کا شبہ ہے جیسا کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے تحقیق کی ہے لہٰذا اسے حسن قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ والعلم عند اللہ عزوجل

[شہادت، اکتوبر ۲۰۰۳ء]

بیمار کا حمام میں نہانا؟

سوال بیماروں کے لئے حمام میں نہانا مفید ہوتا ہے۔

(مجمع الزوائد کتاب الطہارۃ باب فی الحمام والنورۃ ۱/۲۸۸ ح ۱۵۱۹، ونسخہ مشہورہ ۱/۲۷۷)

یہ روایت کیسی ہے؟ (محمد محسن سلفی، کراچی)

الجواب روایت مذکورہ ، اس مفہوم کے ساتھ المعجم الکبیر للطبرانی (۱۱/ ۲۵، ۲۶ ح ۱۰۹۲۶) میں موجود ہے۔ اُس کا راوی یحییٰ بن عثمان التیمی ضعیف ہے۔

(التقریب: ۷۶۰۶ وضعفہ الجمہور)

یہ روایت زوائد البزار میں شفاء مریض کے بغیر (ینقی الوسخ) کے الفاظ سے لکھی ہوئی ہے۔ (۱/۱۶۲ ح ۳۱۹) اس کی سند سفیان ثوری کی تدلیس (عن) کی وجہ سے ضعیف ہے۔

خلاصہ: روایتِ مسئولہ بلحاظِ سند ضعیف ہے۔ [شہادت، اگست ۲۰۰۴ء]

سوال سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ جب حمام میں جاتے نہلانے والا آپ کے بدن پر میل دور کرنے کی کوئی چیز ملتا تو وہ ناف تک پہنچتا تو آپ اس سے بھی کہہ دیتے "اخرج" باہر چلے جاؤ۔ (مجمع الزوائد ۱/۲۹۰ ح ۱۵۲۹) (محمد محسن سلفی، کراچی)

الجواب اس روایت کی سند مجھے معلوم نہیں ہے، مصنف عبدالرزاق (۱/۲۹۱، ۲۹۲) وموسوعۃ فقہ عبداللہ بن عمر (ص ۳۰۸) میں اس کے معنوی شواہد ہیں۔ ابن ابی شیبہ (۱/۱۰۹ ح ۱۱۶۵) نے صحیح سند کے ساتھ عبداللہ بن عمر سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا:

"لا تدخل الحمام فإنه مما أحدثوا من النعیم" [تم حمام میں داخل نہ ہو کیونکہ

انھوں نے بہت سی بدعات ایجاد کرلی ہیں۔] [شہادت، اگست ۲۰۰۴ء]

بیوی اور شوہر کی مدتِ جدائی؟

سوال ایک مشہور واقعہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے دورِ خلافت میں ایک گھر کے پاس سے گزرے تو ایک عورت اشعار پڑھ رہی تھی کہ آج میرے خاوند جہاد پر گئے ہیں، اگر مجھے شریعت کا ڈر نہ ہوتا تو میرے بستر پر آج کوئی غیر مرد ہوتا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سنا تو اپنی بیٹی کے پاس گئے اور جا کر پوچھا کہ اے میری بیٹی ایک عورت اپنے خاوند کے بغیر کتنا عرصہ گزار سکتی ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ دو ماہ یا زیادہ سے زیادہ چار ماہ۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں قانون بنا دیا کہ کوئی مرد مجاہد چار ماہ سے زائد گھر سے باہر نہ رہے بلکہ وہ چھٹی لے کر گھر آئے اور اپنے حقوقِ زوجیت ادا کرے۔

کیا یہ واقعہ صحیح اسناد سے ثابت ہے؟ اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو پھر بہت سارے مجاہدین اور تبلیغی جماعت والے سال کے لئے یا دو سال کے لئے گھر سے نکل جاتے ہیں، وہ تو ان حقوق کو پورا نہیں کرتے۔ اس واقعہ کا حوالہ بھی دیں کہ یہ کون سی کتاب میں ہے۔

(خرم ارشاد محمدی، دولت نگر)

الجواب اس مفہوم کا اثر حافظ ابن کثیر نے موطأ امام مالک سے بسند عمرو بن دینار عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر ۱/۵۴۱، سورۃ البقرہ: ۲۲۷)

یہ اثر موطأ امام مالک میں نہیں ملا۔ دوسرے یہ کہ عمرو بن دینار نے سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو نہیں پایا۔ دیکھئے تحفۃ الاشراف (۸/۹۴ ح ۲۰۶۱۳، ولفظہ: عمرو بن دینار المکی الأثرم عن عمر .... ولم یدرکہ)

بیہقی نے اسماعیل بن ابی اویس: ''حدثني مالك عن عبدالله بن دينار عن ابن عمر قال: خرج عمر بن الخطاب رضي الله عنه من الليل فسمع امرأة تقول ... '' إلخ کی سند سے اس کی ہم معنی روایت بیان کی ہے۔ (السنن الکبریٰ ۹/۲۹)

اس کی سند اسماعیل بن ابی اویس کی وجہ سے ضعیف ہے۔

تفسیر ابن کثیر میں اس کا ایک ضعیف شاہد بھی ہے۔ (۵۴۱/۱)
مصنف عبدالرزاق (۱۵۰/۱، ۱۵۱ ح ۱۲۵۹۳، ۱۲۵۹۴) اور المحلی لابن حزم (۴۰/۱۰ مسئلہ: ۱۸۸۶) وغیرہما میں اس مفہوم کی دوسری سندیں بھی ہیں جو سب کی سب ضعیف ہیں لہٰذا یہ قصہ باسند صحیح یا حسن ثابت نہیں بلکہ ضعیف ہے۔ واللہ اعلم

محمد بن اسحاق بن یسار؟

سوال کیا محمد بن اسحاق (صاحب مغازی) ضعیف راوی ہے؟ (میں نے سنا ہے کہ آپ اسے ضعیف کہتے ہیں) (ناصر رشید، راولپنڈی)

الجواب محمد بن اسحاق بن یسار اگر سماع کی تصریح کریں تو حسن الحدیث یعنی حسن درجہ کے راوی ہیں۔ (دیکھئے الکواکب الدریہ ص ۴۲، ۴۳، دوسرا نسخہ ۵۹، ۶۰)

بعض لوگ یہ دھوکا دیتے ہیں کہ وہ مغازی وسیر میں تو حسن درجہ کے راوی ہیں مگر سنن و احکام میں ضعیف و کذاب ہیں حالانکہ جمہور محدثین نے سنن و احکام میں بھی انھیں حسن الحدیث وصدوق ہی قرار دیا ہے۔ مثلاً امام بخاری، ابوداود، ابن خزیمہ، ابن حبان، ترمذی، دارقطنی اور بیہقی وغیرہم۔

[تنبیہ: آپ نے جو سنا ہے کہ میں ''اسے ضعیف کہتا ہوں'' یہ غلط بلکہ جھوٹ ہے۔ میں تو ابن اسحاق مذکور کو جب سماع کی تصریح کریں حسن الحدیث سمجھتا ہوں۔]

[شہادت، مئی ۲۰۰۰ء]

ناسخ ومنسوخ

سوال بعض احادیث میں ایک کام کی اجازت مل رہی ہے، دوسری حدیث سے اس کی ممانعت ہو رہی ہے، اس لئے آپ سے گزارش ہے کہ اس کی وضاحت کریں کہ کون سی حدیث ناسخ ہے اور کون سی منسوخ؟

① ''لعن رسول اللہ ﷺ زوارات القبور ...'' إلخ رسول اللہ ﷺ نے

قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت بھیجی ہے، کی حدیث مسند طیالسی (۱/۱۷۱ ح ۲۳۴۳) سنن ابن ماجہ (۱۵۷۵) سنن ترمذی (۱۰۵۶) تمہید ابن عبدالبر (۲/۲۳۵) میں ہے۔ مسند طیالسی، صحیح ابن حبان اور سنن ابن ماجہ میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے، مستدرک حاکم اور سنن ابن ماجہ میں حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ حدیث ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کو ترمذی اور ابن حبان نے صحیح کہا ہے اور حدیث حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو بوصیری نے صحیح قرار دیا ہے۔ علامہ البانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث انھی الفاظ کے ساتھ محفوظ ہے۔

(احکام الجنائز ۱۸۶)

② عبداللہ بن ابی ملیکہ سے روایت ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ایک روز قبرستان سے آ رہی تھیں، میں نے دریافت کیا کہ آپ کہاں سے آ رہی ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ میں اپنے بھائی عبدالرحمٰن بن ابی بکر کی قبر سے آ رہی ہوں۔ میں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کی زیارت سے منع نہیں کیا؟ انھوں نے جواب دیا کہ منع تو کیا تھا مگر بعد میں زیارت کا حکم دے دیا تھا۔ المستدرک للحاکم (۱/۳۷۶) التمہید لابن عبدالبر (۲/۲۲۳)

③ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ میں جب قبرستان جاؤں تو کون سی دعا پڑھوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ پڑھا کرو ((السلام علی أهل الديار ...)) إلخ صحیح مسلم (۷/۴۴) سنن النسائی (۲/۹۲۔۹۳)

ان احادیث میں تطبیق وتوفیق کر کے جواب دیں۔ (عبداللہ صاحب)

الجواب زوارات مبالغہ کا صیغہ ہے۔ بہت زیادہ زیارت کرنے والی عورتوں کو زوارات کہتے ہیں لہٰذا دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ بہت زیادہ زیارت کرنے والی عورتیں اپنے بھائی، بیٹے، خاوند، باپ وغیرہ رشتوں کے علاوہ غیروں کی قبروں پر بھی جاتی ہیں۔ ان پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے۔ رہا قریبی رشتہ داروں کی قبروں پر جانا، جس طرح کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے بھائی کی قبر پر گئی تھیں تو دوسری حدیث و

دیگر دلائل کی رو سے جائز ہے۔ اگر قریبی رشتہ دار کی قبر، قبرستان میں ہو تو وہاں بھی پردہ کر کے جانا تیسری حدیث کے رو سے صحیح ہے لہٰذا ان روایتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

[شہادت، نومبر ۲۰۰۰ء]

تذکیرِ موت

سوال رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بلاشبہ دل وگناہ آلود ہو جاتے ہیں جیسا کہ لوہا زنگ آلود ہو جاتا ہے جب اس کو پانی لگے، آپ سے عرض کیا گیا: اے اللہ کے رسول! زنگ دور کرنے کا آلہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: کثرت کے ساتھ موت کو یاد کرنا اور قرآن پاک کی تلاوت کرنا (مشکوٰۃ المصابیح۔ کتاب فضائل القرآن، حدیث ۲۱۶۸) اس کی مفصل تخریج درکار ہے۔ (محمد محسن سلفی، کراچی)

الجواب یہ روایت شعب الایمان للبیہقی (ح ۲۰۱۴) میں ہے اور اس کی سند سخت ضعیف ہے۔ ایک سند میں ابو ہشام عبدالرحیم بن ہارون الغسانی الواسطی کذاب ہے اور دوسری میں عبداللہ بن عبدالعزیز بن ابی رواد سخت ضعیف ہے۔

حلیۃ الاولیاء (۸/ ۱۹۷) میں غلطی سے ہشام الغسانی چھپ گیا ہے۔

صاحبِ حلیۃ الاولیاء (ابونعیم اصبہانی) نے کہا:

”تفرد به أبو هشام واسمه عبد الرحيم بن بن هارون الواسطي“

سنن ترمذی (۲۳۰۷ وغیرہ) کی ایک حسن روایت ہے کہ ”أكثروا ذكر هاذم اللذات يعني الموت“ یہ روایت درج بالا روایت کی تائید نہیں کرتی، اس کے باوجود تنقیح الرواۃ (ج ۱ ص ۵۶) میں یہ لکھ دیا گیا ہے کہ ”ويؤيد هذا حديث أبي هريرة عند الترمذي في ذكر الموت بإسناد حسن“!!!

[شہادت، فروری ۲۰۰۳ء]

فرعون اور اس کی سیڑھی

سوال بڑے کافر حکمران (فرعون) کے بنائے گئے محل، سیڑھی (اللہ سے لڑائی کرنے کے لئے) کی ''چوٹی آسمان سے ملتی تھی'' ایک مولوی (ان پڑھ) نے یہ مسئلہ عام مجلس میں بیان کیا.... کیا یہ ثابت ہے؟ کیا واقعی فرعون نے اس مینار پر چڑھ کر آسمان کی طرف تیر پھینکے تھے؟ (ذکر مینار سورۂ قصص: ۳۸ اور مومن: ۳۶) (محمد صدیق سلفی، ایبٹ آباد)

الجواب اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کے لئے، فرعون لعین کا اونچا مکان بنوانا ثابت ہے لیکن یہ قطعاً ثابت نہیں ہے کہ اس مکان کی چوٹی آسمان سے ملی ہوئی تھی۔ ان پڑھ مولوی صاحب نے یہ جھوٹی بات پھیلا دی ہے کہ اس مکان کی چوٹی آسمان سے ملی ہوئی تھی۔ اس لئے علمائے حق نے ایسے قصہ گوؤں کے قصوں سے منع کیا ہے اور احادیث میں بھی ان لوگوں کی مذمت ہی مروی ہے۔ [شہادت، اکتوبر ۲۰۰۰ء]

ایک عجیب روایت کی تحقیق

سوال ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ وہ مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد فوراً گھر چلے جاتے تھے، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کہا یا رسول اللہ ﷺ یہ روزانہ ہی جلدی جلدی گھر چلے جاتے ہیں تو آپ ﷺ نے دریافت کیا تو وہ صحابی رضی اللہ عنہ کہنے لگے کہ میرے پاس اور میری بیوی کے پاس صرف ایک چادر ہے جس میں مَیں اور میری بیوی نماز ادا کرتے ہیں، جب وہ چادر لے کر مسجد میں آجاتا ہوں تو میری بیوی گھر میں برہنہ حالت میں بیٹھی رہتی ہے اس لئے میں مغرب کے وقت جلدی جلدی گھر چلا جاتا ہوں کیونکہ اس نماز کا وقت کم ہوتا ہے جب میں جاتا ہوں تو یہ چادر اپنی بیوی کو دیتا ہوں پھر وہ اس میں نماز ادا کرتی ہے، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا اگر کوئی جنتی جوڑا دیکھنا چاہتے ہو تو اس جوڑے کو دیکھ لو۔ پھر آپ ﷺ نے انھیں اونٹ دیئے، جب وہ گھر پہنچے تو ان کی بیوی نے کہا مجھے ساتھ رکھ لیں یا اونٹوں کو پاس رکھ لیں انھوں نے اونٹ واپس کر دیئے اور بیوی کو اپنے ساتھ رکھ

لیا، اس واقعے کو قاری عبدالحفیظ فیصل آبادی نے اپنی کیسٹ میں بیان کیا ہے۔ کیا یہ واقعہ کسی حدیث کی کتاب میں موجود ہے۔ اگر ہے تو یہ واقعہ سند کے اعتبار سے کیسا ہے؟ اس کے بارے میں آگاہ فرمائیں۔ جزاکم اللہ خیراً

اللہ ہمیں قرآن وسنت کی خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

(خرم ارشاد محمدی، دولت نگر گجرات)

الجواب اس روایت کی کوئی سند یا ثبوت مجھے کسی کتاب میں نہیں ملا۔ روایت، الفاظ اور قصے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ موضوع و بے اصل روایت ہے۔

آپ قاری عبدالحفیظ فیصل آبادی صاحب سے رابطہ کریں اور یہ پوچھیں کہ یہ روایت کہاں ہے؟

[شہادت، جنوری ۲۰۰۵ء]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا عظیم الشان مقام

سوال کیا حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ علمائے اہلِ سنت والجماعت میں سے تھے یا نہیں؟ محمد ابوبکر غازیپوری دیوبندی نے ایک رسالہ لکھا ہے: "کیا ابنِ تیمیہ علماءِ اہلسنت والجماعت میں سے ہیں؟ ابن تیمیہ کے بعض معتقدات پر ایک طائرانہ نظر"

اس رسالے میں غازیپوری مذکور نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اہلِ سنت و جماعت سے خارج تھے، ابن تیمیہ کا عقیدہ تھا کہ انبیاء علیہم السلام گناہوں سے معصوم نہیں ہوتے۔ وغیرہ، دیکھئے ص ۳۴، ۳۶

غازیپوری کے اس رسالے کو الیاس گھمن پارٹی (حیاتی گروپ) کے مکتبہ (۸۷۔ جنوبی، لاہور روڈ سرگودھا) سے شائع کیا گیا ہے، اس کی کیا حقیقت ہے برائے مہربانی واضح فرمائیں۔ (مدثر جاوید بن محمد صدیق النجار، حضرو)

الجواب حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نہ صرف کبار علمائے اہلِ سنت و جماعت میں سے تھے بلکہ شیخ الاسلام تھے، فی الحال مشتے از خروارے دس حوالے پیشِ خدمت ہیں:

۱: حافظ ابن تیمیہ (متوفی ۷۲۸ھ) کے شاگرد حافظ ذہبی (متوفی ۷۴۸ھ) نے ابن تیمیہ کے بارے میں لکھا:

"الشیخ الإمام العلامة الحافظ الناقد (الفقیه) المجتهد المفسر البارع شیخ الإسلام علم الزهاد نادرة العصر ..." (تذکرۃ الحفاظ ۴/ ۱۴۹۶ ت ۱۱۷۵)

نیز لکھا: "الإمام العالم المفسر الفقیه المجتهد الحافظ المحدث شیخ الإسلام نادرة العصر ، ذو التصانیف الباهرة والذکاء المفرط"

(ذیل تاریخ الاسلام للذہبی ص ۳۲۴)

اور لکھا "شیخنا الإمام" (معجم الشیوخ ۱/ ۵۶ ت ۴۰)

معلوم ہوا کہ حافظ ذہبی انھیں امام اور شیخ الاسلام سمجھتے تھے۔

۲: حافظ ابن تیمیہ کے شاگرد حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ (متوفی ۷۷۴ھ) نے لکھا:

" وفاة شيخ الإسلام أبي العباس تقي الدين أحمد بن تيمية "
(البدایہ والنہایہ ۱۴/۱۴۱ اوفیات ۷۲۸ھ نیز دیکھئے ص ۱۴۶)

۳: شیخ علم الدین ابو محمد القاسم بن محمد بن البرزالی الشافعی رحمہ اللہ (متوفی ۷۳۹ھ) نے اپنی تاریخ میں کہا: " الشيخ الإمام العالم العلم العلامة الفقيه الحافظ الزاهد العابد المجاهد القدوة شيخ الإسلام " (البدایہ والنہایہ ۱۴/۱۴۱)
نیز دیکھئے العقود الدریۃ (ص ۲۴۶)

۴: حافظ ابن تیمیہ کے شاگرد حافظ ابو عبداللہ محمد بن احمد بن عبدالہادی المقدسی الحنبلی رحمہ اللہ (متوفی ۷۴۴ھ) نے " العقود الدرية من مناقب شيخ الإسلام أحمد بن تيمية " کے نام سے ایک کتاب لکھی جو ۳۵۲ صفحات پر مشتمل ہے، مطبعۃ المدنی قاہرہ مصر سے مطبوع ہے اور ہمارے پاس موجود ہے۔ والحمد للہ

اس کتاب میں ابن عبدالہادی نے کہا:

" هو الشيخ الإمام الرباني، إمام الأئمة ومفتي الأمة وبحر العلوم، سيد الحفاظ و فارس المعاني و الألفاظ، فريد العصر و قريع الدهر، شيخ الإسلام بركة الأنام وعلامة الزمان و ترجمان القرآن، علم الزهاد و أوحد العباد، قامع المبتدعين و آخر المجتهدين " (العقود الدریہ ص ۳)

۵: حافظ ابو الفتح ابن سید الناس الیعمری المصری رحمہ اللہ (متوفی ۷۳۴ھ) نے حافظ جمال الدین ابو الحجاج المزی رحمہ اللہ کے تذکرے میں کہا:

" وهو الذي حداني على رؤية الشيخ الإمام شيخ الإسلام تقي الدين أبي العباس أحمد... " (العقود الدریہ ص ۹)

۶: کمال الدین ابو المعالی محمد بن ابی الحسن الزملکانی (متوفی ۷۲۷ھ) نے حافظ ابن تیمیہ کی کتاب: " بيان الدليل على بطلان التحليل " پر اپنے ہاتھ سے لکھا:

" الشيخ السيد الإمام العالم العلامة الأوحد البارع الحافظ الزاهد الورع

القدوة الكامل العارف تقي الدين ، شيخ الإسلام مفتي الأنام سيد العلماء ، قدوة الأئمة الفضلاء ناصر السنة قامع البدعة حجة اللّٰه على العباد في عصره، رادّ أهل الزيغ والعناد ، أوحدالعلماء العاملين آخر المجتهدين ''
(العقود الدریہ ص ۸، الرد الوافر لابن ناصر الدین الدمشقی ص ۱۰۴، واللفظ لہ)

۷: ابوعبداللہ محمد بن الصفی عثمان بن الحریری الانصاری الحنفی (متوفی ۷۲۸ھ) فرماتے تھے: '' إن لم يكن ابن تيمية شيخ الإسلام فمن ؟ ''
اگر ابن تیمیہ شیخ الاسلام نہیں ہیں تو پھر کون ہے؟ (الرد الوافر لابن ناصر الدین ص ۹۸، ۵۶)

۸: ابوعبداللہ محمد بن محمد بن ابی بکر بن ابی العباس احمد بن عبدالدائم المعروف بابن عبدالدائم المقدسی الصالحی (متوفی ۷۷۵ھ) نے حافظ ابن تیمیہ کو شیخ الاسلام کہا ہے۔
دیکھئے الرد الوافر (ص ۶۱)

9: شمس الدین ابوبکر محمد بن محب الدین ابی محمد عبداللہ بن المحب عبداللہ الصالحی الحنبلی المعروف بابن المحب الصامت نے اپنے ہاتھ سے لکھا:
'' شيخنا الإمام الرباني شيخ الإسلام إمام الأعلام بحر العلوم والمعارف ''
(الرد الوافر ص ۹۱)

۱۰: حافظ ابن تیمیہ کے مشہور شاگرد حافظ ابن القیم الجوزیہ (متوفی ۷۵۱ھ) نے اُن کے بارے میں کہا: '' شيخ الإسلام '' (اعلام الموقعین ج ۲ ص ۲۴۱ طبع دار الجیل بیروت)

ان دس حوالوں کے علاوہ اور بھی بہت سے حوالے ہیں جن میں حافظ ابن تیمیہ کی بے حد تعریف کی گئی ہے اور انھیں شیخ الاسلام جیسے عظیم الشان لقب سے یاد کیا گیا ہے مثلاً:
حافظ ابن رجب الحنبلی (متوفی ۷۹۵ھ) نے کہا:
'' الإمام الفقيه المجتهد المحدث الحافظ المفسر الأصولي الزاهد تقي الدين أبو العباس شيخ الإسلام وعلم الأعلام ... '' (الذیل علی طبقات الحنابلۃ ۲/ ۳۸۷ ت ۴۹۵)
ابن العماد الحنبلی نے کہا: '' شيخ الإسلام ... الحنبلي بل المجتهد المطلق ''
(شذرات الذهب ۶/ ۸۱)

تہذیب الکمال اور تحفۃ الاشراف کے مصنف حافظ ابوالحجاج المزی رحمہ اللہ نے فرمایا:

"ما رأيت مثله، ولا رأى هو مثل نفسه و ما رأيت أحدًا أعلم بكتاب الله وسنة رسوله ولا أتبع لهما منه" میں نے اُن جیسا کوئی نہیں دیکھا اور نہ انھوں نے اپنے جیسا کوئی دیکھا، میں نے کتاب اللہ اور رسول اللہ (ﷺ) کی سنت کا اُن سے بڑا عالم نہیں دیکھا اور نہ اُن سے زیادہ کتاب وسنت کی اتباع کرنے والا کوئی دیکھا ہے۔

(العقود الدریہ ص ۷ تصنیف الامام ابن عبدالہادی تلمیذ الحافظ المزی رحمہما اللہ)

ان گواہیوں کا خلاصہ یہ ہے کہ حافظ ابن تیمیہ اہلِ سنت و جماعت کے کبار علماء میں سے تھے اور شیخ الاسلام تھے۔

فرقۂ بریلویہ اور بعض مبتدعین اُن کی شان میں گستاخی کرتے ہیں جن کی تقلید میں ابوبکر غازیپوری دیوبندی نے بھی اپنے رسالے "کیا ابن تیمیہ علماء اہلسنت والجماعت میں سے ہیں؟ ابن تیمیہ کے بعض معتقدات پر ایک طائرانہ نظر" میں کذب وافتراء، دجل و فریب اور تحریفات کرتے ہوئے بڑا گھناؤنا پروپیگنڈا کیا ہے جس کا حساب اُسے اللہ کے دربار میں دینا پڑے گا۔ ان شاء اللہ

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے بارے میں "قافلۂ حق" نامی دیوبندی رسالے میں محمد محمود عالم صفدر اوکاڑوی دیوبندی نے بہت زبان درازی کی ہے۔

دیکھئے قافلۂ حق (فی الحقیقت: قافلۂ باطل) جلد ا شمارہ ۲ ص ۲۰ تا ۳۳)

ماضی قریب میں زاہد بن حسن الکوثری (الجہمی) نام کا ایک شخص گزرا ہے جس پر شیخ عبدالرحمٰن بن یحییٰ المعلمی الیمانی اور شیخ البانی وغیرہما نے سخت جرح کر رکھی ہے۔ اس شخص (کوثری) کے بارے میں ابوسعد الشیر ازی (دیوبندی) نے لکھا:

"فخر المحدثین امام المتکلمین شیخ الاسلام زاہد بن الحسن الکوثریؒ" (قافلۂ باطل جلد ا شمارہ ۴ ص ۲۷)

یہ وہی کوثری تھا جس نے امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ کی کتاب التوحید کو "کتاب الشرک" لکھا ہے۔ دیکھئے مقالات الکوثری (ص ۳۳۰، الطبعۃ الاولیٰ ۱۳۷۲ھ)

اس کوثری نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے بارے میں توہین کرتے ہوئے لکھا:

"ومع هذا كله إن كان هو لا يزال يعد شيخ الإسلام فعلى الإسلام السلام"

اور اگر ان سب (باتوں) کے باوجود اسے شیخ الاسلام کہا جاتا ہے تو (ایسے) اسلام پر سلام ہے۔ (الاشفاق علیٰ احکام الطلاق ص ۸۹)

دیکھئے کوثری جرکسی جہمی نے کس طرح شیخ الاسلام پر اپنی بھڑاس نکالی ہے حالانکہ حافظ ذہبی، حافظ برزالی، حافظ ابن عبدالہادی، حافظ ابن سید الناس، حافظ ابن کثیر اور حافظ ابن القیم وغیرہم نے حافظ ابن تیمیہ کو شیخ الاسلام قرار دیا تھا۔ کوثری کے گمراہ کن نظریات وعقائد کے لئے دیکھئے مولانا ارشاد الحق اثری کی کتاب: مقالات (ج ۱ص ۵۳، ۱۶۲، ۱۷۹)

آخر میں حنفیت کی طرف منسوب ان مبتدعین کی خدمت میں حنفیوں اور مبتدعین۔ کے حوالے پیش کرتا ہوں جو اپنی تحریروں میں حافظ ابن تیمیہ کو شیخ الاسلام کہتے یا اُن کی تعریف میں رطب اللسان تھے یا ہیں:

۱: ملا علی قاری حنفی تقلیدی نے ابن تیمیہ اور ابن القیم کے بارے میں لکھا:

"ومن طالع شرح منازل السائرين تبين له أنهما كانا من أكابر أهل السنة والجماعة و من أولياء هذه الأمة" جس نے منازل السائرین کی شرح کا مطالعہ کیا تو اس پر واضح ہو گیا کہ وہ دونوں (ابن تیمیہ اور ابن القیم) اہلِ سنت والجماعت کے اکابر میں سے اور اس اُمت کے اولیاء میں سے تھے۔ (جمع الوسائل فی شرح الشمائل ج ۱ص ۲۰۷)

ملا علی قاری کی اس عبارت کو اختصار کے ساتھ سرفراز خان صفدر گکھڑوی کڑمنگی نے اپنی کتاب "المنہاج الواضح یعنی راہِ سنت" میں نقل کیا اور کوئی جرح نہیں کی۔ دیکھئے ص ۱۸۷ نیز دیکھئے تفریح الخواطر فی رد تنویر الخواطر ص ۲۹، اور راہِ ہدایت ص ۲۳۸

۲: سرفراز خان صفدر دیوبندی کڑمنگی نے لکھا:

"شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ ..." (احسن الکلام طبع جون ۲۰۰۶ جلد ۱ص ۹۴)

۳: محمد منظور نعمانی دیوبندی نے کہا:

"ساتویں اور آٹھویں صدی کے مجدد شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اپنی تصنیفات اور فتاویٰ میں جابجا شیعیت کا رد فرمایا ہے" (ماہنامہ بینات کراچی، خصوصی اشاعت: خمینی اور اثنا عشریہ کے بارے میں علماء کرام کا متفقہ فیصلہ ص ۱۱) نیز دیکھئے خمینی وشیعیت کیا ہے، ص ۸۴

۴: بریلویوں اور دیوبندیوں کے ممدوح ملا ابن عابدین شامی نے کہا:

" ورأيت في كتاب الصارم المسلول لشيخ الإسلام ابن تيمية الحنبلي... "

(ردالمحتار علی الدر المختار ۳/۳۰۵)

۵: اشرف علی تھانوی دیوبندی نے کہا:

"ابن تیمیہ بزرگ ہیں عالم ہیں متقی ہیں اللہ ورسول پر فدا ہیں دین پر جان نثار ہیں۔ دین کی بڑی خدمت کی ہے مگر ان میں بوجہ فطرۃً تیز مزاج ہونے کے تشدد ہو گیا۔"

(ملفوظات "حکیم الامت" ج ۱۰ ص ۴۹، ۵۰ مطبوعہ ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان)

تشدد والی بات تو مردود ہے نیز تھانوی نے حافظ ابن تیمیہ اور حافظ ابن القیم دونوں کے بارے میں کہا:

"یہ سب نیک تھے اور نیت سب کی حفاظت دین کی تھی۔" (ملفوظات ج ۲۶ ص ۲۸۷)

۶: محمد تقی عثمانی دیوبندی نے لکھا:

"اور علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:" (حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق ص ۱۱۷)

۷: عتیق الرحمٰن سنبھلی نے لکھا:

"امام ابن تیمیہؒ کا ارشاد" (واقعہ کربلا اور اس کا پس منظر، دوسرا ایڈیشن ص ۲۳۹)

۸: بشیر احمد قادری دیوبندی مدرس قاسم العلوم فقیر والی نے لکھا:

"شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کا فتویٰ:" (تجلیاتِ صفدر جلد ۳ ص ۱۰۵)

۹: ماسٹر امین اکاڑوی دیوبندی نے لکھا:

" نیلوی صاحب شیخ الاسلام ابن تیمیہ، علامہ ابن قیم، علامہ سیوطی اور نواب صدیق حسن خاں سے نقل کرتے ہیں..." (تجلیات صفدر ج ۷ ص ۱۶۲)

۱۰:    محمد محمود عالم صفدر اوکاڑوی دیوبندی جس نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے بارے میں بہت زبان درازی کی ہے۔ دیکھئے قافلۂ باطل ج ۱ شمارہ ۲ ص ۲۰ تا ۳۲

اسی محمود عالم نے ''اصولِ حدیث'' والے مضمون میں خود لکھا ہے:

''شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں...'' (قافلۂ باطل ج ۱ شمارہ ۴ ص ۸)

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے حوالے ہیں مثلاً دیکھئے منحۃ الخالق علی البحر الرائق (ج ۵ ص ۲۴۶) برأت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ تصنیف ظفر احمد عثمانی تھانوی دیوبندی (ص ۱۷) خاتمۃ الکلام فی ترک القراءۃ خلف الامام تصنیف فقیر اللہ دیوبندی (ص ۴۳) اور ''صبر وتحمل کی روشن مثالیں'' تالیف محمد صاحب بن مفتی ابراہیم دیوبندی (ص ۵۳، ۵۶)

جب مرضی کا معاملہ ہو مثلاً فاتحہ خلف الامام کا مسئلہ وغیرہ تو دیوبندی حضرات حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کو شیخ الاسلام، امام اور علامہ وغیرہ لکھتے ہیں اور اگر مرضی کے خلاف بات ہو تو یہی لوگ شیخ الاسلام پر تنقید، تنقیص اور توہین آمیز جملے بے دریغ استعمال کرتے ہیں۔ کیا انھیں اللہ کا خوف نہیں ہے؟

[شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے بارے میں ابن بطوطہ سیاح کے کذب وافتراء کی تردید کے لئے دیکھئے محترم محمد صدیق رضا کی کتاب: مشہور واقعات کی حقیقت ص ۱۶۰۔۱۶۴]

آخر میں دوبارہ عرض ہے کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اہلِ سنت و جماعت کے کبار علماء میں سے جلیل القدر ثقہ امام تھے، آپ ۲۰ ذوالقعدہ ۷۲۸ھ میں دمشق کے قلعے کی جیل میں فوت ہوئے۔ رحمہ اللہ   (۱۱/ دسمبر ۲۰۰۸ء)

چند اہم سوالات اوران کے جوابات

سوال آپ کی خدمت میں پھر کچھ دینی سوالات ارسال کر رہا ہوں تا کہ قرآن و حدیث کی روشنی میں جوابات حاصل کرسکوں۔

۱۔   یہاں مدراس کے علاقے کے اہلحدیثوں سے یہ بات آئی ہے کہ جہری نمازوں کی جماعت میں مقتدیوں کو سورۂ فاتحہ سننا چاہئے۔ انفرادی طور پر پڑھنا ضروری نہیں۔ یہ قول

کہاں تک صحیح ہے؟

۲۔ کہتے ہیں صحیح ابن خزیمہ میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی گئی ہے کہ کسی کو جماعت کی نمازوں میں رکوع مل جانے سے، اسے رکعت ملنا شمار کیا جائے گا۔اس بارے میں حقیقت کیا ہے؟باوجود قیام نہ ملنے اور سورۂ فاتحہ نہ پڑھ سکنے کے رکعت کیسے شمار ہوگی؟

۳۔ وتر کس طرح پڑھا جائے؟ دو رکعت پڑھ کر سلام پھیرنے کے بعد ایک رکعت پڑھی جائے یا تین رکعتیں اکٹھی پڑھ کر ایک ہی تشہد سے سلام پھیرا جائے؟

۴۔ عیدین اور جنازہ کی نماز میں ہر تکبیر پر رفع یدین کر کے ہاتھ باندھنا صحیح ہے یا صرف تکبیر اولی پر ہی رفع یدین کر کے ہاتھ باندھنا چاہئیں؟

۵۔ عیدین کی نماز سے پہلے جو تکبیریں کہی جاتی ہیں، تو یہاں ہوتا یہ ہے کہ ایک شخص پہلے بلند آواز سے مائیک میں تکبیر کہتا ہے اور پھر حاضرین جواباً مجموعی طور پر تکبیر کہتے ہیں۔کیا ایسا کرنا ٹھیک ہے؟

۶۔ کیا عیدین میں خطبہ کے بعد امام اور مقتدیوں کا ہاتھ اٹھا کر مجموعی طور پر دعا مانگنا صحیح ہے؟

۷۔ عیدین میں خطبہ عید کے بعد عید مبارک کہنا اور (معانقہ) بغل گیر ہونے کا جو دستور ہے شرعاً کیسا ہے؟

۸۔ ذوالحجہ کے مہینے میں مسجدوں میں جماعت کی فرض نمازوں کے بعد جو تکبیریں کہی جاتی ہیں وہ کب سے کہی جائیں؟ نویں سے ۱۳ تاریخ تک یا پہلی سے ۱۳ تاریخ تک؟ (چونکہ سورۂ فجر میں ولیال عشر کی قسم کھائی گئی ہے)

۹۔ اگر عید جمعہ کے دن ہو تو کیا خطبۂ جمعہ ساقط ہو جاتا ہے؟ یعنی صرف ظہر پڑھنی چاہیے؟

۱۰۔ جمعہ کے خطبہ سے قبل جو نمازیں پڑھی جاتی ہیں وہ دو دو رکعتیں پڑھی جائیں یا اکٹھی چار رکعتیں پڑھی جا سکتی ہیں؟ (کیونکہ مشاہدہ یہ ہے کہ لوگ جمعہ کی پہلی اذان کے بعد چار رکعتیں اکٹھی پڑھتے ہیں)

۱۱۔ جمعہ کی فرض نماز کے بعد جو چار رکعتیں سنت ہیں وہ دو دو رکعتیں پڑھنی ہیں؟ یا چار رکعتیں اکٹھی ایک سلام سے بھی پڑھی جا سکتی ہیں؟

۱۲۔ سجدۂ تلاوت نفل نمازوں کے ممنوع اوقات میں (یعنی نماز فجر اور نماز اشراق کے درمیان اور نماز عصر اور غروب آفتاب کے درمیان کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ سجدۂ تلاوت فرض ہے؟ واجب ہے؟ یا کچھ اور؟ اگر ان اوقات میں تلاوت کے دوران آئے ہوئے سجدۂ تلاوت کو بعد میں کر لیا جائے تو کیسا ہے؟

۱۳۔ مسجد میں بیٹھے ہوئے کسی شخص کے ٹھیک پیچھے دوسرا کوئی شخص اپنی انفرادی نماز پڑھ رہا ہو تو کیا وہ بیٹھا ہوا شخص اس نمازی کے سلام پھیرنے سے قبل اپنی جگہ سے اٹھ کر جا سکتا ہے؟

۱۴۔ کئی مسجدوں میں (خاص کر رمضان المبارک میں) نمازیوں کی اتنی کثرت ہوتی ہے کہ مسجد کا ہال اور صحن پُر ہو جانے پر سیڑھی کے راستے سے آنے والے جماعت میں شامل ہونے کے لئے اوپر جانا چاہیں تو ان کو نمازیوں کے سامنے سے گزرنا ہوگا۔ تو ایسی حالت میں کیا کرنا چاہئے؟ جماعت چھوڑ دے یا نمازیوں کے سامنے سے گزر جائے؟

۱۶۔ میت کو قبر میں دفنانے کے بعد قبر کے سرہانے سورۂ اخلاص (تین بار) سورۂ فلق، سورۃ الناس، سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کا پہلا رکوع اور پاؤں کی طرف سورۂ بقرہ کا آخری رکوع پڑھنے کے بعد حاضرین ہاتھ اٹھا کر دعائیں مانگتے ہیں کیا ایسا کرنا شرعاً ٹھیک ہے؟

۱۷۔ کوئی اعتکاف کے لئے بیسویں رمضان کو اذانِ مغرب سے قبل کسی مجبوری اور لاچاری کی وجہ سے مسجد نہ پہنچ سکے تو کس وقت تک اس کا مسجد پہنچنا اعتکاف کے صحیح ہونے کے لئے ضروری ہے؟

۱۸۔ معتکف کو کس وقت اپنے حجرے میں داخل ہونا چاہئے؟

۱۹۔ معتکف اپنے حجرے کے باہر مسجد کے احاطے میں نماز، تلاوت قرآن، دعا وغیرہ کر سکتا ہے؟

۲۰۔ کیا یہ صحیح ہے کہ معتکف بلاشرعی حاجت کے غسل وغیرہ نہ کرے؟

۲۱۔ عید کے چاند کی اطلاع پر معتکف کے مسجد سے گھر لوٹنے سے قبل دو رکعت نماز پڑھنا کیا ضروری ہے؟ یہ دو رکعت کیا نماز ہے؟

۲۲۔ کیا کوئی شخص اپنے بیٹے کے عقیقے کے لئے دو بکرے یا بھیڑ ذبح کرنے کے بجائے عیدالاضحیٰ کے موقع پر گائے میں سات قربانیوں کے حصوں میں دو حصے عقیقہ کے شامل کر سکتا ہے؟

۲۳۔ ایک ملک میں رہنے والا دوسرے ملک کو اپنی زکوٰۃ کی رقم بھیج سکتا ہے یا اپنی قربانی دوسرے ملک میں کروا سکتا ہے؟ (واضح رہے کہ ملکوں کی کرنسی کے نرخ میں کافی فرق ہوتا ہے)

۲۴۔ اسی طرح ایک شہر سے دوسرے شہر یا علاقے کو زکوٰۃ اور قربانی بھیج سکتا ہے؟

۲۵۔ وفات کے وقت کوئی مسلم دو بیویاں چھوڑے۔ ایک کی اولاد ہو، دوسری کی نہیں تو وراثت میں بے اولاد بیوی کا کتنا حق ہوگا؟

۲۶۔ ایک مسلم مرد کی تین بیویاں ہیں دوسری (جو پہلے بیوہ تھی) پہلی کی سگی بہن ہے۔ چونکہ دو بہنوں کو نکاح میں اکٹھا کرنا منع ہے۔ دوسری سے نکاح کرنے سے پہلی کا نکاح ٹوٹ جاتا ہے یا دوسری کا نکاح باطل ہے؟ تینوں بیویوں سے اولاد بھی ہے۔ چنانچہ دوسری سے پیدا ہونے والے بچوں کی حیثیت کیا ہے۔ دوسری سے نکاح کے بعد پہلی بیوی سے پیدا ہونے والے بچوں کی حیثیت کیا ہے؟ مرد کے انتقال پر وراثت میں سب بیویوں کی اولاد کو حق ملے گا؟ کیا وراثت میں تینوں بیویوں کا حق ہوگا؟

۲۷۔ زید کی نکاح شدہ مسلم بیوی بغیر طلاق لئے اپنے شوہر کو چھوڑ کر چلی گئی اور دوسرے مسلم مرد کے ساتھ کئی سال رہنے کے بعد زید کے پاس واپس لوٹ آئی۔ کیا زید کا نکاح باقی رہتا ہے؟ کیا اسے نکاح کی تجدید کرنی ہوگی؟ اگر بیوی مسلم مرد کے بجائے کسی غیر مسلم مرد کے پاس رہ کر آئی ہو تو اس صورت میں پھر اسے اپنانے کے لئے زید کو کیا کرنا ہوگا؟

(عبدالرحمٰن یعقوب آئیہ)

الجواب آپ کے سوالات کے مختصر اور جامع جوابات بالترتیب درج ذیل ہیں: .

۱: جہری نمازوں میں بھی مقتدی پر سورۂ فاتحہ کا پڑھنا واجب (یعنی فرض) ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے جہری نماز کے مقتدیوں کو فرمایا:

((لا تفعلوا إلا بام القرآن فإنه لا صلوة لمن لم يقرأ بها)) تم سوائے سورۂ فاتحہ کے اور کچھ بھی نہ پڑھو، کیونکہ جو شخص سورۂ فاتحہ نہیں پڑھتا اس کی نماز نہیں ہوتی۔

(کتاب القراءت للبیہقی ص ۶۴ ح ۱۲۱، وقال البیہقی: وھذا اسناد صحیح ورواتہ ثقات)

اس حدیث کے راوی نافع بن محمود جمہور محدثین کے نزدیک ثقہ ہیں لہٰذا بعض علماء کا انھیں مجہول یا مستور کہنا غلط و مردود ہے۔

دیکھئے میری کتاب "الکواکب الدریہ فی وجوب الفاتحہ خلف الامام فی الجہریۃ"

فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ پر مزید تفصیل کے لئے درج ذیل کتابوں کا مطالعہ مفید ہے:

جزء القراءت للبخاری، کتاب القراءت للبیہقی، تحقیق الکلام لعبدالرحمٰن المبارکفوری رحمہ اللہ

۲: یہ روایت صحیح ابن خزیمہ (ج ۳ ص ۵۸ ح ۱۶۲۲) میں یحییٰ بن ابی سلیمان عن زید بن ابی العتاب وابن المقبری عن ابی ہریرہ کی سند سے موجود ہے۔ امام ابن خزیمہ فرماتے ہیں:

" في القلب من هذا الإسناد فإني كنت لا أعرف يحي بن أبي سليمان هذا بعدالة ولا جرح " دل اس سند پر مطمئن نہیں ہے کیونکہ یحییٰ بن سلیمان کو جرح تعدیل کی رُو سے میں نہیں جانتا۔

صحیح ابن خزیمہ کے علاوہ یہ روایت سنن ابی داود (۸۹۳) سنن دارقطنی، سنن بیہقی اور مستدرک الحاکم (ج ۱ ص ۲۱۶، ۲۷۳، ۲۷۴ وصححہ ووافقہ الذہبی وخالفہ مرۃ أخریٰ) میں بھی یحییٰ بن ابی سلیمان کی سند سے موجود ہے۔

راقم الحروف نے سنن ابی داود کے حاشیہ "نیل المقصود فی التعلیق علیٰ سنن ابی داود ج ۱ ص ۲۸۸ قلمی) میں یہ ثابت کیا ہے کہ یحییٰ مذکور جمہور محدثین کے نزدیک ضعیف ہے۔

امام بخاری نے اسے "منکر الحدیث" کہا ہے۔

(جزء القراءت للبخاری: ۲۳۹، نصر الباری ص ۲۶۱، ۲۶۲ ح ۲۳۹)

جو کہ (امام بخاری کے نزدیک) شدید جرح ہے۔ یحییٰ بن ابی سلیمان کی حدیث کے جتنے شواہد ہیں سب بلحاظ سند ضعیف ہیں۔ شیخ ناصر الدین البانی نے ''مسائل احمد واسحاق'' لاسحاق بن منصور المروزی نامی کتاب سے ایک شاہد ذکر کر کے اسے ''وھذا إسناد صحیح ثقات رجال الشیخین'' قرار دیا ہے۔

حالانکہ اس سند میں بشرطِ صحتِ کتاب ابن مغفل المزنی کا تعین محل نظر ہے۔ تہذیب الکمال، تہذیب التہذیب وغیرہما میں عبداللہ بن مغفل المزنی الصحابی کے حالات میں عبدالعزیز بن رفیع کا بطور شاگرد تذکرہ نہیں ہے بلکہ شداد بن مغفل (الکوفی الاسدی) کے شاگردوں میں عبدالعزیز اور عبدالعزیز کے استادوں میں شداد کا ذکر ملتا ہے۔

عین ممکن ہے کہ اصل مخطوطہ میں ''ابن معقل'' غیر منقوط ہو جسے شیخ صاحب نے ابن مغفل سمجھ لیا ہے حالانکہ اسے ابن معقل بھی پڑھا جا سکتا ہے لہٰذا ضرورت یہ ہے کہ اس کتاب کے قلمی نسخوں کو دیکھا جائے تاکہ ابن مغفل کا تعین ہو سکے۔ ابن معقل کے تعین کی صورت میں یہ روایت مرسل ہونے کی وجہ سے ضعیف ہو جاتی ہے۔

۳: وتر پانچ، تین، ایک وغیرہ پڑھنا صحیح و جائز ہے۔ تین رکعت وتر پڑھنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ دو رکعتیں پڑھ کر سلام پھیر دیا جائے اور ایک رکعت علیحدہ پڑھی جائے۔ اس کے بہت سے دلائل ہیں۔

مثلاً دیکھئے صحیح مسلم (ج ۱ ص ۲۵۴ ح ۷۳۸، ۷۴۵، ۷۵۱) صحیح ابن حبان (ج ۴ ص ۷۰ ح ۲۴۲۶) مسند احمد (ج ۲ ص ۷۶) المعجم الاوسط للطبرانی (ج ۱ ص ۲۲۴ ح ۷۵۷)

تین رکعتیں ایک سلام سے پڑھنے والی مرفوع روایت (السنن الکبریٰ للبیہقی ۳/ ۲۸، حاکم ۱/ ۳۰۴) قتادہ کے عنعنہ کی وجہ سے ضعیف ہے۔ قتادہ ثقہ امام اور مشہور مدلس ہیں۔

دیکھئے تقریب التہذیب (۵۵۱۸)

۴: تکبیرات عیدین میں ہاتھ باندھنا ہی راجح ہے۔ حالتِ قیام قبل از رکوع میں ہاتھ باندھنے پر اتفاق ہے۔ جناب محمد قاسم خواجہ صاحب لکھتے ہیں: ''بعض لوگ تکبیراتِ عید کے

درمیان ہاتھ کھلے چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے چونکہ یہ حالتِ قیام ہے اس لئے بارگاہ ایزدی میں دست بستہ ہی کھڑا ہونا چاہیے۔" (حی علی الصلوٰۃ ص ۱۵۳، ۱۵۴)

۵: میرے علم میں یہ عمل ثابت نہیں ہے۔ واللہ اعلم

۶: یہ مسئلہ اجتہادی ہے۔ دعا مانگنا ثابت ہے لیکن مقتدیوں کا امام کے ساتھ ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا ثابت نہیں لہٰذا بہتر یہی ہے کہ ہاتھ بلند کر کے اجتماعی دعا نہ مانگی جائے۔

۷: اس کا کوئی ثبوت میرے علم میں نہیں۔ تقبل اللّٰہ منا و منك والی دعا صحابہ کرام سے منقول ہے۔ اسے حافظ ابن حجر نے حسن اور احمد بن حنبل نے جید کہا ہے۔

(فتح الباری ج ۲ ص ۴۴۶، الجوہر النقی ج ۳ ص ۳۲۰)

مجھے ان آثار کی سند نہیں ملی۔ واللہ اعلم

علی بن ثابت الجزری سے روایت ہے کہ میں نے (امام) مالک بن انس (رحمہ اللہ) سے پوچھا: لوگ عید کے دن تقبل اللّٰہ منا و منك کہتے ہیں؟ تو انھوں نے فرمایا: "ما زال ذلك الأمر عندنا ، ما نری به بأسًا" ہمارے ہاں اسی پر مسلسل عمل ہے، ہمارے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (کتاب الثقات لابن حبان ۹/ ۹۰ وسندہ حسن)

۸: حافظ ابن حجر ان تکبیرات کے بارے میں لکھتے ہیں: "رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں کوئی حدیث ثابت نہیں۔ صحابہ کرام سے جو صحیح ترین روایت مروی ہے وہ علی رضی اللہ عنہ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول (وفعل) سے مروی ہے۔" (ملخصاً فتح الباری ج ۲ ص ۴۶۲)

علی رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ آپ عرفات کے دن (۹/ ذوالحجہ) صبح کی نماز کے بعد تکبیریں شروع کرتے اور آخری یوم تشریق (۱۳/ ذوالحجہ) کی عصر تک پڑھتے تھے، اُس دن مغرب کے بعد نہیں پڑھتے تھے۔ دیکھئے السنن الکبریٰ للبیہقی (ج ۳ ص ۳۱۴ وسندہ صحیح) وصححہ الحاکم والذہبی (ج ۱ ص ۲۹۹، المستدرک)

۹: عید اگر جمعہ کے دن ہو تو نماز عید پڑھنے کے بعد، اس دن جمعہ کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے لہٰذا اختیار ہے کہ نماز جمعہ پڑھیں یا نماز ظہر لیکن نبوی عمل کی روشنی میں اس دن نماز جمعہ

پڑھنا افضل ہے۔ سنن ابی داود (ح ۱۰۷۰) کی روایت میں آیا ہے کہ صلی العید ثم رخص فی الجمعة فقال: ((من شاء أن یصلی فلیصل)) آپ نے نماز عید پڑھی پھر نماز جمعہ میں رخصت دے دی اور فرمایا: جو شخص نماز جمعہ پڑھنا چاہے پڑھ لے۔

اس کی سند حسن ہے، اسے ابن خزیمہ (۱۴۶۴) حاکم اور ذہبی (المستدرک ج ۱ ص ۲۸۸) نے صحیح کہا ہے۔ ایاس بن ابی رملہ جمہور کے نزدیک ثقہ وصدوق اور حسن الحدیث راوی ہیں۔ احکام العیدین للفریابی (ص ۲۱۱ تا ۲۱۸) میں اس کے بہت سے شواہد موجود ہیں۔

۱۰: یہ رکعتیں اور دیگر سنن ونوافل دو دو کر کے پڑھی جائیں کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ ((صلوٰة اللیل والنھار مثنی مثنی)) رات اور دن کی (نفل) نماز دو دو رکعت ہے۔

(سنن ابی داود: ۱۲۹۵، وسندہ حسن)

اسے ابن خزیمہ (۱۲۱۰) اور ابن حبان (الموارد: ۶۳۶) نے صحیح قرار دیا ہے۔

علوم الحدیث للحاکم (ص ۵۸) میں حسن شاہد اور السنن الکبریٰ للبیہقی (ج ۲ ص ۴۸۷) میں اس کا صحیح موقوف شاہد ہے۔

علی بن عبداللہ البارقی جمہور محدثین کے نزدیک موثق ہیں لہٰذا حسن الحدیث راوی ہیں اور اس کا تفرد چنداں مضر نہیں ہے۔

۱۱: دو دو کر کے پڑھی جائیں۔ دیکھئے نمبر ۱۰

۱۲: طلوع آفتاب، زوال اور غروب آفتاب کو ملحوظ رکھتے ہوئے سجدۂ تلاوت کرنا بہتر ہے۔ سجدۂ تلاوت سنت ہے، واجب یا فرض نہیں ہے۔ اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں آیا ہے کہ نبی ﷺ نے سورۃ النجم سنی اور سجدہ نہیں کیا۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۴۶ ح ۱۰۷۲، صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۱۵ ح ۵۷۷)

مزید تفصیل کے لئے دیکھئے ماہنامہ شہادت (ج ۶ شمارہ ۵ مئی ۱۹۹۹ء، سوال وجواب، قرآن وسنت کی روشنی میں ص ۲۹) کا مطالعہ کریں۔ سجدۂ تلاوت بعد میں کرنا بھی جائز ہے۔

واللہ اعلم

۱۳: اٹھ کر جا سکتا ہے کیونکہ گزرنے اور اٹھنے میں فرق ہے۔ واللہ اعلم

۱۴: امام کا سترہ مقتدی کا سترہ شمار ہوگا، کی رُو سے اگر امام نماز پڑھا رہا ہو تو گزر سکتا ہے ورنہ نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ دروازے کے پاس یا باہر صف بنالیں تا کہ نمازی کے آگے سے نہ گزرنا پڑے۔

۱۵: جس طرح عام چارپائی پر انسان لیٹتا ہے اسی طرح میت کو کفن کے بعد لٹایا جائے پھر اسے اس طرح جنازہ گاہ اور قبر کی طرف لے جایا جائے کہ اس کا سر آگے ہو۔ امام بیہقی نے روایت کیا ہے کہ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا جنازہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ چارپائی کے اگلے دونوں پاؤں کی طرف سے کندھے پر رکھ کر لے گئے۔ (السنن الکبریٰ للبیہقی ۲۰/۴ وسندہ صحیح)

۱۶: قبر پر مذکورہ سورتوں یا باقی قرآن کا پڑھنا صحیح سند سے ثابت نہیں ہے۔ صحیح مسلم (۷۸۰) کی ایک حدیث سے متعدد علماء نے یہ استدلال کیا ہے کہ قبرستان میں قرآن پڑھنا مکروہ ہے۔ امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ سے اس کی کراہت منقول ہے۔ دیکھئے اقتضاء الصراط المستقیم (ص ۳۸۰) مسائل ابی داود (ص ۱۵۸)

عبدالرحمٰن بن العلاء بن جلاج کی جس روایت میں آیا ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے وصیت کی تھی کہ ان کی قبر پر دفن کے بعد سورۃ البقرہ کا شروع اور آخری حصہ تلاوت کیا جائے (کتاب الروح ص ۱۷) بلحاظ سند ضعیف ہے۔ اس کا راوی عبدالرحمٰن مجہول الحال ہے، اسے ابن حبان کے علاوہ کسی نے بھی ثقہ نہیں کہا۔ اس کے دوسرے راوی الحسن بن احمد الوراق اور علی بن موسیٰ الحداد بھی مجہول الحال اور غیر معروف ہیں۔

البتہ قبرستان میں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا صحیح ہے۔

دیکھئے صحیح مسلم (ح ۹۷۴، کتاب الجنائز باب مایقال عند دخول القبور والدعاء لأھلھا)

۱۷: مسنون یہی ہے کہ آخری عشرہ میں اعتکاف بیٹھے اگر کسی مجبوری کی وجہ سے لیٹ ہو جائے تو اعتکاف صحیح ہے لیکن مسنون اعتکاف کے ثواب سے محروم ہو جائے گا۔ واللہ اعلم

۱۸: بیسویں روزے کی شام کو مسجد میں داخل ہونا چاہئے اور پھر نماز فجر کے بعد اعتکاف

والے حجرہ میں بیٹھنا چاہئے۔ "کان رسول اللّٰہ ﷺ إذا أراد أن یعتکف صلی الفجر ثم دخل معتکفه" نبی ﷺ جب اعتکاف کا ارادہ کرتے تو صبح کی نماز پڑھ کر جائے اعتکاف میں داخل ہوجاتے۔ دیکھئے صحیح مسلم (۱۱۷۳، دارالسلام: ۲۷۸۵)

۱۹: اس کے ناجائز ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے لیکن بہتر یہی ہے کہ جائے اعتکاف میں یہ امور انجام دے۔

۲۰: معتکف کے لئے جائز ہے کہ جب چاہے غسل کرے۔ شریعت میں اس کی ممانعت منقول نہیں ہے تاہم اسے مسجد میں موجود غسل خانہ میں ہی غسل کرنا چاہئے۔ اس کا احاطۂ مسجد سے شرعی عذر کے بغیر نکلنا صحیح نہیں ہے۔

۲۱: میرے علم میں ان دو رکعتوں کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ واللہ اعلم

۲۲: مسنون یہی ہے کہ عقیقہ میں بکری (بکرا) اور بھیڑ (نر یا مادہ) ذبح کئے جائیں۔ گائے یا اونٹ وغیرہ کا عقیقہ میں ذبح کرنا ثابت نہیں ہے چہ جائیکہ اسے حصوں میں تقسیم کیا جائے جس روایت میں ہے کہ ((فلیعق عنه من الإبل أو البقر أو الغنم)) یعنی اس کی طرف سے اونٹ، گائے اور بکریاں، عقیقہ میں ذبح کی جاسکتی ہیں۔ (المعجم الصغیر للطبرانی ۸۴/۱) اس کی سند مسعدہ بن الیسع وغیرہ کی وجہ سے موضوع و باطل ہے۔

ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ عبدالرحمٰن بن ابی بکر کے بچے کی طرف سے ایک اونٹ بطور عقیقہ ذبح کریں تو انھوں نے فرمایا: "معاذ اللّٰہ! ولکن ما قال رسول اللّٰہ ﷺ: شاتان مکافاتان" یعنی میں (اس بات سے) اللہ کی پناہ چاہتی ہوں لیکن (میں وہ کروں گی) جو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ دو بکریاں کافی ہیں۔

(السنن الکبریٰ للبیہقی ج۹ ص۳۰۱ وسندہ حسن، تحفۃ الاخیار ۴۲۸/۶ ح ۲۵۱۶ وسندہ حسن، مشکل الآثار للطحاوی ۶۸/۳ ح ۱۰۴۲، وسندہ حسن، الکامل لابن عدی ۱۹۶۲/۵، دوسرا نسخہ ۱۵/۷)

اس روایت سے کئی مسائل ثابت ہوتے ہیں مثلاً:

(الف) گائے اور اونٹ وغیرہ کو بطورِ عقیقہ ذبح کرنا جائز نہیں ہے۔

(ب) قرآن وحدیث کو تمام آراء وفتاویٰ پر ہمیشہ ترجیح حاصل ہے۔ بلکہ ہر وہ رائے اور فتویٰ جو قرآن وحدیث کے خلاف ہے مردود ہے۔

(ج) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی عظیم فضیلت اس سے ثابت ہے کیونکہ آپ اتباع سنت میں بہت سختی کرنے والی تھیں۔

۲۳: بغیر شرعی عذر کے ایک علاقے کے لوگ دوسرے علاقے میں زکوٰۃ نہ بھیجیں۔

((تؤ خذمن أغنياء هم و ترد علىٰ فقرائهم)) ان کے امیروں سے لے کر ان کے غریبوں کو زکوٰۃ دی جاتی ہے۔ (صحیح بخاری:۱۳۹۵، صحیح مسلم:۱۹)

دوسرے ملکوں میں قربانی بھیجنے کا ثبوت مجھے معلوم نہیں ہے۔

۲۴: اس کا جواب وہی ہے جو حوالہ سابق ۲۳ میں گزر چکا ہے۔

۲۵: نصِ قرآن (سورۃ النساء:۱۲) کی رُو سے اسے ثمن (۱/۸) ملے گا۔

۲۶: دوسری بیوی جو پہلی بیوی کی سگی بہن ہے۔ پہلی کی زندگی و حالت نکاح کی صورت میں دوسری سے نکاح باطل ہے۔ اگر زوج اور زوجۂ ثانیہ کو حرمت کا علم تھا تو سزا بھی ملے گی۔ دوسری کی اولاد کا وراثت میں کوئی حق نہیں ہے۔ واللہ اعلم

۲۷: زید کی مذکورہ بیوی زانیہ ہے۔ اس کے نکاح کی تجدید تو نہیں ہوگی لیکن اسلام میں اس کی سزا سنگسار کرنا ہے۔ وما علينا إلا البلاغ [شہادت، نومبر ۱۹۹۹ء]

(حجامت) سینگی لگانا

سوال گردن کے پچھلے حصے سے چیر لگا کر (غالباً) یا کسی اور طریقے سے خون نکالنا جسے شاید عربی میں (حجامۃ) کہتے ہیں۔ یہاں پر کچھ عرب حضرات کرتے ہیں اور ایک دوست نے بھی کہا ہے۔ کیا یہ سنت ہے یا علاج کے لئے صحابہ نے کیا تھا یا کوئی اور وجہ تھی؟

(محمد عادل شاہ، برطانیہ)

الجواب حجامت کو اردو میں سینگی لگانا یا پچھنے لگانا کہتے ہیں، اس طریقے سے کچھ خون نکال کر علاج کیا جاتا ہے۔ یہ عمل جائز بلکہ سنت ہے۔

مثلاً دیکھئے صحیح بخاری (۱۹۳۸۔۱۹۴۰) اور صحیح مسلم (۱۲۰۲، دارالسلام: ۲۸۸۵)
یہ عمل رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام سے ثابت ہے۔

امارتِ سفر کا حکم اور کاغذی تنظیمیں

سوال کیا سفر میں امیر بنانا جائز ہے؟ (خورشید احمد قصوری)

الجواب سفر میں امارت کے بارے میں پانچ مرفوع احادیث مروی ہیں جن میں سے ایک بھی صحیح ثابت نہیں ہے، ان روایات کی تفصیل درج ذیل ہے:

① عن عبداللہ بن عمرو بن العاص رضي اللہ عنه

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے فرمایا: حدثنا حسن: حدثنا ابن لهيعة: حدثنا عبداللہ ابن هبيرة عن أبي سالم الجيشاني عن عبداللہ بن عمرو أن رسول اللہ ﷺ قال:

((.... ولا يحل لثلاثة نفر يكونون بأرض فلاة إلا أمّروا عليهم أحدهم)) إلخ

(سیدنا) عبداللہ بن عمرو بن العاص (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تین آدمیوں کے لئے جو ویرانے بیابان میں رہتے ہیں، حلال نہیں ہے مگر یہ کہ وہ آپس میں سے ایک کو امیر بنا دیں یعنی امیر کے بغیر ان کے لئے رہنا حلال نہیں ہے۔

(مسند احمد ۲/۱۷۷ ح ۶۶۴۷)

اس روایت کی سند ابن لہیعہ کے اختلاط کی وجہ سے ضعیف ہے۔ ابن لہیعہ کے بارے میں تحقیق یہ ہے کہ وہ آخری عمر میں اختلاط کا شکار ہو گئے تھے لہٰذا اختلاط کے بعد ان کی ساری روایات (تفرد کی صورت میں) ضعیف ہیں، چاہے انھوں نے سماع کی تصریح کی ہو یا نہ کی ہو۔

اختلاط سے پہلے وہ حسن الحدیث تھے لہٰذا ان کی اختلاط سے پہلے والی روایت حسن ہوتی ہے بشرطیکہ سماع کی تصریح کریں کیونکہ ان کا تدلیس کرنا بھی ثابت ہے۔

درج ذیل شاگردوں نے اُن سے اختلاط سے پہلے سنا ہے:

عبداللہ بن المبارک، عبداللہ بن یزید المقرئ، عبداللہ بن وہب، عبداللہ بن مسلمہ القعنبی،

یحییٰ بن اسحاق السیلحینی ، ولید بن مزید، عبدالرحمٰن بن مہدی، اسحاق بن عیسیٰ، سفیان ثوری، شعبہ، اوزاعی، عمرو بن الحارث المصری، لیث بن سعد اور بشر بن بکر۔

دیکھئے میری کتاب الفتح المبین فی تحقیق طبقات المدلسین (ص ۷۷، ۷۸)

روایتِ مذکورہ بالا میں ابن لہیعہ سے راوی الحسن بن موسیٰ الاشیب ہیں جن کا سماع قبل از اختلاط معلوم نہیں ہے لہٰذا یہ سند ضعیف ہے۔

شیخ محمد ناصر الدین الالبانی رحمہ اللہ نے بھی اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔

دیکھئے السلسلۃ الضعیفۃ (حدیث: ۵۸۹)

② عن عمر بن الخطاب رضي الله عنه

عمار بن خالد الواسطی نے کہا: ''ثنا القاسم بن مالك المزني عن الأعمش عن زيد ابن وهب قال قال عمر :إذا كان نفر ثلاث فليؤمّروا أحدهم ، ذاك أمير أمره رسول الله ﷺ''

(سیدنا) عمر (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: اگر تین آدمی ہوں تو ایک کو امیر بنالیں، یہ وہ امیر ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے مقرر کیا ہے۔ (صحیح ابن خزیمہ ۴/۱۴۱ ح ۲۵۴۱، البحر الزخار للبزار ۱/۴۶۲ ح ۳۲۹، کشف الاستار ۲/۲۶۶، ۲۶۷ ح ۱۶۷۲، المستدرک للحاکم ۱/۴۴۳ ح ۱۶۳۲، وصححہ علیٰ شرط الشیخین ووافقہ الذہبی)

یہ روایت مجمع الزوائد (۵/۲۵۵) اور کتاب العلل للدارقطنی (۲/۱۵۱، سوال: ۱۷۶) میں بھی مذکور ہے۔

اس روایت کی سند میں سلیمان بن مہران الاعمش مشہور مدلس ہیں۔ (دیکھئے الفتح المبین ص ۴۳)

اور یہ روایت عن سے ہے لہٰذا یہ سند ضعیف ہے۔

مدلس راوی کے بارے میں تین باتیں ہمیشہ مدِ نظر رکھیں:

اول: اگر مدلس راوی ثقہ وصدوق ہو تو اس کی تصریح بالسماع والی روایت صحیح یا حسن ہوتی ہے۔

دوم: صحیح بخاری وصحیح مسلم میں مدلس راوی کی ہر روایت صحیح ہوتی ہے کیونکہ صحیحین کو تلقی

بالقبول حاصل ہے اور مدلسین کی روایات سماع اور متابعات پر محمول ہیں۔

سوم: اگر مدلس راوی سماع کی تصریح نہ کرے بلکہ عن وغیرہ سے روایت کرے تو اس کی روایت غیر صحیحین میں ضعیف ہوتی ہے۔

③ عن أبي سعيد الخدري رضي الله عنه

حاتم بن اسماعیل نے کہا: ''حدثنا محمد بن عجلان عن نافع عن أبي سلمة عن أبي سعيد الخدري أن رسول الله ﷺ قال: ((إذا خرج ثلاثة في سفر فليؤمّروا أحدهم))

(سیدنا) ابوسعید الخدری (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تین آدمی سفر کے لئے نکلیں تو ایک کو امیر بنالیں۔

(سنن ابی داود: ۲۶۰۸، مسند ابی یعلی ۳۱۹/۲ ح ۱۰۵۴، ۵۱۱/۲ ح ۱۳۵۹، السنن الکبریٰ للبیہقی ۲۵۷/۵)

یہ روایت السلسلۃ الصحیحہ (۳۱۴/۳ ح ۱۳۲۲) میں بھی مذکور ہے۔

اس روایت کی سند میں محمد بن عجلان مدلس ہیں۔

(طبقات المدلسین للحافظ ابن حجر/ المرتبۃ الثالثہ ۳/۹۸، الفتح المبین ص ۶۰)

طحاوی نے بھی انھیں مدلس قرار دیا ہے۔ (دیکھئے مشکل الآثار ۱/۱۰۱، طبع قدیم طبع جدید ۲۲۳/۱ ح ۲۶۱)

چونکہ یہ روایت عن سے ہے لہٰذا یہ سند ضعیف ہے۔

④ عن أبي هريرة رضي الله عنه

حاتم بن اسماعیل نے کہا: ''حدثنا محمد بن عجلان عن نافع عن أبي سلمة عن أبي هريرة أن رسول الله ﷺ قال: ((إذا كان ثلاثة في سفر فليؤمّروا أحدهم .)) (سیدنا) ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر سفر میں تین آدمی ہوں تو ایک کو امیر بنالیں۔ (سنن ابی داود: ۲۶۰۹، السنن الکبریٰ للبیہقی ۲۵۷/۵)

اس روایت کی سند محمد بن عجلان مدلس کی تدلیس کی وجہ سے ضعیف ہے۔

دوسری سند: محدث بزار کہتے ہیں:

''حدثنا محمد بن جميل القطان الجنديسابوري :ثنا عبدالله بن رشيد :ثنا محمد بن الزبرقان :ثنا ثور بن يزيد عن مهاصر بن حبيب عن أبي سلمة عن أبي هريرة قال قال رسول الله ﷺ :((إذا سافر ثم فليؤ مكم أقرؤ كم و إن كان أصغركم و إذا أمكم فهو أميركم .)) جب تم سفر کرو تو تمھارا سب سے بڑا قاری تمھیں نماز پڑھائے اگرچہ وہ سب سے چھوٹا ہو، جب وہ تمھارا امام بن جائے تو وہی تمھارا امیر ہے۔ (کشف الاستار للبزار ۲/۲۶۶ ح ۱۶۷۲)

اس روایت میں محمد بن جمیل جندیساپوری مجہول الحال راوی ہے جس کے حالات نہیں ملے۔ یہ وہ محمد بن جمیل نہیں ہے جسے ابن حبان نے کتاب الثقات (۹/۹۷) میں ذکر کیا ہے، باقی سند حسن ہے۔ اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد ہیثمی نے لکھا ہے:

''وفيه من لم أعرفه ''اس میں ایسا راوی ہے جسے میں نہیں جانتا۔ (مجمع الزوائد ۵/۲۵۵)

مجہول الحال راوی کی روایت ضعیف ہوتی ہے لہٰذا یہ روایت بھی ضعیف ہے۔

⑤ عن عبدالله بن عمر رضي الله عنه

بزار نے کہا: ''حدثنا إبراهيم بن المستمر :ثنا عبيس بن مرحوم :ثنا حاتم بن إسماعيل عن ابن عجلان عن نافع عن ابن عمر أن النبي ﷺ قال :

((... وإذا كانوا ثلاثة في سفر فليؤمّروا أحدهم .))

(سیدنا) ابن عمر (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جب سفر میں تین آدمی ہوں تو ایک کو امیر بنالیں۔ (کشف الاستار ۲/۲۶۷ ح ۱۶۷۳)

یہ روایت محمد بن عجلان کی تدلیس کی وجہ سے ضعیف ہے۔

خلاصۃ التحقیق: سفر میں امیر بنانے والی تمام مرفوع روایات ضعیف یعنی مردود ہیں لہٰذا امارتِ سفر کو واجب یا بہتر قرار دینا غلط ہے۔

بعض لوگ ضعیف + ضعیف کرتے ہوئے ضعیف و مردود روایات کو جمع تفریق کے حساب سے حسن لغیرہ بنالیتے ہیں بشرطیکہ یہ عمل اُن کی خواہشات کے مطابق ہو ورنہ اگر ایسی

روایت اُن کی مرضی کے خلاف ہو تو اللہ کی مخلوق میں سب سے زیادہ حسن لغیرہ کو ترک کرنے والے یہی لوگ ہوتے ہیں۔ صحیح تحقیق یہ ہے کہ ضعیف روایت ضعیف ہی رہتی ہے چاہے اس کی بہت سی سندیں ہوں اور صحیح روایت صحیح ہی ہوتی ہے چاہے اس کی صرف ایک ہی سند ہو۔ حسن لغیرہ کو حجت سمجھنے والے اپنے مخالفین کی ایسی بہت سی روایتوں کو رد کر دیتے ہیں جو اُن لوگوں کے اپنے اصول پر بھی حسن لغیرہ ہی بنتی ہیں۔!!

موقوف روایت: علی بن الجعد فرماتے ہیں: " أنا شعبة عن أبي إسحاق عن أبي الأحوص عن عبداللّٰه قال: إذا كنتم ثلاثة في سفر فأمروا أحدكم ....))

(سیدنا) عبداللہ (بن مسعود رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: اگر تم سفر میں تین آدمی ہو تو ایک کو امیر بنا لیا کرو۔ (مسند علی بن الجعد ۱/۳۷۲ ح ۴۴۳ وسندہ صحیح، دوسرا نسخہ: ۴۳۰)

اس روایت کی سند صحیح ہے۔ اسے طبرانی نے عمرو بن مرزوق: "أنا شعبة إلخ " کی سند سے بیان کیا ہے۔ (دیکھئے المعجم الکبیر ۹/۲۰۸ ح ۸۹۱۵)

جلیل القدر صحابی کے اس فتوے سے معلوم ہوا کہ سفر میں امیر بنانا جائز ہے۔

تنبیہ: سفر میں امارت کے جواز پر قیاس کر کے کاغذی تنظیمیں بنانا اور اپنی اپنی تنظیم یا پارٹی کا امیر بن کر بیٹھ جانا اور پھر یہ دعویٰ کرنا کہ جس نے ہمارے امام یا امیر کی بیعت نہ کی تو وہ جاہلیت کی موت مر جائے گا، بہت بڑا دھوکا اور فراڈ ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ تمام مسلمانوں کو کاغذی و نام نہاد تنظیموں، پارٹیوں اور کاغذی امیروں سے محفوظ رکھے جو خلافت اور امارتِ کبریٰ والی روایات و دلائل کو اپنے آپ پر فٹ کر دیتے ہیں۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: تجھے کیا پتا ہے کہ امام کسے کہتے ہیں؟ جس پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہو جائے، ہر آدمی یہی کہے کہ یہ امام (خلیفہ) ہے۔

(سوالات ابن ہانی: ۲۰۱۱، الحدیث: ۲۶ ص ۲۹، علمی مقالات ج ۱ ص ۴۰۳) [۱۰/ جولائی ۲۰۰۸ء]

[الحدیث: ۵۳]

گھر والوں کو السلام علیکم کہنا

سوال کیا گھر میں داخل ہونے والا اپنے اہلِ خانہ مثلاً ماں، بہن، بیٹی اور بیوی وغیرہا کو السلام علیکم کہہ سکتا ہے یا نہیں؟ دلیل سے جواب دیں۔

(حاجی نذیر خان، داماں حضرو)

الجواب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَإِذَا دَخَلْتُم بُيُوتًا فَسَلِّمُوا عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُبَارَكَةً طَيِّبَةً ۚ﴾ جب تم گھروں میں داخل ہو تو اپنوں کو سلام کرو، وہ تحفہ جو اللہ کی طرف سے برکتوں والا پاک ہے۔ (النور:٦١)

سیدنا جابر بن عبداللہ الانصاری رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''إذا دخلت على أهلك فسلّم عليهم تحية من عند الله مباركة طيبة'' جب تو اپنے گھر والوں کے پاس داخل ہو تو انھیں سلام کہہ، ایسا تحفہ جو اللہ کی طرف سے برکت والا پاک ہے۔

(الادب المفرد للبخاری:١٠٩٥ وسندہ صحیح)

اس آیت اور فتویٰ صحابی سے معلوم ہوا کہ گھر میں داخل ہوتے وقت گھر والوں مثلاً ماں، بیٹی، بہن، بیوی اور بھائی وغیرہ کو السلام علیکم کہنا چاہئے۔ اس میں بڑی برکت اور ثواب ہے۔ والحمد للہ

قربانی کا جانور خریدنے کے بعد نقص/ اجماع اور اجتہاد

سوال اگر کوئی شخص قربانی کے لئے جانور خریدے، جانور خریدنے کے بعد اُس کے اندر عیب پیدا ہو جائے مثلاً اس کی ٹانگ ٹوٹ جائے یا کانا ہو جائے تو ایسی صورت میں کیا کرنا چاہئے جانور نیا خریدنا چاہئے یا وہی جانور قربان کر دیا جائے۔ قرآن و حدیث، آثارِ صحابہ اور اجماعِ اُمت کی روشنی میں جواب ارشاد فرمائیں اور یہ بھی وضاحت فرمائیں کہ کیا اہلحدیث اجماعِ اُمت اور اجتہاد شرعی کے قائل ہیں۔ اجماع و اجتہاد کا حجت ہونا کس دلیل سے ثابت ہے؟ جواب مفصل تحریر فرمائیں۔ (خرم ارشاد محمدی گجرات)

الجواب یہ بات بالکل صحیح ہے کہ کانے یا لنگڑے جانور کی قربانی جائز نہیں ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ((أربع لا تجوز في الأضاحي: العوراء بين عورها، والمريضة بين مرضها والعرجاء بين عرجها والكسير التي لا تنقى.)) چار جانوروں کی قربانی جائز نہیں ہے: واضح طور پر کانا، واضح طور پر بیمار، صاف طور پر لنگڑا اور اتنا کمزور جانور کہ اس کی ہڈیوں میں گودا نہ ہو۔

(سنن ابی داود: ۲۸۰۲ وسندہ صحیح، وصححہ الترمذی: ۱۴۹۷ وابن خزیمہ: ۲۹۱۲ وابن حبان: ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، وابن الجارود: ۴۸۱، ۹۰۷ والحاکم ۱/۴۶۷، ۴۶۸ ووافقہ الذہبی)

یہ اس حالت میں ہے جب قربانی کے لئے جانور خریدا جائے۔

اگر ان عیوب سے صاف ستھرا جانور برائے قربانی خریدا گیا ہو اور بعد میں اس میں کوئی عیب پیدا ہو جائے تو اس کے بارے میں سیدنا عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''إن كان أصابها بعد ما اشتريتموها فأمضوها و إن كان أصابها قبل أن تشتروها فابدلوها'' اگر یہ نقص وعیب تمھارے خریدنے کے بعد واقع ہوا ہے تو اس کی قربانی کرلو اور اگر یہ نقص وعیب تمھارے خریدنے سے پہلے واقع ہوا تھا تو اس جانور کو بدل لو یعنی دوسرے جانور کی قربانی کرو۔ (السنن الکبریٰ للبیہقی ج۹ ص۲۸۹ وسندہ صحیح)

اہلِ سنت کے مشہور ثقہ امام اور جلیل القدر تابعی امام ابن شہاب الزہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''إذا اشترى الرجل أضحية فمرضت عنده أو عرض لها مرض فهي جائزة'' اگر کوئی شخص قربانی کا جانور خریدے پھر وہ اس کے پاس بیمار ہو جائے تو اس جانور کی قربانی جائز ہے۔ (مصنف عبدالرزاق ۴/۳۸۶ ح ۸۱۶۱ وسندہ صحیح، دوسرا نسخہ: ۸۱۹۲)

خلاصہ یہ کہ صورتِ مسئولہ میں قربانی والے جانور کی قربانی جائز ہے۔

الحمدللہ اہلِ حدیث اجماعِ امت کے حجت ہونے اور اجتہادِ شرعی کے جائز ہونے کے قائل ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ((لا يجمع الله أمتي على ضلالة أبدًا ويد الله على الجماعة)) اللہ میری اُمت کو کبھی گمراہی پر جمع نہیں کرے گا اور اللہ کا ہاتھ جماعت

(یعنی اجماع) پر ہے۔ (المستدرک للحاکم ج ۱ ص ۱۱۶ ح ۳۹۹ وسندہ صحیح)

اس حدیث سے حاکم نیشاپوری نے اجماع کے حجت ہونے پر استدلال کیا ہے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے قاضی شریح رحمہ اللہ کی طرف لکھ کر بھیجا تھا: اگر کتاب اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں بھی نہ ملے تو دیکھنا کہ کس بات پر لوگوں کا اجماع ہے پھر اسے لے لینا۔

(مصنف ابن ابی شیبہ ج ۷ ص ۲۴۰ ح ۲۲۹۸۰ وسندہ صحیح، المختارۃ للضیاء المقدسی ۱/ ۲۳۸ ح ۱۳۴، سنن الدارمی: ۱۶۹، ماہنامہ الحدیث حضرو: ۴۷ ص ۴۸)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ما رأی المسلمون حسنًا فهو عند الله حسن وما رآه المسلمون سيئًا فهو عند الله سيئ .... '' تمام مسلمان جسے اچھا سمجھیں تو وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہے اور جسے تمام مسلمان بُرا سمجھیں تو وہ اللہ کے نزدیک بھی بُرا ہے۔ (المستدرک للحاکم ۳/ ۷۸ ح ۴۴۶۵ وسندہ حسن وصححہ الحاکم ووافقہ الذہبی)

سیدنا ابو مسعود عقبہ بن عمرو الانصاری رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''أوصيك بتقوى الله ولزوم الجماعة فإن الله لم يكن ليجمع أمة محمد صلى الله عليه وسلم على ضلالة '' میں تجھے اللہ کے تقویٰ اور جماعت (اجماع) کے لازم پکڑنے کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو کبھی گمراہی پر جمع نہیں کرے گا۔ (الفقیہ والمتفقہ للخطیب ۱/ ۱۶۷، وسندہ صحیح)

امام محمد بن ادریس الشافعی رحمہ اللہ نے اپنی مشہور کتاب الرسالہ میں حجیتِ اجماع پر دلائل ذکر کیے ہیں۔ دیکھئے ص ۴۷۱۔۴۷۶ فقرہ: ۱۳۰۹ تا ۱۳۲۰

حافظ ابن حزم اندلسی اپنے غرائب وشذوذ کے باوجود اعلان فرماتے ہیں:

'' أن الإجماع من علماء أهل الإسلام حجة و حق مقطوع به في دين الله عزوجل '' علمائے اہلِ اسلام کا اجماع حجت اور اللہ کے دین میں قطعی حق ہے۔

(الاحکام فی اصول الاحکام جلد اول حصہ چہارم ص ۵۲۵)

امام بخاری رحمہ اللہ کے مشہور ثقہ استاذ امام ابوعبید القاسم بن سلام فرماتے ہیں:

''إلا أن يوجد علمه في كتاب أو سنة أو إجماع ''

سوائے یہ کہ اس کا علم کتاب (قرآن) یا سنت (حدیث) یا اجماع میں پایا جائے۔

(کتاب الطہور للامام ابی عبید ص ۱۲۴، قبل ح ۳۳۵)

اس طرح کے بے شمار حوالے کتبِ حدیث وغیرہ میں مذکور ہیں۔ برصغیر کے اہلِ حدیث علماء بھی اجماع کو حجت تسلیم کرتے ہیں مثلاً سید نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ کے شاگرد حافظ عبداللہ غازیپوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''واضح رہے کہ ہمارے مذہب کا اصل الاصول صرف اتباع کتاب وسنت ہے۔''

''اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ اہل حدیث کو اجماع امت وقیاس شرعی سے انکار ہے۔ کیونکہ جب یہ دونوں کتاب وسنت سے ثابت ہیں تو کتاب وسنت کے ماننے میں ان کا ماننا آ گیا''

(ابراء اہل الحدیث والقرآن باب: اہل حدیث کے اصول وعقائد ص ۳۲)

معلوم ہوا کہ اہلِ حدیث کے نزدیک ہر دور میں اُمتِ مسلمہ کا اجماع شرعی حجت ہے۔

اجتہاد کا جواز کئی احادیث سے ثابت ہے مثلاً نبی کریم ﷺ نے صحابۂ کرام کی ایک جماعت کو حکم دیا۔ ((لا يصلين أحد العصر إلا في بني قريظة))

بنو قریظہ کے پاس پہنچنے سے پہلے عصر کی نماز کوئی نہ پڑھے۔

صحابہ کی ایک جماعت نے (اجتہاد کرتے ہوئے) راستے میں نماز پڑھ لی اور دوسرے گروہ نے بنو قریظہ جا کر ہی نماز پڑھی تو نبی کریم ﷺ نے کسی کو بھی بُرا نہیں کہا۔

(صحیح بخاری: ۹۴۶، صحیح مسلم: ۱۷۷۰)

معلوم ہوا کہ نص (واضح دلیل: قرآن، حدیث اور اجماع) نہ ہونے یا نص کے فہم میں اختلاف ہونے کی صورت میں اجتہاد جائز ہے لیکن یہ اجتہاد عارضی اور وقتی ہوتا ہے، اسے دائمی قانون کی حیثیت نہیں دی جاسکتی۔

اجتہاد کی کئی اقسام ہیں مثلاً: ① آثارِ سلف صالحین کو ترجیح دینا

② اولیٰ کو اختیار کرنا ③ قیاس کرنا (نص کے مقابلے میں ہر قیاس مردود ہے۔)

④ مصالح مرسلہ کا خیال رکھنا وغیرہ

بعض اہلِ تقلید دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ ادلۂ اربعہ چار ہیں یعنی قرآن، حدیث، اجماع اور اجتہاد لیکن یہ لوگ صرف اپنے خود ساختہ اور مزعوم امام کا اجتہاد ہی حجت سمجھتے ہیں اور اس کے علاوہ دوسرے تمام اماموں کے اجتہادات کو دیوار پر دے مارتے ہیں۔ مثلاً مدرسۂ دیوبند کے بانی محمد قاسم نانوتوی صاحب نے ایک اہلِ حدیث عالم مولانا محمد حسین بٹالوی رحمہ اللہ سے کہا: ''دوسرے یہ کہ میں مقلد امام ابوحنیفہ کا ہوں، اس لئے میرے مقابلہ میں آپ جو قول بھی بطور معارضہ پیش کریں وہ امام ہی کا ہونا چاہئے۔ یہ بات مجھ پر حجت نہ ہوگی کہ شامی نے یہ لکھا ہے اور صاحب درمختار نے یہ فرمایا ہے، میں ان کا مقلد نہیں۔''

(سوانح قاسمی ج۲ ص۲۲)

محمود حسن دیوبندی صاحب لکھتے ہیں: ''لیکن سوائے امام اور کسیکے قول سے ہم پر حجت قایم کرنا بعید از عقل ہے....'' (ایضاح الادلہ ص ۲۷۶ سطر نمبر ۱۹، ۲۰)

احمد یار خان نعیمی بریلوی صاحب لکھتے ہیں:

''کیونکہ حنفیوں کے دلائل یہ روایتیں نہیں ان کی دلیل صرف قولِ امام ہے۔''

(جاء الحق حصہ دوم ص ۹)

نعیمی صاحب مزید لکھتے ہیں: ''اب ایک فیصلہ کن جواب عرض کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے۔ کہ ہمارے دلائل یہ روایات نہیں۔ ہماری اصل دلیل تو امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے۔ ہم یہ آیات واحادیث مسائل کی تائید کے لئے پیش کرتے ہیں۔ احادیث یا آیات امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کی دلیلیں ہیں۔'' (جاء الحق حصہ دوم ص ۹۱)

اہلِ حدیث کے نزدیک اس طرح کی تنگ نظری اور تقلید باطل ہے بلکہ مسائل اجتہادیہ میں جمہور سلف صالحین کو ترجیح دیتے ہوئے اجتہاد جائز ہے اور جو شخص اجتہاد نہیں کرتا وہ بھی قابلِ ملامت نہیں ہے لیکن ہم تو واضح دلیل نہ ہونے کی صورت میں اجتہاد اور اس کے جواز کے قائل ہیں۔ وما علینا إلا البلاغ (۱۹/ جون ۲۰۰۸ء)

[الحدیث: ۵۲]

میت کی طرف سے قربانی

سوال کیا فوت شدگان کی طرف سے قربانی جائز ہے؟ (ایک سائل)

الجواب سنن ابی داود (کتاب الضحایا باب الاضحیۃ عن المیت ح ۲۷۹۰) اور جامع ترمذی (ابواب الاضاحی باب ماجاء فی الاضحیۃ عن المیت ح ۱۴۹۵) میں شریک بن عبداللہ القاضی عن ابی الحسناء عن الحکم عن حنش کی سند سے مروی ہے کہ میں نے علی رضی اللہ عنہ کو دیکھا، آپ دو مینڈوں کی قربانی کرتے تھے۔ میں نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ تو انھوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے وصیت کی تھی کہ میں آپ کی طرف سے قربانی کروں، اس لئے میں آپ کی طرف سے قربانی کرتا ہوں۔ [انتہی]

اس کی سند ضعیف ہے۔ شریک القاضی مدلس تھے اور یہ روایت عن سے ہے۔

ابوالحسناء مجہول راوی ہے۔ (دیکھئے تقریب التہذیب: ۸۰۵۳، اور آثار السنن ص ۳۹۹ تحت ح ۷۸۴)

حاکم اور ذہبی دونوں کو وہم ہوا ہے۔ انھوں نے اسے الحسن بن الحکم سمجھ کر حدیث کو صحیح کہہ دیا ہے جبکہ ابن الحکم دوسرے راوی تھے اور ابوالحسناء مذکور دوسرا راوی ہے۔

حکم بن عتیبہ بھی مدلس تھے اور (بشرطِ صحت) عن سے روایت کر رہے ہیں۔ امام ترمذی نے اس روایت کو ''غریب'' لکھا ہے۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ حدیثِ مذکور ضعیف ہے تو معلوم ہوا کہ فوت شدگان کی طرف سے قربانی کرنے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اب اگر کوئی شخص ضرور بالضرور قربانی کرنا ہی چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ اسے صدقہ قرار دے کر سارا گوشت مساکین وفقراء میں تقسیم کر دے کیونکہ میت کی طرف سے صدقہ کرنا جائز ہے جس کے بے شمار دلائل ہیں۔ واللہ اعلم

[شہادت، مارچ ۲۰۰۱ء]

عقیقہ اور اس کے بعض مسائل

سوال کیا عقیقہ کرنا سنت ہے؟ کیا امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ عقیقے کو مکروہ کہتے تھے

جیسا کہ مولوی غلام رسول سعیدی بریلوی نے شرح صحیح مسلم جلد نمبر ا صفحہ نمبر ۴۳ تا ۴۵ فرید بک سٹال لاہور میں وضاحت کی ہے۔ کیا عقیقے میں اونٹ یا گائے کے اندر حصہ ڈال کر عقیقہ کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے علاقے میں احناف یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ اونٹ اور گائے میں قربانی کی طرح عقیقے کے بھی سات، پانچ، چار وغیرہ حصے ڈالے جاسکتے ہیں؟

کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔ (خرم ارشاد محمدی)

الجواب

☆ عقیقہ کرنا سنت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((من أحبّ أن ينسك عن ولده فلينسك عنه: عن الغلام شاتان مكافأتان وعن الجارية شاة.))

جو شخص اپنی اولاد کی طرف سے قربانی (عقیقہ) کرنا پسند کرے تو وہ قربانی کر لے: لڑکے کی طرف سے دو برابر بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری۔ (سنن النسائی ۷/۱۶۳ ح ۴۲۱۷ وسندہ حسن، مسند احمد ۲/۱۸۲، ۱۸۳ ح ۶۷۱۳ وسندہ حسن، وصححہ الحاکم ۴/۲۳۸ ح ۷۵۹۲ ووافقہ الذہبی)

اس حدیث میں "پسند کرے" کے الفاظ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عقیقہ کرنا واجب نہیں بلکہ سنتِ مؤکدہ ہے۔ دیکھئے التمہید للحافظ ابن عبدالبر (۴/۳۱۱)

نیز دیکھئے موطأ امام مالک بتحقیقی (روایۃ عبدالرحمٰن بن القاسم: ۱۵۸)

حافظ ابن القیم الجوزیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"فأما أهل الحديث قاطبة وفقهاء هم وجمهور أهل السنة فقالوا: هي من سنة رسول الله ﷺ" تمام اہلِ حدیث، ان کے فقہاء اور جمہور اہلِ سنت کہتے ہیں: یہ (عقیقہ) رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے۔

(تحفۃ الودود باحکام المولود ص ۲۸، الفصل الثالث فی ادلۃ الاستحباب)

امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: عقیقہ واجب نہیں ہے لیکن اس پر عمل مستحب ہے اور ہمارے ہاں (مدینہ میں) لوگوں کا اسی پر عمل جاری رہا ہے۔ (الموطأ روایۃ یحییٰ ۲/۵۰۲ ح ۱۱۰۹)

ابراہیم بن حارث بن خالد التیمی رحمہ اللہ عقیقے کو مستحب سمجھتے تھے اگرچہ ایک چڑیا ہی کیوں نہ

ذبح کردی جائے۔ (الموطأ روایۃ یحییٰ بن یحییٰ ۲/۵۰۱ ح ۱۱۰۷، وسندہ صحیح)

عبداللہ بن عبیداللہ بن ابی ملیکہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ (سیدنا) عبدالرحمٰن بن ابی بکر (رضی اللہ عنہ) کا بیٹا پیدا ہوا تو (ان کی بہن) عائشہ (رضی اللہ عنہا) سے کہا گیا: اے ام المومنین! آپ اس کی طرف سے اونٹ ذبح کریں۔ انھوں نے فرمایا: معاذ اللہ! لیکن (وہ ذبح کریں گے) جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دو سالم برابر بکریاں۔ (السنن الکبریٰ للبیہقی ۹/۳۰۱ وسندہ صحیح)

☆ محمد بن حسن الشیبانی نے قاضی ابو یوسف سے، اُس نے (امام) ابوحنیفہ سے نقل کیا ہے کہ "ولا یعق عن الغلام ولا عن الجاریۃ" نہ تو لڑکے کی طرف سے عقیقہ کرنا چاہئے اور نہ لڑکی کی طرف سے۔ (الجامع الصغیر ص ۵۲۴)

یہ سند صحیح نہیں ہے لہٰذا امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے یہ قول ثابت نہیں ہے، اس کے باوجود ملا کاسانی نے بدائع الصنائع (۵/۶۹) میں اسی کی حمایت کی ہے اور فتاویٰ عالمگیری (۵/۳۶۲) میں لکھا ہوا ہے کہ یہ اس کے مکروہ ہونے کی طرف اشارہ ہے۔!

نیز دیکھئے الموطأ المنسوب الیٰ محمد بن الحسن الشیبانی ص ۸۸، ۸۹

غلام رسول سعیدی بریلوی لکھتے ہیں: "احادیث صحیحہ میں عقیقہ کی فضیلت اور استحباب کو بیان کیا گیا ہے لیکن غالباً یہ احادیث امام ابوحنیفہ اور صاحبین کو نہیں پہنچیں، کیونکہ انھوں نے عقیقہ کرنے سے منع کیا ہے۔" (شرح صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۳)

سعیدی صاحب مزید لکھتے ہیں: "اگر کوئی شخص تقلید محض کی پستی سے نہیں نکلا تو اس کو عقیقہ کرنے سے منع کرنا چاہئے یا کم از کم یہ کہنا چاہئے کہ عقیقہ مباح ہے اور کار ثواب نہیں ہے اور اس کو یہ نہیں چاہئے کہ امام اعظم کے قول کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال کر یہ کہے کہ امام اعظم کے نزدیک عقیقہ سنت ہے لیکن سنت موکدہ یا سنت ثابتہ نہیں ہے۔ اور اگر وہ میدان تحقیق میں وارد ہے تو اس کو یہ کہنا چاہئے کہ عقیقہ سنت اور مستحب ہے کیونکہ احادیث صحیحہ میں اس کا ثبوت ہے اور تمام امت نے ان احادیث کو قبول کیا ہے اور امام اعظم کو یہ احادیث نہیں پہنچیں ورنہ وہ عقیقہ کو مکروہ نہ کہتے کیونکہ اس زمانہ میں نشر و اشاعت کے ذرائع اور وسائل

اتنے میسر نہیں تھے جتنے اب ہیں.... یہاں امام کے قول کے خلاف حدیث پر عمل کرنا تقلید کے خلاف نہیں ہے۔" (شرح صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۵)

☆ عقیقہ میں صرف بکری بکرا یا مینڈھا ہی ثابت ہے۔ ابراہیم بن الحارث التیمی کا قول مبالغے پر محمول ہے اور صحیح یہ ہے کہ گائے اونٹ وغیرہ کا عقیقے میں ذبح کرنا ثابت نہیں ہے جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول " معاذ اللہ " سے ثابت ہے لہٰذا جو لوگ اونٹ یا گائے میں قربانی کی طرح عقیقے کے بھی سات، پانچ یا چار وغیرہ حصے بنا لیتے ہیں، ان کا عمل غلط ہے اور سنت کے خلاف ہونے کی وجہ سے مردود ہے۔ (۱۹/ جون ۲۰۰۸ء)

نومولود کے سرہانے چاقو؟

سوال جب کسی کا بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے سرہانے ایک چاقو رکھ دیتے ہیں۔ کیا اسلام میں یہ جائز ہے؟ (حاجی نذیر خان، داماں حضرو)

الجواب نومولود بچے کے سرہانے چاقو رکھنے کا ثبوت کسی حدیث میں نہیں ہے بلکہ ثقہ تابعیہ ام علقمہ مرجانہ رحمہا اللہ سے روایت ہے کہ لوگوں کے جب بچے پیدا ہوتے تو (سیدہ) عائشہ (رضی اللہ عنہا) کے پاس لائے جاتے، آپ اُن کے لئے برکت کی دعا فرماتی تھیں، پھر ایک بچہ لایا گیا تو وہ اُس کا سرہانہ رکھنے لگیں، کیا دیکھتی ہیں کہ اُس کے نیچے ایک اُسترا ہے تو انھوں (سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا) نے اُن لوگوں سے اُسترے کے بارے میں پوچھا؟ لوگوں نے کہا: ہم یہ استرا جنوں کی وجہ سے رکھتے ہیں۔ عائشہ (رضی اللہ عنہا) نے اُسترا لے کر دُور پھینک دیا اور انھیں اس سے منع کر دیا۔ انھوں نے فرمایا: بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بدفالی کو بُرا سمجھتے تھے اور اس سے بُغض رکھتے تھے۔ عائشہ (رضی اللہ عنہا) اس کام (اُسترا رکھنے) سے منع کرتی تھیں۔ (الادب المفرد للبخاری: ۹۱۲ وسندہ حسن)

اس روایت کی سند حسن لذاتہ ہے۔ شیخ محمد ناصر الدین الالبانی رحمہ اللہ نے منہج میں خطا کی وجہ سے اس روایت کو ضعیف الاسناد قرار دیا ہے۔ دیکھئے الادب المفرد بتحقیق الالبانی (ص ۳۱۹)

لہٰذا اس روایت کے تین راویوں کا دفاع پیشِ خدمت ہے:

① ام علقمہ مرجانہ رحمہا اللہ

ان سے علقمہ بن ابی علقمہ (ثقہ) اور بکیر بن الاشج (ثقہ) دو راویوں نے حدیث بیان کی۔
دیکھئے تہذیب التہذیب (۱۲/ ۴۵۷، دوسرا نسخہ ۱۲/ ۴۷۸)

حافظ ابن حبان البستی نے انھیں کتاب الثقات (۵/ ۴۶۶) میں ذکر کیا اور صحیح ابن حبان (الاحسان: ۳۷۴۰) میں ان سے حدیث بیان کی۔ معتدل امام عجلی رحمہ اللہ نے فرمایا:
''مدنیة تابعیة ثقة'' وہ مدینے کی تابعیہ ثقہ تھیں۔ (معرفۃ الثقات ۲/ ۴۶۱ ح ۲۳۶۴)

امام ابن خزیمہ (صحیح ابن خزیمہ ۴/ ۳۳۵ ح ۳۰۱۸، ۴/ ۳۶۲ ح ۳۰۷۹) امام ترمذی (السنن: ۸۷۶) حاکم (۱/ ۴۸۸ ح ۱۷۹۴) اور ذہبی نے اُن کی بیان کردہ حدیث کو صحیح قرار دیا۔ امام مالک نے الموطأ (۱/ ۲۴۲ ح ۵۷۶) میں اُن سے روایت لی۔

شیخ البانی نے ایک راوی ضبہ بن محصن کے بارے میں کہا: ''وكذلك وثقه كل من صحح حديثه...'' اور اسی طرح ہر اُس نے اُسے ثقہ قرار دیا ہے جس نے اُس کی حدیث کو صحیح کہا ہے۔ (السلسلۃ الصحیحہ ۷/ ۱۶ ح ۳۰۰۷)

معلوم ہوا کہ مرجانہ کو عجلی، ابن حبان، ترمذی، ابن خزیمہ اور حاکم نے ثقہ قرار دیا ہے۔
ذہبی کی جرح (لا تعرف) اُن کی توثیق سے معارض ہو کر ساقط ہے۔ رہا حافظ ابن حجر کا اسے مقبولہ یعنی مجہولۃ الحال کہنا تو یہ جمہور کی توثیق کے مقابلے میں مردود ہے۔

شیخ البانی پر تعجب ہے کہ عجلی، ابن حبان، ابن خزیمہ، ترمذی اور حاکم کی توثیق کے باوجود مرجانہ مذکورہ کو مجہولہ سمجھتے تھے!

فائدہ: تحریر تقریب التہذیب میں لکھا ہوا ہے: ''بل: صدوقة حسنة الحديث'' بلکہ وہ سچی تھیں، اُن کی حدیث حسن ہے۔ (۴/ ۴۳۳ ت ۸۶۸۰)

② عبدالرحمٰن بن ابی الزناد رحمہ اللہ جمہور محدثین کے نزدیک موثق ہونے کی وجہ سے صدوق حسن الحدیث تھے۔ دیکھئے میری کتاب ''نور العینین'' (ص ۱۱۵۔۱۱۶)

③ اسماعیل بن ابی اویس بقولِ راجح ضعیف راوی تھا لیکن امام بخاری کی اُس سے روایت

حسن یا صحیح ہوتی ہے کیونکہ امام بخاری نے اُس کی اصل کتابوں سے روایتیں لکھی تھیں۔
دیکھئے حافظ ابن حجر کی کتاب ''ہدی الساری'' (ص ۳۹۱)

خلاصہ التحقیق: یہ روایت بلحاظِ سند حسن لذاتہ ہے اور متن میں کوئی علت نہیں لہٰذا اُس سے استدلال صحیح ہے۔

غیر قبیلے میں شادی اور میاں بیوی کا اختلاف

سوال محترم حافظ صاحب صورت احوال کچھ یوں ہے کہ میرے ایک دوست انگلینڈ میں ہوتے ہیں۔ کافی عرصہ پہلے اُن کی شادی، غیر برادری میں ہوئی تھی۔ اُنھوں نے مجھے فون پر بتایا کہ میں کافی عرصہ سے پریشان ہوں اور آپ مجھے کسی اچھے عالم دین سے مسئلہ پوچھ کر بھیجیں تاکہ میں اپنی بیوی کو بتاؤں اور ہوسکتا ہے کہ میری زندگی میں سکون ہو سکے۔ تو میں نے بھائی امجد سے بات کی تو اُنھوں نے آپ کا ایڈریس (پتا) دیا۔ تو اس سلسلے میں آپ کو خط لکھ رہا ہوں، آپ سے گزارش ہے کہ اگر ہو سکے تو جواب کمپیوٹر پر کمپوز کر کے اور دستخط کر کے بھیجیں کیونکہ میرے دوست کی بیوی اردو زیادہ نہیں پڑھ سکتی اور کمپیوٹر کمپوزنگ ذرا واضح ہوتی ہے اس کو پڑھنے میں آسانی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ آپ کی اس کاوش کو اُن کا گھر آباد کرنے اور سکون مہیا کرنے کا سبب بنائے (آمین) مسئلہ یہ ہے:

① کیا غیر برادری میں شادی کرنا معیوب ہے؟

② اپنے آپ کو اعلیٰ سمجھنا اور دوسرے کو گھٹیا سمجھنا اسلام کی نظر میں کیسا ہے؟

③ نبی ﷺ نے بیٹیوں کی شادی کبھی غیر برادری (قوم) میں کی ہے؟

④ میرے دوست کی بیوی کہتی ہے کہ جب سے میری تم سے شادی ہوئی ہے۔ میں نے کبھی سکون نہیں دیکھا۔ جب سے تم میری زندگی میں آئے ہو میرے سارے کام رُک گئے ہیں کوئی کام نہیں ہوتا۔ کیا کسی کی زندگی میں آنے سے ایسا ہوسکتا ہے؟ یاد رہے میرے دوست کی بیوی اخراجات میں شاہ خرچ ہے۔

⑤ وہ کہتی ہے کہ میں نے استخارہ کیا تھا (شادی سے پہلے) تو مجھے خون نظر آیا تھا خواب

میں۔ وہ کہتی ہے میں نے کسی مولوی سے پوچھا تھا وہ کہتا تھا کہ سرخ اور سیاہ رنگ کا نظر آنا اچھا نہیں ہے۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس استخارے کا کیا مطلب ہے؟

حافظ صاحب! براہِ مہربانی قرآن وحدیث کی روشنی میں مدلل جواب دیں اور اگر ہو سکے تو ذرا جلدی جواب دے دیں میں نے یہ جواب انگلینڈ بھیجنا ہے اور ایک گزارش ہے کہ میرے دوست کے لئے خصوصی دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ دونوں کو اتفاق واتحاد اور سکون دے اور اُس کی بیوی کو ہدایت دے کر راہ حق مسلک حق کی طرف موڑ دے۔ (آمین)

(ابو احمد، میر پور)

تنبیہ: سائل کے سوال کو من وعن نقل کیا گیا ہے۔

الجواب آپ کے سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں:

① غیر برادری میں شادی کرنا معیوب نہیں ہے۔ سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف القرشی الزہری المہاجر رضی اللہ عنہ نے ایک انصاری عورت سے شادی کی تھی۔

دیکھئے موطأ امام مالک (روایۃ عبدالرحمٰن بن القاسم: ۱۵۰، بتحقیقی، روایۃ یحییٰ بن یحییٰ ۵۴۵/۲ ح ۱۱۸۴، وھو حدیث صحیح) صحیح بخاری (۵۱۵۳) اور صحیح مسلم (۱۴۲۷/۸۱)

② صحیح العقیدہ مسلمان بھائیوں میں سے کسی کا اپنے آپ کو اعلیٰ اور دوسرے کو گھٹیا سمجھنا اسلام کی نظر میں جائز نہیں ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((بحسب امریئٍ من الشر أن یحقر أخاہ المسلم .)) آدمی کے شر کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر (گھٹیا) سمجھے۔ (صحیح مسلم: ۲۵۶۴)

③ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چار بیٹیاں تھیں جن کے نام مع شوہروں کے نام درج ذیل ہیں:

۱: فاطمہ رضی اللہ عنہا (علی بن ابی طالب القرشی الہاشمی رضی اللہ عنہ)

۲: زینب رضی اللہ عنہا (ابو العاص بن الربیع القرشی رضی اللہ عنہ)

۳: رقیہ رضی اللہ عنہا (سیدنا عثمان بن عفان القرشی الاموی رضی اللہ عنہ)

۴: ام کلثوم رضی اللہ عنہا (سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ)

④ شادی میں ناکامی کی وجہ اگر بدشگونی اور بدفالی ہے تو یہ غلط ہے۔ ارشادِ نبوی ہے:
((لا طيرة .)) کوئی بدفالی نہیں ہے۔ (صحیح بخاری: ۵۷۵۴، صحیح مسلم: ۲۲۲۳)
اگر ناکامی کی وجہ فریقین (میاں بیوی) کی باہم مفاہمت (Understanding) اور محبت نہیں ہے تو یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔
تنبیہ: اسراف اور شاہ خرچی جائز نہیں ہے اگرچہ اس کا ارتکاب شوہر کرے یا اس کی بیوی، حتی الوسع کفایت شعاری سے کام لینا چاہئے۔
⑤ استخارے کی وجہ سے خواب دیکھنا حدیث سے ثابت نہیں ہے لہٰذا یہ کہنا ''مجھے خون نظر آیا تھا'' بے دلیل ہے۔ مولوی صاحب کا یہ کہنا کہ ''سرخ اور سیاہ رنگ کا نظر آنا اچھا نہیں ہے'' بلا دلیل ہونے کی وجہ سے مردود ہے۔
تنبیہ: خواب کی تعبیر کے نام سے جو کتابیں مارکیٹ میں ہیں، بے دلیل و بے ثبوت ہونے کی وجہ سے ناقابلِ حجت ہیں مثلاً عبدالغنی النابلسی (بدعتی) کی '' تعطير الأنام في تعبير المنام'' ابوالقاسم دلاوری دیوبندی تقلیدی کی ''تعبیر الرویا کلاں'' اور امام ابن سیرین رحمہ اللہ کی طرف منسوب جعلی کتاب ''تعبیر الرؤیا'' یا ''تفسیر الأحلام''
عوام کے لئے ان کتابوں سے بچنا ضروری ہے۔ دیکھئے شیخ ابوعبیدہ مشہور بن حسن آلِ سلمان کی کتاب'' كتب حذر منها العلماء'' ج ۲ ص ۲۷۵۔۲۷۷، ۲۷۹۔۲۸۳
ایک اہم بات: آخر میں عرض ہے کہ بیوی پر (معروف اُمور میں) اپنے شوہر کی اطاعت فرض ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((**والذي نفس محمد بيده! لا تؤدي المرأة حق ربها حتى تؤدي حق زوجها .**)) الخ
اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! عورت اس وقت تک اپنے رب کا حق ادا نہیں کر سکتی جس وقت تک وہ اپنے شوہر کا حق ادا نہ کر دے۔ الخ
(سنن ابن ماجہ: ۱۸۵۳، وسندہ حسن وصححہ ابن حبان، الموارد: ۱۲۹۰، والحاکم علیٰ شرط الشیخین ۴/۱۷۲، ووافقہ الذہبی)
سیدنا ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((**ثلاثة لا تجاوز**

صلاتهم آذانهم .... وامرأة باتت و زوجها عليها ساخط.)) إلخ

تین آدمیوں کی نماز ان کے کانوں سے اوپر نہیں جاتی ....اور وہ عورت جو اس حالت میں رات گزارے کہ اس کا شوہر اُس سے ناراض ہو۔ الخ

(سنن الترمذی: ۳۶۰ وقال: ''حسن غریب'' وسندہ حسن وحسنہ البغوی فی شرح السنۃ ۳/۴۰۴ ح ۸۳۸)

سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لا تؤذي امرأة زوجها في الدنيا إلا قالت زوجته من الحور العين : لا تؤذيه قاتلك الله ! فإنما هو عندك دخيل ، يوشك أن يفارقك إلينا .))

جو عورت بھی اپنے (ایمان دار) شوہر کو دنیا میں تکلیف دیتی ہے تو اس شوہر کی حوروں میں سے بیوی کہتی ہے: اسے تکلیف نہ دو، اللہ تجھے تباہ کرے! یہ تیرے پاس کچھ دنوں کا مہمان ہے، قریب ہے کہ تجھے چھوڑ کر ہمارے پاس آ جائے۔ (سنن الترمذی: ۱۱۷۴، وقال: ''حسن غریب'' قلمی نسخہ ص ۸۵ ب، حلیۃ الاولیاء لابی نعیم ۵/۲۲۰، واسماعیل بن عیاش صرح بالسماع عندہ وھو بری من التدلیس)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((لا تصوم المرأة وبعلها شاهد إلا بإذنه .)) کوئی عورت اپنے خاوند کی مرضی کے بغیر (نفلی) روزہ نہیں رکھ سکتی۔

(صحیح بخاری: ۵۱۹۲، صحیح مسلم: ۱۰۲۶)

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت کو اس کے شوہر کے بارے میں فرمایا: ((فإنما هو جنتك و نارك .)) وہی تیری جنت ہے اور وہی تیری جہنم ہے۔

(مسند احمد ۴/۳۴۱ ح ۱۹۰۰۳، وسندہ حسن، السنن الکبریٰ للنسائی: ۸۹۶۷، وصححہ الحاکم ۲/۱۸۹، ووافقہ الذہبی)

مزید تفصیل کے لئے دیکھئے عصرِ حاضر میں حدیث کے مشہور عالم شیخ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ کی کتاب ''آداب الزفاف'' (ص ۲۸۱۔۲۹۲)

اس سلسلے میں ڈاکٹر فرحت ہاشمی کی تقریر ''اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ'' کے موضوع پر بہت مفید ہے جو کہ کیسٹ کی صورت میں مارکیٹ میں دستیاب ہے۔

معلوم ہوا کہ بیوی پر شوہر کی خدمت اور اطاعت فرض ہے۔

یاد رہے کہ شوہر پر بھی بیوی کے بہت سے حقوق ہیں جن کی ادائیگی اس پر فرض ہے۔

رسول اللہ ﷺ سے عورتوں کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:

((و أطعمها إذا طعمتَ و اكسها إذا اكتسيتَ و لا تقبّح الوجه و لا تضرب .))

جب تو کھائے تو اسے بھی کھلا، جب تو پہنے تو اسے بھی پہنا اور اس کے چہرے کو برا نہ کہہ اور نہ اسے (چہرے پر) مار۔ (سنن ابی داود: ۲۱۴۳، وسندہ حسن)

میرے علم میں ایسے واقعات آئے ہیں کہ جن لوگوں کے پاس برٹش پاسپورٹ ہوتا ہے تو وہ اپنے ان ماتحتوں کو بہت تنگ کرتے ہیں جن کے پاس برٹش پاسپورٹ نہیں ہوتا۔ گویا وہ اپنے آپ کو کوئی آسمانی مخلوق سمجھتے ہیں۔ برطانیہ کی نیشنلٹی والا مرد اپنی اس بیوی کو تنگ کرتا ہے جس کے پاس نیشنلٹی نہیں ہوتی اور اسی طرح نیشنلٹی والی بیوی اپنے اس شوہر کو بے حد تنگ کرتی ہے جس کے پاس برطانوی نیشنلٹی نہیں ہوتی۔ ایسا کرنا بالکل حرام ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((المسلم من سلم المسلمون من لسانه و يده .))

مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ (صحیح بخاری: ۱۰)

انھی الفاظ والی روایت سیدنا جابر بن عبداللہ الانصاری رضی اللہ عنہ سے بھی ثابت ہے۔

دیکھئے صحیح مسلم (۴۱، ترقیم دارالسلام: ۱۶۲) وما علینا إلا البلاغ (۸/ مارچ ۲۰۰۸ء)

دلہن کی گود میں چھوٹے بچے کو بٹھانا

سوال جب گھر میں نئی دلہن آتی ہے تو بعض لوگ اُس کی گود میں چھوٹا بچہ بٹھاتے ہیں تا کہ اُس کی بھی اولاد ہو۔ کیا یہ جائز ہے؟ (حاجی نذیر خان، داماں حضرو)

الجواب یہ ہندوانہ رسم ہے جس کا اسلام میں کوئی ثبوت نہیں ہے۔

لطیفہ: احمد رضا خان بریلوی نے لکھا ہے:

"دُلھن کو بیاہ کر لائیں تو مستحب ہے کہ اس کے پاؤں دھو کر مکان کے چاروں گوشوں میں چھڑکیں اس سے برکت ہوتی ہے یہ پانی بھی قابلِ دضو رہنا چاہئے اگر دُلھن باوضو یا نابالغہ

تھی کہ یہ اوراس کا سابق از قبیل اعمال ہیں نہ از نوع عبادات اگر چہ نیت اتباع انہیں قربت کر دے واللہ تعالیٰ اعلم۔'' (فتاویٰ رضویہ مع تخریج وترجمہ عربی عبارات ج۲ص۵۹۵ فقرہ:۱۵۶)

بریلوی کی یہ بات کہ ''پاؤں دھو کر مکان کے چاروں گوشوں میں چھڑکیں ...'' بالکل بے دلیل اور مردود ہے بلکہ عوامی گپ شپ معلوم ہوتی ہے جسے فتاویٰ رضویہ میں بطورِ استدلال درج کرلیا گیا ہے۔ واللہ اعلم

دولہا کے گلے میں ہار؟

سوال دولہا کے گلے میں ہار ڈالنا کیسا ہے؟ (حاجی نذیر خان، دامان حضرو)

الجواب یہ ایک فضول رسم ہے جس کا دین میں کوئی ثبوت نہیں ہے۔

بیس رکعات تراویح سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہیں

سوال بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ بیس رکعت تراویح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ثابت ہیں، ان کے دورِ خلافت میں بیس رکعات تراویح پڑھائی گئی ہیں تو یہ جائز ہے؟ اور کیا اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم تھا؟ (حاجی نذیر خان، دامان حضرو)

الجواب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے بیس رکعات تراویح ثابت نہیں ہیں، نہ قولاً اور نہ فعلاً بلکہ آپ سے گیارہ رکعات کا حکم ثابت ہے۔ موطأ امام مالک میں حدیث ہے کہ (سیدنا امیر المومنین) عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے (سیدنا) اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ اور (سیدنا) تمیم الداری رضی اللہ عنہ دونوں کو حکم دیا کہ لوگوں کو گیارہ رکعات پڑھائیں۔

(ج۱ص۱۱۴ح۲۴۹ وسندہ صحیح، آثار السنن للنیموی ص۲۵۰ وقال: ''واسنادہ صحیح'')

تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب ''تعدادِ رکعاتِ قیامِ رمضان کا تحقیقی جائزہ'' (ص۲۲،۲۳)

اس فاروقی حکم کے مقابلے میں دورِ خلافت میں بعض نامعلوم لوگوں کے عمل کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

[الحدیث:۶۱]

رکعاتِ تراویح اور دعویٰ اعظمی

سوال جناب حبیب الرحمٰن اعظمی صاحب نے اپنی کتاب: ''رکعات تراویح'' میں بیس رکعات تراویح پر اجماع کا دعویٰ کرتے ہوئے لکھا ہے: ''اس دعوے کو توڑنے کے لئے سارا زور صرف کرنے کے بعد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ امام مالکؒ کا ایک قول گیارہ کا ہے، لیکن اگر مطالبہ کر دیا جائے کہ امام مالکؒ کی طرف اس قول کو منسوب کرنے کی کونسی قابلِ اعتماد سند ہے۔ ان کے کس شاگرد نے اس کو روایت کی ہے اور وہ روایت کس مستند تصنیف میں ہے تو عجب نہیں کہ دن میں تارے نظر آنے لگیں'' (ص ۸۶)

جناب اعظمی صاحب کی یہ تعلی اور چیلنج کہاں تک صحیح ہے؟ (ایک سائل)

الجواب حافظ ابو محمد عبدالحق بن عبدالرحمٰن الاشبیلی رحمہ اللہ (متوفی ۵۸۱ھ) نے لکھا ہے: ''وقال أشهب بن عبدالعزيز عن مالك : الّذي آخذ به لنفسي في قيام رمضان هو الّذي جمع به عمر بن الخطاب النّاس احدى عشرة ركعة وهي صلاة رسول الله ﷺ ولا أدرى من أحدث هذا الركوع الكثير ذكره ابن مغيث'' (کتاب التہجد لعبدالحق الاشبیلی دار الکتب العلمیہ بیروت لبنان ص ۱۷۶ فقرہ ۸۹۰، دوسرا نسخہ ص ۲۸۷ دار الوفاء للطباعۃ والنشر والتوزیع)

حافظ عبدالحق (ابن الخراط) صاحبِ احکام کبریٰ وصغریٰ کے بارے میں حافظ ذہبی نے لکھا ہے: '' الإمام الحافظ البارع المجود العلامة '' (سیر اعلام النبلاء ج ۲۱ ص ۱۹۸)

حافظ الابار نے کہا: ''كان فقيهًا حافظًا عالمًا بالحديث و علله ، عارفًا بالرجال ...إلخ '' (ایضاً ص ۱۹۹)

امام ابوالولید یونس بن عبداللہ بن محمد بن مغیث القرطبی رحمہ اللہ (متوفی ۴۲۹ھ) کے بارے میں حافظ ذہبی نے فرمایا: ''الإمام الفقيه المحدّث ، شيخ الأندلس ، قاضي القضاة، بقية الأعيان '' (سیر اعلام النبلاء ج ۱۷ ص ۵۶۹)

ان کا شمار مالکی فقہاء میں ہوتا ہے۔ (دیکھئے ''الدیباج المذہب فی علماء المذہب'' ج ۲ ص ۳۷۴، ۳۷۶)

اشہب بن عبدالعزیز سنن ابی داود وغیرہ کے راوی تھے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا: "ثقة فقيه" (تقریب التہذیب: ۵۳۳)

ابن عبدالحکم المالکی نے انھیں اجتہادی مسائل میں ابن القاسم پر ترجیح دی ہے۔

(دیکھئے سیر اعلام النبلاء ج۹ص ۵۰۱)

اب آپ خود فیصلہ کریں کہ دن میں تارے کسے نظر آتے ہیں؟

(ہفت روزہ الاعتصام لاہور، ۲۷/ جون ۱۹۹۷ء)

سوال اعظمی دیوبندی صاحب نے لکھا ہے: "حاصل یہ کہ امام مالک کا قول گیارہ رکعت کا ہے۔ (بشرطیکہ وہ ثابت بھی ہو) دوسرا بیس (۲۰) کا... اُن کے متبعین میں فقط ایک شخص گیارہ رکعت کے قائل تھے اور وہ ابوبکر بن العربی ہیں۔" (رکعات تراویح ص ۱۴)

کیا یہ دعویٰ صحیح ہے۔؟ (ایک سائل)

الجواب علامہ ابوالعباس احمد بن عمر بن ابراہیم القرطبی المالکی (متوفی ۶۵۶ھ) نے لکھا ہے: "وقال الشافعي: عشرون ركعة، وقال كثير من أهل العلم: احدى عشرة ركعة أخذًا بحديث عائشة المتقدم"

اور شافعی نے کہا: بیس رکعتیں، اور بہت سے علماء نے کہا: گیارہ رکعتیں، انھوں نے یہ فیصلہ (ام المؤمنین) عائشہ کی سابقہ حدیث کی بنیاد پر کیا ہے۔

(المفہم لما اشکل من تلخیص کتاب مسلم ج۲ص ۳۹۰۔۳۸۹ تحت ح ۲۳۹۶)

علامہ ابوالعباس کے بارے میں ابن العماد نے لکھا ہے: "الأنصاري المالكي المحدث الشاهد نزيل الإسكندرية كان من كبار الأئمة" (شذرات الذہب ج۵ص ۲۷۴)

(ہفت روزہ الاعتصام لاہور، ۲۷/ جون ۱۹۹۷ء)

دادا کی وراثت

سوال باپ فوت ہو جائے تو اولاد اپنے دادا کی وراثت سے کیوں محروم کی گئی ہے؟ اولاد اگر جائیداد حاصل کرنا چاہے تو اس کا کیا طریقہ ہے؟ یاد رہے کہ دادا زندہ ہے، وضاحت فرمائیں۔ جزاک اللہ خیراً (قاری سعید الحسن، اسلام گڑھ)

الجواب قرآن و حدیث میں جو حصے مقرر کیے گئے ہیں ان میں پوتے کا کوئی ذکر نہیں لہٰذا حدیث " فما بقي فهو لأولى رجل ذكر " پس جو باقی رہ جائے تو وہ قریب ترین مرد کو ملے گا۔ (صحیح بخاری: ۶۷۳۲، ۶۷۳۵، صحیح مسلم: ۱۶۱۵) کی رو سے باپ کا زندہ بیٹا عصبہ بن کر ورثاء سے باقی تمام جائیداد کا مالک بن جاتا ہے۔

سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: " ولد الأبناء بمنزلة الولد إذا لم ... "

پوتے بیٹوں کے قائم مقام ہوتے ہیں بشرطیکہ کوئی بیٹا زندہ نہ ہو۔

(صحیح البخاری کتاب الفرائض باب میراث ابن الابن اذا لم یکن ابن قبل ح ۶۷۳۵)

تاہم دادا کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ ثلث (۱/۳، ایک تہائی) کی وصیت کر سکتا ہے لہٰذا اسے چاہئے کہ پوتے کے لئے مناسب وصیت کرے۔ [شہادت، نومبر ۲۰۰۰ء]

اہلِ حدیث پر مخالفینِ حدیث کے حملے اور اُن کا جواب

سوال بعض لوگوں نے اہلِ حدیث کے بارے میں درج ذیل عبارات لکھ کر اپنے دیوبندی تقلیدی "مفتیوں" سے مسئلہ پوچھا ہے کہ کیا اہلِ حدیث کے پیچھے نماز ہو جاتی ہے؟

۱: وہ (یعنی اہلِ حدیث) امام (یعنی ابوحنیفہ کو) نہیں مانتے اور ہم مانتے ہیں۔

۲: وہ کہتے ہیں کہ جب نیند سے (آدمی) اُٹھ جائے اور پیشاب نہ آیا ہو تو نیند اور ہوا (خارج ہونے) سے وضو نہیں ٹوٹتا، نیند پر نقضِ وضوء نہیں ہوتا خواہ مضطجعاً ہو یا غیر مضطجعاً، خروجِ ریح پر وضوء نہیں ٹوٹتا۔

۳: اُن کے مذہب میں آٹھ رکعات تراویح ہیں اور حضرت عمرؓ کے بارے میں حد سے

تجاوز کیا ہے۔ آٹھ رکعات تراویح کو صحیح مانتے ہیں اور باقی بارہ رکعات کے منکر ہیں۔
کیا یہ لوگ حضرت عمرؓ سے زیادہ احادیث کو جاننے والے ہیں؟

٤: وہ منی کو صاف (پاک) قرار دیتے ہیں۔

٥: وہ فاتحہ خلف الامام بھی پڑھتے ہیں۔

٦: جورابوں پر مسح کو بھی جائز قرار دیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک مسح علی الجوربین مطلقاً جائز ہے بدون احناف کے ہر گونہ شرائط سے۔

٧: امام ابوحنیفہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ کُتبِ فقہ ویسے ہی اُس کی طرف منسوب کی گئی ہیں۔

٨: وہ کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ تو کوئی عالم نہیں تھے اور کہتے ہیں کہ کیا ابوحنیفہ پر جبریل علیہ السلام نازل ہوتے تھے؟ اور کہتے ہیں: ہم ابوحنیفہ کو بالکل نہیں مانتے اور ائمہ ثلاثہ کو بھی نہیں مانتے۔

٩: یہ لوگ امام ابوحنیفہ کو گمراہ سمجھتے ہیں اور تقلید کو گناہ کبیرہ قرار دیتے ہیں۔

١٠: اُن کے نزدیک امامت النساء جائز ہے حتیٰ کہ اقتداء الرجال خلف النساء بھی درست ہے۔

١١: وہ کہتے ہیں کہ وضع الیدین تحت السرۃ کا ثبوت کسی (صحیح) حدیث سے نہیں ہے۔

١٢: وہ کہتے ہیں کہ بدون رفع الیدین نماز درست نہیں ہے، اگر کسی نے پڑھی ہو تو اعادہ لازمی ہے۔

١٣: اُن کے نزدیک صلوٰۃ مکتوبہ سے قبل و بعد کوئی سنت ثابت نہیں۔

١٤: وہ کُتبِ حدیث میں صرف بخاری شریف (صحیح بخاری) کو مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ امام بخاری غیر مقلد تھے۔ باقی کتبِ حدیث کو وہ نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ ان کے مصنفین مقلد تھے اور صحیح بخاری کے علاوہ جملہ کتبِ احادیث مفتریات و تصنعات ہیں۔

١٥: جمع بین الصلوٰتین حقیقتاً کے بھی قائل ہیں۔

١٦: ان لوگوں نے تبلیغی جماعت والے زکریا دیوبندی صاحب کے بارے میں حد سے

تجاوز کیا ہے۔

۱۷: ان کے نزدیک جمعہ کے دن قبل از فرائض کوئی سنت نماز نہیں ہے۔

اس طرح کی عبارات پر بغیر کسی تحقیق، حوالے اور تصدیق کے دیوبندی مفتیوں نے فتویٰ دے دیا کہ "مذکورہ بالا عقائد کے حامل کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے"

آپ ہمیں تحقیق سے اور قوی دلائل کے ساتھ جواب دیں کہ کیا مذکورہ تمام عبارات کا اہلِ حدیث کی طرف انتساب صحیح ہے؟ اور کیا ان دیوبندی تقلیدی مفتیوں کا فتویٰ صحیح ہے؟

بینوا توجروا، جزاکم اللہ خیرًا سائل

محمد جلال محمدی بن عبدالحنان

گاؤں جانس، ڈاکخانہ وتحصیل شرینگل

ضلع دیر بالا، صوبہ سرحد

(محمد جلال محمدی)

(۲۴/نومبر ۲۰۰۸ء بمطابق ۲۶/ ذوالقعدہ ۱۴۲۹ھ)

الجواب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا ﴾

اور جب بات کرو تو انصاف کرو۔ (سورۃ الانعام:۱۵۲)

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا ﴾

اگر تمھارے پاس کوئی فاسق کسی خبر کے ساتھ آئے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو۔ (الحجرات:٦)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إن اللّٰه لا يقبض العلم انتزاعًا ينتزعه من العباد ولكن يقبض العلم بقبض العلمآء حتى إذا لم يبق عالم اتخذ الناس رء وسًا جهّالاً فسئلوا فأفتوا بغير علم فضلّوا و أضلّوا .))

بے شک اللہ تعالیٰ علم کو لوگوں سے کھینچ کر نہیں اُٹھائے گا بلکہ وہ علماء کو فوت کر کے علم کو اُٹھائے گا حتیٰ کہ جب کوئی عالم نہیں رہے گا تو لوگ جاہلوں کو اپنے پیشوا بنا لیں گے پھر اُن سے مسئلے

پوچھے جائیں گے تو وہ بغیر علم کے فتوے دیں گے، وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۰ ح ۱۰۰، واللفظ لہ، صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۴۰ ح ۲۶۷۳، ترقیم دارالسلام: ۶۷۹۶)

ان دلائل سے معلوم ہوا کہ مفتی کو درج ذیل باتوں کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہئے:

① سائل کے سوال کی تحقیق کر کے جواب دے، بالخصوص اس وقت تحقیق انتہائی ضروری ہے جب سائل کسی شخص یا گروہ پر الزامات لگا کر جواب یا فتویٰ طلب کرے۔

② بغیر علم کے فتویٰ نہیں دینا چاہئے۔

③ ہمیشہ عدل و انصاف کی ترازو قائم کر کے غیر جانبداری کے ساتھ حق و انصاف والا جواب دینا چاہئے۔

یہاں پر یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ لوگوں کو چاہئے کہ قرآن و حدیث پر عمل کرنے والے صحیح العقیدہ مفتیوں سے مسئلے پوچھیں اور بے علم جاہلوں سے دُور رہیں۔

اس تمہید کے بعد آپ کے سوالات کا مفصل اور جامع جواب پیشِ خدمت ہے:

۱: امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت بن زوطی الکوفی الکابلی رحمہ اللہ کو ماننے اور نہ ماننے کا مطلب کیا ہے؟ اگر ماننے سے مراد یہ ہے کہ وہ ایک عالم تھے جو دوسری صدی ہجری میں فوت ہوئے تو عرض ہے کہ تمام اہلِ حدیث اس بات کو تسلیم کرتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ کے وجود کا ثبوت تو تواتر سے ثابت ہے۔ مثلاً دیکھئے التاریخ الکبیر للبخاری (۸۱/۸ ت ۲۲۵۳) کتاب الکنیٰ للامام مسلم (مخطوط مصور ص ۱۰۷/۳۱) اور عام کتب اسماء الرجال.

امام ابوحنیفہ نے فرمایا: ''ما رأيت أحدًا أكذب من جابر الجعفي و لا أفضل من عطاء بن أبي رباح '' میں نے جابر الجعفی سے زیادہ جھوٹا کوئی نہیں دیکھا اور عطاء بن ابی رباح سے زیادہ افضل کوئی نہیں دیکھا۔ (علل الترمذی مع شرح ابن رجب ج ۱ ص ۶۹)

اگر ماننے سے مراد امام ابوحنیفہ کی تقلید کرنا ہے تو عرض ہے کہ دیوبندی اور بریلوی بلکہ حنفی حضرات اپنے قول و عمل کے ساتھ ائمہ ثلاثہ (امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل

رحمہم اللہ) کی تقلید نہیں کرتے لہٰذا اگر تقلید نہ کرنا جُرم ہے تو پھر یہ لوگ بھی اسی جرم کے مرتکب ہیں۔ امام ابوحنیفہ کی تقلید کا دعویٰ کرنے والے تقلیدی حضرات بہت سے مسائل میں امام ابوحنیفہ کی بھی تقلید نہیں کرتے مثلاً:

مسئلہ ۱: امام ابوحنیفہ کے نزدیک اگر میت مرد ہو تو نماز جنازہ پڑھانے والا امام اس کے سر کے قریب کھڑا ہوگا اور اگر میت عورت ہو تو اس کے درمیان (سامنے) کھڑا ہوگا۔

(دیکھئے الہدایہ ج ۱ ص ۱۸۱ کتاب الصلوۃ باب الجنائز)

امام صاحب کے پاس سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی ہے مگر مروجہ تقلیدی فقہ اس فتویٰ کے خلاف ہے۔

مسئلہ ۲: امام ابوحنیفہ کے نزدیک زمیندار کو اس شرط پر اپنی زمین دینا کہ وہ ایک تہائی یا ایک چوتھائی حصہ لے یا دے تو باطل ہے۔ (دیکھئے الہدایہ ۲/۴۲۴ کتاب المزارعۃ)

جبکہ مروجہ تقلیدی عمل وفتویٰ اس کے خلاف ہے۔

مسئلہ ۳: امام ابوحنیفہ کے نزدیک مفقود الخبر کی بیوی ایک سو بیس (۱۲۰) سال انتظار کرے۔

(دیکھئے الہدایہ ۱/۶۲۳ کتاب المفقود)

جبکہ قدیم وجدید تقلید کے دعویداروں کا فتویٰ اس کے خلاف ہے۔

مسئلہ ۴: امام ابوحنیفہ کے نزدیک انڈا بیچنا جائز نہیں ہے۔

(دیکھئے الہدایہ ۲/۵۴ کتاب البیوع باب البیع الفاسد)

جبکہ تقلیدی فتویٰ اس قول کے خلاف ہے۔

مسئلہ ۵: پرانے حنفیوں (جن میں امام صاحب خود بخود شامل ہیں) کے نزدیک اذان، حج، امامت، تعلیمِ قرآن اور تعلیمِ فقہ پر اجرت لینا جائز نہیں ہے۔

(دیکھئے الہدایہ ۲/۳۰۳ کتاب الاجارۃ وغیرہ)

جبکہ ہمارے زمانے میں تمام آلِ تقلید اس فتویٰ کے خلاف ہیں۔

دیوبندیوں کے مفتی کفایت اللہ دہلوی سے کسی نے پوچھا:

"اہل حدیث جن کو ہم لوگ غیر مقلد بھی کہتے ہیں مسلمان ہیں یا نہیں؟ اور وہ اہل سنت والجماعۃ میں داخل ہیں یا نہیں۔ اوران سے نکاح شادی کا معاملہ کرنا درست ہے یا نہیں؟"

کفایت اللہ دہلوی صاحب نے جواب دیا:

"ہاں اہل حدیث مسلمان ہیں اور اہل سنت والجماعت میں داخل ہیں۔ ان سے شادی بیاہ کا معاملہ کرنا درست ہے محض ترک تقلید سے اسلام میں فرق نہیں پڑتا اور نہ اہل سنت والجماعۃ سے تارک تقلید باہر ہوتا ہے۔ فقط" (کفایت المفتی ج۱ص ۳۲۵ جواب نمبر ۳۷۰)

امام شافعی رحمہ اللہ نے لوگوں کو اپنی اور دوسروں کی تقلید سے منع فرمایا تھا۔

دیکھئے کتاب الام للمزنی (ص ۱) اور آداب الشافعی لابن ابی حاتم (ص ۵۱ وسندہ حسن)

امام احمد بن حنبل نے امام ابوداود سے فرمایا: اپنے دین میں ان میں سے کسی ایک کی بھی تقلید نہ کر... (مسائل ابی داود ص ۲۷۷، میری کتاب: دین میں تقلید کا مسئلہ ص ۳۸)

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اماموں نے مجتہدین کو تقلید سے منع کیا تھا نہ کہ عوام کو۔!

عرض ہے کہ یہ بات کئی وجہ سے مردود ہے:

۱: مجتہد تو اُسے کہتے ہیں جو تقلید نہیں کرتا بلکہ اجتہاد کرتا ہے۔ ماسٹر امین اوکاڑوی دیوبندی نے لکھا ہے کہ "اہل سنت کا اتفاق ہے کہ اجتہادی مسائل میں مجتہد پر اجتہاد واجب ہے..." (تجلیات صفدر ج۴ص ۳۰۰)

جس پر تقلید حرام اور اجتہاد واجب ہے، اُسے تقلید سے منع کرنا تحصیلِ حاصل اور بے سود ہے۔

۲: اماموں سے یہ بات قطعاً ثابت نہیں کہ عوام تو تقلید کریں اور صرف مجتہدین اجتہاد کریں۔

۳: حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا:

بلکہ ان (اماموں) سے اللہ راضی ہو، یہ ثابت ہے کہ انھوں نے لوگوں کو اپنی تقلید سے منع فرمایا تھا... (مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ ج ۲۰ ص ۱۰، ماہنامہ الحدیث حضرو: ۵۵ ص ۲)

اس قول میں ''الناس''یعنی لوگوں سے مراد عوام ہیں جیسا کہ ظاہر ہے۔معلوم ہوا کہ سائل کا پہلا اعتراض اور اس پر تقلیدی مفتیوں کا جواب دونوں مردود ہیں۔

۲: اہلِ حدیث کا یہ موقف ہے کہ دُبر (یا قُبل) سے ہوا خارج ہونے کے ساتھ وضوٹوٹ جاتا ہے جیسا کہ راقم الحروف نے کئی سال پہلے ایک سوال کے جواب میں لکھا تھا:

''ان احادیث سے معلوم ہوا کہ انسان کی ہوا نکلنے کے ساتھ اس کا وضوء فوراً ٹوٹ جاتا ہے چاہے یہ ہوا آواز سے نکلے یا بے آواز نکلے۔ چاہے بدبو آئے یا نہ آئے، چاہے معمولی پھسکی ہو یا بڑا پاد، چاہے دُبر سے نکلے یا قُبل سے، ان سب حالتوں میں یقیناً وضوء ٹوٹ جاتا ہے اور یہی اہلِ حدیث کا مسلک ہے۔'' (ماہنامہ الحدیث:۲ص۲۹، جولائی ۲۰۰۴ء)

معلوم ہوا کہ معترض سائل نے اہلِ حدیث پر جو الزام لگایا ہے وہ غلط ہے۔

اہلِ حدیث کے نزدیک نیند سے وضوٹوٹ جاتا ہے۔ دیکھئے سنن الترمذی (۳۵۳۵ وقال: ''حسن صحیح'') اور میری کتاب ''مختصر صحیح نمازِ نبوی'' (طبع سوم ص ۸ فقرہ:۱۳)

۳: آٹھ رکعات تراویح کے سنت ہونے کا اعتراف حنفی اور دیوبندی ''علماء'' نے بھی کر رکھا ہے مثلاً ابن ہمام نے کہا:

اس سب کا حاصل یہ ہے کہ قیامِ رمضان گیارہ رکعات مع وتر جماعت کے ساتھ سنت ہے۔

(فتح القدیر ج۱ص۴۰۷، میری کتاب: تعدادِ رکعاتِ قیامِ رمضان کا تحقیقی جائزہ ص ۱۰۸)

ابن نجیم مصری نے ابن ہمام حنفی سے بطورِ اقرار نقل کیا کہ ''پس اس طرح ہمارے مشائخ کے اصول پر ان میں سے آٹھ (رکعتیں) مسنون اور بارہ مستحب ہو جاتی ہیں۔''

(البحر الرائق ج۲ص۶۷)

طحطاوی نے کہا: کیونکہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بیس نہیں پڑھیں بلکہ آٹھ پڑھی ہیں۔

(حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار ج۱ص ۲۹۵)

خلیل احمد سہارنپوری دیوبندی نے اعلان کیا:

''اور سنت مؤکدہ ہونا تراویح کا آٹھ رکعت تو بالاتفاق ہے اگر خلاف ہے تو بارہ میں ہے''

(براہین قاطعہ ص ۱۹۵)

تفصیل کے لئے دیکھئے تعدادِ رکعات (ص ۱۰۷۔۱۱۱)

یہ کہنا کہ "سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں حد سے تجاوز کیا ہے۔" معترض سائل کا جھوٹ اور بہتان ہے جس کا حساب اسے اللہ تعالیٰ کے دربار میں دینا ہوگا۔ ان شاء اللہ

ہم اعلان کرتے ہیں کہ "ہم تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کو عدول اور اپنا محبوب مانتے ہیں۔ تمام صحابہ کو حزب اللہ اور اولیاء اللہ سمجھتے ہیں۔ ان کے ساتھ محبت کو جزوِ ایمان سمجھتے ہیں۔ جو ان سے بغض رکھتا ہے ہم اس سے بغض رکھتے ہیں۔"

(دیکھئے میری کتاب: جنت کا راستہ ص ۴، مطبوعہ ۱۴۱۵ھ، علمی مقالات ج ا ص ۲۷)

سیدنا عمر الفاروق خلیفہ راشد رضی اللہ عنہ تو جلیل القدر صحابی اور قطعاً جنتی ہیں لہٰذا اُن سے محبت کرنا اور اُن کا احترام کرنا ہمارا جزوِ ایمان ہے۔ اے اللہ! سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی محبت پر ہمیں زندہ رکھ اور اسی عقیدے پر ہمارا خاتمہ فرما۔ آمین

یہ کہنا کہ "آٹھ رکعات تراویح کو صحیح مانتے ہیں" کوئی عیب والی بات نہیں ہے کیونکہ آٹھ رکعات کا ثبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے بھی ثابت ہے۔

انور شاہ کشمیری دیوبندی نے کہا: اور اسے تسلیم کئے بغیر کوئی چھٹکارا نہیں ہے کہ آپ علیہ السلام کی تراویح آٹھ رکعات تھی... الخ (العرف الشذی ج ا ص ۱۶۶، تعدادِ رکعات ص ۱۱۰)

نیز دیکھئے صحیح بخاری (ج ا ص ۲۶۹ ح ۲۰۱۳، عمدۃ القاری ج ۱۱ ص ۱۲۸، تعدادِ رکعات ص ۱۵)

سیدنا امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے سیدنا اُبی بن کعب اور سیدنا تمیم الداری رضی اللہ عنہما کو حکم دیا کہ لوگوں کو گیارہ رکعات پڑھائیں۔ الخ

(موطأ امام مالک ج ا ص ۱۱۴، آثار السنن ص ۲۵۰ ح ۷۷۵ وقال: واسنادہ صحیح)

اس فاروقی حکم والی روایت کے بارے میں نیموی تقلیدی نے کہا: اور اس کی سند صحیح ہے۔

(آثار السنن دوسرا نسخہ ص ۳۹۲)

باقی بارہ یا اس سے زیادہ رکعات کے بارے میں عرض ہے کہ یہ رکعتیں نہ تو رسول

اللہ ﷺ سے باسند صحیح ثابت ہیں اور نہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے قولاً یا فعلاً ثابت ہیں لہٰذا ہم انھیں سنت نہیں مانتے۔ رہے نوافل تو عرض ہے کہ نوافل پر کوئی پابندی نہیں، جس کی مرضی ہو بیس پڑھے اور جس کی مرضی ہو چالیس پڑھے لیکن یاد رہے کہ سنت گیارہ رکعات ہی ہیں اور اسی پر اہلِ حدیث کا عمل ہے۔ والحمد للہ

سائل کا یہ کہنا کہ ''کیا یہ لوگ (سیدنا) عمر رضی اللہ عنہ سے زیادہ احادیث کو جاننے والے ہیں؟'' تو عرض ہے کہ ہرگز نہیں، حاشا و کلا، ہمارا یہ دعویٰ ہرگز نہیں بلکہ ہم تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی عزت و تکریم اور آپ سے محبت جزوِ ایمان سمجھتے ہیں۔

۴: منی کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ حنفیوں کے چچازاد بھائی شوافع اسے پاک سمجھتے ہیں جیسا کہ محمد تقی عثمانی دیوبندی نے کہا:

''منی کی نجاست و طہارت کے بارے میں اختلاف ہے، اس میں حضرات صحابہ کے دَور سے اختلاف چلا آرہا ہے، صحابۂ کرام میں سے حضرت ابن عمرؓ اور ابن عباسؓ اور ائمہ میں سے امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک منی طاہر ہے...'' (درسِ ترمذی ج ا ص ۳۴۶)

طاہر پاک کو کہتے ہیں۔ یاد رہے کہ ہمارے نزدیک منی ناپاک ہے جیسا کہ میں نے کئی سال پہلے ایک سوال کے جواب میں لکھا تھا، یہ سوال و جواب درج ذیل ہیں:

سوال ایک مسئلہ جو بریلوی و دیوبندی حضرات بڑا اچھالتے ہیں کہ ''اہلحدیث کے نزدیک منی پاک ہے۔'' منی کے بارے میں مسلکِ اہلِ حدیث واضح فرمائیں اور دلائل بھی ذکر کریں؟ (ایک سائل)

الجواب منی کے بارے میں... محمد رئیس ندوی لکھتے ہیں:

''ہم کہتے ہیں کہ فرقہ بریلویہ اور فرقہ دیوبندیہ کے پیران پیر شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے کہا:

''وھو (أي المني) طاھر في أشھر الروایتین'' یعنی ہمارے مذہب میں مشہور ترین روایت کے مطابق منی پاک ہے۔ (غنیۃ الطالبین مترجم ص ۷۰)

اور حنبلی مذہب کی کتاب الانصاف فی معرفۃ الراجح من الخلاف میں صراحت ہے کہ

"ومني الآدمي طاهر هذا المذهب مطلقًا و عليه جماهير الأصحاب إلخ"
یعنی حنبلی مذہب میں مطلقاً آدمی کی منی طاہر ہے اور جمہور اصحاب کا یہی مذہب ہے
(الانصاف فی معرفۃ الراجح من الخلاف ۱/۳۴۰۔۳۴۱)

امام نووی نے کہا: "وذهب كثير إلى أن المني طاهر روي ذلك عن علي بن أبي طالب وسعد بن أبي وقاص وابن عمر وعائشة وداود وأحمد في أصح الروايتين وهو مذهب الشافعي و أصحاب الحديث ..."
یعنی بہت سارے اہل علم منی کو طاہر کہتے ہیں حضرت علی مرتضٰی وسعد بن ابی وقاص وابن عمر وعائشہ جیسے صحابہ سے یہی مروی ہے اور امام داود ظاہری کا یہی مسلک ہے امام احمد کی صحیح ترین روایت یہی ہے کہ منی پاک ہے امام شافعی واہل حدیث کا یہی مذہب ہے کہ منی پاک ہے (شرح مسلم للنووی باب حکم المنی ج ا ص ۱۴۰ والمجموع للنووی ابواب الطہارۃ)

بعض علمائے اہل حدیث طہارت منی کے قائل ہیں اور ان کے اختیار کردہ موقف کی موافقت خلیفہ راشد علی مرتضٰی اور متعدد صحابہ وتابعین وائمہ دین کیے ہوئے ہیں انھوں نے اپنی ذاتی تحقیق سے اسی موقف کو صحیح سمجھا ہے لیکن امام شوکانی ونواب صدیق اور متعدد محقق سلفی علماء نجاست منی ہی کے قائل ہیں

(نیل الاوطار ج ا ص ۶۷، وتحفۃ الاحوذی شرح ترمذی ج ا ص ۱۱۴۔۱۱۵ ومرعاۃ شرح مشکوۃ کتاب الطہارۃ ج ۲ ص ۱۹۶ وغایۃ المقصود ج ۱)

دریں صورت فرقہ بریلویہ ودیوبندیہ کا علی الاطلاق اسے غیر مقلدوں کا مذہب قرار دینا محض تقلید پرستی والی تلبیس کاری وکذب بیانی ہے پھر جو مسئلہ صحابہ سے لے کر فرقہ دیوبندیہ وبریلویہ کی ولادت سے پہلے اہل علم کے یہاں مختلف فیہ رہا، اس میں اپنی تحقیق کے مطابق اسلاف کے کسی بھی موقف کو اختیار کرنے والوں کو نئے مذہب کی طرف دعوت دینے والا قرار دینا جبکہ اسے مذہب کی دعوت قرار دینے والے بذات خود چودھویں صدی میں پیدا ہوئے کون سا طریقہ ہے؟

ہم بھی اس مسئلہ میں امام شوکانی و عام محقق سلفی علماء سے متفق ہیں کہ منی ناپاک ونجس ہے۔" (ضمیر کا بحران ص ۳۰۹، ۳۱۰)

میں بھی یہی کہتا ہوں کہ منی ناپاک اور نجس ہے۔ اسے پاک کہنا غلط ہے یاد رہے کہ جماہیر الاصحاب سے امام احمد کے شاگرد اور حنابلہ مراد ہیں۔ اور ندوی صاحب کی نقل کردہ عبارات میں مذکور صحابہ کرام میں سے کسی صحابی سے بھی طہارت منی کا قول ثابت نہیں ہے۔

یہ سوال و جواب آپ لوگوں کی خدمت میں دوبارہ پیش کر دیا گیا ہے لہٰذا جھوٹے پروپیگنڈے کر کے اہلِ حدیث کو بدنام کرنے کی کوشش نہ کریں۔

۵: سائل کا قول "وہ فاتحہ خلف الامام بھی پڑھتے ہیں۔" ہمارے خلاف نہیں بلکہ ہمارے عمل کی ترجمانی ہے جس پر ہم دلائل و براہین اور بصیرت کے ساتھ عمل پیرا ہیں۔ والحمدللہ

ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ اور قرآن میں سے جو میسر ہو پڑھو۔ (سورۃ المزمل: ۲۰)

اس آیتِ کریمہ سے ابوبکر الجصاص اور ملا مرغینانی نے نماز میں قراءت کی فرضیت پر استدلال کیا ہے۔ دیکھئے احکام القرآن (ج ۵ ص ۳۶۷) اور الہدایہ (اولین ج ۱ ص ۹۸)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لَا صَلٰوةَ لِمَنْ لَّمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ .))

اس کی نماز نہیں ہوتی جو سورۂ فاتحہ نہ پڑھے۔ (صحیح بخاری: ۷۵۶، صحیح مسلم: ۳۹۴)

تفصیل کے لئے دیکھئے امام بخاری کی کتاب جزء القراءۃ (تحقیقی نصر الباری) اور میری کتاب: "الکواکب الدریہ فی وجوب الفاتحہ خلف الامام فی الصلوٰۃ الجہریہ" والحمدللہ

ائمۂ کرام میں سے امام الشافعی رحمہ اللہ نے فرمایا:

کسی آدمی کی نماز جائز نہیں ہے جب تک وہ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھ لے۔ چاہے وہ امام ہو یا مقتدی، امام جہری قراءت کر رہا ہو یا سری، مقتدی پر لازم ہے کہ سری اور جہری (دونوں) نمازوں میں سورۂ فاتحہ پڑھے۔ (معرفۃ السنن والآثار للبیہقی ۲/ ۵۸ ح ۹۲۸ وسندہ صحیح)

اس قول کے راوی امام ربیع بن سلیمان المرادی رحمہ اللہ نے فرمایا:

"یہ (امام) شافعی کا آخری قول ہے جو اُن سے سنا گیا۔" (ایضاً ص ۵۸)

امام اوزاعی رحمہ اللہ نے فرمایا:

امام پر یہ حق ہے کہ وہ نماز شروع کرتے وقت تکبیرِ اولیٰ کے بعد سکتہ کرے اور سورۂ فاتحہ کی قراءت کے بعد ایک سکتہ کرے تاکہ اس کے پیچھے نماز پڑھنے والے سورۂ فاتحہ پڑھ لیں اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو وہ (مقتدی) اسی کے ساتھ سورۂ فاتحہ پڑھے اور جلدی پڑھ کر ختم کرے، پھر کان لگا کر سنے۔ (کتاب القراءۃ للبیہقی ص ۱۰۶ ح ۲۴۷ وسندہ صحیح، نصر الباری ص ۱۱۷)

اتنے دلائل اور عظیم الشان اماموں کے عمل اور اقوال کے باوجود اگر کوئی شخص فاتحہ خلف الامام کے مسئلے میں اہلِ حدیث کو مطعون قرار دیتا ہے تو وہ اپنے ایمان کی فکر کرے۔!

فاتحہ خلف الامام پر بحث کرنے سے پہلے میری دونوں کتابوں نصر الباری اور الکواکب الدریہ کا مکمل جواب ضروری ہے۔

۶: اہلِ حدیث کے نزدیک دو شرطوں کے ساتھ جرابوں پر مسح جائز ہے:

اول: ثخینین (جرابیں موٹی ہوں)

دوم: لا یشفان (ان جرابوں میں جسم نظر نہ آئے)

یہ شرائط قرآن و حدیث سے نہیں بلکہ بعض سلف صالحین سے ثابت ہیں اور ہم کتاب و سنت کو سلف صالحین کے فہم سے ہی سمجھتے ہیں لہٰذا ہمیں ان دونوں شرطوں کا اقرار ہے۔

یاد رہے کہ بعض دیوبندیوں کا یہ شرط لگانا کہ بغیر جوتی کے بارہ ہزار قدم چلنا ممکن ہو۔(!) اس قسم کی تمام شرائط بے دلیل اور بے ثبوت ہونے کی وجہ سے مردود ہیں۔

فقہ حنفی کی بعض کتابوں میں مذکور ہے کہ امام ابوحنیفہ نے (جرابوں کے مسئلے میں) صاحبین کے قول پر رجوع کر لیا تھا (کہ جرابوں پر مسح جائز ہے) اور اسی پر فتویٰ ہے۔

دیکھئے الہدایہ (ج ۱ ص ۶۱)

امام ابوحنیفہ کی ولادت سے پہلے امام سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے پیشاب کیا پھر وضو کیا اور جرابوں پر مسح کیا۔ (دیکھئے امام ابن المنذر کی کتاب الاوسط ج ۱ ص ۴۶۲ وسندہ صحیح)

دیگر دلائل و آثار کے لئے دیکھئے میری کتاب "ہدیۃ المسلمین" (حدیث نمبر ۴)

امام ترمذی رحمہ اللہ نے فرمایا: سفیان ثوری، ابن المبارک، شافعی، احمد اور اسحاق (بن راہویہ) جرابوں پر مسح کے قائل تھے۔ بشرطیکہ وہ موٹی ہوں۔ دیکھئے سنن الترمذی (ح ۹۹)

جرابوں پر مسح درج ذیل صحابہ وتابعین سے ثابت ہے:

سیدنا علی رضی اللہ عنہ، سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ، سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ، سیدنا عقبہ بن عمرو رضی اللہ عنہ، سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہ۔ ابراہیم نخعی رحمہ اللہ، سعید بن جبیر رحمہ اللہ اور عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ۔ دیکھئے علمی مقالات (ج ۱ ص ۳۷، ۳۸)

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ جرابوں پر مسح کرنے والے کے پیچھے اُس کی نماز نہیں ہوتی تو اُسے اپنے ایمان کی خیر منانی چاہئے۔ کیا سیدنا علی رضی اللہ عنہ، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعینِ عظام رحمہم اللہ اجمعین کے پیچھے بھی اس شخص کی نماز نہیں ہوتی؟!!

بعض مسائل واحکام میں تحقیقی اختلاف کی وجہ سے نماز نہ پڑھنے کا فتویٰ لگانا ہر لحاظ سے باطل ہے۔

۷: اس وقت حنفیوں کی جو کتبِ فقہ ہیں مثلاً قدوری، ہدایہ، فتاویٰ شامی، البحر الرائق، منیۃ المصلی، نور الایضاح اور فتاویٰ عالمگیری وغیرہ، ان میں سے ایک کتاب بھی باسند صحیح امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے ثابت نہیں ہے اور اس پر ناراض ہونے کی کیا بات ہے؟

محمد بن الحسن بن فرقد الشیبانی کی مروّجہ کتابیں بھی ابن فرقد سے باسند صحیح ثابت نہیں ہیں۔ دیکھئے ماہنامہ الحدیث حضرو: ۵۵ ص ۳۶

اگر کوئی شخص ان مروّجہ کتابوں کو ثابت مانتا ہے تو اصولِ حدیث اور اسماء الرجال کو مدِنظر رکھتے ہوئے ان کتابوں کی صحیح سند پیش کرے۔!

۸: عہدِ قدیم میں امام ابوحنیفہ کے بارے میں محدثین کرام کا آپس میں اختلاف تھا، جمہور ایک طرف تھے اور بعض دوسری طرف تھے لیکن ہمارے دور میں اہلِ حدیث تو امام ابوحنیفہ کو عالم سمجھتے اور مانتے ہیں مثلاً ہمارے استاذ مولانا ابو محمد بدیع الدین شاہ الراشدی السندھی رحمہ اللہ نے امام ابوحنیفہ کو عزت واحترام کے ساتھ ''امام صاحب'' لکھا ہے۔

دیکھئے تنقید سدید بر رسالہ اجتہاد وتقلید (ص ۲۴)

اگر کوئی پوچھے کہ کیا امام ابوحنیفہ پر جبریل علیہ السلام نازل ہوتے تھے؟ تو اس کا آسان جواب یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ پر جبریل علیہ السلام نازل نہیں ہوتے تھے۔

ائمہ ثلاثہ کو ماننے یا نہ ماننے کے بارے میں فقرہ نمبر ا کا جواب دوبارہ پڑھ لیں۔

۹: سائل نے عہدِ حاضر کے اہلِ حدیث پر یہ الزام لگایا ہے کہ ''یہ لوگ امام ابوحنیفہ کو گمراہ سمجھتے ہیں'' اس کا جواب یہ ہے کہ یہ الزام باطل ہے جس کا سائل نے کوئی حوالہ اور ثبوت پیش نہیں کیا۔

رہا تقلید کو گناہ کبیرہ سمجھنا تو عرض ہے کہ سرفراز خان صفدر دیوبندی تقلیدی نے کہا:

''ان آیات کریمات میں جس تقلید کی تردید کی گئی ہے وہ ایسی تقلید ہے جو اللہ تعالیٰ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حکم کے مدمقابل ہو ایسی تقلید کے حرام شرک، مذموم اور قبیح ہونے میں کیا شبہ ہے؟ اور اہل اسلام اور اہل علم میں کون ایسی تقلید کو جائز قرار دیتا ہے؟ اور ایسے مقلدوں کو کون مسلمان کہتا اور حق پر سمجھتا ہے...''

(الکلام المفید فی اثبات التقلید ص ۲۹۸ طبع ۱۴۱۳ھ)

سرفراز خان صفدر نے اپنے اشرفعلی تھانوی سے نقل کیا کہ ''بعض مقلدین نے اپنے امام کو معصوم عن الخطأ ومصیب وجوبا مفروض الاطاعت تصور کر کے عزم بالجزم کیا کہ خواہ کیسی ہی حدیث صحیح مخالف قول امام کے ہو اور مستند قول امام کا بجز قیاس امر دیگر نہ ہو پھر بھی بہت سے علل اور خلل حدیث میں پیدا کر کے یا اس کی تاویل بعید کر کے حدیث کو رد کر دیں گے ایسی تقلید حرام اور مصداق قولہ تعالیٰ اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ الآیہ اور خلاف وصیت ائمہ مرحومین ہے'' (الکلام المفید ص ۳۰۵ بحوالہ فتاویٰ امدادیہ ج ۴ ص ۸۸)

سرفراز خان صفدر نے مزید کہا:

''کوئی بدبخت اور ضدی مقلد دل میں یہ ٹھان لے کہ میرے امام کے قول کے خلاف اگر قرآن وحدیث سے بھی کوئی دلیل قائم ہو جائے تو میں اپنے مذہب کو نہیں چھوڑوں گا تو وہ

مشرک ہے ہم بھی کہتے ہیں کہ لا شك فیه ...'' (الکلام المفید ص ۳۱۰)

بس یہی وہ تقلید ہے جسے اہلِ حدیث اپنی تحقیق کے مطابق گناہ کبیرہ (یعنی شرک) کہتے ہیں اور اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے؟!

۱۰: امامت النساء للنساء کے سلسلے میں عرض ہے کہ ریطہ الحنفیہ رحمہا اللہ نے فرمایا:

ہمیں عائشہ (رضی اللہ عنہا) نے فرض نماز پڑھائی تو آپ عورتوں کے درمیان کھڑی ہوئیں۔

(سنن الدارقطنی ۱/۴۰۴ ح ۱۴۲۹، وسندہ حسن، آثار السنن: ۵۱۴ وقال النیموی: ''واسنادہ صحیح'')

ایک حدیث میں آیا ہے کہ بے شک رسول اللہ ﷺ نے ام ورقہ (رضی اللہ عنہا) کو اس کی اجازت دی تھی کہ اُن کے لئے اذان اور اقامت کہی جائے اور وہ اپنی عورتوں کی امامت کریں۔ (سنن الدارقطنی ج ۱ ص ۲۷۹ ح ۱۰۷۱، وسندہ حسن)

مشہور تابعی امام شعبی رحمہ اللہ نے فرمایا: عورت عورتوں کو رمضان کی نماز پڑھائے (تو) وہ اُن کے ساتھ صف میں کھڑی ہو جائے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ۲/۸۹ ح ۴۹۵۵ وسندہ صحیح، عنعنہ ہشیم عن حصین محمولۃ علی السماع، انظر شرح علل الترمذی لابن رجب ۲/۵۶۲)

مشہور ثقہ تبع تابعی ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا: عورت جب عورتوں کی امامت کرائے گی تو وہ آگے کھڑی نہیں ہوگی بلکہ اُن کے برابر (صف میں ہی) کھڑی ہو کر فرض اور نفل پڑھائے گی۔ (مصنف عبدالرزاق ۳/۱۴۰ ح ۵۰۸۰ وسندہ صحیح)

امام معمر بن راشد رحمہ اللہ نے فرمایا: عورت عورتوں کو رمضان میں نماز پڑھائے اور وہ اُن کے ساتھ صف میں کھڑی ہو۔ (مصنف عبدالرزاق ۳/۱۴۰ ح ۵۰۸۵ وسندہ صحیح)

ان احادیث و آثار سے ثابت ہوا کہ عورت عورتوں کی امامت کر سکتی ہے۔

یاد رہے کہ عورت مردوں کی امامت نہیں کر سکتی کیونکہ اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

دیکھئے میری کتاب ''تحقیقی، اصلاحی اور علمی مقالات'' (ج ۱ ص ۲۴۷)

معترض کا یہ کہنا: ''حتیٰ کہ اقتداء الرجال خلف النساء بھی درست ہے'' اہلِ حدیث پر بہتان ہے جس سے اہلِ حدیث بری ہیں۔

۱۱: یہ بات بالکل سچ اور حق ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی کسی صحیح حدیث میں "وضع الیدین تحت السرہ" یعنی نماز میں ناف سے نیچے ہاتھ باندھنا ثابت نہیں ہے۔

دیکھئے میری کتاب "نماز میں ہاتھ باندھنے کا حکم اور مقام"

بلکہ دوسری طرف یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز میں اسے (یعنی ہاتھ کو) سینے پر رکھا تھا۔ دیکھئے مسند الامام احمد (ج ۵ ص ۲۲۶ ح ۲۲۳۱۳ وسندہ حسن محفوظ)

امام سعید بن جبیر تابعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ نماز میں ناف سے اوپر ہاتھ باندھنے چاہئیں۔

(امالی عبدالرزاق/ الفوائد لابن مندہ ۲/ ۲۳۴ ح ۱۸۹۹، وسندہ صحیح)

محمد تقی عثمانی دیوبندی نے کہا: "امام شافعیؒ کے نزدیک ایک روایت میں تحت الصدر اور دوسری روایت میں علی الصدر ہاتھ باندھنا مسنون ہے" (درس ترمذی ج ۲ ص ۱۹)

۱۲: نماز میں رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد اُٹھتے وقت رفع یدین کرنا رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے، یہ سنتِ متواترہ غیر منسوخہ اور غیر متروکہ ہے۔ تفصیلی دلائل کے لئے میری مشہور کتاب "نور العینین فی مسئلۃ رفع الیدین" کا مطالعہ کریں۔

فی الحال مسئلہ سمجھانے کے لئے چند دلائل پیشِ خدمت ہیں:

اول: سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ (جلیل القدر صحابی اور نیک مرد) سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا، آپ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو دونوں ہاتھ اپنے کندھوں تک اٹھاتے تھے اور رکوع کی تکبیر کے وقت بھی رفع یدین کرتے تھے اور جب رکوع سے سر اُٹھاتے تو اسی طرح رفع یدین کرتے تھے لیکن سجدہ میں ایسا نہیں کرتے تھے۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۰۲ ح ۷۳۶)

دوم: سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کے راوی امام سالم بن عبداللہ بن عمر رحمہ اللہ (فقیہ تابعی) فرماتے ہیں کہ میرے ابا بھی ایسا ہی کرتے تھے یعنی سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ شروع نماز، رکوع کے وقت اور رکوع سے اُٹھتے وقت رفع یدین کرتے تھے۔

(دیکھئے حدیث السراج ج ۲ ص ۳۵ ح ۱۱۵، وسندہ صحیح ولہ شاہد صحیح عند البخاری فی صحیحہ: ۷۳۹ وسندہ صحیح مرفوع)

سوم: سالم بن عبداللہ رحمہ اللہ سے اس حدیث کے ایک راوی امام سلیمان (بن ابی سلیمان) الشیبانی رحمہ اللہ نے فرمایا: میں نے دیکھا، سالم بن عبداللہ جب نماز شروع کرتے تو رفع یدین کرتے، جب رکوع کرتے تو رفع یدین کرتے اور جب رکوع سے سر اُٹھاتے تو رفع یدین کرتے تھے۔ (حدیث السراج ۲/۳۴، ۳۵ ح ۱۱۵، وسندہ صحیح)

چہارم: سالم بن عبداللہ تابعی کے علاوہ امام محمد بن سیرین، ابوقلابہ، وہب بن منبہ، قاسم بن محمد، عطاء، مکحول، نعمان بن ابی عیاش، طاوس اور حسن بصری (تابعین) بھی رفع یدین کرتے تھے۔ دیکھئے میری کتاب نور العینین (ص ۱۷۴)

ان آثار کی سندیں صحیح یا حسن لذاتہ ہیں۔

پنجم: تبع تابعین میں سے امام مالک (سنن الترمذی مع عارضۃ الاحوذی ۲/۵۷ ح ۲۵۶، تاریخ دمشق لابن عساکر ج ۵۵ ص ۱۳۴، وسندہ حسن) امام اوزاعی (الطبری بحوالہ التمہید ۹/۲۲۶ وسند الطبری صحیح) اور معتمر بن سلیمان التیمی (جزء رفع الیدین للبخاری: ۱۲۱، وسندہ صحیح) وغیرہم ایک جماعت سے رکوع سے پہلے اور بعد والا رفع یدین ثابت ہے۔

ششم: تبع تابعین کے بعد امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام یحییٰ بن سعید القطان، امام عبدالرحمٰن بن مہدی اور اسماعیل بن علیہ وغیرہم رفع یدین قبل الرکوع وبعدہ پر عامل تھے۔

(دیکھئے جزء رفع الیدین للبخاری: ۱۲۱، اور کتاب الام للشافعی ج ۱ ص ۱۰۳، ۱۰۴، من قولہ وأمرہ)

بعد میں تو امام بخاری جیسے کبار علماء نے اس عظیم الشان مسئلے پر کتابیں لکھی ہیں۔

ثابت ہوا کہ رفع یدین کی سنتِ متواترہ پر عمل رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں، صحابہ کرام کے زمانے میں، تابعین عظام کے زمانے میں، تبع تابعین کے دور میں اور تیسری صدی ہجری میں مسلسل جاری وساری رہا ہے لہٰذا اس پیارے عمل کو منسوخ اور متروک سمجھنا یا سرکش گھوڑوں کی دُموں سے تشبیہ دینا غلط ہے۔

رفع یدین کے اس مقدس عمل کی فضیلت میں ایک حدیث بھی مروی ہے:

سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ صحابی نے فرمایا: نماز میں جو شخص اشارہ کرتا ہے، اسے ہر اشارے

کے بدلے میں ایک انگلی پر ایک نیکی یا درجہ ملتا ہے۔
(المعجم الکبیر للطبرانی ج ۱۷ ص ۲۹۷ ح ۸۱۹ وسندہ حسن، مجمع الزوائد للہیثمی ج ۲ ص ۱۰۳، وقال: ''واسنادہ حسن'')

امام اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ مشہور ثقہ فقیہ نے اس موقوف حدیث سے رکوع سے پہلے اور بعد والا رفع یدین مراد لیا ہے۔
دیکھئے معرفۃ السنن والآثار للبیہقی (قلمی ج ۱ ص ۲۲۵، مطبوع ج ۱ ص ۵۶۲ ح ۷۹۲ ب)

ان دلائلِ صحیحہ اور حججِ قاہرہ کی وجہ سے کسی اہلِ حدیث نے اگر یہ کہہ دیا ہے کہ رفع یدین کے بغیر نماز سنت کے مطابق نہیں ہے لہٰذا درست نہیں ہے اور رفع یدین کے بغیر والی نماز کا اعادہ کر لینا چاہئے تو اس میں ناراض ہونے والی کیا بات ہے؟

مشہور متبعِ سنت صحابی جب کسی شخص کو دیکھتے کہ رکوع سے پہلے اور بعد رفع یدین نہیں کرتا تو اسے کنکریوں سے مارتے تھے۔ دیکھئے جزء رفع الیدین (۱۵، وسندہ صحیح)

۱۳: معترض سائل کا یہ اعتراض تو اہلِ حدیث پر بہتان ہے۔

سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

((من صلّى اثنتي عشرة ركعة في يوم وليلة بني له بهن بيت في الجنة .))

جس شخص نے دن رات میں بارہ (نفل) رکعتیں پڑھیں، اُس کے لئے جنت میں گھر بنا دیا گیا۔

سیدہ اُم حبیبہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: میں نے جب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسے سنا ہے، ان رکعتوں کو کبھی نہیں چھوڑا۔

عنبسہ بن ابی سفیان رحمہ اللہ (تابعی) نے فرمایا: میں نے جب سے اُم حبیبہ سے اسے سنا ہے، ان رکعتوں کو کبھی نہیں چھوڑا۔

عمرو بن اوس رحمہ اللہ نے فرمایا: میں نے جب سے عنبسہ سے اسے سنا ہے، ان رکعتوں کو کبھی نہیں چھوڑا۔

نعمان بن سالم رحمہ اللہ نے فرمایا: میں نے جب سے عمرو بن اوس سے اسے سنا ہے، ان

رکعتوں کو کبھی نہیں چھوڑا۔

(صحیح مسلم: ۷۲۸، ترقیم دارالسلام: ۱۶۹۴، باب فضل السنن الراتبۃ قبل الفرائض وبعدھن وبیان عددھن)

اتنی عظیم الشان فضیلت اور مسلسل عمل والی روایت کو کوئی سچا اہلِ حدیث ترک نہیں کر سکتا اِلا یہ کہ بعض اوقات کسی شرعی عذر سے انھیں چھوڑ دے مثلاً سفر میں سنتیں نہ پڑھنا وغیرہ

عصرِ حاضر میں نماز کے موضوع پر اہلِ حدیث کی ایک مشہور کتاب ''صلوٰۃ الرسول'' میں حکیم صادق سیالکوٹی رحمہ اللہ نے لکھا ہے: ''رات اور دِن کی موکدہ سنتیں بارہ ہیں''

دیکھئے صلوٰۃ الرسول (مطبوعہ نعمانی کتب خانہ ص۲۸۲، تخریج والانسخہ القول المقبول ص ۵۶۱)

اس صراحت کے باوجود یہ پروپیگنڈا کرنا کہ اہلِ حدیث کے نزدیک ...کوئی سنت ثابت نہیں۔'' صریح جھوٹ اور بہتان ہے۔

۱۴: اہلِ حدیث کے نزدیک صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی تمام مرفوع مسند متصل احادیث صحیح ہیں اور ان کے علاوہ تمام معتبر کتبِ حدیث مثلاً صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن حبان، صحیح ابن الجارود، المستدرک للحاکم، المختارہ للمقدسی، سنن الترمذی، سنن ابی داود، سنن النسائی، سنن ابن ماجہ، موطأ امام مالک، کتاب الام للشافعی، مسند الامام احمد، سنن دارقطنی، السنن الکبریٰ للبیہقی، مصنف ابن ابی شیبہ اور مصنف عبدالرزاق وغیرہ کی وہ تمام احادیثِ مرفوعہ حجت ہیں جن کی سندیں اُصولِ حدیث کی رُو سے صحیح یا حسن (لذاتہ) ہیں۔ والحمدللہ

یہ کہنا کہ اہلِ حدیث صرف صحیح بخاری کو مانتے ہیں، بالکل جھوٹ اور افتراء ہے۔

نیز دیکھئے میری کتاب ''علمی مقالات'' (ج۱ص۱۷۶، ۱۷۷)

اہلِ حدیث یہ نہیں کہتے کہ امام بخاری غیر مقلد تھے بلکہ اہلِ حدیث تو یہ کہتے ہیں کہ امام بخاری مجتہد مطلق تھے، اہلِ حدیث تھے بلکہ اہلِ حدیث کے اماموں میں سے ایک بڑے امام تھے۔ امام بخاری کی تعریف اور دفاع کے لئے دیکھئے میری کتاب ''صحیح بخاری پر اعتراضات کا علمی جائزہ'' (ص۱۰، ۱۱) اور مجموع فتاویٰ لابن تیمیہ (ج۲۰ص۴۰)

باقی معتبر کتبِ حدیث کی صحیح اور حسن روایات کو ہم بسر وچشم قبول کرتے ہیں اور اعلان

کرتے ہیں کہ ان کتابوں کے مصنفین میں سے ایک بھی مقلد نہیں تھا۔
دیکھئے میری کتاب ''دین میں تقلید کا مسئلہ'' (ص ۵۰، ۵۱) اور الکلام المفید فی اثبات التقلید (!!) تصنیف سرفراز خان صفدر دیوبندی (ص ۱۲۷، طبع ۱۴۱۳ھ)

کذاب و مفتری سائل کا یہ کہنا کہ ''اہلِ حدیث کے نزدیک صحیح بخاری کے علاوہ جملہ کتب احادیث مفتریات وتصنعات ہیں'' بالکل جھوٹ اور افتراء ہے جس سے تمام اہلِ حدیث بری ہیں۔

۱۵: اہلِ حدیث کے نزدیک قرآن وحدیث کے دلائل کے ساتھ اگر شرعی عذر مثلاً سفر، حج (یوم عرفہ) اور بارش وغیرہ ہو تو جمع بین الصلوٰتین جائز ومسنون ہے ورنہ نہیں ہے۔
میں نے کئی مہینے پہلے لکھا تھا:
''بعض لوگ شرعی عذر کے بغیر حضر (اپنے گھر، گاؤں اور شہر) میں دو نمازیں جمع کرتے رہتے ہیں، یہ عمل کتاب وسنت سے ثابت نہیں ہے بلکہ سراسر مخالف ہے لہٰذا ایسے امور سے ہمیشہ اجتناب کرنا چاہئے..... وما علینا إلا البلاغ (۱۰/ مئی ۲۰۰۸ء) ''

(ماہنامہ الحدیث: ۵۲ ص ۲۵)

اس اعلان کے باوجود جو شخص ہمارے خلاف پروپیگنڈا کرتا ہے، وہ قیامت کے دن کے لئے جواب سوچ لے۔

۱۶: دیوبندی تبلیغی جماعت والے زکریا دیوبندی صاحب کی غلط عبارات پر تنقید کرنا حد سے تجاوز نہیں بلکہ امر بالمعروف اور النہی عن المنکر کے باب میں سے ہے۔

زکریا صاحب نہ تو نبی تھے اور نہ صحابی، تابعی، تبع تابعی یا امام تھے؟ وہ ایک دیوبندی صوفی تھے جنھوں نے خلیل احمد سہارنپوری دیوبندی کی صوفیانہ بیعت کی تھی۔
دیکھئے سوانح... محمد زکریا، تصنیف ابوالحسن علی ندوی صوفی دیوبندی (ص ۶۲)
ان زکریا صاحب نے بطورِ رضامندی واقرار بعض شرکیہ اشعار کا ترجمہ لکھا تھا:
''رسولِ خدا نگاہِ کرم فرمایئے اے ختم المرسلین رحم فرمایئے...

عاجزوں کی دستگیری، بیکسوں کی مدد فرمایئے اور مخلص عشاق کی دلجوئی و دلداری کیجئے''

(تبلیغی نصاب ص ۸۰۶، فضائل درود ص ۱۲۸)

اِن اشعار میں اللہ تعالیٰ کے بجائے رسول اللہ ﷺ کو مدد اور دستگیری کے لئے پکارا گیا ہے اور رحم کی درخواست کی گئی ہے۔ حالانکہ ایسے عقائد رکھنے والے بریلویوں کے بارے میں دیوبندی حضرات مشرک اور بدعتی کا فتویٰ لگانے سے کبھی نہیں چوکتے۔

زکریا دیوبندی کے بارے میں تفصیلی تحقیق کے لئے میری کتاب اکاذیب آلِ دیوبند (مخطوط ص ۱۳۹۔۱۶۲) کا مطالعہ از حد مفید ہے۔ والحمدللہ

۱۷: اہلِ حدیث کا دعویٰ یہ ہے کہ نمازِ جمعہ سے پہلے، سنت کی کوئی متعین تعداد رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں۔

اس سلسلے میں تقلیدی حضرات جو شبہات پیش کرتے ہیں ان کا جواب درج ذیل ہے:

پہلی روایت: سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ چار رکعات جمعہ سے پہلے پڑھتے تھے اور چار جمعہ کے بعد اور سلام آخری (چوتھی) میں پھیرتے تھے۔'' (معجم طبرانی اوسط بحوالہ نصب الرایہ ج ۲ ص ۲۰۶، حدیث اور اہلحدیث ص ۸۲۳، ۸۲۴)

عرض ہے کہ اس روایت کی سند درج ذیل ہے:

''حدثنا أحمد (ابن الحسين بن نصر الخراساني) قال: حدثنا شباب العصفري قال: حدثنا محمد بن عبدالرحمٰن السهمي قال: حدثنا حصين بن عبدالرحمٰن السلمي عن أبي إسحاق عن عاصم بن ضمرة عن علي'' إلخ

(المعجم الاوسط للطبرانی ج ۲ ص ۳۶۸ ح ۱۶۱۷)

المعجم الاوسط کے علاوہ یہ روایت المعجم لابن الاعرابی (۸۷۴) اور الاثرم کی کتاب میں بھی محمد بن عبدالرحمٰن السہمی کی سند سے موجود ہے۔ دیکھئے فتح الباری (۲/۴۲۶ تحت حدیث ۹۳۷)

زیلعی حنفی نے اسے نصب الرایہ میں نقل کیا ہے مگر اس نقل میں زیلعی یا ناسخین سے نقل در نقل کی کئی غلطیاں ہوئی ہیں مثلاً (۱) ابواسحاق السبیعی کا واسطہ گر گیا ہے۔ (۲) شباب العصفری

کے بجائے سفیان العصفری چھپ گیا ہے۔ (۳) محمد بن عبدالرحمٰن السہمی کے بجائے محمد بن عبدالرحمٰن التیمی لکھا گیا ہے۔

روایتِ مذکورہ کئی وجہ سے ضعیف ہے:

اول: ابواسحاق السبیعی طبقہ ثالثہ کے مدلس تھے۔ دیکھئے طبقات المدلسین (بتحقیقی الفتح المبین ۹۱/۳، ص ۵۸) اور یہ روایت عن سے ہے۔ اُصولِ حدیث کا مشہور مسئلہ ہے کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے علاوہ دوسری کتابوں میں مدلس کی عن والی روایت ضعیف ہوتی ہے۔

مثلاً دیکھئے مقدمۂ نووی ص ۱۸، فتح المغیث ص ۷۷، اور تدریب الراوی ص ۱۴۴، بحوالہ خزائن السنن تصنیف سرفراز خان صفدر دیوبندی (ج ا ص ا)

دوم: محمد بن عبدالرحمٰن السہمی جمہور محدثین کے نزدیک ضعیف راوی ہے۔ حافظ ابن حجر نے اس سہمی کے بارے میں فرمایا: امام بخاری وغیرہ کے نزدیک سہمی ضعیف ہے اور اثرم نے کہا: یہ کمزور حدیث ہے۔ (فتح الباری ۴۲۶/۲)

میری مفصل تحقیق کے لئے دیکھئے ماہنامہ شہادت اسلام آباد (جولائی ۲۰۰۱ء)

سوم: ابواسحاق آخری عمر میں اختلاط کا شکار ہو گئے تھے اور یہ روایت اختلاط سے پہلے کی نہیں ہے۔

دوسری روایت: سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چار رکعات جمعہ سے پہلے پڑھتے تھے اور چار رکعات جمعہ کے بعد...

(مجمع الزوائد ج ۲ ص ۱۹۵، بحوالہ حدیث اور اہلحدیث ص ۸۲۴)

عرض ہے کہ اسے حافظ ہیثمی نے "رواه الطبراني في الكبير" کہہ کر امام طبرانی کی کتاب المعجم الکبیر سے نقل کیا ہے۔

المعجم الکبیر للطبرانی (۱۲۹/۱۲ ح ۱۲۶۷۴) میں یہ روایت "بقية بن الوليد عن مبشر بن عبيد عن الحجاج بن أرطاة عن عطية العوفي عن ابن عباس" کی سند سے موجود ہے اور اسی سند کے ساتھ یہ روایت سنن ابن ماجہ (۱۱۲۹) میں موجود ہے۔ بوصیری نے کہا:

"هذا إسناد مسلسل بالضعفاء، عطية متفق على ضعفه و حجاج مدلس و مبشر بن عبيد كذاب و بقية هو ابن الوليد يدلس تدليس الشيوخ"

یہ سند ضعیف راویوں کے ساتھ مسلسل ہے، عطیہ (العوفی) کے ضعیف ہونے پر (بوصیری کے نزدیک) اتفاق ہے، حجاج (بن ارطاۃ) مدلس ہے اور مبشر بن عبید کذاب (جھوٹا) ہے اور بقیہ بن الولید تدلیسِ شیوخ (یعنی تدلیسِ تسویہ) کرتے تھے۔ (زوائد ابن ماجہ ص ۱۷۵ ح ۳۷۳)

معلوم ہوا کہ یہ روایت مبشر بن عبید کذاب کی وجہ سے موضوع ہے۔

لطیفہ: ظفر احمد تھانوی دیوبندی نے ہیثمی کے کلام پر ضرب تقسیم کرتے ہوئے یہ جھوٹا دعویٰ کر دیا ہے کہ طبرانی کی سند میں حجاج بن ارطاۃ اور عطیہ العوفی کے علاوہ دوسرا کوئی متکلم فیہ راوی نہیں ہے۔ دیکھئے اعلاء السنن (ج ۷ ص ۱۴ ح ۱۷۶۳)

دیوبندی تقلیدی بیچارے کیا کریں؟ ان کے پاس اہلِ حدیث کے خلاف صرف موضوع اور مردود روایتوں کے علاوہ اور کیا ہے؟!

تیسری روایت: سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جمعہ کے دن جو نماز پڑھے وہ چار رکعات جمعہ سے پہلے پڑھے اور چار رکعات جمعہ کے بعد" (النجار بحوالہ کنز العمال ج ۷ ص ۷۴۹، حدیث اور اہلِ حدیث ص ۸۲۴)

یہ روایت بالکل بے سند ہے لہٰذا مردود ہے۔ سرفراز خان صفدر دیوبندی نے ایک روایت کے بارے میں کہا: "اور امام بخاریؒ نے اپنے استدلال میں ان کے اثر کی کوئی سند نقل نہیں کی اور بے سند بات حجت نہیں ہو سکتی۔" (احسن الکلام ج ۱ ص ۳۲۷، دوسرا نسخہ ج ۱ ص ۴۰۳)

اگر بے سند بات حجت نہیں ہو سکتی تو تقلیدی حضرات ابن النجار کی طرف منسوب یہ بے سند روایت کیوں پیش کر رہے ہیں؟ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے مولانا محمد داود ارشد حفظہ اللہ کی کتاب: حدیث اور اہلِ تقلید (ج ۲ ص ۲۰۱، ۲۰۲)

معلوم ہوا کہ تقلیدیوں کے پاس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی کوئی صحیح یا حسن حدیث نہیں، جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ جمعہ کے فرضوں سے پہلے چار سنتیں موکدہ ہیں۔ اس کے برعکس

عام صحیح احادیث سے یہ ثابت ہے کہ جمعہ کے دن حالتِ خطبہ میں آنے والا دو رکعتیں پڑھے اور خطبے سے پہلے آنے والے کو اختیار ہے کہ جتنی رکعتیں چاہے پڑھے۔

یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ نام نہاد مفتی حضرات بغیر کسی تحقیق کے فتوے لگانا شروع کر دیں کہ اہلِ حدیث کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔!!

کیا ان لوگوں نے اپنے عقائد و بدعات پر کبھی غور کیا ہے؟ اُمتِ مسلمہ کو تصوفی دین میں پھنسانے والے، رسول اللہ ﷺ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو مشکل کشا سمجھنے والے، خالق و مخلوق میں فرق مٹا دینے والے وحدت الوجود کا عقیدہ رکھنے والے اور قرآن و حدیث کی بے شمار مخالفتیں کرنے والے کس منہ سے یہ کہتے ہیں کہ اہلِ حدیث کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے؟! تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب "بدعتی کے پیچھے نماز کا حکم"

کیا اس دن کا خوف نہیں جب ساری مخلوق قیامت کے دن رب العالمین کے دربار میں سر جھکائے کھڑی ہوگی؟ اس دن ہر آدمی اپنے سارے اعمال اپنے سامنے حاضر پائے گا اور...

دیوبندیوں کے خطرناک عقائد اور قرآن و حدیث کے مخالف نظریات میں سے فی الحال چار حوالے پیشِ خدمت ہیں:

۱: گنگوہی، نانوتوی اور تھانوی کے پیر حاجی امداد اللہ نے لکھا ہے:

"اور ظاہر میں بندہ اور باطن میں خدا ہو جاتا ہے" (کلیات امدایہ ص۳۶)

یہ کہنا کہ بندہ باطن میں خدا ہو جاتا ہے۔ قرآنِ مجید کی کس آیت، نبی کریم ﷺ کی کس صحیح حدیث یا امام ابوحنیفہ کے کس ثابت شدہ قول میں لکھا ہوا ہے؟ حوالہ پیش کریں۔

۲: محمد قاسم نانوتوی نے رسول اللہ ﷺ کو مدد کے لئے پکارتے ہوئے کہا:

"مدد کر اے کرم احمدی کہ تیرے سوا نہیں ہے قاسم بیکس کا کوئی حامی کار"

(قصائد قاسمی، قصیدہ بہاریہ در نعت رسول اللہ ﷺ ص۸)

رسول اللہ ﷺ کو مدد کے لئے پکارنا اور یہ عقیدہ رکھنا کہ آپ کے سوا نانوتوی بیکس (بے یار و مددگار محتاج) کا کوئی بھی حامی کار نہیں تھا۔ کس آیت، حدیث یا قولِ امامِ ابوحنیفہ

سے ثابت ہے؟

۳: رشید احمد گنگوہی نے اللہ تعالیٰ کو مخاطب کر کے لکھا:

"اور جو میں ہوں وہ تُو ہے اور میں اور تُو خود شرک در شرک ہے۔"

(فضائل صدقات حصہ دوم ص ۵۵۶، مکاتیب رشیدیہ ص ۱۰)

یہ کہنا کہ وہ جو تُو (اللہ) ہے وہ میں (رشید احمد گنگوہی) ہوں۔!

کس آیت، حدیث یا قولِ امام سے ثابت ہے؟

۴: اشرف علی تھانوی دیوبندی نے رسول اللہ ﷺ کو مدد کے لئے پکارتے ہوئے کہا:

"دستگیری کیجئے میرے نبی کشمکش میں تم ہی ہو میرے نبی"

(نشر الطیب ص ۱۹۴)

یہ سمجھنا کہ کشمکش اور مصیبتوں میں نبی ﷺ ہی دستگیری فرماتے ہیں اور اسی طرح مدد کے لئے آپ کو پکارنا کس آیت، حدیث یا قولِ امام ابوحنیفہ سے ثابت ہے؟

دیوبندیوں نے کبھی اپنے گریبانوں میں جھانک کر اپنا جائزہ بھی لیا ہے یا بس دوسروں پر فتوے ہی لگا رہے ہیں؟!

خلاصۃ التحقیق: دیوبندی تقلیدی مفتیوں (محمد ابراہیم حقانی، غلام قادر نعمانی، گل جمالی، انور شاہ، عبدالحفیظ اور اصغر علی ربانی وغیرہم) کا اہلِ حدیث کے خلاف کذاب و مفتری سائلین کی جھوٹی سچی عبارتوں پر فتویٰ لگانا کہ اہلِ حدیث کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، بالکل باطل اور مردود ہے۔ **وما علینا إلا البلاغ**

(۲۹/ ذوالقعدہ ۱۴۲۹ھ بمطابق ۲۸/ نومبر ۲۰۰۸ء)

حافظ زبیر علی زئی، مدرسہ اہل الحدیث حضرو۔ ضلع اٹک